

891-43905 Rame  
Call No. ~~168C92~~ Acc. No. 34056

ATTN: AB

RECEIVED









رسالہ چاندیہ معجم سالانہ  
افسانہ بہترین بابے چائے  
علاوہ مصورنگ

مصور کردہ حکمتیں پنجاب صوبہ بہرہ ریاست میدر آباد دکن

چندہ نمالک غیر سے  
آٹھ شنگ

# رسالہ لطف لاہور

ادارہ تحریر  
چوہدری برکت علی  
بی۔ اے

مینجنگ پروپر ایڈیٹر

چوہدری نذیر احمد

مینجنگ

بی۔ اے بشیر احمد

فروری ۱۹۳۹ء

مقام شاہ مکہ تہذیب و لاهور  
فی پب پارانے

میرزا ادیب  
بی۔ اے

شمارہ  
اسکی  
بان  
نقل  
کد رسالہ  
ماہ گرام  
مطبوعہ  
نکال نظر  
ماہ گرام  
ہر ہفتہ

| جلد ۸     |                | فہرست مضامین |                          | جلد ۷     |                |
|-----------|----------------|--------------|--------------------------|-----------|----------------|
| صفحہ نمبر | مضامین         | صفحہ نمبر    | مضامین                   | صفحہ نمبر | مضامین         |
| ۱         | اشارت          | ۱۳           | مختصر نامی خانم          | ۳۱        | میرزا ڈیوارے   |
| ۲         | میرزا ادیب     | ۱۴           | جناب ماہر قادری          | ۳۹        | کیف و نشاط     |
| ۳         | جناب میکش صاحب | ۱۵           | جناب عرب احمد صاحب       | ۴۰        | کھوٹے ہونے کے  |
| ۴         | گنگا دھ فرحت   | ۱۶           | راجہ ہمدی علی خان صاحب   | ۴۳        | بہنوں کی یک سچ |
| ۵         | علی احمد صاحب  | ۱۷           | مبیل احمد صاحب           | ۴۴        | ذاتی سو رہیہ   |
| ۶         | چوہدری مس صاحب | ۱۸           | رام جواہر دھندل          | ۵۲        | شکار           |
| ۷         | سعود جبار      | ۱۹           | آفر جونی                 | ۵۳        | حدیث نگاہ      |
| ۸         | پجہ صدیقی      | ۲۰           | محمد ایوب                | ۵۴        | طلوع بحر       |
| ۹         | عبداللہ بیٹ    | ۲۱           | جیانج آبادی              | ۵۵        | غزل            |
| ۱۰        | تیش صاحب       | ۲۲           | نور بے بی رضوی           | ۵۶        | شنگ ناموس      |
| ۱۱        | توکس صاحب      | ۲۳           | پیر زادہ محمد نیرم قاسمی | ۶۱        | غزب کا تھنہ    |
| ۱۲        | اؤر گیسانی     | ۲۴           | ادارہ                    | ۶۵        | قد و نظر       |

انوں  
۵۴  
مورت  
ناب  
ہن و پال  
جانبوں کے  
رہے  
بگی  
ہاکی اوپننگ

چوہدری برکت علی بی۔ اے پرنٹر پبلشر ڈیزائنر راجہ کدہ ٹریڈنگ پرنٹنگ پرس و من بڈنگ لاہور سے چھپو اگر دفتر ادب لطیف سرکار روٹنگ شائع کیا











سے اور فون کلا، اس نے آنکھیں کھولیں اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ آپس میں ٹکرائے گئے۔ اور ان سے اونٹوں کی ہونٹیں ہلکی سی ---  
مضج سی آواز نکلتی تھی۔ پاش گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ اور بھی گھوڑے کے  
چند قدم پیٹا، اٹھائے ہوئے کہ اسے چاروں طرف گردوغبار کے بادل تھا  
اور ان بادلوں میں وہ ریٹھسواروں کے گھوڑے سہانے گئے۔

لوہے کے خون سے تھکے ہوئے ہونٹ بھی ٹک تھک تھک اور اس کے منہ  
اور ان سے بہت سی آواز تھی۔ ہیٹھی۔ ایکبار در اس کے منہ  
سے خون کی دھار نکلی اور وہ جیٹے کے لئے خاموش ہو گیا۔ پاش کی غم و شہ  
میں ڈبی ہوئی نگاہیں اسکے سجدہ چہرے پر ڈک گئیں۔ در اسے یہ معلوم ہی نہ  
ہو سکا کہ کتنے سالہ گہرا جوتا اسے اس وقت اپنی حالت کا اندازہ ہوا  
تھا اس کے بازو زنجیروں میں جکڑے جا چکے تھے۔ اور بے شمار تارکی  
سپاہی اس کے گرد کھڑے تھے نہ اندازہ لگا ہوں سے اسے دیکھ رہے  
تھے!

منہ سے خون کی دھار نکلی اور منہ کے کچھ حصے کو سرخ کر گئی۔ اب سب  
تارکی بھی لڑکے کے جہر سے پر جھک گیا۔ چند لمبے گز گئے۔ یکایک پاش  
کے دامن سے گرو غبار کی آندھنی مٹی ہوئی نظر آئی۔ یہ آندھنی  
بڑھے لگی سب ہنگامیں اس طرف دیکھنے لگیں تاہم انہوں نے  
قریب پہنچ کر دو غبار کے گھٹیت پر دھسے ہیں سے ایک سڑت دور  
ہوا گھوڑا نمودار ہو گیا۔ اور وہیں لوگوں کے بعد ایک فوجیوں نے جھٹ  
سے اتر کر کچن کی سی بڑی کے ساتھ در کے کو بازو پر اٹھایا۔ رگھو  
کی طرف بڑھ گیا۔ تاہم انہوں نے ہاتھ سے فرط حیرت میں بہرہ پڑا  
دراں کے منہ سے پاشا کٹی ہوئی اور مصائب گونجی۔ اس وقت  
ان کے سامنے خودست مارت کا سب سے پرانا ٹیڑھا تھا۔

دو لوں نے پاشا کی طرف جھپٹے۔ یا شانے ایکس بانڈے مٹی  
لوہے کو سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے دونوں کا مقہر کر کے۔ دھیر  
لوگوں کی کشمکش کے بعد وہ گھوڑے کے قریب پہنچ گیا۔ لڑکے کے منہ

جناب میکش ایڈیٹرس

## واردات

آنکھوں آنکھوں میں کچھ پیام آیا وہ بھی ایسا کہ نام تمام آیا  
بھولنے کی جو میں نے کوشش کی سانس بن بن کے ان کا نام آیا  
ان کا دامن ہے میری آنکھوں کی میرا رونا ہی میسر کام آیا  
شوق کی راہ طے ہوئی نہ کبھی ہر قدم پر نسیا مقام آیا  
عزم تو بہار سے معاف اللہ ہونٹ تھرا گئے کہ حجام آیا

میکدے میں بھی پی نہیں میں نے  
بحر تک جا کے تشنہ کام آیا



جناب گنگا دھرتی ناتھ فرحت بی بی نے، کانپوری

# میرے ہاتھ

خندہ زن ہے چار سو صحن چمن میں سے لئے  
کوثر و نسیم ہیں، گنگ و جمن میں سے لئے  
لکھتے ہیں ہر روز نگہائے چمن میں سے لئے  
جلوع رنگیں بنا صحن چمن میں سے لئے  
یاد آتی، رو دیتے پھر مودون میں سے لئے  
ہو چکے بیزنگ پھر بل میں سے لئے  
پھر کھڑا ہی رہ گیا کوئی غریب انتظار  
پھر دھڑک کر رہ گیا سینہ زین باغ کا  
سرو یوں کی یہ خشک راتیں یہ ٹھنڈی چاندنی  
چاندنی ہے پھکی پھکی اور ستارے ہیں اداس  
بن گئے ہیں سب کے سب بھولی ہوئی سی استار  
مریم زخمِ جگر و رمان دردِ زندگی !  
یوں نواک مدت ہوئی مجھ کو وطن چھوٹے ہو  
نت نئے ایجاد ہوتے ہیں مظالم کس لئے  
بھڑا سیر بونے گل کو قید و بند زندگی  
فرحت آخر اس آیا کیوں چمن میں سے لئے

ہر طرف سے آتی ہے بوئے وطن میں سے لئے  
غیرت فردوس ہے بارش وطن میں سے لئے  
ہوتی ہیں رنگیں ادائیں خندہ زن میں سے لئے  
خوش تر و شاداب ہے باغ وطن میں سے لئے  
آج تک گریاں ہیں یاران وطن میں سے لئے  
کھل چلی زلفِ شکن اندر شکن میں سے لئے  
پھر ہے مجھ کوئی نازک بدن میں سے لئے  
پھر تڑپ کر رہ گئی شام وطن میں سے لئے  
اور مجھ انتظار اک سیمت میں سے لئے  
عندہ وہ ہے انجمن کی انجمن میں سے لئے  
وہ گل و شبِ نیمہ کلیاں وہ چمن میں سے لئے  
ہمسرا کسیر ہے خاک وطن میں سے لئے  
آج تک گریاں ہیں ارباب چمن میں سے لئے  
کس لئے گردش میں ہے چرخ کہن میں سے لئے

متہجہ: جناب علی احمد صاحب

مصنفہ: خیرت دروسی انسانہ نگار

# ناکام خودکشی!

ہی س کا تجربہ کر کے، ٹھیک میری آنکھوں کے سامنے ایک واہ  
تھا، چپوٹے، اونگ روہم سے عاوا تھا، تین خوبصورت موسم تھیں  
کے جو رخ ایک نظارہ میں روشن تھے۔ انکی مدھم روشنی ہم ناہیک  
سایت کے رنگ کی دیواروں پر چیل رہی تھی، گہرے کے عین قسط  
میں درمیزوں پر ایک نابوت رکھا تھا، مدھم روشنی میں ایک درو  
چہرہ نیمروانہ پتلی ناگ کے ساتھ نظر آ رہا تھا، ریشم کے نرم ٹیکے اس  
کے سر پہ پاؤں ٹپک بکھرے ہوئے تھے، اور ان ٹیکوں میں سے  
وہ بے نرس زرد پاتھ بک۔ سنے تے ایک ہاتھ میں موسم کا بنا  
جوا، ایک صہیب خا، جو سن کے سب برابر ہوا تھا، ڈانگ دوم  
کے تاریک، دراندہ لوٹ، نابوت کے سایوں کا عکس، در خود  
نابوت۔۔۔ ہر چیز جز مدھم چرخوں کے سوت کی طرح بے حس  
اور تفر کی طرح خاموش تھی

گستاخ متظر موت کے اس دروازے کو دیکھ کر میرے  
سنسے نکلا۔ ایک عورت کی لاس ایک نابوت۔۔۔۔۔  
میں نے اپنے چاروں طوٹ نظر دوڑائی، بائیں طرف ایک دروازہ  
تھا جس میں شے لگے ہوئے تھے، دائیں جانب ایک جھکا ہوا شکت  
سٹینڈ کھڑا تھا، جس سے ایک پرانہ اونٹنی کوٹ آویزاں تھا۔  
تیانی: ایک کراہنے کی آواز آئی۔

یہ درد میں ڈوبی ہوئی آواز بائیں دروازے سے آئی، اے  
کھول کر نہیں چوٹے تار یک کرے میں پہونچا، کھڑکی سے سرک کی  
مدھم روشنی اندر آ رہی تھی۔

کیا کوئی بیاں ہے؟ میں نے در بافت کیا، اور بغیر جو اس نظارہ  
کے دبا سلائی روشن کی، اسکی مدھم روشنی میں میری آنکھوں نے  
دیکھ کر مہرے پاؤں کے قریب ہی ایک شخص خون سے منجھو

ر مت کے دو بچ چکے تھے جب مہر! باہر چلی گئی، ہوا با نسبتا  
ناہینا مہر متفرق ہو چڑ، سرے مطالعہ کے گرس جس داخل ہو، در نے  
ہی کہ آپ کی بوڑھی ہسالی میتویہ ایسے باہر پی خانہ میں معنی کچھ در  
کے لئے آپ کو بلاتی ہے، اس کے مکان میں جو شخص رہتا تھا اس  
سے شاید خودکشی کر لی ہے۔

لیکن میں کیا کر سکتا ہوں، میں نے کہا، میتویہ ہسی: اکثر کے  
پاس جاے، باو پیس کو، علاج دے۔

وہ اکثر کی فاس میں کیونکر جا سکتی ہے؟ باہر پی بولا، وہ انہی خور  
ہے، کرکشی سے سانس لے سکتی ہے، آپ ہی کچھ دیر کے  
لے چیتے تو مہر ہے

ابا گرم بوٹ، اور نوٹی پہنکر میں میتویہ کے مکان پر گیا، بھینک  
کی طرف سے یہ وہ کھلا ہوا تھا، چند قدم چل کر میں وک گیا، مہر بغیر  
سوچے ہوئے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، عا ط میں داخل ہو کر کچھ فاصلہ  
بٹھانے کے بعد میں نے تار کی میں محسوس کیا، کہ دروازہ نصف نہیں ہے  
اسے سوں کر میں اندر چلا گیا، روشنی نہیں مام کو بھی نہ تھی، ہر طرف  
گھپ اندھیرا تھا، اور ایک خاص قسم کی بو فضا میں پھیلی ہوئی تھی، دھو  
کی طرح راستہ نشانی ہونے میں آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگا کہ  
چاک ایک سی لوجہ کی شے سے میری اپنی ٹکرانی اور ساتھ ہی کسی چوڑ  
تھے، سے ٹھوکر کھا کر میں گر پڑا، اٹھاؤ ایک دروازہ نظر آ جا جس سے  
مجھے ہوسے پردے تنگ رہے تھے، اس سے گر کر میں ایک ہال  
کے میں پہنچا۔

اسوقت میں کوئی پہونچ کی داستان نہیں دکھ رہا، در نہ یہ  
پتا دس کہ پڑھنے والے کو ملاو جہیرت میں ڈالوں، لیکن جو متطر  
میری آنکھوں نے دیکھا، وہ اس قدر دہشت، نیچر تھا کہ شاید موت

میں سے کسی نے کوئی گفتگو نہیں کی۔ میں اپنا کام کرتا رہا۔ اور وہ خاموش  
لیٹا لیٹتی باندھے مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا رہا، جس سے ظاہر ہوتا  
تھا کہ وہ اپنی نامیاد خود کشی اور ایک اجنبی کی ہمدردی پر شیمان ہے۔  
اب آپ کو خاموش لیٹے رہنا چاہیے؛ اپنی کام میں نے مکمل  
کر کے کہا۔ میں کسی ڈاکٹر سے مشورہ کر کے کوئی دوا لیتا ہوں۔

اسکی کوئی ضرورت نہیں؛ اس نے میری آستیں پھڑکرائی نظریں  
میری نظروں سے ملاتے ہوئے کہا۔

خوف اسکی آنکھوں میں جھلکیاں لے رہا تھا۔ اور صیب جانے کے  
خیال ہی سے وہ گھبرا رہا تھا۔

کوئی ضرورت نہیں؛ پانچ منٹ اور غم نہ جائیے..... دس  
منٹ..... اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو ٹھہریں..... میں  
البتہ کرتا ہوں۔

جب وہ مجھ سے یہ الفاظ کہہ رہا تھا، تو حقیقتاً اس کا جسم کانپ رہا  
تھا۔ اللہ اس کے دانت بچ رہے تھے۔ میں نے اسکی تمہیں کی اور دیکھ  
کے کوئی نہ پریشان کیا۔ دس منٹ سکوت میں گزر گئے۔ اور میں خاموش  
بیٹھا اس کمرے کی تمام چیزوں کا جائزہ لیتا رہا، جہاں قسمت نے  
غیر متوقعانہ رات مجھے پہنچا دیا تھا۔ کتنی غربت؛ ایسا شخص جو ایسے  
مناسب حضا اور ایسے سین چہرہ کا مالک ہو، افسوس ہے کہ ایسے  
افلاس میں زندگی بسر کرے۔ ایک پیرانا پٹا ہوا صوفہ، ایک معمولی ٹوٹی  
ہوئی کرسی ایک چھوٹا سا میز، ایک فرسودہ ہینک اور دیوار سے لٹکی  
ہوئی ایک دھندلی تصویر۔ یہ تھا جو میں نے دیکھا۔

کتنی خراب موسم ہے؛ مریض نے بغیر آنکھوں کو کھولے ہوئے کہا۔  
ہاں..... میں نے جواب دیا: میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو کہیں  
دیکھا ہے۔ کیا آپ نے یو باخوف کے خانی تعمیر میں گزشتہ سال  
کام کیا تھا؟

اس سے آپ کا مطلب؟ اس نے جلدی سے اپنی آنکھیں کھولنے  
ہوئے پوچھا۔

اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔

یقیناً میں نے آپ کو وہاں دیکھا ہے۔ کیا آپ کا نام سیلیون

فرش پر بیٹھا ہے۔ اگر میرا ایک قدم بھی اٹھے ہر جا ہوتا تو یقیناً میں  
رو نہ ڈالتا۔ پاؤں پھیلانے اور ایسے دونوں باتوں کو ذہن پر رکھنے  
وہ اپنے خوب صورت اور موت کی طرف نہ دیکھ سکے، ٹھانے کی کوشش  
کر رہا تھا۔ جب اسکی نظریں اور آنکھیں تو اس کی بڑی بڑی آنکھوں  
میں نے پھانٹا تھا۔ بیان خوف درد اور یاس پسینہ کا ایک سرد  
قطرہ پیشانی سے دھل کر اس کے رخسار پر جم گیا تھا چہرہ کا آثار چہرہ  
پسینہ تیز نفس لے ہوئے؛ انت اسکی بے اندازہ تکلیف اور  
بے چینی کا پتہ دے رہے تھے اس کے سیدھے ہاتھ کے قریب کچھ  
دور ایک پسول پڑا تھا۔

مجھے عیون ذکر نہ جانا؛ اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ جبکہ میری  
صحتی ہوئی کا ذہنی کچھ رہی تھی۔ نیز ہر ایک تبدیلی رکھی ہے؛ تقدیر میں  
کر کے میں کب کے درمیان خاموش کھڑا ہو گیا۔ اب آگے کیا کرنا چاہیے  
مجھے معلوم نہ تھا میں نے فرش پر پڑے ہوئے آدمی پر ایک کبریٰ نظر  
ڈالی۔ اور اسوقت میری آنکھوں نے ایسا محسوس کیا کہ میں نے اسے  
کہیں دیکھا ہے۔

درد ناقابل بروا شت ہے؛ اس نے شکل کہا۔ اور مجھ میں اتنی  
طاقت بھی نہیں کہ دوسری گولی سے خود کو ہلاک کروں..... آف  
دل کی کمزوری؟

اپنا گرم کوٹ اتار کر میں اس مجروح کی طرف متوجہ ہوا۔ صغیر  
سے گودیں اٹھا کر میں صوفہ پر لیٹا دیا۔ پھر احتیاط سے اس کے خون آلود کپڑے  
اتارے۔ سردی سے بے چارہ کانپ رہا تھا۔ جو زخم میں نے دیکھا  
وہ اتنا زیادہ نہ تھا جس کا اندازہ اس کے چہرے اور اس کے کانپنے  
سے ہر رہا تھا۔ گزشتہ سبیل کی باخوبی درجنی بڑی کے درمیان  
کھال سے نکل کر گزشتہ میں دھنسی ہوئی تھی۔ کوئی کوئی ہتھیار کھال میں  
نے پیٹے ہوئے خون کو حتی الامکان مدکنے کی کوشش کی۔ اور آخر کار  
دو تال ایک تھیکہ کا خدات اور دو دستیوں کو ملا کر ایک عارضی پی  
باندھنے میں کامیاب ہو گیا۔

زخمی آدمی کو پیچے میں نے کچھ پانی دیا۔ اور پھر اسٹینڈ سے ٹھکانا  
ادنی کوٹ اتار کر اسے اڑھا دیا۔ جب تک بی با نہ می جاتی رہی ہم دونوں

نہیں؟

- اگر ایسا ہو بھی تو اسے معلوم کرنے سے فائدہ؟

- لیکن میں صرف جانتا چاہتا ہوں۔

- ویسلیوٹ نے آنکھیں بند کر لیں اور چار رخ صوف کی...

بیٹ کیلبرٹ پیر لیا۔ شاید وہ ناراض ہو گیا تھا۔

- میں آپ کے اس تجسس کو نہیں سمجھاؤں وہ بڑا بڑا، تو وہ اب شاید

آپ یہ سوال کریں کہ میرے خوشگوشی کرنے کا باعث کیا ہوا؟

ایک منٹ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ پھر میری طرف پلٹا، آنکھیں

کھولیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا،

- معاف فرمائیے، میں اب کچھ سوچ رہا تھا، لیکن آپ خود اس

کا اثر اور کریں گے کہ میں غلطی پر نہیں، ایک مجرم سے یہ سوال کرنا، وہ

میں میں کیونکر آیا، یا ایک مرتے ہوئے شخص سے یہ پوچھنا کہ اس نے

جو خوشگوشی کیوں کی کہ میں نہیں، اور بے سنی سی بات ہے..... اپنے

ذہنی تشکی کیلئے ہزاروں کے جذبات سے کھینکا.....

- نہیں نہیں! میں آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتا، میرا یہ خیال

ہرگز نہ تھا، کہ میں آپ کی خاموشی و معروضیوں کی پیمائش میں کیوں میں

لے سکا جملہ کاٹے ہوئے کہا۔

- آپ پوچھ سکتے ہیں..... ہمیشہ لوگ یہی تو کیا کرتے ہیں۔

اثر..... میں سے انکو کوئی فائدہ نہیں ہوتا، گرمیوں کو تو شاید

آپ یقین نہ کریں یا نہ سمجھیں..... یہی کہ اسکی وجہ میں خود نہیں جانتا

..... اچھے سا ہو گا، پس اور اب اس سے چند مخصوص محاورات

اور منادات، استعماں ہوتے ہیں مثلاً، زبردستی کی محبت، اور سوسائٹ

افلاس..... لیکن انکے وجود ظاہر نہیں ہوتے، وہ نہ تو مجھے معلوم

ہیں، نہ آپ کو اور نہ اخباروں کے ایڈیٹروں کو، باوجود اس کے کہ

وہ خوشگوشی کرنے والے کی ڈائری تک لکھ ڈالتے ہیں..... خدا ہی

اس شخص کے قلبی تاثرات اور روحانی کیفیات کو سمجھ سکتا ہے، جو خود

کہ اپنی زندگی کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ خدا کے علاوہ اس راز کو

کوئی نہیں سمجھ سکتا..... کوئی.....

- میں سب کچھ سمجھ گیا، جس نے کہا: لیکن آپ کو زیادہ بات

نہیں کرنا چاہیہ

.....

لیکن میری خوشگوشی روکی نہیں جا سکتی، اپنے سر کو ہاتھوں کا سہارا

لیکھ کر، ذہنی پروفیسر کے طور پر اس نے کہا، شروع کیا، انسان خوشگوشی

کے لئے دے دے، نہ سببی، نہ عین کو میں سمجھ سکتا، چہرے کی وجہ سے نسبت

سہارا، کہ جو کہ جانتا ہے، ہاتھ اگر خوشگوشی کرنے والے کا پستول، اس

سے زبردستی بھین لیا جاتا ہے، تو کل نہیں ہے، کہ وہ اپنی مرضی سے اس

کو چھبک دینا پسند کرے..... یہ سب زیادہ تر انہوں نے

ٹیبلوں اور انکی کیفیات پر منحصر ہے، میری ہی مثال لیجئے، صرف آدمی کے

بیشیرتے موت کی دلی رزگرتی اور اب جبکہ زندگی روشن کر دیتی ہے،

اور آپ یہ سب باتیں ہیں میں موت کا تصور کرنے کے لئے بھی تیار

نہیں، اس فوری تبدیلی کو آپ سمجھا سکتے ہیں تو سمجھائیے..... میں

تیار ہوا ہوں، اور میری زندگی کو موت کے آہنی پنجوں سے چھین

لیا گیا ہے..... کیا اس خوشگوشی اور تبدیلی کا باعث بہادر زندگی شکر

کرنے ہیں! ایک مجدد، جنہی کی موجودگی؟

- روشنی یقیناً اپنے اندر بہت اثر رکھتی ہے، صرف کچھ کہنے کی

خاطمی نے کہا، - روشنی کا اثر، خصوصاً انسانیت کو فانی.....

روشنی کا اثر..... لیکن آپ کو معلوم ہو گا کہ لوگ روشنی کی

موجودگی میں خوشگوشی کر لیتے ہیں، آپ کے ہاتھوں کے ہر دھڑکنے

لئے یہ ایک شکر خیز ثابت ہوگی، اور اگر ڈرامے کا پلاٹ ایک معمولی

روشنی ہو جائے، کیا ایک..... پٹا کھا جائے تو اس بجواس کی

تشریح شاید کی جا سکتی ہے، لیکن ہمارے ذریعہ نہیں..... ایسی

چیزوں کے متعلق سوالات کرنا اور ان کے جوابات دینا جنہیں کوئی

نہ سمجھ، محض بیکار ہی نہیں لغوی ہے۔

- معاف فرمائیے، میں نے کہا: لیکن آپ کے چہرے کی کیفیت

سے مجھے ایسا محظوم ہوتا ہے کہ آپ پر نیند کا غلبہ ہے؟

- ہاں ویسلیوٹ نے چونک کر کہا، بہت ممکن ہے میں غلط تر

خیالی اور بھی آدمی ہوں، اچھا سمجھائیے، اگر آپ کو اپنی قیادہ شناسی

پر اعتماد ہے۔ آدمی گھنٹہ پیشتر میں نے خود پر گولی چلائی، اور..... اس

وقت، اٹکھ رہا ہوں..... اسے سمجھائیے، مگر آپ سمجھا سکیں؟

جنرل لیوا خوف سے طے ہوئے آپ کو کتنا عرصہ گزرا؟  
گزشتہ موسم گرما کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا:  
”اسے شہرت کا بنوں ہے، لیکن منسا اور خوش مزاج بوڑھا ہے  
اور کیا آپ اب بھی کچھ لکھتے ہیں؟“  
”ہاں کبھی کبھی“

”تو تمہیں یاد ہوگا میں جو تو فوں کی طرح خانگی تھیسروں کا کیے شرت  
لگاتا تھا۔۔۔۔۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے زینا سے محبت  
کر لی شروع کی تھی۔۔۔۔۔ کیسا ہونا نہ نخل اور کتنا دلچسپ مذاق۔  
اس زمانے کی رنگین یادیں تہ موسم بہار کے چھوٹے چلنے لگتے تھے۔  
اب وہ منظر کتنا بھیا ننگ ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ یہ پلاٹ تھما  
میں نے سجد دلچسپ ہوگا لیکن خود کٹی کر نیوالے کی ڈائری لکھنے کی کوشش  
نہ کرنا۔۔۔۔۔ اس میں کوئی جدت نہیں۔۔۔۔۔ مزاج سپہ  
کرنا چاہئے مزاج۔۔۔۔۔“

پھر آپ پر فزونی طاری ہو رہی ہے؟ میں نے کہا: ”امی آپ کی  
حالت قابل اطمینان نہیں“

”سننے کی بات نہیں، آپ کہتے ہیں سننے کی بات نہیں، ویسلیو  
جینہ گیا، آئو: اس کی آنکھوں میں چمک رہے تھے، زور چہرے پر کب  
اور بے چینی کی لہریں توڑ پڑھ رہی تھیں، وہ قدرے کانپ رہا تھا۔  
”آپ مرنوں کی بیوفائی پر جیسے ہونگے، وہ بولا، لیکن کسی بے وفا  
عورت نے، یہ ذریعہ نہ دیا ہوگا جیسا میری قسمت نے مجھے دیا ہو  
۔۔۔۔۔ مجھے بھی دھوکا دیا گیا، خوفناک دھوکا۔۔۔۔۔ گزشتہ سال میں کس  
قدر خوش تھا۔۔۔۔۔ کس قدر خوش اور اب۔۔۔۔۔ اب“

ویسلیو ٹیکوں میں، حسن گیا اور سننے لگا۔  
ایسی چانگ تبدیلی، اس سے بڑی بد قسمتی کا تصور بھی نہیں کیا  
جاسکتا، آغاز کربا محبت، رنگین لمحے، خوشگوار راتیں اور انجام۔۔۔۔۔ طائر  
کی تلاش، گردش، مایوسی، اور پھر سب سے بڑھ کر کمر کی دھوم دھام  
کچھ بے چینی ہوئی مڑکوں سے۔۔۔۔۔ قبرستان کی طرف؟  
وہ پھر سنسا، میں نے غیر معمولی بے چینی محسوس کی، اور جانے کا  
امدادہ کر لیا۔

آخری الفاظ ویسلیو نے نہایت کمزور اور دھیمی آواز میں ادا  
کئے، سنی تو بت گویا بی رحم ہو گئی، اور وہ خاموشی کی نشا بن کھو گیا۔  
چند لمحے بڑی گزر گئے۔ میں نے ایک تنقیدی نظر سے پڑائی، اس کا  
چہرہ اس کے اندر زور تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جہت  
دور تک کل ہی ہے لیکن بے پایاں۔۔۔۔۔ تکلیف کے علامات جو  
اس خیالی اور دھیمی شخص کے تصور سے نظر نہ چور رہے تھے۔ اس کے زندہ  
ہونے کی تائید کرتے تھے اسے دیکھنے سے تکلیف ہو رہی تھی، باوجود  
اس کے ویسلیو کے جسم میں حرکت ہوتی شاید گھٹکوں کو کرنے کی  
”ملاحیت اس میں پھر عود کر آئی۔“

”آپ یہاں۔۔۔۔۔ کیا آپ یہاں ہیں، کبھی کے بن  
اٹھتے ہوئے اس نے کہا، خدا کیلئے سنئے؟“

میں سننے لگا، پھر تیار ہو گیا، کھڑکی کے شیشے بارش کے مسلسل  
قطروں سے بھر رہے تھے، ہوا، فضا میں باہر توڑ پڑھ رہی تھی، میٹریج ہو  
داس اس آگئی تھی ڈرائنگ روم میں لاش بریڈ ہو رہی تھی، اور محسوس  
ہوتا تھا کہ اسکی شخصیت اور تکی ہونی آواز کبھی ختم نہ ہوگی۔

”کتنا بھلا منظر ہے؟“ ویسلیو نے اپنی ڈرائیو آنکھیں میڈی  
طرف پھرتے ہوئے روشنی کے عالم میں کہا، ”وہ تمام چیزیں جھوکی آدمی  
دیکھتا اور سننا ہے، گرا ایک بدی نعمت میں تبدیل کر رہا ہے۔۔۔۔۔  
لیکن تب میں اس نعمت کو کیسے سمجھو گا۔۔۔۔۔ اور اسے کیا محسوس  
کر رہا گا۔۔۔۔۔ اس وقت کے بچے موند گئے؟“

”تین بچے ہیں پانچ منٹ؟“  
”راستاً ختم ہو رہی ہے اور صبح کو جنازہ کی رسم ادا ہو جوالی ہے  
کتنا خوش منظر، تابوت لئے کچھ، بارش میں گزرتا ہوگا۔ رہو، بادلوں  
سے گھر کو آسمان اور اس ناگوار منظر کو دیکھ کر نظریں پھیر لیں گے  
کچھ دیر بھری ہوئی مڑکیں تہ وہ خانے گھبرائی ہوئی سویاں۔۔۔۔۔ اور  
کسی کے کپڑے غلیظ پانی میں تھرا اور نہ ختم ہونوالی بھگی مڑکیں لنگرنا  
ہو اس سے بد وقت۔۔۔۔۔ اور سینہ پر پتھر۔۔۔۔۔ ایک  
بھاری پتھر؟“

دم بھر کیلئے ٹھہر کر اس نے پھر کہا شروع کیا: ”



”جیڑ نکلی وسیلیوت! ہم آپ کی منتظر ہیں۔ الہز عورتیں ہمارے جیڑ کو بکا رہتی ہیں۔“

”صرت ایک منٹ! اپنی مائی کو درست کرتے ہوئے، وہ خیالی اور بھی شمس کہتا ہے۔“ میرے دوست بات بیکار اور ساتھ ہی ساتھ چمدی کی بھی سستی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے؟ ..... کر ہر شخص یہ تصور کرے اہد کو کشش کرے کہ تمام مسیتوں کے ظہر جن سے وہ گزر چکا ہے۔ انکو اپنے دماغ میں تازہ رکھے۔ اس نے کہ وہ اپنی زندگی کے اہم واقعات ہیں، تو یقیناً ہماری دود مذہ زندگی بھی ہمارے لئے وبال و دش ہو جائے۔“

میں نے اس کے سنجیدہ چہرے کو دیکھا۔ اور میری آنکھوں میں پھر وہی مایوسی اور وہی غمت پھرنے لگا۔ جو اکیسال قبل اس رات کو

میں نے دیکھا تھا۔ اسکی تقریر میں پھر وہی جوش اور وہی لہجہ لہریں لیتا معلوم ہوتا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ میں نے پھر ایک بار دیکھا کہ وہ خون سے رنگے ہوئے فرش پر بیٹھا ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں کرب و اضطراب گردن میں رہا ہے۔

”لیکن یہ افسانہ خستہ تم کیسے کیا سبائے؟“ میں پھر بڑبڑاتا ہوں۔

وسیلیوت بیٹھا تھا، اور مائی کو درست کرتا ہوا ڈرائنگ روم میں چلا جاتا ہے ..... اور میری نظریں پردوں تک اس کا پیچ کر کے لوٹ آتی ہیں .....“

سجش شمس

جناب گوپال مشن بی۔ اے

## دھوکے

رنگینی ہوس کا وفا نام رکھ دیا خود واری وفا کا جفا نام رکھ دیا  
خود غرضیوں کے سائے میں قاتی و پرورش آفت کہ جس کا صدق مٹھا نام رکھ دیا  
مغس کو اہل زرنے بھی کیا کیا دیتے فرب اپنی جفا کا حکم خدا نام رکھ دیا  
انسان کی جوبات سمجھ میں نہ آسکی انسان نے اسکا حق کی رضا نام رکھ دیا  
بے مہرئی حبیب کا مشکل تھا اعتراف یاروں نے اس کا ناتواوا نام رکھ دیا  
یہ روح کیا ہے جس کا عکس لطیف ہے یہ اور بات ہے کہ خدا نام رکھ دیا  
فطرت میں آدمی کی ہے ہم سا ایک خفت اخفی نکا کسی نے خدا نام رکھ دیا

# خستہ زبدا

جناب مسعود جاوید بی. اے

پرہیز  
آہ کہاں ہو تم؟

لوڑا پجاری جڑینے پر استادہ تھلجہ بات کے اسی طوفان  
میں کاغذ رہا تھا۔

پریم سنگھ — ایک نوجوان منتھٹ — نے اپنی کشتی سے  
ماہر قہر میں رکھ دیا اس نے شیلہ کی نشست کے پیچھے نہایت خاموشی  
سے راک دی تھی۔ وہ آگے بڑھا اس تمام اترام و بھرجم کے ساتھ  
جس کا اظہار صرف ایک دیوی کے حضور میں کیا جاسکتا ہے۔ آگے  
بڑھا اور وہ سامنے لمحوں جو منہ کی شکنیں دے زبان دوی پہنچاؤ  
کرنے لایا تھا۔ شیلہ کے سامنے پیش کر دینے۔ شیلہ نے ایک لمحہ کیلئے  
اس خوبصورت نوجوان کی طرف غور سے دیکھا۔ اور پھر بھگاہیں جھکائیں  
”پھولوں کے اس تھنے کا شکریہ“ اس نے پھولوں پر نظریں ڈالتے  
ہوئے کہا۔

لیکن وہ اب بھی ایک مہر میں مجھے کی طرح بے حس و حرکت  
کھڑا تھا۔

ایک جگہ سے اور کیا چاہتے ہو؟ اس نے اپنی آواز قند سے  
بلند کرتے ہوئے کہا: ہمارے راستے باطل جدا گانہ ہیں پر تیرا۔ اس  
دیوی کو فراموش نہ کرو۔ جس کی پرستش کے لئے تم یہاں آئے ہو؟  
اس نے تسلیم غم کیا۔ اور اپنی کشتی کھینچا ہوا چلا گیا۔ شیلہ ٹھوڑ  
کر اسکی چھوٹی سی کشتی کو موجوں پر بھجکے۔ لے کھلتے دیکھتی رہی۔ اسے  
حیرت تھی کہ نوجوان منہ میں دیوی کے حضور میں حاضر ہونے بغیر  
کیوں چلا گیا۔

(۲۱)

عورت کیلئے محبت ایک مذہب ہے اور مرد کے لئے تعطل و  
فرصت کا ایک لذت شغل۔

دریا نے زبدا کی بل کھاتی ہوئی موجوں کے آغوش میں مجھے  
جبر سے پہلے ایک مہر میں چوترا قائم تھا۔ در شیلہ اس حسین مرتضیٰ  
سطح کے کنارے بھی تھی۔ اس منہ۔ ایک سنگین رہنہ تھا جسکی یہ شیلہ  
درد سے کھل کر پوچھنے کے۔ سر سے کسے۔ ایک کشتی تھی۔ اور  
دریا نے اس پار۔ گئے درخوں کے۔ ریہان ایک تہا منہ۔ شیلہ  
کا چہرہ دونوں چاندنی میں جھک رہا تھا۔ اس کی ساری قوس  
قرت کی سست رنگیوں کا ایک عزم۔ محوم ہونی تھی اس کے برہنہ ہیں  
پوں بانی کی نازک نازک لہروں میں بہا کر خود بھی ایک نازک لہر بننے  
لئے۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ خود ایک انسانی سستی نہیں بلکہ  
گوئی مادی مخلوق ہے۔ ماہر ایک بست المحو۔ اسکی بری بڑی  
چشمیں بالوں کے ان ٹکڑوں پر مرکوز تھیں جو شفق شام کی رنگت پڑا  
سے گھبراہٹ گئے تھے۔ اس کا ستارہ کسی برہ کی ستانی ہوئی بولنی کی طرح لگتا  
وہ تھا۔ اس کے تنوں میں ایک نامعلوم روحانی تشنگی چوہ۔ ہی تھی  
آہ کہاں ہو تم؟ اس نے ایک طرف سر دواہ کے ساتھ دہرایا۔  
پرہیز۔ آہ کہاں ہو تم؟

گوگل۔ سبہ زون میں اور بسندہ۔ بن کے واس میں  
کرشن جہاں مٹی کی سے سے ہوک ٹھٹھتے تھے من میں  
شغل جھل — بستی بستی  
وصوفہ پھری میں دھونڈیری  
پرہیز:

آہ کہاں ہو تم؟  
شیلہ کے من کو چارے کوئل کے پرل جباتے  
شیلہ کے جو پریم کو پرہیز تم اڑنا سکلا جباتے  
بادل بادل — تارہ تارہ  
چھائی پھرتی اڑاؤ کر



جذبات سے مغلوب ہو کر پریم نے شیدا کو اپنی آغوش میں گھنچ لیا لیکن شیدا فوراً ہی کچلی کی طرح تڑپ کر اُڑا ہو گئی۔ اور شدت احساں سے کانپنے لگی۔ . . . پریم نے عفو و اذی کی التجا کی۔۔۔ شیدا بھٹنے لگی۔۔۔ سسکیاں لیکر۔۔۔ وہ زبان سے کیا کہتی؟

(۳)

پریم سنگھ اور مہسی پریس کے ایک نشاط خانے کے حق بن گئے تھے۔ اور ہر اس شخص میں جذب تھے جو شراب و حسن و شباب کے تصادم سے پیدا ہو سکتا ہے نینسی کی آنکھیں نسوں کا نہیں اور اس کے لیے بے پانی میٹا نہ مدوش کافی غنائیں۔ اس نے اگر پریم پر جوشِ محبت میں اسے یونان کی حسین پری کہہ دیا تھا تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ وہ بات تو ایسا ہوا کہ یہاں جذبات سے بے قابو ہو کر اس نے ایک نرسنگ کی آنکھوں سے اپنے مرضی لے لیا اور اس نے اگر ایسا ہوا کہ لبریز جامِ شراب کو نینسی کے گرد طواف دیکر اس نے ایک سانس میں خالی کر دیا۔ نینسی کی آنکھوں میں محبت جگمگا رہی تھی۔ اور وہ تمام فرانسسیسی لوگ جو اس پاس بیٹھے تھے۔ اس خیال پر مسکرا رہے تھے کہ ایک ہندوستانی نوجوان معاملات تشق میں بھی اتنا ہی قابل ہو سکتا ہے۔ جتنا کہ جنگامہ کا رنارہیں!

آخر کار وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہوٹل کے خادم نے پریم سنگھ کو بتایا کہ اس قابل ایک حسین لڑکی نے ادا کر دیا ہے۔ جو نیم مشرقی لباس پہنے ہوئے تھی اس نے دروازہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”وہ۔۔۔ سامنے جا رہی ہے وہ لڑکی؟“

پریم سنگھ تڑپ کر باہر نکل پرہنچا۔ لیکن نیکی روانہ ہو چکی تھی۔ اس لڑکی کو اپنی آغوش میں سے ہونے۔ اس نے چلا کر پکارا۔ شیدا! وہ لڑکھو کر زمین پر آ رہا۔

(۴)

وہ دبا گئے وسط میں ایک مرمرین چوڑے پر ایک ہنست البحر بیٹھی تھی۔ لوگ اسے تو خیر بڑا کہتے تھے۔ اس کے حاضروں کے گلاب مرجھائے تھے۔ اس کے لباس پر قوس و قزح کی رنگینیاں باقی نہ رہی تھیں۔ اس کے چہرے کا رنگ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے یا سین کے پھولوں

لیکن مرد محبت پر اپنی جان دیدیتا ہے؟

”ہاں۔۔۔ مگر محبت میں زندہ رہنا مرنے سے دشوار ہے۔ اور عورت زندہ رہتی ہے؟“

محبوبت کا جہاں ستاں۔ غم عورت ہی کی بیداری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ خوب!۔۔۔ ابھی تک کیونچہ کو خود اپنی جنس کا علم نہیں؟ شیدا اور پریم کچھ غلط باغات سے نیچے تر رہے تھے۔ وہ خوش طبعی کے ساتھ بوٹ و پھول میں مشغول تھے پریم کو احتراف کرنا پڑا کہ وہ محض ایک سپاہی ہے اور بوٹ و باغستان ہی قدرت سے بیدار چلے چلے دوڑوں ایک تلویش کچ کے گرد گھومتے تو شہر نے کیا بھول توڑا اور پریم کے کوٹ میں لگانے لگی

پریم نے ایک بے پناہ جاہلیت سے مجبور ہو کر اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دیا اور اسکی آنکھوں کی گہرائیوں میں اپنی نظریں غرق کر دیں۔ ”اسرار کے ان دو سیاہ سمندروں نے میرے دل کو تباہ کر دیا ہے ناقابلِ فہم ذہنیت کی شہزادی۔۔۔ شیدا! میری قسمت کا فیصلہ ایک بار ہمیشہ کے لئے کیوں نہیں کر دیتی ہو؟“

”ہمارے درمیان ایک شفیق باپ کی سنی حامل ہے جس کا میرے علاوہ دنیا میں کوئی نہیں، تمہاری ٹرین کو فلاہ اسٹیشن میں داخل ہونے ہوئے دیکھ کر اس نے مجھ سے اپنی یہ متناظر کی تھی کہ اپنی ذات اور نسب کے وقار و احرام کو زاموش نہ کرنا۔“

”آہ!۔۔۔ پھر وہی رسوم و رواج کی لعنت!۔۔۔ اور ہاں شاید تمہارا لکھتی باپ یہ بھی تو خیال کرتا ہوگا کہ پریم سنگھ اس قدر دولت مند نہیں کہ تمہارے لئے تخت کیا جاسے۔“

”اسکی شرائط و عہدیت پر خط نہ کیجئے۔ تم دونوں میرے واسطے جیٹ تھیں ہو۔ میری آنکھوں کی طرح۔۔۔ میں کسی ایک سے بھی جدا نہیں ہو سکتی۔“

”پھر اس چستان کو کیسے حل کر دیتی تم؟“

”حل ہو جانے کے بعد چستان کی دیکھی منا ہو جاتی ہے۔“

”تو پھر تم نے کیا سوچا ہے؟“

”پریم کی آنکھ میں گھل کر ختم ہو جانا۔“

میں زعفران کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ اور۔۔۔ اسکی ہاتھوں میں  
پھٹی ہوئی بکلیاں بکھتی ہوئی شمع کی زرد کرونوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔

اس نے اپنی خوابناک نگاہیں متلاشہ و ذرا نشی، اور اپنا ستار اٹھایا  
جو اس کے پہلو میں خاموش پڑا تھا۔ ستار کے تاروں سے نرم نرم  
شیریں جھلکار پیدا ہوئی، اور ذرا سی دیر میں شیریں نغموں کے ایک  
اٹلے جوئے چٹنے میں تبدیل ہو گئی، ایک مجبور و شکستہ تہمت جو سوز و  
لمحہ سے نیم جاں معلوم ہوتا تھا، اسکے لبوں کے گوشوں پر نمودار ہوا فتنہ  
رہنہ اس کی آنکھوں میں سکھو سرور کی ایسی کیفیات ظاہر ہو گیا جس پر  
کسی نے صحت نصحت جام پی کر رکھ دیا ہو۔ اور اس کے جہرے ہر  
بہت بگی سی سرخی بھتجے ہوئے تھی۔ اس کا تہمتہ شیریں تھا۔ اس کا  
موضوع فتنہ شیریں تر تھا۔

تمہیں! اس نے اپنا ترانہ مسرت شروع کیا۔ تمہیں۔۔۔ تم  
وہاں نہیں ہو،

ان حسین بستیوں میں جو ہیں بادلوں سے آگے  
نہیں۔۔۔۔۔ تم وہاں نہیں ہو

مرد و مہر میں نہیں ہے

رُخ پڑھیا تھا را

نہیں لکشاؤں میں بھی

کوئی نقش پا تمہارا

یہ نفا کے خالی دامن

ہیں ہوا کے خالی دامن

سرے تنوں کی نظر نے یہ حجاب دیکھ ڈالے

نہیں۔۔۔۔۔ تم وہاں نہیں ہو

۱۰ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوئی اور پھر گانے لگی۔

کہیں فطرت حسین میں تو چھپے ہوئے نہیں جو!  
نہیں!۔۔۔۔۔ رنہ یوں نہ رستے یہ جہان کے نظارے

یہ سپہا مست ہو کر

وہ فتن کے راگ گاتا

کہ جسم آگ بن کر

لب گل پہ تھر تھراتا

یہ دھنک کے شوح جلو

کوئی، ایسا رخ بدلتا

کہ تھا را نام جیسے کوئی آسماں یہ لکھ دے

نہیں، تم وہاں نہیں ہو،

وہ پھر ڈر، رک گئی۔ اور ستار کے تاروں کو جھنجھٹا کر  
گانا شروع کیا:-

”مگر ہاں:-۔۔۔ بے جو تم تو میری اجڑی ہریت میں ہی

تمہیں پالیا ہے میں نے۔ تمہیں پالیا ہے پیار سے

یہ مرا انگار سپلو!

جو ہے یاد کا رافت

میری صبر کردہ آہیں

جو ہیں شاہکا رافت

میری روح۔ روح سوزوں

میرا قلب۔ قلب ہریاں

۔ تمہارا سے واسطے ہے میرا سارا ساز و ساماں

تمہیں پالیا ہے میں نے۔ تمہیں پالیا ہے پیار سے

سن رسیدہ بچاری کے لبوں سے ایک کرلہ بلند ہوئی  
اور وہ زمین پر گر پڑا!

## صحرا نور کے خطوط

الف لیٹلے کے بعد الف لیٹلے کی سی کتاب عنقریب شائع ہو رہی ہے۔ کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ

مکتبہ اردو لاہور

جناب عجاز صدیقی کبر آبادی

# پھولوں کی جوانی

سب ساز سمجھتے ہیں جسے ساز کہاں ہے  
تم دل میں ہو میرے مگر آواز کہاں ہے  
اے موسیٰ گل اور بڑھانے ابھی اپنی  
اے عشق نہ دے حسن کو تکلیف تنہا  
اے جان چین دل جو بناوے مرے دل کو  
دل بول رہا ہے مگر آواز کہاں ہے  
یہ ساز ابھی پردہ ویرانہ کہاں ہے  
دیوانہ ابھی خوش بر آواز کہاں ہے  
اس کی متحمل نگہ ناز کہاں ہے  
وہ تیری نگاہ غلط انداز کہاں ہے

## قطعہ

وہ حسن کی ستانہ جمابی چہ حسابی  
آغوشِ حُب میں وہ ہی ہوتی نظرس !  
وہ چاندنی وہ تاج وہ جہنم کا کستارا  
پھولوں میں وہ چھپنا مرا وہ دھندلانا کا  
وہ عشق کی گجراتی سی آواز کہاں ہے  
جے تابی خاطر کا وہ انداز کہاں ہے  
وہ ہر جہتی روح کی پرواز کہاں ہے  
پھر ناز سے کہنا اے عجاز کہاں ہے

دل اور جگر ایک ہی مرکز پر ہیں دونوں  
اب دل ہے نقطہ واقف اسرارِ حقیقت  
دل دُوب چکا چھپ چکے جانہ اور ستارے  
ہے وقت کہ دیو اسے کچھ انگڑائیاں لے لیں  
دل اور جگر ایک ہی مرکز پر ہیں دونوں  
اب دل ہے نقطہ واقف اسرارِ حقیقت  
دل دُوب چکا چھپ چکے جانہ اور ستارے  
ہے وقت کہ دیو اسے کچھ انگڑائیاں لے لیں  
ان میں الپ خود رنگ کا انداز کہاں ہے  
یہ ساری خدائی تری مہراں کہاں ہے  
آواز دے میرے بت طناز کہاں ہے  
وہ چٹم فسون ساز ابھی باز کہاں ہے

اعجاز غزل میں ہے محبت کا تصرف

یہ ذہن رسا کامرے اعجاز کہاں ہے

جناب عبداللہ بٹ ایڈیٹر کرسینٹ

# یہ لاہور ہے

خطہ لاہور یعنی جنت ہندوستان

قل اس سے کہ پیشتر لاہور یا لاہور والوں کے متعلق کچھ لکھا جاتے ہیں من تمام حضرات سے جنکا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ طور سے ہے یا ہونے کی توقع ہے۔ معافی کا خواہشگار ہوں۔ اور جو کچھ خوش قسمتی سے خود بھی اسی شہر کا باشندہ ہوں اس لئے اس مقالے کے پڑھنے کے بعد ہر قسم کی بھی بے نیامی اور وحلی و حلائی کا لیسار اسپرمل بینک لاہور میں یا قائم الخدوت کے نام بذریعہ مئی آرڈر ارسال کی جائیں

یوں تو لاہور کی جمہوریت پر مثال اور جواب ہے۔ مگر یہاں کی سرگرمی اپنی نفاست اور صفائی کے اعتبار سے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آج جب کہ تمام دنیا اقتصادی بد حالی کا رونا رو رہی ہے۔ اور بیکاری اور بھوک کے مسائل کو حل کرنے کیلئے بڑے بڑے بل بنادیے ہیں تاکہ تمام بیکار خصوصاً بیکار رجیویشن بلوں میں آسانی سے گھس سکیں دگر رجیویشن ہونے والے اصحاب تیار رہیں ہمارے لاہور کے اور انڈیش اور عام فہم دماغوں نے میونسپل کمیٹی معطل کرنے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ سڑکوں کی حالت بدستور رہے اور انہی نفاست میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ اگرچہ بادی النظر میں میونسپل کمیٹی کا تعطل بہت ہی برا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جسم نہایت ہی گستاخی سے عرض کریں گے کہ اس میں بھی ایک مسلم انسانکتہ پوشیدہ ہے۔ جسے شاید ادارہ رسالہ کے سوا اور کوئی شخص نہ سمجھے۔ اس چیز سے شاید کوئی بھی اختلاف نہیں کر سکتا کہ شہر میں کھانا ہضم کرنے کیلئے چورن، چٹنی، چائے یا مصالحے معالجہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ امر بھی واضح ہے کہ ان چیزوں کے لئے حضرت مدظلہ علیہ السلام کی موجودگی لازمی ہے مگر موجود

جسکی ترقی سے ہے خاک کا کپ پنجاہ سال اقتصادی بد حالی کے ہوتے ہوئے ہر شخص ان چیزوں کو حاصل نہیں کر سکتا تھا بد قسمتی کی شکایت برحق تھی۔ اور لاہور کی صحت عامہ غریب سے غریب نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ اس حالات میں ہمارے دو مان حکمرانوں نے نہایت ہی کم خرچ اور بالائین طریقہ ایجاد کیا۔ اب آپ حضرات نہایت ہی آسانی سے برکت ضرورت کے لیے ٹیشن سے سب سے ایک آدھ خرچ کر کے بجائی وہ دوازہ تک ایک عدد ٹانگہ میں تین دیگر ممبر ایسوں کے ساتھ سفر کریں انشاء اللہ کم از کم شاہ عالی گیٹ اور زیادہ سے زیادہ لاہری گیٹ تک سب کچھ باہر آجائے گا۔ اور آپ کو اس قدر بھوک لگے گی کہ وہیں کسی بوٹی پر کھانے کو جی چاہے گا۔ اور اگر آپ بد قسمتی کے دائمی مریض ہیں تو ذرا بجائی گیٹ تک جو آئے۔ طبیعت بالکل صاف ہو جائے گی۔ اس وجہ سے لاہور کی سڑکوں کو ہا فم سڑکوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہاں اگر آپ جو کے ہوں تو پھر آپ کی پسلیوں کی خیر نہیں۔

لہذا باہر سے آنے والوں کو بذریعہ اشتہار ہذا مطلع کیا جاتا ہے کہ ریڈے سٹیشن سے سوار ہوتے وقت میڈی ہسپتال میں اطلاع کریں کہ میں فلاں ابن فلاں ٹانگہ نمبر فلاں پر سوار ہو کر لٹا کر چلنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس لئے تمہیں ہوں کہ ایک عدد ایمبولنس کد جائے وقوعہ پر بھیج دیا جائے شکر گزار ہوگی۔ اگر آپ کو خدا تعالیٰ سے سائیکل پر جانا ہو تو برائے ہیرانی فرما کر یہ اس کے پڑھنے سے بہتر کا بھلا ہوگا۔ کا اچھی طرح مطالعہ کر لیجئے۔ اور ان کے دفتر کا پتہ اپنی پاکٹ بک پر نوٹ کر لیں تاکہ بعد میں شکایت کا موقع پیدا نہ ہو سکے۔ ہاں اگر آپ کے پاس جا پانی سائیکل ہو تو شاید اس



ہے تو یہ جنت مگر انسان بتے ہیں یہاں  
خدا کے نکلے ہوئے ارمان بتے ہیں یہاں

صورت و معنی ہم مجھو نیا زودنا نہیں  
حسن کے پہلو بہ پہلو عشق کے انداز میں  
اگر آپ کو دہائی دیکھنے کی تو لیں ارمانی ہوئی تو آپ ان اشک  
کی حقیقت سے بخوبی واقف ہو سکتے ہیں اس سلسلہ میں ایک تازہ  
آئہ یاد آگیا۔ صفیر صاحب کے کمرے میں یار دوست موجود تھے  
اور احباب کی محفل گرم تھی کسی دل جلے نے دیوالی دیکھنے کی تجویز  
دینے کی جو تقریباً اتفاق رائے پاس ہوئی جو بدری دین محمد سابق  
بڑی کاٹک علامہ بوست علی دھانی نے اسے کوٹھالی کمان تسلیم  
لیا گیا اور یہ مختصر سا قلمچہ بدری صاحب کی کمان میں انارکلی کی  
کلیفٹ ڈس راج کرتا ہوا رازہ ہوا۔ ہم نظارہ حسن میں اس قدر مجھو  
تھے کہ ٹھوڑی دودھ جا کر چوہدری صاحب ہم سے جدا ہو گئے۔ ہم سمجھے  
کہ شاید شہید ہو گئے۔ نیا نیک اپنے ساتھی کی شہادت پر حسرتی  
آہ بجاوا اور بھی بھڑک اٹھی اور ہم لوگ پہلے سے زیادہ دوتا  
تھو کیے ساتھ اس جنگ میں جھٹھ لینے لگے۔ راکم الحوت کا یہ  
جلاوطن تھا۔ اس لئے اگر بول چوڑ جان بھی جاتی تو تعجب کا مقام  
نہ تھا۔ صفیر صاحب دیوانہ و فر پکار رہے تھے کہ اے خدا میں گدا  
ہونا اور آج بھیک مانگنا، ابھی ان کا فوہ پھانہ ہوا تھا کہ کسٹر  
خارج الدین خالد بول اٹھے بدکاش میں اس موٹر کار کا ڈرائیور جوتا  
خدا خدا کر کے تکشی جوتا ک پیچے۔ یہاں ایک نئی دنیا آباو پانی جہاں  
نہاں ہائمنوں میں ملتا ہے بلاتفریق مذہب و ملت موجود تھے۔ ہم واپس  
کے پہرے میں حسن کی تہے نیا زبان اور عشق کی در ماندگیاں دیکھ  
کہ دل ہی دل میں جل رہے تھے اور ملک انور تو علی الاعلان کہہ رہے  
تھے کہ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے کہ ہمارے خالص پرائیویٹ معاملہ  
میں بھی سرخ چڑیاں خانی ہیں۔ قبضہ دفعائے کاز نے یہیں بھی  
ستہ گریہ کا خالص کاٹریس نڈر استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن یہ  
تجویز کسی نہ کسی وجہ سے عملی جامہ نہ پہن سکی اور ہم نہایت ہی مجبوری  
کی حالت میں دیوانہ جوش دل پس آئے۔ بعض ساتھی تو بوسٹل

پنچے سے پہلے ہی دیوالی کی نڈھ ہو چکے تھے۔ واقعی  
حسن پھرتا ہے یہاں اٹھیلیاں کرتا ہوا۔

سادگی کو تہے حجابی پر عیاں کرتا ہوا  
عشق ہر شہ اس تماشا گاہ میں آوارہ ہے  
وہم خوردہ ہے بہت آئندہ ہی چاہے ہے  
اک طرف قاتل نگاہیں تیر بر سائی ہوئی  
اک طرف بھڑا آہیں دلوں کو کھٹکتی ہوئی  
یہ وہ میخانہ ہے جس میں ساتیان نے فرشتے  
چر رہے ہیں ہر طرف سانپوں کی پیادہ

بہ آفات ہلاک سیفیاں ڈرھتے ہوئے  
جلوہ آراہی یہاں کیفیتیں پیچاب کی:  
سینہ فولا میں خاصیتیں سیباب کی

لاہور والوں کو خدا سلامت رکھے۔ بچارے بہت زندہ دل خلق  
ہوئے ہیں۔ یہاں کے جلسے اور جلوس خاص طور پر مشہور ہیں۔ ذرا  
درا سی باتوں پر عظیم الشان اور عقیدہ المثل جلسے منعقد ہو جاتے  
ہیں جو بھی کسی لیدر کی سیم صاحبہ ناراض ہوئیں۔ فوراً انہوں نے  
مبلغ ایک ہجرت کر کے اپنی بیگم صاحبہ کے پر ملاقات عدم اعتماد  
کا ریزولیوشن باتفاق رائے منظور کر کے بھگت بیگم صاحبہ بھیج دیا  
اور قرار پایا کہ اس کی نقول جناب گورنر صاحب بہادر اور اجازت  
کو ارسال کی جائیں۔ یہاں کی پبلک کچ اس قسم کی عجیب و غریب بات  
ہے کہ ہم ہم اور میرا سے بچنے سے قاصر ہیں۔ لاہور کو تو کچوں کا گھر ہے  
ہر قسم کی تحریک کی ابتدا اس مبارک شہر سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر عالم  
اٹھے تو انہوں نے نمک بنانا شروع کر دیا۔ احرار نے ٹکٹیر جیل کھول  
چلو کی تحریک چلائی۔ منظر یہ پردہ اولا، اولا، بالآخر مولانا غلام  
صاحب نے شہید گنج شروع کی۔ لیکن آئری ہے لاہور کے لوگوں  
پر کہ انہوں نے کسی کی دل شکنی مناسب نہ سمجھی۔ سب کا ساتھ دیا،  
قومی فوے بھی لگائے۔ اللہ اکبر کے فلک شکاٹ غنوں سے موجی  
دورانے کے بارخ کی گھاس اٹھا کر اسے پیرسٹ بنا دیا۔ اور مجلس احمد

انہی کثرت کا یہ عالم ہے کہ حکومت کو دس دس پندرہ پندرہ درخواستیں گزارنے کے بعد کہ ہم فلاں نام کا اخبار یا رسالہ جاری کرنا چاہتے ہیں۔ ہر درخواست اس رہارک کے ساتھ پیش جاتی کہ اس نام کے اخبار یا رسالہ کیلئے پہلے کسی صاحب لے جائزت حاصل کر رکھی ہے۔ لہذا آپ کوئی نیا نام تجویز کریں۔ اگر لاہور کے کسی اخبار میں جلی حروف میں چار چار کالمی سرخی کے ساتھ اس قسم کی خبر دکھائی دے۔

اسلامیان لاہور کا عقیدہ المثل اجتماع ایک لاکھ فرزندان توحید کا شائیں مارتا ہوا سند، حضرت مولانا کی بصیرت غریب و غریب آموزہ تقریر۔

تو سمجھ لیجئے کہ جلسہ میں پانسو سے زائد انسان نہ ہونگے۔ اور پانسو میں پولیس اور سی آئی ڈی کو نکال دیا جائے۔ تو شاید تعداد ساٹھ تین سو سے بڑھنے نہ پائے۔ ہاں اگر آپ بھی بائی جانس اس جلسہ میں شامل ہوتے ہوں تو مندرجہ بالا خبر پڑھ کر شبہ ہوگا کہ شاید کسی اور جلسہ کی کارروائی ہے۔ ہاں اگر جلسہ کسی ایسی جماعت کی طرف سے ہوا ہے جو آپ کے سیاسی عقاید سے اختلاف رکھتی ہے تو اس حالت میں بیسی پسی ہزار کے مجمع کو بیک جنبش قلم اس غریب حال دنیا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

احادیث کی ناکامی اور امرای کا ایک بین ثبوت لاہور کے غیر مسلمانوں نے تقریر سننے سے انکار کر دیا۔ حاضرین کی تعداد سو سے کم۔ جن میں اکثریت متاثریوں کی تھی۔

لاہور کے پریس کی حالت یہاں کے لوگوں سے بھی زیادہ قابلِ مہم ہے۔ اب ذرا لاہور کی ہندو ترین مخلوق میں کالجیٹ لوگوں کا حال بھی سن لیجئے۔ فرسٹ ایر میں داخل ہوتے ہی انہی زبان پر ہر پریم کا محبوبا بھلا دے کوئی؟ اہمیراجیوں پریم کہانی، وغیرہ وغیرہ جاری ہو جاتا ہے۔ چاہے پریم کے معنوں سے وہ خود چھوڑ ان کے والد ماجد بھی نا آشنا ہوں۔ کالجیٹ میں داخل ہوتے ہی پریم کی نیا تہل میں چلنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ لوگ اگر کسی کو لادس باغ میں سیر کرتے ہوئے دیکھ پائیں یا کوئی قسمت کا مارا یا قسمت کی ماری۔

زندہ باد کے نعروں سے محشر ہا کر دیا۔ ہزار ہا انسان قید ہوئے اس کے باوجود آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس تمام کٹکٹ میں لاہوری قیدی کی تعداد آلے میں نمک سے بھی کچھ کم ہی ہوگی۔ زندہ باد اور وہاں ان لوگوں کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والے تمام لوگ یہی ہونگے۔ اعتراض کرنے میں سب سے پہلے لیڈروں کے گلے میں ہار ڈالنے میں پیش پیش۔ اس پر طویہ کہ ان کی غلطی اچھانے میں بھی سبقت لینے والے یہی غرض کہ ہر بات میں اَلْمُسْلِمُونَ اَلْاَدْلُونَ ایک جلسہ میں مولانا غفر علی خاں آئیں تو احرار کے خلاف ریزولوشن پاس ہو جائے۔ اور دوسرے دن اسی جگہ اسی سبک جلسہ میں اگر چہ دہری افضل حق آجائیں تو مولانا غفر علی کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ حاصل کر لیں، اور تیسرے دن واکٹر عالم آئیں تو اتحاد ملت اور احرار دونوں کو متروک باؤکر جانیر ایکشن ہو مولانا غفر علی، اللہ شاہ بخاری کی تقریر سننے کیلئے گئے۔ ہزار ہا کا مجمع لاؤ سپیکر کا تسلی بخش انتظام اور لوگ شاہ صاحب کی تقریر کے لئے بے چین۔

خدا خدا کر کے شاہ صاحب سیٹج پر تشریف لائے۔ اور جناب صدر اور لاہور کے تماشائی دوستوں کو کرسی پر بیٹھ گئے۔ ہم حیران تھے یا الہی کیا ماجرا ہے۔ ہم نے سن رکھا تھا کہ شاہ صاحب گفتگو نہیں کریں اور ان کی تقریر میں اس قدر محرم تاہے کہ کوئی شخص جلسہ گاہ سے اٹھنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ جب ہم نے اس مختصر سے فقرے کے بعد تقریر کو ختم ہونے دیکھا۔ تو کچھ دیر تک دھوا دھر کے ٹوٹاٹوٹ خیالات نے دماغ پر چھاؤنی ڈالی۔ مگر جلد ہی ہم کو معلوم ہو گیا کہ حضرت امیر شریعت نے مختصر سے فقرے میں پورا لاہور بند کر دیا۔ جلسے اور جلسوں کے ساتھ ساتھ یہاں کے اخبارات اور رسائل بھی ملاحظہ کرتے جائے۔ اگر لاہور کو اخبارات اور رسائل کا عجائب گھر کہا جائے تو بالکل بجا ہوگا۔ کیونکہ یہاں ہر قسم کے اخبارات پاکٹ سائز سے لیکر جانا سائز تک جھپا ہو سکتے ہیں، اور لطیف یہ ہے کہ ان کے نام بالکل مختلف اور جدا جدا ہیں۔ آپ ہر رنگ ہر قیمت، ہر ایسی اور ہر زبان کے اخبارات کا مطالعہ فرما سکتے ہیں

کو قہر بختہ آمینختہ ہرہ شربت وصل بخود نہ مگر ہیں خد شہ ہے یہ نفع  
اب مفید نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اب حقیقت کافی قریبی کر چکا ہے۔ لہذا  
اس چٹاخ چٹاخ بیماری کے صحیح علاج کے لئے ہمیں کوئی اور نسخہ  
تجویز کرنا پڑے گا۔ ہمیں امید ہے کہ اس معاملہ میں طبیہ کالج کوئی عملی  
اقدام کرے گا۔ ہاں تو کالج کے یہ بر خور اور جب ایف اے میں  
ہی تین چار سال تک بدستور چکے ہو تو کیا بے رہتے ہیں تو ان کا عشق  
فورا اپنا رخ بدلتا ہے۔ اور جگت تیا پریم ہی پریم کی جگہ پریم ہے سن  
کی مجلس اور پریم ہے سند روگ شروع ہو جاتا ہے۔ اور یہ لوگ  
بتلون و صلی کر کے چیتے اور جلاتے ہیں۔

اب میں نے جانا ہائے پریم کیا ہے:

اور آیتوں نسلوں کے لئے: جھوٹی دیکھی پریت جگت میں کی وصیت  
لکھ کر رخصت ہو گئے ہیں۔

سینا ضروریات زندگی میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں  
ہے کہ سینا جاننا والے اصحاب اپنے دل بھی وہیں بھینٹیں آئیں،  
مگر ہم نے اکثر ایسے دوست دیکھے ہیں جنہیں سینا کے بعد مورو دل  
کا عارضہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور کسی ماہر ڈاکٹر کی خدمات حاصل کئے  
بغیر نہیں بنتی، یہاں کے ڈاکٹر حکیم اور دیہی بھی کچھ اسی قسم کے لوگ  
ہیں۔ ہماری مراد ان حکیموں اور ڈاکٹروں سے ہے جو سرکوں پر  
ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر گھومتے ہوئے نہایت ہی بلند  
آواز سے

اے مسافر جانو اے دیکھ لے منہ پر کبر

ہم مسافر بھی کھڑے ہیں تیرا ستہ گھیر کر!

پڑتے ہوئے چند شعبہ سے دکھا کر نامردی سستی۔ یا آشک  
تو ناگ شروع کر دیتے ہیں ہس کے بعد اپنی دوائی کی تعریف کی  
انکو تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ اور وہ محض خلق خدا کے قاتل کے  
لئے صرف اپنی لاگت وصول کرتے ہیں۔ اگر آپ کو یہ طریقہ پسند نہ آئے  
تو کسی ایم بی بی ایس کے پاس چلے جائیے۔ آپ خواہ بچے چکے  
چلے پھرتے کھاتے پیے اور جیتے جاگتے ہی کیوں نہ ہوں ڈاکٹر جیتا  
آپ کے ادھر ادھر ٹیوب لگانے کے بعد فتویٰ صادر فرمائیں گے۔

کالج جاتے ہوئے، نکلے ہاتھ آجائے تو اس تبے چار سٹے یا تبے چاندنی  
کی غیر نہیں ہوتی، اس کی موٹر کا نمبر نوٹ کر لیا جاتا ہے۔ پہلے پہل قادیان  
سے یا مانڈی گانٹھے کیلئے سفارشات حاصل کجاتی ہیں۔ اور اگر سیو سیلٹی  
کا اس شدہ ماسٹر جو نوٹا نکلے دے کی پانچوں ٹکی میں اور سرکاری میں  
بہ لوگ س مانگے کا بھی نہیں چھوڑتے۔ جب تک کہ سوار کی کامکس  
غیر مشبہ معلوم نہ کر لیں۔ اس مانگہ کو گراہ پر لیا جاتا ہے اور باتوں  
ہی باتوں میں ایک سگریٹ میں کرتے ہوئے، سوکھت کی بارش  
شروع کر دیکھائی ہے۔ کہاں سے نادی ہے و کس محل سے ہلکا کافر  
کہا ہے والد کا نام؟ کوئی کلاس؟ وغیرہ وغیرہ جب شام کو یہ لوگ  
کالج بوسٹلوں میں آتے ہوتے، تجھ بن پریم مند ہے خالی، گاتے گاتے  
سو جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ واقعہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ لارنس سے راہی  
پر ہمارے ساتھیوں نے پانی پیا، اور ایک صاحب فرماتے تھے کہ  
میں تو ہر روز جانا پانی پیتا ہوں، اور وہ شخص اس لئے کہ شاید کسی  
نعشوں نے اس گلاس میں پانی پیا ہو۔ اور اس کے ہونٹ اسی جگہ  
لگے ہوں جہاں ہمارے ہونٹ اور اسی طرح معشوق کے غیبی  
جو غلوں پر اپنے ہونٹ پرست کر دیتا ہوں؟ ان گلاس بوسوں کا  
آکسو سکرم حیرن ہونے ہی والے تھے۔ کہ خواجہ احمد حسن صاحب نے  
بھیں اطلاع دی۔ کہ آج کل ٹیلیفون کے ذریعہ بوسہ بازی شروع  
ہو گئی ہے۔ خدا ہیں وہ دن نصیب نہ کرے۔ جب کہ ٹیلیفون کے  
ذریعے سب کچھ ہو جایا کرے، کیونکہ اب ہمارے کالجوں کے بہت  
سے لوگ شادی شدہ ہونے والے ہیں۔ انہیں تو خاص نگرانی ضرورت  
نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ہر وقت پرنسپل صاحب کا ٹیلیفون استعمال  
کر سکتے ہیں۔ جن لوگوں کے ہاں ٹیلیفون نہیں ہیں۔ ان کا کیا بے گلا  
حوالہ انقلاب نے کچھ عرصہ پہلے عشق کا نسخہ تجویز کرتے ہوئے  
نکھاتھا۔

جوانا شانی

بوسہ لب

۵ عدد

دشام گرفتہ

ہو زدن

بوسہ رخسار

۳ عدد



فیغ ہو جائیں گی۔ اور ایک بیوی سے ہی آپ کو محبت ہوگی۔ آپ کی عمر کسی صورت میں نوٹے سال سے کم نہیں ہے۔ اور آپ کو مغرب کی طرف سفر فرود پڑے گا۔ آپ کے ہاں اولاد بکثرت ہوگی۔ مگر دولت آپ زیادہ سنبھال کر نہیں رکھیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

المختصر لاہور کا ذرہ ذرہ اپنے اہل دل و دلہن کا سامان لئے ہوئے ہے لیکن اسے دیکھنے کے مشرکیناب کی آنکھوں کی ضرورت ہے۔ لاہور کے متعلق.... کہاں تک لکھا جائے۔

آب و گل میں زندگی بنگامہ آرا ہے یہاں

موت بھی چاہے تو جینے کا سہارا ہے یہاں

کہ آپ کے گرد سے خراب ہیں مگر اس پر غریب قسلی کی ضرورت ہو، تو ایک اور صاحب کے پاس چلے جائیے۔ ان کے نزدیک آپ کے پھیرنے کا کام ہی نہیں کرتے۔ وہ بھر تو بالکل خراب ہو چکا ہے غرض کہ پانچ دس سینکڑوں کے ہاں سے واپس آئیے۔ تو مگر بیچ کر دیا نہیں محسوس ہونے لگا۔ کہ شاید مجھے کوئی بیماری ہے۔ آپ کو لاہور کی مڑک پر بخوبی کمی بکثرت مل جائیں گے۔ آپ کی جمیلی پر پانچ پیسہ دیکھ لیجئے اور اپنی آئندہ زندگی کی مکمل داستان پوچھ لیجئے۔ وہ آپ کے بچوں سے شروع ہوئی تھی۔ جب کہ آپ ایک خطرناک بیماری سے پیش کیے تھے۔ اس کے بعد آپ کی تین شادیاں ہوں گی۔ جن میں سے دو دشمنی کے بعد ہی

جناب عبداللطیف پٹن ایم اے

## غزل

ضبط فریاد سے ہنگامہ محشر ہی ہسی جنبش ساز تو ہے نعمت مضطرب ہی ہسی  
مدتوں دیکھی ہے آئینہ دل میں صورت پھر بھی تپھر اسے کہتے ہو تو تپھر ہی ہسی  
ہے مجھے رنگ پریدہ کا تماشا منظور کوئی بے پردہ نہ ہو پردے کے اند ہی ہسی  
حضرت شیخ بہکنے کے مگر کیا معنی میکدہ مانا کہ مسجد کے برابر ہی ہسی  
تشنہ رنگ ہے ہر بھول کی تپتی تپتی ذرہ ذرہ چین و بے کا سا غریب ہی ہسی  
کسی صورت تو ہوا فنا و محبت سے نجات کچھ نہیں تو میری تقدیر میں چٹہر ہی ہسی

مٹ گیا شکوہ و سوزی اجاب تپش

آپ ٹھنڈے تو ہوئے آگ لگا کر ہی ہسی

نوشہ دار شاہ ولی اللہ سیٹھ  
انگریزی مصنف

مترجمہ: جناب گل دہانیوی بی بی

# مسئلہ موت و حیات

تبرکے سرہانے ایک کتبہ بھی نصب کر دیا جاتا ہے مروجہ کے اعتبار  
اللہ اعلم بالصواب کافی تعداد میں اپنی شکلوں کو اسکاکی طور پر خاک اور پر  
حسرت بناتے، جس جسم بے روح کو سپرد خاک کرنے کے لئے طے کیا  
ہے۔ ان سب ماپوس کن اور اذیت وہ جنگامی کارروائیوں کو نہ صرف  
پڑ رہہ شعراء کی توبت نیکو کا سہارا حاصل رہا ہے۔ بلکہ متعدد فلسفیوں  
نے بھی اپنی پوری مشق کو خرچ کر کے غریب انسان کو کچھ کم غلط فہمی  
میں مبتلا نہیں کیا ہے۔ وہ تو یوں کہتے کہ پکارے انسان کو اپنی زندگی  
کی گونا گوں مصروفیتوں میں پھنسے رہنے کے باعث ان شعراء کی ہر وہ  
سرائی اور ان فلسفیوں کی خشک مشق کی طریت توجہ کر کے کی ہیلت  
ہی نہیں ملتی۔ ورنہ ان لوگوں نے جو انسان کو ہر دم انسر و دھنسا طر  
غلیظ اور ناشاد و مضمحل بنادینے کی کوشش کی تھی، وہ اپنی تظہیر کب  
ہی ہے

ہر خند یہ حقیقت ہے کہ انسان کسی جنگامی اور حادثے سے اتنا  
خوفزدہ اور ہراساں نہیں ہوتا جتنا موت کے نام کو ہی سسگر  
ہو جاتا ہے۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ جنوبی امریکہ میں بہت سے ٹھیکو کہ کش  
نشاں کے پہلو میں بسے ہوئے ہیں اور وہاں کے باشندے ہر دھنسا  
خطرے شتہ برابر خوفزدہ ہوئے بغیر بالکل اسی بے فکری اور اطمینان  
کے ساتھ اپنے ضروری فرائض کو انجام دیتے رہتے ہیں۔ گو یاد رکھنا  
کے کسی سرسبز و شاداب ترین خطہ میں باغات کے لئے زمین کو تیار  
کر رہے ہوں۔ وہ لوگ موت کی آغوش میں ہر وقت رہتے ہوئے  
بھی اپنی پرکھت رنگینوں اور رنگ رلیوں کو کسی نہ کسی صورت سے  
قائم رکھتے ہیں۔ محتاط اور ڈروک انسان امریکہ کی اس شاندار  
زندگی پر حسد نہ دھتے تو اور کیا کرے؟ اور یہ سب سکون و اطمینان

اصحائے جہانی میں تبدیلیاں جہاں بیت ناک اور اٹل ہوتی  
ہیں وہاں اپنے نتائج اور اثرات کے لحاظ سے بھی استعد خف ناک اور  
ناپس کن ہوتی ہیں۔ کہ یہ بیوقوف دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا، موت  
کے مضبوط جھک سے بھلا نجات کہیں؟ فرشتہ موت بعض اوقات تو  
اپنے شکار کو بالکل اسی طرح آدھو چتا ہے جس طرح ایک ٹھک  
بالکل غیر متوقع طور پر کسی عین کے سر پر آجود ہو۔ اور کسی اس گوس  
کی زندگی کے قصہ کو سدا کرنے کے لئے برسوں محاصرہ بھی کرنا پڑتا ہے  
جب موت اپنا کام کر چکی ہے تو مروجہ کی ذات سے متعلقہ  
و البتہ زندہ کیوں میں جو ایک خاص قسم کا بیجان سا رہا ہو جاتا ہے و  
بھی کم ذرا فرسائیں ہوتا مروجہ کی ذات سے تعلق رکھنے والی ہر وہ  
سی لئے کا نظارہ مرنے کے بعد اس کے احباب و اعزاء کو کسی روحانی  
خلش میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ پر کچھ کم جانکاہ نہیں  
ہے۔ اور ذرا اس قسم طریق کو ملاحظہ فرمائیے۔ کہ موت ہمارے احباب  
اور اعزاء کو ہماری آنکھوں کے سامنے سے بالکل ہٹا نہیں لیتی، بلکہ  
انسانی جسم کا وہ منسک خیز و فناک اور ناقابل برداشت بیوی چھوڑ  
جاتی ہے کہ جب کو اپنے ہی اہل و عیال سے جلد سے جلد چھپانے کے سوا  
اور کوئی چارہ کار نظر ہی نہیں آتا۔ کسی کی موت واقع ہونے کے بعد  
منروح سے اخیر تک تجہیز و تکفین کی تمام رسوم اور پابندیوں سے  
اب چاہے وہ مصر کے عظیم الشان اور فلک پیمائندوں سے وابستہ  
ہوں اور یا نہ متوسط کے یورپ میں خونی مجرموں کی سزا ہو  
سے تعلق رکھتی ہوں۔ و البتہ ان کے دل و دماغ کو کیا کچھ اذیت نہیں  
پہونچتی؟ یہ بھی ظاہر ہے، عام طور سے صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک  
غریب اور محتاج ملک کی میت کو بھی تبرک پینچانے کیلئے کچھ نفوس  
ضرور جمع ہو جاتے ہیں۔ یادگار کے طور پر بعض اوقات مرنیوالے کی

کی باتیں اسوقت تک عمل میں آتی رہتی ہیں کہ جھوٹے باشندوں کے قدموں سے زمین کو آتش فشاں کی تیش کے باعث کاپتی سی رہتی ہے۔ کوہ آتش فشاں اپنی پوری خفیاکیوں کے ساتھ آگ اگلتا رہتا ہے۔ اور اس کا بہت قریبی مکان ہوتا ہے کہ خدا جانتا ہے اور کس وقت آتش فشاں کا آتشیں مادہ اس کے قریب بے ہوش ہونے پر جہازاً کے جسم کو رنی کے گائے کی طرح اڑا دے یعنی پہاڑ کے ارد گرد رہنے والی تمام آبادی کی رنگ رلیوں اور خوش نصیبوں کا پل بھر میں خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک دراندیش محتاط اور خود پرست کوہ آتش فشاں سے بہت کافی فاصلہ پر آخر کیونکر پیٹ بھر کر کھانا کھا سکے گا۔ چہ جائیکہ وہ رنگ رلیاں منائے۔ جب نازک مزاج نواب موت کے مکان سے اس قدر قریب رہنا کہاں گوارا کر سکتا ہے اس کے نزدیک ایسے خطرناک مقام پر بے ناشی خدات لڑنے کے برابر ہے اسکی دانست میں تو ایسا مقام صرف سنیا سیوں اور درویشوں کے لئے یا پھر شیطان کامل اور ہمہ دم شراب میں مشغول رہنے والوں کے کیلئے ہی مناسب ہو سکتا ہے۔

خود غرض کرنے کی تھوڑی سی تکلیف اس بات کو معاف کر دے گی کہ جنوبی امریکہ میں کوہ آتش فشاں کے قریب بسنے والوں کی موت کی طرح سے بے پروائی تو حقیقی صورت حالات کا ایک ہی سافونہ ہے۔ ورنہ اس دنیا کی زمین پر بسنے والی انسانی آبادی کے موت کی طرف سے تحائف کا اندازہ لگانا تو میرٹ محال ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے یہ دنیا کی زمین کا آتشیں گولہ جو ہزاروں مختلف سمتوں میں چلتی دالے اجسام فلکی کے ساتھ نہایت تیزی سے دور بھر بہت ہی تنگ جگہ میں جکڑ لگا رہا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کب اور کسوقت وہ کٹنی سیک سے ٹکرا جائے۔ اور کائنات ارضی و سماوی کو الٹ پلٹ کر رکھ دے طبی نقطہ نظر سے ہمارے جسم کی بھی ایک آتش بازی کے پٹارے سے زیادہ حقیقت نہیں ہے جس طرح کسی جہاز کا بارود اس کیلئے بیکار ہو کر تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے بالکل اسی طرح ہمارے جسم کا چھوٹے سے چھوٹا عضو ہمارے جسم کی پوری مشین کو معلوم

وقت تک کیلئے بیکار کر سکتا ہے۔ اسی بنا پر ہر سائنس جو ہم جانتے ہیں اور خوراک کا ہر ذرہ جو ہم منہ میں ڈالتے ہیں ہمارے لئے خطرات کا پتہ بن سکتے ہیں۔ پس واضح ہوا کہ اگر ہم فلسفیوں اور محققین کی ان خیالی اور فنی توفیوں پر اعتماد کریں تو دنیا میں ہماری زندگی دو بھر جو جانے لڑائی کے میدان میں مرنے والی پوری آواز سے شور مچانا ہو گا۔ لیکن اس کی آواز پر لبتیک کہنے والا کوئی نہ ملے گا۔ اور اس طرح **حکایت کا حیدر** کبھی گرم ہی نہ ہوگا۔ جہاز کے مستول پر نیا جہنم ہوا میں خوب زور سے ہراتا رہے گا۔ لیکن کیا محال کہ کوئی مدد ہونے والے جہاز میں قدم رکھ دے ذرا غور کیجئے گا کہ اگر غریب انسان ان خشک فلسفیوں اور محققین کے اعتقادات کی کوراد پرستش کرتا تو آج لفظ کمانوں سے دسترخوان کو آخر کون نوازتا۔ جو تاریخ کے کسی اہم سے اہم میدان جنگ کی تباہ فاکیں سے ہرگز کم نہیں ہوتا۔ تجربہ اور حقیقت شاہد ہے کہ ہمارے بزرگوں کی بہت بڑی تعداد جہنمی کا شکار ہوئی ہے۔ اور پھر تو اس کی بھی امکان تھا کہ صنعت نازک شادی کی طرح ہی راضی نہ ہوئی۔ ایک خاص اور مقررہ وقت کے بعد ہم ہر قدم جو زندگی کی منزل میں رکھتے ہیں خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ ایک شخص جو زندگی کی شتر منزل طے کر چکا ہو۔ اسکا زندہ رہنا اجماع نہیں تو اور کیا ہے؟ جب ایسا ضعیف شخص اپنی ڈیوں کے دھانچے کو لٹیر رات کو بستر پر سوتا ہے۔ تو یہ شبہ یقیناً بے بنیاد نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ضعیف صبح کی روشنی کو بھی اپنی مادی آنکھوں سے دیکھ سکے گا یا نہیں لیکن کیا ان سب امکانات کے باوجود ایک ضعیف شخص موت کو زندہ بھی خاطر میں لاتا ہے؟ اس ضعیف کی موت سے پہلے پانی کا اندازہ دنا اس سے لگائیے کہ وہ کس قدر ہشاش پشاش رہتا ہے۔ رات کے وقت حسب معمول شراب کا جام بھی خالی کرتا ہے۔ اور پوزی دیکھی کیساتھ وہ دوسروں کو اپنی زندگی پیش آنیوالے واقعات بھی نہایت طور سے سناتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے بھروسوں کو بلکہ اپنے سے بہت زیادہ کم عمر لوگوں کو مارتے ہوئے بھی دیکھتا ہے۔ لیکن کیا محال کہ اس کی ہمیں پر ایک شکن بھی چڑ جائے اور اسکے چہرے پر ذرا خوف و ہراس کے آثار پائے جاتیں۔ اور یہ موت کی طرح سے کال بے پروائی مانس

وقت میں سی آتی ہے۔ جب کہ ایک ہلکا سا ہوا کا جھونکا بھی اسکی زندگی کا اسی طرح خاتمہ کر سکتا ہے۔ جس طرح وہ ایک چراغ کی دھواں بجھائے اس کا میاب ہو سکتا ہے۔ اور یا ایک ذرا سی ٹھوکر اس کے جسم کو اسی طرح چمکا کر کر سکتی ہے جس طرح وہ شیشے کے کسی طوط کو پاش پاش کر سکتی ہے۔ اگر ہم موت اور مرگ خطرہ کو ہی پیش نظر رکھیں تو ہم کے ایک وطن پرست نوجوان کو غصے کا اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کرنا بھی بالکل دینی حقیقت نہ لگتا ہے جو ایک نوٹ سن کر ضعیف و ناتواں کا سوتے وقت کیڑے بدلتا۔

ایک دیاسانی جلی اور جل کر ختم ہو گئی۔ جس میں ہمارا عرصہ جنتا ہے۔ ابھی شراب کی بوتل کا لنگ ہی کھولا ہے۔ لیکن اتنی لمبی توقع اور امید نہیں کہ موت ہم کو اس کے پینے کی بھی مہامت دے۔ یہ سب کچھ ہمیں محتاط اور گوشہ نشین بنانے کے لئے بہت کافی ہے۔ لیکن کیا باوجود ان عبرت سامانیوں کے انسان موت سے ڈرتا ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ زندگی سے محبت اور موت کا خوف۔ یہ دو لگتھیں اس قدر پیچیدہ ہیں کہ انسان جتنا انکو سمجھتا ہے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اتنی ہی یہ اسکی فہم و عقل سے مالا ہوتی جاتی ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ ہم لوگ موت سے متعلق فلسفوں کی فنی اور منطقی تعریفوں کے مطالعہ سے اپنی عقل و فہم کو بہت گرو کر لیتے ہیں۔ کسی شخص کا مطالعہ اور مشاہدہ اس بات کی کافی دلیل نہیں ہے کہ وہ موت کا صحیح مفہوم سمجھ سکا ہے۔ اور زندگی کے متعلق کوئی صحیح ماننے بھی قائم کر سکا ہے۔ طبعیات و فلسفہ کے لکھنے والے اور دانشور جین ٹیک کا ادبی مواد اس موضوع پر ہمیں تو محض ایک کڑوا شش ہی ہی نظر آتی ہے۔ ہمارے محترم شعرا نے بھی اپنی تخیل کی انتہائی باتیں کہیں سے کام لیکر یہ سمجھا نا چاہا ہے کہ زندگی محض بھپ سی کوئی شے ہے اور اسکی مراد سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں۔ اور وہ اسی صفت اور لفظ سے تعلق رکھتی ہے کہ جس سے خواب جیسی بے حقیقت چیز کی تخلیق ہوتی ہے۔ اتنی وضاحت کے بعد میں یہ کہنے کیلئے تیار ہوں کہ ہم نے لفظ

زندگی کو سمجھانے کے لئے اس کے ساتھ سیکیڑوں طریقوں اور پہلوؤں سے مکمل کیا ہے۔ حتیٰ کہ ہماری طاقت میں جواب تک دیا گیا۔ .. اصل میں غم اور مسرت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اور اسی کا نام زندگی ہے۔ دنیا میں انسان کی زندگی کے نام محدود ہیں۔ اور ان چند نام میں اس کے فرائض کی فہرست بڑی طویل ہے۔ اگر وہ اسباب مختصر عرصہ حیات تازہ و عیون اور اپنی ذاتی حفاظت میں ہی گزار دے۔ تو کی فرائض کی انجام دہی میں یہ کوتاہی نہ ہوگی؟ یہی وہ نقطہ ہے کہ جس کے تحت میں انسان ایک نیک کے لئے بھی اپنی جان کو فخر و ہونہ ڈالتا۔ اور اگر لیتا ہے۔ جہاں تک زندگی سے محبت کرنے کا اور زندہ رہنے کی متنا کا تعلق ہے۔ تو وہ جس صورت سے ایک بہت ہی محتاط اور دور اندیش شخص میں پائی جاتی ہے۔ بالکل سادہ اور اپنا اپنی چار کی چوٹی پر دستی کے ذریعہ چمکنے والے مزدور کے ہاں اور سپاہی کے تلب میں بھی موجزن ہوتی ہے۔

اس سہلے کے روشن اور تازہ ایک دونوں پہلو معزز قارئین کے لئے پیش کئے جا چکے ہیں۔ جہاں مذہبی پڑتو ایمان علم نے زندگی کی تشریح کو بہت درجہ برہنہ کاری اور احتیاط کے ساتھ طے کرنے کے لئے تیار کی ہیں وہاں نہایت بہت پرکشش لوگوں نے اپنی جولانیوں اور رنگ دلیوں کے لئے اس سہلے حیات کو بہت مختصر ہی قرار دیا ہے۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کی دلچسپیوں اور دلچسپیوں میں کچھ اس طور سے گھرے رہتے ہیں کہ موت کا خیال بھی اپنے ذہن میں لانا باعثِ حماقت سمجھتے ہیں۔ ہم زندگی کے اس مختصر زمانے کو ہرگز کسی اعتدال اور احتیاط کے ساتھ گزارنا گوارا نہیں کرتے بلکہ کامل عیش و نشاط اور بے انتہا بے پروائی ہمارا طریق تعین جاتا ہے۔ ایسی صورت میں غریب انسان پر الزام رکھنا انصاف کا خون کرنا نہیں ہے تو اور کیا ہے جب ایسے ایک پل کے لئے بھی اپنی زندگی کا یقین نہیں تو آخر وہ ان لمحات کو کیوں نہ مسرت و شادمانی اور کامل بے تکوری سے گزار دے؟

ہم سب احساسات و تصورات کی قدیم قدر اسکاں تو ضرور کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم صرف احساسات و تصورات پر ہی اپنی زندگی بنیاد سمجھ لیں، تو اسکے لئے تو بس وہی وقت موزوں ہو سکتا ہے کہ جب ہمارے سروں کے بال نہ صرف گر گئے ہوں، بلکہ ضعیفی اور کمزوری کی وجہ سے ہمارا سربالوں کے بار کو برداشت بھی نہ کر سکتا ہو اور ساتھ ہی ہماری عقل و فہم میں بھی نقص واقع ہو گیا ہو۔ اس زندگی کو کسی نے جہاں ایک تاریک غار سے تشبیہ دی ہے وہاں کسی نے اسکو ایک مدرسہ بھی قرار دیا ہے۔ جہاں مرنے کے بعد شروع ہونے والی حقیقی زندگی کے لئے تیاریاں کرنی پڑتی ہیں۔ اور بہت سے تو نہ صرف موت کے بعد شروع ہونے والی زندگی، بلکہ مذہب اور خدا کے وجود کے بھی قائل نہیں۔ ایسے لوگ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر سب کچھ ڈھکوسلہ ہے اور اس مذہب اور اس خدائی وجود کی کوئی اہمیت اور اصلیت نہیں، بعض کھاؤ پیو اور خوش رہو میں زندگی کے راز کو مغفیر پاتے ہیں۔ اور پھر بعض ایسے بھی ہیں جو کامل احتیاط، پرہیزگاری، عاقبت اندیشی اور نفس کشی میں زندگی کا مزہ پاتے ہیں لوگوں کی زندگی کے متعلق ان مختلف آراء سے اگر کوئی ممکن اور مناسب نتیجہ نکالا جاسکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ انسان کو بغیر موت سے ذرا سے زندگی کی تنگ و دو میں پوری یکسوئی اور زندہ دلی کے ساتھ جتنہ لینا چاہیے۔ اور پوری خوشنودی کے ساتھ اس کو اپنے فرائض منصبی ادا کرتے رہنا چاہئے۔ ڈاکٹر سیمونیل جاسن سے زیادہ کون موت کے نام سے ڈرتا ہوگا لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ باوجود خوف و ہراس کے وہ زندگی کے متعلق کیسے خوشگوار خیالات رکھتا تھا۔ اور اس نے زندگی اور زندہ دلی کا کیسا صحیح نمونہ پیش کیا ہے۔ ہر چند وہ ضعیفی میں قدم رکھ چکا تھا لیکن یہ نے پہاڑوں کے سفر سے چمبی جنت نہیں ہا۔ ی۔ ی۔ ی۔ انسانانی اوصاف میں جو درجہ بہت و جرات اور عقل کو حاصل ہے۔ وہ اظہر من الشمس ہے۔ اسی بنا پر ہماری عقل و فہم کا یہ تعاضل و چاہیو کہ ہم اپنی زندگی کے حالات کی اہمیت کا صحیح طور سے احساس کریں اور ہماری جرأت و بہمت کا بھی یہی نتیجہ نکلتا چاہئے کہ ہم فرض نہ

حق کے لئے ضمیر کی آواز پر لبیک کہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ زندگی بھی بس اسی کا نام ہے۔ اس دنیا کی زمین پر بننے کے لئے اسی انسان کو حق حاصل ہے کہ جو عزم و استقلال کا مالک ہو۔ مستقبل کے متعلق خیالی پلاؤ نہ بچاتا ہو۔ اور ماضی کی ناکامیوں کے احساس سے اپنے آپ کو ہر وقت مضمل اور بڑبڑو نہ رکھتا ہو۔ کچھ ایسا ہی شخص جہاں اپنی ذات خاص کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے وہاں ایک مخلص دوست اور محب وطن کہلانے جانے کا بھی دعویٰ کر سکتا ہے۔ ڈروک اور کمزور طبیعت کے انسان سے ہمدردی اور ایثار کے جذبات کی توقع رکھنا عین حماقت ہے۔ ایک محتاط اور گوشہ نشین شخص جو اپنی صحت و تندرستی کی حفاظت کو ہی بس اپنا ایمان سمجھتا ہو اس سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ دوسروں کی مشکلات اور مصیبتوں میں ہمدردی سے کام لے گا۔ جس دل و دماغ میں خود غرضی اور خود پرستی کا رونا ہوا۔ اس سے نیا فی اور نفاہ عالم کے کاموں کی انجام دہی کی توقع رکھنا کہاں تک مناسب ہے۔ ایسا تو پرست شخص ایک ایسی روحانی خلش میں مبتلا رہتا ہے۔ جس میں خوف و ہراس کا پہلو نمایاں طور سے نظر آتا ہے۔ وہ صرف اپنی ذات سے متعلق حفاظت کے خیال میں اس قدر محو رہنے لگتا ہے کہ دنیا کی زمین پر بننے والے اس کے ہم جنس کی آواز کو یا اس کے لئے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی۔ اور وہ اس قدر بے حس بھی ہو جاتا ہے کہ کسی کی مصیبت و راحت سے کوئی اثر لینا اس کے نزدیک کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ پرہیزگاری احتیاط ایک انسان کو یقیناً صحت دلی بنا دیتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ایک خود پرست شخص زندگی کسی کوئی مفید کام مطلق خدا کے لئے نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ ہر چیز کو بے انتہا شک و شبہ کے ساتھ دیکھنے کا عادی ہے۔ اس کے باطل برعکس وہ شخص جو مذہب یا مباح ہوتا ہے۔ وہ ہر حالت میں متاثر بھی ہوتا ہے۔ اللہ اپنی زندگی کو فرض نہ اور حق کی حمایت میں استعمال کرنے کا آرزو مند بھی نظر آتا ہے۔ وہ زندگی کو بالکل دوسری ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ حق کے لئے فرائض کی انجام دہی میں ہی اپنے ایمان کا راز سمجھتا ہے وہ حق

کی خاطر مشکلات اور دقتوں کے طوفان کو خاطر میں لانا، انسان کی فکر کے عین خلافت سمجھتا ہے۔ موت اس کے سر پر منڈلاتی رہتی ہے لیکن اس کے ذہن میں صرف ایک خیال ہوتا ہے۔ اور اس کے قلب میں ایک تمنا ہوتی ہے اور یہ دونوں صرف حق کی خاطر ذاب کی انجام دہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ ایک نذر اور بے بگ شخص کے احباب اور اعزاء اپنی جگہ پر تعجب کرتے ہیں اس کے اقدام کو غلامت مصلحت بھی سمجھاتے ہیں۔ بہت سے احمقا اور ڈرامہ نویس کے تحت میں اس کو سمجھاتے ہی ہیں۔ اور بعض اس کے سامنے اس کے اقدام سے متعلق مشکلات کا ذکر بھی کھوتے ہیں لیکن کیا وہ صاحب دل اور باہمت کہیں بڑھانے ہوئے قدم کو پیچھے ہٹا دیں گے؟ زندگی کے کچھ ایسے صبح نظریہ نے تیار دیکھیں گے۔ دیر یا نئے نیل کی مشہور تاریخی لڑائی میں تخت یا تختہ کے الفاظ ابا کرانے تھے۔ ذرا غور تو کیجئے کہ اگر زندگی اسکا نام نہیں ہے تو اور پھر کس کا ہے؟ یقیناً تیلین کے یہ الفاظ دوسروں میں زندگی کا صبح خوش پیدا کرنے کے لئے بہت کافی ہیں۔ ذرا غور تو فرمائیے کہ زندگی کا صبح مقصد کس حد تک ان الفاظ میں پوشیدہ ہے۔

کہا جا چکا ہے کہ موم و استقلال زندگی کا دوسرا نام ہے۔ عزم و استقلال کا ہی شاندار نتیجہ تھا کہ ڈاکٹر جانسن لغت صبی فقیم کتاب کو شروع کر کے ختم کر سکا۔ وہ نہ اگر وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے اندر کم جتنی پیدا ہوئے دیتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ دو پیسہ کا ایک کارڈ بھی لکھ کر ختم نہ کر سکتا۔

۱۔ متعدد طویل بحث کے بعد بھی موت اور حیات کے الفاظ اپنی جگہ پر جس طور سے شرمندہ معنی ہیں۔ وہ ایک حقیقت ہے۔ مجھے تو یہ سب کچھ ایک کمیل سا معلوم ہوتا ہے۔ ج..... ایک ان الفاظ کے ساتھ کیلا گیا چٹاں انصاف طلب ذہنوں سے اتنی توقع ضرور کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے لئے کوئی صبح ماسہ ضرور تلاش کر لیں گے۔ آپ ہی بتائیے کہ زندگی کی تمام مسرتوں اور دینیوں کو ترک کر کے کال احتیاط اور خود غرضی کی زندگی بسر کرنا

اگر زندہ دگر ہونا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ کیا آپ کو اس کے ماننے میں کچھ تاں ہے۔ کہ زندگی بغیر بلند حوصلگی اور زندہ دلی کے فی الحقیقت موت کا دوسرا نام ہے؟ ..... ہرگز ضروری نہیں کہ کسی کام کی تکمیل پر ہی کام کرنا اس کی عزت و منزلت کا انحصار ہو بلکہ اس کا اس کام کو پورے انتہائیک اور جوش سے شروع کر دینا ہی اس کے لئے یقیناً باعث فخر ہے۔ انسانی دنیا کبھی اس شخص کو فراموش کر دینے کی ہمت نہیں کر سکتی کہ جس نے خلق خدا کے لئے ایک مفید کام شروع کیا تھا لیکن عین اسوقت کہ جب وہ اپنے نگاہے ہوئے پودوں کے پھل کھاتا، اسے موت کے آہنی پنجہ نے آدبا یا۔ ایک انسان تو وہ ہے۔ جو زندگی کی مثال کو ملاحظہ و باکی ماند ملے کر رہا ہے۔ اور دوسرا وہ ہے۔ جو کچھ اور دلدل سے بھرے ہوئے تالے کے مانند قدم قدم پر احتیاط اور دور اندیشی سے کام لے رہا ہے۔ دو طرح کی زندگیاں آپ کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ان میں سے اول الذکر کو منتخب کرنا، آپ کی جرات و ہمت کی دلیل ہے میرا اعتقاد ہے کہ جب یونانیوں نے اس مسئلہ پر اپنا خیال ظاہر کیا تھا کہ دو جو خدا کو پیار سے ہوتے ہیں کم سنی ہی میں مرجاتے ہیں تو انہی نگاہوں میں ایک معروف کار شخص کی یکایک ختم ہو جانے کی زندگی بھی ضرور ہوگی میرا خیال ہے کہ انسان کتنی ہی عمر میں کیوں نہ مرے لیکن اگر وہ کسی بہتر و برتر فرض کی انجام دہی میں یکایک مر گیا ہے تو اس کی زاید عمر کی موت بھی عین شباب کی موت سے کسی طرح کم نہیں حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی دوڑ میں ایک بے نیاز اور زندہ دل شخص ہی کچھ مفید کام کر سکتا ہے۔ اور مرنے کے بعد بھی ایسے ہی شخص کی روح کو ابدی سکون حاصل ہونے کا امکان ہے۔ ایک سمار اپنے کام میں پورے انصاف سے مصروف ہے۔ اس کے آگاہی کے استعمال سے کان بڑی آواز نہیں سنائی دیتی، اور اسی دوران میں دو یکایک جاتا ہے۔ اسی طرح جنگ کا میدان گرم ہے اور بہادری سپاہی نہایت جو افروزی سے دشمن پر حملہ کر رہا ہے، بھل کی آواز کان کے پردے پھاڑ رہی ہے۔ اور اسی دوران میں بہادر سپاہی لڑائی میں کام لگ گیا ہے۔ کیا آپ بلند آواز سے یہ اعلان نہیں فرما سکتے کہ

ان دونوں کو حیاتِ ابدی حاصل ہوئی۔ اور دونوں نے اگلی خیریت کا  
 کیا۔۔۔ یقیناً زندگیِ زمیں کی انجام دہی میں جان کھودینے کا  
 نام ہے۔ ہوسناکیوں اور خود پسندیوں سے بھری ہوئی زندگی یقیناً  
 انسانیت کے نام پر ایک نہ نئے والا وصف ہے۔  
 یہ جہاں دارالعمل ہے چین دم بھر بھی نہ لے  
 دیکھتا ہے گرتے اپنی بہسار زندگی رسائی یونہی

جناب سید شریف حسین صاحب لاہور  
 گیدانی

## غزل

جوانی، محبت، محبت، جوانی ! انہیں دو پہ ہے منحصر زندگانی  
 محبت میں اک کیف ہے جاودانی ہر اک شے نظر آ رہی ہے سہانی  
 تری یاد سے ہے مرے دل کو فرقت تری دید سے ہے مری زندگانی  
 ہر اک شے میں جلوہ ترا دیکھتا ہوں یہ سب ہے مرے عشق کی کامرانی  
 محبت میں خون جگر پی رہا ہوں اسی میں ہے پوشیدہ کیفِ جوانی  
 بڑھا دے مرے دردِ دل کو بڑھا دے اسی درد میں ہے۔ مری زندگانی  
 مجھے خواب رنگیں نظر آ رہے ہیں جوانی کی راتیں ہیں۔ کتنی سہانی  
 لبوں پر تبسمِ جوانی ہے اُن کی مگر اشک آکھوں میں میری جوانی

اگر وہ مرے پاس آجائیں آنور

سناؤں انہیں دردِ دل کی کہانی

مترجمہ محترمہ انوری خانم نائب چیف  
تہذیبی

نوشتہ کٹر پیوگو  
فرانسیسی مصنف

# میرن ڈیلے

یہ رومانی ڈراما مشہور میں لکھا گیا، لیکن شہنشاہ چارلس دہم کے فرمان، قتل عامی کے تحت اسے اشاعت و تھیل کلائسنس دینے سے انکار کر دیا گیا۔ اس محسباً مذہن کیوجہ یہ تھی کہ کٹر پیوگو نے اس میں کوئی سبزو سحر کی اور وہوں حالت کی ہرست کتہ تصویر کشی کی تھی، اسی فرانسیسی تاجا کے عہد میں میرن ڈیلے اپنی شاندار یادگار زندگی کے صفت انہار پر تھی، تاجا دورا ہستہ نے اسے انقلاب کے بعد اسٹیج پر آیا، فن اسٹیج جس مسئلہ و کٹھنات کا ثبوت اسکی تصویر یاد آتا ہے اس نے سگو کی اس تراوش قلم کو جس، الکلام کا مقام دیدیا ہے، یہ فرانسیسی نوبلی ادب، محفل ڈاٹھا، ان میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے، وہ حقیقتاً ایک شاعر ہے، جسے ایک نادر قلم نازل روایت ہوا ہے، لیکن ادب اسٹیج اس کے جوہر شہری کی ایک آواز ہے جس کی کاسیابی نے ان میں امداد کے شان پیدا کر دی ہے۔ — زیر ذکر ڈرامے کا موجد پیرا یہ اصل فرانسیسی متن سے تیار کیا گیا ہے۔

## اشخاص ڈراما

نقیب شہر  
نکسا  
دو کارنگر  
سپاہی حکام  
عام لوگوں کا ایک جھوم

کاٹی ڈی گیس  
بریشا نتو  
لی ایجیلی رسخو  
روشبیرن  
نفیا

میرن ڈیلے  
دیدنیر  
شہنشاہ لوی سینروہم  
مارکوس ڈی سیونی  
مارکوس ڈی ٹنگی

## پہلا ایکٹ

منظر (تعبیر ہائے کی ایک سڑک، زمانہ ۱۷۳۵ء۔ کچھ افسر سواروں کے باہر کی نیم روشنی نیم تاریکی میں بیٹھے ہوئے ٹپ زنی، تباہ کو نوشی، ادھر ادھر زنی میں مشغول ہیں۔ ناگہاں وہ استاد ہو جاتے ہیں، اور کامی ڈی گیس کا استقبال کرتے ہیں،)

بریشا نتو:- آپ ہمارے میں غالباً جمنٹ میں داخل ہونے کے لئے آ رہے ہیں؟ ہم سب آپ سے اظہار تعزیت کرتے ہیں:-  
ہاں یہ فرما ہے پرس کی کیا خبر ہے؟

گیسی:- ڈیوین در قیامت مبارزت کا موقع پھر پیدا ہو گیا ہے  
کدو نیل ریشیلو پھر عالم جلال میں ہیں!  
کیسی:- اچھا تو اب ایک تازہ تازہ نو بہر خبر سنو: میرن ڈیلے  
کہیں رو پوش ہو گئی ہے: غور کیجئے اس واقعہ کی پراساوی



ادب لطیف لاہور

بریشا تھو۔ اچھا ہیں اس ناد صرع طرح پر گرہ لگا دینے دیجئے میرن  
یہاں موجود ہے:

گیسی: یہاں موجود ہے؟ بلائے میں؟ نہیں آپ خاق کو رہے ہیں  
میرن: وہ ہنسناں جمل اور اس کو روئے گہن: یہاں  
بریشا تھو: گزشتہ شب کا واقعہ ہے کہ سیورنی پر مجرموں کی ایک ٹولی  
نے حملہ کیا۔ وہ اسے مارے ہی ڈالتے کہ ایک شخص مروجہ  
بنکر ظاہر ہوا۔ اد اس نے حملہ آوروں کو مار بھاگایا، پھر وہ ہمارے  
دوست کو اک مکان کی پناہ گاہ میں لے آیا:

گیسی: ۱۔ لیکن میرن ڈیلا رہے؟  
بریشا تھو: یہ پناہ گاہ میرن ہی کا شانہ حسن تو تھی: .... سیورنی  
کی جان بچاؤ والا وہی نوجوان تھا۔ جس کو یہ جان من اپنی جان  
جان جانے ہوئے ہے:

روشبیرن: یہ کس قسم کا آدمی ہے؟  
بریشا تھو: یہ سیورنی سے پوچھئے

نقیب شہر: ایک متعاقب انبوہ عوام کی سرکردگی میں، فر: ن:  
جلالت الملک لوی میزدہم، انصاف اپنی شہنشاہ فرانس دوڑا  
بتحاطب جملہ اشخاص متعلقہ: مابعد دولت کا یہ فرمان ہے کہ: تہ  
سے تمام لوگ عام اس سے کہ وہ عوام ہوں یا امرائے عظام  
جو ذویولت لڑکر قانون شکنی کے مرتکب ہوئے پھر خواہ انہیں و  
ایک فریق جانبر ہو یا دونوں زندہ رہیں، وہ تختہ دار پر لٹکائیے  
جائیں گے تا آنکہ وہ قید حیات سے آزاد ہو جائیں! یہ ہے  
انجانب کا نشانہ ہمایونی:

گیسی: ہمیں لٹکا دیا جائے گا؟ ہم امرا کو: عوام کا انعام کی طرح!  
ڈاکوؤں اور چوروں کی طرح:

دشہر کے دو حکام سرکاری فرمان سلطانی کو ایک دیر چڑھایا  
کہتے ہیں، جس کے بعد نقیب شہر موجود عوام کے رخصت  
ہو جاتا ہے، ہرک تار یک: بے لگتی ہے۔ سیورنی منتر  
پر نمودار ہوتا ہے:

سیورنی: حسین میرن اپنا کاشانہ چھوڑ گئی: وہ طائرہ پرستان ہنا  
نفس دیران کر گئی: آہ: میں اسے کہاں پاؤں: سہ  
اس کی حسرت ہے جسے دل سے بھلائی سکوں  
دھونڈنے اس کو چلا ہوں جسے پا بھی نہ سکوں  
گیسی: کچھ یہ معلوم ہے کہ یہ آدمی کس رنگ و رنگ کا تھا؟

سیورنی: کچھ نہیں بتا سکتا: مکان میں داخل ہونے پر میں نے شیریں  
میرن کو پہچان لیا۔ اور اس سے رہاؤ من کھولی: لیکن قبل اس  
کے کہ میں شروں اور اس شخص کا شکریہ ادا کروں، جس نے مجھے  
زندگی بخشی تھی، اس نے شیخ گل کردی: میں سنا چھ پناہ: دیکھو  
کہ اس عظیم جمال میں نہیں شاید ایک حلقہ بیرون در ہوں: آہ  
جو کچھ مجھ محروم قسمت کا مفلسانہ علم اس بارے میں ہے، وہ بتا  
ہی ہے کہ تقدیر کے اس منظور نظر کا نام نامی دیدہ میر ہے:

روشبیرن: مجھے اس نام نامی سے بازاری دہنامی کی پڑائی ہے:  
خالبانیہ کوئی کم نسب آدمی ہے: اس حقیر لفظ نام کا شخص، اور  
میرن کو اڑا لے جائے؟ ع

پائے طاؤس نے خانہ مانی مانگے:

آہ میرن: وہ اللہ الجلال اور ایک ایسے حضرت کا کج حال: ایسی  
تاڑ آفریں اور عشق فؤاد اور ایسے کرکس کے ساتھ صرف ہر دان  
سیورنی: آہ روشبیرن: ممکن ہے ایسے لوگ موجود ہوں جو اس  
کے خاکسارانہ نام کے مقابلے میں، بڑے بلند بانگ اسکا  
گرمی و انقلاب سامی رکھتے ہوں، لیکن ناممکن ہے کہ اس کا  
دل و جگر رکھتے ہوں: ذرا غور کرو، میرن کی آغوش طلائی سے  
جست کرنا، اور ایک اجنبی شخص کی جان بچانے کے لئے چنا  
و عوش سے دست و گریباں ہو جانا: کتنی رستمان بات  
ہے: میں دیدہ شہر کا اتنا زبردست احسان ہوں کہ اپنے سارے خون  
سے بھی اس کا بدل نہیں کر سکتا: اے کاش کہ مجھ سے بیان  
دوستی باندھ لے:

دلی اینجیل، بادی سحر، ایک محرمی صورت کی مخلوق  
آتا ہے اور حلقہ اعمال میں بیٹھ جاتا ہے اس کے چہرے پر ایک



کی ساری سلوت و جبروت پر کاہ کی طرح اڑ جائے گی لیکن  
آہ یہ کاف تمکین۔ سب قریب سادہ دلی ہے: میری یہ  
فیصل کن، بے پناہ زبان خود اس کے ہاتھ میں ہے: ۱۰۰۰  
خاک بر سر کن عجم آیام: میرے مسخے آلود میرا غم فط کرع  
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے  
لی یحییٰ: میرے آقا! کیا خود قید حیات اور بندہ غم اصل میں دونوں  
ایک نہیں ہیں؟  
بادشاہ:۔۔۔ یقیناً ہیں!۔۔۔ اور آہ انسان کا یہ سارا وجود بھی یک  
سایہ سے زیادہ نہیں:

لی یحییٰ: ۱۔ اور حق آدم میں جس کا نام بادشاہ ہے وہ دراصل ایک  
تعلیٰ زندگی کی معراج کا دوسرا نام ہے  
بادشاہ:۔۔۔ شاہی سفر: مجھے کتنی آسودگی ہوتی ہے جب تو یہ کت  
بیان کرتا ہے: تو ظرافت اور حکمت کا جامع البحرین ہے اسے  
کاش کہ تیرے انہیں کلمات معرفت پر میں جان بقی ہو جاؤں  
تختہ زمین پر تو ہی ایک آدمی ایسا ہے جس کی گفتگو شائستہ سماعت  
ہے! مجھے تعجب ہے کہ اس حکمت و دانش پر تو متابع بہرست  
کو ٹھکرا کیوں نہیں دیتا اس دربار میں بھائی تیری کیا قدر و قدر  
ہے!۔۔۔ ایک مسخو! ایک کٹھ پتلی! جس سے میں ایک  
بچے کی طرح کھیلتا ہوں!۔۔۔ ایک مجسمہ محکمہ نصیحت  
لی یحییٰ: ۲۔ پکارا تے ہیں حضور: عمر میری، ساری دلہی اس  
زندگی سے اتنی ہی ہے کہ اس منہک دنیا کا مطالعہ کر کے: ہاتھ  
میں دربار میں ایک کٹھ پتلی ہوں۔ لیکن اس سے زیادہ قابل  
عبرت یہ ماجرا ہے کہ خود ذات شاہانہ جس پادری صاحب  
کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بنی ہوئی ہے، وہ اس کا کیسا اتنا شامرو بار  
دکھاتے ہیں۔

بادشاہ: ۱۔ کچھ شک نہیں کہ جو کچھ تم کہتے ہو میں دیکھ ہی ہوں:۔۔۔  
لاش کہ خود شیطان میرے مقدس مآب امام کلیسا کا منصب  
جلس اختیار کر لیتا! شاید میری روح اس کی گرفت میں لا  
آسودہ ہوئی!

کاشدہ: خون آشام پادری خود فری کے کسی موقع زندی  
کو ہاتھ سے روکے گا۔ اس کے لئے ع  
میر تقی:۔۔۔ شمشیر کاغریں ہوتا  
میر:۔۔۔ تم مجھے ڈراؤ گے کون آئے: جو تم لیا بلا!  
لی یحییٰ:۔۔۔ دربار کا طریقہ!  
میر:۔۔۔ آہ وہ بیز اثر ایک عورت کا دست نازک کسی ہنر  
نگاہ کو کات سکتا ہے۔ تو وہ دست نازک وہ جو گاجو میری  
لانا لائی سے جڑا ہوا ہے:۔۔۔

۱۔ رخصت ہو جاتی ہے!۔۔۔  
لی یحییٰ:۔۔۔ رجوتو اس نے وید شکر کو دی تھی اسے اٹھاتے ہوئے  
۱۰۰۰:۔۔۔ آج رات کو تو حماقت کا پادشہ کم از کم میں  
لے نہیں کھینچا:

## دوسرا ایک

منظر:۔۔۔ دلیہر شہر کا ایک ہال شہنشاہ لونی سیزو ہم ایک  
سفید، ضعیف العقل آدمی، شہنشین پر مہیا ہے  
زرد ہے، چہرہ حق ہے، دل میں تلق ہے۔ لی یحییٰ دربار  
سمو پاس ہی استادہ ہے:۔۔۔

بادشاہ:۔۔۔ آہ! کتنی زارہ نڈوں چیز ہے: بادشاہ ہونا بھی ایسا بادشا  
ہونا، جو تخت شاہی پر نشست تو رکھتا ہے لیکن جس کے ہاتھ  
میں عصا شاہی نہیں ہے:۔۔۔ تقدس شیطان و شیطان  
سارے منظور نظروں کو موت کے گھاٹ اتارے دیتا ہے:  
مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اسے اپنے قبائے سرخ کیسے  
شاید انسانی خون تازہ کی ضرورت ہو کر رہتی ہے:

لی یحییٰ:۔۔۔ یہ سب وہ فرانس کے لئے کرتا ہے، میرے آقا!  
بادشاہ:۔۔۔ جن فرانس کے لئے، اور نبرائے نفس کے لئے: ان!  
اس مرد دوسے مجھے کتنی نفرت ہے: فرانس کے کسی قبائ  
سے جبار شہنشاہ نے مجھ کو یہ ظلم نہیں کیا ہوگا جو وہ کر رہا  
مرن میری زبان کے ایک لفظ کی ضرورت ہے اور اس

لی ایجیسی۔ میرا خیال ہے کہ بعینہ یہی حادثہ وقوع میں آچکا ہے:  
بادشاہ۔ اس مردود کی رشتگی خون کا کچھ ٹھکانا ہے! اس کے چلائش  
کا سترم کر رہا تھا اور آج یہ دیویوں نے اسے دلے میں جن کے  
خون کا وہ طلب ہے!۔

شیر نر، نعیمہ کر وہ در کشید

سعدہ! ش فرہ: نال من مزید

دلی ایجیسی ایک ایشاد کرتا ہے۔ اور میرین ڈیلارے اور

مارکوس ڈی نگی رخل ہوتے ہیں!۔

میرین۔ جان بخشی: بادشاہ سلامت تہاں بخشی:۔

بادشاہ:۔ کس کی؟

میرین:۔ دہیر کی حضور!

مارکوس تگی:۔ اور مارکوس آف سیورن کی بھی!۔ اعلیٰ خدمت! بیفین

صرف ۶۰-۷۰ سال کے جوانان خام ہیں: بالکل دو بجے:

وہ دونوں کسی بات پر طعنہ نہ بھگتے پڑے۔۔۔ اتنے میں چہر

جاسوسوں نے جنہیں ریشیلینو نے اس موقع پر تعینات

کیا تھا۔

میرین:۔ معاف کر دیجئے میرے بادشاہ! معاف کر دیجئے: کیا

حضور کو ان پر رحم نہ آئے گا: دو ڈوئیز لڑکے: ایک چمکا نہ تو تو

نہیں ہیں: میں گرفتار: ایک بوند ہو کی نہ ٹکری: صرف اتنی

سی جھوٹ: موت کی بات کہنے بادشاہ سلامت: سیکر

دہیر کی جان لیں گے: نہیں نہیں: کبھی نہیں:

بادشاہ:۔ اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھنے ہوئے: ریشیلینو کا حکم

ہو چکا ہے: کہ تمام دیویوں نے داؤں کو پھانسی دیگانی چاہیے

اب آپ لوگ میرے لئے درد میں رہیں: کچھ پر

رحم کر: چلے جاؤ: جیسا ہونا ہے ہوگا: پادری صاحب کا

حکم: ملحق ہے!

دلی ایجیسی میرین کو ایشاد کرتا ہے: کہ وہ پہلو کے تاجیک

ماں میں چمک کر کڑی ہو جائے: بس کی وہ تھیل کرتی ہے:

مارکوس ڈی نگی: بہر چلا جاتا ہے!

بادشاہ:۔ اچھا جو کہ وہ نہ آئی اندھجے: تڑپا نہیں:۔ اچھا  
لی ایجیسی: کچھ انتساب تو بکلی باتیں کر: ہاں کی تم اسی فلسفہ موت  
.... کی بحث کی تکمیل ٹکرو گے: یہ دیگر موت میرے لئے تلام  
حیات کو کچھ قابل برداشت بنا دیتا ہے:

لی ایجیسی:۔ حضور! میں تو اس وقت بندگانِ عالی کو اپنا آخری سلام

رخصت کرنے آیا تھا

بادشاہ:۔ رخصت: تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتے: موت

تہاں رخصت: حصد کو تیرے منقطع کر سکتی ہے:

لی ایجیسی:۔ یہی قاطع تعلق موت آنحضور اس غلام پر عائد فرما ہے

ہیں اس طرح کہ ان دیویوں نے اسے لڑکوں کو معاف نہیں

فرماتے: لیکن ان کے ساتھ میں بھی اس غیر منسوختہ فداوی موت

میں شریک ہو: میں نے ہی ان دونوں کو لڑایا تھا:۔ اس

لئے کہ میں نے ہی اپنی تلوار دیر بر دور مستعد دی تھی:

بادشاہ:۔ آہ میرے درد باری! میں: تو یہ ظلم تہاں ہی گردن بھی مارے

اچھا! وادح میرے اندر قدم: زندگی تہاں سے بھرے لطف

ہوگی: اچھا! لی ایجیسی: اچھا! تم مرد تو میرے پاس کسی دن آکر

مجھے بتانا کہ وادح کی موت کیا ہوا کرتی ہیں: تمہیں معلوم

ہے بعض مرنے والوں کی وادح اس طرح کبھی کبھی آیا کرتی

ہیں:۔ اگر تم سے بھی پوچھ کر تا:

لی ایجیسی:۔ (اچھے سے) اس درجہ خوشگوار فریاد ہے:

بادشاہ:۔ لیکن ایجیسی نہیں: ایسا نہ کرنا! اگر تہاں رخصت کبھی آ:

تو میرے لئے بڑی دہشت کا باعث ہوگا: بس بہتر یہ ہے کہ

تم مرو ہی نا! لیکن آہ ایجیسی: یہ موزی ریشیلینو: کیا سچ کچھ تہاں

خیال ہے کہ میں امکا نا اس جن پر غائب آسکتا ہوں!:

لی ایجیسی:۔ میرے آقا: کوشش کیجئے: قسمت آزمائی کیجئے:

بادشاہ:۔ اچھا مجھے کچھ کاغذ د:

دلی ایجیسی:۔ تمہیں حکم کرتا ہے: بادشاہ مہلت اور دہشت

کی حالت میں چند اٹھ سیدھے اٹھا نا اس پر بھٹتا ہے

اور یہ تحریر در بادوی طریف کے حوالے کرنا ہے!:

میرن میں نے تم سب کو معاف کر دیا؛

لی ایسیلی :- جلدی جلدی میرن کے پاس جا کر، لوہ پر دانجل  
بکشی، شکریہ ادا کرو بادشاہ سلامت کا۔

بادشاہ :- میرن کو اپنے قدموں میں سرسبز دیکھو، نہیں نہیں؛  
مجھے ایسا نہ کرنا چاہیے، مہربانی کر کے کاغذ مجھے واپس دیدو؛  
یہ ممکن نہیں ہے، ریشیلو کا غصہ کون ہے گا؟

میرن :- ترحم خسروانہ! فرماں اپنے سینے کے محرم میں چھپاتے  
ہوئے، میرے آغا، یہ قیمتی پرزہ تحریر تو آنحضرت کو اسوقت  
واپس مل سکتا ہے، جب آپ میرا سینہ چاک کر ڈالنے؛  
بادشاہ :- میرن کے من گوسوزے اپنی آنکھیں خیرہ پاتے ہوئے  
اور نظریں خمی کر کے، اُفت، تم کون سا حرم ہو! میرا دل لرز  
رہا ہے۔ اچھا اس کاغذ کو اپنے پاس رکھو اور مجھے اپنی آنکھوں  
سے پناہ دو، یہاں سے رخصت ہو جاؤ۔

میرن :- درد بارے باہر آکر، با! میرا درد بیوقوف کیا؛  
بادشاہ :- لی ایسیلی، تم نے دیکھا کہ آخر کار میں نے کارڈائیں ریشیلو کو  
بتایا، کہ فرانس کا فرمانبردار میں ہی ہوں۔

لی ایسیلی :- لاریب کہ آپ ہی میں جنہوں نے سرسبزی کی حالت  
میں ایک غلطی کر ڈالی اور اس غلطی کے پردے میں کم از کم ایک  
دفعہ میرے کام انجام دیا؛

## تیسرا ایکٹ

منظر :- تصویر منی کے حصار کے پہلو میں ایک میدان بڑی  
دیوار میں ایک بڑا چڑا خنہ پیدا کیا گیا ہے، اس خلا  
میں سے اندرونی تصویر کی عمارت نظر آتی ہے۔ دو کارنگر  
اس مصنوعی چھانک پر ایک وسیع و عریض سیاہ پردہ  
ٹان رہے ہیں،

ایک کارنگر :- اگر دن دونوں طرف، کو بیرونی حصار کے باہر بھی پچاسی  
دیکھائی والی تھی، تب بھی پادری صاحب اس کا ردوائی کاغذ  
بالائے قلعہ سے فرما سکتے تھے اور اس شکست و ریخت کی

مطلق ضرورت نہ تھی؛

دوسرا کارنگر :- ہاں کیا وہ حصار کی بڑی چھانک سے نہ آ سکتا تھا؟  
پہلا کارنگر :- کیا کہا؟ ایک گاڑی جس کے اٹھائیو اسے چوبیس  
آدی ہوں، اسکے سنے وہ چھانک کافی گزر گاہ ہو سکتی ہے؟  
نہیں میرے بے خبر دوست، تقدس تاب ریشیلو کا گروفر  
اور ترک و احتشام بادشاہوں سے کہیں بڑھ چکا ہے؛  
جب کبھی خاص خاص سوتوں پر وہ شہر میں قدم رنج فرما ہوا  
کرتے ہیں، تو ان کا داخلہ شہنشاہوں اور فاختوں کی طرح ہوا  
کرتا ہے۔ چنانچہ ہمارے حملات کے کسی حصار میں اسی طرح  
کوئی دشمن پیدا کیا جاتا ہے جس میں سے ہو کر ان کا مرکب  
ہمایولی داخل شہر ہو کر تارے۔

دوسرا کارنگر :- تو گویا اب وہ اس بنائے ہوئے چھانک میں سے  
آئے گا، تاکہ ان دونوں جوانوں کی پچاسی کا تماشا دیکھے، کسی  
مقدس قصائی ہے۔

پہلا کارنگر :- اچھا اب آؤ اور اس پچاسی کو دیکھو، جو ہمارے  
ہاتھوں بٹائی گئی ہے؛

دو کارنگر رخصت ہوتے ہیں، اور اسی وقت میرن قہر کے  
دردازے برپا ہوتے ہیں، وہ دستک دیتی ہے، لیکن میں اسکے  
کہ دردازہ کھیلے نہما، ریشیلو کا گماشتہ ایک ہاؤس گھوٹے  
پر سوار، آن پہنچتا ہے؛

میرن :- بادشاہ ذبیحہ کی جناب سے حکم؛

دربان :- اجازت نہیں دیا سکتی؛

نعیم :- پادری صاحب کی سرکار سے ایک حکمنامہ؛

دربان :- بسر و چشم! گزر جائیے؛

میرن :- میرے پاس ترحم خسروانہ کا ایک فرمان ہے؛

نعیم :- اور میرے ہاتھ میں اس فرمان کی منوخی کا ایک حکم نامہ؛

پادری صاحب آج شب کو یہاں نزول اجلال فرمائے، اُنے دئے

میں، تاکہ پچاسی کو ملاحظہ فرمائیں۔ اس کے لئے ۹ بیچ کا وقت

مقرر نہیں مقدر ہو چکا ہے!!

میرن :- آہ! سے

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں لڑی ہے کس  
دو چہار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا  
ہائے تو اب کوئی امید نہیں؛ میرا دیدیر مجھ سے بغلیں جو نے  
..... کے بجائے پھانسی کے پھندے سے لکھ لے گا؛ اُف  
اُف! میرے اللہ، میرے اللہ!

نعیم :- اب بھی اسکی نجات کی ایک صورت ہے؛ جس سے اسے  
نکل بھاگنے کا موقع دے سکتا ہوں۔ دیدیر بچ سکتا ہے؛  
بستر طبع میرن تم —

میرن :- نہیں!

نعیم :- یہ دیدیر کی زندگی کی نفی ہے!  
میرن :- لیکن اگر اسکی زندگی بچ بھی جائے تب بھی کیا؛ اگر وہ  
مجھے ملتا ہے تو میں اسے نہیں ملتی؛ ایک ٹیل جانگل سوتا  
اچھا دیدیر جیسے گا، پھر جاتا ہے۔

میرن :- نعیم کی میت میں قبر میں داخل ہوتی ہے؛

دیدیر اور نعیم نظر آتے ہیں، جو جیلر اور اس کے گارڈ

کی حراست میں ہیں؛ اب مات ہو گئی ہے!

جیلر :- سیورنی سے سرگوشی میں تم چاہو تو جھاگ... مکتے ہو، ہاں کس  
آفت انگلی نے تمہارے فرار کا سارا بندوبست کر لیا ہے؛

سیورنی :- ہم دونوں کا

جیلر :- نہیں موت تمہارا؛ دوسری بات مجھ سے نقد جان  
طلب کریگی؛

سیورنی :- ہر باب من؛ جس طرح بنے میرے دوست کو بھی بچا  
جیلر :- یہ میرے انتہا میں نہیں ہے؛

سیورنی :- تو مجھے اپنے رفیق کی رفاقت نبھانی ہے دیدیر کی طرف  
طرک، دوست ہم دونوں اس رات ساتھ ساتھ ہی جنت

کو چلیں گے!

دیدیر :- سیورنی! ذرا دیکھنا غور سے؛ یہ سائے میرن ڈیلائے  
ہی ہے؛ تمہیں اپنی عزت کی قسم؛ مجھے بتاؤ، کیا سید یہ

مشاہدہ صحیح ہے!

سیورنی :- غور در صحیح ہے۔ غی سیری مجھ میں تمہاری یہ کیفیت قلبی  
نہیں آتی دیدیر تمہیں، اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ تم ایک ایسی  
ملکہ حسن کے حرم دل کے فاتح ہو  
دیدیر :- لیکن میرا تو یہ بھی خیال تھا کہ وہ جتنی حسین ہے اتنی ہی حسوم  
بھی ہے۔

سیورنی :- ہاں تو اس میں کوئی شک ہے؛ وہ تمہاری عاشق ناز  
ہے؛ تمہارے فراق میں یہاں تک آپہنچی ہے۔ اس کی جب  
تک جان میں جان ہے، تمہارا بال بیکا نہیں ہو سکتا؛ تم سے  
کچھ ایک جان دو قل لب ہو؛ تمہارے یہ نصیب اللہ اکبر  
لٹنے کی جائے ہے!

اتاری کی چڑھی ملتی جو سیورنی سو جاتا ہے۔ میرن درد انگے

سے نکل کر آتی ہے۔ اسکی بغل میں ایک پوٹلی ہے!

میرن :- دیدیر سے، اور سر دیکھو، جلدی سے یہ کپڑے پہنو، ریشمینو  
آگیا ہے؛ سنتے نہیں ان تو پوں کو جو اس کے درد و کاستقبل

یہ سر جو رہتا ہے!

دیدیر :- ذرا اپنی آنکھیں کھلاؤ، درجہ سے ملو، مجھے تم نے کس قسم کا  
آدمی سمجھا ہے، احسن یا آبرو باخت؟

میرن :- جاہلیت و شوری سے دیدیر سے آنکھیں چار کر دتے ہوئے  
اور سر تا پا لہرہ بر اندام؛ جیسا تم سے محبت کرتی ہوں دیدیر؛

اپنی جان سے بھی زیادہ؛ جس نے کوئی قصیدہ نہیں کہیا؛  
مگر ات؛ تمہاری آنکھیں کتنی ہر آلودہ ہیں؛ سنو تو کیا میں وہی

تمہارا میری نہیں ہوں؟

دیدیر :- میری یا میرن ڈیلائے؟

میرن :- دیدیر مجھے معاف کرنا؛ میں تم سے سب قصہ کہہ دوں گی  
اگر تمہیں میرا نام یاد رہتا تو مجھے خوف تھا۔ مجھے تمہیں اپنے

ہاتھ سے دیدیر نہ ہوتا؛ تم نے اپنی محبت سے میری نجات کی  
مٹی میں نے آرزو کی مٹی کو اپنے ساتھ جو دئے حلقے کے سارے

آثار کو منہدم کر دوں گی، تمہارے ساتھ ایک بالکل نئی زندگی

میرن :- دیدنیر سے ہٹ کر، اور مجھے دیدنیر، مجھے؟ اسے مجھے  
خیرا بوجی نہ کہو گے!

دیدنیر :- سپاہیوں کی اور گیس میں کشاں کشاں در حالت خلیفہ  
میں، نہیں، تم کو کچھ نہیں! میرا دل تیکڑے تیکڑے ہو رہا ہے!  
آہ میری، میری۔ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں، آفت میں غلطی  
پرکتا:

میرن :- تو مجھے معاف کرتے ہو!  
دیدنیر :- میں خود تم سے معافی، تمہا ہوں میری! مجھے یہ دیکھنا نصبت  
میری لاؤں نصبت:

سپاہی دیدنیر کو کہتے ہیں،  
افسر :- غل کھاتی ہوئی میرن کو اپنے ہاتھوں میں سنبھال کر  
ابھی آخری امید منتقل نہیں ہوئی ہے۔ دیکھو وہ کارڈینل کیلیو  
صاحب تشریف لارہے ہیں، ان سے عرض و معروض کرو!  
راہ کے تو بچانے کی تو میں سلامی دیتی ہیں! صبا  
کے زبردست رخنے کا مہیب سیاہ پردہ کرتا ہے کارڈ  
اپنی عظیم دھیم پانکی کے اندھا یاں ہوتا ہے جسے چومیں  
پیل سپاہی لارہے ہیں، پانکی کے پردے خونی سرخ  
ہیں، انہوہ عوام دھشیا نہ چیتا رہا ہے، لیکن ان کے ٹروہ  
شیون اور گراں گوش شیطان سیرت پادری کے کاروں کے  
ورمیان بھی سرخ پردے خالی ہیں،

میرن :- دو دن، پانکی کی طرف، چنے کو ایک تونچکاں خط رتنا زچہ سستی تھا  
لنہ، فی سبیل اللہ سیرت مقدس آقا کا دیش ان دن ناشا و نوجوان  
کو بختہ بختہ

اُس آواز، دپ، پوش پانکی کی اندرونی فست میں سے، ہرگز نہیں  
ہرگز نہیں!

انچ آگے نکل جاتی ہے، ہجوم اس کے پیچھے  
شو، شور بلند کرتا کرتا ہے، میرن اکیلی  
پڑی، عاتق سے، اس پر فشی کا درہ پڑ  
جاتا ہے!

شروع کر دیتی، اس کے دہ میں تم سے محبت کرنی تھی اور  
آج بھی تم سے محبت کرتی ہوں، میرا عشق تمہارے لئے تھا  
ہے، عین جیسے دیدنیر! ان تو ہمارے مہربان بوجاؤ نہیں  
تو میں مجاؤں کی!

دیدنیر :- سنو، اس سوس کا بوسہ دو کر میرے لئے یہ معافی، ہم تم  
لئے کس طرح حاصل کیا، یہ نیا میری گلو خلاصی کرنے کے  
لئے خود اپنی شہرت یوں خطرے میں لارہا ہے، کیا جرا  
ہے؟

میرن :- میں بتاؤں گی، میں بتاؤں گی، لیکن ابھی نہیں پہلی  
بات یہ ہے کہ نور، یہاں سے بھاگ چلو، بھاگ چلو۔ ہونو  
وہ لوگ آتے ہیں، تمہارے اور بات کرنے کا موقع نہیں  
پہلے اپنی جان بچاؤ!

دیدنیر :- نہیں! میں مراست گاہے ہو گنا چاہتا ہوں، نہ  
داسکا موت سے نکلتا، خدا کا شکر ہے کہ خدا پہلوچی  
میں موجود ہے!

ایک جنازہ اپنا تیرنے، حکام اور سپاہیوں کی  
ایک جمعیت کے ساتھ نمودار ہوتا ہے!

میرن :- دیدنیر کے قدموں میں زمین بوس ہو کر، دیدنیر  
دیدنیر!

ایک افسر :- صاحبان کیا آپ تیار ہیں؟  
سیورنی :- کبسی ہر سینی ہے، ایک میر کے خوابات  
میں یہ قتل، اندازی؟

جلاد :- معاف فرمائیے، لیکن اس کی تباہی بہت جلد ہو جائیگی  
وقت آگیا ہے، آپ دونوں عزت کو نہایت پرسکون  
بستروں پر، رکرو یا جائے!

سیورنی :- اچھا، ابھی آگیا ہے، بہت خوب، بخیر جنازہ پچاسی  
کے ہمینہ، سے کتنا، بہت دم ہے

دیدنیر :- سب، فی سے نکلیں ہوں، دے، الوداع اسے  
یاد فرماتا، الوداع۔

# کیف و نشاط

ہر سو نشاط و کیفیت کا ساماں ہے آجکل  
موج شرابِ زیت کا عنوان ہے آجکل  
جو بھی شریکِ محفلِ رنداں ہے آجکل  
مستی کا نام جذبہ عرفاں ہے آجکل  
قطرہ میں سلسیل کی موجوں کا ہے فروغ  
ظلمت بھی نور و کیف کے سانچے ہیں ڈھلگئی  
لطفِ نشاط کم نہیں ہوتا کسی طرح  
فردا کی فکر ہے نہ گزشتہ کا کوئی غم  
خود آ رہے ہیں اُن کی طرف سے پیامِ شوق  
وہ فلسفہ جو فطرتِ انساں پہ بار تھا  
نہ جانے کس نے چھیڑ دیا زندگی کا ساز  
ذرا سے سنار ہے ہیں محبت کی واردات  
ہر سمت ہو رہی ہے تمنا کی روشنی  
ٹھہرا ہوا ہے منزلِ عشرت پہ کارواں  
کہہ دو غمِ حیات سے فرصت نہیں ملی

عالم تمام صبح بہاراں ہے آجکل  
کونین غرقِ مستیِ معصیاں ہے آجکل  
اُس پر نزولِ رحمت یزداں ہے آجکل  
زاہد کو بھی گناہ کا ارماں ہے آجکل  
ذرا طلوعِ صبح گلستاں ہے آجکل  
جامِ شرابِ مہر و خشاں ہے آجکل  
ٹھہری ہوئی سی گر دشنِ دلاں ہے آجکل  
دستِ جنوں میں ہوشِ کدلاں ہے آجکل  
اپنے کئے پہ حسنِ پشیمان ہے آجکل  
شعر و شبابِ حسن کا طوفاں ہے آجکل  
دوشیزہ بہار بھی رقصاں ہے آجکل  
تاروں کی روشنی بھی غزلخواں ہے آجکل  
امید کا چراغِ افروزاں ہے آجکل  
قابو میں میرے عمر گریزاں ہے آجکل  
اُن کا خیال سلسلہ جنباں ہے آجکل

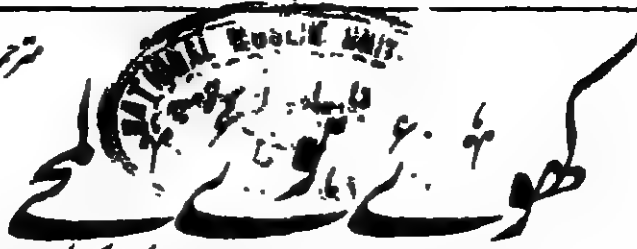
وہ کیفیت کہ زیت کا ماحصل کہیں جے  
ماہرِ تری نظر سے نمایاں ہے آج کل



مترجمہ: جناب عزیز احمد

جان گالزورڈی

رائٹگریزی: مسلمان خداد



وہ پندرہ تاریخ تک کیلئے کلیسا میں بیٹھی گئی۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ جیل خانے میں رہنے کے بجائے یہاں رہ کر بہتر بن سکتی ہے۔ ایک عورت کو گولی کا نشانہ بنانا ہے۔ اس خیال ہی سے ایک آدمی کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ اور وہ بھی دوران جنگ میں۔ چھوٹی سسٹر کیلٹ دیکھ کر مدد دیتی۔ یہاں میری جگہ کسی کو متعین کرو میں اس سے متا چاہتی ہوں۔ وہ برآمدہ میں سے گزرتے ہوئے خرامن خراماں ایک کمرے میں آئی۔ رقصہ اپنے پنگ پر پاؤں لٹکائے بھٹی گئی۔ اس کا چہرہ بے رنگ تھا جہاں خون کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔ اس کا چہرہ بیضی تھا، مڑگان چشم اور کواٹھے ہوئے تھے۔ اور سیاہ بال کا جوڑا بندھا ہوا تھا، اس کے جذباتی نازک لب سفید تھے۔ جس کے درمیان موتی کی طرح سفید دانت چمک رہے تھے۔ وہ ہاتھ باندھے ہوئے تھی، اس کی آنکھوں میں شراب کا سا بخار تھا۔ اس کی تھری سلاخ سے دور باہر کے مناظر کا نظارہ کر رہی تھیں۔ جس طرح بچے میں بند جیتا مسرت بھری تلوں کو باہر دیکھتا ہے۔ مد نے کہا: اسے میری بیٹی ہم تیرے لئے کیا کریں؟ لڑکی نے اپنے جسم کو سکڑ لیا۔ تم بیکار تکلیف اٹھا رہی ہو؟ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تم دعا نہیں مانگتی ہو۔ بیٹی یہ بہت فسوسگ بات ہے۔

رقاصہ مسکرائی، جیسے کسی نے ساز کے تاروں کو چھڑو دیا ہو۔ لیکن یہ دلفریب سکراہٹ جلد ہی غائب ہو گئی۔ یہاں نہیں کوئی ایک حرف بھی نہ کہے گا جس سے ہمیں تکلیف ہو، بلکہ یہاں ہر شخص تم سے ہمدردی رکھتا ہے، کیا تم کوئی کتاب پڑھنا چاہتی ہو، یا کیا تم کوئی نثر پڑھنے کی خواہشمند ہو؟ تمہاری جو آرزو ہو، بتاؤ، میں اسکی تکمیل کی کوشش کروں گی۔

رقاصہ نے اپنے دونوں ہاتھ کھول دیئے، اور ہر ایک شاندار لڑبا

در در کلیسا کی راہ عورت کو مدد دیتے ہیں، مدد دہیاری مدد دے رقصہ بہت رنجیدہ ہے وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر بچھڑے جنہی ہے اور ایک خالی جگہ کو گھور رہی ہے۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ مدد میں نے اس سے دعا مانگنے کو کہا لیکن افسوس وہ جانتی ہی نہیں کہ کس طرح دعا مانگی جاتی ہے۔ وہ بہت کمزور عقیدہ رکھتی ہے اس لئے اپنے جرم کا اقبال کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے وہ مت پرست ہے۔ باطل کا فوہ۔ چنی کا فوہ لیکن کوئی اسے ایسے تکلیف اور صبر آزمائی میں کیا کہہ کے تسکین دے ہیں نے کوشش کی کہ وہ اپنی داستان مجھ سے بیان کر دے۔ مگر وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مرث وہ خالی جگہ کو گھورتی رہی۔ اس حال میں بچہ کر میری دل پر ایک چوٹ لگی۔ کیا کوئی اتنے مرنے سے پہلے تسکین نہیں دے سکتا؟ ایسی جبری جوانی میں اس عورت کا مرنا۔ ایسی نوجوان اور خوبصورت حسینہ کو گولی مارنا، اس قدر خوفناک اور درد انگیز بات ہے۔

جب وہ اپنی گفتگو ختم کر چکی، تو مد نے اپنا ہاتھ اوپر کو اٹھایا اور اپنے سینے پر باندھ لیا۔ اس کی بھوری اور خشک آنکھیں اور پرانی اور اس نے استفسار انگیز نظروں سے سامنے کھڑی ہوئی سسٹر ر کلیسا کی مقدس راہ عورت کو اس نام سے موسوم کرتے ہیں، کو دیکھا جس کا چہرہ اس کے نرم اور نازک بالوں میں اترا ہوا چھلکی دے رہا تھا، اور اس کے سامنے سفید کپڑوں میں ملبوس مدد کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔ وہ جاسوس عورت اس کی نگاہ پر مقرر تھی۔ وہ خاموش تباہ کی نس کی ایک رقصہ تھی، جس نے چند اہم راہ کی خبر اپنے فرانسیسی عاشق سے حاصل کر کے جرم گورنمنٹ کو پہنچائی تھیں وہ گرفتار کر کے یہاں بھی گئی۔ تاکہ مرنے سے قبل وہ ان لوگوں میں رہ کر اپنے گناہوں سے توبہ کر سکے۔ اور اپنے لہذا عقائد سے توبہ کرے

اٹھا کر سے دیکھا۔ رقاصہ سیدہ سلک پہنے ہوئے تھی۔ خوبصورت  
جراہیں اور چمکدار اونچی ایڑی کا جوتا۔ اسکی دونوں گلاہوں  
پر سونے کی میاں بندھی ہوئی تھیں، اور اس کے بالوں کے ٹپے  
میں سرخ گلاب لگا تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں سفید ہاتھی دانٹکے  
تھے۔ اس کا ایک چھوٹا بچہ تھا اس کے ہاتھوں پر ہلکا سفید رنگستا  
اور اس کے چہرے پر ایک ہلکی رنگین نقاب۔

وہ کمرے کے بیچ میں پہنچ کر رک گئی۔ اور اپنی نظریں جھکا لیں سسٹر  
مذہب کی آنکھیاں متحرک ہوئیں۔ وہ پیانو سے سر پی آواز نہ گھٹنے لگی۔  
رقاصہ نے اپنا ہنسا اٹھایا۔ اس اسپینی ناچ میں وہ مشکل سے اپنی  
جگہ سے ہٹ سکی۔ لیکن اس کے ہاتھ متحرک رہے تھے۔ اور جسم کا  
قوازن قائم کر رہے تھے۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ ساکت نہ تھا ہر  
چیز متحرک تھی، صرف اسکی آنکھیں دکھائی دیتی تھیں، جو اس کے  
چہرے پر ساکت تھیں اور جو اس بچے کو گھور رہی تھیں

دفعتاً سسٹر مذہب کی آنکھیاں رک گئیں۔ رقاصہ ساکت  
کھڑی ہو گئی اور تمام کمرے میں ایک مکمل خاموشی چھا گئی، عورتوں  
کی قطار سے ایک ہلکا شور بلند ہوا۔ اور رقاصہ مسکرانے لگی، پھر سسٹر  
مذہب نے ایک نئے قسم کا گانا شروع کیا۔ ایک لمحہ تک رقاصہ  
خاموش کھڑی باجے کے سروں کو غور سے سنتی رہی، پھر اس کے  
پیروں کو حرکت ہوئی اور وہ مسکرانے لگی، وہ بہت حسین اور خوش  
نظر آدمی تھی..... ایک تیلی کی طرح کسی کی پروا کئے بغیر دیکھنے  
والوں کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی، اور انبساط کی ایک  
ہلکی لہر ان کے جسم میں دوڑ گئی۔

مذہب آنکھوں میں آنکھیاں ڈالے بیٹھی رہی۔ لیکن بھولے ہوئے  
لحے اسے یاد آ رہے تھے وہ پرانا گھروہ رومان ایک ایک کر کے  
اس کے سامنے آ رہے تھے۔ وہ بہر جب اس کا عاشق لڑائی  
میں مارا گیا، وہ اس کلیسا میں داخل ہو گئی، یہ چمکدار ظلم آنکھیاں  
سیاہ بالوں میں سرخ چھول، کتابی خانہ آلود چہرہ، حسین آنکھیں  
اور دل میں گھپ جانورانی نظریں اسے یاد آ رہی تھیں۔ عیش  
و عشرت کے حسرت بار بھر گئے، وقت سے پہلے فنا ہو گئے اور

کے ساتھ ان کو گردن پر رکھ لیا۔ یہ لمحہ بھی کشتار نگین تھا، کس قدر خوش  
اور جذبات سے بھرپور تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا تمام  
جسم سن اور کیف میں ڈوبا ہوا ہے۔ در کے چہرے پر ایک ہلکا سا  
رنگ آیا، اور وہ بولی: کیا تم..... ہم سب کی خاطر ایجاب  
ناج سکتی ہو۔

دو بار وہ اس کے لبوں پر بوسہ کھینچنے لگا۔ جیسے کوئی شہر ایک پہلا  
جرعہ پینے کے بعد متہشم ہوتا ہے۔ لیکن اس مرتبہ وہ دیر پا رہا، اور اس  
نے کہا: "مرد بعد شادی میں تنہا رہے لئے ضرور ناچوں گی، خاتون  
مجھ اس میں خوشی ہوگی۔ بہت بہتر تنہا رہے کپڑے آج ہی یہاں  
بھیج دیئے جائیں گے۔ آج رات کھانے کے بعد کمرے میں ڈر کے  
بعد۔ اور اگر تم پسند کرو تو ایک پیانو کا بھی انتظام کیا جائے  
سسٹر مذہب بہت اچھا بھاتی اور گاتی ہے۔ ہاں گانا بھی اچھا  
گمانے گی۔ خاتون کیا میں یہاں سگریٹ پی سکتی ہوں۔"  
"شوٹ سے میری بیٹی! میں تنہا رہے لئے سب سگریٹ بھجواتی  
ہوں۔"

3456

رقاصہ نے انگڑائی لینے کے لئے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے  
میں سے اس کے خوبصورت حسین بازو عریاں ہو گئے۔ اور کمرے  
اپنے دل میں کہا: "انسوس یہ دلکش اور بھوری بازو کل سرور  
ہو جائیں گے۔ اکثر لوگ تمام دن ان کا ناچ دیکھنے کے لئے بیچینی  
سے منتظر رہے، بعضوں کو اپنے گزشتہ بھوے ہوئے واقعات یاد  
آ رہے تھے۔ ایسے ڈرامائی، تحریر خیز واقعات جو ان کی روح  
کو اس مقدس مقام سے کہیں اور لئے جا رہے تھے۔

آخر کار کھانا ختم ہوا۔ تمام میزیں اٹھا دی گئیں، کمرہ آئینہ  
کی طرح صاف کیا گیا۔ ایک پیانو لاکر رکھا گیا۔ اور بچوں کی قطار  
لگا دی گئی۔ ساتھ بھورے رنگ والی سسٹرس دروازہ بوقتیں  
بچوں پر آکر بیٹھ گئیں اور پیانو پر سسٹر مذہب، اور ان کے سب کے  
درمیان در خاموشی اور تجیدہ جمی تھیں۔ بمشکل انتظار کی گولیاں  
ختم ہوئیں۔ پہلے منتظر کمرے میں داخل ہوئی، اس کے پیچھے رقاصہ  
خراں خراں کمرے میں آئی۔ سوائے در کے ہر ایک نے گردن



جناب راجہ مہدی علیخاں جانتا یدِ نیر و زماہِ لسانِ لہو

# بہار کی ایک صبح کو

|                                   |                            |
|-----------------------------------|----------------------------|
| گلستاں میں نگہت چلی آرہی ہے       | نہیں خود لطافت چلی آرہی ہے |
| وہ خود آرہی ہے خراماں خراماں      | جلو میں نزاکت چلی آرہی ہے  |
| چلی آرہی ہے بہاروں کی زینت        | کلی کی صباحت چلی آرہی ہے   |
| دم صبح آغوش گل سے نکل کر          | مری سمت نگہت چلی آرہی ہے   |
| کسی کنج باغ ارم سے نکل کر         | کوئی حورِ جنت چلی آرہی ہے  |
| مے دل سرِ رخصت تھی لہجہ گلاب      | مرے دل کی راحت چلی آرہی ہے |
| مجھے تھام لے لے جنوں مسرت         | مری سمت جنت چلی آرہی ہے    |
| وہ خود پیچھے پیچھے ہے اور آگے آگے | جیا کی لطافت چلی آرہی ہے   |
| نگہ سے مری ایک منت سے جسکی        | نگہ کی شرارت چلی آرہی ہے   |

”وہی“ آرہی ہے مے گھر کی جانب

”وہی“ ماہِ طلعت چلی آرہی ہے

جانب جمیل احمد کندھارہ پوری بی اے

# دھالی سوروسہ!

بھول تھے موسیقی تھی، اور محبت کے رنگین خواب ادا اپنے خوش اند  
مستقبل کے سہانے خواب دیکھنے تھے۔ جب اس کی زندگی بھی طغور  
اور رنگینوں سے معمور ہو جائیگی۔۔۔ جب اس سے بھی کوئی گرجوشی  
سے محبت کرے گا اور یہی اپنے پرستار کی محبت کا جواب اسی  
گرجوشی سے دے سکیگی۔

(۲۱)

شباب و جوانی کے خواب کتنے لطیف ہوتے ہیں یہ کون نہیں  
جانتا! اور نہ جانے حسین گل بانو کب تک اس خود فراموشی کے عالم  
میں غرق رہتی، اگر قریب سے ایک چوپکی آواز اس کی توجہ اپنی جا  
منقطع نہ کر لیتی کٹارے سے کوئی چٹو چٹا ہوا آہستہ آہستہ آواز  
تھا۔ جب وہ ایک دم قریب پہنچ گیا، تو پانی کی لہلوں کی آواز سن کر گل بانو  
دھما چوٹ نکلی۔ اس نے دیکھا کہ آفتاب بھی غروب ہو چکا ہے  
فضا پر تاریکی مسلط ہو رہی ہے اور نیلے شفق پر اگلے دسے ستارے  
نکل چکے ہیں۔ وہ جلدی سے، علی، اور گھر آکر سر پر رک کر گھر کی طرف چلی  
دروازہ کے پاس پہنچی تو دیکھا، باب اور ماں دونوں مصروف گفتگو  
میں ہیں جس کا موضوع خود اسی کی شادی ہے ظاہر ہے گل بانو کے جذبات  
کی اس وقت کیا کیفیت ہونی ہوگی۔ گھڑا چپکے سے اس نے زمین پر  
رکھ دیا اور دروازے سے لگ کر انکی گفتگو سننے لگی۔

آخر کیا کرنا ہے؟ فرید خاں نے حق اپنے قریب کھینچے ہوئے نگاہ  
تہم نے جہاں بھی شادی کے پیغام بھیجے سہمی نے تو دہرے ہی طلبے  
تو پھر! گل بانو کی ماں نے پیشانی پر شکن ڈال کر کہا۔

پھر کیا۔۔۔ اس نے حق کا ایک بڑا سا کش لگا کر کہا: آخر گل بانو  
کو کب تک بیٹا رکھو گی! لڑکی جوان ہو چکی ہے، شادی تو ہمیں جس  
طرح بھی ہو کرنی ہی ہوگی!

(۱۱)

شام ہو رہی تھی، فرید خان صحن میں ایک جھلکی چار پائی پر لٹایا  
حلقہ بی رہا تھا، اور اس کی پیروی چلے میں آگ روشن کرنے میں غصہ  
تھی۔ گل بانو اٹھی اور گھر الیکٹرک پانی لانے کیلئے ندی کی طرف چلی گئی  
راستہ میں گاؤں کے زمیندار کا چھوٹا سا باغیچہ تھا جس میں  
انواع و اقسام کے پودے لگے تھے۔ گل بانو شباب کی سستی سے چور تھا  
قدم قدم بڑھتا کرتی چلی جا رہی تھی، کہ دفعتاً اس کی نگاہ گلاب کے پودے  
پر پڑی۔ رنگ برنگ کے پھول کھلے تھے جنہیں سین ستلیاں دیوئے  
چوم رہی تھیں گل بانو بروئے۔ اس راستے سے پانی لانے کے لئے جاتی  
تھی، اور بروئے۔۔۔ وہ ستلیوں کا رقص دیکھتی ہوگی۔ لیکن نہ جانے  
کیوں آج اس منظر نے اس کے دل پر ایک خاص اثر پیدا کر دیا۔  
یہ باریک جوا کا ایک تیز جھومکا دیا اور ایک گلاب نے فرط محبت سے  
بغیر جو کہ دوسرے گلاب کا منہ چوم لیا۔ گل بانو یونہی ایک لمحہ کے لئے  
غیر راوی طور پر باغیچہ کے پاس ٹھہر گئی تھی۔۔۔ جوانی کی شوخی سے  
نہیں، بلکہ کسی خاص جذبہ کے زیر اثر! اور اب جو پھولوں کو منہ چومتے  
دیکھا تو وہ بھر چل پڑی، ندی وہاں سے چند ہی گز پر تھی جلد ہی وہاں  
پہنچ گئی

آفتاب غروب ہو رہا تھا اور اسکی خوں نشاں گریز سطح آب  
کا بوسہ لے رہی تھیں، گھنڈی اور کیفیت پروردہ جوا چن رہی تھی، قضا میں  
سکوت تھا۔ گل بانو ندی میں پاؤں لٹکا کر کچھ دیر کے لئے بیٹھ گئی۔ اس  
نے دیکھا، اور ایک کمیت کے کنارے مور کا ایک جوڑا رقص کر رہا  
ہے۔ اور یہ رقص کچھ ایسا جانب توجہ تھا کہ گل بانو اپنے ماحول سے بے خبر  
بے خبر ہو گئی، تن بہن کا ہوش باقی نہ رہا۔۔۔ مور کا رقص دیکھتے  
دیکھتے وہ درحقیقت رقص کی دنیا میں پہنچ گئی، جہاں رنگ برنگ کے

وہ بیشک مسترقوں کی دنیا آباؤ کرنا چاہتی تھی لیکن اتنی گراں قیمت پر نہیں، اسے اپنے والدین سے محبت تھی، جنوں کی حد تک، اس وقت ان کے سوا، اس کا دنیا میں اور تھا ہی کون؟ پھر فرید خاں کی کوئی اور اولاد تو تھی نہیں، پھر وہ کس طرح ممکن تھا، کہ وہ ایک ایسی شادی پر رضامند ہو گا، اظہار کرتی، جس سے بحالیت موجودہ اس کے والدین کو ایک سال کے لئے کماتے تک کا سہرا باقی نہ رہتا۔ بیشک وہ اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس کرتی تھی، اور چاہتی تھی کہ کوئی محبت پرست دل اس کو نصیب ہو۔ لیکن یہ شادی اس کی تلووں میں ایسی شادی تھی جس کی بنیاد خود غریبی پر قائم کی گئی ہو، جو الفت و محبت کے غیر سے بحیرہ عاری ہو۔ چنانچہ اس وقت... وہ بے چینی میں بیچ و تاب کھاتی رہی۔ اس کی طبیعت میں ایک قسم کی وحشت، ایک خاص انداز کا اضمحلال پیدا ہو گیا، رات کی وقت وہ اپنے والدین کی خدمت کے باوجود بغیر کھانا کھانے سو رہی، فرید خاں نے سرخندہ اپنی لڑکی کی اندرونی کشمکش کا جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوا۔

گل بانو کو آدھی رات گئے تک خندہ نہ آئی، استراہ کر رہ کر مقررہ ایو آ جاتا، جب شادی بیاہ کے بعد وہ سسرال چلی جائے گی، اور اس کے باپ ماں بیاں ناقوں مرنے لگیں گے، رات کو عالم اضطراب میں اکثر اس نے فیصلہ کیا کہ اسی وقت باپ کو جگا کر، اپنی ولی کینیت کا اظہار کر دے لیکن پھر شرم و حجاب غالب آتا، اور وہ اپنا خیال ترک کرنے پر مجبور ہو جاتی۔

الغرض رات گل بانو نے بڑی مشکلوں سے گزاری۔

صبح ہوئی تو فرید خاں نے دیکھا، اس کی لڑکی گل بانو کا چہرہ اترا ہوا ہے اور قبل اس کے کہ وہ اس کے متعلق کچھ استفسار کرے گل بانو نے اپنی ماں کو علیحدہ سے جا کر خود ہی کہا ہے ماں میں نے ساری باتیں سن لی ہیں، اور اس شادی پر ہرگز رضامند نہیں، جی چاہے تو بااثر فرید خاں کو وہ یاد ہی بکھر پکارتی تھی، کو کہہ دے:

”کیوں؟“ گل بانو کی ماں نے پریشان بھرم میں کہنا شروع کیا: تیرا مزاج تو ٹھیک ہے، آخر آج شادی وادی کا ذکر کیا ہے، ہنسی؟

”ہاں ماں!“ گل بانو نے تقریباً بی بی کے ہونے کہا، اس شادی

”اور وہ دھالی سوداوں کا مطالبہ؟“

”فصل لگی ہوئی ہے، غلہ فروخت کر کے دیروں گا۔“

”اور کیا پیٹ پر پتھر باندھ لو گے؟ گل بانو کی ماں نے ذرا چپیں چپیں ہو کر کہا۔“

”لو اب کھانے کا خیال کرو گی، تو گل بانو کی شادی ہو چکی، فرید خاں نے حکم کو سمجھتے ہوئے کہا، جس کی چٹکادیں دم توڑ رہی تھیں۔“

”لیکن پھر بھی کچھ سوچا تو ہو گا؟“

”ان میں ابھی طاقت باقی ہے، گل بانو کی ماں!۔ فرید خاں نے اپنے مضبوط بازوؤں کی طرف اشارہ کر کے کہا: میں مزدوری کر سکتا ہوں۔“

”مزدوری کرو گے؟ وہ ذرا چومک کر بولی، جسے اسے اس وجہ کی توقع نہ تھی: کیا شرم و حیا دھو کر پی گئے، آخر کچھ لوگوں کا بھی خیال ہے کہ وہ کیا کہیں گے؟“

”کہیں گے کیا؟ فرید خاں نے اپنی پیشانی پر گہری تسن پسیدہ کر کے کہا۔“

”یہی کلفظ ایک لڑکی کی شادی میں فرید خاں کی کہی نہ جھجھنے والی گویا آخر جھک گئی؟“

”لیکن گل بانو کی ماں! فرید خاں کسی قدر مطمئن انداز میں کہنے لگا: تم نے یہ بھی سوچا کہ شادی نہ کرنے کی صورت میں سماج کیا آواز دے سکے گی؟“

”کیا؟“ گل بانو کی ماں نے رازدارانہ لہجہ میں دریافت کیا

”یہ کہ لڑکی جو ان ہونے کو آئی، اور ماں باپ کو اس کے بیاہ کی

نکاح نہیں، اور.....“

”اور کیا؟“ گل بانو کی ماں نے پوچھا۔

”اور شاید پھر... سماج تمہاری نیک سیرت لڑکی پر بد چلنی کا الزام بھی لگائے اور اپنی تہمت سے ہمیں اس قابل نہ رکھے، کہ ہم

پھر دنیا کو منہ بھی دکھا سکیں۔“

گل بانو کی ماں بے شک کسی قدر سست پڑ گئی۔

گل بانو نے جب یہ گفتگو سنی تو اس کے خفقانہ بات بیدار ہو گئے

کے لئے میں ہرگز تیار نہیں :-

”کیوں؟ کوئی وجہ؟“

”وجہ میں نہیں جانتی“

”مے؟“ گل باؤ کی ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا: اب تجھے

وجہ بھی معلوم نہیں تو پھر ناراضا نہ کیوں کرتی ہے؟ اسے ہم ترسے دشمن تو ہیں، نہیں جو تیری برائی چاہیں گے، باوا نے خود تیسرے لئے دو ہاتھ ڈھونڈا ہے۔ شہباز کتنا اچھا لڑکا ہے، خوبصورت، پڑھا لکھا، پھر اس کے پاس کچھ کمیت بھی ہیں، اور تو کیا چاہتی ہے؟

”نہیں ماں! میں شادی نہیں کر سکتی“

”ارے۔ یہ کیا بات تو قہری ہے۔ تیرے باپ نے سن پایا تو، اسکو کتنا صدمہ ہو گا، اس نے خود بروہو مٹا ہے“

یہ باتیں اندر باور میں خازن میں، ماں اور بیٹی کے درمیان سو رہی تھیں، جہاں تیسرا، کوئی تھنٹھن بھی نہ تھا۔ فرید خاں باہر آگئی میں منہ ہاتھ دھو رہا تھا۔ جب اس سے فارغ ہو کر اندر آئے لگا تو اس نے اتفاقاً ان کی گفتگو کا آخری حصہ سن لیا۔

”کیوں گل باؤ کی ماں آخر مجھے صدمہ کیوں ہونے لگا؟“

پہلے تو وہ عجیب شش درج میں ڈر گئی، کہ کیا کہے یہ..... نہ کہے پھر بیکر کڑیاد فرید خاں پہلے ہی گھلا پوری گفتگو سن چکا ہے۔ اس نے بادل نا خواستہ ہوئی،

”یہ تمہاری گل باؤ شادی کے لئے آمادہ نہیں :-

”کیوں؟ فرید خاں نے تعجب سے پوچھا، اور پھر تریب آگئے باؤ کی تھوڑی بکڑ بکڑ :-

”کیوں بیٹا؟ کیا یہ سچ ہے؟“

”ہاں باوا! میں اپنی وجہ سے آپ کو پریشانی میں ڈالنا نہیں چاہتی۔ پریشانی کیس گل باؤ؟“

”میداد اور فروخت کر کے جب آپ روپے کسی کو دے دیں گے تو خود کیا کھائیں گے باوا! میں آپ کو محنت مزدوری کرتے دیکھوں، یہ ناممکن ہے“

فرید خاں نے اپنی لڑکی کا آخری جملہ سن کر ہنس دیا، اور گویا

ایک خندہ زیر لب میں ساری گفتگو کو تحلیل کر دیا۔

یہ تیرے سوچنے کی چیز نہیں گل باؤ! تو ہی تو میرا واحد کھلوٹا ہے پھر کیوں نہ میں تیری خوشی کے لئے بھلیکھ مول لوں، اور اسی بھلیکھ کو اپنے لئے راحت سمجھوں :-

(۳۱)

شہباز جس سے گل باؤ کی شادی کی باتیں سو رہی تھیں، حسن پڑے زیب ہی ایک گاؤں میں رہا کرتا تھا۔ اس کا باپ گاؤں کے خوشحال آدمیوں میں شمار ہوتا تھا۔ کچھ اپنی کاشت ختی، دو چار ہل بیل تھے، اور گھی دودھ کے لئے کائے بھینس کی بھی کئی نہ تھیں۔ شہباز کی عمر ۲۰ کے گنگ جھنگ ہو چکی تھی، اس نے اس کا باپ چاہتا تھا کہ جہاں بھی ہو جلد سے جلد اب اسکی شادی کر دیکھائے۔ لیکن مشکل تو یہ تھی کہ، بغیر فائش کے شادی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جہاں سے بھی شادی کا پیام آتا شہباز روپے ہی طلب کرتا۔ چنانچہ جب فرید خاں نے گل باؤ کے لئے یہاں پیام بھیجا، تو شہباز کے باپ نے ڈھائی سو روپوں کی گرانٹیا رقم طلب کی۔ جس کو فرید خاں نے آخر قبول کر لیا۔ نہ قبول کرتا تو پھر چارہ ہی کیا تھا۔ ہر جگہ سے تو روپے ہی طلب کئے جاتے تھے کسی کی جیب تو اسے بھرتی ہی پڑتی۔

(۳۲)

فرید خاں نے گل باؤ کو شادی میں دینے کیلئے چاندی کے چند روپے اور چند..... روپوں کا تیل ہی سے انتظام کر رکھا تھا۔

اب فردرت تھی تو ڈھائی سو روپوں کی، لیکن فصل بچنے میں بھی دو ماہ کی دیر تھی، اور اس سے قبل فرید خاں روپے کہاں سے بہا کرتا، لیکن اس نے سوچا کہ شہباز کے باپ سے کفالت و شنید کر کے ہم شادی انجام دے دیں۔

بسیاکہ کے بیٹے کی تہہ دہی تھی، اسکی خواہش تھی کہ اسی زمینہ کو اندر خرید بیجاں بن جائے۔ کیونکہ اس کے بعد جھیل کا زمینہ آتا تھا اور اتنی گرنی میں شادی کے انتظامات کرنے میں کس قدر دشواریاں ہوتی ہیں۔ فرید خاں اس سے بخوبی واقف تھا۔ چنانچہ اس نے شہباز کے باپ کے پاس آکر پھر بیکر یہ بات طے کر لی کہ بسیاکہ کی چند ہویں تاریخ کو

شادی ہو جائے گی۔ روپوں کے متعلق اس نے کہا، جیسا کہ فصل کٹے پر غلہ جیسے ہی تیار ہو گا وہ اسے فروخت کر کے روپے دے دیں گے۔

چنانچہ شہباز کے باپ نے اسے قبول کر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ فرید خان اپنی غربت و تنگدستی کے باوجود جو بڑا یادگار باغ نہیں بنے۔ جب اس نے فرید خان سے وعدہ کیا ہے، تو جس طرح بھی ہو وہ شادی کے بعد جیسے تک روپے ضرور ادا کر دے گا۔

چنانچہ میاں کے چند روپے تاریخ آئی اور شہباز و گل بانو دونوں رستہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

دن بھٹے اور بھٹے پہنے میں تبدیل ہونے لگے، فرید خان نے اگلی محنت کرنا شروع کر دی تھی، منہ اندھیرے اٹھتا اور کھیت پر چلا جاتا، دن بھر وہیں کام کاج میں لگا رہتا۔ جب وہ یہاں سے وہاں تک اپنے سرسبز لہلہاتے کھیتوں کو دیکھتا، تو اس کا دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا، کھیتوں کے درمیان اس نے اپنے لئے بانس کا ایک بچان بنا رکھا تھا، جس پر بیٹھ کر وہ کھیتوں کی نگرانی کرتا رہتا، پھر کنوئیں سے پانی بھر کر کھیتوں میں ڈالتا، اسی کے فرانس میں داخل تھا، دھوپ کے وقت کھانا لیکر گل بانو کی ماں خود ہی کھیتوں پر چلی جاتی، فرید خان جانتا تھا کہ اس سال کی فصل اب اسکی ہینگلی شہباز کی ہے۔ اس لئے اس شخص ہر ممکن کوشش کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلہ پچھلے سالوں سے بھی زیادہ پیدا ہوا، خود گل بانو دیکھتی تھی کہ اس کا باپ چلے سے کہیں زیادہ، ہنساک سے محنت کرتا رہا ہے۔ اکثر اس نے اپنے باپ کو اس سے باز رکھنے کی کوشش بھی کی، لیکن بے سود، فرید خان نے ذرا بھی توجہ نہ کی۔

گل بانو شادی سے پیشتر کھڑا ازدواجی زندگی کے سہانے خواب دیکھا کرتی تھی، لیکن انہوں نے یہ وہ خواب تھے، جو شرمندہ تعبیر نہ ہوئے ایک ماہ گزرنے پر گل بانو اس حقیقت سے آشنا ہو گئی تھی کہ شہباز کو اس سے نہیں اس کے باپ کے کھیتوں سے محبت ہے۔ گل بانو پر ابھی طرح آفکندہ ہو گیا تھا کہ شہباز ایک پیکر تھا، دوسیت کا اور اس کے سوا کچھ ہی نہیں، وہ جو کچھ بھی کرتا، اس میں اس کے ذاتی اغراض نہایتا ہوتے، چنانچہ شادی میں بھی اس نے اسی کا جو پار کیا تھا۔

کھیتوں میں فصل کٹ کر تیار ہوئی، فرید خان کی خوشی کا کوئی ٹکڑا

نہ تھا، اس کے کھیتوں میں اس سال تمام گاؤں والوں سے زیادہ غلہ پیدا ہوا تھا، یعنی جہاں اور لوگوں کے کھیتوں میں، بالعموم ایک بیگہ زمین میں دس من غلہ پیدا ہوا، وہاں فرید خان نے ایک بیگہ میں پندرہ من پیدا کیا، اس کامیابی میں جہاں غلامی غلامتیں شامل تھیں ان خود فرید خان کی جان تو محنت کو بھی کافی دخل تھا، اخیر میں تو یہاں کو بھی، اپنے کھیت ہی میں بچان پر سوتا، تاکہ تاریکی شب میں کوئی ہشت اس کی فصل کاٹ کر نہ لے جائے، جیسا کہ ہر سال گاؤں والوں اور بالخصوص فرید خان کے ساتھ پیش آتا تھا۔

الغرض فصل کٹ کر گھلیاں پہنچی، اپنے غلے کے انبار پر جب فرید خان لگاؤ ڈھونڈتا تو باغ باغ ہو جاتا، یہی اس کی سال جبر کی کمائی تھی، اور اس تقاریر سے اس کا سر دھڑکا، ایک فطرتی امر تھا۔

شادی کے بعد میں دونوں تک تو گل بانو شہباز کے گھر چلی، اور پھر اس کے بعد دونوں محسن پور چلے آئے، جیسے آگیا تھا، اور شہباز اپنے روپوں کے لئے سپٹم براہ تھا۔

یہاں پہنچ کر جب اس نے فرید خان کے غلہ کا انبار دیکھا، تو دل میں ایک قسم کی حسرت محسوس کی، لیکن اسے اب یہ اندیشہ لاحق ہو کر شاید اس کا سسر اس سے دغا بازی کرے، اور وعدہ کی رقم ہضم کر جائے۔ شاید اپنے ہی سیاہ دل کو مقرر کر کے شہباز دوسروں کے دلوں کا بھی جائزہ لینے کا عادی تھا، یہی وجہ تھی کہ فرید خان کی طرف سے بھی اس کے دل میں قسم قسم کے شکوک پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے، اسے کیا خبر کہ فرید خان کے دل میں کتنی تنہا کتنی آرزو تھی کہ وہ جلد سے جلد اس بارگراں سے سبکدوش ہو جائے، چنانچہ شہباز اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو اطمینان دلانے کیلئے گل بانو سے بار بار پوچھتا۔

”تنہا اسے باوانے رویوں کا وعدہ کیا ہے..... جانتی ہوں؟“

”ہاں معلوم ہے“

یہ کھیر گل بانو ٹال تو دیا کرتی، لیکن شہباز کے اس قسم کے سوالات سے گل بانو کے دل سے اسکی وقعت و عظمت آہستہ آہستہ گھٹتی جاتی تھی: — اسی دن شام کو نرمی کے کنا سے شہباز اور گل بانو دونوں بیٹھے تھے، نصائیں ایک قسم کی اداسی تھی، اور شام کے دھندے



مقصود سامنے آجاتی ہے۔ اور فرید خاں اس درخشاں ہیرے کو اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے۔ لیکن افسوس وہ اسی کے لئے جو بھی وہ قدم نیچے بڑھاتا ہے اس کے پاس استقلال کو لغزش ہوتی ہے اور وہ لرزھکتا ہوا پتھر کی چٹان کی طرح نیچے آ رہتا ہے۔

گل بانو نے یہ منظور کیا اور اس کی خوت و وحشت سے چھٹیں نکل پڑیں۔ ایسی نلک شکاف چھٹیں جو انتہائی سرسبزی کی حالت میں انسان کے منہ سے نکلتی ہیں اور پھر جو گل بانو نے بیدار ہو کر اپنی آنکھیں دیکھ کر اٹھیں تو آگ آگ کی دھشت انگیز آواز بجلی کی سرعت کیساتھ اس کے کانوں کے پردے سے پار ہو گئی۔ فوراً ہی وہ چادر پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور دیکھا کہ شہباز اور اس کی ضعیف ماں دونوں دیوانوں کی طرح رات کی پرہیز تاراجی میں کسی چیز کی پروا کئے بغیر دوڑے جا رہے ہیں۔ گل بانو بھی ان کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگی، اور چند ہی لمحے کے بعد جب وہ شہباز کے برابر ہو گئی تو اس نے پوچھا۔

”آگ کہاں لگی ہے؟“

”تہا سے باوا کی کھلیاں میں“

اور پھر سب مل کر زیادہ تیزی سے روتے پھٹتے، چپتے چلتے دوڑنے لگے۔ گاؤں کے کنویں کے پاس کے پاس سے کھلیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ قیامت کا نظارہ تھا، ہر طرف آگ ہی آگ نظر آ رہی تھی، فریادیں سامنے درود کرنا، کچھ پیٹھ ہاتھ اس کی اتنی محنت کی کھلی، آگ اس کی آنکھوں کے سامنے اسی کی غفلت سے راکھ کا ڈھیر جو رہی تھی، مثل مشہور ہے کہ آگ بجھانے نہیں سمجھتی اور اس کی لپٹیں روکے نہیں رکھتیں چنانچہ ہوا تیز تھی اور فریادیں کے انبار سے اب آگ در سروں کے انبار تک پہنچ گئی، گاؤں والے اس وقت تک جمع ہو چکے تھے، سبوں نے متحد ہو کر آگ بجھانے کی ہر ممکن تدبیر کی، لیکن قسمت کے فرشتے سکڑا رہے تھے۔ اللہ انہی تمام کوششیں مانگاں گئیں، اس نتیجہ فرید خاں کے علاوہ گاؤں کے دواہ آدھوں کے غلے جل کر خاکستر ہو گئے۔

فرید خاں کو اس حادثہ سے کتنا ہونچا ہو گا۔ اس کا اندازہ کچھ وہی لگا سکتے ہیں جو ایسی مصیبت سے کبھی دو چلے ہوئے ہوں گل بانو اللہ اس کی ماں تو غم و الم میں مدتی چھٹی جیسا کہ اور سینہ کو بلی کرتی تھیں

میں دور تلوں سے پرے ملی کے ڈنٹے چوٹے، بیڑے کے مکانات ایک عجیب غم، بجز سماں پیدا کر رہے تھے۔ اور شہباز نے گل بانو کے جذبات کو زیادہ سے زیادہ مجروح کرنے کیلئے پھر وہی پرانی گفتگو پھیر دی۔

”کل تمہا سے باوا غلہ فروخت کر رہے ہیں۔ گل بانو؟“

”ہاں، سنتی تو میں بھی ہوں۔ گل بانو نے بیزاری سے کہا۔“

”روپے تو مجھے کس بلی جائیں گے نا؟“

”یہ سوال تمہیں میرے باپ سے کرنا چاہیے۔“

”اور جو تم سے پوچھوں تو؟“

”یہ تمہاری جگہ تو فنی ہے۔“

کچھ دیر کے بعد دونوں گھر واپس آئے گل بانو آج انہی خدو غرض شوہر کی گفتگو بہت متاثر ہوئی تھی۔ اس نے اس کے چہرے پر اسکا کافی اثر موجود تھا، بہت دیر تک وہ ماضی کو سوچتی رہی۔ وہ رنگین خواب اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے۔ جنہوں نے شادی کو قبل اس کے دل و دماغ میں گھر کر، کہا تھا وہ دیکھ رہی تھی کہ شہباز کی بستی کس طرح ایک خوفناک زلزلہ کی مانند، اس کے تصورات کی رنگین دنیا میں داخل ہوئی اور اس کو بری طرح سمار کر کے چلی گئی، لیکن افسوس عمارت منہدم ہو جانے کے بعد اب صبر و شکر کے سوا وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔

اسی حالت میں اسے نیند گئی اور اس نے دیکھا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ پہاڑ کے لاقصابی سلسلے کے سامنے کھڑی ہے۔ ہر چار طرف دھند لکا سا چھایا ہوا ہے۔ صوف پہاڑ کی انتہائی بلندی پر ایک بڑا سا ہیرا اپنی درخشاں سے آس پاس کو منور کر رہا ہے۔ گل بانو کی لچائی نگاہیں اس پتھر کے ٹکڑے پر پڑتی ہیں، اور جب فرید خاں کو اپنی لڑکی کے شوق کا علم ہو جاتا ہے تو وہ کسی چیز کی پروا کئے بغیر اس کو اپنے قبضہ میں لانے کے لئے پہاڑ پر چڑھنے لگتا ہے۔ جاتے وقت خود گل بانو کو جان لیوا خطرناک ہم سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے لیکن فریادیں اس سے اثر پذیر ہونے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے۔

راستہ میں سینکڑوں قسم کی رکاؤں میں روڑے لگا دیے ہیں لیکن یہ عزم کا پختہ مستقل مزاجی سے اوپر بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ منزل

لیکن فرید خان پرگوں یا سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ نہ کسی سے ہمتاؤ تھا نہ نہ  
نہ ملہا برقم کے لئے گریہ و زاری کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس  
کے دماغ کی ساری قوت سلب ہو چکی ہے اور وہ اب ایک لفظ  
بھی کسی زبان پر نہ لائے گا۔

اس واقعے کے تیسرے دن گل باؤں شام کے وقت آنگن میں  
امرو کے درخت کے نیچے اداس بیٹھی تھی پوری فصل صبح کر خاک  
ہو گئی تھی اور اس سے اسے بہت صدمہ پہنچا تھا، شہباز کہیں باہر گیا  
ہوا تھا جب وہ آیا تو بچکے سے گل باؤں سے مخاطب ہو کر بولا۔

”اب میرے روپوں کا کیا ہو گا گل باؤں؟  
”جس نے وعدہ کیا ہے اس سے پوچھو، گل باؤں نے شکستہ  
آواز میں کہا۔

”ان سے کیا پوچھوں؟  
”یہی کہ وہ تہا را قرض کب ادا کریں گے؟  
”گل باؤں کیا تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو؟  
”نہیں!۔۔۔ گل باؤں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔  
”تو کیا اپنے باپ کی طرح تم بھی مجھے بیوقوف بنا رہی ہو؟  
”بنا تو کوئی نہیں رہا ہے۔ شاید تم خود... ہی بیوقوف بن چکے ہو؟  
”مطلب؟ شہباز نے آنکھیں ملا کر پوچھا۔  
”مطلب یہ کہ ایسے وقت اس قسم کے سوالات کرنا بیوقوفی  
نہیں تو اور کیا ہے؟

”تو گویا روپوں سے میں اب ہاتھ دھوؤں؟  
”ہاتھ دھونا یا نہ دھونا یہ تمہارے اختیار کی بات ہے۔ لیکن  
انتظار و رکاوٹ نہ ہو، کہ انسان کو موقع و محنت کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے۔  
دوسرے دن شہباز نیک ایک غائب ہو گیا۔

فرید خاں نے گاؤں میں ادھر ادھر تمام دھونڈا لیکن کہیں ہوتا  
تو نہ تھا۔ وہ توجہ کر کے گاؤں بھاگ گیا تھا۔ جب فرید خاں تلاش  
کرتے کرتے تھک گیا، تو اسے گل باؤں کی ماں سے یہ خبر ملی کہ شہباز روٹ  
کر چلا گیا ہے لیکن اس کا اسے یقین نہ آیا۔ اور اس نے گل باؤں سے  
جا کر پوچھا۔

”بیٹی آخر شہباز اس طرح بغیر کچھ کہے سنے کیوں چلا گیا؟  
گل باؤں خاموش رہی۔

”کچھ حلوم ہو تو بتا دو گل باؤں! آخر وہ مجھ سے بغیر کچھ کہے سنے کیوں  
چلا گیا؟

گل باؤں نے اب بھی اپنی زبان کو زحمت گفتار نہ دی۔  
”کیا تجھ سے کچھ جھگڑا ہوا؟ فرید خان نے قدم سے عاجزی سے پوچھا  
باپ کا اصرار بہت بڑھ گیا تھا۔ ادھر گل باؤں کے لئے اب خاموشی یہ  
مصر رہنا ناممکن تھا

”نہیں دادا! وہ آہستہ سے بولی۔

”تو بچہ کو کسی وجہ ہوئی؟

”انہیں اپنے روپوں کی قلت سے مایوسی ہو گئی تھی۔ گل باؤں بالاجب  
سے بولی

”مایوسی؟ فرید خاں نے متعجب ہو کر پوچھا۔ کیا وہ ایسے بڑے نہیں  
تجربے روپوں کا تذکرہ کر رہا تھا؟

”ہاں دادا۔“

فرید خاں پر ساری حقیقت آشکار ہو گئی اور سلسلہ گفتگو کو باقی رکھنے  
کی تاب اس میں نہیں رہی۔

مثل مشہور ہے مصیبت تنہا نہیں آتی۔۔۔ فرید خاں کے غلے  
میں آگ لگنے کے سبب سے جن دو آدمیوں کی فصل مذرا لٹش ہوئی  
تھی، انہوں نے اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی اور غلے میں پو  
لکھوا دی۔ چنانچہ فرید خاں دوسروں کے انبار میں آگ لگانے کے جرم  
میں گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمہ شروع ہوا۔ فرید خاں تو برابر راست ہی  
میں رہا آخر اسکا دینا میں تھا ہی کون؟ جو اس کی ضمانت قبول کرتا  
مرد کی صورت میں البتہ ایک شہباز تھا۔ لیکن اس جیسے انسان سے اس  
قسم کی توقعات قائم کرنی جو اس قلعے تعمیر کرنے سے کم نہ تھا۔ گاؤں کے  
چند ٹیک دل آدمیوں نے فرید خاں کی حمایت میں مقدمہ کی پیروی کی  
عدالت کے فیصلے سے فرید خاں بے قصور ثابت ہو کر اپنے گاؤں میں  
غور آیا لیکن ایک مغل، بھیک سنگھ کے روپ میں، مقدمے کی  
پیروی میں اس کی رہی بھی جائے لا ختم ہو چکی تھی۔

کی تہا ہر سہینا، لیکن کوئی بھی اس کے ذہن میں .... نہ تھی، آفریادیک  
دن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود ہی شہباز کے پاس جائے، اللہ کے  
سمجھ بھبا کر اپنے ساتھ لیتا آئے۔ اس طرح اسے یقین تھا کہ  
مغل بانو کی صحت دوبارہ عود کر آئے گی، جیسے جیسے وہ اس کے متعلق  
سوچتا اسے اس کا زیادہ سے زیادہ یقین ہوتا جاتا کہ شہباز اس  
کی عرض قبول کرے گا۔ وہ خیال کرتا شہباز آخر کتنا ہی برا ہو، پھر  
بھی اس کا داماد ... ہے۔ . . . . ناممکن ہے کہ وہ اس کے  
پاس رحم و کرم کی درخواست لیسکر جائے، اور شہباز اس کی تکلیف  
کو اپنی بے رحمی سے کھل دے۔

ان تصورات سے مسرت کی ایک لہر فرید خاں کے چہرے پر  
دور گئی، اور وہ مسکرانے لگا، جیسے کوئی نعمتِ خداوندی انداز میں اپنی کامیابی  
پر مسرور ہو رہا ہو۔ دوسرے دن صبح سویرے اس نے اپنی بڑی  
سی لائٹی، اور شہباز کے گاؤں کی چل پڑا۔  
جاتے وقت گل بانو کی ماں نے پوچھا: "کہہ کر مارا وہ ہے؟"  
"شہباز کو لانے جا رہا ہوں۔" فرید خاں اتنا کہہ کر مسکراتا  
ہوا آگے بڑھ گیا۔

گل بانو اور اس کی ماں دونوں شہباز کی فطرت سے بخوبی واقف  
تھیں لیکن جس طرح تپ دق کے مرضی کو آفریقہ تک اپنی لذت  
کی امید رہتی ہے۔ اسی طرح یہ دونوں ماں بیٹی بھی امید کے خلاف  
شہباز کی واپسی کی امید کرنے لگیں۔

دوسرے دن شام کے وقت گل بانو کی ماں نے پورے مکان کو گشت  
سٹھرا لیا۔ اور پھر تمام چیزوں کو مناسب جگہ پر تزیین سے رکھ چھوڑا۔  
اس خیال سے بے حد مسرور تھی، کہ تین چار ماہ بعد اس کا والد پھر  
یہاں آئے گا۔ اور اس کے لئے وہ ہر لمحہ چٹم برہم تھی۔

رات کے دس بجے فرید خاں گھر واپس آیا لیکن گل بانو اور اس  
کی ماں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب انہوں نے یہ دیکھا کہ شہباز  
اس کے ساتھ نہیں فرید خاں کے چہرے پر بالواسی اور اضمحلال کھنڈا  
ہوا تھا، اللہ کیا معلوم ہوتا تھا، کہ وہ کسی بہت بڑے حد سے  
دوچار ہو رہا ہے۔

مقدمہ کے دور میں گل بانو نے شہباز کو متعدد خط لکھے۔ لیکن  
اس مشکل انسان پر اسکا مطلق اثر نہ ہوا اور اس نے کوئی توجہ نہ کی  
دن بچنے اور بچنے سمیٹوں میں تبدیل ہو گئے۔ فرید خاں اب  
بہت پریشان حال رہنے لگا، اس کے پاس صرف ایک بیل گاڑی تھی  
رہی تھی جسے سسٹے واسوں نے زبردستی کر کے اس نے خود نوٹس کا سنا  
ہینا کیا۔ اللہ چنیدہ بعد جب وہ بیٹے بھی ختم ہو گئے تو فرید خاں نے اپنا سنا  
زیندار کے ہاں رہیں کہ وہ گویا قسمت نے اس کا آخری سہارا بھی اب  
اس سے چھین لیا تھا۔

گل بانو کی صحت پر ان چیزوں نے خاص اثر پیدا کیا، اس کی رنگ  
روز بروز زرد ہوتا جا رہا تھا، اور وہ قبل از وقت بوڑھی معلوم ہونے لگی  
تھی۔ مگر یا اسکا شباب اب نہ چڑا کر اس سے رنجست ہو رہا تھا، وہ  
چہل پل تھی، نہ وہ بشاشت اور نہ وہ انداز زیادہ تر خاموش سی رہتی  
اور محو کے لاتنا ہی سمندر میں موط زن! زندگی کی ناکامی کا حال گل بانو  
پر اچھی طرح آشکار ہو چکا تھا۔ اور وہ دیکھ رہی تھی کہ قدرت اس کے  
ساتھ کیسا تلخ مذاق کر رہی ہے۔

نہ ہی کما رے وہ اب بھی پانی لانے کے لئے جاتی تھی، پھروں  
پر تیلیوں کا رقص وہ اب بھی دیکھا کرتی تھی، لیکن اس انداز سے جیسے کوئی  
بے حس انسان اسے دیکھ رہا ہو، اب نہ وہ انگلیں اٹھتیں اور نہ بھروسہ  
شوق کے وہ ولولے، کبھی کبھی وہ طاؤس کے دیوانہ وار رقص سے بھی  
دوچار ہو جاتی تھی، اور اس کی دیر سے پھر خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتی تھی  
لیکن اب اس کے خوابوں میں وہ لطافت اور رنگینی نہ ہوتی، بلکہ ان پر  
حزن و غم اور ریج و راجوسی کی تاریک اور بیابانک گھٹائیں چھلتی پھرتیں  
اس کی زندگی اس گلاب کی مانند تھی، جو کسی دیرین کھنڈر کے ایک گوشہ  
میں کھلا اور وہیں ... تمازت آفتاب سے کھلا کر مر جاتا تھا۔

محبت کے لاتعداد خواب گل بانو نے شادی سے قبل دیکھے تھے  
لیکن سب ایک ایک کر کے غلط ثابت ہوتے گئے گویا وہ محض نقش  
بر آب تھے، جن کا وجود اس مادی دنیا میں ناممکن تھا۔

فرید خاں اس انقلاب کو بغور دیکھ رہا تھا، جس سے اس کی بڑی  
اسوخت و دوچار ہو رہی تھی، روزانہ وہ اس بڑھتے ہوئے سیلاب کے دنگے

”شہباز کو ساتھ نہیں لائے؟“ گل بانو کی ماں نے حیرت سے پوچھا۔

”چوری؟“

”اگے پر راضی نہیں ہوا۔ فرید خاں مایوسی سے ہوا۔

”کیوں؟“

”روپے مانگتا تھا۔“

”تو کیا اسے تمہاری موجودہ حالت کا علم نہیں؟“

”علم کیوں نہیں؟ میں نے خود ہی اسے تمام حقیقتوں سے آگاہ

”کیا وہ ہاتھ جوڑ کر اس سے درخواست کی، کہ وہ میری حالت پر ترس

”تھا کہ روپے اب معاف کر دے اور گل بانو کو دوبارہ اپنی خدمتگاری

”کا موقع دے؟ فرید خاں نے کہا۔

”تو کیا اس پر بھی اس کا دل نہ سمجھا؟“

”نہیں! گل بانو کی ماں! ترس کھانا تو کھا، اس نے اپنے گاؤں کو

”سب آدمیوں کے سامنے مجھے ذلیل کیا؟“

”یہ کس طرح؟ گل بانو کی ماں نے حیرت سے پوچھا۔ جیسے اسے

”اسکی توقع نہ تھی۔

”مجھے چور اور بے ایمان کہا اور یہی نہیں، بلکہ گل بانو کو طلاق دے

”دینے کی بھی دھمکی دی؟ فرید خاں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”طلاق؟ گل بانو کی ماں نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

”ہاں طلاق! فرید خاں کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلتے۔

”قدرے توقع کے بعد فرید خاں نے پھر کہا شروع کیا۔ ”بچو

”میں کو شہباز یہاں آئے گا گل بانو کی ماں! جب اس نے دوبارہ طلاق

”دینے کی دھمکی دی تو میں نے اس کو روپیہ ادا کر دینے کا وعدہ کر لیا

”جب کے دن وہ اسی غرض سے یہاں آ رہا ہے۔ روپے پا جانے کے

”بعد شہباز تمام معاملات کو راہ راست پر لے آئیگا۔“

”لیکن تم اسے روپے دو گے کہاں سے؟ گل بانو کی ماں نے

”اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”ابھی تمام راہیں مسدود نہیں ہوئیں گل بانو کی ماں.....

”ایک راہ تو اب بھی کھلی ہوئی ہے؟“

”وہ کونسی؟ اس نے اپنے منہم چہرے پر خوشی کی لہر پیدا

”کرتے ہوئے پوچھا۔

”چوری؟“

”تجربہ؟ گل بانو کی ماں نے حیرت سے دھرایا۔

”اے اب! اسے سو کوئی چارہ نہیں؟“

”باپ کی گھٹکوسنگڑ گل بانو کا دل ٹوٹے ٹوٹے ہو گیا، طلاق کا

”لفظ معاذ اللہ! گل بانو کو ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کسی نے اس کے

”سینہ میں چھری بھونک دی ہے۔ اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود بھی اسے

”شہباز سے ایسی توقع نہ تھی، یہ اس کے دہم میں بھی نہ تھا، کہ اس کا شو

”اب اتنا خطرناک قدم اٹھائے گا۔

”گذشتہ واقعات ایک ایک کر کے اس کی تپلوں کے سامنے قوس

”کرنے لگے۔ کس طرح شہباز نے کھلیان میں آتش زدگی کے باوجود

”اس سے روپوں کا تذکرہ کیا تھا..... پھر اس کا موٹہ کر بھاگ

”جانا، اور فرید خاں کو طرح طرح سے گاؤں والوں کے سامنے ذلیل ہوا

”کرنا، اور پھر روپے نہ دینے کی صورت میں طلاق دے دینے کی دھمکی!

”ان باتوں کو سوچ کر گل بانو کے جسم میں لرزہ پیدا ہو گیا

”چون گز گئے۔ اور فرید خاں روپے جیتا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا

”آج صبح کو اس کا دل تھا، اور گل صبح سویرے اسے شہباز کو روپے دینا

”تھے۔ لیکن ابھی ایک رات باقی تھی، اس نے فیصلہ کیا، کہ آج کی رات

”نصف شب گزر جانے کے بعد وہ زمیندار کے گھر چوری کرے گا۔

— چوری!—

”گل بانو کو اپنے باپ کا ارادہ معلوم ہو گیا۔ وہ جان گئی کہ اس کا

”باپ صحت اس کی خوشی کے لئے آج کتنا خطرناک اور تباہ کن قدم

”اٹھانے والا ہے۔

”وہ منتظر اب اسکی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگا۔ جب اس کا

”باپ چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا جائے گا..... اور پھر اسے

”اپنی زندگی کا آخری..... بالکل آخری حصہ جیل کی تاریک

”تنبہائیوں میں گزارنا پڑے گا، اور سماج زندگی بھر اسے کیلے گی ایک

”چھ..... حقیر اور ذلیل چور۔ سو سائنی کا ٹھکرایا ہوا..... درگاہ

”ایرادی کا دانہ ہوا!

دلا سکتی تھی بس مرثیہ: اس کے علاوہ دوسری کوئی اور  
تدبیر نہ تھی۔

(۵۱)

دوسرے دن صبح سویرے شہباز خوشی میں چورڈھانی سوداؤں کی  
قبیلے لینے کی غرض سے جھومتا جھومتا حسن پور چلا آ رہا تھا گاؤں کو  
عین وسط میں مسجد تھی اور فرید خاں کے گھر پہنچنے کے لئے مسجد  
سے ہو کر گزرتا پڑتا تھا، چنٹا پنڈ جب شہباز مسجد کے قریب پہنچا  
تو دیکھا کہ کسی جنازے کی نماز ہو رہی ہے۔ پاس ہی چند لڑکے کھیل  
رہے تھے۔ شہباز نے ان میں سے ایک سے پوچھا:

”بچے! یہ کس کی لاش ہے؟  
گل بانو کی رات اس نے خودکشی کر لی ہے۔“

اور وہ خودکشی کھلانے کی۔ ایک چور کی مٹی۔ دینا اچھے  
جی حمارت کی نگاہ سے دیکھے گی، اور پھر وہ عزت اسے سماج میں کبھی  
حاصل نہ ہوگی، جو آج اس کو نصیب ہے۔ جبکی آج یہ مستحق ہے۔

جیسے جیسے گل بانو ان باتوں کا خیال کرتی تھی، اسکی پریشانی بڑھتی  
جاتی رہی، ایسا محسوس ہوتا تھا، کہ وہ ایک ایسی دنیا میں پہنچ گئی ہے  
جہاں مرثیہ تاریکی ہی تاریکی ہے۔ جہاں روشنی کی ایک کرن بھی  
مہرور نہیں اور بگ بگ بانو کو اس بولناک فطرت کدہ سے باہر نکلنے  
کی کوئی ہیرہ نہ سمجھی تو پھر اس نے لاچار ہو کر ایک ارادہ کیا۔ خونگٹا  
ایسا ارادہ، جو اس کے باپ کو ان تمام رسوا یوں اور ذلتوں سے بچا  
سکتا تھا، جن سے وہ مغریب و وچار ہو گیا تھا، مرثیہ ہی ایک واحد  
ذریعہ تھا، جس سے یہ بے خاندان کو تمام تکالیف سے نجات

جناب رام جوایا خنداں

”شکار“

یہ دشت تھا کبھی مرکز مری نگاہوں کا  
نہیں وہ حسن یہاں اسنے اداسی نہیں  
وہی ہے وقت وہی جھیل کا کنارہ ہے  
وہی بہار کا موسم وہی ہوا میں ہیں  
بہت شکار ہے لیکن شکار کون کرے!  
کسی حسین شکاری کی یاد آتی ہے  
تھا ڈرہ ڈرہ حسین ان شکار گاہوں کا!  
بہت اداس تھی تصویر رنج و یاس میں  
فضا میں شام و شفق کا وہی نظارہ ہے  
کہیں کلنگ کہیں قاز کی صدائیں ہیں  
اداس لمحوں کو اب خوشگوار کون کرے  
مرا خیال شکار غم جدائی ہے

کسی کی یاد سے اس وقت بقیار ہوں ہیں!

غم جدائی کے صدموں کا خود شکار ہوں میں

جناب اثر چکوالی بی' اے

## حدیث نگاہ

فضائیں مست ہیں اگر دُش میں جام ہے ساقی  
نوائے دردِ محبت کسی کو راس نہیں!  
بڑے غمِ دور سے یہ کہہ رہا ہے پروانہ!  
فلک کو چیر کے آگے گزر گیا ہوں میں  
نہ کہہ یہ مجھ سے کہ انجسامِ کار کیا ہوگا  
جس آبِ زنگ میں چاہا، اسی میں دیکھ لیا  
مرے کدو ہے روشن جہانِ تیسرہ قار  
پیامِ موت ہے دل کے لئے نمودِ ثبات  
مری نگاہ میں ہسم مشربِ جنوں کے لئے  
بہت محال ہے خوب اور زشت میں تمیز  
خود اپنی نظروں میں احساسِ اپنی ذلت کا  
جنوں نوازیوں کا اذنِ عام ہے ساقی  
مذاقِ کتنا زلمنے کا خام ہے ساقی  
حیاتِ سوختنِ ناقص ہے ساقی  
بہت بلند نظر کا مقام ہے ساقی  
کہ میرا عشق سراپا دوم ہے ساقی  
جہانِ میری نظر کا غلام ہے ساقی  
مرا کدو ہے، کہ ماہِ تمام ہے ساقی  
حیاتِ ایک تغیت کا نام ہے ساقی  
خدا گواہ! بڑا اہم ہے ساقی  
مذاقِ عشق کچھ اس طرح عام ہے ساقی  
ضمیر کے لئے مرگِ دوم ہے ساقی

میں مار کر بھی ہوں سرگرم بزمِ ہستی میں  
غلط غلط کہ مرادِ وقِ خام ہے ساقی

جناب محمد ایوب

# طلوعِ عمر

افراد:- سرسرایہ دار سپاہی مزدور - شاعر  
منظر:- ایک تنگ و تاریک گھر - وقت:- چابکے شب۔

حالات:- چاروں افراد اسیرانِ جنگ ہیں جنہیں جج قتل کیا جائے گا۔

سرسرایہ دار:- اُٹ رات کتنی جلد ختم ہو رہی ہے۔  
سپاہی:- بزدل و طغویٰ ہنسی ہنسر، موت سے ڈرتا ہے۔

دبم اور گولیاں چلنے کی آوازیں آتی ہیں۔

مزدور:- کتنی بیدردی سے انسان کا خون بہایا جا رہا ہے۔

سپاہی:- اس سے زیادہ دلچسپ مشغلہ ہو کر کیا ہو سکتا ہے؟

شاعر:- فریح انسان کو جو بس ملک گیری میں لکری کی طرح کٹوا یا جا رہا ہے۔

مزدور:- سکون مجھ وہ ہے۔ اور مجھ و موت، ہمارا شاعر زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ ہے۔

شاعر:- رگوبیا اس نے اب تک کچھ سنائی نہیں، خدا جانے کاغذ کجنت کہاں غائب ہو گیا۔ ملتا ہی نہیں۔

سپاہی:- (تنبہ مار کر) وہ اب تک شے میں تھا۔

سرسرایہ دار:- یہ کون اتنی خطرناک حالت میں قہقہے لگا رہا ہے۔

مزدور:- زندگی عبارت ہے خطروں سے اور مردہ ہے جو خطرناک سے خطرناک موتوں پر قہقہے لگائے۔

شاعر:- زندگی خطروں سے عبارت ہے نہیں، نہیں، زندگی ایک نیا خواب ہے۔ اور محبت سے اس کی رنگینیاں قائم ہیں۔

مزدور:- اس خیالی دنیا میں بنے واسے کو اگر چہ پیر و دین کا بوجھ

لا کر چلواتی دھوپ میں تپتی ہوئی سرک پر چلنا پڑے تو اسے

سلام ہو کہ زندگی سہانا خواب ہے یا سخت ترین عذاب۔

شاعر:- خیر زندگی عذاب ہی ہے، مگر محبت جو حوصلہ افزائی کے لئے ہے محبت کی شراب ان چیزوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

مزدور:- تم نے ساری عمر خیالوں میں بسر کی اور کچھ بے بنیاد خیالات

محبت نفس کی رنگک خواہشوں کے انہار کا مہذب ذریعہ

ہے۔ اور بس۔

شاعر:- اُٹ اگر میرے کانوں میں کوئی گچلا جوا سیسہ ڈال دیتا

تو اس قدر مدد نہ دیتا، جتنا تمہارے ان الفاظ سے ہوا۔

مزدور:- یہ دنیا کا دستہ ہے کہ طاقتور کے ارادوں کی تکمیل کروں  
سے ہو، بادشاہ ملک گیری کے لئے سپاہیوں کو کٹواتا ہے، سرکاری  
عیش و عشرت کے لئے مزدور کا خون چوستا ہے۔

سرسرایہ دار:- انکی باتوں میں دلچسپی نہ لیتے ہوئے، ہائے بیجا  
موت منہ پھاٹنے، لنگھنے کے لئے تیار کھڑی ہے۔

شاعر:- موت کو بیجا تک نہ کہو موت ایک حسین دنیا میں لیاقتی  
ہے۔ جہاں رنگینیاں برستی ہیں، جہاں امن و سکون ہے ٹھہرو

اس موضوع پر نہیں، ایک نظم سناؤں جو میرا شاہکار ہے۔

(اچھے لباس میں نظم کا کاغذ تلاش کرتا ہے)

مزدور:- لیجئے آپ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی موت کی ترسین  
کی سیر کر آئے۔ جی تو لوگ کہتے ہیں کہ شاعر دیوانہ ہوتا ہے۔

سپاہی:- اور امن و سکون کے بھی آپ متلاشی ہیں، بزدل سکون  
اور امن میں کیا رکھا ہے۔ کوئی ہنگامہ ہو کٹکٹ ہو۔

مزدور :- حقیقت بہت تلخ ہوتی ہے۔

(انی پر اجالا نمودار ہوتا ہے)

سرمایہ دار :- اب کیا وقت ہوگا؟

مزدور :- کبھی یہ سوال کرنے پر سرمایہ دار ہماری کھال ادھیڑتے تھے۔ کہ تمہیں وقت سے کیا سروکار، بس کام کئے جاؤ مگر یہ اتنا سنگدل نہیں کہ اس وقت تمہیں وقت نہ بتاؤں، صبح ہو رہی ہے۔

سرمایہ دار :- کیا صبح ہو رہی ہے ہائے کیا کروں کہاں جاؤں کیا تم لوگ موت سے نہیں ڈرتے؟

مزدور :- ہماری زندگی کو نشتی خوشگوار ہے، جو ہم موت سے بے سپاہی :- کبھی مرد بھی موت سے ڈرتے ہیں۔

شاعر :- موت سہانی ہے، موت کے جزیرے میں زنجیناں ہیں۔

راجا لاڈھتا جا رہا ہے۔ باہر سپاہیوں کی بات پیت

کی آواز آ رہی ہے۔

سرمایہ دار :- دکھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے، مگر گر پڑتا ہے۔  
یا اللہ کیا کروں۔ آف ہائے۔

شاعر :- اسے تسلی دینا چاہیے، بہت خوفزدہ ہے۔  
مزدور :- اسے تسلی دینا بیکار ہے۔ موت خود آکر اسے تسلی دے گی۔

رپڑوں کی چاپ سے معلوم ہوتا ہے، کہ سپاہی اور آ رہے ہیں،

سپاہی :- دکن کرکھڑا ہو کر مضبوط آوازیں، دوستو! ہماری زندگی کا آخری لمحہ آپہونچا، اس وقت تم یہ ثابت کر دو۔ کہ ایک بہادر سپاہی کے رفیق ہو۔ جیسے موت کا ڈرہ مجھ سے غم نہیں۔

مزدور :- یقیناً

(سپاہی اندر آتے ہیں ان موت کے فرشتوں

کو دیکھ کر شاعر کی زنجینت رخصت ہو جاتی ہے

اللہ وہ بے اختیار مع امتحان ہے۔ سرمایہ دار

بھی بری طرح چلانے لگتا ہے۔)

(پروہ کرتا ہے)

منجھ منجھ منجھ

جناب فیاض آبادی ایم اے

## غزل

گلوں نے کہدیا آخر چین سے وطن کی شان ہے اہل وطن سے  
یہ میرے شوق کا انجم تو ہے نکالا حصار ہا ہوں اکمن سے  
خدا جانے عداوت کس لئے ہے زمانے کو اسیران محن سے  
جھلکتی ہے ادائے حسن تیری گلوں سے نترن سے باہن سے  
اسی اسدبر مو میں رداں ہیں کبھی تو چاند نکلے گا اکمن سے  
کبھی ہوئی تو پھر ہوگی یقیناً طلوع صبح چاک پیرین سے

سیاہاں میں بڑی آڑیاں ہیں  
نکل چل لے فیاض چین سے



# تنگ و ناموس

میری طلعت!

پھر! بھی تو تم "دہن" بھی نہیں بنی ہو۔ کہ تبدیلی خاموشی کو شرم و حجاب سمجھ کر ہی صبر کروں۔ تنہا یہ اوقات پر

ابھی کسی "اور" کا صرف بھی نہیں ہوا کہ آپس فراموشی لاری کی بجائے خود فراموشی سمجھ لیا جائے۔ ابھی تو تم آزاد ہوتی کی طرح!۔  
مگر پھر بھی یہ بھیسی ————— یہ جھوٹا

میری طلعت! خدا را اپنی بد نصیب فیروزہ کو صرف ایک مرتبہ اور یاد کرو ————— پھر یہ شگہہ کرے تو تم اپنے ہونٹ  
سی کر بیٹھ جانا۔

ہاں وہ ہمارے دوسم بھائی یعنی تمہارے ہونے والے "وہ" آج کل کہاں ہیں! شرمناک نہیں! ————— پہلے کرم فرمائی  
کاسیہ قدسیکہ کو پھر شرمناک غلاموں کے رخساروں پر حجاب و شرم کا رنگ بچھا معلوم نہیں ہوتا۔  
رخصت ہوئی ہوں۔ خالہ جان کی خدمت میں آداب۔

تمہاری بھور و پریشان فیروزہ

فیروزہ پیاری!

تمہارا عتاب نامہ ابھی ابھی ملے ————— آہ تم نے اس طلع آئیں زمانے کا تذکرہ چھڑ کر میرے درد میں اور اضافہ کر دیا۔  
تمہارا مکتوب متعدد بار پڑھا ہے۔ اور یقین کر لو کہ ہر بار متعدد آنسو آنکھوں سے بہہ گئے ہیں ————— کیا تمہارے تمام  
شگہے اتنا کچھ معلوم کرنے کے بعد بھی آسودہ نہیں ہوئے؟

تم میری خاموشی کی شکی ہو! ————— مگر آہ خاموشی نہیں ————— فرونی ہے ————— کیا تم چاہتی ہو کہ ایک نقش  
تمہارے لئے زندہ ہو کر محبت کا مظاہرہ کرے۔ آہ نہیں میری حالت کی خبر نہیں درندہ گمانی کو اس قدر اہ نہ دیتیں

انہیں بد گمانیاں ہیں میری بالائیوں پر + لب نقش پر بھی یارب وہ کراہ جاتے ہیں

میرے دل کی لاکھ میں بھی وہ شکر گڑھوندے ہیں + وہ ہلاک سوز الفت سے بھی آہ چاہتے ہیں

میں کہاں سے گاؤں یارب وہ بچے ہوئے شرارے!

سمجھیں کہ! ————— معلوم ہوا کہ تم کس سے یہ شگہے کر رہی ہو! ————— میری نادان فیروزہ! ————— آہ  
اب وہ طلعت مر چکی ————— یا یوں کہو کہ آہستہ آہستہ مر رہی ہے۔

تعب کیوں کرتی ہو! ————— گھبراؤ نہیں تم نے یہ تذکرہ پھیر دیا ہے تو میں اپنی پوری داستان سنا کر دم لوگی۔  
تم سناؤ ناہ سنو۔۔۔۔۔

سب سے پہلے تو اس چیز پر ایمان لے آؤ کہ میں نہیں کسی حالت میں بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ دیا میں صرف تم ہی میری جھوڑ  
و ہمارا سہیلی ہو۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ جنس جنس کرتیں ہنسائی تھی ————— آج وہ وقت بھی آگیا کہ رو رو کر نہیں رلاؤں۔ مگر بلا  
رکھو آنسو جو آج تمہارے سامنے میری آنکھوں سے چھلکتے۔ اس وقت تک صرف دل میں محفوظ ہے ہیں۔ اگر تم ان کی قدر نہیں  
سمجھ سکتی ہو تو ان کو دھوا کر دینا ورنہ اپنی ہلکیوں میں جذب کر کے رکھ لینا۔

تم سے جدا ہونے چھ ماہ ہو گئے ہیں۔ نہیں کیا خبر کہ اس زمانے میں کیا کیا انقلاب آئے اور انہوں نے تمہاری طلعت کو کس طرح بدل  
کر رکھ دیا۔ تم جانتی ہو میں "انہیں" کس قدر چاہتی تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی یہ محسوس ہوا کہ "وہ" سمجھ رہے ہیں۔ طفولیت کے  
زمانے سے ہی مجھے یہ علم تھا کہ بزرگوں نے ہم دونوں کی قسمتوں کو ایک کر دیا ہے۔ یہ والدین کا فیصلہ تھا ————— خاندان کا فیصلہ  
————— سماج کا حکم ————— اور ہم دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا ————— وہ روز بروز میرے ہونے چلے گئے ماہ میں ساعت

پر سماعت میں کی محبت میں جذب ہوتی چلی گئی۔ باری ہر قسم جاتی ہو فیروزہ کے نظر و سماعت کے لحاظ سے میں ہمیشہ میں سے دور رہی اور وہ مجھ سے ۱۔ جی ہاں ستا نقان کو دیکھوں۔۔۔۔۔ ساری دنیا سے چھپ کر ان کو صرف ایک ہار دیکھ لوں۔۔۔۔۔ کان ترستے تھے کہ ان کی آواز سن لیں۔۔۔۔۔ پھر یہ بھی ہے کہ ایسے مواقع جی اکثر اُنے۔۔۔۔۔ چاہتی تو انہیں دور سے ایک لمحہ کو دیکھ لینا دشوار نہ تھا۔۔۔۔۔ مگر نہیں۔۔۔۔۔ میں نے نہ دیکھا۔۔۔۔۔ انہوں نے جی نہ دیکھا۔۔۔۔۔ اپنے دل کو تو اس خیال سے اطمینان تھا کہ کچھ دن اور ہیں۔۔۔۔۔ پھر یہ اندیشہ دومی کہاں سے آئیگی۔۔۔۔۔ ہم جلد ہی ایک دوسرے کے ہوا بیٹھے۔۔۔۔۔ پھر زندگی بھر میری نظروں میں ہوگی اور ان کی صحبت۔۔۔۔۔ میری سماعت ہوگی اور ان کی شیریں آواز۔

زمانہ گزر گیا۔ اب میں انٹرنس میں تھی اور وہ ملی۔ اسے میں۔ اب جان کا خیال تھا کہ امتحان سے ہم دونوں کو فرحت ہو جائے تو شادی کر دی جائے۔ مگر پیداوار قسمت کچھ اور سوچ رہی تھی۔ ظالم سماج کسی اور فکر میں تھا۔ اسی زمانے میں تقسیم ہند کا جھگڑا ابیدار ہو گیا اور اب جان اور چچا جان میں سخت رنجش پیدا ہو گئی۔ آخر اس کشمکش کا انجام یہ ہوا کہ اسی جان نے میری شکستی کو توڑ دیا۔ — آہ میرے دل پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تم جانتی ہی ہو۔ کہ مظلوم دوشیزہ لڑکیوں کو ان معاملات میں رونے کی بھی اجازت نہیں۔ مجھے معلوم نہیں مذہب کا راج حکم کیسا ہے مگر اب تو سماج ہی مذہب ہے؟ — سماج ہی خدا۔ — دنیا کے تمام مرد اب تو سماج ہی کو بولتے ہیں۔ تو جوان نسل کا خون بہایا جا رہا ہے۔ — وہ کچھ کہے تو کافر۔ — ہنسے تو بے شعور۔ — روئے تو بے حیا۔ — پھر ان حالات میں کیا کر سکتی تھی۔ — کچھ خون کر کے پیٹھ گئی۔ — یہی وہ زمانہ تھا۔ جب مجھے سب سے پہلے مرنے کی دعا میں مانگنی پڑی۔ دن رات رونے میں گذرتا تھا۔ — مگر ان آنسوؤں کو کوئی دیکھ نہ سکتا تھا۔ میں نے ضبط کیا۔ اور اس انتہاک کہ ان کو مجھ کو خبر نہ ہونے دی۔ — مگر آخر تاکھا؟ — ان کو سب کچھ معلوم ہو گیا۔ — اور ایک شب وہ اٹھ کر پیٹے گئے خدا جانے کہاں۔ —

عرصہ ہو گیا لیکن کسی کو ظلم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں ہیں۔ میری حالت جو کچھ تھی اسے کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ مرنے کی دعائیں مانگتے مانگتے ہاتھ ٹھک گئے۔ لوگ کہتے تھے اسے دق کا مرض ہو گیا ہے۔

مگر آخر ایک روز مجھے ان کا ایک خط موصول ہوا۔ اس پر کوئی پتہ تحریر نہ تھا۔ ————— ذراں کا نام میرا ————— خدا ہمارے  
بجھ تک کیسے پہنچا، لا پتہ بالحقوں سے چاک کیا۔ ————— دل اتنی بری طرح دھڑک رہا تھا کہ کچھ بھی بڑھا نہ جاتا تھا۔ —————  
خط یہ تھا ۔

طلعت — خوش رہو

تفاقی کہ تہارے نام سے پہلے ”میری“ کا لفظ لکھتا۔ مگر نہیں لکھ سکتا۔ کیونکہ کچھ زمانے کے بعد تم کسی اور سرے کو منسوب دی جاؤ گی۔ کسی اور کے گھر کی زینت ہو گی۔ مجھے بھی اس چیز کا تصور ہی نہ تھا طلعت کریم مجھ سے چس جھاٹی میں مسرور تھا۔ اور اپنی قسمت پر مغرور۔ مگر آہ انسان کی سرستیں تقدیر کے قدموں میں کس قدر آسانی سے چرچر ہو جاتی ہیں۔ میں علیگڑھ سے بغیر کسی اطلاع کے چلا آیا۔ اور اب نہ معلوم کہاں جاؤں گا۔ اب میں وہاں کرتابھی کیا۔ تب سر بیوہ ناجی شہزادہ قوسنگب آستان کی تخصیص ہی کیا؟

کبھی میں یاد آتا ہوں تو مجھے گنہگار سمجھ کر معاف کر دیتا۔ اچھا تو یہی ہے کہ مجھے دفعہ رفتہ رفتہ بھول جاتا۔ دنیا کی نظروں میں میری یہ تحریر ایک گناہ ہے۔ میں بھی آئندہ یہی سمجھنے کی کوشش کروں گا۔

تہوار بد نصیب و سیم

اس خط کو آج تین ماہ ہو گئے۔ کسی کو پتہ نہیں۔ وہ کہاں ہیں۔  
تم سمجھ سکتی ہو فیروزہ۔ میں اپنی زندگی کے صبر آزمائیاں کیسے گزار رہی ہوں؟  
خودکشی کے تصور سے روح لرز جاتی ہے۔ دنیا کو خدا کا خوف نہیں رہا۔ مگر مجھے ابھی تک یہ خوف محسوس ہو رہا ہے  
دیکھنے زندگی کے یہ کھٹن دن کیسے گزرتے ہیں۔

پھر آخر میں یہ بھی سن لو کہ میرا جتنا زہ اٹھانے کے واسطے اب کسی "اور" کا انتخاب کیا جا رہا ہے۔ شاید نام ہے۔ مبینی میں  
کسی کا بیچ میں پروغیر ہے۔ لوگوں کا ارادہ دس بیس روز میں میری "خانہ بربادی" کا ہے۔ خدا کے لئے تم ضرور آنا اور نہ شاید  
اپنی بد نصیب طلعت کو پھر نہ دیکھ سکو۔ تم کیا سمجھو کہ مرنے والے کو ایک پر خلوص زمرہ خواں کی موجودگی بڑی سہارا ہوتی ہے۔  
زندگی رہی تو پھر ملاقات سے مطلع کروں گی۔

تہماری ناچار

طلعت

فیروزہ امیری محرم راز!

تم خطا ہو گئیں؟ ————— اللہ معاف کر دو۔ میں کیا سے کیا ہو گئی۔ اور تمہیں اطلاع بھی نہ دے سکی۔ تمہارے کتبوبات  
وہم موصول ہوئے مگر میں نے ایک ہی جواب نہ دیا۔ تمہاری ملاقات کو سننا لیکن میں خاموش رہی۔ ممکن ہے کہ مجھے مرہوہ سمجھ لیا ہو۔  
مگر نہیں تمہاری طلعت زندہ ہے۔ اور ایک پڑ جستم زندگی گزار رہی ہے جس کا تصور بھی نہ ہو گا۔ متعدد بار تمہیں خط لکھنا چاہا۔  
مگر وہ سیم صاحب کی علالت نے اہارت نہ دی۔ تم حیران ہو گئی کہ یہ وہ سیم صاحب کہاں سے نازل ہو گئے۔ ————— متعجب نہ ہو  
کبھی کبھی اندھیرے سے بادلوں کو پاک کر کے ایک نکتہ چاند نکل آتا ہے۔ ————— سنو!

تمہیں خط لکھنے کے چند روز بعد میری شادی ہو گئی۔ ————— وہ وقت مجھ پر کس قیامت کا گذر اس کا  
احساس تم ابھی طرح کر سکتی ہو۔ کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ اپنی زندگی کو بس اسی جگہ ختم کر دوں۔ ————— یا پھر کسی  
طرف دیوانہ وار نکل جاؤں۔ ————— ہر جگہ "نہیں" تلاش کروں۔ اور اس تلاش میں خود بھی کم ہو جاؤں۔ مگر شرم و  
خیرت نے دامن نہ چھوڑا۔ ————— ہر ارادہ ذہن میں آیا اور فوراً گیا۔ ————— اپنے مقدر پر شاکر ہو کر خاموش ہو  
رہی۔ گھر میں کون تھا۔ کہ خوشی نہ منار رہا ہو۔ ابا جان اور امی جان بھی مسرور تھیں کہ چلو آج یہ لمحہ بھی دور ہوا۔ کوئی بچہ  
نامہ۔ ان کی خدا اور پندار کی شرم تو رہ گئی۔

میں اپنی پہیلیوں سے بھی چھپ چھپ کر رو رہی تھی۔ سوچتی تھی کہ کاش فیروزہ ایسے وقت طیل نہ ہوتی وہ میرے  
باس ہوتی تو ان بیکس آنسوؤں کا دیکھنے والا تو میرا ہوتا۔

آخر وہ وقت آیا کہ میں سسرال پہنچ گئی۔ دل چاہتا تھا کہ کہیں بھاگ جاؤں۔ ————— کانپ رہی تھی۔  
دور رہی تھی۔ ————— ان کا تصور آج انتہائی شدت سے محسوس ہو رہا تھا۔

آخر کار وہ آئے۔ ————— پاؤں کی آہٹ سے لرز گئی۔ دل اچھل کر پیسے تک آیا۔ ————— اور ایک بار  
دھک سے ہو گیا۔

”طلعت اپنی شادی کی شرکت میں مدعو بھی نہ کیا۔۔۔۔۔ انہوں نے کہا۔۔۔۔۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ  
پیسے بجلی کی دوسرے پاؤں تک سنسنائی ہوئی گذر گئی ہے۔ سوچتی تھی یا اللہ کان دھوگا تو نہیں لعا ہے جس۔۔۔۔۔  
یہ آواز تو دوسم بیتی ہے۔

وہ اور قریب آگئے اور لمبے۔۔۔۔۔ ”کانپ کیوں رہی ہو طلعت! اسے تم تو رو بھی رہی ہو۔ ادھر دیکھو!  
۔۔۔۔۔ بے اختیار میری نظر اٹھی۔

سامنے دوسم کھڑے مسکرا رہے تھے! سب کچھ کیسے ہو گیا یہ طویل مگر دلچسپ داستان ہے۔ تم آؤ گی تو ان کے سامنے ہی کہوں گی۔ مختصر یہ سمجھ لو کہ  
شاہد رہی تھے مگر یہ حقیقت نکلنے کے لمحے تک معلوم نہ ہو سکی۔۔۔۔۔ سب حیران تھے مگر تم ہانتی ہو۔ ہم سب  
سمان کے احکام کے ماتحت ہیں۔ کس کے کیسے میں اتنی بہت تھی کہ رات کو ناکام واپس چھ کر اپنی ناک کٹوا لیتا چکے چکے  
سب کچھ ہو گیا۔ اور کسی نے دم نہ مارا۔ لوگوں کو مذہب اور خدا کا ڈر نہیں۔ مگر عزت کا ڈر ضرور ہے۔ پھر یہ جی ہے کہ اب  
وہ ایک پردہ فیسر تھے۔ کئی روز وہ بہ ماہوار مشاہیر پانے والے۔۔۔۔۔ ایک دولت مند انسان۔۔۔۔۔  
زرد مال کے جھگڑوں نے اس رشتے کو توڑا تھا۔۔۔۔۔ زرد مال نے پھر چڑ دیا۔ پاس ہاں مل گئے کہے کو  
صنم خانے سے!

اب تم جلد لکھو کب آؤ گی۔ تاکہ ایک بار اس داستان کی تمثیل کی جائے اور پھر ”نگ و ناموس“ کے اس  
امقارہ ڈرامے پر خوب دل کھول کر ہم تینوں قہقہے لگائیں۔

تمہاری طلعت

| صفحہ نمائیت                                     | دنیا کے ادب کے بہترین جواب نصف قیمت پر | نیاں رعایت |
|---|--|------------|
| سالنامہ ۱۹۳۶ء                                   | تعداد ۲۵۰ صفحات                        | قیمت ۸/-   |
| افسانہ نمبر ۱۹۳۶ء                               | تعداد ۲۰۰                              | ۴/-        |
| سالنامہ ۱۹۳۷ء                                   | تعداد ۲۵۰                              | ۸/-        |
| افسانہ نمبر ۱۹۳۷ء                               | تعداد ۲۰۰                              | ۴/-        |
| سالنامہ ۱۹۳۸ء                                   | تعداد ۲۵۰                              | ۱۰/-       |
| افسانہ نمبر ۱۹۳۸ء                               | تعداد ۲۲۵                              | ۸/-        |
| سالنامہ ۱۹۳۹ء                                   | تعداد ۳۲۵                              | ۸/-        |
| نوٹ: ۱۔ محمولہ ایک ادبی نمبر قیمت کے علاوہ ہرگز | بہترین تعداد                           | ۵/-        |
|   | میں ادب لطیف ۱۵ سرکل لاہور             |            |

جناب احمد ندیم قاسمی کی

# غریب کا ہتھ

مجھے اس سے بحث نہیں کہ وہ کون تھی۔ کہاں کی پہنے والی تھی۔ میں تو صرف یہی کہہ سکتا ہوں اور یہی کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے اسے دیکھا۔ اور دیکھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہوا کہ میری زندگی کا انتہائی مقصد اس ناہن کی صورت میں مشکل ہو کر میرے سامنے محو خرام ہے، میں نے اسے گاؤں سے باہر ایک کھنڈر کی چکی ہوئی دیوار پر پڑے تھوپے ہوئے دیکھا اس نے مجھے ایک بار بڑی دیکھ لیا۔ اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی میں نے جی اسے بڑی دیکھ لیا۔ اور اگلے چلا گیا۔ اپنے تھوپے کو فی ایسا تعجب انگیز کام دیا کہ میں اسے خود سے دیکھتا۔ گاؤں کی ہر عورت صبح اٹھ کر نماز سے پہلے ہی کام کرتی ہے، میں سیدھا گھر گیا!

دوسرے دن میں منہ اندھیرے ہی گھر سے نکلا۔ کیونکہ اس دن میں نے ایک بہت اونچی چوٹی پر سورج کے طلوع ہونے کا منتظر دیکھنے جانا تھا۔ میں گاؤں سے باہر آیا تو ایک سایہ سا سر پر ڈگری اٹھانے میرے آنے کے رینگتا نظر آیا۔ میں نے بڑی پوچھ لیا "کون ہے بھائی؟" "ہی میں ہوں" یہ ایک عورت کی آواز تھی۔ میں خاموش ہو گیا۔ طلوع خود شہد کا منظور دیکھ کر میں اسی دھڑے سے واپس ہوا۔ تو اسی دیوار پر اپنا تھوپے جا رہے تھے۔ اس نے مجھے ایک بار دیکھا۔ اور اس کو دیکھنے میں کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ کہ میں رگ جاتا میں چلا گیا۔ اور وہ سر جھکائے اپنے ہاتھوں کو تیزی سے جنبش دیتی رہی۔

اور یہ منتظر میں نے صرف دو دن ہی نہ دیکھا۔ متواتر دس دن مجھے یہی لڑکی اسی کھنڈر کے پاس اپنے کام میں بیدار مصروف نظر آئی۔ دوسرے دن میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ آخر یہ لڑکی اپنے گھر اپنے کیوں نہیں تھوکتی یہاں بھیانک کھنڈر کی کمزور دیوار سے اسے کیا لگاؤ تھا۔ لیکن میں ان دنوں اپنی شادی کی تیاریوں میں ماحول مصروف رہتا تھا۔ کہ کسی ایک خیال کا مسلسل طور پر میرے دماغ پر

مستور رہتا ہے نہ ناممکن تھا۔ میں اپنے گھر گیا! ایک دن میں صبح سویرے اٹھ کر گاؤں سے باہر گیا تو وہ رستے میں بیٹھی گوبراٹھار ہی تھی۔ رستہ ڈانٹنگ تھا۔ میں اس کے پاس آکر رک گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اور تیزی سے ایک طرف ہو کر بولی "گنڈ جانیے جی!"

میں نے ایک قدم اٹھا یا مگر درگزر کرتا ہوا چھ لیا "تم کس کی بیٹی ہو لڑکی!"

"میں پر دیسی ہوں جی۔ میرے ماں باپ مر گئے ہیں" اس نے اپنی بیٹی ہوئی چادر جلدی سے اپنے سینے پر پھیلانے ہوئے کہا۔ "کس کے پٹے تھوکتی ہو؟"

"پٹے جی۔ انہیں بچ کر پیٹ بھرتی ہوں۔" میں اس کے نکل گیا۔ ایک بار مگر دیکھا۔ تو وہ ایک اور جگہ بیٹھی ڈگری میں گوبراٹھار ہی تھی۔ میری کنپٹیوں کی رگیں قد سے پھول گئیں۔ اور میں راہ کے ہموار ہونے کے باوجود اپنے لگ گیا۔ واپسی پر میں نے اسے اسی دیوار کے پاس جھکے اور اٹھتے ہوئے دیکھا۔ دوسرے دن وہ پھر مجھے اسی رستے پر ملی۔ میں اس کے قریب آکر رک گیا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور بولی "آپ ہمیں جی؟"

"ہاں" میں بولا "بہت سویرے نکلتی ہو گاؤں سے؟"

"سویرے نہ نکلوں تو دوسری گوبراٹھار والیاں راستے صاف کر جائیں۔" میرا تو یہی روزگار ہے جی۔

میں دو چار لمبے دیں کھڑا ہوا۔ وہ وہاں سے ڈگری اٹھ کر آگے جانے لگی۔ مجھے خاموش کھڑا دیکھ کر پوچھا "آپ صبح سویرے کہاں جاتے ہیں جی؟"

"سیر کرنے"

”اچھا جی، اس نے یہ الفاظ اس انداز سے کہے گئے گویا وہ میرا مطلب نہیں سمجھی!“

پارہ دونوں کے لئے مجھے گاؤں سے باہر جانا پڑا۔

پانچویں دن آیا۔ تو صبح سویرے اٹھ کر اس طرف چلا دیا۔ وہ جینوں کے ایک ٹک کے نیچے بیٹھ گیا۔ وہاں تک وہ کوئی نہ گئے کے لئے جھک گئی۔ میں اس کے قریب گیا۔ تو اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور قدرے اداس مسکراہٹ سے پوچھا۔

”آپ کہاں پہلے گئے تھے جی؟“

”پر دیس میں کچھ کام تھا۔“

”میں چار دن آپ کو بہت دیر تک دیکھتی رہی۔ میں نے کہا اللہ خیر کرے۔ ملک جی نہیں آئے۔ میں تو آج آپ کو گھر پہنچنے کے لئے جانے والی تھی۔“

میرا دل دھڑک کر بجلی کی ایک لہریں گیا۔ جسم میں ہلکا سا لرزہ آیا۔ اور گاؤں میں ایک بے نام کی گونج پیدا ہو گئی۔

بادلوں کے دو چار ننھے ننھے ٹکڑے مشرقی بہت پر منڈلا رہے تھے۔ ابھرتے ہوئے سورج کی لرزتی ہوئی کرنوں کو دیکھ کر ان کے چہرے لہو بہ لہو لال ہو رہے تھے۔ اور ان کا عکس تمام دلدی پر بہن اور غوانی پر وہ پھیلا رہا تھا۔ گہروں کے تازہ آگے ہوئے پودے اس کے پوجہ سے زمین پر جھکے ہوئے تھے۔ اور دور جینوں کا گلہ پرانے والا کاموں پر یہاں ایک گیت دردناک سُر میں ادا پڑا تھا۔

اس وقت میں نے لڑکی کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ کانپ کر شرما گئی۔ اس کا رنگ پریت کی چوٹی پر منڈلانے والوں بادلوں کا سا ہو گیا۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں پر پھٹی پھٹی پانی کی جلی تڑپیں لگائی ہوئی۔ اس نے جھک کر ٹوکر کی اٹھائی۔ اور آگے ہلنے لگی جینوں بہت دور جا چکا تھا۔ اور گاؤں کے آس پاس کوئی شخص نظر نہ آتا تھا۔ اپنے تھوپنے والی کی کھلی آستینوں والی میلی قمیض نرم نرم جھونکوں سے آہستہ آہستہ لہو رہی تھی۔ اور جس بازو سے اس نے ٹوکر کی کو تمام رکھا تھا۔ وہ شلنے لگ کر چلا گیا تھا۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ میں نے لہو وہ اس کی طرف تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ ایک گہان بھاری کہاس میں اسے جا لیا۔

اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ اور ہونٹوں میں تھر تھری۔ اُسکے کھلے بال اس کے رخساروں اور گاؤں کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ محبت سے ہانک جانا چاہتی ہے۔ وہ ایک طرف گولی گولی پتھروں کی دیوار کے ساتھ چمٹ گئی۔

”آپ ————— ملدی آپ کیا کہتے ہیں مجھے؟“ اس نے ٹوکر کی کو دونوں ہاتھوں سے مضبوط تھام لیا۔ اس کا دوسرا بازو بھی نکلا ہو گیا۔ میلی ہمارے سینے سے دھٹک کر ایک طرف ٹپکنے لگی۔ اور وہ زور سے سانس لینے لگی۔

میں گھبرا گیا۔ میں اسے کیا کہوں! ————— میں اسے کیا کہوں! ————— میں اسے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ ایک ذرا سی بات —————

”الفاظ طلق تک آکر رک جاتے تھے۔ میرا دماغ گونجنے لگا۔ دل کی رقتا۔ غیر معمولی طور پر تیز ہو گئی۔ میری زبان لڑکھانے لگی۔ میں نے جھجک کر اس کا نام پوچھا۔

”دخانی“ اس نے یہ نظریوں کہا۔ جیسے اس نے ایک بہت بھاری مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے۔

میں واپس ہو پڑا۔ مجھ سے اب وہاں زیادہ نہیں ٹھہرنا تھا۔ میری ہنسون میں آگ لگ گئی۔ میں گاؤں میں داخل ہوا۔ تو ایک جوان بستر دیو ٹیوٹا ”اسلام علیکم“ ملک دی ”وہ بولا“ خیر تو ہے آپ کا بھروسہ اس قدر زبرد کیوں ہو رہا ہے؟“

”خیریت ہے بھائی ————— اور میں تیزی سے آگے نکل گیا۔

”وہاں میرے پیچھے زور سے کھانسا۔ کھانسی مصنوعی تھی۔ —————

میرے دل میں جیسے کسی نے پتلی لی۔

وہ بھر میں ہو پڑا۔ میرا دل نے دو تین میلوں کے فاصلے پہنچا دیا۔ میں لاہور سے پہلے لاہور آیا۔ یکم کے ریکارڈ خرید لیا ہوں۔ تمام گاؤں صرف تہاں تھیں۔ ٹھکانے میں نے کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر نہیں مانا دیا۔ آتا آئے۔ پوچھنے لگے ”آج پڑھا کچھ نہیں؟“ میں نے کہا ”جی۔ سہریں دو رہے۔“ آن کی آن میں انگریزی اور لہو تانی دو اٹیوں کا ایک انہار میرے سامنے تھا۔

————— والدین کی محبت کتنی انجان ہوتی ہے! —————

اچانک میرے قدم آپ سے آپ رُک گئے! میں واپس  
بیت پر ۱۲۔ ایک طرف لڑکی کی ہفتوں کی محنت خاک میں مل جائے  
آپ خشک اچلے بیگ بھانینگے اور وہ بچہ ہی بہت روئے گی!  
میں جھانکنا کھنڈر تک آیا۔ اور اندھیرے میں جتنے اچلے اکٹھے  
ہوئے۔ کھنڈر کی دوسیدہ چھت تلے جمع کر دیتے۔ اسی اشنا میں مجھ  
پر سے زور سے برسنے لگا۔ اور میں اپنے دل میں یہ اتہا سترت



کھٹکی بھٹ تھے قہقہے سارے انہوں کا دھیر لگا دیا ہے۔  
بے فکر رہو۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ کانپ گئی ہے۔ آپ کہتے آپھے  
ہیں جی۔

وہ میں بہت بڑا ہوں خانی۔ میں نے نہیں کرا دیا۔  
اب جانے نہیں کہاں کہاں چر میں آئی ہوں گی۔

”مجھے کہیں بھٹ نہیں آئی۔ آپ۔۔۔۔۔“  
بارش تھم چکی تھی۔ سانس بڑھی نالوں کی آواز سے گونج رہی تھی۔

مینڈک اس پاس گڑھولہ میں زور سے زور سے ٹرتا رہے تھے۔ خانی نے  
میرا ہاتھ پھوڑتے ہوئے کہا۔ ”اب میں گھر جاؤں گی؟“

”گھر!۔۔۔۔۔ تمہارا بھی کوئی گھر ہے خانی؟“  
”جی ایک خمارس نے ایک کنیادہ رکھی ہے۔ سر چھپانے کا

سہارا تو ہے جی۔۔۔۔۔ اب جا کر دال سے وہ پانی نکالوں گی بڑھت  
میں سے ٹپکا ہو گا۔“

میرا آواز پیراستہ کمرہ چانگ میرے ذہن پر اچھا لگا۔ لڑا لہ  
ٹھٹھے ٹھٹھے۔ ریزہ ریزہ ہو کر لہجے میں غائب ہو گیا۔ میری آنکھوں

سے وہ بہت گرم ہوندیں نکلیں اور نیچے کچھڑ میں گر گئیں۔ میں نے سوچا۔  
ہم زندگی کے اس قدر مختلف زادوں پر کیوں رکھے گئے ہیں۔ یہ کیسی

خدائی ہے؟۔۔۔۔۔ یہ کیسا قاتلانہ ہے؟  
میں نے کہا۔ ”خانی! آخر تم مجھے یہ کیوں نہیں بتاتیں کہ کہاں کی

رہنے والی ہو؟ کون ہو؟ یہاں کیسے آئیں۔ تم کو برا بھلا کرنے کے لائق تو نہیں  
تھیں خانی!۔۔۔۔۔ تم ریشم اور خواب میں پٹی بننے کے قابل ہو۔“

”آپ۔۔۔۔۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ آپ آپ کیسی باتیں کرتے  
ہیں آپ۔۔۔۔۔ آپ سن کر کیا کریں گے؟“

”خانی! میں نے احساسات کے طوفان سے مجبور ہو کر سرگوشی  
کے آغاز میں کہا۔ ”خانی!“

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی انگلیاں بھیگی ہوئی تھیں۔  
بارش سے پانی سے۔۔۔۔۔ گھر بارش کا پانی اس کو گرم تو نہیں ہو سکتا!

”خانی!۔۔۔۔۔ تمہاں غریب نہ ہو گی۔ تم میرے ہوتے۔۔۔۔۔“

”آپ جی۔۔۔۔۔ لڑی لڑی۔۔۔۔۔“  
بچی ہوں اور سن کر بھلا بھی بچی ہوں۔ میرے دل باپ کے لیے کچھ سمجھتا

تو بصورت قروان سے بڑا لہجہ جی اسی قسم کی باتیں کرتا تھا کہ جب  
ایک دو باتیں میرے دل باپ اور بھائی مر گئے۔ تو اس نے ایک اور لڑکی

سے شادی کر لی۔ اور مجھے گھر سے باہر نکال دیا۔ اب میں باتوں کو ضبط کرتی  
ہوں۔ ریشم اور خواب پر سونے کی لذت میں چکھ چکی ہوں۔ اور اس کا انجام

جی میرے سامنے ہے۔ اب ان باتوں کو تو وہ نہ میں جو لذت ہے وہی  
قیمت ہے۔ اب ریشم و ریشم کی ہوس نہیں رہی جی۔ اور نہ کسی چیز کی

خواہش ہے۔ آپ نے میرے اپنے غمخیز کر دیے۔ اس کے لیے میرے پاس  
شکر ہے کہ سوا اللہ کچھ نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو میں دینے کی جرأت نہیں کر

سکتی۔۔۔۔۔“  
اندھیرے میں مجھے کسی نے آواز دی۔ کوئی مجھے ڈھونڈتا پھرتا

تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”خانی! تم مجھے ایسا نہ بھڑو۔ میں۔۔۔۔۔“  
ایک اور آواز آئی۔ میں نے تیزی سے کہا۔ ”کوئی مجھے

ڈھونڈ رہا ہے، کل ٹوکی!۔۔۔۔۔ کھنڈر کے پاس؟  
کل صبح۔۔۔۔۔ ٹوکی تا!۔۔۔۔۔ اچھا!“

لیکن وہ خاموش تھی۔ میں اس کا ہاتھ تیزی سے اپنے پیٹ میں لٹک لے  
گیا۔ اس نے بیچ کر اسے پیچھے کھینچ لیا۔ میں گھبرا گیا۔ اور دوڑتا ہوا پکھلنے

والے کی طرف بڑھا۔ ”کون ہے بھائی؟“ میں نے زور سے کہا۔  
”میں ہوں جی۔۔۔۔۔ درخو مستری۔ سارا گھر آپ کی گھر میں

پریشان ہے، آپ بارش میں کدھر نکل گئے تھے؟ بڑائی کی حالت  
میں؟۔۔۔۔۔ اللہ یہ سچا کون تھا۔ ٹھک جی!“

”میں چچا تھا۔ ایک کنکر سونہ گیا تھا پاؤں میں!“  
درخو زور سے کھانسا۔ کھانسی مصنوعی تھی! میرے دل

میں جیسے کسی نے ہتھی لی!  
”کھنڈر میں پناہ لی ہو گی آپ نے؟“ اس نے پوچھا۔

میں کانپ اٹھا۔  
”نہیں چلتا پھرتا۔۔۔۔۔ مجھے ایسے سے سیر کرنے میں

بڑا لطف آتا ہے!“

شک ہے۔ اس کے ہوا انگلیوں  
خارج قدم میں تیز قدم اٹھاتا ہوا گھبراہٹ میں ہمارے گھروں کی  
قفل پر ہوا۔

مجھ پر سے اٹھ کر میں کھنڈ کی طرف گیا۔ وہ وہاں پہنچی  
میں نے دیکھ کر شرمائی۔ لیکن مجھ پر نگاہیں گانے کی طرح صاف  
تھا گھر سے نیچے آسمان میں سورج کی آتش لگی ہوئی آپ دنا سے  
یکساں ہی تھی گاؤں کی چھتوں سے دھواں سا بخار اٹھ رہا تھا۔ نہانے  
ہوئے پر ہاتھ بچے مٹھا جھیلوں میں اپنے ہرے دیکھ رہے تھے۔  
خانی خشک اپلوں کو ہر دروازہ پر ہیں رہی تھی ہارش کی ٹی کی جبر  
سے وہ سنگھار کے قابل نہ رہے تھے۔ اور ایک دن دھوپ میں پرش  
بھنے سے خشک ہو چکے تھے۔ میں نے قریب جا کر کہا "خانی کل رات  
بکھی طرح بات تھی"۔

خانی نے شرم کر سر جھکا لیا۔

میں نے کہا خانی — بچے تم سے محبت ہے۔  
وہ مسکرائی۔ میری طرف ایک خاص انداز سے دیکھا جیسے  
استاد اپنے شاگرد کی طرف دیکھتا ہے۔ "اللہ آپ کو اس  
کا ہر دے"۔

اس فقرے سے اس کا کیا مطلب ہے۔ اس کا  
لاہور میں نہیں تھا میں نے گھر اگر گاؤں کی طرف دیکھا۔ دینو ستری  
نے کوٹھے کی منڈ پر پر ایک بڑا حارث گردن کینچ کر پھانسی لگا کر  
میرے دل میں جیسے کسی نے ہنگامی میں لے آسمان کی  
طرف دیکھا ایک جیل دوسری جیل سے کسی بد بخت مرغی کا ایک  
پیرتا ہوا لکڑہ چھین کر سورج پر سے گندمی ایک پہاڑی کے  
سارے دے میں گھس گئی۔

میں خاموش گھر واپس آیا۔

اس سال کی خاص غصہ کی دہر سے میری شادی  
رنگ لگی۔

"سب سے سال گریوں کی چھٹیوں میں میں پھرنا ہر دے  
پہنے گاؤں کیا۔ بیات دھوم دھام سے وہیں کے گھر و خانہ ہوئی۔  
میرے شہری دوستوں نے سہرے گاگا کر پڑھے۔ میرے دیہاتی  
ساتھیوں نے تالیوں بجا کر اور ڈھول کے باند کر دناج بچ کر  
اپنی بے سوچ مسرت کا اظہار کیا۔

صبح ہوئی۔ میں شب بیداری کے اثر کو زائل کرنے کیلئے ایک  
کھیتوں میں چلا گیا۔ اچانک پیچھے سے میرے کانٹے پر کسی نے  
اتھ رکھا۔ اپلوں والی کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"خانی" میں نے حیران ہو کر کہا،

"آج کس کی شادی ہے جی؟"

میں سر جھکائے ایک سوچ میں ڈوب گیا۔ ظن کی  
جگہ میری رگوں میں خانی گردش کر رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد میں نے سراٹھایا۔ دینو ستری اپنے  
کوٹھے پر کھڑا کانس رہا تھا اور اپلوں والی قائب تھی۔  
واپسی پر میں اپنے گھر کے بڑے دروازے کے  
قریب سے گزرا۔ دور سے مجھے وہاں خشک اپلوں کا ایک  
بہت بڑا ڈھیر نظر آیا۔

"کون لے آیا؟" میں نے ایک میرا  
سے پوچھا۔

"کوئی رات کو یہاں ڈھیر لگا گیا۔"

دعوت دہر تیار کرنے وقت وہی اپنے استیصال  
کے تھے۔

میں نے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ سب کچھ ہمارے ہاں ہو رہا ہے۔



ادارہ:-

# تقد و نظر

اوراق پارینہ: مصنف چودھری شیرجنگ، کتابت و طباعت  
اصلی صفحات ۱۰۰، قیمت ۸ روپے کاپڑے، پینٹل پبلشنگ (اوس) کوچہ گورنمنٹ  
سکھ شیش محل روڈ لاہور، مکتبہ خیرا روڈ لاہور

الہدای پاریتہ ملک کے مشہور معروف سیاسی کارکن جناب چودھری  
شیرجنگ کے تئیں انکار کا مجموعہ ہے۔ چودھری صاحب موصوف  
ایک مدت سے سیاسی دنیا میں سانس لے رہے ہیں۔ سکر اس کے باوجود  
آپ کے شاعرانہ احساسات کی رائیوں میں ذرا بھکی واقع نہیں ہوتی۔  
منیت: ہے کہ کتاب کا ہر ورق، ہر سطر ایک پوری روح کی ڈنگ ہے۔ ہر ایک  
دھم نصیب ل کی نمساں یکا ہے، ناممکن ہے کہ انسان اسے پڑھے اور پھر  
مٹا کر نہ پڑھنا ہو۔ ناممکن ہے کہ مصنف کے خطریز بات کی حرارت قدرتی سامع  
کے دل کی گہرائیوں تک نہ پہنچ جائے۔ چودھری صاحب کو خیالات کی تیز چال  
کے علاوہ اسلوب بیان کی دلکشی سے بھی بھرپور فضا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کتاب  
بہت موثر اور بہت دلچسپ ہے۔

اوراق پارینہ مشاہدات ہیں ایک قیدی کے تجربات حیات ہیں ایک  
گرفتار سلاسل انسان کے اور احساسات تئیں ہیں ایک عقیدہ شاعر کے  
جب تک کہ ہوتی ہیں کہ بے نقص کر دیا جائے تو اس کے نفوں میں زیادہ  
رواد اور زیادہ اثر پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح جب شاعر کو جس کی تنگ نظر  
گوٹھری میں بند کر دیا جائے تو اس کے احساسات و جذبات تمام دنیا کی  
وکی ہوئی دوجوں کی لڑاؤ بن جاتے ہیں۔ چودھری صاحب موصوف  
تہ یہ اوراق حیات موجودہ ہندوستان کے ایک بد بخت مگر حساس غلام  
کے صحیح جذبات لئے ہوئے ہیں۔ چودھری صاحب کی انشا پردازی کا رنگ  
ماخذ فراموش ہے۔

اسٹیج محبت اور اسٹیج غم جیسے قلم نام رہ سکتے ہیں لیکن وہ محبت اور غم  
جیگرانی بے پناہ اور بے انتہا ہوتی ہے۔ اپنی ہی لاکھوں اور خوفناک وسعت  
میں مکھ جاتے ہیں۔

آگ کا تند و بھڑکا ہوا شعلہ کسی ایک حالت میں دیر تک قائم نہیں  
رہ سکتا۔ شعلہ جلد تیز تیز اور بلند کسی راگہ اسی قدر ٹھنڈی جلد دم اور بجلی  
حقیقتاً اوراق پارینہ ایک بہت قابل قدر کتاب ہے۔ امید ہے قارئین  
گرام اس مفید و دلچسپ کتاب کا ضرور مطالعہ کریں گے۔ ۱۱ م ۱۱

چنگاریاں: مصنف پرنسپل جھیلدا، کتابت و طباعت خوشگوار  
۱۲ قیمت ۱۲ روپے کاپڑے۔ لاچیت رائے اینڈ سنز ایک سیلز و پبلشرز لاہور  
رواد لاہور

چنگاریاں مجموعہ ہے جناب جھیلدا اس کے سیاسی افسانوں کا جھیلدا  
اشتراکیت کے شہر و آفاق راہنما ہیں اور اس سے پیشتر اشتراکیت اور دیگر  
سیاسی موضوعات پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ چونکہ آپ مدت سے سیاسی  
زمین گھوم رہے ہیں اس لئے سیاسی نکات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اس مجموعہ  
پر آپ نے سیاسیات کے نہایت اہم راہنما کو انہایت سلیس رنگت  
زبان میں پیش کر دیا ہے۔ ہر ایک افسانہ کسی نہ کسی سیاسی مادے کے گرد گھوم  
رہا ہے۔ اور افسانہ پڑھتے ہی یہ راز خود بخود معلوم ہو جاتا ہے۔ مصنف نے  
ہر افسانے کے آخر میں انسانے کی توضیح و تشریح بھی موزوں الفاظ میں  
کر دی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے سے معمولی چٹھا لکھا آدمی بھی  
سیاسیات کے اہم نکات سے بہت حد تک واقف ہو جاتا ہے  
ناظرین کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔  
امید ہے اس مقصد کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے وہ مفید  
پایہ تکمیل کو پہنچے گا۔

۱۱ م ۱۱

ہر قسم کی کتب ہم سے طلب کیجئے۔ مکتبہ ادب لطیف لاہور



## بہرہ کی خوبصورتی کا حقیقی آرز

آپ کا رنگ کالا برگز نہیں رہ سکتا کیونکہ آپ کی جلد کے نیچے سفید جلد موجود ہے۔ مونا ویکس ویکس کے متواتر استعمال سے آپ کی کالی اور کھوری جلد دور ہو کر نیچے سے سفید نکل آئے گی۔ مونا ویکس کے اجودا بہرہ کی جلد پر نہایت خوشگوار اثر پیدا کرتے ہیں۔ جلد کو لائٹ اور سفید کر دیتے ہیں۔ مونا ویکس دوسری کیریوں کی طرح آپ کی جلد پر سطح نہیں بنائے گی۔ بلکہ یہ آپ کے جلدی مساموں میں داخل ہو کر دن بھر کی گرد و غبار کے ذروں کو نکال کر آپ کے بہرہ کو ایک نئی جاذبیت بشارت اور صبح افزا تر و تازگی سے مالا مل کرے گی۔ مونا ویکس کے متواتر استعمال سے آپ کے بہرہ کی رونق دوبالا ہو جائیگی۔ اس کے علاوہ بھڑواں چھائیاں دھبے لائے اور سفید داغ سب کا فور ہو جائیں گے۔ تھوڑی سی وجہ سے آپ اپنے بہرہ اور رنگ کی دلآویزی میں مونا ویکس کے استعمال سے اضافہ کر سکتے ہیں۔

آج ہی مونا ویکس خرید کر استعمال کریں اور فائدہ اٹھائیں

سول ایجنٹس

بیلی رام اینڈ براڈرز۔ اتارگی لاہور

# جدائش ایکٹ

نے بیسیوں چھوٹی بیمہ کمپنیوں کو بڑی اور کمپنیوں کے ساتھ الحاق کرنے کیلئے مجبور کر دیا ہے

مسلم انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ

نہایت استقلال کے ساتھ ترقی کرتی ہوئی دن بدن مضبوط اور مستحکم ہو رہی ہے۔ اور  
مبلغ پچھن ہزار روپیہ ضمانت گورنمنٹ ہند کے پاس جمع کرا چکی ہے جس کا نتیجہ  
یہ ہے کہ وہ اس ایکٹ کے باوجود اپنی مہتی کو انفرادی طور پر برقرار رکھے میں کامیاب  
ثابت ہوئی ہے۔ بنابرین ہر خودوار مسلمان کا غرض ہے کہ غیر مسلم بیمہ کمپنیوں کے  
مقابلہ پر اس کمپنی کی پالیسی خریدے۔

ڈاکٹر محمد شریف منمنقی منمنقی ڈاکٹر کیر ۲۲ منمنکی ڈاکٹر

# ادب شہرِ حیاتِ اسلام کی مقبول عالم اور شہرہ آفاق کتابیں

جن کا ہر لفظ دلچسپ، ہر سطر پر اثر برسرِ تاثیر اور سرشارِ نغمہ خیز ہے۔ اگر آپ نے اب تک یہ افسانے نہیں پڑھے تو ضرور پڑھئے اور اگر پڑھے ہیں تو اس قابلِ مصنف کے متذکرہ ذیل جدید افسانے (جو محال ہی میں نہایت دیدہ زیب بیج ہو سکے ہیں) پڑھنے سے طلب فرما کر اور پڑھئے گا۔

**کارزار حیات** | قابلِ مصنف کے ہائیس افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے جس کا ہر افسانہ ایسا دلچسپ ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ہمارا دعوئے ہے کہ اس کتاب کی اور ایسی نغمہ خیز کوئی کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی، حجم تقریباً سات سو

صفحات کا غذائیکہ اور دلچسپ و لطیف نہایت صاف۔ جلد خوبصورت۔ قیمت . . . . .

**تفسیر حیات** | یہ بھی قابلِ مصنف کے ہائیس افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ جن پر قابلِ مصنف کو پنجاب یونیورسٹی سے سات سو روپے کا انعام ملا ہے۔ دوسرے حصے سے زیادہ دلچسپ ہے۔ جلد خوبصورت۔ قیمت . . . . .

**شمر گناہ** | یہ نہایت عبرت ناک اور بے حد پُر سوز افسانوں کا مجموعہ۔ ہر افسانہ عورت کی بیگنی اور غلطی کی المناک داستان پیش کرتا ہے۔ اور اردو زبان میں ایسے دلچسپ افسانے آج تک نہیں لکھے گئے۔ قیمت ایک روپیہ

**سرابِ حقیقی یا دھرم پتی** | ایک لاہور ہندو عورت اور نوجوان سادھو کی محبت کی نہایت حیرت انگیز بے حد دلچسپ اور روان خیز داستان ہے۔ سادھو محبت کی خاطر مذہب کی زنجیریں توڑتا ہے۔ اور عورت مذہب کی خاطر محبت کر قربان کر دیتی ہے۔ جلد خوبصورت۔ قیمت . . . . .

**آشوبِ زمانہ** | یہ مجموعہ ہے ایک مرد اور ایک عورت کے چند خطوط۔ محبت کا جن میں مصنف نے اپنے دوست و مشاہد اور رنگین عہد سے جذبات و محبت کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ قیمت . . . . .

**مرزا جی حصہ اول و دوم** | اگر آپ مزاحیہ افسانے اور مذاقیہ مضامین پڑھنے کے شائق ہیں تو زیادہ سنجیدہ ظرافت اور اچھوتے مذاق کی کوئی کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔ جلد خوبصورت حصہ اول . . . . . حصہ دوم . . . . .

**گناہ کی راتیں** | یہ کتاب اپنے اچھوتے مضامین کے باعث اس قدر مقبول ہو چکی ہے کہ اس کا ہر تھاوہ پیش ہم نے شائع کیا ہے۔ جس میں انسان کی سیاہ کاریوں کے وہ سات افسانے درج ہیں جو نہایت دلچسپ اور سبق آموز ثابت ہوئے ہیں جلد خوبصورت۔ قیمت . . . . .

**بقاع دوام** | اس میں روح کے متعلق وہ عام معلومات درج ہیں جن کے معلوم کرنے کی ہر شخص کو طبعاً خواہش ہے۔ مثلاً روح کیا ہے۔ مرنے کے بعد کہاں جاتی ہے۔ انسان دنیا سے سفر کر کے کیا لے جاتا ہے۔ اس دنیا میں آسکتا ہے۔ یہ سب اور غیرہ۔ جلد خوبصورت۔ قیمت . . . . .

اس وقت  
علی بن  
ملک دین محمد ایندھن پور پشاور و تاجران کتب بازار کشمیری بل وڈ لاہور

ان تمام غریبوں کے باوجود قیمت بہت کم رہی گئی ہے یعنی صرف  
بین روپیہ بلاجلد - مجلد سیکے - علاوہ محصول ڈاک -

مخزنِ حرکاتِ معلّم و اساتذی  
 قیمت: بلا ہلہ ۱۰۰۔ جلد تین روپے۔ اس کتاب میں تقریباً دویسہ دو سو تار  
 قدیم و جدید یونانی حرکات کے صحیح منتخب نسخہ ہات درج ہیں۔ ان کے علاوہ  
 خمیر معلّم و اساتذی اور خمیر طبع الامراض بھی شامل ہیں۔

پیشہ طبعی کتب خانہ جناب شمس اللطیف ابھانی گیت طالع







# The Eastern Federal Union Insurance Company, Ltd.

HEAD OFFICE :—9, CLIVE STREET, CALCUTTA



**PURELY INDIAN CONCERN**

**OFFERS**

**To its Policy-holders :—**

**PEACE AND SECURITY**

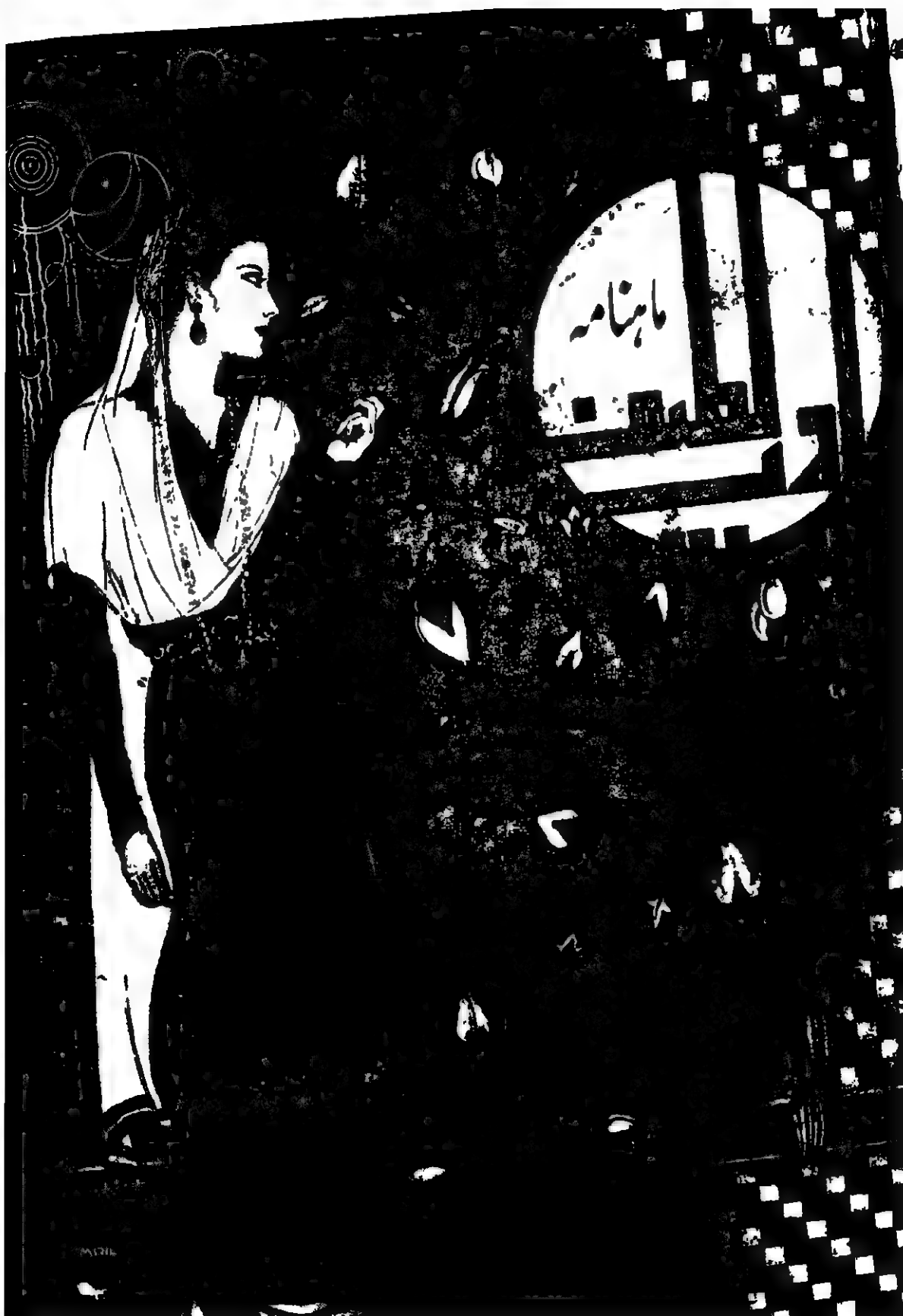
**To its Representatives :—**

**A PROSPEROUS & INDEPENDENT CAREER**

**For Agency Terms Write To-day to**

**The Branch Manager,**

**10, GANGA RAM TRUST BUILDINGS - The Mall, LAHORE.**



# فینسی قمیضوں کے کپڑوں میں **ASTRA** SHIRTING



مینڈیکچرز

دی بنگلور وولن کاشن اینڈ  
سیلک ملز کمپنی لمیٹڈ بنگلور

سول ڈسٹری بیوٹرز

جیمز ہن کرشن پیرشاد

برائچہ ہے۔۔۔ مہشی۔۔۔ دہلی  
کامیور لبر  
کٹہرہ آہلو والیاں امرتسر۔  
روپہ

سالانہ چھ ماہیہ مضامین سالانہ  
ادارہ نمبر ۱۲۱ پانچویں سال  
علاقہ محمولہ ایک

مطلوبہ کردہ تعلیم پنجاب، سو پر سرحد و راستہ آبادکن

رسالہ ادب لطیف

ادارہ تحریر

پودھی برکت علی

بی۔ اے

میرزا ادیب

بی۔ اے

پودھی ندیر احمد

مینجر

چودری بشیر احمد

مکتبہ بہار دولاہور

۳۹

نی پڑچپ رائے

| جلد ۸ | فہرست مضامین          | مکتبہ                    |
|-------|-----------------------|--------------------------|
| نمبر  | صاحب مضمون            | مضمون                    |
| ۱     | ادارہ                 | اشارات                   |
| ۲     | جناب راجندر سنگھ بیدی | موت کاراز (افسانہ)       |
| ۳     | تاج محل صدیقی         | چاندنی کی آمد (نظم)      |
| ۴     | جہیل جگندھان پوری     | سکی موت کیوجہ (افسانہ)   |
| ۵     | اثر چکولی             | غزل                      |
| ۶     | سید احسان بی۔ اے      | میں ہوں بڑی شکست کی آواز |
| ۷     | سید مقبول حسین صاحب   | گیان گیت (گیت)           |
| ۸     | شاگر علی صاحب         | دوستوں کی (مقالہ)        |
| ۹     | احمد ندیم قاسمی       | سریزمین تصور (نظم)       |
| ۱۰    | سید راحت مولانی       | خود نمائی (افسانہ)       |
| ۱۱    | روشن صدیقی            | تقریب (نظم)              |
| ۱۲    | جناب یزدانی جاندھری   | دس منٹ (ڈراما)           |
| ۱۳    | امین حزیں             | لطیف زلیست (نظم)         |
| ۱۴    | مسعود جاوید           | تکبوت کے خطوط (افسانہ)   |
| ۱۵    | تاجور سامری           | بے نیازی (نظم)           |
| ۱۶    | سید الطاف شہیدی       | غیر بلند (نظم)           |
| ۱۷    | حق نواز اختر          | آمر پوسٹ (مقالہ)         |
| ۱۸    | طالب انصاری           | غزل                      |
| ۱۹    | میاں عبدالحی صاحب     | جمادی زبان (مقالہ)       |
| ۲۰    | خواجہ حسن عباس        | سیدی دیکر (افسانہ)       |
| ۲۱    | اختر ہوشیا پوری       | مصورم اقرار (نظم)        |

## ادب لطیف

کے ڈرامہ نمبر میں شہار دیکر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اپنی تجارت کو فروغ دیجئے

فرمانامہ، کاشفہ، نثاروں میں اعلان کیا جا چکا ہے کہ بکے افسانہ نگار کی بجائے ڈراما نمبر شائع ہو رہا ہے؛ ہمارے افسانہ نمبر ملک میں  
بہت مقبول ہوچکے ہیں۔ وہ یہیں بھی شاعری کا خاص طور پر انتظار کرتے رہتے ہیں، مگر جو سا کہ اہل ذوق حضرات بخوبی جانتے ہیں صرف افسانہ  
نگاری کا فروغ ہی ہمارے ادب کو فائدہ نہیں کر سکتا بلکہ افسانہ نگاری کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہمیں ادب کے دیگر اصناف و انواع کے فروغ  
کی بات بھی ناگوار نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس خیال کو مد نظر رکھ کر ڈراما نمبر کا اعلان کیا گیا۔ ہماری پہلی فن ڈراماٹسٹ مانوس نہیں اس لئے ڈراما  
کی اشاعت کا مطالبہ کرنے وقت ہمیں جہاں اس امر کا احساس تھا کہ ہمدانی کو کشمکشیں وقت کی ایک اہم ضرورت کی طرف توجہ کر رہی ہیں  
وہاں میں نے باطلیم حیدرین تھا کہ ہمیں متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اول تو ہمارے یہاں ڈراما نویس ہی بہت کم ہیں اور جو جدید جدید ہیں  
وہ یا تو فلسفی راستے پر کاربن ہو گئے ہیں اور یا انہوں نے نظم کا حق سے دیکھ دیا ہے اور یا پھر انکی ذاتی مصروفیات، نہیں رسالوں کے لئے ڈرامے لکھنے کی  
وقت نہیں ہوتی۔ غرض اب میں اپنے فیصلے کا اعتراف ہو گیا ہے؛ ہمارے فارغین نے جس ذوق، شوق اور جس دلچسپی کے ساتھ ہمارے ڈرامے کا  
خیر مقدم کیا ہے وہ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ کم از کم ڈرامے کے بآئیں ملک کے متعلق ہماری رائے محض سر زمین کی حیثیت رکھتی تھی ایک طرف تو  
قارئین ڈراما نمبر کی اشاعت کا نہایت جہت افزا انداز میں خیر مقدم کرتے ہوئے خط درخط لکھ رہے ہیں اور دوسری طرف دفتر میں ایسے بلند پایہ کامیاب  
اور خدمت گزار ڈرامے اور مضامین موصول ہو رہے ہیں جنہیں پڑھ کر ہم پر مزاحمت لگا چکے ہیں کہ ڈراما نمبر افسانہ نمبر سے بدرجہا زیادہ کامیاب رہے گا۔  
مشورہ و حروف دورہ نویسوں کو اپنی کوناکوں مصروفیات نے ٹھیک رکھا ہے۔ مگر انکی بجائے میدان ادب میں ایسے نوجوان ڈراما نویس آ رہے ہیں  
جنکی کوششیں سینا اور دورہ اکوشت مزید مقام پر لے جائیں گی ان نوجوان و ماخول کے جوان فکر و فنی نقطہ نظر سے اتنے بلند اور کامیاب ہیں  
کہ آپ بقضاءِ روٹی سے سخت ڈراما نویسی کے فروغ و ترقی کے معترف ہوئے بغیر نہیں رہیں گے!

جہاں سے فرم اہل قلم اس مبارک کامیاب کھیا ب بنانے کیلئے انتہائی کوشش کر رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل مضامین اللہ کے فضل و کرم میں پہنچ چکے ہیں:

جہوں ایک کہانی از عشق و رحمانی - پانچویں سیمپوزیئم لاہور میں منعقد ہوا۔ ضمیمہ ہندوستان کے علوم و ادب کا ترجمہ قاسمی - آرام علاج از انصاف ناصر  
جہوں سے اس طرح کے نثر اور لطیف ڈرامے کی تاریخ مذاہر اللہ دی۔ مجرم ذمیل احمد کے بارے میں معلومات کا پیچہ دہاکرام قمر۔ حقوق نسوان - از پروفیسر کینیا لالہ  
دستور و حریم پر کاش - مسٹر مونس اور کی تباہی از میہ ز اویس۔ علاوہ ازیں مندرجہ ذیل حضرات کی نگارشات بھی شریک شہر ہو گئی ہیں۔  
حکایت فی جہرہ سے صلح سید بادشاہ حسین - اختر اور نیوی منسلق قریشی، علی شاگرد، فارہ حمید آبادی، مسعود جلالیہ، نریندر ناتھ، عطار اللہ پالکا  
نیروانی جہاں سے میری شہرہ چوہانی - عزیز احمد، علی احمد، کرشن چندر، ایم پی سنت سنگھ، سیکھوں، پروفیسر فیاض محمود ایم بی، راجہ فاروق علی خاں، راجہ شمس الدین  
ہیں یہ سنگٹہہ محبت انوسن ہوا کہ جہاں سے عربیہ محکم شاہہ جناب رام عا عا صاحب خدائے علیل ہیں۔ خدا کرے وہ جلد صحت یاب ہو کر صحت  
معموس اور نازیبا باتوں سے انکار نہیں ہے۔ کہ وہ خدائے صاحب کے لئے دعا کی صحت کریں۔

ایک حکم اطاع۔ جیسا کہ تقدیر جانتے ہیں۔ ہمارا افسانہ قبر پرہیز اور مسمیٰ کے نمبروں پر منسلک رہا جسے سب سے ڈانا نمبر سی ان دو نمبروں کا مجموعی نمبر نکلا: چنانچہ پرہیز کا پورچہ شائع نہیں ہوگا۔ اور ڈانا نمبر یک مسمیٰ کو آرکیٹ میں آجبلے گا۔ قارئین اپری کے رچہ کا انتظار نہ کریں۔  
حضرت اختر شیرانی کا صحیح پتہ:- اختر شیرانی ۱۸ فیلمنگ روڈ لاہور۔

جناب راجندر سنگھ بیدی

# موت کا راز

بیٹھا تھا۔ اپنے بیٹے چکے پوٹوں کو بچا رہے تھے، بلکہ وہ خود چپٹ جسم کر  
اٹھ گئے۔ . . . . . ہائیں! آپ جہاں کیوں نکلتے  
ہیں . . . چپے پوٹے ہیں کہیں نہیں نکلتے . . . . . سنے تو میں صہم  
کی اس حالت میں نہ جے، ہنسا کی آخری منہ لپکنا چاہیے، اس  
نہایت صہم سے پیچھے ہو کر اسے یوں دیکھ رہا تھا جس طرح پرانی  
حکایتوں کا شہزادہ کسی اونچے اور نہایتی نیچے پر کھڑا دوسرے اس  
شہزادی کے محل کا جھٹکتے ہوئے دھوئیں کے دھوڑے اندازہ لگائے  
جس نے اپنی شادی مشروط رکھی ہو۔

وہ رقصاں خنداں لہڑیاں لوگ میرے بڑے تھے . . . . . بیٹے  
اپنے والدین کی تصویر تو ماہے میرا باپ اپنے باپ کی تصویر تھا اس  
لئے میں اپنے دادا کی تصویر بھی جو سکنا ہوں، اور بوں اور اتانی منازل  
طے کرنے کی وجہ سے اپنے . . . ہاں سننے کی کرمات نہیں تو دسمندلی  
سی تصویر ضرور ہوں . . . . . ہندوستانی تہذیب و دھنوں کا شروع  
ہے، ایک دروازہ اور دوسری آئینہ میں آئینہ نسل سے ہوں، میرا  
وراثہ تو گوارا نکلیا، سیاہ آنکھیں، جس میں بوجی اور قدرت جسم  
پرست ہونا، اس بات کا ثبوت ہیں۔ . . . . بات معلوم کرنے کی  
میری زبردست خواہش تھی کہ موت کا راز کیا ہے مرنے وقت دے  
دے پر کیا کیا عمل غور پذیر ہوتا ہے، مجھے یہ یقین دلایا جا چکا تھا کہ ماہ  
اور مدوح لافنا جبر سی حالت میں اگر وہ موت کے عمل میں اپنی  
حیثیت بدلتے ہیں تو اس وقت انکی کیا حالت ہوتی ہے — آخر  
مرنے والے نے کہا: وہ بالکل کہاں سکے ہیں۔ سوائے اس بات کے  
کہ وہ کوئی دوسری شکل اختیار کریں، جسے ہم لوگ آگاہ کہتے ہیں  
کہ بڑے حقیقت میں ظہور پذیر ہونے کے بعد پھر اس ذرہ کو جس سے  
کہ ہم پیدا ہوئے ہیں، آدمی کی شکل دیکھاتی ہے۔

یہ بات سنکر شاید آپ بہت ہی تعجب ہو گئے، کہ ہلنے پھرنے

(۱)  
اس بے ربط اور ہوا زنی کے شمال کی طرف نہایتی مہوں کی  
دھن میں میں نے گندم کی تیسویں فصل لگائی تھی، اور سرطانی سورج  
کی حیات کش تمازت کے نیچے پختے ہوئے سٹوں کو دیکھ کر میں خوش  
ہو رہا تھا، گندم کا ایک ایک دانہ پہاڑی دیگ کے برابر تھا، ایک  
نے کو سٹل کر میں نے ایک دانہ لٹکانا وہ کناروں کی طرف سے باہر کو  
قدرے پھکا ہوا تھا، اسکی درمیانی ٹیکہ گہری تھی، یہ اس بات کا ثبوت  
تھی کہ گندم اچھی ہے۔ اس میں خوردنی مادہ زیادہ ہے۔ اور گورکھپور کی  
مذاذی میں اس سال اسکی فروخت نفع بخش ہوگی۔

میرے خیالات کچھ عیونی اختیار کر رہے تھے، اس وقت زندگیوں  
میں سے میرے نزدیک کوئی نہ تھا، قدرتا آپ پوچھ گئے ہیں کہ اگر زندگیوں  
میں سے کوئی تمہارے نزدیک تھا، تو کیا مردوں کی یاد تمہارے ویران  
خانہ دل کو آباد کر رہی تھی؟ — میرا جواب اثبات میں ہے  
آپ سے ایک اور بات بھی مراد سے منوا چاہتا ہوں، اور وہ یہ ہے  
کہ میں دونوں کا تصور ہی نہیں کر رہا تھا، بلکہ ان کو اپنے سامنے بیٹھے  
دائیں اور بائیں کتھا کی انداز سے وقف کرتے، سنتے اور خوفست  
کہہ پتے ہوئے دیکھ رہا تھا، جس طرح آب کی دانہ کی بال بال مجھے ملے  
ظاہر کتاب، اور آپ کی تمازت ذرہ آنکھوں کے سرخ ڈھبے دیکھ  
رہا ہوں، اسی طرح میں انہیں دیکھ رہا تھا، ان میں سے کسی کے چہرہ مہوی  
نوتین کی اس کی کاندہ کا چہرہ صبح کے وقت کا شمیری بہار کی شبنم نے  
دھوڑا ہوا شگفتہ ہو کر چمک رہا تھا، اور کسی کے چہرے پر جھراں اور  
گہری گہری لکیریں تھیں، شاید وہ کسی نتیجہ خیز تجربہ زندگی کی نشانیاں  
تھیں۔

گندم کے کھیت کے دن . . . . . نہیں کہیں رہے تھے نہ . . .  
تیس سالہ شیشم جس کے گتھے مایہ دار پھینڈاؤ نے مجھے تباہی یا تباہ





سے کچھ اتف گئے ہونگے۔

(۳۱)

اس دن جس دن کرے گا بال میرے ناخن میں داخل ہوا۔ میں  
بہت مضطرب رہا۔ شام کو میں گھبراتے ہوئے پاس ہی کے ایک  
شہر کے کسی ڈپے اختر شناس کے پاس گیا۔ اس نے میری داس زعفریہ  
دیکھتے ہوئے تیار نہ لکایا اور بچہ کہا۔ کہ برصیت کا اثر تمہیں ہر بلا سے محفوظ  
رکھے گا۔ اور تمہاری عمر بہت لمبی ہے۔ اس کا شاید خیال ہو کہ دوزخی عمر کی  
پیشین گوئی سن کر یہ بالدار زمیندار اپنے بائیں ہاتھ میں چٹکی طحانی انگوٹھی  
اتار کر دے گا مگر یہ بات سن کر مجھے سخت بے چینی ہوئی، ایک لکھی سی  
کے عالم میں میں نے اسے اسکی قلیل فیس۔ ایک ناریل تیار کیا اور  
پانچ شے دے دیئے۔ میں تو مرنا چاہتا تھا اور دیکھنا  
چاہتا تھا کہ اس حالت میں مجھ پر کیا عمل ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کا  
بھی شوق تھا کہ میں اس راڈ کو جسکی بات چڑے چڑے حکیم اور پتی  
طبیعیات کے ماہر کہہ چکے ہیں۔ وہ کہتا ہے کچھ..... ہم نہیں  
جانتے کیسے..... طشت از بام کر دوں اور دنیا میں پہلا شخص بنوں  
جو کہ دوسری بہنیت میں آتے ہوئے اپنی حریت انگریز یا واداشت کے  
ذریعہ سے دنیا پر واضح کر دے کہ ذرے کو یہ حالت پیش آتی ہے۔  
اور وہ اس شکل میں تبدیل ہوتا ہے

اس بات کے مشاہدہ کے لئے خود مرنا لازمی تھا مگر عاقل اختر  
شناس نے اس کے برعکس دوزخی عمر کی روح فرسا خبر سنا لی تھی، آتم گھاٹ  
خود کشی ایک پاپ تھا جس کا ارتکاب نہ صرف میرے بزرگوں کے  
نام پر دھبہ لگاتا تھا بلکہ موجودہ بچوں اور آئندہ نسلوں پر بھی اثر انداز ہوتا  
تھا، چنانچہ میں نے خود کشی کے خیال کو بالکل باطل گردانا۔  
میں جنگل میں ایک ٹیلے پر بیٹھا تھا وہاں سے وہ بڑے گندک کے  
ایک معاون کے..... آبنار کی آواز صاف طور پر کانوں میں آرہی  
تھی اور چونکہ مجھے وہی بات خوش کر سکتی تھی جو کہ میرے دل کو مضطرب  
کرے۔ اس نے گندک کے معاون کے آبنار کی دیکو بجا دینے والی  
آواز مجھے بجا رہی تھی، ایک پتھر کو اٹاتے ہوئے میں نے بہت سے  
کیرے مکوڑے دیکھے۔ پھر میں نے کہا: ہر

اسکا ایک بال میرے ناخن میں باثر گیا اور لاکھوں ذرات جن کی میں  
مخبرئی صحت ہوں۔ ان میں سے ایک ذرے کو جو کہ انفرادی طور پر  
ذره بنظیم سے کم نہیں اسنے آگے دھکیل دیا وہ ذرہ جو آگے دھکیلا گیا  
نا معلوم گذشتہ زمانے میں میرا کوئی بزرگ تھا یا شاید آئندہ نسلوں میں  
سے کوئی۔ یہ میں جان نہ سکا، بہر حال بے گال بال ان دونوں میں  
سے نہ تھا۔ وہ ایک برونی خارجی چیز تھی جس کو میرے تعجب میں  
داخل ہونے کی تعلیمی مخالفت تھی۔ اس کا یوں میرے جسم میں چلے آنا  
اس مسافر کی مداخلت بے جا کی مانند تھا جو لفظ شارع عام نہیں  
پڑتے ہوئے بھی اندر گھس آئے۔ یہ مداخلت قطعی کیوجہ ہی تھی کہ درد  
سے میں اسے اٹھا کر مجھے نرزدہ بر اندام کر رہی تھی۔

بھلا ایک کتنا اپنی گلی میں دوسرے کتے کو نہیں آئے دیتا تو میرے  
خاں پرستش بزرگوں اور معرکتہ آکار کام کرنے والی آئندہ نسلوں کی  
عظیم الشان ہستیوں اس خارجی چیز کی مداخلت بے جا کو کب بڑا  
کر سکتی تھیں۔ اٹ درو! ماسو اس چیز کے۔ اس ذرے کے جو کہ  
ہماری آئندہ نسلوں کا اپنی ضرب و تقسیم کے ساتھ روحانی لاچرمانی  
بت بنے یا ہمارے بزرگوں سے ہیں درد میں آئے کسی اور چیز کو  
مطلق دخل نہیں۔ مادہ اور روح دونوں اس وقت تک چین نہیں  
پاتے جب تک کہ خارجی مادے کو ہر ایک تکلیف سے کر جسم سے  
باہر نہیں پھینک دیا جاتا۔

وہ ذرہ تو ہر جنبش سے اثر پذیر ہوتا ہے مگر آپ نے غلط ڈی سو  
اپنے جسم و روح کے نامناسب استعمال سے انہیں کسی طرح مفلک  
اور نا توں بنادیا ہے۔ تو آئیے وہ ذرے جنہوں نے آپ کے بیٹے اور پوتے بننا  
ہے مفلک اور نا توں حالت میں آپ کے سامنے آکر اپنے ولی و  
ذمی اضطراب کا باعث ہوں گے مادہ اسے قسمت و تقدیر کہیں گے  
مگر اگر قسمت کی تعریف مجھے پڑھیں تو وہ یہ ہے: صحبت نیک و  
بد کے اثر کے علاوہ چیز پوری ذمہ داری سے ہمارے بزرگوں سے نہیں  
دی ہے وہ ہمارے قسمت ہے۔ اس لئے آپ جو لمبی نعل کریں سوچ  
کر کریں۔ انگلی بھی پائیں تو سوچ کر..... یاد رکھئے۔ ایک سموالی بات  
نہیں ہے..... اب شاید آپ ذرے کے قول و فعل

[illegible]

پناہ مانگنے سے بہت پیچھے ہیں ۷۰ فی صد میں مکمل —  
— نیگامانی کے ہزاروں پیرہ رکھ دو سو سو کہیں ضروری خبر دلا دی  
فعل کو مانہ ہمیں ایک ہزاروں کا

میں نے کہا کہ میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے دنیا بھر کے لوگ ہنس رہے ہیں۔

میں کمر تک مکتی تانہ اور دھوا لائری تے اور دروں پہاڑوں  
تسے ہوتے ہرنانی پانی میں داخل ہو چکا تھ میں بدلی جلدی آئے  
بڑھنا چہ تھا کھو کھو کیا کرتا ارادہ تانے آپ کو مار ڈالنا تھا  
لیکھ آگے بڑھتے ہوئے میں نے آہستہ آہستہ پاؤں کو قلعہ نصف  
نزدیکی سکھ میں چھوڑ دیا سرور سے باور باغ غنٹ کے سیب ببا  
متراب تاکہ کوئی پانی پر نہ پڑے ببا سے باتے یا کوئی قلعہ دیکھو

پانی میں ٹانگ پکڑ کر مجھے گھسیٹا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔  
... معاذیر پاؤں ایک آبی تھانڈی میں اچھ گیا۔ ہر میں پانی  
میں غوطے کھانے لگا۔ سہرا پاؤں اور پھل، اور دوسرے لمحہ میں تین ٹانی  
کے لمون میں غوا پانی کے ریلے بڑے زور و شوق سے میرے سر پر پرت  
کر رہے تھے۔

بچہ دیر تک میں نے پنادم سادھے کھا، مگر گب تک ہوا۔۔۔  
 بے ہوش ہونے سے پہلے مجھے چند ایسے باتیں یاد تھیں کہ میری انگلیں  
 زور ہاتھ بڑ پانی میں کانپتے ہوئے احرار حرم پر رہتے تھے۔ باہر نکلتے ہوئے  
 سانس سے چند جیلے اندر سطح کی طرف گئے۔ میرے دماغ میں زور  
 دینے کا ایک زبردست خواہش نے اکساہٹ پیدا کی، ادا کی کشش  
 میں میں کسی چیز کے برٹن کے سنڈ پنی میں ادھر دھرا تہ پاؤں مارنے  
 لگا مگر اب میں پانی کی زد سے باہر آ سکتا تھا۔ باوجود وہ مجھ سے بہت  
 کچھ جھوٹا تھا۔

اس کے بعد میری یادداشت منسل جوئے لگی..... بسیرہ بزرگان  
..... تکمیل..... پرانی حکایتوں کا سہزادہ..... موت کا راز.....  
..... مکمل..... موت کا راز..... اس  
کے بعد یاب نیا سا اندھیرا چھ گیا۔ اندھیرے میں کبھی کبھی روشنی کی  
ایک جھلک ایک بڑے سے کدے کی تسکین دکھائی دیتی..... پھر  
پرانی حکایتوں کا سہزادہ..... ذرہ..... موت کا عمل  
..... ناموس اور اندھیرا ہی اندھیرا !!

س تکس ب ہونی میں مجھے ایک نقطہ سا دکھائی دیا۔ جو کہ برابر چھٹا گیا۔ شاید یہ وہی ذرہ عظیم خا جس کی بابت میں نے بہت کچھ کہا ہے۔ جو کہ لپٹا ہوا گیا۔ وہ پھر کراہی گئی کی سی صورت میں میرے جسم کے ارد گرد لپٹ لیا اس طرح کہ اب پانی اس میں داخل نہیں ہو سکتا تھا بے پول محسوس ہوا۔ جیسے میں کسی خلا میں ہوں۔ جہاں سانس لینا بھی ایک تکلف ہے

نیزہ عظیم سے آواز آنے لگی۔  
 'مرث کے عمل میں تین حالتیں ہوتی ہیں قبل از موت۔ موت۔  
 بعد از موت۔ دہلی حالت میں جو سکنا ہے کہ دو سرری حالت نام پر

ہوئے کباتہ بادداشت کی تحسین — مکمل تحلیل پر میں وہ راز دنیا والوں کے مسائل طشت ازہم بیٹے کر تھرا ہوں..... میں زندہ رہنا ہی ہوتا ہوں؟

— زندگی کی اس خواہش کے ساتھ ہی میں نے اپنے آپ کو بھٹی ناتھ دودھ سولا گری کے، دگر دنی پہاڑیوں میں تہہ کر آتے ہوئے برفانی پانی کی سطح پر پاپا بھلی سی مہرے جو پرت اتر چکی تھی، زندگی کی ایک اور خواہش کے بعد ہونے ہی گناک کے معادن کے ایک ریلے نے مجھے گنہ گار پر چینٹا دیا اس وقت چاندنی رات میں ہوا تیزی سے چل کر سانس کی صورت میں میرے ایک ایک سام میں داخل ہو رہی تھی۔

طاری ہونے سے پہلے تم زندہ رہ جاؤ۔ قدرت اس میں ہمیں دوسری حالت کا احساس نہیں ہو سکتا۔ دوسری حالت میں تم اس بات کو ایک طاعنی عرصہ کے لئے جان سکتے ہو۔ جس کی تم اتنی خواہش کرتے ہوئے ہو۔ مگر اس کا اظہار نہیں کر سکتے۔ ابعد موت ہمیں زندگی کی پہلی نشانی کو مافی کی قوت عطا کی جاتی ہے۔ پھر یادداشت کو جو اول دوم حالت میں تہہ سے ساتھ ہوتی ہے اسے خیر یاد کہنا ہوتا ہے۔ ذرے کو ذرات کی عطا کر کے اس پر بہرہ بانی کی جاتی ہے۔ عین اسی طرح جب آدمی کو غیب سے ناسخ کر کے اس پر کرم کیا جاتا ہے۔ وہ، از یادداشت کی تحسین پر میں پنہاں ہے

یادداشت کی مکمل تحلیل۔ میں نے ان الفاظ کو ذہن میں دہرات

جناب تاج صدفی بی اسے

## چاندنی کی آمد

رات ساکن ہے میں چپ سہاں خاموش ہے  
ہے زمین و آسمان کو نمیند سی آئی ہوئی  
چاندنی امندی چلی آتی ہے اٹھاتی ہوئی  
کچھ بلند و پست سے سرگوشیاں کرتی ہوئی  
چپکے چپکے رستیوں سے گاؤں سے ہوتی ہوئی  
مسکراتی مسکراتی پھول برساتی ہوئی  
آسمانوں سے اتر کر آ رہی ہے چاندنی

برگ برخاموش ہیں سارا جہاں خاموش ہے  
اور فضاوں پر میں پریاں نیند کی چھائی ہوئی  
نور کے طوفان میں ہر ذرے کو ہلاتی ہوئی  
ایک دہن کی طرح ابھکیلیاں کرتی ہوئی  
باغ اور کھیتوں میں مولیٰ نور کے بونی ہوئی  
مست خوشبو سے ہر ایک ذرے کو بھکاتی ہوئی  
دور اور نزدیک پھیلی جا رہی ہے چاندنی

اک روپہلی خواب ہے کون و مکان کو آ رہا

ہے فضا کی سمجھ میں نشہ سا اک تھرا رہا

نوشتہ: ای نیت

# اس کی موت کی وجہ

مترجمہ: جناب میل احمد  
کدھاپوری بیسے

اختیار کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ کیونکہ محدود آمدنی کے ساتھ آپ جاتے ہیں شہری زندگی کسی قدر ناممکن ہے۔ اب موت ہی ایک عمدہ نئی کہ کسی گاؤں میں کوئی چھوٹا سا مکان کرانے پر لیکر وہیں سکونت اختیار کی جائے۔ ہماری خواہش تھی کہ جس گاؤں پر ہماری نظر انتخاب پڑے وہ نہ صرف خوبصورت ہو، بلکہ اسکی آب و ہوا بھی اچھی ہو، مگر یہ دونوں چونکہ ایسے اوصاف ہیں جو مشکل کسی جگہ یکجا نظر آتے ہیں۔ اس لئے کچھ دنوں تک تو ہماری تلاش راگلاں گئی، مگر آخر کار ایک گاؤں مل گیا، جو ہمارے مقررہ معیار پر پورا اترتا تھا۔

اس گاؤں کا نام بڑنگ تھا۔ جو فٹاک دلدروں کی دھن جانب ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع تھا۔ آخری حدود میں گرجا کے قریب ہی ایک مکان ملا۔ یہ ایک قدیم خستہ حال عمارت تھی، جس کے بعض حصے اور احوال دھڑکتے تھے۔ مرنے والے درمیان دو کمرے اب تک محفوظ رہے تھے۔ مگر ان کی ساخت بھی بیڑھ سٹکی تھی، دیواروں پر تمام کافی جم گئی تھی، اور جا بجا گھاس چھانی پڑی تھی، مکان کے سامنے قدیم طرز کا ایک باغ تھا جس میں بدشیں بنی ہوئی تھیں۔ اور رنگ برنگ کے جھگی پھولوں کے پودے۔ بالخصوص گلاب اور چنبلی کے پودے اپنی بہادر کھارہ تھے۔ اگر یہ چیزیں نہ ہوتیں، تو وہ جگہ یقیناً بہت بھیاٹک نظر آتی۔

کنارے کے چند کمرے ٹوٹ کر گر گئے تھے۔ اب وہاں اب صرف کھنڈر ہی کھنڈر نظر آتا تھا۔ جس کمرے کو ہم لوگوں نے اپنے رہنے کے لئے پسند کیا تھا، اس کی کھڑکی سے خوشنما سرخراہ اور مسند کی شبیلی سطح دکھائی دیتی تھی:

اور چونکہ اس مکان کا کرایہ غیر معمولی طور پر کم تھا، اس لئے معمولی سی دیکھ بھال کے بعد ہم نے وہ مکان کرایہ پر لے لیا۔

مگر یہ اس انسان کا ہر لحاظ حقیقت پر مبنی ہے کہ میرا خیال ہے کہ بہت کم لوگ ان واقعات کی صداقت کے سامنے تسلیم خم کرنے پر آمادہ ہونگے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ اب لوگ ہر چیز کو عقل و جوش کی روشنی میں دیکھنے کے عادی بن گئے ہیں، اور میں اس نئی کہانی کے لئے نفسی دلائل پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ اتنا سمجھ لیجئے کہ کتبہ کی اس یادگار کیسے کیا تاریخ کو ہم دونوں میں اور میری شریک حیات، روزی دھوکا اور غلط فہمی میں مبتلا رہ کر اسی حادثہ کا شکار بنے انسان ختم کرنے کے بعد آپ خود سکا اندرہ لگانے کے قابل ہو جائیں گے۔ کزیری دلیل کہاں تک کس طرح قابل قبول ہے، میں نے اس یادگار واقعہ میں حصہ لیا ہے میں، روزی، اور ابک ڈیون ڈیکٹر، مگر انکو ابھی بتید جاست ہے۔ اور آپ اگر چاہیں تو اس ناقابل یقین واقعہ کی اصلیت اور حقیقت کے متعلق اس سے استفسار کر سکتے ہیں۔

یوں تو آج تک زندگی میں کبھی بھی مجھے فارغ البالی نصیب نہ ہوئی، لیکن بالخصوص اس وقت جبکہ یہ واقعہ رونما ہوا، میں بہت زیادہ تہید ست تھا۔ حتیٰ کہ معمولی ضروریات زندگی کے لئے بھی مجھے اکڑھوڑ کے سامنے دست سوال و راز کرنا پڑتا تھا ایک تو یہ حالت اور اس پر مستزاد ہماری شادی، ایسی حالت میں آپ ہی بتائیے زندگی بغیر کفایت شکاری کے ہمارے لئے ناممکن تھی یا نہیں؟ وہ تو خیرستہ ہوئی کہ میری شریک حیات روزی انسانے لکھنا جانتی تھی، جبکہ بدلت ہر مہینہ تھوڑی بہت رقم مکان رسائی کی طرف سے اسے مل جایا کرتی تھی، اور میں معمولی سے کچھ نہ کچھ کما لیا کرتا تھا، اس طرح گویا معمری طو پر گزرتا وقت کی صورت پیدا ہو جانے کی امید تھی، اور خدا خواستہ، اگر وہ بالکل بے ہنر ہوتی تو زندگی سراپا مصیبت بن کر رہ جاتی، شہر میں بود و با



مخبر چکر ان کے وارثوں کے پاس کافی سیم دزد تھے۔ اس لئے وہ ان گنہگار انسانوں کو موت کے بعد گرجا کے اندر جگہ دلانے میں کامیاب ہو گئے۔

ان سفید محبتوں کی بعیت کڈانی کو دیکھ کر وہ بتانوں کی باتوں کا یقین ہو جاتا تھا۔

گر جاس رات نیمر معمولی طور پر بہت ہی سبب ناک نظر آ رہا تھا اور منور بادشاہ بلوط کے سامنے محسن اور ستون پر بیٹھے انداز میں بیکر ہوئے تھے۔ درخوردت مرزا رضیائے ماہ میں پرستان بن گئے تھے۔ جو محبتوں میں بل کعبہ کے پر جلال جن کو بخور دیکھتے رہے جو اس مقام کا خاص طائر اختیار تھا۔ درخوردت رات در زیادہ ہو گئی۔ تو گھر اس لوٹ آئے۔

صبح کے وقت مسز ڈورن سے میں میں خطاب ہوا۔  
"میں نے سنا ہے کہ تم گھر جانا چاہتی ہو ایک سو مسز ڈورن آفر  
اسکی وجہ کیا ہے؟

"جی ہاں" مسز ڈورن نے اپنے خاص انداز میں کہا۔ "اس واقعے  
اختتام سے میں یہ اس گھر سے چلا جانا نہایت ضروری ہے"

"کیا تمہیں ہم سے کوئی شکایت پیدا ہو گئی ہے؟  
"نہیں حضور! مطلق نہیں۔۔۔۔۔ آپ اور آپ کی روزی، تو

مجھ پر جویش بہت مہربان رہے ہیں۔۔۔۔۔؟

"اچھا تو کیا تم اب اپنی تنخواہ میں کچھ اضافہ چاہتی ہو؟  
"نہیں۔۔۔۔۔ تاہم میرے دل میں تو اس قسم کا کوئی خیال نہیں؟

"تو چر میاں تمہاری کیوں نہیں ہو؟

"نہیں حضور! میرا جانا تو گریہ ہے مسز ڈورن نے قدرت  
تال کے ساتھ کہنا شروع کیا۔۔۔۔۔ گھر پر جتنی محنت ملی ہے"

"لیکن جتنی تو تمہاری اسی وقت سے علیل ہے۔ جب تم پہلی مرتبہ  
میاں آئی تھیں۔۔۔۔۔ کیا تم کم سے کم ایک مہینہ اور عمارت کے ساتھ

نہیں ٹھہر سکتیں؟

"نہیں جناب! پنجشنبہ کو میرا جانا لازمی ہے"

اور وہ دو شنبہ کا دن تھا۔

گرجا کی عمارت دیہات سے کسی قدر ہٹ کر ایک سنان اور

غیر آباد مقام پر واقع تھی۔ چاندنی راتوں میں ہم کھڑو ہاں جایا کرتے تھے

اور میں! میں ایک خاص صفت حامل ہوتا تھا، وہاں جانے کے

لے ایک تنگ سی راہ جنگل کو صاف کر کے بنائی گئی تھی جو مرزا

سے ہوتی ہوئی گرجا تک پہنچتی تھی۔ یہ راہ کچھ دور تک پہنچتی تھی اور لوگ

اسے "مردہ بردار راہ" کے نام سے موسوم کرنے کے عادی تھے۔ کیونکہ

جہاز سے پہنچنے والے تھے۔ اسی راستہ سے جو گرجا جایا کرتے تھے

محبوب کی دیواروں کے ارد گرد گھٹنے اور تناور درخت لگے تھے جن کے

یادہ بیٹھے سامنے دیران گرجا کے اندر رات کی پر جلال تاریکی میں

ابے معلوم ہوتے تھے۔ جیسے خوفناک جن خواب استراحت میں مستغرق

ہوں۔ قدروں کے پاس منور برکے درخت تھے جن کی شاخیں بطور حیرت

آہستہ آہستہ پھیل رہی تھیں۔ اندر داخل ہونے کے لئے شاہ بلوط کا

ایک چوڑا کوار لگا تھا، اور اس کے پٹ لوہے سے جڑے ہوئے تھے

مخروہوں کے دریاں وسیع لگتے تھے جن سے چاند کی روشنی اندر داخل

ہو کر پہلی ہوتی تھی! مشرقی جانب کھڑکیوں میں قیمتی شے جڑے تھے۔

اور روشنی میں ان کا ہلکا ہلکا دم رنگ نظر آ رہا تھا، معبد کے ہر دروازے

جنگو سپاسیوں کے سفید جیسے ایستادہ تھے سنگ تراش نے انکوسا

حرب سے بھی آراستہ کر دیا تھا جو زندگی میں ان کے لباس کا خاص

جزو رہے ہونگے اور ان کے ہاتھ اور پر کی جانب لگے ہوئے گویا

وہ دائمی عبادت میں مصروف تھے۔ اور اس طرح اپنے گناہوں کی

معافی کے لئے دعا میں مانگ رہے تھے۔ ان محبتوں کے نیچے ہی اسی

قبریں بھی تھیں۔

گاؤں کے دیہاتوں میں ان کے متعلق یہ افواہ مدت ہو چکی

ہوئی تھی کہ ان قبروں کے مچیں وہ نچے، اسی گاؤں کے باشندے

تھے اور اسی مکان میں رہا کرتے تھے جس میں ان لوگوں نے رہتے تھے زندگی

میں وہ نہایت بد خواہ اور بد اطوار طبیعت کے انسان تھے۔ اور ہمیشہ

گستاخ و خون اور قسم قسم کے لہو و لہب میں مصروف رہا کرتے تھے

اسی نے کسی شخص کو جیتے ہی ان سے محبت نہ رہی اور خدا نے ان کی

بے اعتدالیوں سے تنگ آکر آخر بطور قہر ان کے مکان پر پہلی گرا دی مگر





تین ذرا اٹل کراٹپ پتیا ہوں پیای؟۔ میں نے رقصی سے کہا

رہا تھا۔ میں نے گھر۔ اپس جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن پھر کسی نامعلوم جذبہ کے زیر اثر ارادہ ترک کر دیا۔ اور گرجا کی جانب بڑھنے لگا۔ اپنے مکان کے نیچے درجہ پر میں نے ایک آخری نگاہ ڈالی۔ وہ ذی انجینسی کے قریب آرام گری پریشی چوٹی تھی۔ اس کا چہرہ میں نہ دیکھ سکا۔ البتہ دم خم خلی دیوار کے متقابل اس کا پیارا پیارا منہا سر نظر آیا۔ وہ بالکل خاموش اور غیر متحرک تھی۔ . . . . . بلاشبہ وہ آغوش غروب میں ہو گئی۔

جنگل کے کنارے کنارے میں دبے پاؤں جا رہا تھا قریب سے کسی آواز نے یکا یک سکوت شرب کو درہم برہم کر دیا۔ یہ ایک قسم کی کھر خھر ہٹ کی آواز تھی۔ جو جنگل میں پیدا ہوئی تھی۔ میں نے دفعتاً رک کے آواز کو سننے کی کوشش کی۔ لیکن میرے ساتھ ساتھ آواز بھی رک گئی تھی۔ میں نے قدم اٹھایا اور میرے ساتھ ساتھ اس آواز نے بھی، جیسے وہ صدائے بازگشت تھی شاید وہ کوئی چوہ یا ڈاکو ہوگا۔ خود میرے پیروں میں اس قسم کے چوروں کے متعدد واقعات ہو چکے تھے۔ لیکن وہ خواہ کوئی بھی ہو حق ضرور تھا۔ کیونکہ اسے بطور احتیاط اپنے قدم ذرا ہستی سے اٹھانے چاہئیں تھے۔ میں نے مرکز جنگل پر ایک نگاہ ڈالی۔ اور اب مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے وہ آواز بھی میرے نقوش قدم پر آہستہ آہستہ میرا تعاقب کر رہی ہے میں سوچا ضرور یہ میری صدائے بازگشت ہوگی۔ چاندنی نے جنگل پر ستائش سی پیدا کر دی تھی۔ موٹے موٹے درخت ایسے معلوم ہو رہے تھے۔ جیسے گونگھک ستون۔ آخر تر وہ برادر راہ سے ہوتے ہوئے میں گر جا کے اندر اس مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں قبریں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی تھیں۔

ایک لمحہ کے لئے میں اس جگہ ٹھہر گیا۔ جہاں بیٹھ کر گزشتہ دن میں نے ادوی کے ساتھ من و معنی کی مدح پرورد باری کی تھیں۔ یکا یک میری نظر گر جانے والے دروازے پر پڑی۔ جس کے کواڑ کھلے ہوئے تھے۔ اور گزشتہ شرب اس کو یونہی کھلا چھوڑ کر چلے جانے پر میں نے آپ ہی آپ اپنے ضمیر کو ملامت کیا۔ گاؤں میں صرف ہم ہی ایسے انسان تھے جو یکشنبہ کے علاوہ بھی یہاں سیر و تفریح کی عوض سے آیا کرتے تھے۔ اللہ اس خیال سے مجھے اس وقت کچھ گفت سی محسوس ہوئی کہ اپنی بے پلائی

تو پھر میں بھی آتی ہوں؟  
- نہیں جان: آئی راست نہیں: تم دیے ہی بہت تھک گئی ہو  
میں فوراً وہیں آتا ہوں۔ جانو۔ جا کر سو رہو! وہ نہ تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی! دوکھ مجھے خانہ وادی کے کاموں کے علاوہ ڈاکہ کا بھی تھا!  
گھر نہ پڑے گا: میں نے غافقا کہا۔

جانے سے قبل میں نے اس کے لبوں کا بوسہ لیا اور... باہر نکلنے کے لئے ابھی مڑنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ وہ میرے پیچھے سے پست گئی جیسے وہ مجھے کسی باہر نہ جانے دیگی۔ میں نے اس کے ریشی بالوں کو سہلا کر کہا۔  
"جانو! سو رہو! پیاری! خانہ وادی کے کاموں نے میں کھکا دیا ہے اپنی گرفت اس نے کسی قدر ڈھیل کر دی۔ اور ابک طویل۔ ماسٹ لیکر کہا: نہیں پیارے! آج تو ہم بہت خوش رہے ہیں نا!...  
... اچھا! وہ اس آواز میں ویرہ کرنا

تجربہ نہیں۔ میں فوراً وہیں آ جاؤں گا پیاری؟  
سامنے کے دروازے سے میں باہر نکل گیا۔ اور اس کو یونہی کھلا ہوا چھوڑ دیا۔ اتنی کہیں ہیصیت ناک رات تھی! سیاہ اور بھاری بادل کی ٹکڑے آسمان کی سطح پر جا بجا پھیر رہے تھے۔ اور پتلے پتلے سفید بادل ستاروں کے درمیان منڈلا رہے تھے۔ بادلوں کے بجز پیدائش میں چاند ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی ہمسیم کشتی چھو کچھ دیر تو موجوں سے جنگ کرتی جاگ رہی تھی۔ تاریکی میں غائب ہو جاتی۔

رات نہایت خاموش تھی۔ اور ہر طرف ایک پراسرار سکوت تھا۔ تھا نہ تو غوغائوں کی کھر کھر ہٹ سناؤ دیتی تھی۔ اور نہ ہی غیم پیدا پرندوں کی صدا آتی تھی۔ اگرچہ تیز ہوا فضائی بند ہی پر بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ دھکیلتے پھیر رہی تھی۔ لیکن نیچے زمین پر اسکا نام و نشان تک نہ تھا۔ اسی لئے جنگل کے درخت کے پتے بھی ساکت تھے۔ اور کہیں سے کھر کھرا کی آواز نہیں پیدا ہو رہی تھی۔ مرغزاروں کی اس طرف مجھے گرجا کا بلند مینار نظر آ رہا تھا۔ جو در آسمان کے مقابل اپنے پر ہیبت جلال کیساتھ ایسا رہ تھا۔ اپنی تین ماہ کی خوشگوار زندگی میں نہ ملنے پر غور کرتا ہوں۔  
بیسست قدموں کے ساتھ وہاں ٹھہرتا رہا۔

گر جہاں کی جانب مجھے من و معنی کی آواز سناؤ دی۔ گھڑیاں لگنا۔ بجا

سنگرزہ تک موجود تھا۔ جی جی زبانتی باکیا کوئی دن دیوانہ محمول کو اٹھانے لگا تھا۔ کیا کسی نے میرے ساتھ بیٹگیں مٹا کی تھیں؟ ..... بہر حال میں نے اسکی اہلیت دریافت کر لی تھی۔ کانیسہ کیا اور اس ارادہ کے ساتھ ہی اپنی جیب سے کاغذ کا ایک بڑا سا ٹکڑا نکال کر اسے دیا۔ سلائی سے روش کر کے مشعل بنایا۔ اور اوپر کھینچ اٹھایا، اسکی زرد روشنی نے تاریک محرابوں اور خالی پتھروں کو دفعتاً منور کر دیا۔ رہ مجھے غائب تھے! ..... اور میں ..... اسوقت ..... اس خوفناک ..... گر جا کے اندر ..... تنہا ..... کھڑا تھا!!

اب بھر پر شدید خوف طاری ہونے لگا: خوف ..... ناقابل بیان ..... قابل یقین ..... اور لا محدود! ..... میں سمجھ گیا کہ غریب بچہ پر کوئی بہت بڑی آفت نازل ہو جائے گی۔ بس جنون، بے رحمتی میں میں نے مشعل ہاتھ سے گرا دی، اور انتہائی خوف و تشویش کی حالت میں تیزی سے معبد کے اندر سے نکل کر بھاگا۔ اسوقت میں اپنے لبوں کو نذندہ سے کاٹ رہا تھا اور قریب تھا کہ شدت خوف میری چھین نکل جائیں۔ آفت! اسوقت میں دیوانہ ہو گیا۔ غصہ گرجا کی جہاز دیواری سے ..... چھلانگ مار کر میں باہر کود پڑا اور کھیتوں سے گزرتا ہوا سیدھا اپنے مکان کی جانب روانہ ہو گیا۔ ابھی میں نے نفع راستہ ہی طے کیا تھا کہ کوئی شخص مجھے اپنی طرف جڑتا ہوا دکھائی دیا۔ آنے والی آفت کے خیال سے میں اس وقت تک اس راہ پر ہاتھ نہ دھرتا تھا۔ اور مزاحمت بے جا کی تاب نہ لا کر غصہ سے چرخ اٹھا، تھپ تھپ جاڑ میرے راستہ سے؟

لیکن اس شخص نے اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ مجھے پکڑ لیا۔ اور پھر جو میں نے بغور دیکھا تو اس نوجوان ڈاکٹر پر نظر پڑی جو نہ صرف میرا ہمایہ تھا، بلکہ دوست بھی! ..... چھوڑو! جانے دو مجھے! معبد سے مر مر میں مجھے چل پڑے ہیں!! میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں! ڈاکٹر نے زور سے ایک قہقہہ لگایا۔ اے کل مجھے تم کو دراپنا پڑی ..... سگام اور تباہی کی کثرت نے تمہارا آواز دن دماغی مترزل

سے ہم نے دروازے کھلے چھوڑ دیئے تھے۔ جس سے خزاں کی غزیریں ہواؤں کو اندر داخل ہو کر عمارت کو بدنام کرنے کا موقع ملتا تھا، میں اندر داخل ہوا۔ یہ بات آپ کو درالعجب خیر معلوم ہوگی کہ معبد میں داخل ہونے کے بعد یکایک ایک خوف کے ساتھ مجھے مسہ ڈروس کی باتیں یاد آگئیں کیونکہ یہی سنیت، یو کی شہ اور ٹھیک وہی وقت تھا، جب اس کے خیال کے ساتھ مجھے اپنے بگڑ چوڑ کر جلتے باہر نکل جایا کرتے تھے۔ اب سنیں کہیں اسکا خیال آئے ہی میں نا معلوم خوف کے زہراثر جسم میں کیچی سی محسوس کرنے لگا۔ اور دل ہی دل میں گھر سے باہر نکل آئے پر زور دیکھتے لگا۔

خیر! تو اس کا خیال آتے ہی میں نے اپنے دل کو سنبھلا کر کہے، ان مرمرین مجسموں کے پاس جانے کا ارادہ کیا تاکہ نگاہوں میں پھیلی ہوئی فوٹو کی چشم خود تراش کر دیں مجھے یقین تھا کہ مجھے اپنی جگہ استادہ ہونے اور اس خیال سے مجھے خوشی ہوئی کہ اب حقیقت دریافت کر کے مسہ ڈروس کو اس کے پاس آئے پر کھینکا کہ اس کے خیالات بالکل غلط تھے اور ہر سنیت یو کی مشعل گیارہ بجے مجھے حسب دستور اپنی مقررہ جگہ پر استادہ تھے نیز تو جیب میں ہاتھ ڈالے میں آہستہ آہستہ ٹہکتا ہوا اس طرف روانہ ہوا۔ چاند کی وضعتی روشنی میں معبد کا مشرقی حصہ محمول سے ذرا زیادہ بڑا نظر آ رہا تھا۔ اور ان دو قبروں کی محرابیں بھی پہلے سے کسی قدر دراز دکھائی دے رہی تھیں، چاند نے بنیلا کے اوٹ سے نکل کر بھرپور من حقیقت واضح کر دی، میں بھکت ٹھہریا۔ سنہ یکا یک لبوں اچھلنے لگا اور ایسا محسوس ہوا جیسے شدت خوف سے میرا دم ٹھٹھ کر رہ جائے گا

وہ مجھے اپنی جگہ سے غائب تھے وہ چوڑے چوڑے سفید پتھر جن پر انکے بت نصب تھے، اسوقت چاند کی چمکی اور منوم روشنی میں جو مشرقی در کیستے گزر کر داخل ہو رہی تھی ..... خالی تھے ہوتے تھے۔

کیا وہ مجھے راستہ اپنی جگہ سے غائب تھے، یا میں اسوقت یوں ہو گیا تھا۔ اپنے دل کو مضبوط کر کے میں نے دن خالی اور وحید پتھروں کو اپنے ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر دیکھا۔ لیکن وہاں ایک معمولی

کر دیا ہے

”مخلوق جانے دو ڈاکٹر! میں نے ترش روئی سے کہا: میں خود... ویکہ رہا ہوں کیجئے گر جیسے غائب ہیں“

”اچھا! تو پھر میرے ساتھ چلو! میں ایک مریض کو دیکھنے مارا ہوں۔ مہر رہے گر جا کر ہم اسکی تصدیق بھی کر لیں گے۔“

”تم کو جہاں بھی جانا ہو جاؤ۔ میں نے ڈاکٹر کی ہوتی ہنس سے بچ کر کہہ دیا۔ میں اپنی ساری کفایت معلوم کرنے جا رہا ہوں۔“

”دیوانہ کہیں کا؟ ڈاکٹر نے کہا۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں موت تمہیں چھوڑ دوں گا؟ تاکہ تم تمام مہر پہل افواہ پھیلاتے رہو، کہ سینٹ، یوٹی، بیس نے ان مجسموں کو اپنی جگہ سے غائب دیکھا ہے۔۔۔۔۔ نہیں

دوست۔۔۔۔۔ میں ایسا کبھی نہیں کر سکتا؟

دست کی ہوا۔۔۔۔۔ انسانی آواز۔۔۔۔۔ اور ایک بلند قلاست تو انسان کی صحبت۔۔۔۔۔ ان چیزوں نے مل ملا کر میرے پریشان ہوش و حواس مجتمع کر دیئے۔

”اچھا! تو پھر چلو! میں نے کہا۔ گر جا پہنچ کر میں دکھا دوں گا کہ مجھے اپنی جگہ سے غائب ہیں یا نہیں؟

ڈاکٹر میرا بازو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا، ہم تھوڑی دیر کے بعد گر جا کے پاس پہنچ گئے۔ جہاں موت کی سی خاموشی مسلط تھی میں دل ہی دل میں خوش تھا، کہ ابھی میری بات کی تصدیق ہو جائے گی اور ڈاکٹر شرمسار ہو جائے گا۔ کیونکہ مجھے یقین کا مل تھا کہ مجھے اپنی جگہ سے غائب برہنہ ڈاکٹر نے اپنی برقی لیمپ روشنی کی۔۔۔۔۔ دیکھو! یہ مجھے بدستور اپنی جگہ پر موجود ہیں۔۔۔۔۔ میں نہ کہتا تھا کہ تمہارا دامنی تو ذہن متزلزل ہو گیا ہے؟

میں نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ واقعی سفید پتھروں پر وہ مجھے سب ساہتی دیتا وہ تھے۔ میں نے سی قدر اطمینان کا سانس لیا۔

”میں تمہارا بہت ممنون ہوں ڈاکٹر! میں نے شکریہ کے لہجے میں کہا۔ مہر میری آنکھوں کو اسوقت کسی نہ کسی طرح دھوکا دیا تھا۔ شاید یہ

دامنی کمزوری کثرت کار کا نتیجہ ہو؟

”مجھے معلوم ہے: ڈاکٹر نے ہنسر کہا: تمہیں اپنے دامع کی طرف

کافی توجہ صرف کرنی چاہئے۔ روزہ ممکن ہے آئندہ تمہیں صحت دھوکا کھا دیتے۔“

وہ سوقت خنبدہ سوکر دامن جانب کے مجھے کو بخور دیکھ رہا تھا۔ اس کی ہیئت کدائی سے بے تنہا شہادت مترشح تھی۔

”تو پھر! بخدا! یہاں کوئی نہ کوئی آیا ضرور ہے“ دیکھو انکے اٹھنے کی ہمت نہایت غائب ہے جیسے ذہن کہیں گر گئی ہو

اور واقعی ڈاکٹر نے درست کہا تھا۔ کیونکہ ایک روز قبل جب میں تھیں گے ساتھ بیٹاں پوچھ تھا، تو جیسے بائبل صحیح و سالم تھے۔

”شاید کن پڑت لے، اس کو یہاں سے ہٹانے کی کوشش کی ہے“

”نوجوان ڈاکٹر نے کہا۔“

”آپا چو۔ میں نے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ مہر پریشان پریشان ہو رہی ہوئی، تم بھی وہاں پکڑ میرے ساتھ دھوکا کا ایک بیگم نوش کر دو گے۔ پھر تو ہم زندہ کی جریاد کر لیں گے کہ غلط طور پر اپنی حماقت کو اس قسم کا خوف ہم پر بھی مسلط ہوا تھا۔“

”مجھے اپنے مریض کو جا کر دیکھنا تھا مگر اب کافی دیر ہو گئی۔۔۔۔۔ خیر! صبح سویرے دیکھ لوں گا۔ ڈاکٹر نے جواب دیا

راستہ میں ہم آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ جس کا بنیادی مرکز یہ تھا کہ سطح بسا اوقات ہمارے ہی آنکھیں میں دھوکا دیتی ہیں اور ہم ان چیزوں کو جن اور جوت پر محو کرنے لگتے ہیں

مگر سچ کر باغ کے پاس سے میں نے دیکھا کہ سامنے دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اور اسکی روشنی کی تیز شعاعیں باہر نکل رہی ہیں۔

”آہ! آ جاؤ! میں نے ڈاکٹر سے کہا اور وہ میرے ساتھ ملاقاتی کے

میں داخل ہوا۔ وہاں جا بجا موم بتیوں روشن تھیں۔ کوئی ادھر کوئی ادھر بعض اس جگہ بعض اس جگہ۔۔۔۔۔ کہیں کہیں چراغ اور شمعیں بھی

جل رہی تھیں۔ سو قات مجھے خیال آیا کہ شاید روزی نے نہائی کے خوف سے یہ روشنیاں جلا رکھی ہیں۔۔۔۔۔ بے چاری لڑکی۔۔۔۔۔ کیوں

میں فضول سے تنہا چھوڑ کر باہر گیا۔۔۔۔۔ بیشک میں سنگدل تھا مگر اس کی چاروں طرف میں ایک طائرانہ نگاہ والی لیکن رزوی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ سکی کسی خالی پڑی تھی اور اس کی کتاب تھرا رہی۔۔۔۔۔

حق میں دوسرے کمرے میں داخل ہوا اور دیکھا کہ وہ دیکھ کے پاس ایک  
میز کے مہارست وہ گری پڑی ہے۔ اُٹ سمجھو! معلوم ہوتا تھا،  
جیسے کسی نے اس کا تعاقب کیا ہے اور وہ خوف و حشت سے گر پڑی ہے  
..... ہائے میری پیاری روزی!!

اس کا نصف جسم تو میز پر تھا اور نصف دیکھ پر اس کا سر  
نیچے کی طرف جھکا ہوا تھا اور سنے و سنے خوبصورت بال پرستانی  
کے عالم میں تالین پر جکڑے پڑے تھے۔ اس کے لب عجیب خوف افزا  
ظہر پر دیکھ کی جانب اٹھے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں بند تھیں....  
.. ہمیشہ کے لئے بند! اب نافیامت وہ کوئی چیز بھی نہ دیکھ سکتی تھیں۔  
اُٹ سمجھو! وہ کونسی شے ہو گئی جس پر میری روزی نے مرنے سے قبل آخری  
مرتبہ بڑا ہوا ہو گیا۔

ڈاکٹر اسی جانب بڑھ رہی تھیں اس نے اسے دھکیل کر پرے  
بٹا دیا اور خود اس کے اپنے بازوؤں میں لے کر کہا: نہ

۔ روزی! پیاری روزی!!..... دیکھو! میں داپس آ گیا۔  
وہ میرے بازوؤں کی مضبوط گرفت میں تھی میں نے اسے لپٹا کر  
بوسنیا اور طرح طرح کے دلنشیں ناموں سے اسے پکارا۔ لیکن وہ  
ابدی نیند میں غرق تھی اور میری آوازیں اسے خواب غفلت سے  
بیدار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس کی سٹھیاں خوب مضبوطی و حکمت  
ہوئی تھیں اور ایک کے اندر وہ کسی خبر کو زور سے بھیجے ہوئے تھی جب  
مجھے اس کا ایک دم یقین ہو گیا کہ وہ ہمیشہ کے لئے مجھے داغ مفادقت لگتی  
تو میں نے ڈاکٹر کو اس کی انٹھیں کھولنے کی ہدایت کی۔

اور جب وہ میرے ارشاد کی تعمیل کر چکا تو میں نے کیا دیکھا....  
اُٹ سمجھو! اس کے اعادہ سے بھی بدن پر رشتہ سا طاری تھا  
ہے.....!..... وہی تھر کی سفید مرمیں  
انٹھیں شہادت جو گر جاو اے مجھے کے ہاتھ سے صحن  
غائب پانی تھی۔

جناب اثر چکوانی بی اے

## غزل

دل پہ طاری ہے شعورِ انبساط      زندگی ہے ایک احساسِ نشاط  
دل فسرہ آنکھ پر خمِ روحِ شوق      ماسوا اس کے ہے کیا میری بساط  
عشق سو زجاو داں کا نام ہے      صن ہے ذوقِ نظر کا انبساط  
ایں آں میں فرق مب معدوم      کیا عجب ہے دوستی کا اختلاط  
غفل ہے گم کردہ منزل لے شاعر  
عشقی محکم ہے عسناں گیر بساط

جناب سید احسان علی شاہ

(ابن ۱۷)

# میں ہوں اپنی شکست کی آواز

کالج کی پرکیت زندگی کا نقشہ میری نگاہوں کے سامنے رقص کر رہا ہے۔ ادب میں دیکھ رہی ہوں کہ ایک نوجوان اپنے مقتدا سب قسم کو ایک خوش رنگ سوٹ میں لبوس کئے اپنے دوستوں کے ہنگامے میں بیٹھا ہے۔ اسکی آنکھوں میں شراست کھیل رہی ہے اور اس کے ہونٹوں پر ایک بڑی ہی مٹھی مسکراہٹ! میں جان بوجھ کر اس کے قریب سے گزرتی ہوں لیکن اپنے رویہ سے بے اعتنائی کا اظہار کرتے ہوئے وہ اپنی پیاری پیاری آنکھوں سے میری طرف دیکھتا ہے اور پھر اپنے دوستوں سے مخاطب ہو جاتا ہے۔

لوگ رشتہ معلوم ہوتے ہیں، وہ مترنم آواز میں کہتا ہے۔  
 کماؤ! تم تو ہمیشہ سے پاگل ہی رہے، اس کے دوستوں میں سے ایک کہتا ہے۔ اسے بھی یہ تو مدت سے کالج میں حشر برپا کر رہی ہیں۔  
 اور بھی تنگ ہوا کیوں نہیں! وہی جنس کر جواب دیتا ہے۔  
 اگر چند روز اور سچ دیکھ کا ہی عالم رہا تو ہو جائے گا!  
 میں ان لوگوں کی بات سننی ان سنی کر کے آگے بڑھ جاتی ہوں لیکن کماؤ کو بار بار دیکھنے کی ایک عجیب سی خواہش میرے دل میں چھپیاں لینے لگتی ہے۔ میں پلٹ کر دیکھتا چاہتی ہوں لیکن نامعلوم کیوں ایسا نہیں کر سکتی پھر دل ہی دل میں کہتی ہوں:

”اسے دیکھ میری پیزار! مجھے کیا پڑی ہے جو اسکی طرف دیکھوں لیکن دل اس خیال کا ساتھ نہیں دیتا۔ آنکھیں اسکے مسکراتے ہوئے چہرے کی بلائیں لے لینے کو تیار ہو رہی ہیں دماغ کہتا ہے اس میں کوئی ایسے فعل نہیں ہے جس میں اسے بار بار دیکھوں میں تو نہیں دیکھتی!“

اور ساتھ ہی بے اختیار ہی کے عالم میں پلٹ کر اسے دیکھ لیتی ہوں پھر خود ہی دوسری طرف دیکھنے لگتی ہوں اسکی نگاہیں مسکراہٹ تعاقب کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور میں خود بخود خفیف سی ہرجاتی

پوچھ پیتا!

مجھ بھانگوں جلی کی زبان سے یہ القاب سنکر آپ ناراض نہ ہوں آپ مجھے جینی بنا کر اپنے گھر لائے تھے۔ آگے یہ میری تقدیر تھی کہ آپ ہی نے مجھے دھکے دیکر اس گھر سے باہر نکال دیا۔ مجھے اسکا کوئی ٹھکانہ نہیں جب تقدیر ہی انسان کو میں ڈالنے پر تیار ہے تو تدبیر کیا کر سکتی ہے؟ اور پھر ایک پھل سارا جل بھی تو گندہ کر دیتی ہے۔ آپ نے گندی مچھلی کو لکال کر سارے تالاب کو اپو تر ہونے سے بچا لیا۔ آپ نے بڑا اچھا کیا۔ بڑا ہی اچھا!

لیکن میں گندی ہی سی، بی سی سی اور باش ہی سی جو کچھ بھی ہوں آخر ہوں تو وہی جسے اپنے اپنے بیٹے کی استری بنایا تھا اور بڑے چافے پہورانی کہا تھا۔ اب اگر میں آپ کی نظروں میں اس خطاب کے قابل نہیں رہی تو نہ ہی میں دنیا سے منہ کالا کرتی ہوں، آخر اپنے ساتھ آپ کی اور آپ کے خاندان کی عزت کو کیوں غرق کروں۔ چند منٹ کے بعد یہ محسوس صورت ہمیشہ کے لئے بد پوش ہو جائے گی اور آپ کی حرف کوئی انگلی بھی نہ اٹھائے گا۔

مرنے سے پہلے آپ سے ایک بھیک مانگتی ہوں، مجھ کو جائز دیکھیں کہ میں آپ سے ایک راہ کہہ دوں۔ یہ میری سادی زندگی کا حال ہے میں جانتی ہوں کہ آپ بھی اسے اپنا راز سمجھ سکیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسے اپنے سینے کی اتھار گہرائیوں میں چھپا سکیں گے اس لئے آپ ہی سے کہتی ہوں!

”سے پڑھ کر شاید آپ مجھے منہ بھٹ اور بے شرم لڑکی سمجھیں۔“  
 نہیں میں جانتی ہوں بزرگوں سے ایسے راز نہیں کہے جاتے۔ لیکن میں پھر بھی سب کچھ لکھوں گی، میں اپنی زندگی کے ان حسین ترین لمحات کو دستِ راکھ تلے سے کرید کر رہو گی، خواہ آپ کچھ ہی کہیں:

ہوں دل کہتا ہے۔

”ایک دفعہ دیکھ لوں پھر نہیں دیکھوں گی“

لیکن خود ہی جواب دیتا ہے۔

”آخر وہ کوئی چیز یا کھربے جو میں اسے بار بار دیکھوں“

اس پر وہ بخود بخود ہنسنے لگتی ہوں۔ اسے پھر لیٹ کر دیکھتی ہوں دل اور دماغ کی عظیم کشمکش ایک جہادی بوجھ کی طرح میری روح پر مسلط ہو جاتی ہے اور میں تیز تیز قدموں سے چل کر کلاس روم میں چلی جاتی ہوں کیسی پر لطف غمی یہ کشمکش، کاش! ماضی ایک وفد ان لمحات کو پھر اگل دے!

اس کے بعد آہستہ آہستہ زندگی ایک نشہ خیز موسیقی میں بدلتی گئی جیسے جیسے لمحات کے پرے اٹھتے گئے ویسے ویسے بھولنے والی کی بھٹی مٹتی نہیں کا احساں شدید ہوتا گیا، ایک ایسی ٹیکہ احساس جسے میں زندگی کے بدلے بھی نہیں دے سکتی!

میرا کار سائیکل پر سوار تھا، میں تانگے میں بٹنی، وہ کبھی تانگے کے آگے نکل جاتا، اور کبھی تعاقب کرنے لگتا، میں اسے کٹکھیروں سے دیکھتی لیکن جب اسکی اچھتی ہوئی نگاہیں میرے چہرے پر پڑتیں میں شرم سے کانوں تک سرخ ہو جاتی، اس وقت مجھے وہ بڑا ہی پیارا معلوم ہو رہا تھا، کاش میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتی، میں گھبراہٹ مچاتی، اور وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے پر نام کر کے چلا گیا۔ میں جانتی تھی کہ اس نے مجھے پر نام کیا ہے لیکن میں نے اس پر غصہ نہ ہونے دیا میں چاہتی تھی کہ ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے جھک جاؤں لیکن نام نہاد انسانیت بھی تو ایک بڑی قوت ہے۔ اس کی کشادہ پشت پر کوٹ کی سلٹیں کیسی کھلی معلوم ہو رہی تھیں!

چلا گیا، اور میں سارے دن اسکی یاد میں محو رہی کتابوں کا مطالعہ تو بجاے خود ہا کتاب کی طرف اٹھی اٹھا کر بھی دیکھنا مشکل معلوم ہوتا تھا، دل یہی چاہتا تھا کہ اس کی بھونی صورت کو آنکھوں کے سامنے بٹھاؤں، اور اس سے باتیں کئے جاؤں کبھی چاہتی کہ اس کے گھر چلی جاؤں کبھی اعادہ کرتی کہ کل۔۔۔ تب بھی وہ کالج میں ہے۔ اسے

پر نام کروں، اسکا مزاج پوچھوں، اور پھر کہہ دوں کہ کمار کچھ تم سے محبت ہے لیکن ساتھ ہی یہ خیال آتا کہ اس حرکت سے کبیں وہ مجھے لعاش لڑکی ہی نہ سمجھ لے۔

دوسرے دن کالج جاتے وقت میں نے دیکھا، کمار ہمارے مکان سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑا تھا، آج اس کے سر پر انگریزی ٹوپی تھی، سیاہ رنگ کی، اسکا سر بڑا عقیدہ رنگ، اس ٹوپی کے سامنے میں کیسا بھلا معلوم ہوتا تھا، جی چاہتا تھا کہ اسکی پوجا کرنے لگوں، لیکن نہ معلوم کیوں میں اس سے آنکھ ٹک نہ پاسکی۔

بہت سے دن گزر گئے، کمار مجھے روز ملتا، اب مجھ میں اس سے کچھ ملانے کی جرأت پیدا ہو گئی تھی، ”مجھے مسکر کر دیکھتا، کس قدر دلفریب تھی، اسکی مسکراہٹ، کاش یہ میرے لئے وقف ہو جاتی، لیکن...“

... قسمت قسمت!

اب میں کبھی کبھی اسکی طرف دیکھنے لگتی لیکن خود ہی شرمناک ہو کر دوسری طرف منہ پھیر لیتی، میں اس کے سامنے مسکرانے سے قتی تھی، تعلقات بڑھتے رہے، اور میں اپنے کمار کے نزدیک تر ہوتی گئی، اب میں اس کے ساتھ ایک اور بات بھی کر لیتی، مگر مجھے بھول پیش کرتا، تو وہ بھی لے لیتی، مگر مجھے محبت کے اس فونی انجام کی خبر ہوتی تو وہ بھول حفاظت سے اپنے پاس جمع رکھتی، شاید یہی سوکھی چٹیاں اب تکین قلبی سامان بن جاتیں۔ لیکن جب تقدیر اور انسانی قوتوں کی جنگ ہو تو فتح تقدیر کی ہی ہوتی ہے، انسان بے چارہ تو پس ہی سکتا ہے اور بس۔

آفتاب کے طلوع و غروب کے ساتھ ساتھ ہماری بے تکلفی بھی جاتی رہی اور آخر وہ دن آچھا جب میرے کمار نے مجھے اپنے ساتھ سرگرنے کو کہا اندھا کیا مانگے دو آنکھیں، میں تو اسدن کے لئے بیقرار تھی لیکن کمار کے اضطراب کا تماشا بھی کچھ کم تر لطف نہیں ہوتا تھا، میں نے کمار کو تڑپا اچھا، اور ٹامک ٹوسے کرتے لٹی، کمار نے میری خستہ کپڑے میرے سامنے ہاتھ جوڑے، پر اٹھا اور دنیا بھر کے تمام دیوتاؤں کے واسطے دین اور تب جا کر میں نے ہاں کہی۔

صلوات یہ نئی کہ چاندنی رات میں دریا پر چلیں۔

چاہتی تھی لیکن جینپ کر بولی کچھ بھی تو نہیں: اور میں نے مسکرا کر کمار کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر میری آنکھیں خود بخود جھبک گئیں۔ کمار میرے قریب کھسک آیا۔

”نہیں لا جو! اس نے کہا: آج تو نہیں بتانا ہی ہوگا!

”کہا بتانا ہوگا: میں نے بے ساختہ کر دیا۔

”بی جو کچھ کہنا چاہتی تھیں؟

”میں تو کچھ بھی نہیں.....

”غلط کامانے میری بات کاتے ہوئے کہا: اچھا تو پھر میں کہوں

اسکی بچہ میں میرے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ اور میں مارے شرم کے زمین

میں گڑی جاتی تھی۔

”جواب تو دو:

”ہاں! میں نے اسکی طرف دیکھنے کی ناکام کوشش کرتے

ہوئے کہا: کہو بھی کچھ

”میں..... اور کمار یکدم خاموش ہو گیا

”میں ایک کہانی سنائوں نہیں بڑی ہی پیاری:

”اچھا: بچے ایسا محسوس ہو کہ میرے دل پر سے ایک مبادی بوجھ اتار

گیا ہے۔ کمار کہنے لگا:

”ایک تنہا بھکاری..... معمولی بھکاری۔ وہ ایک دن چلتا چلتا

ایک بہت بڑے راجہ کے محل کے پاس جا پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے۔ کہ محل

کی ایک کھڑکی کھلی ہے۔ اور اسیں راجہ کی بیٹی بیٹھی ہے۔ راجہ کی بیٹی میں

سندھ تھی۔ میں سندھ تھی کہ یہ چاند بھی اس کے سامنے پھیکا پڑ جائے۔ تو غیر

اس بھکاری نے اسے دیکھا۔ اور بہت دیر تک اسکی طرف دیکھتا رہا۔

راجہ کی بیٹی بھی اسکی طرف دیکھتی رہی۔ ایک دن ایسا ہوا کہ..... کہ

بھکاری نے اپنی جھول میں سے ایک پھول نکالا۔ اور راجہ کی بیٹی کو دیا۔

راجہ کی بیٹی نے اترا آئی۔ اور بولی: بھکاری میں تم سے پریم کرتی ہوں.....

بھکاری نے کہا: ”میرے سن سندھ کی دیوی میں تیری پوجا کرتا ہوں.....“

..... راجہ کی بیٹی بولی: ”میرے بھکاری مجھ سے..... شادی کر

لے اور.....“

”باہل جھوٹ! باہل غلط! میں نے زور سے تالی بجا کر کہا: یہ ہاتھ

میں نے شام کے وقت اپنی بہترین سادھی پہنی۔ ماما کو کہہ دیا کہ

میں سینما جا رہی ہوں۔ دیر سے لوگوں کی اور شام کے دھندلکے میں گئیں

کاروان کی طرف جوں۔ میں کمار سے ملنے کا وعدہ تھا۔

کمار موٹر میں بیٹھا بڑی بے تابی سے میرا انتظار کر رہا تھا مجھے دیکھتے

نہی کچھ پر برس ہی تو پڑا۔ اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اور پچھے سے موٹر میں بچے

گئی۔ موٹر پر اسے باتیں کرنے لگی۔

دم کے دم میں ہم ہدیہ کے کنارے پہنچے۔ راوی کی روایتی نرم خیزی

ہی مستانہ انھیلیوں سے شعور و مان کی دنیا کو جگاتی چاند کی سیس شعلوں

آفت کے اس پارے جا رہی تھی۔ چادروں طرف ہوا کا عالم تھا لیکن اس

خاموشی میں بھی ایک دغریب مس تھا۔ سر فلک و رختوں کے جھنڈ جو

نبہالی میں شاید مجھے لرزہ برآمد کر دیتے۔ سرور و کیت کے ہراتے ہوئے

نزدوس معلوم ہو رہے تھے۔ اور ان سب سے بڑھ کر جانوں۔ دنیائے

ظہم کا حسین راجہ..... روشنی جس ستاروں کے جھرمٹ میں بیٹھا

محوت کے گہوارے میں آرام کی فیض سونے والی دنیا کو دیکھ دیکھ کر

سکرا رہا تھا۔

ہم دونوں ہنستے ہوئے موٹر پر سے اترے۔ آج میرا دل غلط

معمول سرور تھا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کمار نشاط و کیت کی اس

دہشت کن جنت پر چھوڑی کرنے والا دیوتا ہے اور مجھے اپنی سرمدی سرستوں

میں جذب کرنے کے لئے اپنی ملکیت میں سے آیا ہے۔ اسی اثنا میں وہ

دربار کے کنارے دیت پر مڑ گیا۔

”کیسا پیارا منظر ہے! وہ پوہ

”ہاں! میں نے کہا: لیکن کمار..... میں کچھ کہنا چاہتی تھی

شاید اپنے کئی حسیات کو اخلاص کا جامہ پہنائی۔ لیکن میں خاموش چو گئی

معلوم نہیں کیوں!

”کہو لا جو! کمار نے اپنی جذبات سے بھری جوں مترنم آواز میں

کہا: ہاں تو لیکن.....“

”کچھ نہیں! میں بولی

”کچھ تو ہے!

”تمہاری..... میں یکدم جھبک گئی۔ میں کمار کی سونگہ کھانا



مجھے ایسا محسوس ہوا، گویا کمار کے ہونٹوں نے میری روح کا خیز  
ترین راز چرایا ہے۔

میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں، اس کی کٹھن پیشانی  
کی سن موہنی سلوٹیں، اسکے تمنا تھے ہونے و خسار، اس کے جذبات  
سے کانپتے ہوئے ہونٹ خاموشی کی زبان میں گھرے تھے۔

اے کاش کہ تو اور میں — اے کاش کہ میں ابد تو  
اک بھول سا بچہ بن جاؤں — تجھ سے نہیں کھو جائیں  
اور میں بے اختیار سکرا دوں۔ لیکن اس کے فوراً بعد مجھے اپنے ہنستا ہوا  
ہونے کا تلخ احساس ہوا

”ہم ہندوستان میں ہیں، میں نے غمگین آواز میں کہا، اور جب  
تک سماج اپنے قوانین کو پورا نہ کرے گی، ہم دونوں ایک جگہ نہ  
ہو سکیں گے۔“

”سماج؟ کمار نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا، سماج دودھوں کے دھنیا  
حائل نہیں ہو سکتی؟“  
”لیکن کمار۔۔۔۔۔“

”لیکن دیکھیں کچھ نہیں لاجو؟ کمار نے پرجوش انداز میں کہا، ہماری  
دوہیں ایک دوسرے میں جذب ہو جانے کے لئے یقیناً درج میں  
زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا، ہماری شادی آج ہی ہوگی۔“

”تم ذرا صبر کرو، میں نے اسے سہانے کی کوشش کی، آسمان کو  
بعد گھر جاؤں گی، تو مانا کو کہہ سکتا راضی کروں گی، بڑا خطہ تو ذرا صبر  
بات کا ہوتا ہے، ہم دونوں کھتری ہیں۔“

”اوہوں! کمار نے طعنا نہ کہا، اب میں زیادہ دیر تک جہ نہیں  
رہ سکتا، میں تو آج ہی شادی کر رہا تھا۔“

”اور مانا پتا کی اجازت کے بغیر یہ سب کس طرح ہو جائیگا؟“  
”دو دوہوں کے ٹاپ کے لئے ظاہری دھرم و رواج کی ضرورت  
نہیں ہو اگر، ہم دونوں ملی کر بتا دیں گے کہ سماج کے اہل نہیں قانون  
محبت کے سامنے موم کی ناک بن جاتے ہیں۔“

”لیکن مانا پتا کا حکم کبھی تو پھر بڑی طاقت ہے؟“  
”مانا پتا کیا جانیں پریم کی ریت، میں دس بجے آؤنگا تیار رہنا۔“

کے لئے کمار، اگر محبت ہی ہونا تھا تو ایک حد تک بولا ہوتا بھلا ہوتا  
ایک سو سے اس طرح کی باتیں کہہ سکتی ہے؟

”تم سنو تو کمار نے جھنجھٹے ہونے کہا، بات یہ ہے کہ راجہ  
کی بیٹی کو اس سے محبت تھی؟“

”خواہ کچھ بھی ہو عورت ایسی باتیں نہیں کر سکتی؟“  
”اچھا لاجو! کمار نے یہ سن کر آنکھیں ڈال کر کہا، عورت

یہی باتیں کبھی نہیں کر سکتی؟“  
”عورت خواہ کسی کی محبت میں دیوانی کیوں نہ ہو رہی ہو، ایسی  
باتیں کبھی نہیں کرے گی؟“

”تو پھر کس طرح اپنی محبت کا اظہار کرے گی؟“  
”میں اس سوال کی تہ میں کام کرنے والے جذبے کو بھانپ گئی

سیرا دل چاہتا تھا کہ اس موقع کو ہاتھ سے جانے دوں، اور میرے دل  
پر جو گزرتی ہے، کمار کو بہ سناؤں، لیکن میں نہیں سمجھ سکتی کہ میں کیوں مفعول  
سی ہو گئی اور سر جھکا کر بولی نہ

”میں کیا جانوں؟“  
”لاجو! کمار نے معنی اور یہی انداز میں کہا، اس کے ہاں میری گردن

میں محائل ہو گئے میری آنکھیں اور جھک گئیں، اور میری انگلیاں ریت  
پر لکیریں بنانے لگیں۔ آہ! محبت کا اظہار کیا بھی کتنا کٹھن کام ہے۔

”لاجو! کمار نے پھر اسی کانپتی ہوئی آواز میں کہا، تجھے۔۔۔۔۔ میں  
..... لاجو! تم مجھے بڑی اچھا لگتی ہو۔“

مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا، کہ محبت کے فرشتے کسی دوسری  
دنیا سے مجھے ابدی مسرت و لافانی کھراں کا مژدہ سنا رہے ہیں۔

کمار مجھے دھڑلایا، ابد بد وقت ابھی لافانی محبت کا اظہار کرنا  
رہتا، کتنے اچھے دن تھے اب کی راتیں، لیکن انکی یاد کتنی بھیاں تک  
کس قدر دغراش، گزری ہوئی مسرت کیوں مصیبت بن جاتی ہے۔ آخر  
کیوں؟

ایک دن کمار کو نہ جانے کیا سوچیں بولا۔ لاجو! آؤ ہم دونوں  
شادی کر لیں۔“

اور وہ چلا گیا۔

میں عجیب سی ادھیر بنیں بن چکی، جذبات پر دست وادم  
ثانی، بابے کا ہے، اور مانتا تھا کہ اجازت کے بغیر شادی چاہیے کا  
خیال میرے لئے عجیب تھا۔ لیکن اپنے کمار سے ہمیشہ کیسے مل  
بیٹھے کا خیال کچھ کم نشہ خیز نہ تھا۔ وہ میٹھی مسکراہٹ، وہ دل موہ بے  
دلی باتیں، اور وہ پیاری صورت صرف سماج کے چند سنگین اصولوں  
کی قربانی پر میری بوسنتی تھی، سودا سنا معلوم ہوتا تھا، میں تیار  
ہو گئی۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے میرا کنہیا ہاتھ میں پھولوں کے  
دو ہائے ہوئے آیا، اس نے ایک میرے گلے میں ڈال دیا، اور  
دوسرا میں نے اسکی گروں میں پہنا دیا، اس نے دونوں ہاتھوں میں  
گرو دے دی اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا،

”اب ہم دونوں کی شادی ہو گئی، اب ہم کبھی بھی جدا نہ ہونگے  
اور اس نے میرے ہونٹوں کو چوم لیا، لیکن میں کسی نا، علوم غریبے  
کو محسوس کر کے سہم گئی، سماج کی گڑبی زنجیروں میں محبہ اہوا دل بیکر  
آزادی کی دیوی کو دیکھ کر گھبرا گیا، اور میں پھر انہیں زنجیروں میں  
آڑ لینے کو لٹی۔

لیکن یہ گناہ ہے، میں نے سہی ہوئی آواز میں کہا: ہم دونوں  
سماج کی نظروں میں ذلیل ہو جائیں گے۔

اور لاہور! اس نے ہاتھ جھٹک کر کہا: سماج بھاڑیں جاتے  
کمانے اس دن تو مجھے پتی کہا تھا کہ یہ ہماری شادی کی پہلی  
رات ہے، اور اس کے بعد اسی نے کہا کہ یہ جیا ننگ گناہ تھا، میں  
ابھی تک نہیں سمجھ سکی، کہ ان دونوں میں سچی بات کونسی ہے، لیکن  
میرا دل کہتا تھا، وہ ہماری شادی کا پھیلاؤ تھا، اور میری زندگی  
کے خواہناک آغاز کا خوشنماک انجام۔

اسکے بعد کچھ ہوا، اس کے خیال سے میرے دو ننگے کھڑے  
ہو جاتے ہیں، لیکن تصویر کو مکمل کرنے کے لئے ان سب واقعات  
کا اعادہ ضروری ہے۔ اس نے کیجے پر تھر رکھ کر لکھتی ہوں:

کمار کا جوش محبت کم تو نہیں ہو، البتہ مجھے یہ احساس تو ضرور ہوتا  
تھا، کہ سب سے سچی آنکھیں میری نہیں رہیں، وہ آتا تو اور چند منٹ بیٹھ کر  
دھرا دھرنے کے بجائے کیف ہی باتیں کرتا اور چل دیتا۔

اب اس کا آنا جانا بھی کم ہونے لگا، میں اس بے رخی کا سبب  
پر غصی تو وہ کہتا۔

امتحانات کے دن قریب ہیں، فرصت نہیں ملتی، میں چسکی  
پر رہا۔

سمان ہوئے اور کمار امتحان دیکر مجھے لے بغیر چلا گیا، میں اس  
رات سے سخت پریشان ہوئی، وہ رہ کر سوچتی، کہ کمار مجھے بھول تو نہیں  
کہا، لیکن اور ابھی اس خیال کو فاسد خیال کی طرح دماغ سے نکالتی تھی  
اور کوشش کرتی، کہ مجھے اسکی محبت پر پورا اعتماد ہو جائے۔

چھٹیاں ہوئیں، اور مجھے اپنے گاؤں واپس آنا پڑا، جس طرح میں  
نے بد دن کاٹے ہیں، کچھ میں ہی جانتی ہوں، صبح بہار ہوتے ہی مجھے  
یعنی ہوتا کہ کمار کا خط آئے گا، لیکن ساتھ ہی خیال آتا، کہ اسے ہمارے  
گاؤں کے نام تک کا تہ نہیں، اس خیال سے میری ساری امیدیں  
خاک میں مل جاتی ہیں، چہرہ میں یہ سوچتی، کہ محبت کبھی انسان کو غلام نہیں  
بٹھنے دیتی، وہ ضرور ایک نہ ایک دن مجھے ڈھونڈتا ڈھونڈتا اورھر  
آنکھیں، میں سارا سارا دن انہیں خوش فیسوں میں بٹھا گوش ہر آواز  
رہتی، لیکن کمار کی دلکش آواز، ایک دلخیزش یا اس بدل چکی تھی اور  
بس:

جوں توں کر کے دن گزرتا اور کالج پھر کھلا، میں پھر اسی فضا میں  
آگئی، جسکی ہوا کا ہر ذرہ میرے کمار کے نفرتی قہقروں سے معمور تھا  
لیکن یہاں آکر مجھے اپنے ذہل ہونے کی خبر سننا پڑی، کمار پاس ہو گیا  
تھا، میں نہیں جانتی تھی، کیوں اسکی کامیابی پر اتنی خوشی ہوئی، میں کچھ  
نہ سمجھتی تھی، مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا، کہ میں خود بڑے اعزاز سے پاس  
ہو گئی ہوں، اب مجھے پوری امید تھی، کہ کمار مجھ سے ملنے کے لئے یا کم  
از کم یار دوستوں کو دعوت کھلانے کے لئے ضرور آئے گا، لیکن دن  
ہینوں میں بدل گئے، اور کمار کے آنے کی امید ایک خوشگوار خواب  
کی طرح میرے ذہن کے حقیق گوشوں میں محفوظ رہی۔

دل چاہتا تھا کہ کمار کے قدموں پر جھک جاؤں لیکن کما سے نہیں کروانے کا خیال اس خواہش پر غالب آگیا۔ اور میں نے سانس روک لیا۔

کمار آہستہ آہستہ میرے قریب آیا چند لمحوں تک خاموشی سے میرے پاس کھڑا رہا اور میری پشت پر ہاتھ رکھ کر ولا۔

”میں نے کیا..... اس چادر میں گرمی فٹنی ہوگی؟“  
”اٹ کتنی دلی بھدی میں ڈوبے ہوئے تھے یہ الفاظ میں بے تاب ہو گئی اور جلدی سے گھونگٹ اٹھا کر بولی۔

”تبی دیو؟“  
کمار نے مجھے حیرت سے کھلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دیکھا۔ اور سمٹ کر ایک قدم مجھے ہٹ گیا۔ حیرت نے اُسے کس قدر سسند بنا دیا تھا۔

”دیکھا؟ میں نے سترت بھری ہوئی آواز میں کہا: ”میں نہیں۔۔۔۔۔۔“  
آپ کو..... آپ کو نہیں بھولی؟ اور ساتھ ہی میں ہلنگ ہسے اٹھ کر کمار کے قریب آکھڑی ہوئی۔

”تم؟ کمار کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔  
”ہاں ہاں تبی دیو؟ آپ کی لاجو؟ وہ ایک قدم اور مجھے چٹ گئے۔  
”اوہ نا راض ہو گئے؟“ میں نے سسکراتے ہوئے کہا: ”ہاں غلطی تو میری ہی ہے۔ پہلے مجھے اپنے دیوتا کے چرن لینے چاہئیں؟“

اور میں انکے قدموں پر جھک گئی، میں کتنی خوش تھی، میرے دل کی سب سے بڑی تمنا آج پوری ہوئے کو تھی، ابھی میرے ہاتھ انکے قدموں سے مس بھی نہ ہونے پائے تھے کہ انہوں نے اپنے پرچھے کھینچ لئے اور سمٹ کر ایک طرف ہو گئے۔ میں نے انکے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس پر غم و غصہ کے شدید جذبات ترسم تھے۔ میں خفیت سی ہو گئی تھا یہ میری اضطرابی حرکتیں میرے دیوتا پر ناخوشگوار اثر ڈال رہی تھیں لیکن میں اپنی خفت کو چھپانے کے لئے کھڑی ہو گئی، اور جھوٹی سسکتا سے بولی۔

”بڑے کٹھور ہو! پتھر کے دیوتاؤں سے بھی زیادہ کٹھور! بچا دن کو اپنا فرض بھی ادا نہیں کرنے دیتے۔“

میں دوسرے سال بھی فیمل ہو گئی اور تپاچی کے کپے پر کالی چھڑنا پڑا۔ مجھے ایسا غم س ہو گیا۔ مجھ سے میری زندگی بھینی جا رہی ہے میں نے تپاچی کو کہا کہ میں اس سال خود پاس ہو جاؤں گی۔ لیکن میری کون سننا تھا۔ مجھے وہیں گاؤں میں آنا پڑا۔ لیکن میسر نہیں کیا کہ بڑی کون چہا سننا تھا۔

میرے بیاہ کی تیاریاں دنے لگیں بڑے بڑے امیر گھروں کو رستے آئے۔ لیکن میں بیابان تھی، تپاچی کی غرض فوری میں دوسری شادی کس طرح کر لیتی۔ سہیلیوں کے ذریعہ یا خود مانا جی سے کہہ کر رشتہ لڑ لیتی۔ اسی طرح دو سال اور گزر گئے اور ابھی تک میری شادی نہیں ہوئی تھی شہر میں نوجوان لڑکیاں کھپ سکتی ہیں۔ لیکن گاؤں میں جوں لڑکیوں کا وہر تک ناگوار ہنا بڑا ہی معیوب سمجھا جاتا ہے یہی وجہ تھی کہ لڑکا اپنے اپن بھروسے میں تھیکر تپاچی کو خوب خوب سناتے تپاچی یہ سب کچھ سنتے تھے۔ لیکن میری دشمنی کے خیال سے مجھ سے کچھ نہ کہتے۔ ایک روز قسمت نے اور رنگ دکھایا۔ مہرے کی جھلک کھا مجھے ہمیشہ کے لئے آجوں اور آنسوؤں کے سپہ دکر دیا۔

ایک اور رشتہ آیا لڑکے کا نام کمار تھا اور لڑکے کی تصویر وہی تھی جو میں نے کئی دفعہ کمار کے کمرے میں دیکھی تھی لیکن یہ رشتہ تپاچی کو کچھ ایسا پسند نہ آیا۔ نہ لڑکے کے والدین کے پاس جائداد تھی، اور نہ ہی لڑکے کی تنخواہ ایک نا زلف مہر تھی ہوئی لڑکی کی ضروریات کی تحمل ہو سکتی تھی۔ لیکن میرا کمار تھا۔ میں نے مجھ سے غربت واری کی آڑ لی اور کسی نہ کسی طرح تپاچی پر ظاہر کر دیا کہ میں اسی سے شادی کروں گی۔

ہماری شادی ہو گئی، اب سہراج کے تمام قوانین پورے ہو گئے تھے اور گناہ کا خیال میرے دل سے نکل گیا تھا۔ میں سترت سے لبریز سر رخ چادر میں لپیٹ کر دوسری میں چلی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ کمار کو کتنی خوب آئے! انھوں کو بھی اور پوچھو گی کہ شادی کرنے کے بعد بیویوں کو چھڑ کر اس طرح بھاگ جایا کرتے ہیں۔

لیکن کمار کے پاؤں کی چاپ سننے ہی میرا غصہ یکدم اتر گیا میں نے سوچا کہ اگر کمار مجھے بھول گیا ہوتا تو یہ شادی ہی کیوں ہوتی؟

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے قریب ہی کہیں کبلی گری ہے جس سے میرا  
دماغ سن ہو کر رہ گیا ہے۔

دوسرے دن بھی میری یہی حالت تھی مجھے صرف اتنا یاد ہے  
کہ آپ نے مجھے بازو سے پکڑ کر تانگے پر بٹھادیا، مجھے ایسا محسوس ہوا

تھا کہ آپ کسی کنویں میں سے بول رہے ہیں  
جہاں کی چڑیل ہے تو میں جا کے مرنا شاید ہی تھے آپ کے  
الغلا

مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں کبھی "انگے برت اتری اور کیوں اتری  
الغلا جب میرے حواس درست ہوئے تو میں نے اپنے آپ کو بارغ  
میں پایا میرے احساسات تیز ہو رہے تھے بارغ کا ہر ذرہ مجھ پر انتہا  
کا پھیلاؤ دیتا معلوم ہوتا تھا، لیکن پھر نا معلوم کبھی کالے کے وہ رنگین  
لمحات میری آنکھوں تلے چھر گئے مجھت کے مقدس نبض کی خیال  
آگیا، میں جانتی ہوں کہ نامہ ادبی کی یاد مجھت کے لطیف جذبات  
کو کھل دیتی، ادب میں کمار سے نفرت کرتے لگو تھی یہ انتقاد بشری ہے  
لیکن میں اسدن کہنے زندہ نہیں رہنا چاہتی حسدن میں اپنے کمار سے  
نفرت کرنے لگوں۔

پوچھ پتا: آپ نے بڑے قہر سے میرے اس راز کو سنا  
ممنون ہوں ایک عرض کو اور مان لیجئے میں مر رہی ہوں جھوٹ  
نہیں کہو تھی میں نے آج تک اپنے آپ کو کمار کی امانت سمجھ رکھا  
ہے اور کسی غیر کی جو آنکھ کو اپنے قریب نہیں بٹھنے دیا، مجھ پر اتنی  
دیا کیجئے کہ میری لاش یا میرے پھولوں کو کسی غیر مرد کا ہاتھ نہ لگے  
دیجئے، نہیں تو میں جنم جنم کے لئے دستکار دی جاؤں گی میرے سوا  
مجھ بھاگوں جلی پراتی مہربانی تو ضرور کروں گے انہیں بھی کبھی مجھ  
سے نفرت تھی۔

اب رخصت ہوتی ہوں میرے بچہ پنی کو میری طرف سے  
کہہ دیجئے۔

"میرے دیوتا! انہیں آخری دفعہ پر نام:

بدلعیب

لاجونی

"تم مجھے چند منٹ کے لئے زندہ رہنے دو: کمار نے ماتھا پکڑتے  
ہوئے کہا۔ اور کسی تھکے ہوئے آدمی کی طرح مسہری کے قریب رکھنی  
کر سی پر گر پڑا۔

"کیا ہوا: یکدم میرے منہ سے نکلا اور میں گریا کر سی کی طرف  
کھنچ گئی۔

ہٹ جاؤ! الگ مجھ سے! کمار نے غصے اور نفرت سے بھری  
ہوئی آواز میں کہا: "ڈوڈا دین!"

یہ الفاظ نہ تھے، زہر میں مجھے ہوئے نخر تھے، جو میری روح میں اثر  
لگے، میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"پتی دیو! آپ . . . . .

"پتی دیو! کمار نے غصے سے کافی پتی ہوئی آواز میں کہا: "لا جوتی  
تہیں میرے سامنے آتے ہوئے شرم آنی جا ہے، تم وہ وقت بھول  
گئی ہو شاید جب ہم دونوں کے درمیان باختری کی خلیج حال تھی، اور  
تم نے . . . . . تمہنے اسے بیباک گناہ سے پاش دیا تھا، تم  
میری آوارہ عورت میری پتی بننے . . . . . میری پتی۔ اُن  
پر اتنا . . . . . مجھ کو وہ یکدم کر سی پر سے اچھل پڑا، مجھ میں  
تہیں ایک سنت کے لئے بھی اس گھر میں نہ رہنے دو لگا۔"

یہ الفاظ کبلی بکر میری ذہنی قوتوں پر گرے، مجھے ایسا محسوس  
ہوا کہ میرے ہونٹ کہہ رہے ہیں:

"بھیا نک گنہ . . . . . بھیا نک گناہ: میں اس سے  
زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔

کمار لپک کر کمرے سے باہر نکل گیا، دھولک کی آواز، اور  
عورتوں کے مسووقہ فونناک نشتروں کی طرح میری سماعت کو  
نکرا رہے تھے، چند لمحوں کے بعد خوشی اور مسرت کا یہ شور و حیرت  
و استہجاب کے ناقابل فہم غلطے میں ڈوب گیا، میرا دل ڈوبتا ہوا  
محسوس ہوا اور میں کر سی کا ہتھ پکڑ کر فرس پر چڑھ گئی۔

میں شاید ساری رات اسی طرح جھبی رہی میرے ذہن  
میں کوئی خیال نہ تھا، مجھے کسی علم یا کسی خوشی کا مطلق احساس نہ تھا،

جواب سید مقبول حسین  
احمد پوری

# گیان گیت

جب سے ہوئے ہم پریم پجاری

(۱)

نین بنے درشن کے بھکاری

لے صاحب اختیار

شیام ہیں درشن کے ادھکاری

شیام سے آس ہماری اب تو شیام سے آس ہماری!

بھول گئے سب جیون کا نم

(۲)

لے خودی

اپنے سُرپ میں مست ہوئے ہم

اپ ہی پریم ہیں آپ ہی پریم

ہم ہوئے اپنے پجاری اب تو ہم ہوئے اپنے پجاری!

اب نہیں جیون ہم پر بھاری

(۳)

اپ ہوئے اپنے ادھکاری

اپنی ہی آتما سے کی یاری

اپنی ہی آتما پیاری اب تو اپنی ہی آتما پیاری!

جناب شاکر علی صاحب

## دوستو کی

جس پر ہجو چڑھا یا گیا اور وہ وہی قطار میں کھڑے کر دیئے گئے منصف  
پہان پر چڑھا اور موت کا حکم پڑھ کر سنانے لگا۔ سزا اس کے فوراً  
ہی بعد دیکھانے والی تھی۔

فیصل میں سزا ترمیم مرتبہ یہ محسوس لفظ دہرایا گیا۔ سزائے موت  
سزائے موت!!

یہ لفظ میرے ذہن میں اس طرح بیٹھ گیا تھا کہ اس کے سالہا  
سال بعد تک میں سوتے سوتے چو تک اٹھتا۔ یہ محسوس ہوتا۔ جیسے  
اسے کوئی پھر دہرا رہا ہے

منصف نے فیصل سنانے کے بعد کاغذ کوٹے کر کے جیب میں رکھا  
اور پھان سے اتر کر چلا گیا۔ اسی دشت سورج بھی بادلوں سے نکل آیا  
میں نے سوچا نہیں یہ ناممکن ہے وہ ہمیں نہیں ماریں گے یہی چپکے  
سے میں نے اپنے ساتھی سے بھی کہا لیکن اس کے جواب میں اس  
نے مرثیہ باتوں کی طرف اشارہ کر دیا۔ پوچھان کے قریب ایک  
تھا۔ میں دھمکے ہوئے رکھے تھے۔ میری تمام امید ختم ہو گئی اور موت  
کے آنے والے ہولناک لمحہ کا نظارہ کرنے لگا لیکن میں نے ذرا بھی بیٹھا  
کا نظارہ نہ ہونے دیا اور اپنے ساتھی سے اور حراہر کی باتیں کرنے لگا  
اس نے مجھے بعد میں بتایا کہ میرا چہرہ بھی کچھ زیادہ چمکانہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد پادری اوپر آیا اور ہم سے پوچھا کہ کوئی مجرم اپنے  
گناہوں کا اعتراف کرنا چاہتا ہے۔ ہم میں سے صرف ایک نے اس  
دعوت کو قبول کیا لیکن جب اس نے صلیب پیش کی تو سب نے  
اسکو پس دیا

پتھر دسکی اور دو ادا جرم میں سے زیادہ خطرناک سمجھے جاتے تھے  
بلیوں سے پہلے ہی ت بندے ہوئے تھے امدان کے چہروں پر ایک

منصف میں وہ روس کے ایک خیراتی شفا خانہ میں پیدا ہوا۔  
منصف میں اس نے اپنا بیانا دل غریب لوگ لکھا  
اپریل منصف میں ایک اشتراکی انجمن میں حصہ لینے کے جرم  
میں اپنے کٹالیس ساتھیوں کے ساتھ پکڑا گیا۔ سزا موت  
فرمان پائی۔

دوسرے منصف میں  
اگرچہ اس کے میں ساتھیوں کو سزا کا حکم سنایا گیا۔ اس کے بعد  
ہر ایک کو چھوٹے کیلئے صلیب دی گئی۔ پھان کی آنکھیں بند کیے  
برابر برابر بلیوں سے باندھ دیا گیا۔ جب سپاہیوں کو بندہ قتل بھرنے  
کا حکم دیا جاتا تھا تو ایک افسر کھڑا دوڑتا ہوا آیا۔ سزائے موت  
تو تے تبدیل ہو گئی۔

دوستو کی خود لکھتا ہے کہ

۲۳ ذوری کو مجھے جیل کی کونھری میں فیصل سنایا گیا۔ سزائے  
موت ایک بے یار نہیں بتایا گیا۔ منصف سے آدھ گھنٹہ گزر چکا کہ جیلر آیا  
اور مجھے تیار ہونے کا حکم دیا۔ بڑی نگہداشت سے مجھے صحن میں لایا  
گیا۔ جہاں میرے ساتھیوں میں سے ۱۹ موجود تھے۔ سوقت صبح کے  
کوئی سات بجے ہو گئے۔ ہم گاڑیوں میں بٹھایا گیا۔ ایک میں چار  
چار ہر ایک گاڑی کے ساتھ ایک ایک سپاہی بھی تھا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟ ہم میں سے کسی نے دریافت کیا۔  
”یہ میں نہیں بتا سکتا“ سپاہی نے کہا۔

گاڑی کی کھڑکیاں ہر باری کی وجہ سے دھندلی ہو رہی تھیں  
ان لئے باہر بھی کچھ دکھائی نہ دیتا تھا آخر کار ہم  
Soyam پر پہنچ گئے۔ بیچ گھیر میں ایک اونچا سا چٹان تھا۔

قسم کا قیدوار رہا ہوا تھا۔ سپاہی بدوق چھینٹا نے منتظر کو دے تھے۔  
ناظر کے لئے:

میں نے سوچا کہ میری زندگی کے اب صرف پانچ منٹ باقی ہیں۔ یہ کھن پانچ منٹ!

میں گرجا کی پہلی بری کو تک رہا تھا جو سورج کی کرن میں چمک رہی تھی میرے ذہن میں ایک دم یہ خیال پیدا ہو گیا کہ میں بھی وہیں سے آ رہی ہوں جہاں میں خود پانچ منٹ میں پانچ جاؤں گا۔

مجھے میں ایک دم بھی سی ہوئی، لیکن میں دیکھ نہیں سکتا تھا کہ کیا وہ ہے میری آنکھیں بہت کمزور تھیں۔ میں نے خیال کیا کہ کوئی غیر ملکی

بات نہ رہے۔ آخر میں نے ایک افسر کو دیکھا جو سفید رد مال جاتا گھوڑے کو سرسٹ دوڑاتا ہوا آ رہا تھا۔ اسے بادشاہ نے ہمارے

بغلی کے لئے بھیجا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ سرنٹ موت کا حکم ہمیں صرف دھمکانے کیلئے دیا گیا تھا تاکہ ہمیں اس کے لئے سنبھالنے

لیکن یہ سبق ہم میں سے بعض کے لئے بہت جلد ثابت ہوا۔ اگرچہ یہ سبق کو جب پلی سے کھوا گیا تو اسکا دماغ صحیح نہ تھا۔ اس

کے علاوہ ہر ست ہر ایک پر اس کا کچھ نہ کچھ اثر آخر تک باقی رہا جہاں پر چڑھانے سے پیشتر ہمارے تمام کپڑے اتار لئے گئے تھے

اور ہمیں میں منٹ سے زیادہ دیر تک ۲۲ درجے کی سردی میں صرف ایک ہلکی فیس میں کھڑا رکھا گیا۔ جب ہم جیل خانے واپس آئے تو ہم میں سے کئی کے کان اور انگلیاں سو جی ہوئی تھیں

ایک کے پھیپھڑے پر دم چڑھ آیا تھا جو دم پر جا کر ختم ہوا لیکن میں بچے یا دھنیں کہ مجھے سردی کا ذرا سا بھی احساس ہوا ہوا۔

ہماری سزائے موت سانبیریا میں آٹھ سال کی قید اور ایک عرصہ دوا کی جلا وطنی میں تبدیل ہو گئی۔

۱۹۳۹-۴۰ء چار سال سانبیریا کے جیل خانے میں بیٹے جیو کا تجربوں کی غفلت میں مزید جارحیت سپاہی کے۔

۱۹۴۰ء جرم اور سزا کی اشیاء میں گزرے اور اسکی کامیابی میں: —

۱۹۴۱ء اب باوجود ایک کامیاب اور مشہور ناول میں اسکی مالی حالت بہت خراب رہی اس زمانہ میں وہ بھوک اور قرضداروں کا ہمیشہ شکار رہا۔ کئی مرتبہ قرضداروں سے پھپھا

مچرانے کی خاطر روس کو الوداع کہنا پڑا۔ اور ایک دفعہ صرف دو سکوں کے لئے اپنے کوٹ اوتھیں کو رہن رکھنے پر مجبور ہوا۔

۱۹۴۱ء میں اس نے انتقال پایا اور اس کے چالیس ہزار ہم وطنوں نے اس کو اس کی آخری آرام گاہ نکلتے ہی عزت کے ساتھ پہنچایا۔

دوستوں کی مرگیا لیکن اس کے بولے ہوئے بولی اور لکھے ہوئے الفاظ کی بازگشت اب بھی سنائی دیتی ہے۔

(مختار)

## ترکی جمہوریہ

مولانا جناب سید ضمیر ہاشمی

ترکی جمہوریہ میں ترکی کی مختلف ترقیات کا حال نہایت دلپذیر طریق بیان کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ ترکی انقلاب پہلے کیا تھا اور انقلاب کے بعد کیا کیا انقلاب پیدا ہوا اور اب کیا ہو رہا ہے ترکی کے مستقبل کا ناظر اور مستند حالات معلوم کرنے کیلئے یہ بہترین کتاب ہے۔ طبعیت کتابت علی قیامت علیہ

## لینن

آج دنیا کا بڑا ہیو لینن کی پمیرانہ خصوصیات کا قائل ہے یقیناً

یہ مردوں کا رہنما بیسویں صدی میں سب سے بڑا انسان تھا۔ جس نے دیکھتے ہی دیکھتے روس کی کاپیٹل دی۔ لینن کے حالات و کوائف

پر متعدد کتابیں موجود ہیں یہ اردو ترجمہ میں پہلی کتاب ہے جس میں تمام حالات قلمبند ہیں۔ کتابت و طبعیت علی قیامت علیہ

لے کا پتہ۔ مکتبہ اردو لاہور

# سرزین تصور

مرے ندیم کہاں آگیا ہے میرا خیال؟      بلند و پست پہ چھایا ہوا ہے کس کا جمال؟  
یہ کس کے نور سے پر نور ہے دماغ مرا؟  
مرے ندیم یہ سینے میں لہڑا ہے کیوں؟      یہ فتنے فتنے میں پوشیدہ آفتاب ہے کیوں؟  
یہ کس کے عکس سے پھر جل اٹھا چراغ مرا؟  
مرے ندیم اتنی پرہیز بادلوں کے نشاں      کہ کہکشاں پر تخیل کے کارواں ہیں وہاں  
جلو میں جن کے فرشتے ہیں گیت گاتے ہوئے  
یہ عرش ہے کہ ہری رفعتوں کا پانداز؟      یہ چاند ہے کہ صبحی کا اک شکستہ سا؟  
یہ تارے ہیں کہ مرے شعر جگمگاتے ہوتے  
مجھے یہ کون اتنی سے صدائیں دیتا ہے؟      ہوا کے بھیس میں میری بلائیں لیتا ہے؟  
یہ کس نے تمام کیا ہے مرے گریباں کو  
یہ کون چاند پڑا چاند کے سفینے سے      یہ کس نے بھیج دیا مجھ کو اپنے سینے سے  
یہ کس نے پونچھ دیا میری چشم گریاں کو  
ابھی تو سر تھا ہر نقش پائے جاناں پر      عتاب کھلتا پھرتا تھا دوسرے تاباں پر  
حرم ناز میں مجھ کو ابھی تو بار نہ تھا  
مرے ندیم اچانک یہ انقلاب ہوا،      وہ ذرہ خاک کا ہمدوش آفتاب ہوا  
جسے خود اپنی حقیقت پہ اعتبار نہ تھا

یہ سرزین تصور ہے اے دل غمگیں!  
جھکی ہوئی ہے یہیں عقل آگہی کی جبیں





میں گزارنا چاہتا تھا۔ اور جس کے متعلق میں محسوس کرتا تھا کہ میں بھگتی تھا وہ اودھ میں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ وہ شرارتیں ایجاد کرنے میں بلا کا تیز انسان تھا۔ اس کے دماغ کی نبض شاید کسی وقت بھی سست نہیں ہوتی تھی۔ اسے برقیات سے عمدہ شغف رہا۔ وہ برقی شمع بھی بھی وہ ایجاد کرتا کہ انکو دیکھ کر ہولک ششدر رہ جاتے اور کبھی غور کرنے سے بھی وہ ہمارے گمان میں نہ آتے۔ جب کبھی کسی کو اسکی نہیں چھپائی ہوئی برقی لہر سے جھکا لگا، تو وہ ہنستے ہنستے لوٹ جاتا۔ ایک تہ نہ جانے کس طرح اس نے برقی تاروں کو ایک کتاب کے نیچے جوڑ دیا۔ جو استاد کی میز پر رکھی ہوئی تھی، اور جب پڑھاتے پڑھاتے ماسٹر صاحب کتاب کو اٹھانے لگے، وہ بھی خود لو اس پر ہرنی بیٹھے۔ اور جنید کے بے محابا ہونے سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ تمام لڑکوں کے سامنے استاد سے گستاخی؟ جنید دفعتی طور پر، سکول سے نکال دیا گیا۔ لیکن میں آج تک اس گستاخی کی اہمیت نہیں سمجھ سکا ہوں۔ یہ تھا اسکی ہر جانیت کا بدلہ، اسکی جدت طراز فطرت کا۔ بعد ازاں اس کی شہریت طبعیت کا انجام۔

جنید مجھ سے عمر میں کچھ بڑا تھا۔ اور میرے دل میں ایسے ممتاز فرد یا ایسے ستلخ شاگرد جو بعد کو ثابت کیا گیا، کے متعلق کچھ بھی جاننے کی کوئی تئنا پیدا ہی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ لیکن جب وہ دوبارہ اسی سکول میں لے لیا گیا۔ تو کسی باعث میں اور وہ درست ہو گئے۔ یا تو مجھے وہ پسند آیا، یا میں اسکو پسند آیا۔ ہر حال کچھ عرصہ تک ہم دونوں ایک دوسرے کو جاننے کی کوشش کرتے رہے۔ کچھ جان بھی گئے۔ لیکن پوری طرح جاننے سے قبل بالکل اتفاقیہ اور اس سے زیادہ بظلمت طور پر ہماری دوستی ختم ہو گئی، اور آہستہ آہستہ ملاقات بھی میں سمجھتا ہوں کہ میں پھر فضول باتوں میں جا پڑا، کیونکہ میں جنید کے متعلق تو یہ سب کچھ جانتا تھا اس سے قبل بھی اور اسوقت بھی یہ میں خود کو اپنے میں دیکھ رہا تھا۔ پھر موانع کر دیتے۔ اب میں واقعتہ وہ اندھ شہد کو کرتا ہوں۔ لیکن آپ مجھے معاف کیوں کریں؟ اسنے کہ میرے لیے جو کچھ بھی ہوں لیکن آپ کے لئے ان نحوڑے سے معززہ جملوں سے اس خیال تک پہنچنے میں آسانی بڑی جو اسوقت

میرے دماغ میں آیا جب کہ میں نے جنید کو دیکھا، اس آسانی میں ہی آپ کے دوش پر دوش ہوں۔ اچھا تو سنئے میں زندگی میں کسی بھی چیز اور کسی جہد و تہجد کی آرزو نہ رکھتا تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ ہمیشہ ایک ہی گنبد کے ارد گرد گھومے جانے، ایک ہی لکڑی کو پیشے رہنے اور صرف کو ہو کا میں بننے کی بجائے میں اپنے کو ہمیشہ ہمیشہ کو لئے جب کے بچے بننا۔ میں بچپنک دوں، اور میرے پاس اس کا صرف ایک ذریعہ تھا جس میں امید کی کچھ جھلک نظر آتی تھی۔ میری نے، عقدر سختی سے، تنہی پر غلطی سے اس کی طرف سے منہ کیوں میر لیا؟ اور بالکل دوسری جگہ ایک قصہ ناکا کہم جو کیوں شروع کی؟ میری غلطی۔ فاش غلطی! میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ میں بچپن کی شام کو تنہا جایا کرتا تھا میں نے ہر مرتبہ ایک سی نا اہدی کے بعد اس آواز کو دی کی بجائے جنید کی ہم غلطی حاصل کرنے کی کوشش کیوں ہیں کی؟ اس کو کیوں نہیں تلاش کیا؟ اور کیوں اس کے وجود کو پہچانتے ہوئے بھی میں نے ان پسند یا سب سے بلاخیز نگاہوں کی جانور کی سعی نہیں کی؟ جو کہ یقیناً اس کی زندگی کے ڈرامہ کا ایک اہم اور خاص جزو ہونگے۔ یا شاید پس منظر ہی ہوں اس سے، بھکار نہیں کہ اسوقت جنید زندگی کی تک وہ میں محبت بہت آگے خواہ وہ باوقار بھی تھا اور دولت مند بھی بنایاں طور سے انجیری کی ڈگری لینے کے بعد وہ ایک مشہور برقی ادارہ کے منتجب اور حمیدہ اشخاص میں آ گیا تھا۔ وہ اسکی روح رواں بنا ہوا تھا باوجود اس وقار دولت کے وہ شہر بڑا بھی رسمی انسان نہ تھا، وہ ایسا بلند فطرت و جو تھا جس کے لئے دنیا معمول کے تمام لغامات، قطع نظر، ہی عملی قدر و قیمت کے، صرف بیکار ہی نہیں تھے بلکہ کوئی معنی ہی نہ بنا رکھتے تھے۔ اور اس احساس میں علاوہ اسکی فطرت کے اس کے ہمالک اور اسکی مصروفیتوں کو بھی دخل تھا، اس کے سے صرف معاشی جہد کرنا نہ پوری تھا، اور اس میں اس نے جامعہ کے اپنے تمام ہم سبقوں کو شکست دے دی تھی، اور ایسی جگہ آنا فانیہ بیچ چکا تھا۔ جو چند ہی اور مخصوص و منتخب لڑکیوں کے لئے مقدر تھی، لیکن وہ حقیقت اسکا دماغ کہیں اور نہ رہ کسی اور ہی دنیا میں اور پھر رہا تھا وہ نادر تصورات و



نوروز ملتے اور سکون خور چمکا دینے میں کامیاب ہو چکا تھا، وہ خود بسموں، اور رازوں سے بٹا ہوا انسان تھا

اگرچہ میں سے اس سے کبھی اسکی عمر دریافت نہیں کی مگر وہ اس وقت کسی طرح بچپن میں سے کم نہیں معلوم ہوتی تھی جو انی شرم سنجیدگی مجھے دیکھ کر کچھ لجا نا، کچھ سمٹنا، اس کے اندر بیت سی چیزوں کا بیک وقت اجتماع تھا، وہ کوئی حسین لڑکی، خوبصورت، دو شیزہ نظر نہیں آتی تھی، بلکہ ایک سنجیدہ چنڈ عورت، قبل اس کے کہ میں اپنے ہوش و حواس بکری کروں وہ مسکراتی ہوئی تھی۔

شاید آپ جنید صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ ماہر کے ہونے میں آئے، تشریف لائے۔

اسی طرح عمارات میں ایک طرح کی سکون آئیز محبت ملی ہوئی تھی اور میں کسی حالت میں بھی اس قابل نہیں تھا، کہ اس محبت نواز دھڑکی کی ضمانت لے سکوں، اس لئے کہ وہ کے اندر داخل ہو گیا، جیسے ہی میں اسکی تربیت سے گزارا، اس نے چٹا ہاتھ آہستہ سے میرے بازو پر رکھ دیا۔

وہ مجھے ایک وسیع، سادہ اور دلکش کمرے میں لے گئی، اور بغیر کسی رسم و تکلف کے ایک کمری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چائے بنانے میں مصروف ہو گئی، کبھی کبھی وہ میری طرف دیکھتی اور مسکراتی دیتی۔ مسکراتی اس طرح کہ گویا جس حالت میں میں خود کو اجنبی محسوس کرتا ہوں، وہ اس کو اچھی طرح جانتی ہے، میری تمام زندگی تجزیوں سے گزری تھی، مجھے آج تک کبھی ان احساسات و پہچانات کا خیال بھی نہیں ہوا تھا جو اس وقت میرے اندر شاید ایک تلامطم سا یا ایسی ہی کوئی چیز برپا کئے ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے جب میں جوان تھا، اس وقت شاید ان جذبات کا خوابوں میں لطف اٹھایا کرتا تھا، لیکن وہ خوابیں بھی اس وقت بالکل ویران سی محسوس ہورہی تھیں کیونکہ انکی جیسا ایک خلیوں کو آباد کرنے کی صلاحیت کسی سنوئی وجود میں نہ تھی نہ کبھی کسی جوان عورت نے میرے ان حسین خوابوں کو مرہون تعبیری کیا تھا ان حسین تیریوں میں جنہوں نے کبھی کبھی راتوں رات میری خوابوں کی دنیا کو آہستہ سے چھو دیا ہو، کچھ دلچسپ خدو

ایک عجیب سی چیز، بالکل عجیب اور قابل بیان چیز محسوس کی میں ملاقاتوں کے سلسلے میں استہانی حساس اور کچھ عصی بھی واقع ہو چکا اور بالخصوص اس وقت جب میں کسی کے دروازہ کے آگے کھڑے ہو کر اسکا انتظار کروں، ایسی حالت میں میرا تمام اعصابی نظام ششمر ہو جاتا ہے۔ مجھے ہزار ہا خوف و خطرات، اپنا شکار بنالیتے ہیں اگر یہاں سے کوئی شخص نکلا اور اس نے مجھے زبرد قیوح کی؟ کیا میں صبح مکان پر آیا ہوں؟ کیا وہاں جنید منترلی ہی نکلا تھا؟ کب میں ٹھیک وقت اور ٹھیک دن آیا ہوں؟ میں اپنے تصور میں دروازہ کی طرف آتے ہوئے کئی قدموں کی چاپ سن رہا تھا، چٹنا..... جنید کے ہونے چاہئیں جسکی عراب چاس کے کھڑے ہوگی، جس کی عمر جب میں نے آخری مرتبہ دیکھا تھا، وہ ۲۰ سال بڑی تھی، اتنے سالوں کا یہ عرصہ اس کے اوپر کس طرح اثر انداز ہوا ہو گا کیسا گذرا ہو گا؟

لیکن آواز دراصل کسی کی بھی نہیں تھی، وہ تو ایک ہم تھا، صوفیہ میں پاپوس ہو کر آخری مرتبہ دروازہ کھٹکھٹانے ہی کو ٹھہر کر ایک لخت اور بغیر کسی آواز کے دروازہ کھلا اور میرے سامنے ایک میرا خیال ہے کہ مرد کے لئے سب سے بڑا سمتہ، اسکی شخصیت و نظوری کارکردگیوں کا مترشہ عورت ہے اور ہمیشہ سے ہے۔

اس وقت جنید کہاں چلا گیا تھا، میں کھڑا تھا، اور ایک حیرت و استعجاب کے عالم میں خاقانی کی اس نازک و پاک صنعت کو دیکھ رہا تھا، بظاہر بے خبر مگر میرے اندر میرے ضمیر کی گہرائیوں میں ایک جذبہ بیدار ہو چکا تھا، ایک عجیب الٹی الٹی سی لامعلوم لہر بیدار ہو چکی تھی، وہاں میرے سامنے بالکل مقابل، ایک گز سے بھی کم فاصلہ پر وہ سب کچھ موجود تھا، جس کی میں اپنے جذبات کی تمام شدت اور رُوح کی تمام پاکیزگی کے ساتھ آواز نہ کر رہا تھا، اگر یہ نہیں تو کم از کم وہ چیز تو تھی ہی جسکو اگر میں پہلے پاچکا ہوتا، تو اپنی کوششوں کو اپنی امیدوں کو تار بکی دیا ہوسکتا تھا، بھانک سنان دیرانے میں اس طرح کبھی بھی دانا نہ نہ کرتا، کبھی کبھی اس قدر بھٹکتا پھر جنید میری آج سے ۲۰ سال قبل کی آرزوں، تمناؤں کے فلسفے راز پر بے پناہ



اس نے میرے سوال کا کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ عمداً احتراز کر رہی تھی، وہ ایک پراسرار طریقہ سے مسکراتی ہوئی بولی۔

میں جب انکو ملی ہوں اس سے قبل کچھ ہی نہ تھی۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں میں نے ذرا زور دیتے ہوئے کہا۔ لیونکو میرے اندر ایک انتہائی تلخ عداوتی جذبہ ارادہ کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ ایسا جذبہ ارادہ جس سے میں آج تک قطعاً نا بلرغا۔ مگر جس کی ترغیب پر میں ہر ممکن طریقہ سے جنید کی قدر کو کم اور اسے اعتبار کو اونٹنے کرنے کے لئے آمادہ ہو چکا تھا۔

”نہیں“ وہ اپنے سر کو نفی میں ہلاتے اور نظروں کو زمین پر جھانے پر تے بولی، اور ایک ہی ثانیہ کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ دروہی بند کچھ دیر بعد اس نے اپنی آنکھیں میری طرف اٹھائیں۔ اس کے چوٹے نم، لود ہو رہے تھے، اس کی ہلوں پر آنسوؤں کے موتی چھل چھل کر رہے تھے۔ نہ معلوم کس جذبہ سے متاثر ہو کر میرے بازو چھل گئے اور وہ ان میں بالکل اسی طرح کلچنے آئی جیسے پتھان سے لڑنے آئے، میرا سر اس کے صرستہ ملا ہوا تھا۔

اس شام کو جب میں اس چھوٹے سے دروازے سے نکلا، میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر ضرور کوئی ایسی تبدیلی واقع ہو گئی ہے جس کے امکان کا وہم و گمان بھی مجھے اس دروازے میں داخل ہونے سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ مجھے محبت ہو گئی تھی۔ دیوار دار محبت — مجھے: جو اس ہی شام کو کچھ دیر پہلے آئے تھے میں ابنا عکس جھک کر اپنے شباب سے مایوس ہو چکا تھا اپنی جوانی کی یاد کو سپرست نالی چکا تھا۔

دوسری ملاقات میں میرے سامنے اور واقعات بھی مختلف ہوئے، ایسے واقعات جنہوں نے مجھان تمام باتوں سے جو کہ میں نے اب تک سنی تھیں، زیادہ متوجہ کیا یعنی اس کے اور جنید کے تعلقات کی اہمیت۔ میں شاید کبھی دہم میں بھی وہ باتیں نہیں لاسکتا تھا۔ وہ ہمیشہ بی کتنی کہ وہ جنید کو نہیں چھوڑ سکتی، کیونکہ اس کے اوپر جنید کے بڑے احسانات ہیں

میں نہیں جانتی کہ غیر انکے میرا کیا حال ہوگا: اس نے کہا یہ وہ

مگر صادق نکالیں میرے جبرہ پر اس طرح جواب دینی کہ گویا اس کے لئے کوئی ایسا ارادہ نہیں ہے، جو ہر شخص اچھی طرح نہ سمجھ سکے اور دوسری وہ زمین پر گرزی ہوئی متفکر نظریں جن سے یہ اظہار ہو رہا تھا، کہ وہ اس پر غور کر رہی ہے، کہ میں کہنے اس سے کیا کیا کہا، اور وہ اس کے جواب میں کیا کیا کہنا چاہتی ہے اور میں اس کے اس انداز میں جو انتہائی لطیف تھا، ایک نوع کی پانی، ایک قسم کی صدا، ایک طرح کی راستی پا رہا تھا۔

”تو کیا؟ میں نے دریافت کیا: آپ جنید کی رفیقہ میت

ہیں؟“ کیا آپ جنید صاحب سے رفیقہ حیات کی توقع رکھتے ہیں؟“ مجھے کیا علم، میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ میں نے جنید کو ۱۰ برس سے نہیں دیکھا ہے۔

”نہیں میں انکی رفیقہ حیات نہیں ہوں“ وہ آخر کار بون ”شاید آپ ان کے ساتھ رہتی ہیں“ میں نے کہا: مہربانی کر کے آپ یہ نہ سمجھیں کہ . . . . .

”جیسے میں سمجھ ہی لوں گی: اس نے اپنا ہاتھ میرے گھٹنے پر سے ہٹا کر میرے منہ پر رکھتے ہوئے کہا ”ہاں میں انکے ساتھ رہتی ہوں: وہ بولی، لیکن مجھ کو وہ کچھ پسند نہیں“

یہ اندازہ کر کے کہ میرے جذبات مجھے کن کن بستوں اور کن کن گہرائیوں یا بھر کن کن بستوں تک لے گئے ہیں میں حیرت ہو کر رہ گیا۔

”پھر آپ اس کے ساتھ کیوں رہتی ہیں؟ میں نے استفادہ کیا میں ان سے جدا نہیں ہو سکتی: اس نے جواب دیا ”دوسرے کے لیے میں ایک ادا اسی تھی“ میں ہر چیز کے لئے انکی ممنون ہوں میں جب انکو ملی ہوں اس سے قبل کچھ بھی نہ تھی، وہ ہمیشہ ہی کہتے ہیں کہ انہوں نے مجھ کو سدا سدا رہا ہے، اور اب میں انکو سدا سدا رہا ہوں تم اسکو سدا دے دو گی؟ میں نے دھڑبڑا کر اس طرح؟

ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ میں اپنی حیات کا کارنامہ ہوں، اپنی زندگی کا سہارا ہوں، انہوں نے مجھے کھودیا۔ تو وہ اس صدمہ سے جان بڑھ کر بچیں گے اور بالخصوص اس وقت

اس وقت کیوں؟ میں نے بے معنی سے پوچھا

وہ ایک لمحہ ٹھہری اور پھر بولی۔

آپ نہیں سمجھ سکتے، وہ مجھے تعلیم دے رہے ہیں اور اگر میں

ان کو اس وقت چھوڑ دیا تو

تو ہمیں تعلیم دے رہے ہیں کیا تعلیم دے رہے ہیں؟

وہ کمرے کی دوسری طرف بیٹھی اور ایک وسیع پردہ کو ہٹاتے

ہوئے۔ اس نے مجھے ایک بڑا خوبصورت ستار دکھایا، اور میں جب

گئی اور ستار اٹھا کر جانے لگی، چند ہی منٹ کے بعد مجھے معلوم ہو گیا

کہ وہ ایک ماہرین ستاروں ہے مجھے موسیقی سے کچھ زیادہ دلچسپی

نہیں ہے لیکن ستاروں کے ناموں پر دل و دماغ میں بڑی نگہداشت

پاتا ہوں، اور میں نے ملک کے مشہور ماہرین فن کے فن کو پرکھا ہے

اس وقت مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ان میں سے کسی طرح بھی کسی سے

کم نہیں تھی اس کی انگلیوں کی جنبش جیسے پھلیاں سطح آب پر انتہائی

سرعت سے دوڑتی تھیں، اس کے چہرہ کا آثار چڑھاؤ جیسے وہ

ہر راگ میں غور کو بھی دینے ہی مٹا کئے ہوئے ہے جیسے ایک سننے

والا ہو سکتا ہے اس کے سینہ کا نشیب و فراز، جیسے ہر تال اور ہر شہر

اس کے اپنے ہی جذبات کی ایک الاپ ہے اسی کی... طرح

کی ایک پکار ہے یہ سب چیزیں ثابت کر رہی تھیں کہ وہ ایک شائق

و ماہر فنکار ہے

جب وہ اپنا رنگ ختم کر چکی تو وہاں سے اٹھی اور بغیر کوئی لفظ

کہے اپنی پہلی جگہ آ بیٹھی۔

میں اب سمجھا کر تمہیں جنید کیا تعلیم دے رہا ہے؟ میں نے

بے تابانہ کہا۔

”وہ آئندہ بہار... کے مقابلہ موسیقی میں مجھے شریک کے مانتے

ہیں، اس نے کہا۔ شاید اب آپ یہ سمجھ گئے ہوں گے، مگر میں ان کو

اس وقت چھوڑ دوں۔ . . . .

تو کیا حب جنید یہ کہتا ہے کہ تم اس کو مددگار مانتے ہو اس سے یہی مراد ہوتی ہے؟ میں نے دریافت کیا۔

اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا مگر وہ سر جھکانے

خاموش بیٹھی رہی جس سے میں نے یہ اندازہ کر لیا کہ اس کا جواب

اثبات میں ہے۔

لیکن براہ کرم، میں نے اسی بے تابی سے کہنا شروع کیا۔ یہ تو بتاؤ

کہ جنید تم کو تعلیم کس طرح دے سکتا ہے؟ وہ تو ستاروں کی بالکل ہی

نہیں جانتا۔

”وہ نہیں تو جانتے، مگر سب سے پہلے انہوں نے خود ہی مجھے

تعلیم دینی شروع کی تھی، وہ مسلسل پانچ سال تک مشق کراتے رہے

اور اس کے بعد انہوں نے مجھے دیگر ماہرین فن کی شاگردی میں

دے دیا۔

”تو پھر یہ دیگر ماہرین فن تم سے خوب واقف ہوں گے؟ میں

نے پوچھا۔

”جی ہاں، اس نے جواب دیا۔ اتنی لواحق وہ میرے متعلق اچھی

طرح جانتے ہیں، اور پھر فوراً ہی میری طرف دیکھتے ہوئے حجاب

و دلیری، حیا و تسنن کے لئے جملے جذبات کے ساتھ، جو میں نے نہ

اس سے پہلے کبھی دیکھے تھے نہ آئندہ کبھی دیکھوں گا، وہ زیر لب آواز

میں بولی۔

”لیکن میں ہوں بہت رازدار۔“

میرا خیال ہے کہ یہ سیرمی یا چوٹنی مرتبہ کا واقعہ ہے، جب ہماری

محبت پروان چڑھی، نئے امید ہے کہ آپ مجھے پروان چڑھی کے

اللہ خداستدعا کرنے کی اجازت دیں گے۔ حالانکہ بہت سے انسان

شہرہ میرے اس دلیرانہ اظہار و اعتراف پر حیرت منگے، یہ نہیں کہ میں

اس پروان چڑھنے کی تائید بیان کرنے سے جی چراتا ہوں، یا میرے

ذہن سے، اس رنگین لمحہ کی یاد تازہ ہے، لیکن یہ میرا تجربہ اس قدر

گراں تھا کہ مجھے اس سے پہلے کی تمام زندگی بونی باتوں میں ایک کی

سی محسوس ہونے لگی، اس واقعہ میں خود اتنی خیرگی تھی کہ ہر گزشتہ آئندہ

واردات کا نظراً جانا ناممکن سمجھا۔

بھری ہوئی ہے۔ اسوقت فطرت میں نے بھی چاہا کہ اپنی مجبورہ کو اس طرح دیکھوں کہ وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔ اور نہ بھی کہہ سکی کہ وہ تھائی میں جب کہ اس کے پاس کوئی نہ ہو کسی معلوم ہوتی ہے۔

دہاں کہے ہو کر مجھے سوائے اپنے ہی دل کی دھڑکنوں کے کوئی اور آواز سنائی نہیں دی بہ طرف سکوت مسلط تھا، لیکن فوراً ہی میں نے کھڑکی کے قریب ہی اسکی آواز سنئی، بالکل اسی کی آواز جو باوجود ایک دیوار بچ میں غافل ہونے کے مجھے صاف صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی تکرار پر ہی تھی

”میں پیار سے ہرگز نہیں میں تم سے کہہ چکی ہوں، اگر انہوں نے مجھے کھو دیا تو وہ اس صدمہ سے جا بزنہ ہو سکیں گے اور بالخصوص اس وقت . . . . .“

یہی الفاظ تھے جو اس نے کبھی مجھ سے کہے تھے۔ اور بالکل اسی لہجے میں، میں اپنی اسوقت کی دماغی حالت کو اس سے زیادہ واضح الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا کہ جب میں نے یہ الفاظ سنے تو وہ فوری جذبہ جو میرے اندر پیدا ہوا، ایک قسم کی اندر دنی شادمانی، اندر دنی مسک کا تھا، یہ ہے سچی محبت کا نظارہ خوش سے میرا سینہ چھٹا جا رہا تھا، وہ مجھ سے کس قدر محبت کرتی تھی، کہ وہ میری عدم موجودگی میں ان ہی الفاظ سے تسکین قلب کر رہی تھی، جو ہم نے کبھی آپس کی گفتگو میں استعمال کئے تھے۔ شاید وہ یہ بھی محسوس کر رہی ہو کہ میں اس کے مقابل میں تھا ہوا ہوں اور ہم دونوں باتیں کر رہے ہیں، اگر وہ اس حالت کو پہنچ گئی ہے تو وہ یقیناً میری ہے اب میرے اندر اس کے تعلق حصول مقصد کی وجہ دلی سی امید یقین کی صورت اختیار کر چکی تھی۔

تھوڑی دیر تک میں اسی مسرور بے خودی کے عالم میں گھڑا رہا لیکن اب جب کبھی میں اس موقع اور اس لمحہ کا خیال کرتا ہوں تو اپنی اس مسرور بے خودی کو کسی ایسی ہستی سے تشبہ دینے پر مجبور ہو جاتا ہوں جو کسی انتہائی بلند چوٹی پر کھڑی ہو، وسیع دنیا کو دیکھ رہی ہو، اور اسکی پستی پر نہیں رہی ہو اور دوسرے ہی لمحہ اسکو وہاں سے پاش پاش ہونے کے لئے پھینک دیا جائے، فوراً ہی میں نے ایک آواز

میں سمجھا ہوں، کہ انسان کی تعمیر ہی کچھ اس پنج پر ہوئی ہے کہ وہ موجود چیزوں سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ یہ اسکی فطرت ہے کہ وہ من پیزوں سے اور اگے بڑے یہ تغیر خارجی میں ہو سکتا ہے اور ذہنی بھی، چنانچہ میرے ”اغصاب حسن“ میں ایک اضطراب زدہ حالت پیدا ہو چکی تھی، میرے تعلقات کی بنیاد، وہاں ہے جیسی تھی ہو، مگر میرا ضمیر چاہتا تھا کہ اسکو اور زیادہ وسیع ہونا چاہئے۔ میری غافلوں میں جتنا تو اترو استحکام پیدا ہوتا، اسی ہی میری برآورد ہوئی کہ وہ اور زیادہ ہوں چند ہفتوں کے لئے میں واقعی تمام سستی سبوتاں سے ہٹکار رہا اور ان ہفتوں میں مجھے معلوم ہو گیا کہ سرسرت کیا چیز ہے اور دنیا کے کتنے آدمی یہاں اپنی سرسرت کے حاض کرنے کی جرات دے باقی ہوتی ہے یہ احساس کہ وہ ہے وہ میری ہے، وہ مجھ سے والہانہ محبت کرتی ہے اور آنے والی سپر کی شام کو پھر ہم دونوں وظیفہ محبت دوسرے لئے تو وہ وظیفہ محبت سے بھی زیادہ اہم تھا، اور انہیں گئے۔ میرے لئے کچھ کم نہ تھا، ذہن پر میرے قدم اگر کسی دو تار کے سے نہیں تو کم از کم ہم دنیا کی طرح پڑنے لگے تھے۔ جنید کس قدر بد نصیب اور ساتھ ہی سیاہ کلا بھی تھا، اس نے ایک جوان عورت کو ننھے سے پرند کی طرح قید کر لیا تھا، مگر جیسے جیسے میری محبت عمیق ہوتی گئی، میرے اندر ایک تغیر رونما ہوتا گیا۔

آج مجھے اس تک پہنچنے میں کچھ غیر معمولی تاخیر ہو گئی تھی لیکن باب میں اس چھوٹے سے دروازہ کے قریب پہنچا، تو یہ دیکھ کر کہ وہ حشرات معمول کھلا ہوا ہے، میں بے حد متحیر ہوا۔ میں حسب معمول اندر داخل ہو کر صحن کو لے کر تا ہوا اور چڑھ گیا اور پہنچ کر میں نے دیکھا کہ آج وہ ایک کھڑکی میں کھلی ہوئی ہے جس کے متعلق میرا خیال تھا کہ مکان تعمیر ہونے کے بعد اسکو کبھی کھولنے کی زحمت ہی نہیں کی گئی، یہ چیز اور زیادہ تعجب انگیز تھی لیکن میں نے خیال کیا، کہ شاید اس نے تازہ ہوا، اور سورج کی روشنی سے حفظ انداز ہونے کے لئے اس کو وقتی طور پر کھول لیا ہو۔ اسی وقت میرے دماغ میں ایک عجیب خیال پیدا ہوا، ایسا خیال جو بالعموم بچوں یا پھر ایسے محبت کرنے والوں کے دلوں ہی میں پیدا ہو سکتا ہے جن کے لئے تمام دنیا دیکھیوں اور دلفریبیوں سے



سنی نہ سہی آدہ، دیکھی ہر کی آواز جو کہہ نہ سہی تھی۔

”پیارے تم تو کہو! ہوگا اگر تم نہیں کرو گی تو شاید مجھ میں زندگی بھی برواشت نہ کر سکوں۔“

”اب صمانی در حد سے بجا کر جاتا ہے ہم بے پوش ہو جاتے ہیں لیکن فسی تکلیف میں اسباب نہیں ہوتا۔ جہاں سے پاس اس تکلیف کا علاج ہوتا ہے اور وہ یہی کہ ہم وقتی طور پر اس سے بے جس ہو جاتے ہیں سے محسوس ہی نہیں کر سکتے ہم جانتے ہیں کہ کوئی صدر دلوغ پڑے ہو چکا ہے لیکن اس دوران میں ہم اس کے احساس کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اس وقت بھی یہی ہوا میری تمام دنیا ایک لمحے میں مٹ گئی۔ سہری تمام تناؤں پر آں واحد میں پانی پھر گیا۔ میری ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ مگر میں وہیں کھڑا رہا ساکن و خاموش جیسے کچھ ہوا ہی نہیں میں نے نہایت ہوشیاری اور حدود و احتیاط کے ساتھ کھنی ہوئی کھڑکی کے کھڑکوں سے جھانکنے کی کوشش کی۔ اور ان دونوں کو دیکھ لیا۔ ایک سیاہ عام انسان تھا، اور مجھے علم نہیں کہ وہ کون تھا، اور اس کی شکل کیسی تھی۔ کہو! یہ اس کی پشت کھڑکی کی طرف تھی یہ یعنی ہے کہ وہ جہیز نہیں تھا، کیونکہ مجھے خوب یاد ہے کہ وہ جب گورنمنٹ آؤدی تھا وہ خود زمین پر بیٹھی ہوئی، اسی نظر سے اسے دیکھ رہی تھی جس کی لطافت، صداقت اور راستی سے میں بھی اتنی مرتبہ واقف ہو چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے تمام جسم میں ایک سنہنی سی ڈور کئی شاید الفاظ اس سنہنی اور اس حالت کے بیان کے متحمل نہ ہو سکیں۔ لیکن جیسے ہی مجھے یہ خیال آیا کہ میرا اس حالت میں زیادہ دیر تک کھڑکی پر رہنا اور ان میں سے کسی کا مجھے وہاں دیکھ لینا، بڑی غیر مناسب اور محدود سی بات ہے۔ میں نے اپنا سر ہٹا لیا اور مجھے کو دبے قدموں سے لے کر کے نیچے اترا، اور مکان و امیں چلا آیا۔

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ کسی خاص واقعہ سے میں یہ کہنے کے قابل ہو گیا تھا کہ میں مسرت کو جان گیا ہوں۔ لیکن آنیو نے چند ایام نے مجھے انتہائی اذیت کی تھی مجھ کی چھادی اسی جاں گس اذیت کی کہ مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اسکی عرف و نام نہی ہی میرا چہرہ چوہو کر دجی میری حالت بڑی اترا ہو گئی تھی میں انتہائی اضطراب و کرب

میں سر بسجود ہو جایا کرتا۔ اور خدا سے دعا کرتا کہ ”اوپاک پروردگار!!! اگر تو جانتا ہی ہے تو میں اس جالکھ صدر کو برواشت نہ کر دوں گا۔ لیکن میں اس قابل نہیں مجھ میں اتنی طاقت کہاں کہ میں اس کو تھوڑے سے عرصہ تک بھی برواشت نہ کر سکوں۔“

اگلی صبح کی شام کو میں پھر اس کے آستانہ پر حاضر ہوا، لیکن آج بہت جلد اس نے کھٹکھٹانے پر دروازہ کھولا، اور جیسے ہی اس نے مجھے دیکھا اس کا چہرہ پھر اسی صداقت و محبت کا آئینہ بن گیا جسکو میں نے اپنے لئے اپنے خیالوں میں مخصوص کر رکھا تھا، جس نے ایک سے کئی مرتبہ زیادہ میرے متاع ہوشی خواں کو ٹوٹا تھا، اس کے اس قرب کے نظارہ نے میرے اندر اس قدر زبردست تشنگی پیدا کر دیا اور میں فیہر اس خیال کے کہ آیا وہ ہی میری اذیتوں کا باعث تھی یا نہیں؟ اس پر اتنے وحشیانہ طریقہ سے اپنی تمام بدعائیں صرف کر دینا چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے میں خود اپنے مقصد میں اپنے جذبات سے مغلوب ہو گیا۔

اس نے حسب معمول دروازہ بند کر دیا اور محبت بھرا اظہارِ محبت باوجود پرکھتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا، لیکن بیٹھنے کی بجائے میں نے اپنی جیسے ریوڑ اور نکالا، اور اس پر ایک دم کئی گولیاں چلا دیں، اس کے منہ سے آدھا نقطہ بھی نہ نکلا، وہ زیادہ دیر تک کھڑی بھی نہیں رہ سکی، بلکہ فوراً ہی زمین پر ڈھیر ہو گئی اس کے بدن سے ایک ایسی ہلکی سی آہ غصہ نکلی جو اکثر مکان کی شست کو چھوڑنے سے نکلا کرتی ہے، یہی اس کا آخری پیام محبت تھا۔

میں نے فوراً دروازہ کھولا، اور وہاں سے فرار ہو گیا۔

دن گزرتے گئے۔ ہمارا تک کہ ایک ہفتہ، پورا ہفتہ گزر گیا، اخبارات کی اطلاعات سے میں اس تغیر پر بھی پہنچا، کہ کسی کو میرے جسم میں کئی خبر نہیں ہوئی جنید کہاں چلا گیا تھا؟ کیا وہ کسی کو مردہ ملی نہیں؟ — تفتیش کبوں نہیں ہوئی؟ کیا اس کو جنید نے خود کبیں غائب کیا تھا؟ دوسرے ہفتہ پھر کے روز جیسے ہی کہ میں اپنے دفتر سے باہر نکلا میری نظر اخبار کی ایک موٹی سرخنی پر پڑی، دیکھا تھا کہ،

”ایک شاندار کردار کا خاتمہ۔“ — مکان پر

اور ایک در خاص جسد بھی جس کے متعلق انسانی دل ہونے کا جملہ صا وہ کیسا گیا۔ سی دار العمل میں جس۔ ساتھ ہی یہ بھی ملے جو کہ یہ انسانی دل جنید نے خود ہی کسی ایسے طریقہ سے بنایا تھا جو مافنس والی دماغوں کو دعوت عمل دے رہا تھا۔ میری مات یہ غنی کہ یہ دل دنیا والوں کے لئے مصنوعی ہو، مگر چاہتا ہوں کہ یہ وہ ہی ہو گا جس کو جنید سے اپنے عملی تجربوں کے لئے اس کے جسم سے علیحدہ کر کے اس کا جسم یا پڑیاں نکال کر صرف گہرت زمین میں دفن کر دیا

جس نے جب یہ اطاعات پڑھیں، آپ ہی سوچئے میرے حیرت و استعجاب کی کوئی حد رہی ہوگی۔ دنیا کتنی جلد اور کتنی آسانی سے یوتوف بن سکتی ہے اور بنائی جاسکتی ہے۔ میری نظروں کے سامنے یہ غریب و بی نظیرہ معادنی تمام جزوی تفصیلات کے اور ان دو شاہدوں کے جو مجھ سے بہت دور جا چکے تھے، قضا صاف موجود تھا لیکن میں نے اس پر جس قدر غور کیا، اتنی ہی میرے سامنے ایک اور تصویر بھی گردش کرتی معلوم ہوئی، اور وہ میری اپنی ذات تھی، نوو شناسی کی۔ خود شناسی کی کوئی گہرائیاں میں نے ان حسین و صادات آنکھوں کے سمندر میں نہیں دیکھی تھیں۔ کو دنا رحم اور پیار میں نے اس ملکوتی مسکراہٹ میں نہیں پایا تھا جو میرے ہی باجی اول کے خوشوں کی ہمدی میں پیدا ہوئی تھیں۔ اور۔ اور۔ کیا وہ خود خدا کی۔ ہاں ہاں خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوق نہیں تھی، جو دنیا میں میرے خیال سے صرف اسلئے آئی ہو کہ اگر وہ کی نہیں تو کم از کم میری ہی تنہائیوں کو لبریز حیات کر دے میری ہی مخلوقوں کو حلویت بنا دے میری ہی عزت گزینیوں کو اپنے سینے قہقہوں سے گونجا دے۔ اور کیا یہ تمام واقعات ہونیوالے نہیں تھے، کیا یہ وقوع پذیر نہیں ہونے لگا گیا میں نے انکو ثابت نہیں کر دیا، لیکن یہ ثبوت کہاں سے آیا ہو کون اس ثبوت کے پردے میں پوش ہے ہو کون ان واقعات کے پیچھے چھوڑنا ہے وہ ہی ذات۔ وہ ہی ایک ذات۔ افوہ رہی خود نمائی۔

بچہ سب سے پہلا کام میں نے اپنے ملازم سے، خیار مانجے ہی کا بچا، اس کو پڑھ کر مجھے معلوم ہوا کہ یہ شاعر اگر کردار کا خانہ۔ راصل جنید کی موت کی اطلاع تھی، وہ اپنے مکرے میں گولی سے مر رہا ایسے حالات میں پایا گیا جن سے اس کی خودکشی کا خیال برتا تھا۔ فوراً ہی میرے دماغ میں اس کے الفاظ گھومنے لگے۔ اگر آپوں نے اب بھوکھو دیا تو وہ اس صدمہ سے جان نہ ہونیں گے۔ اور اس کے کھونے کا نتیجہ تھا۔ بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔ تب تو اس کو اس کے متعلق بالیقین معلوم ہو گیا۔ اور کسی اور کو بھی وہ واقعہ معلوم نہیں ہوا۔ یہ بات ذرا قابل اعتبار نہ تھی، اور اس لئے میں نے خود سے فیصلہ کر لیا کہ اب میری باری ہے۔

لیکن پھر بھی کچھ وقوع میں نہیں آیا میری زندگی پھر اپنی اصلی حالت پر آچکی تھی اگرگزشتہ واقعہ کے متعلق کوئی خیال باقی تھا تو جنید کی خودکشی کا سبب کیا اسے محبت تھی؟ کیا اس نے بہکت مقابلہ کے اعلان کی شرم کی وجہ سے خودکشی کر لی؟ کچھ روز کے بعد میں نے اخبار میں جنید کی موت کی تفصیل پڑھی یہاں کسی تفصیلی حوالہ کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ کافی ہے کہ اس طرح مومنا یہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر فطین و طباع آدمی آخر عمر میں پاگل ہو جاتے ہیں، بالکل اسی طرح اس کے متعلق بھی فیصلہ کر دیا گیا تھا کہ اس نے خودکشی اختلال دماغی کے باعث کی۔

لیکن اس سے تین امور روشنی میں آئے جنہوں نے مجھے بے حد تعجب و شجب کیا۔ اول یہ امر بغیر کسی شک و شبہ کے پایہ ثبوت کو پہنچ گیا تھا کہ جنید تنہا رہتا تھا۔ وہ سرتے یہ کہ وہ کمرہ جس سے میں اس قدر واقف تھا، جہاں میں نے دنیا کے سب سے بڑے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اس کا دار العمل تھا۔ اس دار العمل میں بہت سے کیمیاے اور پرتائے پاسے گئے۔ بالخصوص ہزاروں کی تعداد میں برقی خزانے جو ابھی تک ساخن کی دنیا میں غیر معروف تھے وہاں ملے۔ علاوہ ان کے انسانی ہڈیوں کی بھی ایک خاصی تعداد

نوٹ: اس انسان کے تمام کردار اور اس کا پلاٹ صرف انسانی ہیں حقیقت سے انکا کوئی تعلق نہیں۔ راحت

# مقرب

## (اشتیاقِ قرب)

نہ مرا شوقِ اسیرِ ہوسِ نظارہ نہ مرے ضبط کو تابِ نگہِ آوارہ  
نہ مجھے عشق کو افسانہ بنانے کا جنوں نہ مجھے حسن کو دیوانہ بنانے کا جنوں  
پھر بھی حسرت ہے کہ تم سے نہ کبھی دور رہوں

دل مرا انجمنِ شاہدِ رعنائے فراق ہر نفسِ تارِ نقابِ رخِ یلانے فراق  
محرمِ رازِ حجاباتِ جدائی ہوں میں! مرتبہ دانِ مقاماتِ جدائی ہوں میں  
پھر بھی حسرت ہے کہ تم سے نہ کبھی دور رہوں

اضطرابِ دل دیوانہ گراں میسر لے! شوخیِ مستی پر دوا گراں میسر لے!  
سوزِ خاموشِ وفا مائلِ الفت ہے مجھے! آہ! محبوب بہت گوشہ سلوک ہے مجھے!  
پھر بھی حسرت ہے کہ تم سے نہ کبھی دور رہوں

جذبہِ عشقِ دوفاغاکِ بسرِ خاکِ شیشِ جلوہ تمکنتِ ناز ہے افلاکِ شیش  
مہرِ تکِ شبنمِ مجبور کی پر داز کہاں؟ میں کہاں اور لطافتِ کدۂ ناز کہاں؟  
پھر بھی حسرت ہے کہ تم سے نہ کبھی دور رہوں

شوخیِ شعلہِ فرقت کی قسم ہے مجھ کو آہ! دامنِ محبت کی قسم ہے مجھ کو  
خلوتِ آرائے جمالِ غمِ پہاں ہوں میں خوابِ اظہارِ محبت سے گریزاں ہوں میں  
پھر بھی حسرت ہے کہ تم سے نہ کبھی دور رہوں

جانا ہوں، کہ جدائی ہے سزاوارِ وفا! ہجر سے دور نہیں سنبلِ اسرارِ وفا!  
حاصلِ عشقِ تصورِ گیتہاں ہے! ہوسِ قرب تو اک عالمِ رسوائی ہے!  
پھر بھی حسرت ہے کہ تم سے نہ کبھی دور رہوں

مرصنفہ: بیرونیسیر لام کار وراما

مترجمہ: جناب یزدانی جالندھری

# دس منٹ

## افراد نمثیل

مہادیو \_\_\_\_\_ ایک معمولی آدمی

بلدیو \_\_\_\_\_ مہادیو کا دوست

داسنٹی \_\_\_\_\_ بددیو کی بہن

ایک پولیس اسپیکٹر، در چار سپاہی

جلد ۱۔ کانپور سے ۲۰ میل دور۔ زمانہ: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد

منظر ۱۔ آزادی کا وقت۔ ایک آراستہ و پیراستہ کوہ، شمالی اور جنوبی جانب دو دروازے ہیں شمالی دروازہ بہت چھوٹا ہے جس کا تعلق باہر جانے والی سڑک سے ہے۔ جنوبی دروازے کے نزدیک کھڑکی ہے، جو بند ہے۔ کمرے کے عین وسط میں ایک میز ہے جس کے دونوں طرف دو کرسیاں پڑی ہیں سامنے ایک گھڑی لگی ہوئی ہے جس میں دو بکھرے منٹ ہوتے ہیں۔ کمرے کے ایک گوشے میں ایک پرانا چنگ بچھا ہوا ہے۔ اس پر ایک اویسٹر عکروادی بہت معمولی کپڑے پہنے سو رہا ہے اکی عمر تقریباً پینتیس برس ہے۔ اس کے چہرے پر شکاوٹ کے آثار نمایاں ہیں چاروں طرف سکون طاری ہے، کمرے میں بجلی کی روشنی پھیل چکی ہے

کے کپڑے خون سے رنگے ہوئے ہیں کرتے کا بالائی حصہ پٹا ہوا ہے، ہاتھ میں چھری ہے، جو ہاتھ کاٹنے کے باعث لباس میں الجھ رہی ہے۔ اس کے منہ پر ہوائیاں چھوٹ رہی ہیں، وہ سہمی ہوئی نظروں سے اوجھل دھڑکتا ہے

بلدیو:۔ دیکھو! ہوائیاں اٹھیں، مہادیو! میں نے خون... کروا دیا! مہادیو:۔ دشمن ہمارے خون کر دیا؟ کس کا؟ کس کا؟ بلدیو:۔ دشمن بلدیو:۔ نہیں... نہیں... میں نے خون نہیں کیا کسی دوسرے آدمی نے خون کر کے چھری میرے ہاتھ میں دیدی ہے میں بے قصور ہوں کون کہتا ہے میں نے خون کیا ہے؟ ایسا؟

مہادیو:۔ ابھی نہیں نے تو کہا تھا، یہ تمہارے کپڑے، بلدیو کے کپڑے

ایک آواز:۔ رہا ہے، مہا... دیو... مہا... دیو:

مہادیو غصہ کی حالت میں سر اٹھاتا ہے، آنکھیں ملتا ہوا [مہادیو سکوڑ کر دروازے کی طرف دیکھتا ہے]

دوبی آواز:۔ مہادیو! آخری دو بالکل دھیرا ہے،

مہادیو:۔ آزادی رات کو بھی چین نہیں دروازے کے پاس پہنچ کر تھکی گھبرائے، میں کون ہے اس وقت؟

بی آواز:۔ دیکھو! بلدیو!

مہادیو:۔ رات ہے، میں بلدیو! تم اس دروازہ کھولتا ہے،

دشمن لپٹے؟ دھڑک کر پیچھے ہٹتے ہوئے، آ... دھم

آواز میں، لپٹے...؟ یہ کیا...؟

بلدیو داخل ہوتا ہے، وہ پچیس برس کا نوجوان ہے، اس

باغ سے جھوٹا ہے۔

بلدیو :- نرم جو کر میں نے کہا تھا تو ہاں میں نے خون کر دیا اس  
س پانی کیسے کا میری بہن کو بری تخت دینے دے رہو  
چہاں ہے اکبر کا لغت آلودہ بن چکا ہوں بھپ  
کر آیا تھا جب رہا نے کی آنکھیں سو رہی تھیں اور صرف  
چار آنکھیں بگ - بی تھیں - وہ - شہزادہ کی اور دوسری  
اپنے دل کو سیاہ بے بی میں دراپنے دل کو سیاہ لباس میں آکر  
آئینہ دھجک کر اس طرح جھک رہا تھا میں نے ایک  
سی وہاں سے پورا بھکا دیا دیکھتے ہو یہ چھری اور کامیابی کے  
رنگ میں رنگے ہوئے یہ کیڑے !

دھبے پر فزادہ غور کی جھک :

مہادیو :- مٹھے سے تھپاری بہن کو بری نظر سے دیکھتا تھا وہ جہم  
لے چھری کہاں ہوئی :

بلدیو :- چھری اس کی بغل میں ہوں :

دھبہ میں جی کا دار کرنا ہے :

مہادیو :- بغل میں ؟ نادان آنکھوں میں جو تک دینی چاہت تھی تاکہ  
وہ گنگا کی آنکھیں دنیا کا زور دیکھ سکے جس آنکھوں میں گناہ  
کا خون تھا ان آنکھوں میں بہن کی بے عزتی کا خون ہونا چاہی  
تھا بھی انتقام لینا بھی نہ آیا : دھبہ تاجہ :

بلدیو :- (خندنی ہے) میں یہ بھی کر سکتا ہوں - مٹی - پیر  
جاتا ہوں - تیار ہوتا ہے :

مہادیو :- یہ غلط تو تم اس طرح کہہ رہے ہو جیسے وہ وہیں پڑا ہوگا  
پولیس نہ جانے اسے کب کا اٹھ لائی ہوئی

بلدیو :- پولیس کو وہ نہیں مل سکتا ! بس کہ میں اس کا بوڑ  
جوڑ کاٹ کر نہ چھینک دوں مجھے تو اس حاصل نہ ہوگا میں  
نے لاش چھپا رکھی ہے وہیں پس کی سب سے کشمیلی

جھاڑی میں

مہادیو :- لیکن اسے اب ! کہہ کر یہ کر دے گا - اب تو وہ کمینہ دہی  
گیا ہوگا - اب اسے مارنے سے حاصل :

بلدیو :- (برہمی سے) نہیں نہیں مجھے انتقام لینا ہی ہے وہ اس  
کی آنکھیں اب بھی کھلی ہوئی گریا اس کی شبوانی پیاس میں  
نہیں بجھی - کھنڈ تہی ! - تہا سے روکنے پر بھی میں شمالی  
دوا کے عید نے دروازے سے جاتا ہے عقب سے فقرے  
کی تکمیل کرتا ہے ، ضرور جلاؤ گا دل کی آگ آہستہ آہستہ  
دور ہوتی جاتی مہم آواز میں ، تو بھلا . . . سکون گا .

مہادیو :- کھڑکی کھول کر دیکھتا ہوا گیا - چلا گیا وہ پانی سنسار  
دہا دیو سوچا ہوا پلنگ پر مٹھا جاتا ہے جو بی دروازے پر  
پیر دستک ہوتی ہے :

مہادیو :- (دنبولہ سے) کون ہے ؟ (مضطرب ہو کر) میرے  
تہ - رات بھی دن ہے :

کھڑکی پر دستک ہوتی ہے :

مہادیو :- (دورازے کے نزدیک جا کر) کون ہے ؟ نام بتاؤ -  
آواز :- پولیس :

مہادیو :- پولیس ؟ پولیس کا اس وقت میرے یہاں کیا کام ؟  
آواز :- (زور سے) دروازہ کھولو :

مہادیو :- (دورازہ کھولتا ہے) پولیس انسپکٹر داخل ہوتا ہے  
وہ تیس برس کا ہونا نا زاد آدمی ہے ، بونٹیں چڑھی ہوئی ہیں  
اور پوری دردی میں چپے ہوئے ہے اس کے ہاتھ میں پستول  
ہے ، ساتھ چار سپاہی ہیں اور سب کے سب باوردی -

سپاہیوں کے ہاتھ میں بھالے ہیں :

پولیس انسپکٹر :- (آستہ جی) سارے ہتھیار رکھو -

(پستول سائے کرتا ہے)

مہادیو :- (چپے ہٹ کر) کیسے ہتھیار ؟ کس کے ہتھیار ؟  
انسپکٹر :- (دنگور تے ہوئے) اچھا تم اکیلے ہی ہو تمہارا نام  
مہادیو ہے ؟

مہادیو :- ہاں

انسپکٹر :- تمہارے گھر ابھی کوئی آدمی آیا تھا :

مہادیو :- شاید :

انسپکٹر:- شاید میں نے دوسرے دیکھا تھا۔ ایک آدمی۔ عین  
اُپر ہاتھ۔

مہادیو:- اس سے آدمی.... نہیں.... تھا۔  
انسپکٹر:- ٹو شیطان تھا؟

غور سے کرسی پر بیٹھا ہے

مہادیو:- نہیں، دیوتا۔ دیوتا غائب اپنی بہن کی عزت و عصمت  
کی حفاظت کرنے والا ایک دیوتا۔

انسپکٹر:- دیوتا؟ اس کے کیا معنی؟

مہادیو:- دیوتا کے کیا معنی ہوتے ہیں؟

انسپکٹر:- خاک پاؤں مار کر، بارہ اور دو بجے کے درمیان ایک

خون ہوا ہے خون کے دہے پڑے ہوئے پائے گئے ہیں

گشت کرتے وقت میرے جوتے خون سے لٹ پٹ ہو

گئے۔ میں اسی وقت، ایک آدمی اس گھر گھومتا ہوا ہوا نکلا

دیا، لاش کو شش کے، وجود نہیں ملی۔ نہ جانے وہ کہاں پر؟

مہادیو:- نہایت سکون سے، وہ انسان کے سوا اور کسی کا خون

نہیں ہو سکتا؟

انسپکٹر:- میں اسے انسان ہی کا خون کیوں نہ تسلیم کروں جب

وہ آدمی شکوک حالت میں، اسی رات کے وقت بھاگا

ہے۔ مجھے ابھی لاش کو تلاش کرنا ہے۔ یہ سوچ کر جب تک

میں لاش کی تلاش کروں، ناقص کہیں بھاگ ہی نہ جائے

میں پہلے اس آدمی کو پکڑ لینا چاہتا ہوں، پھر خواہ وہ گناہ

بی ثابت کیوں نہ ہو تجائیے۔ وہ آدمی کہاں ہے؟ اس کے

بارہ اور دو بجے کے درمیان خون کیا ہے، سوچ کر، ہاں

ٹھیک اسی وقت خون ہوا ہے۔

مہادیو:- بے خون ہے، ہوا کرے اس سے میرا کیا تعلق رہی ہوگی

میں، اسی خون کو میکس میج کیخت مسکرا لئے گی۔ اسی سرخی سے

ساری دنیا میں نور چھا جائے گا۔ وہی خون دنیا کے کونے

کونے میں زندگی کا پیام (صبح کی دکنش ہوا میں بکھیر دیا)۔

انسپکٹر:- وزیر لہجہ میں، یہ کیا بک ہے ہو، زندہ بنا کر، میرے زمان

سفس! جو کچھ دیکھتا ہوں ٹھیک ٹھیک بتاؤ! جو آدمی ابھی

ابھی یہاں آیا تھا۔ وہ کہاں گیا؟

مہادیو:- سوچتے ہوئے، وہ دس منٹ بعد آئے گا۔ ٹھیک دس

منٹ بعد، آپ اس وقت آئیے۔

انسپکٹر:- رطرت سے، آپ میرا پی کر کے مکان خالی کمرے میں کل

ن تا اس لوگوں کو، وہ خواہ اس منٹ میں آئے، خواہ اس میں

آپ سمجھے نا؟

(شان سے اٹھ کھڑا ہوا۔)

مہادیو:- کیا آپ کے پاس تلخی کا وارنٹ ہے؟

انسپکٹر:- غور سے، میرا حکم ہی وارنٹ ہے جناب۔

مہادیو:- سکون سے، آدمی رات کہتے یہ آپ کی زیادتی ہے

میرے پاس ہی تو ایک کمرہ ہے۔ جہاں تک آپ کی نظر جاتی

ہے، اتنا ہی حصہ میرے اختیار و تصرف میں ہے، اسی کو دیکھ

مجھے کہوں دکھائی دیتا ہے کوئی خونی؟

انسپکٹر:- بس تمہارے تصرف میں اتنی ہی جگہ ہے؟

مہادیو:- اس مکان میں صرف اتنا ہی حصہ بچ رہا ہے، باقی کر گیا

ہے، اسے چھپے میدان ہے۔

انسپکٹر:- نرم ہو کر، دیکھو اگر تم اصل حقیقت بتا دو گے، تو بھائی

انعام پاؤ گے۔ سمجھے؟ وہ نہ سمجھ میں میں نہیں کو گرتا کر لو گنا

مہادیو:- آگے بڑھ کر، خوشی سے گرتا کر دیکھتے ہیں آپ۔ لیکن

میں دھرم کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں بالکل بے گناہ ہوں

انسپکٹر:- میں دھرم ورم کچھ نہیں جانتا۔ سچ بتاؤ، تم خونی کے

بارے میں کہا جاتے ہو؟

(مہادیو کو تیز نگاہ سے دیکھتا ہے)

مہادیو:- جانتے سے، کہہ رہا ہوں آپ دس منٹ بعد آئیے

دو بج کر چالیس منٹ پر

(گھڑی کی طرف دیکھتا ہے)

انسپکٹر:- اور اگر میں دس منٹ میں نہیں ٹھہروں تو؟

مہادیو:- (سوچ کر) تو شاید وہ نہ آئے۔

انسپکٹر :- کیوں؟

تجسس آمیز نگاہ اور حرا (دھڑلانا ہے)

مہادیو :- پولیس اور خونی میں کتے اور بلی کا تعلق ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا کرتے ہیں۔

انسپکٹر :- مسکرا کر ایسوزنگ نان سنس! اچھا میں تمہاری تلاؤں دس منٹ بعد لوں گا رہا میوں سے دیکھو اس مکان کو چاروں طرف سے خیر لو میں اس عرصہ میں لاش کا پتہ لگاتا ہوں بس سے میرا شک رفع ہو جائے میں بھی آتا ہوں۔

سپی ۔۔ سلام کر کے بہت اچھا۔

جاتے ہیں!

انسپکٹر ۔۔ (ظلم) اچھا آپ دس منٹ آرام کر سکتے ہیں۔

انسپکٹر جاتا ہے مہادیو دروازہ بند کر لیتا ہے کچھ دیر منیر

کے نزدیک سر جھانک کھڑا رہتا ہے شمالی دروازے

تے آواز آتی ہے۔ مہادیو آہستہ سے جا کر دروازہ کھولتا

ہے۔ مہادیو داخل ہوتا ہے۔ اب اس کے کپڑے پھلتے

بھی زیادہ خون میں شرابور ہیں!

مہادیو :- اس سرت آمیز لہجے میں، پار ہو گئی، چھری دونوں آنکھوں

کے پار ہو گئی، اب شاید دوسرے جنم میں وہ کسی کو بری طرح

سے نہ دیکھے۔

مہادیو :- سنجیدہ ہو کر، ممکن ہے آئندہ جنم میں وہ اندھا ہو گناہ

آلود نظر سے دیکھتا کیسا؟

مہادیو :- رات ہی خیالات میں خواہ مخواہ پھاڑ کر، اوہ! خون

سے تمام زمین سرخ ہو گئی تھی گرامیر سے اس کام کو دیکھ

کر وہ بھی کھلکھلا اٹھی تھی۔ میں بھی دل کھول کر ہنستا ہوں

منہ بنا کر ہنستا ہے!

مہادیو :- رنجیدہ گی سے، اسی مسترت سے سرخ ہو کر کل صبح

سورج ہنسنے لگا۔ گلاب بننے لگا۔ اور اس کے ساتھ ہی تھ

کلیاں بھی..... ہاں ایک کام کرو۔

مہادیو :- (اشتیاق سے) کیا؟

مہادیو :- یہ فتح کے رنگ میں رنگے ہوئے کپڑے تانہ دوڑھٹا

سے نئے کپڑے نکالتے ہوئے، یہ لوٹنے کپڑے انہیں پہن

لو اس دنیا کی ہلکوں میں شک کی پتلیاں ہیں۔

مہادیو :- (دلبری سے) رہنے دو! اس کا جواب میں اپنے گلے کے

خون سے دوڑھٹا

مہادیو :- (ازمنے) انسان لڑنے والے دشمن کو اپنے گلے کے خون

سے جواب دینا چاہیے۔ مگر یہ انسان کی جنگ نہیں تھی

خواہ کتنے ہی بڑے گنہگار کے، انسان کے پیش نظر خون کیا

ہو، لیکن جان لینے کے باعث تمہیں کچھ نہ کچھ سزا ملے گی غور

چاہیے تو یہ تھا کہ منصف تمہیں تمہا سے اس طریقہ فعل پر

انعام دیتا، لیکن کیا کبھی ایسا ہوا ممکن ہے؟

مہادیو :- (سوچ کر، اچھا، تم (تیس) آواز دے ہوئے، نہ مانو گے تمہاری

فصد بڑی سخت ہے۔ اب تو رخی تیس چھینے ہوئے، تم خوش

ہوئے!

مہادیو :- (توڑی دیر آرام کرو۔ دس منٹ تک رکھ سوچ کر، نہیں

دس منٹ تک کیا کرو گے؟ جاؤ اپنی بہن کی خبر لو۔

مہادیو :- (دیر سکون بعد میں) وہ تو اپنی ماما کے پریم کی مانند خاموش

اور معطر دنیا میں گلگشت کر رہی ہے، میں اسے آرام اور سکون

کے اس چٹے سے نکال کر بیداری کے چھریوں پھینک دوں!

صبح سورج کی کرنیں اسے خود ہی جگا دیں گی!

مہادیو :- نہیں! بھائی کے ہاتھ سورج کی کرنوں سے زیادہ نرم و

پریم بھرے ہیں۔ ہاں تاکسی داس نے حقیقی بھائی کے بارے

میں کیا لکھا ہے؟

مہادیو :- (حیرت سے) تو کیا مجھے ٹھہرنے نہ دو گے؟

مہادیو :- بھائی یہاں ٹھہرنے کی بجائے بس کی خیریت معلوم کرنا تھا

خود ہی ہے۔ جس بہن کی عزت و حرمت کی قیمت ایک انسانی

جان سے زیادہ ہے۔ اس کی خیریت معلوم کرنے کے بارے میں

اتنی بے پروائی کیوں ہو؟ اس سے ملنے کے بعد پھر تم یہاں

اگر مجھ سے باتیں کر سکتے ہو۔

جہاد یو:- خون آلود کپڑے اور چمڑی... کراٹھاتے ہوئے اچھا  
بھائی! جاتا ہوں، تھوڑی دیر بعد آؤنگا۔ اگر پولیس کو میری  
خونینہ پیٹی تو.....!

جہاد یو:- تجھے آئینے لیے ہیں، یہ کپڑے اور چمڑی کہیں لئے جاتے  
ہو؟ بہن کے پاس ان کا کیا کام؟  
جہاد یو:- شکستہ ولی جوکر، تم میری خواہش ہمیشہ اسی طرح رد  
کر دیا کرتے ہو۔

رہا دیو ایک کونے میں کپڑے اور چمڑی رکھ کر شمالی دروازے  
سے باہر چلا جاتا ہے،

جہاد یو:- سوچو! یہ.....

اگر سی پریکٹر گنگنا ہے،

میری سانسوں کی آواز میں

گو نچے میرا اشار

گو نچے میرا اشار

جذبی دروازے پر دستک،

جیون رچر دستک، میں.....

جہاد یو:- ٹھہرو!

اخن آلود کپڑے پہنکر ہاتھ میں چمڑی لے لیتا ہے دروازے

کھنٹے ہوئے،

کون ہے؟

انسپیکٹر پستول لئے ہوئے داخل ہوتا ہے،

انسپیکٹر:- خونی کدھر ہے؟ دہادیو کو خون آلود کپڑوں میں دیکھو

ایں..... خونی.....

جہاد یو:- (استغما مسکتے) میں ہوں خونی۔

انسپیکٹر:- تم جو خونی ہو حیرت سے اسکی طرف دیکھتا ہے، سپاہیوں

نے ابھی تمہارے کمرے میں کچھ باتوں کی بینک سنی تھی۔

جہاد یو:- میں گارہ تھا۔

انسپیکٹر:- ہوں رگھو رتا ہے، تم خونی ہو!

جہاد یو:- دیکھتے نہیں یہ کپڑے اور چمڑی!

انسپیکٹر:- کیا تمہیں خونی ہو؟ تم تو کہتے تھے، دس منٹ بعد  
خونی آئے گا۔

جہاد یو:- ہاں، دس منٹ بعد تمہیں خونی ملا یا نہیں؟ خونی تمہارے  
سامنے کھڑا ہے اور تم شک و شبہ میں گرفتار ہو۔ لاش  
دیکھی؟ اس کی بغض اور آنکھوں میں زخم ہے۔

(تیز نگاہ ڈالتا ہے)

انسپیکٹر:- سر ہلاتے ہوئے، ہاں پاس ہی ایک کانٹے دار جہابی

میں دس بجی طرح گھائل لی ہے، اس کی آنکھیں پھوڑولی

گئی ہیں اور اسکی بغض میں چمڑی گھونپ دی گئی ہے۔

جہاد یو:- آگے بڑھ کر، اور وہ چمڑی یہ ہے

(چمڑی دکھاتا ہے)

انسپیکٹر:- سپاہیوں سے گرفتار کرواؤ۔ اور پولیس تھانے لے چلو

اس کے مکان میں تالا ڈالو۔ اس کے کوئی رشتہ دار تو ہیں منس

تھانے جا کر معاملہ طے ہوگا

(سپاہی جہاد یو کو گرفتار کر لیتے ہیں۔ جذبی دروازے سے

آواز آتی ہے:-)

جہاد یو:- آہستہ ہے میں، جہاد یو!

انسپیکٹر:- تیزی سے آؤن جے؟

(باہر سے، اسکا دوست بلدیو

رہا ہرے آہستہ آواز، اس کے دوست کی بہن واسنتی

انسپیکٹر:- (زور سے) اسوقت جہاد یو کسی سے نہیں مل سکتا۔ وہ

خونی ہے۔ سپاہیوں سے، جیلو جلدی

(سب جاتے ہیں)

(باہر آہستہ لہجے میں جہاد یو کا نام

خاموشی میں گونجتا ہے۔)

(پھر وہ)

ادب لطیف کے ڈرامہ نمبر کا مطالعہ برسوں آپ کے دل و دماغ میں اپنی یاد تازہ رکھے گا۔



جناب احیدر حنین سیکوٹی

# لطف زلیست



خروش و پنچہ و دند ان شیرِ زر کی قسم  
تگاہ باز کی اور اس کے بال و پر کی قسم  
شہیدِ لذت کردار کے جگر کی قسم

بغیر حراتِ پیماک لطفِ زلیست نہیں

فلک کی انجمنِ شب کے نور کی سوگند  
ضیا بر شمس و قمر کے ظہور کی سوگند  
درون سینہ کے سینا و بلور کی سوگند

بغیر دیدہ اوراک لطفِ زلیست نہیں

لہ موجِ کاستارہ

یہ شبِ نیم

قسم ہے اس کی کہ ہے جس کا نام نجمِ سحر  
قسم ہے اس کی کہ نازک ترین ہے جو گوہر  
قسم ہے اس کی جو ہے عندلیب کا دلبر

بغیر دامنِ صدچاک لطفِ زلیست نہیں

سرورِ نعمتہ جانسوزِ ساز کی سوگند  
جنونِ نچتہ مجوئیے راز کی سوگند  
کسی کے ناز کی اپنے نیاز کی سوگند

اتیں بغیر دلِ پاک لطفِ زلیست نہیں

جذاب مسعود جاوید

# ”نگہت“ کے خط

پروین ہزاری!

کتنے عرصے کے بعد تمہارے جو میں جنس پیدا ہوئی ہے! —  
 براہین! کیا میری تباہی جذبات کے لئے ناقابل برداشت حقیقت  
 کافی نہیں کہ میں مر رہی ہوں۔ — پھر اگر تم ہی اس اوجہ میں صاف  
 کرو گے تو میرے دل کو کونسا فسوس اس پر پہنچے سے رہ جائے گا،  
 دیکھو! یوں ستایا نہ کرو اور پھر میرے صبر و ضبط کو ناپاؤں کہنے کا حق  
 بھی تمہیں نہ رہے گا:

تمہاری مصحوم و محبت دینے پر میری نظروں کے سامنے ہے۔  
 محسوس ہوتا ہے کہ جیسے گائیڈ گڈ زمانہ مجھے دایں مل رہا ہے خدا کے  
 واسطے اگر یہ احساس صرف غریب تنہا بھی ہو تو بھی اسے شہد تیری  
 بنائے جاؤ کیونکہ شعور جان کے ساتھ ساتھ ہی مجھے بالکل یہ معلوم ہوتا  
 ہے جیسے کوئی میرا گلاب چلا جاتا ہے۔

میری حالت کیا پوچھتی ہو پروین! — یو چھپنے کا وقت تو  
 کہیں کھو گیا۔ اب تو بلا پوچھنے رہے۔ اور روٹ جانے کا زور  
 ہے۔ آنکھ میں ذرہ در ذرہ گر جانے سے جو کربا دینے پائی ہوئی ہے  
 وہ مستقل طور پر میری روح میں سما گئی ہے، رنگ دم دموں سے  
 شہد و رخ ہو کر ایک خاص بلندی تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور اس بلندی  
 سے پھر خاموشی کی لہر ڈھلکتے چلے آتے ہیں لیکن میری زندگی کا  
 الم انگیز راگ سکوت سے دور ہی ہٹا چلا جاتا ہے کون جانے کہ  
 کہ جہان کی طرف رجوع ہو گیا یا نہیں؟

میں گھبرا گئی ہوں پروین! — گھبرا گئی ہوں۔ ان ہلنگ ہلنگ  
 سے: — کاش کوئی بنا سکتا کہ اگر عظمت آسب مشرق کی ایک  
 مصحوم و جاہل ست بی، زندگی کے ان مختصر طوفانوں میں گھر جانے  
 جن کو مد کے کی موت وہ استعمال نہ کر سکے ہی پر مجبور ہے۔ تو وہ کس

طرح دوست! کہ تمہیں میں سونے نہ مل کرے،

نہایتی دھمک: — میں بن کر سن کی طرح: — یہ  
 کیسے نہیں سے ہوئی پروین! — اگر نے یہ الفاظ شک و شبہ کی  
 حالت میں نہ کہے ہوتے تو یقین کرو مجھے تمہاری حسیات کی زندگی پر  
 بھی شک ہو جاتا۔ تم کیا جانتی تھی یہ کہ کیا جان لیا ہے!!  
 رات وہ سے تھے گھر۔ نہ معلوم کتنی طویل جھپٹاؤں راتوں کو  
 بعد۔ — بارہن چٹے تھے۔ یہاں جو فرما۔ کاملاً لکھ کر رہی تھی انکے  
 پاؤں تھے، ہٹ کر۔ — داغ سے چلے۔ اول بیان جاتا ہے، سینے  
 میں دھمک سے جو گیا، اور یہ اختیار بجا رکھ دی لطیف بے صنی ہی  
 محسوس ہوتی جو کہ اول مرتبہ انکے پاؤں کی آہستہ سے پھوٹی تھی خدا  
 گمبھی کی سوچی تھی، میں نے، مذکورہ روزہ کھول دی۔ وہ اندر آئے تو میں  
 نے سلام کیا۔ زحوم سے صدمہ کے بعد اٹھ بیٹوں پر سلام کا جواب  
 ایک خفیف تھک کے ماتہ، انوار ہوا میری کیفیت نہ پوچھو کیا تھی  
 — بھی مائی تیرا سوچوں میں کسی بھی سی بنی کو تھکھڑا سے دیکھا ہے  
 تم نے،

انہوں نے سنا، ایک! — میں کچھ بھلا کی۔ — دو بھر۔ پھر وہ  
 سوئے۔ — دیکھا رہیں تو پاؤں سے سسل سسل کر بچا نا اسی چیز کو کہتے  
 ہیں پروین۔

چراغی۔ تین تو بہت سی گزری ہیں بھر۔ — تم کہا تک سونو گی  
 — بیٹے کے بعد میری تباہیوں کو صرف وہ انیس ٹے ہیں۔ کتاب  
 اور تار: — اور ان دنوں کی شکایاتوں نے کالی کالی راتوں  
 میں ہمیشہ میری بیداریوں کا ساتھ دیا ہے۔ — آہ سکھی! اب تو یہ سہل  
 زندگی ہی ایک جھپٹاؤں رات ہے جسے جاگ جاگ کر کاٹنا  
 ہے کاش سوسائٹی کی آنکھیں ستارے بن کر میرے سکرات کو دیکھ

ان پر شمار ہو چکیں، اسی طرح میں بھی آہستہ آہستہ اپنی زندگی کی مقب  
بہاریں قربان کر رہی ہوں — آہ:

یہی سکنا مگر جینا — نہ سکنا مگر مرنے!

یہی ہے داستانِ دل یہی ہے داستانِ میری

مگر میں نے ارادہ کر لیا ہے پروا دیں، کہ اپنی تقدیر سے زور آزمائی  
کر دوں گی آخری دم تک — سوچنا ہے کہ میری حسیات کی تشنگان  
کے دل تک کب تک نہیں پہنچتی اگر میں اس جدوجہد میں ختم  
ہو گئی تو سمجھ لیں، کہ تمہاری بربادِ محبت کا میاں رہی، اور کئی مینا  
کا دلگدازِ ثبوتِ خواتین کے آئینہ ہو گئے!

پیارے جملہ خدا کرے تم اچھی ہو اور جواب جلد دو۔

سوگوار حیات

ننگھت

جان ننگھت:

تعمیر سے شاید تمہیں تکلیف ہوئی ہو پروا دیں! — مگر  
میں مجبور تھی — اچھا معاف کرو — اس قدر تمہارے اشکوں کے  
لے میرا انسان بہت مختصر ہو گا۔ لیکن ... مگر اسی کو کسی رسالہ میں  
شائع کر دیا جائے۔ تو سماج انہی ستم فرانیوں پر اپنا سر پٹ لے گا!  
کئی دن سے مجھے بخار تھا۔ — بخار سے مجھے کوئی تکلیف نہیں  
ہوتی، بشرطیکہ شدید بھی ہو کہ نہ اس صورت میں میرے شوخی اس  
معطل سے ہو جاتے ہیں۔ اور مجھے اپنی آہ و کراہ کو بھول جانے کا  
موقع مل جاتا ہے۔

رات بخار بہت شدید تھا، اور میں نیم بے ہوشی کے عالم میں  
ننگاروں کے بستر پر پڑی تھی۔ رات بڑی بھیا تک تھی۔ بارش  
زوروں سے ہو رہی تھی، اور بجلی کی کڑک سے دل سہا جاتا تھا!  
کوئی دو بجے کا وقت تھا۔

خادمہ بے چاری میرے پاس بیٹھی بیٹھی کافی خستہ ہو چکی تھی،  
میں نے اسے سونے کی اجازت دے دی تھی، اب — دوسری  
طرف وہ اپنا لمبا کرتا آٹا کے خزانے رہے تھے۔

سکتیں۔

میں یہ مگر نہیں جانتی تھی کہ انکی حادث میں کوئی اخلاقی عیب  
تھا۔ وہ نیک ہیں — پورے پورے نیک — میری آزمائشوں  
پر کسی کوئی پابندی عائد نہیں کرتے اور مادوں ضرورتوں میں کبھی بھی پابندی  
و مجبور نہیں رہتے، لیکن بہت سے غلوں سے جالے کا صدی بچو  
نہیں ہو سکتا۔ — مگر ایک زندگی کے مفہوم میں نہ کیا سنا  
کا پہلو بھی تو نظر انداز کر سکتا۔ ان کے اور میرے مذاق میں  
بعد اشتراک ہی ہے — اتنی دور میری فطرت یکے پر یکا نہ ہی ہے۔  
— لیکن انہا نیک کا غلغلہ اگر مشترک ہو تو پروا دیں اسی کے لئے عورت  
جنت سے بھی روگردانی کی جرأت کر سکتی ہے۔

ان نیکوں کی جیسے کے احساس سے پہلے ہی مجھے اس  
رومانی نشہ کا علم تھا لیکن جب سوسائٹی "و خاندان کی ہمنوائی  
نشریہ" یا جی رہنے لگے تو لڑکی مر سکتی ہے، نیکو بنی نہیں سکتی یہ  
انکا امتیاز ہے اور بات فطری — میری نیکوں کے سامنے وہ  
نات اب تک روشن تاروں کی طرح موجود ہیں جب میری  
زبان کی سموائی حرات میرے قفل کو تبدیل کر سکتی تھی میں بہن  
بنی ہو ذرا ہی سہلیوں کے شہم حلقے میں بھیجی تھی تمام طریق تھی  
کا شور و غل پر پائین میں بی بی ماں و جد مجھے سے چپ چپ کر  
رو رہی تھیں — پھر کیا یک وہ اہم اور انتہائی اہم آپ بچا چھوڑا  
نہ کرے کہ کسی عورت کی زندگی میں بخار آئے — میری سہری کے  
برابر مگر کسی نے نہایت ہی جرات حد کی سچ مانو پروا اس وقت  
ایک یر و زانیہ میرے دل سے تڑپ کر کہوں تک، لیکن مسلم  
دو شیزہ کی فطرت نے مجھ سے کہہ نہ دان، بہ بونے کا وقت نہیں  
رہنائے والدین پر تہ تسلیم کر دینا ہی سرفرازی ہے! — زبان کو  
حرکت نہ ہوئی اور علوم نہیں میرے قریب سے کس نے وہ سب کچھ  
کہہ دیا جو بادل ناخداستہ مجھے کہنا چاہئے تھا۔

اس بات کو آج دو سال سے زائد ہو گئے — اور نہیں کیا  
تباؤں کہ اتنی مدت تک بون چپکے چپکے سینگے رہنے کے بعد اب میری  
فاکتر حیات میں کیا رہا ہے جس طرح مجھ سے پہلے میری دو بہنیں



اور اس آگ میں چپکے پیچھے ہی سلگ کر رہ کر جو عاویں لیکن نہادی  
نمگساروں اور لطافت پاشیوں کے غلوں سے میرے عزم مستقل  
کو کھپاؤش و فی اور تھے سیکم کرنا پڑا نہ نہ یہی محبت کر نیویں بستی کو  
کو جھوٹا میرے بس کی بات نہیں

اگر مجھے رہتے ہوتے دیکھ کر رونے میں نہیں کچھ اذیت  
نہیں ہوتی نو پردین آؤں تہیں خوب خوب رہاؤں، اشک  
میری کی تمام توفیق پہنچ کرے اور سب کچھ نہا کر آنکھوں سے بہاؤ  
کیوں کہ شاید اسی طعن نہیں میں طور پر اس چوک اندازہ ہو سکے گا۔  
تھے کھلے کا خون دھوا لگتے ہیں۔

آج سے پہلے تو تھے مجھے میں رنگ میں دیکھا تھا وہ اب  
باقی نہیں رہا۔ میں وہ سب کچھ کر چکا۔ جو ایک شریف لڑکی ہے شریف  
حیات کے جذبات وہ ساری ساری یاد دہانی کے لئے کر سکتی ہے  
لیکن جس مرتبہ کے برس، تہہ کی مدت پر نہیں کیا جاتی  
اسی عین ان کی نمود بردار سبب، ان بھی پہلے سیدہ بے نیاز حیات  
نظر آتی ہے میں تھک گئی ہوں پردین اور میں ساری تجربہ کی توفیق  
بھی بے جان ہو کر گر پڑی ہیں۔۔۔ پھر اب میں نے کیا سوچا ہے؟  
ہاں سوچ لیا ہے اور وہ تھوڑے تھوڑے خواب میں میری بوجھا ہوگا آؤ  
تمہیں بتا دوں وہ چیز بھی جو میں تہذیب نہ پاتا تھی، تمہارے اس عزم  
کی مخالفت کر دیا موافقت، مجھے پروا نہیں۔۔۔ مجھے کسی کی پروا  
نہیں اب پردین!

دسم و روایت کے ذریعے اثرات سے اپنے دماغ کو یک  
لحے کے لئے آزاد کرنا اور سنو۔۔۔ میرے اگلوں کی حال ستاں  
ناوک اندازوں سے تنگ آکر ایک مجروح شریف کیا کیا کرتی ہے؟  
ایک گریہ میں کسی تہذیب کے دشمنی میں ہوس کر کے فوج  
کرنا چاہو تو اس وقت وہ کیا کرتی ہے؟ کیا کرنے پر مجبور ہوتی ہو  
بس سوچ لو وہی عزم آزمی میں نے کر لیا ہے، اب اس نیا نش و  
برساری میں جہن شوق کو خاکس بنائے رکھا اب یہی جہی ہوئی  
گردن جذبات انتقام کی تمام خود سے کوئے ہوئے پر ہو گئی ہے۔  
اب تنگ آنکھوں کی طرح دیکھتی ہیں، سب شلوں کی طرح جھک

اٹھنا چاہتی ہوں، کبھی تنہا تھی اور زبردست تنہا کر انہی حیات  
کی تاریکی میں گر ہو سکے تو چاند کی خاک دسین کرنیں چرا کر متع کو  
انہی ذہنیت میں ایک سبک چپک پیدا کر کے وسیع گردوں لیکن  
اب یہ سب کچھ نہیں۔۔۔ اب میں سی پڑ کر کھوکھلا ہوا ہوں پاش کر  
دہنا چاہتی ہوں۔۔۔ محبت کی توفیق شکست پا چکی ہیں۔۔۔ اب  
انتقام کی باری ہے۔۔۔ انتقام!۔۔۔ انتقام ان سے نہیں۔  
بلکہ سوسائتی سے۔۔۔ اندھی اور ظالم سوسائتی کے اندھے اور  
ظالم اصولوں سے!۔۔۔ تم میرا سیدہ کیوں ہوتی ہو پردین۔۔۔  
مجھے مجرم سمجھتی ہو گی تم؟۔۔۔ آہ کتنی نہیں معلوم نہیں کہ اس سائتی  
کے دیونے کتنی بے گناہ ستیوں کو اپنے خونخوار جبروں میں مسل فلالت  
اور ہنوز اس کی تشنگی کو تسکین نہیں ہوتی، سب کو دل معصوم رہے گناہ  
لڑکیاں اس خونی گتھی میں پوری پوری میری مدد کے ساتھ ہی جا رہی  
ہیں، انکی بڈیاں جھج جھج کر کے چور چور ہو رہی ہیں، ان کی زندگی  
کا فوجیان خون فوارے کی طرح بلند ہو رہا ہے۔ اور ان کے اعضا میں  
پس کر گوشت کے گھنٹانے کو تھڑوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ لیکن  
اس گتھی کو چلانے والے قہرانی ہاتھ پوری قوت کے ساتھ اس  
خونچکاں شمس میں شہک میں اور اس مذہب دنیا کے مذہب بھڑوٹا  
میں کوئی اتنی جرات انسانیت نہیں رکھتا کہ اس قتل عام کیخلاف  
اجتہاد آواز۔۔۔ انھیں ایک خوف انگیز صبح ہی بلند کرے میں  
پوچھتی ہوں تہذیب و آزادی کے علمبرداروں سے کہ کیا ان کے تمام  
بلند بانس و عاویں میں اس قتل کا دروازہ بند کرنے کا کوئی پروگرام  
ہے؟ میں سوال کرنا چاہتی ہوں مذہب ملت کے رہنماؤں سے  
کہ کیا ان کے اصولوں میں اس قہرمانیت کے خلاف کوئی توبہ کا

نہیں ۹۹

تم جانتی نہیں پردین:۔۔۔ سارے مذہب شہکا۔۔۔ پہلے  
دوست کی منافقت و خود غرضی کی پردیش کے ذرائع ہیں۔۔۔ رونے  
جب کبھی مذہب ظلم کے خلاف کچھ کرنا چاہا ہے تو اسی قسم کے  
رنگین مجاہدات کا سہارا دھونڈا ہے۔۔۔ تہذیب نام نہاس  
جواب نفس پردی کا جسمیں ہر غیر فطری اور خود غرضانہ حرکت کو

کسی طرح کوئی گندے کمرے کے سماج کے خون آشام و رعد! —  
انسانیت کی شرم کرہ ورنہ دن بھی قریب ہے کہ ہم مقتولوں کا  
خون رنگ لائے گا اور فطرت کا سنگین انتقام تم پر نازل ہوگا۔  
خطاطوں ہو گیا — جس نے جانے کیا کیا لکھی۔ کیا کروں سبھی یہ  
سیلاب روم کے نہیں رکنا۔ بجایا کیا اسی پر باؤ نگہت کا سلام کہہ دینا!  
تمہارے جواب کی منتظر ہوں۔

تمہاری دھمکی  
نگہت

پیاری پرویں!

مکتوب محبت زینت نظر ہوا۔ — واقعی تم نے خوشی  
واؤنگساری دی ہے اس ایک ہفتے میں نہ معلوم کتنی بار اسے پڑھ  
چکی ہوں صرت اس نے کہ رونے کا اور کوئی ذریعہ میسر نہ تھا۔ تم  
شعوب ہوگی کہ یہ کیا لکھ رہی ہوں — مگر تم تعجب نہ کرو سبھی پہلے  
مجھے اپنی خیر کتبیں دیکھ دیکھ کر صدمہ ہوتا تھا، لیکن میری ذہنیت کے  
ساتھ ساتھ جس کا تذکرہ پہلے خط میں کر چکی ہوں یہ چیز بھی باقی نہیں  
رہی اب انکی باتیں دیکھتی ہوں اور نفرت و حقارت سے ہنسی  
ہوں۔ جتنا ہنسی میں اتنی ہی یہ نفرت بڑھتی جاتی ہے۔ پھر  
مرہ یہ ہے کہ وہ اس نفرت کو بھی محسوس نہیں کرتے۔ اس ہنسنے  
کو رونا سمجھ لو یا کچھ اور۔ — بہر حال اب تو ہنسنا ہے اور  
اسی تم کا۔ — تم میرے ساتھ بہت کچھ رہ چکی ہو۔ — اذ اب  
میرے ساتھ کچھ نہ رہیں گی۔

رات وہ کوئی دس بجے مکان آئے۔ میں حسب معمول کتاب  
پڑھ رہی تھی دروازے میں قدم رکھنے کے بعد اولین کام انہوں  
یہ کیا کر کرنا مار ڈالا۔ اور دوسرا یہ کہ — ”کھانا دینا دینی؟“  
میں کتاب پڑھتی رہی۔ ملازم نے کھانا ان کے سامنے رکھ دیا  
انہوں نے بلا پس و پیش تنہا اپنے کام و دہن کی خاطر داری  
شروع کر دی اور کوئی نصیحت کئے بغیر دوسرے دوسرے خان میں حیر  
واسطے اللہ اور اللہ کے رسول کا نام چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

جوان کا اباس مل جاتا ہے — آنا دی کا مقصد ہے اپنے کام  
دوسرے دفن کے ذرائع تسکین کو مہیا کرنے میں کوئی رکاوٹ پیدا  
ہونے دینا۔ عورت ہمیشہ ان مظالم کے ہاتھوں ستائی گئی ہے  
اسے آزاد دی بخشی نہ سوسائٹی نے اپنے خود ساختہ اور روایتی اصولوں  
کے ذریعہ اسے سلب کر لیا، آج ہندوستان کے طول و عرض میں  
کتنی ایسی لڑکیاں ہیں جن کی ازدواجی زندگی کی تعمیر میں خود انکی  
مٹا اور بڑے کا کوئی دخل ہے؟ — والدین سماج کے خوف سے  
بجور ہر صرف حسب و نسب اور دولت و ثروت کے لئے اپنی  
لاڈلی اولاد کو اس شرمناک قربان گاہ پر بے دریغ ذبح کر رہے  
ہیں۔ انکی ذہنیت میں یہ چیز ہے ہی نہیں کہ شادی صرت امیدوار  
جائز ہو سکتی ہے جب طرفین میں محبت اور اگر محبت نہیں تو موافقت  
نہ ہو۔ اسی چیز سے آگاہ ہونے کیلئے مذہب نے یہ طریقہ بتایا تھا کہ  
طرفین سے رائے مل جائے لیکن ہماری اندھی سوسائٹی اس کا کبھی  
خیال بھی نہیں کرتی میں یہ نہیں کہتی کہ شادی سے پہلے طرفین  
کو کورٹ شپ کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ — میرا یہ مقصد مگر  
نہیں میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ جن کی شادی ہو ان سے ہی رائے  
طلب کی جائے اور پھر والدین اپنے وسیع تر تجربے کی بنا پر اس رائے  
پر تنقید و تبصرہ کر کے ایک موافق یا مخالف فیصلہ پہنچیں۔ تم ہی کہہ دو  
اگر تمہارے دانشمند ماں باپ اس چیز کو نہ نظر نہ رکھتے تو کیا پر دین  
تمہاری ازدواجی زندگی اس قدر سرد و گرم ہو سکتی تھی؟ —  
سکو بھی چھوڑ دو۔ — کم از کم اتنا ہی خیال رکھا جائے کہ جن لوگوں  
میں آئیں میں نفرت ہو ان کو تنہا ہی نہ باریک رشتہ میں شمل  
نہ کیا جائے۔ — مگر آہ یہ سب کچھ یہاں تو کہہ رہی ہوں۔ —  
— کچھ جاؤں — وہاں کون سنتا ہے! سوسائٹی کے ہنگاموں  
میں درد و کراہ کی ان جھونکوں کا کوئی گزند نہیں۔ ہم چلاتے چلاتے اپنے  
چیمپڑوں کا خون کر دیں تب بھی سوسائٹی کی غلام دہی اپنی طرح  
پسند نظروں کو اصرار اٹھائے گی۔ پرویں میری رنگ میں میں  
و غضب کا انتہا سیماب کی طرح تڑپ رہا ہے۔ اگر مجھ میں قدرت  
ہوتی تو اس پورے عشرت کے کو زلزلہ بن کر سما کر دیتی کاش

میں بولی۔ شادی کی صحت و جواز کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ محبت پر مبنی ہو۔

یہ سن کر وہ چپ سے ہو رہے پانہ ان کے پاس گئے اور پانہ بناتے ہوئے ذرا بصیرت افزہ انداز میں فرمایا کہ تم انگریزی کی کتابیں نہ پڑھا کرو، ورنہ خیالات خراب ہو جائیں گے؟

میں نے کہا: خیالات خراب ہو جائیں گے، یعنی ابھی تک سبب خیالات خراب نہیں ہوئے۔ پھر جب اتنی مدت تک انگریزی کی کتابوں نے صحت خیالات کو نقصان نہیں پہنچایا، تو آئندہ کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟

انہوں نے کچھ جواب نہ دیا صرف یہ کہہ کر رہ گئے: منطق میں نے جیسی نہیں؟

میں نے پوچھا: یہ آپ نے پڑھا کیا ہے؟

ذرا تنک کر بولے: پڑھتے کیا۔ یہی اردو فارسی پڑھی ہے میں زور سے ہنس پڑی۔ نفرت کے پورے جذبات کیساتھ۔ مگر وہ

کہ انہی لطافت مہراج کی دودھ رہی ہوں۔ انہی زندگی کا یہ پہلو تم نے نہ دیکھا ہو گا اب تک۔ میں نے بھی اس کو آج سے پہلے اس

زادہ نظر سے نہ دیکھا تھا۔ پہلے میں ان چیزوں کو دیکھ کر اپنا خون جلتا ہوا محسوس کرتی تھی اور روتی تھی۔ اب ان چیزوں کو اپنے جذبہ بغیر

و اشکرہ کا کھلونہ سمجھتی ہوں اور ہنستی ہوں۔ یہ بھی میرے انتقام کا ایک پہلو کیا اچھا ہو کہ تم کچھ دنوں کو میرے پاس آ جاؤ اور محاکات و تقریر کے

اس تصادم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر میرے ساتھ ساتھ مسلح کے زخم معاملہ اندیشی کا منہ کھلاؤ۔

تمہاری دوست — نگہت

— پھر میٹھ گئے اور پانی پی کر ایک بلند بانگ و کاری میں سب کچھ لکھیں۔ دیکھ رہی تھی۔ اب انہوں نے ادھر ادھر

تقریریں دوڑائیں۔ کبھی باورچی خانہ کی طوطی تو کبھی الماریوں کی طوطی کچھ دیر سوچا اور چور ڈھنچکی انداز میں اٹھا ہوا، نہ معلوم کس سے کہ

— اسے بھی — وہ پانا گڑ کہاں ہے؟

میں نے کہا: — نہ کیا ہو گا اس موسم میں؟

انہوں نے فی البدیہہ فرمایا: — ذرا منہ میٹھا کرنا تھا؟

پانہ نے منہ میٹھا کر لیا۔ منہ چلاتے ہوئے میری طرف آنے لگا۔ کیا پڑھ رہی ہو جی تم؟ — دیکھیں تو۔

میں نے کتاب ان کے ہاتھوں پر ڈال دی۔ دیکھتے ہی بولے: — اسے بھی؟ — تو انگریزی کی کتاب ہے۔ ہماری سبج میں کیا خاک آئے گی۔ — میں نے فوراً پوچھا: — اچھا، دو کی کسی کتاب کا نام

بتائیے جو آپ کی سبج میں آگئی ہو؟

وہ مفکرانہ انداز میں اپنا سر کھاتے ہوئے بولے: — الف لیلا یہ کہا — اور پھر میری کتاب دیکھ کر بولے: — ہاں یہ کونسی

کتاب ہے بھی؟ — نام کہیے۔ کس شعبہ علم کی بات بتاتی ہے؟

یہ اور...

میں نے کہا: — تو بہ! ذرا سمجھ سچ کر سوالات کیجئے۔ آپ نے نو مشین گن کیپرٹ سوالوں کی بوچھاڑ کر دی — سنئے

— اس کا نام ہے عدوت اور ایک امریکی مصنف کی تصنیف ہے انہوں نے ذرا عجیب منہ بنا کر کہا: — اس میں کیا لکھا ہے؟

میں نے فوراً انگریزی میں کہہ دیا: *order to be valid* *maai ma mas ad on love*

انہوں نے کہا: — جی اردو میں — اردو میں؟

## صحرا نور کے خطوط

الف لیلا کے بعد الف لیلا کی سی کتاب عنقریب شائع ہو رہی ہے، کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ قیمت

مستقل خریداران ادب لطیف سے پھر۔

مکتبہ اردو لاہور

منہا لاف مشہدی

## بے نیازی

سنگھار ساری

جیتک میں تھا حقیقتِ دنیا سے بے خبر  
آشفۂ اُسکے عشق میں برسوں رہا کیا!

وہ اپنی کبر و ناز میں مجھ سے کمپنی رہی  
میں اس کی آرزو میں ہمیشہ گھلا کیا

اک مرتبہ بھی آہ، مگر پاسکانہ بار

گو سجدہ نیاز میں برسوں جھکا کیا

اب جب کہ اصلِ وپ میں وہ آگئی نظر

اب جب کہ بے نیاز محبت ہوا ہوں میں

پھر تھی ہے التفات کا ارماں لئے ہوئے

عالا کہ دل سے محوئے کر چکا ہوں میں

لیکن نہ آؤ گا کبھی اس کے قریب میں

رازِ طلسم ہوش رُبا پا گیا ہوں میں

## عزمِ بلند

اُڑے ہوئے وطن کو بٹانے لگا ہوں میں

ہر غنچہ آرزو کا کھلانے لگا ہوں میں

رگ رگ میں جس سے روح شجاعت ہو تیار

وہ گیت خاص لے میں سنائے لگا ہوں میں

جامِ منے حیات کی شیرینیوں سے پھر

بندوستان کی پیاس بجھانے لگا ہوں میں

کہدو یہ اہل ہیرے فرصت نہیں مجھے

اک مشورے کو عرش پہ جانے لگا ہوں میں

یکر جلو میں کیفِ جوانی کے کارواں

اے ہندو تیری بزم پہ چھانے لگا ہوں میں

ہر نے میں جسکی رازِ مسرت ہو مضطرب

اس بانسری کو منہ سے لگانے لگا ہوں میں

ہندوستانِ فخر لے جس پہ عمر بھر

وہ گیت جھوم جھوم کے گانے لگا ہوں میں



جناب حق وزیر اختر

# امر پولیس

## کامریڈ جوزف پلوٹسکی

کے دوران میں گھردا پس آنے پر اس نے ایک ایفٹ گورنمنٹ کے برخلاف شائع کیا جس کی وجہ سے ارباب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونیورسٹی سے نکال دیا۔ ان ہی ایام میں اس نے چند انقلابی کتب کا مطالعہ کیا۔ ان کتابوں کے مطالعہ نے اس کے خیالات میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر دی۔ اور اس کا رجحان انقلابی تحریکات کی طرف بہت زیادہ ہو گیا۔ چنانچہ اس نے وٹنو کے مزدوروں سے تعلقات بڑھانے شروع کر دیئے۔ ۱۹۳۳ء میں پلوٹسکی اور اس کے بھائی کو، لیگنئیڈ رسوم پر قاتلانہ حملہ کرنے کے الزام میں، باخو کر لیا گیا۔ ان بعد اس جرم کی پاداش میں پانچ سال کے لئے سائبریا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ سائبریا کو جو نے کا قافلہ تیرہ نفوس پر مشتمل تھا جن میں تین عورتیں بھی شامل تھیں۔ پہلے انکو ارگنیک کے زندان میں محبوس رکھا گیا۔ یہاں ان کے ساتھ جیل کے افسروں کا سلوک نہایت برا تھا۔ چنانچہ ایک دن تنگ آمد بھاگ گئے مگر معدنی انکے ایک قیدی ساتھی نے جیل کے ایک ملازم کی تعویذی سی مرست بھی کر دی۔ اس واقعہ کو مسلح بغاوت قرار دیا گیا۔ اور پلوٹسکی کو اس کا سرغہ سمجھا گیا۔ جبکہ پاداش میں اسکو ایک سال کی مزید صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

اس قید کے دوران میں اس نے ہر برٹ سپنر اور کادل مارکس کی تصانیف کا مطالعہ کیا۔ اسکے دل و دماغ میں سوشلزم کے خیالات بس چکے تھے۔ اور پچھ سال کے بعد جب اسکو زندان سے رہائی نصیب ہوئی، تو وہ ۱۹۳۳ء سوشلسٹوں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی، جس کے اجلاس میں یہ قرار دیا گیا کہ پارٹی

پولینڈ کا یہ نجات دہندہ مقام زولو۔ ضلع سوانسکی میں ۵ دسمبر ۱۸۹۹ء کو کٹم عدم سے عالم وجود میں آیا۔ اسکا خاندان اپنی نجابت و شرافت کی وجہ سے علاقہ میں مشہور و معروف تھا۔ وہ کسی زمانہ میں خوب مقبول تھا۔ لیکن پلوٹسکی کی پیدائش کی وقت اسکی مالی حالت نہایت دگرگور ہو چکی تھی، کیونکہ خاندان نے چند فراڈسٹ کے بیگانہ میں حصہ لینے کی وجہ سے حکومت کی نظروں میں مورد الزام ہو کر جیل کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے۔ چنانچہ پلوٹسکی کا والد اس کی پیدائش سے پہلے اپنی باقی جائیداد کو خیر ادا کر چکا تھا۔ اور وہ ۱۹۱۰ء میں قلمت پذیر تھا کہا جاتا ہے کہ بڑے آدمیوں کی مائیں بھی بڑی ہوتی ہیں چنانچہ پلوٹسکی کی شخصیت میں اسکی ماں کی تربیت کو بہت حد تک دخل حاصل ہے۔ اس کا والد اسناد اس کی والدہ ہے جس نے اس کے دل میں جذبہ حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔ اور پولینڈ کی تاریخ اور مشہور محب وطن شاعر کزیمسکی کا کلام گھر پر ہی اسے پڑھایا۔ پلوٹسکی کو اس وقت کے مشہور و ب وطن شاعر سلوکی کے شاگرد ہونے کا بھی فخر حاصل ہے۔

جب اس کو اسکول میں داخل کیا گیا تو اس نے چند ہی دنوں میں معلوم کر لیا کہ تاریخ پولینڈ کے واقعات کو جیسے غلط طور پر دیا گیا ہے اور حقیقت بڑی طرح پردہ ڈال گیا ہے۔ یہ دل ہی دل میں کڑھتا اور سوچتا کہ پولینڈ کے لوگ فرانس کی طرح بغاوت کیوں نہیں کر دیتے؟

اسکی آخری پسند طبعیت اسکو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکی۔ چنانچہ جب وہ ۱۹۳۳ء میں یونیورسٹی میں داخل ہوا تو تعلیمات

کڑی نگرانی کی جاتی تھی اگرچہ رشتہ داروں کو ملاقات کی اجازت تھی۔ لیکن جیل کے اندر ہر ذلت موجود رہتے تھے۔ اس لئے کوئی خفیہ پیغام اسے پہنچانا ناممکن تھا۔

لیکن کچھ عرصہ کے بعد اسے دو لیکن سیاسی قیدیوں کے محاذ پر سے کامیاب ہو کر آیا۔ یہ شخص نہایت جمل اور سادہ لوح تھا۔ اس کے دل میں سیاسی قیدیوں کے لئے خاص ہمدردی تھی۔ اس لئے اس کے ذریعہ خفیہ طور پر اہم پیغام ہونے لگے۔

بالآخر یہ تجویز سوچی گئی۔ پلوڈسکی کسی ایسی بیماری کا بیان کر لے جس کا علاج یہاں نہ ہو سکتا ہو۔ تاکہ حکام کو پورا افسوس ہو جائے۔ تب بدل کرنا پڑے۔ بڑے غور و خوض کے بعد جنرل اور دیوانگی کا بیان لیا گیا۔ اس کے بعد ایک سائبرین ڈاکٹر کو گانا بٹھا اور قراہا یا کہ ڈاکٹر مریض کا طبی معائنہ کرتے ہوئے عمداً دیاسلانی کی ڈبیا قیدی کے کمروں میں چھوڑ دے۔ تاکہ اس طریق سے مریض کو تمام سائبرین کے نشیب و فراز سے خبردار کر دیا جائے۔ چنانچہ مریض مریض کیلئے میڈیکل بزرگ بھیجے گئے۔ حکام نافذ ہو گئے۔ جس گاڑی سے پلوڈسکی میڈیکل بزرگ بیمار ہوا تھا، اسی گاڑی پر اس کے رفیق بھی سفر کر رہے تھے۔ تاکہ کسی نوع اپنے ساتھی کو ہمارا کر سکیں۔ اس کے لئے جو میڈیکل بزرگ میں میڈیکل یونیورسٹی کا طالب علم ہونے کے علاوہ پولس سوشلسٹ پارٹی کا ممبر بھی تھا، پلوڈسکی کی رہائی کا بیڑا اٹھایا۔ خوش قسمتی سے اپریل ۱۹۳۸ء میں سینٹ نکولس ہسپتال کا ایس سرجن مقرر ہوا، پلوڈسکی کو ایک پولس ڈاکٹر کی وساطت سے اس تمام تجویز سے مطلع کر دیا گیا۔

یہ کہانی سن کر جبکہ ہسپتال کا اندر بخارج غیر حاضر تھا اور شاہ کے دیگر ارکان قریب ہی ایک میلو دیکھنے گئے ہوئے تھے تو پلوڈسکی نے اسکو زور سے موقعہ جیال کیا اور مریض کو معائنہ کی غرض سے طلب کیا۔ پلوڈسکی کو بھیس بدلنے کے لئے کپڑے مہیا کئے گئے تھے۔ ایک گھنٹہ کے بعد پاگل خانہ سے دو شخص باہر نکلے جن میں ایک پلوڈسکی تھا جس نے ایک روسی کٹم آفسیئر کا بھیس بدلا ہوا تھا۔ یہاں سے فوراً گوبلیٹوف روانہ ہو گیا اور اختصار

کا اُن شائع ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس قزاق کے مطابق ۱۰ اپریل ۱۹۳۸ء کو جماعت کا پرچہ مزدور *Red Dawn* کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ اس کی اشاعت اور تقسیم کرنے کا تمام بوجھ پلوڈسکی کے کندھوں پر تھا اور اس مقصد کے لئے اسکو تمام روس اور پولیسنگ کا دورہ کرنا پڑتا تھا۔

۱۹۳۸ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک کے واقعات ۱۰ اپریل میں اخبار *Bildung* بھی نکالا گیا۔ جو مزدور طبقہ میں نہایت مقبول ہوا۔ اس اخبار کے پرزور مقالات نے مرہ قوم میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ اور روز بروز سوشلزم عوام میں برسرِ عمل ہونے لگا۔ چنانچہ پولس سوشلسٹ پارٹی نے ۱۹۳۸ء میں ۳۰۰۰۰ افراد کی خلافت قانون مغلط شائع کئے اور ملک کے لوگوں تک پہنچا۔ پرچہ دار کے جاسوس جابجا موجود تھے۔ اور سرحدوں پر خاص طور پر نگرانی تھی لیکن پرچہ بدستور شائع ہو کر تقسیم ہوا تھا لیکن ۱۹۳۸ء میں پولیس پریس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئی۔ اور اسی وقت جھل کے مقام پر نیا پریس قائم کر دیا گیا۔ اور پرچہ حسب سابق شائع ہونے لگا۔

اس سلسلے میں ایک فرے کی حکایت بیان کی جاتی ہے۔ جب پریس پر پولیس نے قبضہ کر لیا۔ تو ایک اندر نے طنز کہا۔ کہ اب سوشلسٹ پرچہ شائع نہیں کر سکتے۔ تو پلوڈسکی نے مسکرا کر جواب دیا کہ پرچہ چھپ رہا ہے اور ابھی ابھی پریس سے آیا چاہتا ہے۔ چنانچہ سکریٹریل سوشلسٹ کی درست ثابت ہوا۔ کیونکہ اسی نام پرچہ شائع ہو گیا۔ لیکن اب ان حالات کے تحت میں پرچہ ممبران تک پہنچانا آسان کام نہ تھا۔ اس لئے اس وقت کو مد نظر رکھتے ہوئے سرمیں مقرر کی گئیں جہاں جماعت کے کارکن رہتے ہوئے تھے۔ اور پرچہ ان تک پہنچایا جاتا تھا۔

اپریل ۱۹۳۸ء میں پلوڈسکی کو سوشلسٹ کیا جاتے ہیں۔ مغلط کی اشاعت پر دارسا کے قلعہ میں مجبوس کر دیا گیا۔ اس قلعہ میں اسکو سائبرین کی یاد دلادی۔

دارسا کے قلعہ سے فراری۔ یہاں اس کی نہایت

کھنڈا محمد کے دفتر میں شب باٹس ہوا۔ اور چند ماہ کے بعد لندن چلا گیا۔ وہاں اس نے پی۔ پی۔ ایس کے سید کا کی تائیدیں رکھی۔

فروری ۱۹۳۷ء میں روس کو جاپان سے برسرِ پیکار ہونا پڑا۔ ریشمنٹوں کے لئے یہ موقع تھا کہ وہ اپنے آپ کو خطرہ کر لیں۔ چنانچہ پریسڈنٹ سوشلسٹ پارٹی کے اراکین کی تعداد ۵۰۰ تک پہنچ گئی۔ اگرچہ آزادی حاصل کرنے کا یہی بہترین موقع تھا لیکن پانچہ کاری اور عدم تشدد میں یہ قدم نہ اٹھایا گیا۔ اس وقت مارشل پلوڈسکی، یگامین تمیم، شاہ روم نے اہل پولینڈ سے مدد کے لئے ایک پمپل شائع کی۔ جو نہی بہ اپیل پلوڈسکی کی نظروں سے گزری اس نے اسکی مخالفت پر کمر بستہ ہانڈہ لی۔ اس نے اہل ملک سے وطن کے نام پر درخواست کی کہ وہ قزاقی میں قلعہ کوئی جھنڈہ لیں۔ اس مقصد کے لئے اسے پیٹ زبرگ بھی جاننا پڑا تاکہ رائے عامہ میں اسکی جنگ کے برخلاف بند بننا ضرر پیدا کرے۔ دوسرا اور پیٹ زبرگ میں کچھ بچہ پلوڈسکی سے واقف تھا مزید برآں پولیس نے ہر گمان اور شہر میں اس کے نوٹ بھیج دیے تھے تاکہ گرفتاری میں آسانی ہو۔ لیکن اس کے باوجود وہ دوسرا ہی میں مقیم رہا۔

بغاوت وارسا۔ اتوار کے دن نومبر ۱۹۳۷ء کو مزدوروں اور طالب علموں کا ایک بہت بڑا جلسہ مرکز نہر سے نکلا جن کے ہاتھوں میں بے بے جڑے چلی حروف ہیں لکھے ہوئے قطعات تھے۔ ہم زار کے سپاہی نہیں بننا چاہتے۔ اور جب پولیس نے ان کو روکنا چاہا تو انہوں نے گولیوں سے اس کا جواب دیا۔ پہلی کھلی بغاوت تھی۔ جو ۱۹۳۷ء کے بعد شروع پذیر ہوئی۔ اس میں گیارہ آدمی ہلاک اور ۴۰۰ شخص زخمی ہوئے تھے اور چوبیس ۷۶۔ جنوری ۱۹۳۷ء کو مزدوروں کا ایک جلوس اپنی شکایات لیکر زار کے سرکاری محل کی طرف بڑھا تو اس پر گولی چھانی گئی۔ ۱۹۳۷ء میں پلوڈسکی نوکری پہنچا تاکہ روس کے برخلاف پولینڈ کے لوگوں کی ایک فوج تیار کرنے میں جاپان سے صلاح و مشورہ

لے۔ اور امداد طلب کرے۔ اگرچہ اس کو اس مقصد میں نمایاں کامیابی نہ ہوئی۔ لیکن اس جنگ کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ سوشلسٹوں کی تعداد ہم ہزار سے چالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ اور عوام میں جذبہ حب الوطنی و عام سیاسی بیداری پیدا ہو گئی۔ ان دنوں پلوڈسکی پولیس کی تربیت کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اپنی دونوں اس نے یہ تحریک شروع کی کہ تمام ملک کو فوجی تربیت دینا ہے۔ اور اس کام میں پولش ریگی جماعت نے اسکی امداد کی چنانچہ گلشیا کے مقام پر فوجی سکول بھی قائم کیا گیا۔ ۱۹۳۷ء کے بعد وہ کراک میں چلا گیا۔ اور وہاں پرانے شعرا کے کام کا بنیاد ذوق و شوق سے مطالعہ کرنے لگا۔ جیسے ہی جنگ عظیم کے شعلوں نے یورپ کے زمین امن کو جلا کر رکھ کر دیا۔ پلوڈسکی بھی دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ اس آگ میں کود پڑا۔ اس نے جرمنی کا حلیف بنکر دس کے خلاف ہتھیار اٹھائے۔ لیکن بعد میں نے جرمن اور آسٹریا سے بھی برسرِ پیکار ہونا پڑا۔ پولینڈ کے لیڈروں کی اکثریت اس بات کی خواہاں تھی کہ پلوڈسکی کی فوج کی کمان سنبھالے گا۔ ۱۹۳۷ء کے ہاتھ سونپ دیئے گئے۔ اور جرمنی کے بادشاہ کو کمانڈر انچیف تسلیم کر لیا جائے جنرل وان بیلر نے اس کو تسلیم کر لیا۔ لیکن پلوڈسکی نے غلطی انگیز کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو وکیل اور اس کے بعد سیکرٹ کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ وہ ۱۹۳۷ء سے اگست ۱۹۳۷ء تک یہاں مقید رہا۔

ڈیبرکامینہ تھا کہ ایک دن دو جرمن افسر اس کے کمرہ میں داخل ہوئے اور اس کو رہائی کا مشورہ سنایا۔ یہ بھی کہا کہ شہر میں بغاوت ہو گئی ہے اور اس کے لئے یہی بہتر ہوگا کہ وہ سیدھا برلن کا رخ کرے۔ قید کے دوران میں پلوڈسکی نے اپنی سوانح حیات تحریر کی تھی جسے وہ قلعہ میں بھول آیا تھا۔ لیکن اگر اس کا دوست کل سوشلسٹی غلطی سے اپنے کا عذات میں اس کو نہ لانا تو بہت ممکن تھا کہ دنیا ان واقعات سے روشناس نہ ہوتی۔ جب پلوڈسکی جرمنی سے پولینڈ میں آیا تو اس وقت جرمنی، ہنگری، آسٹریا کی انھیں پولینڈ پہنچی ہوئی تھیں۔ کونسل آف ریکیسی ملک کا بندوبست کرنے سے بحیرہ صحرائی۔ پولینڈ کی سیاسیات میں پلوڈسکی کی اہم شخصیت

کو خوب مضبوط کر لیا تھا۔ اور انکی کڑی نگرانی کی جاتی تھی بالخصوص کوپے ورپے سکین سے کمران کے حوصلے بہت کمزور پڑے تھے جہاں وہ اپنی فوج سمیت گزرتا۔ فتح و کامرانی اس کے قدم چومتی۔ مارچ ۱۹۳۱ء میں اس جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ اب پولینڈ ایک آزاد ملک تھا۔ اگرچہ ۱۹۳۲ء کے انتخابات میں یوکرینک پارٹی کا زور تھا۔ لیکن وہ ایک سال سے زیادہ نہ قائم رہ سکی۔ ۱۹۳۵ء میں پولڈ کی پبلک انٹس سے دستبردار ہو کر سولجیک (دوارسا) کے مقام پر قیام پذیر ہوا۔

حکومت پر قبضہ۔ تین سال کی مسلسل غیر عادی کوجہ سے ملک کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی توگوں کی ایک بہت بڑی جماعت اس بات کی حامی تھی کہ ملک کی باگ ڈور پولڈ کی ہی سنبھالے جائے۔ ۱۹۳۵ء میں سترلا کے مقام پر پولڈ کی فوج اور حکومت کی فوجوں کے مابین لڑائی ہوئی۔ لیکن حکومت کی فوجوں کو شکست فاش ہوئی۔

۱۷ مئی کو بعد وزیر دارالسلطنت پر مارشل لا ڈسکی کا قبضہ ہو گیا دوسرے دن پروفیسر *masiecki* صدر جمہوریہ پولینڈ منتخب ہوا اور پولڈ کی ڈکٹیٹر مقرر ہو گیا۔

بکس فراموش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اور اب وہ کسی جماعت کا سامنا نہ تھا بلکہ تمام ملک کا لیڈر اور لوگوں کی آنکھوں کا تارا۔ ری پبلک کی آزادی کا بہترین محافظ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ملک کی فوج اور اس کو سونپ دی گئی۔ اس کے پیش نظر وہ اہم کام نحو۔۔۔ ملک کی سرحدیں قائم کرنا۔ ثانیاً اندرون ملک میں سکھانے میں وہ مان قائم رکھنا۔

ملک کی سرحدوں پر بندوبست کے لئے سپاہ کی ضرورت تھی اس موقع پر بھی اس کے ان رفیقوں نے جنہوں نے سانہیر پا کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں اور میدان جنگ میں ساتھ دینا تھا۔ اس کے کام آئے۔ اور حتی وفات ادا کیا۔ اندرون ملک کے بندوبست کے لئے فیلڈ کونسل کی بنیاد رکھی اور ملک کے تمام نمائندوں نے متفقہ طور پر پولڈ کی کو ملک کا ڈکٹیٹر تسلیم کر لیا۔ جنگ میں پولینڈ۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک اس کی زندگی خالص طور پر شہادت کا بحر بود تھی۔ کیونکہ اس کی تمام توجہ جنگ کے معاملات کی طرف مبذول تھی۔ کیونکہ اسے یقین کامل تھا کہ ملک کی نوازاں پارلیمنٹ کو ملکی معاملات کے سمجھانے کے لئے ایک گروہ دیا ہے۔ ان دنوں یورپ کی ہر ایک سلطنت کو ہر لحاظ انقلاب کا شکار تھا۔ لیکن پولڈ کی نے ملک کی مخالفت کے لئے سرحدوں

## نغمہ حرم

شائع ہوئی

ان سرمدی نظموں کا مجموعہ ہے جو محطراز شاعر نے سنائی نطرت سے ساثر ہو کر لاپے ہیں اور جو دنیا سے ادب کی نفاذ میں گونج رہے ہیں۔  
نغمہ حرم کو آفتاب کی طرح ہر جگہ اور ہر مقام پر پہنچانے کی عرض سے پبلشر نے اس کی قیمت محض لاگت کے دام مقرر کی ہے۔ حضرت اختر شیرانی کے کلام کا مجموعہ۔  
قیمت مجلد و ملاحظہ صرف ایک روپیہ چار آنے۔

## دنیائے ادب کے بہترین چار نصف قیمت

۱۔ نغمہ حرم ۵۰ صفحہ تصاویر ایک روپیہ قیمت ۸  
۲۔ نغمہ حرم ۱۰۰ صفحہ تصاویر ایک روپیہ قیمت ۸  
۳۔ نغمہ حرم ۲۰۰ صفحہ تصاویر ایک روپیہ قیمت ۸  
۴۔ نغمہ حرم ۳۰۰ صفحہ تصاویر ایک روپیہ قیمت ۸  
۵۔ نغمہ حرم ۴۰۰ صفحہ تصاویر ایک روپیہ قیمت ۸  
۶۔ نغمہ حرم ۵۰۰ صفحہ تصاویر ایک روپیہ قیمت ۸  
۷۔ نغمہ حرم ۶۰۰ صفحہ تصاویر ایک روپیہ قیمت ۸  
۸۔ نغمہ حرم ۷۰۰ صفحہ تصاویر ایک روپیہ قیمت ۸  
۹۔ نغمہ حرم ۸۰۰ صفحہ تصاویر ایک روپیہ قیمت ۸  
۱۰۔ نغمہ حرم ۹۰۰ صفحہ تصاویر ایک روپیہ قیمت ۸  
نوٹ:- مصوڈ ایک اردنی نمبر قیمت کے علاوہ ہوگا

مکتبہ اردو لاہور

لئے کا پتہ

جناب طالب نصاریٰ جی صفا

## غزل

ان نست نگاہوں کا اثر دیکھ رہا ہوں    یہ ہوش نہیں ہے میں کھڑکھ رہا ہوں  
 جب حُسن کی پائندہ بیتاب نظر تھی    اب حسن کو پابندِ نظر دیکھ رہا ہوں  
 آتے ہیں نظر تیرے خط و خال کے جلو    میں آئینہ شمس و قمر دیکھ رہا ہوں  
 آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسوئی دُن سے    آلودہ خونِ تاب جگر دیکھ رہا ہوں  
 فرقت میں تری دلی تڑپنے کا تماشا    دیکھا نہیں جانتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں  
 پھرتے ہیں تصویر وہ اس ناز و اداسے    جیسے میں انہیں پیشِ نظر دیکھ رہا ہوں

یہ چین ہوں بیتابوں بیخوابوں طالب

تکمیلِ محبت کا اثر دیکھ رہا ہوں

مناسب میاں جھنگی ایم اے

# ہماری زبان اردو

نہ ہوگا۔ کہ حضرت آدمؑ کے ظہور سے لیکر بہت کافی عرصہ تک صرف ایک ہی زبان یا بولی رائج تھی۔ سا لہا سال گزر گئے۔ مگر دنیا کی زبان ایک ہی رہی۔ یہ خیال رہے کہ یہ واقعات قبل از تاریخ کے یا بہت قریب ہیں اور ایک طویل عرصہ میں حضرت انسان نے کمال درجہ کی ترقی حاصل کر لی تھی۔ یہاں تک کہ بعض نامادہ کرمہ کو دیکھ کر موجودہ علوم و فنون کے ماہر بھی انکشت بزدلان ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ یہ ہے کہ کہنے کو تو عصر حاضر بہت ترقی کر چکا ہے لیکن فی الحقیقت زمانہ بھی اس گزشتہ ترقی کی گردنک کو بھی نہیں پہنچا۔ تھماج سے کروڑوں سال قبل حضرت انسان کو حاصل تھی۔ اگر بعض نہ آئے تو غور کیجئے کہ جب شہر میں کراہا جاتے ہیں تو کیا اسی طرح کسی ملک یا زمانہ کی تہذیب و تمدن بن کر بگڑ نہیں سکتی؟ ہر کمالے را زداے دنیا کا ایک سلسلہ اصول ہے جس میں ہماری موجودہ دنیا نے بھی اجمعی طرح بگڑا اور زوال پذیر ہو چکے کے بعد اس گزشتہ عروج کے مقابلے میں ابھی بہت کم ترقی کی جو یا بالفاظ دیگر بشکل تمام ابھی تسبیلاً لیا ہے۔

اس گزشتہ زمانہ میں ترقی و تمدن کا اصل گہوارہ ملک آق تھا۔ جس کا وہاں خلافت ان دنوں بابل تھا۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ اور امر تو انسانیت عالم شباب میں تھی۔ اور اور بابل میں انسانی تہذیب و تمدن کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ اہل بابل کو اپنی عقل و فراست پر سجدہ ناز تھا۔ انہوں نے اپنی لیاقت و قابلیت کے زہد پر بعض ایسی عجیب و غریب اشیاء بتائیں جو آج لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتیں۔ ابھی اور باقی سب چیزوں کو جاننے دیجئے۔ ان کے معلق باغات ایک ایسی اختراع تھی جس کا ثانی آج تک نہیں ہوا!

روز ازل ہی سے قدرتی طور پر ہر ایک زبان اور ادب کا پرنسپل واحد رہا ہے۔ اس لئے اگر ہم کسی زبان کے حالات پر غور کریں تو اس ضمن میں لازمی طور پر اس زبان کے ادب کا بھی ذکر آ جائے گا۔ ہر نوع اپنی مادہ کی زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرنے سے قبل یہ معلوم کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ اس دنیا میں مختلف زبانوں کا وجود کیونکر ممکن ہوا۔ اس سلسلہ میں ہمارے پاس کوئی تاریخی ثبوت تو موجود نہیں۔ کیونکہ ظاہر ہر ایک شخص ہی کہے گا کہ نئی نوع انسان کے عالم وجود میں آنے کے ساتھ اس کے ذریعہ گفتگو کے لئے زبان بھی پیدا ہو گئی۔ یہ سچ ہے لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت آدمؑ کی تخلیق کے ساتھ اس دنیا میں صرف ایک زبان وضع ہوئی، تو پھر اولاد آدمؑ میں اس قدر بے شمار زبانیں کیوں رائج ہو گئیں جب کہ انسانی فطرت و عادت ابھی بدستور وہی ہے؟

ایسے مواقع پر علم نفسیات کے ماہر ہماری مشکل کشائی کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دراصل پہلے کوئی زبان بھی رائج نہ تھی بلکہ مشہور ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ جبکہ اولاد آدمؑ کو آپس میں باہم چیت اور اظہار خیال وغیرہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، تو انہوں نے مختلف اشیاء کی اصوات کے مطابق یا پھر مختلف چیزوں کی بابت اپنے گمان کے موافق انواع و اقسام کے نام و مقام وغیرہ وضع کرنے شروع کر دیئے۔ مثلاً اولاد اگر لڑنا ہوا کہ سرسراہا شیر کا چنگھاڑنا۔ کتے کا بوجھنا۔ کوسے کا کانیں کاش کرنا۔ سب ہی قسم کے الفاظ متعدد آوازوں کی نقل کے تحت انسانی زبان میں منتقل ہو کر اب ہماری گفتگو کا ایک اہم جز بن گئے ہیں اس سلسلہ میں کسی مفکر کا نظریہ معلوم کرنا بھی خالی از لطف نہیں

ہے بہت ممکن ہے کہ مینار بابل کی تعمیر سے قبل تمام دنیا کی ایک ہی زبان ہو۔ اور پھر اس عجیب و غریب مینار کی تعمیر کے وقت اس کے متعین کی زبان کے اختلاف کے سبب ان کی نسلوں میں بھی موروٹی طور پر وہی زبانیں رواج پا گئی ہوں۔ اور اختلاف زبان کی اصل وجہ تعمیر مینار ہی سے شروع ہوئی ہو۔ اور آج ملک ملک چپہ چپہ پر جو ہزاروں قسم کی مختلف بولیاں اور زبانیں رائج ہیں۔ تو اسکا سبب بھی شاید وہی مینار ہو۔ چنانچہ آج بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جہاں کہیں لوگوں میں کسی امر پر شدید اختلاف رہتا ہو جیسے تو ہم اسے مینار بابل کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اب تو پتا چلتا ہے بابل ہمارے ہاں ایک ضرب المثل یا محاورہ بن کر رہ گیا ہے۔

اس کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے اپنی ماوری دارود، زبان کی ابتدا کیونکر ہوئی؟ آیا اس کا بانی بھی مینار بابل سے جڑا ہوا کوئی عاقل ہے یا محض نفسیاتی اصولوں پر ہی قدرت نے اس زبان کی مناسب تربیت و پرورش اور غور و پرداخت کی ہے؟ اگر غور سے دیکھا جائے تو انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے یا سننے یا کسی حالت یا دفعہ سے پیش آنے سے ذوق و شوق، عشق و محبت، مررت و استعجاب، طیش و غضب، رنج و اہم، مسرت و انبساط وغیرہ کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں ان سب کے اظہار کے لئے کوئی ایسا ذریعہ ہونا چاہیے جس سے دوسرے پر مطلب ظاہر ہو سکے۔ اور ان سب کے بڑے کربن اپنی ذاتی ضروریات ایسی ہوتی ہیں جن کے پورا کرنے کے لئے انسان کوئی نہ کوئی صورت اختیار کر لے۔ پس اسی طرح زبانوں کے ظہور پر غور کیجئے۔ تو معلوم ہوگا کہ بعینہ یہی حال اظہار مقصد کے لئے پیش آیا۔ ہر ملک ہر خطہ اور ہر قریہ نے اپنی ضرورت و حیثیت کے مطابق ترویج و وضع زبان میں ہاتھ بٹایا اور جہاں تک ہو سکا سب اہل ملک نے اپنی اپنی ماوری زبان کی توسیع میں حتی بقدر غذا و استیلا انجام دیں۔ یہ خدا کسی خاص شخص پر احسان نہ تھا۔ بلکہ اس سے انکو اپنا ذاتی فائدہ بد نظر تھا۔ تاکہ اس ملک و قوم کے فرزند اپنے اظہار خیال کے لئے ایک ایسا مفید آرا قائم کر سکیں جس سے ان کو اپنا مدعا و مقصد

بالآخر جب اہل بابل اپنے تمام کمالات دکھانے اور گورو نواح کے تمام ممالک و قبائل پر ان کا سوا بیٹھ گیا۔ ان کو خیال گزر رہا کہ اب روئے زمین پر تو کوئی ایسا خشکی کا شکار نہیں ہے جسے وہ نہ کر سکیں البتہ اب صرف نیلے آسمان کی ہی ایک سی ٹمٹکات باقی رہ گئی ہے جو ہر روز ہمارے ہاتھوں میں بندھتی ہے بس، انہوں نے نہ پہچان لیا کہ یہ بہرحال آسمان کو فتح کر کے چھو سکتے مگر بھرن کو فکر و سنگینہ ہوئی کہ اب اس قدر بلندی پر کیونکر پہنچیں؟ بالآخر یہ تجویز ہوئی کہ ایک عظیم ارٹھان اور بلند ترین مینار تعمیر کیا جائے جسکی مٹی آسمان سے جاملے تاکہ اس کے ذریعے وہ آسمان کو پہنچ کر لیں۔

عزیز! اس قسم کے مینار کی تعمیر آخر کار شروع ہو گئی اور ہزاروں اور لاکھوں عمارتوں کا دور کام پر لگے دیئے گئے کئی دن بجتے۔ بیسے سال گزرتے۔ اور اتنے عمارتوں میں عمارتوں اور مزدوروں نے مینار کی تعمیر کا کام بدستور جاری رکھا۔ اور سناتے سناتے اسے کافی بلندی پر پہنچ گئے۔ جہاں تک پہنچنے زمین پر کھڑے ہو کر مینار کی طرف منہ اٹھا کر دیکھنے والے کو اپنی پگڑی اور ٹوپی سمجھال کر دیکھنا پڑتا تھا۔ مینار تھا کہ نہ کی پناہ! ایٹھوں پر ایٹھیں لگتی چلی جا رہی تھیں مگر ہنوز مینار آسمان تک نہ پہنچ سکا تھا۔ اور بیٹھتا بھی کیونکر جب خدا کو یہ منظور ہی نہ تھا؟

اب اسے دیکھئے کہ چونکہ خدا کو ان کا یہ پند نہ تھا پس ابھی وہ ٹوک سکی تکمیل کی امید میں بہتیں مسرور تھیں تعمیر ہی تھے کہ خدا نے ان تمام لوگوں کی زبان اور بولی ہی بدل دی یعنی ان کو ایک دوسرے کی بات ہی سمجھ سکنے کے ناقابل بنادیا مثلاً عمارت اگر چنانچہ تھے تو مزدور ایٹھیں پکڑتے تھے۔ اگر ایک شخص پانی مانگتا تھا تو دوسرا سمجھ دیتا تھا۔ الغرض اپنی اپنی ذیلی اور اپنا اپنا راگ۔ اب اسی صورت حالات میں مجھ مینار کی تعمیر کیوں کر پائی تکمیل تک پہنچ سکتی تھی مجبوراً تعمیر کا کام چھوڑنا پڑا۔

اگرچہ یہ روایت ایک انسانہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تاہم اس میں حقیقت و واقعیت کی جھلک ضرور دکھائی دیتی

ہے عزیز واقارب اور اوس زوس کے لوگوں پر آسانی ظاہر کر کے  
کہ فی وقت نہ ہو۔ غرض اسی طرح ایک خاص زبان۔ ایک  
ص ملک کے باشندوں میں فروغ پاتی رہتی اور تدریس اس  
زبان پر عمل جاتی، کہ لکچر اسکے ماہرین کی طبیعتیں اختراع اور صنعت و  
فاد میں اعلیٰ درجہ رکھتی تھیں۔ ایک سن میں انشا پر داری کا ایک  
طلم خانہ کھولتے۔ اور ہمسایہ ملکوں کی زبانوں کی آمیزش سے  
اس میں میں الاقوامی مطالب کے لئے مزید وسعت پیدا کرتے  
اب اس مندرجہ بالا نظریہ کی روشنی میں ہم اپنے ملک کی  
قدردان اور قوم کی تاریخ پر غور کرتے ہیں۔ جہاں تک چنان  
ت کی گئی ہے، معلوم ہوا ہے کہ پہلے پہل مسلمانوں کے آنے سے  
بل بجاآت وراثت کی مادری زبان سنسکرت تھی جس میں رامین  
ما بجاآت، مہکت گیتا، چاروں وید اور دیگر غرضی نیز علمی ادبی  
مناہٹ تحریر کی جا چکی تھیں۔ جب مسلمان بیان آئے تو اپنے  
ماہد ایک جدید تہذیب و معاشرت اور علم و تمدن لائے۔ مگر  
ہوں نے اسے بجاآت نواسیوں پر جبراً عاید کرنے کی کبھی کوشش  
کی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے پہل ایک فارسی شاعر امیر خسرو  
رح بجاآت کی ترکیب قائم کرنے لگے، اصل، وہ مخفی قسم قسم  
کے گیت اور پسلیاں وغیرہ ملک کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور  
کے بعد پرمالان حسین شری جو فن موسیقی کا بے نظیر ماہر تھا، اپنی  
ری توجہ اس طرف متعلق کرتا ہے۔ پھر آئے کچھ عرصہ بعد سکند  
رونی بعض نئی مصالح کے سبب یہاں کے باشندوں کو فارسی  
بجئے کی رغبت دلانا ہے۔ وہ شاید اس لئے کہ اس وقت سرکاری  
بان فارسی مقرر ہو چکی تھی۔ اور اس کو دفتری کاموں کے لئے مشیو  
اور تصدیق کی شہید ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا  
کہ ان دونوں اور تہذیبوں کی زبان پر عربی اور فارسی کے الفاظ چڑ  
نے۔ اور دوسرے مسلمانوں کی زبان پر ہندوستان کی اس وقت کی  
موجودہ زبان نے اثر کیا اور اس باہمی میل جول کی وجہ سے اس  
میں روانی پیدا ہو گئی۔

اس حقیقت کے ثبوت میں ایک آدھ تاریخی واقعہ پیش

کرنا ہے جانے بوجہ۔ چنانچہ جب ظہیر الدین بابر بادشاہ ہندوستان  
آگیا ہے۔ تو باوجودیکہ وہ ایک ٹھیک مغل ہے اور اس کی مادری  
زبان بجاآت وراثت کی مروجہ زبان سے بالکل مختلف ہے مگر  
وہ بھی اس سے متاثر ہوتا ہے چنانچہ اس کے ترکی دیون کا جو نسخہ  
نواب رامپور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ وہ عشتہ تحریر کا نسخہ  
شدہ ہے۔ اس میں بابر کا ایک شعر ہے جس کا ایک پورا مصرع  
اور دوسرے مصرع کا ایک ٹکڑا اردو میں ہے۔

پھر اس کے بعد بابر کے پوتے جلال الدین اکبر بادشاہ کے زمانہ  
میں یہ میل جول اور بھی بڑھ گیا۔ اکبر کی زلمہ سازی اور ہرمان چالوں  
نے سنو کے سبب رسم و رواج اختیار کر لئے۔ چنانچہ پر تشہ نگار یا  
ہاتھوں میں راکھی باندھی۔ اسی پر اکتفا نہیں بلکہ راکھی بندھن کی  
رسم سال بسال دھوم دھام سے ہونے لگی۔ ادب و سخن کی  
مجلسوں میں فارسی شہاد کے دوش بدوش کویشوں اور گویوں اور  
پندتوں نے بھی حلقہ پائی، جو چہند یہ ہندوستان کی پیداوار تھیں،  
ان کے نام قدرتی طور پر ہندی تھے۔ پس وہ بہت جلد زبانوں پر چڑھ  
گئے۔ اور فارسی عبارتوں میں بھی ہندی الفاظ بے تکلف استعمال  
ہونے لگے۔ مثال کے طور پر: جھوگر، درشن، بھول، کنار، تلوار  
گھوڑا، ہاتھی، پانگی، جھال، ہار، ڈاک، پٹواری، راجہ، چودھری  
بہر، دوپہر، گھڑی، ہلی، گھڑ پال اور سی قسم کے سینکڑوں الفاظ  
و اصطلاحات سلطان مغلیہ کی شاہی زبان میں مل جل کر رہ گئے  
اسکے بعد دوسری نسل میں جو نور الدین جہانگیر بادشاہ کی رنگلی  
طبیعت نے رنگ دکھایا تو شراب ٹمک کا نام رام رنگی رکھ  
دیا۔ اسکے بعد شہاب الدین شاہ جہاں نے عمارتوں کے ہندی  
و فارسی کے لئے جے نام تاج محل، لال قلعہ وغیرہ وضع کئے۔  
اسکے بعد کہتے ہیں کہ حضرت محی الدین اور ناک زیب عالمگیر نے  
نہ ہی حقیقت اور محبت اسلامی میں گھمات لطیبات میں کثرت  
سے ہندی الفاظ استعمال کئے۔

جہانگیر بادشاہ، ابراہیم عادل شاہ کا معاصر تھا۔ اس وقت یہی  
دیکھنا یا اگر وہ دربار میں اور دوزبان کا سراغ نہیں ملتا تھا بلکہ وہ



بہت جلد مخلوط ہونا شروع ہو گئیں۔ چنانچہ جب اصناف سخن میں ادب نظم عالم وجود میں آئی، تو اس کے ظہور کا سہرا بھی دکن کے سر پر بندھا۔

احمد دہلی میں شاہی و سرکاری زبان لازمی طور پر فارسی ہی رہی۔ اور اسی زبان میں شاہوں اور بادشاہوں کو اپنے جبر و قابلیت چکانے کا موقع ملتا رہا۔ اور تیموری دکن کی طرف توں برائے نام و قوانین سلطنت کی بنیاد پائی رہی۔ یہاں تک کہ محمد شاہ دہلیا جسکی سات پشتوں نے ہندوستان کی آب و ہوا میں ہمدردی پائی تھی، وہ ان میں سے ایک نے جسکی ترکستان و ایران کی ہوا تک نہ کھانی تھی وہ بھی ترکی زبان بولتے۔ اور فارسی کچھ اپنی مادری زبان سمجھتے۔

مگر یہ حالت ان بادشاہوں کی نہ تھی، جو اطراف ہند و مشا دکن وغیرہ میں برسر حکومت تھے۔ وہاں کچھ ایسے خاندان بھی تھے جو خالص ہندی انسل تھے۔ یا چار پانچ پشتوں کے بعد ہندی ہو گئے تھے۔ بالخصوص دکن میں یہی حال تھا۔ وہاں کے صحاب تاجراج ملکی جبرگڑوں سے مجھے پڑے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اہل دکن کو ان دونوں غیر ملکیوں کی ہرجیسے نفرت تھی، اور ہمدردی و بددشٹی کا جذبہ اسوقت وہاں بہت زیادہ برقرار تھا۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ اہل دکن اپنی مستقل ہستی قائم کرنے کے لئے زبان و سخن میں بھی غیر ملکیوں سے الگ رہنا چاہتے تھے۔ تیسرا سبب آہستہ آہستہ ابراہیم عادل شاہ دہلی کے زمانہ میں فارسی آمیز دکنی زبان کا رواج ہونا شروع ہوا، وہ خود راگ اور موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ یہاں تک کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے گیتے کہ آگے پائی جاتے تھے۔ اور اسے اپنا جھنڈا گرد سمجھتے تھے۔

ابراہیم کو نہ صرف خود راگ اور راگنیوں کو ترکیب دینے کا اپنی زبان میں شعر کہنے کا شوق تھا، بلکہ جو کچھ وہ تصنیف کرتا تو وہ کوکا کرشنا، تاتلہ اور پھر وہ راگی اور گیتے اس کے شعروں اور گیتوں کو یاد کر کے اور گا کر چلاتے تھے۔ رفتہ رفتہ دکنی زبان میں راجہ خالص ہندی تھی، بلکہ عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کے امتزاج سے ایک نئی زبان قائم ہو گئی تھی۔ طبع آزمائی کرنے کا شوق

میں اسکی بنیادیں قائم ہو رہی تھیں۔ مگر یہ خیال وہ ہے کہ اسوقت یہ زبان طغویت کے عالم میں تھی۔ جسکا اندازہ محمد قطب شاہ اور محمد قلی قطب شاہ اور نوری کا کام مطالعہ کرنے سے آسانی ہو سکتا ہے۔ بہر کیف اگر وہ چنانچہ کی زبان سازدہ برائے طرز حکومت سے ہندوستان کی تقریباً سب قومیں فارسی پڑھنے لگی تھیں۔ اور چونکہ انکا میل جول مسلمانوں سے کافی بڑھ چکا تھا۔ پس اس میل جول کی نتیجہ یہ ہوا کہ اس نئی مخلوط زبان نے جو آج اردو کے نام سے عوام سپہ میدان ترقی میں ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ لیکن پھر بھی یہ زبان عام ہو سکی، بلکہ خاص خاص محلوں یا مہجنتوں یا نہ یادہ سے زیادہ گیتوں تک محدود رہی۔ اسکی ترقی تھی کہ ان دونوں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ اسہ کا بھی زبان فارسی تھی، یا شاہی زبانوں سے ملے کہ وزیر کے احکام تک اس زبان میں جاری ہوتے تھے۔ اسی میں عرائض اور مقدمات کے کئی نمونے ملتے ہوئے تھے۔ در طبقہ امراء و شرفاء میں باہمی خط و کتابت بھی اسی فارسی زبان میں ہوتی تھی۔ مگر یہ کیا ہندو کیہ مسلمان سب کے دلوں پر جاری زبان کا اس قدر عیب و افتاد چھایا ہوا تھا، کہ ملکی زبان یعنی اسوقت کی اردو یا ہندوستانی کو بے علم یا کم علمی کی علامت سمجھتے تھے چنانچہ اسوجہ سے اردو زبان کو علمی و دربار تک آسانی حاصل نہ ہو سکی۔ اور کافی بد تک ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی اور اسکے گرد و پیش کے شہروں اور قصبوں میں فارسی کا سکہ روایں رہا۔ لیکن اطراف ملک دکن وغیرہ میں یہ حالت نہ تھی۔ وہاں کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے تھے، کہ ہندوستان کی نئی مخلوط زبان دارودہ کی جرم مضبوط ہو گئی تھی، اور کچھ اسوقت کے واقعات و حالات نے بھی اسکی کافی معاونت کی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ محمد شاہ تغلق کی جڑوا نیوں سے دکن میں ہمنیوں کی ایک نئی عظیم الشان سلطنت قائم ہو گئی۔ اور قرعہ سلطنت علاؤ الدین حسن کاٹھو کے نام پڑا۔ اس نے شروع ہی سے برہمنوں کو مالی و ملکی جہد سے دیکر امور حکومت میں شامل کر لیا۔ مل کا وزیر ملکی زبان میں ہونے لگا۔ اور اسوجہ سے ملکی اور ملکی زبانیں

سے خانہ بجلیاں کرتے کرتے ٹھک چکے تھے۔ چنانچہ پھر کیا تھا سب ہتھیار بھینک کر حیش و عشرت میں پڑ گئے۔ شاعری اور بغیر کی مثل شہور ہے۔ سب صاحب فضل و کمال دہلی میں آکر تہ جمع ہو گئے۔ اور یہاں اکھاڑت رنگ جما۔ اور زندگی بھر تک اس زبان کی خدمت و پرورش کرتے رہے۔ ایسے شاعروں اور ادیبوں کا یہاں ذکر کرنا طوالت سے خالی نہیں۔ اصل مقصد محض داستان اور بیان کرنے کا یہ ہے۔ کہ اس زبان نے کیسے فروغ حاصل کیا؟

پچھلے پہل اردو زبان کا نام دیکھتے تھا۔ پھر اردو نے معنی کا خطاب پا کر سندھوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔ کسی حد تک اس کے فروغ کا ایک سبب یہ بھی ہوا۔ کہ... شروع میں انگریز حکام اپنے ملکی مصالح کے سبب اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی، کہ جو انگریز ولایت سے تازہ وارد ہوتے ہیں انکو اردو زبان سکھانی جائے۔ اور چونکہ اس وقت بھی اردو زبان میں اس مطلب کی کتابیں موجود نہ تھیں۔ اس لئے ایک انگریز ڈاکٹر گلکرسٹ کے زیر اہتمام اس کام کو شروع کیا گیا۔ دہلی اور لکھنؤ سے زبان وال جمع کئے گئے۔ اور اردو زبان کو وسعت اور ترقی دینے کے لئے اس زبان میں لغتوں اور کہانیوں کی کتابیں لکھوائی گئیں۔ چنانچہ بعض فارسی اور عربی نیز سنسکرت اور انگریزی وغیرہ کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔ اور خود ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اردو زبان کی لغت اور قواعد طبع کئے۔ بعض نقاد کہا کرتے ہیں کہ اردو زبان کی ابتدا فارسی زبان کی انتہا جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ درست ہو مگر دراصل اردو زبان کی سٹاک تاریخ صرف اس ایک فقرہ میں بیان کی جاسکتی ہے۔ کہ اس کی ماں بھاشا "سی شیریں بولی تھی" اور یہ بالآخر فارسی و عربی نیز انگریزی کی گود میں پائی پڑی اور برسوں تک بجاہت و دشمنی کے گہوارہ میں جھوٹی رہی ادب یہ درجہ بڑی شکلوں سے حاصل کیا ہے۔

عام ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ فارسی بکریوں ہی میں شعر کہے جانے لگے اور گرو لکھنؤ میں محمد علی اسی ابراہیم کا معاہدہ نہایت علم دوست اور ہنرمند پر بادشاہ تھا۔ اور اعلیٰ پایہ کا شاعر تھا۔ اس کے مرنے پر اس کا بھتیجا اور دادا سلطان محمد قطب شاہ تخت و تاج کا مالک ہوا۔ اور پھر اسکی وفات کے بعد اس کا بیٹا عبد اللہ قطب شاہ بادشاہ ہوا۔ اور وہ بھی شاعر اور صاحب دیوان تھا اس وقت کی زبان کا انداز دکھانے کے لئے اس کا ایک شعر نمونہ پیش کرتا ہوں۔

"اے پری پیکر ترا مکھ آفتاب  
دیکھتا ہوں تو رہے نہ مج میں تاب"

غرض کہ یہ زبان ان دنوں ابھی اوائل عمری ہی میں تھی اور دراصل دیکھتے بھی اسی شے کا نام تھا۔ پھر حال اس زمانہ میں بہت سے ایسے باکمال شاعر اور انشا پرداز پیدا ہوئے ہونگے جنہوں نے اس زبان کی کافی خدمت کی ہوگی۔ کیونکہ مثل مشہور ہے۔ کہ قیسا راجہ ویسی پر جا، یعنی جس طرف بادشاہوں کا میلان ہوتا ہے اسی جانب لوگوں اور رعیت کے خیالات بھی لافنی طور پر منتقل ہو جاتے ہیں۔ مگر پھر یہ یاد آو کی تباہی کے بعد اکثر لوگوں نے اورنگ آباد میں پناہ لی۔ اور چونکہ عالمگیر بادشاہ کی عمر کا بیشتر حصہ وہیں بسر ہوا۔ اس لئے دہلی اور اکبر آباد کے بہت سے امراء و علماء اور مشائخ بھی اورنگ آباد میں رہے۔

اب اور اردو میں یہ حال تھا۔ کہ عالمگیر کے مرنے کے بعد اس کے بیٹوں اور برہمنوں وغیرہ میں سلطنت مغلیہ کے جے بکڑ ہونے شروع ہو گئے۔ اور چند ہی ایام میں جوتوں میں دال بننے لگی کافی عرصہ تک دوڑ و دوپ کے بعد محمد شاہ کو کچھ روز اطمینان سے حکومت کرنا نصیب ہوئی۔ مگر کہاں بس۔ بالآخر نیکی کی طبیعت نے رنگ دکھایا۔ امراتے دربار تو پہلے ہی برسوں

ضروری اطلاع :- ڈاکٹر امیر علی اور مئی کا مشترکہ نمبر ہے اس لئے اپریل کا پرچہ شائع نہیں ہوگا۔ تاہم مطلع رہیں  
(انجمہ)

جناب خواجہ حسن عباس  
بہار

# سیدی لکیر

شہر کے بڑے قبوہ خانہ میں ملا۔ ایک مخیم کتاب اس کی بغل میں تھی۔ اور وہ نشہ میں چور تھا۔ اور اس نے مجھے میرے دوستوں کے سامنے ہی بتا دیا۔ کہ وہ ایک مذہبی کے مکان پر گیا تھا ہیرے ایک دوست نے یہ جملہ سنکر اس کے چپٹے ہونے چہرے پر تعجبی نگاہ ڈالی۔ اور وہ محمود جذبات کے اشتعال سے تھر تھرا کر بولانہ صاحب ایسی حسن و پوش ہستیاں جو اپنی تھیلی پر زندگی کی جنبش گریں لئے پھرتی ہیں جہادی نجات دہندہ ہیں۔ ان کا سماج پر بڑا ہی احسان ہے۔ فرمائیے: اگر یہ نہ ہوں تو ہم مجروح اپنے سخی... جذبات کی پیاس بجھانے کے لئے کن کن حرکات کے متحرک ہوں تھیں جلنے کہ ان کا وجود تعمیر جہاں کے لئے ناگزیر ہے۔ وہ اسی گرمی میں سگھٹ نکال کر تیزی سے کش لگاتے لگاتے۔ یہ دراصل میرے دوست کی جھول تھی۔ جو اس کی بات کو قابل گرفت سمجھ لیا۔

اسے کیا معلوم تھا کہ میرے شرابی دوست کا ذہن دوسرے ملک کی گرفت میں ہے۔ اس کی نگاہ میں مذہب بھی ایک نیم تھی۔ جو صدیوں سے انسانوں کو روحانیت کی اوٹ میں چٹائی جا رہی تھی اور نظریہ جزو مشرک وہ مذہبی دیوانوں کی خو غرضی کا ایک تکمیل سمجھتا تھا۔

میں نے بات چلنے کے لئے اس کی کتاب لے کر یوں ہی ورق گردانی شروع کر دی۔

”جانتے ہو: یہ کہاں سے لی؟“

”کیوں؟“ میں ہیرے سے اسکا منہ بچھنے لگا۔

”آج شام سٹیشن پر چو گیا تو ہیلر بک شال سے یوں ہی نکالی

جب وہ اپنے کمرے کے فرش پر بستر پر لیٹا اپنی پتی پتی دھار ٹانگیں کیونے حقہ گڑگڑا کر کہتا: ”نیم نیم خے یہ تیغ زندگی بڑی پیاری ہے“ تو مجھے اپنے غم نصیب دوست کی جوان ہمتی پر شکر آنے لگتا۔

اسکی صلیب موٹی شرتی آنکھوں میں گزشتہ دو عشرت کی ایک دھندلی سی جھلک اس بات کی گواہ تھی۔ کہ وہ کبھی دنیا رنگت میں بھی سانس لے چکا ہے۔ اس کا ساغر جوانی چھکا۔ اور بار بار چھکا۔ مگر وہ اپنی نغزشوں سے قطعاً بے پروا تھلائی کی بے تاب لہروں پر ایک کاغذی نیلا کی طرح بہنا چلا گیا۔ وہ نظرنا آزاد تھا۔ اور اپنی اس آزاد روی کی لئے میں وہ اکثر آسمانی ستاروں کی بے چارگی پر بھی مسکراتا تھا۔

کبھی اسکی زندگی گونا گوں تفریحات کے آغوش میں بسر ہو رہی تھی۔ سیم و زر کی ہستی ہوتی لہروں میں سے تند کی تلخیاں جو آزاد اور مزاج لڑکیوں سے گہری محبت۔ سماج کے لئے وہ ایک آوارہ انسان تھا، اور سماج اسکی نظروں میں تاش کا ایک بندوق، جس کے پتے ہر بار مل کر ایک دوسرے کے مخالف دائرہ کرتے ہیں۔ اس کا ہر کام ہی کچھ ایسا نرا لگتا۔ کہ اسکے جاننے والے اسکی زندگی کو ایک ٹیڑھی لکیر سمجھنے لگتے تھے وہ ہیل و نہار کی طرح گردش میں رہتا۔ اور فریب دینا کے ذہنی حادثات بھی اسے پابخیر نہ کر سکے۔ اسی میں یہ محرکادی تھی کہ زندگی کے ٹوٹے پھوٹے تاروں سے بھی اپنی دسوزی کے نغے پیدا کر لے:

اپنی دونوں کی بات ہے کہ ایک دفعہ وہ مجھے ایک رات

کتاب پسند آگئی مگر حبیب میں اس وقت اتنے پیسے نہ تھے کہ خرید سکوں۔ صبح قیمت ادا کروں گا! —

اسکے جواب نے مجھے ایک لمحہ کے لئے کچھ یوں ہی ساکت کر دیا مجھے وہ وقت یاد آگیا۔ جب ایک بار اس نے پبلک کال آفس میں ٹیلیفون پر اپنی آواز کا جواب نہ پا کر دوسرا کرایا اور خود فی اطلاع دیکر کافی رقم بطور ہیرہ نہ کے ادا کر دی۔

اس کی دلچسپ باتوں نے میں کچھ دیر قبوہ خانہ میں بٹھائے رکھا اور جب ہم باہر نکلے تو ہم نے دیکھا کہ ایک بڑی سی توند والا انسان تختے پھلانے ایک غریب مزدور کا پھٹا ہوا اگر سیاں تھا اسے بری طرح کوس رہا تھا۔ وہ بے چارہ درنی آہنی سلاخوں کا بنڈل سر پر اٹھاتے آ رہا تھا۔ کہ اس مجسمہ خدائی کو راہ چلتے یوں دھکا سالنگ کیا۔ اور اب اسی جرم کی پاداش میں وہ اسے زبردستی لٹاؤنے کی کوشش کر رہا تھا مزدور کے سینے کی ابھری ہوئی دمازدہ زبانیں کانپتے ہوئے ٹٹنگ پونٹ اور سراپائے چارگی بتا رہی تھی کہ ایک فاقہ کش غریب کی زندگی ہر وقت موٹے دامن میں ہوتی ہے۔ — میرا دوست دفعۃً آگے بڑھا اور مجھے پیاسے مزدور کو رحمت کی گرفت سے آزاد کر کر بوتا نعیم ہتھکن کی غریب دنیا ہنر کسی لیتن کی تلاش میں ہے! — اس کے الفاظ میں کتنا گہرا احساس تھا!

— اس کے لئے زندگی کا سب سے بڑا حادثہ اس کی شاؤبا تھی — نوجوان دلہن نے ہر طرح مغل ہو کر اس کی گردنوں کا پردہ اٹھانا چاہا۔ مگر شوہر کا ظہر حیات نہ پاسکی:

اچانک زندگی نے ایک کروٹ لی اور اب اسکی زندگی ہم روز کی شاعروں سے دور ہونے لگی اس کی آسودہ حسالی بدل گئی۔ مگر اس کے آزاد خیالات بدستور اسی شاہراہ حیات پر اس کے نقش پا کی تلاش میں آوارہ تھے۔ — اس کی صحت گرنے لگی اور وہ کشمیر کی مہر نفا وادی کی طرف تندستی کی تلاش میں چلا گیا۔

اب کے اس کی طبیعت کی زیرنگی نیا رنگ لائی، دھول

سفری میں ایک پہاڑی دو شیرہ پر طبیعت راغب ہو گئی اور وہ اپنے مقصد سفر سے بے پروا اپنی جوان محبوبہ کی رعنائیوں سے چند راہ کھیل کر وکھی جوائی نے واپس چلا آیا۔

وہ اب حادثہ کی پناہ میں تھا۔ وہ مسکراتا رہا اور مصیبت کی آگ اس کی ہستی کو خستہ کرنا ہی تھی۔ اور اب ابھی بھی ہوئی دنگاریوں کو شعلوں میں دھنسنے کے لئے وہ کسی آزاد ماحول کی تلاش میں بہت دھندل گیا۔ — وہ براہر جلتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کی مجلسی ہوئی رگوں میں بہتا ہوا خون آتش سیال بن گیا۔

اس نے سماج کے خود ساختہ قوانین کی خود غرضی کے خلاف بغاوت کی اور اپنے پرسوز دلائل سے سماج کے خداؤں کو انکار کیا پر نوا دیا۔ وہ براہر جلتا رہا۔ لیکن ایک فرد واحد کی بغاوت ہمہ گیر اثر محدود نہ دکھاسکی۔ — وہ ای کشکش میں ایک دائمی حریف بن گیا۔

جب وہ مجھے پچھلے دنوں ملا۔ تو اس کا بظاہر مسکراتا ہوا زرد چہرہ چمکے ہوئے کال اور انجسری ہوئی ڈیاں دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو غبر آئے۔ اپنی اس تبدیلی کا احساس میری نگاہوں میں پا کر وہ حسب معمول مسکرایا۔ اور کہنے لگا کہ نسیم اصول کی خاطر جان کی قربانی کوئی بڑی بات نہیں میں اپنے سادہ لوح بھائیوں کو انسانیت فروش سماج کے ظالم غصب سے ضرور آزاد کرواؤں گا تاکہ انکی چرولت آئندہ نسلیں زندگی کی سیدھی راہ پر چل سکیں۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ امارت اور غربت وہ دونوں ندیوں میں جی بھر کر نہایا ہوں اور جانتا ہوں کہ.... وہ غریب جس کی جیب میں ایک بار روپے نہیں کھٹکتا اسے اپنی غربت کا صحیح احساس نہیں ہو سکتا۔ اور وہ امیر جس نے پیٹے پرانے کپڑوں میں کبھی رات نہیں بسر کی اپنی امارت کا پورا مزہ نہیں اٹھا سکتا۔ —

اس کے الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔ اور مجھے سب بات کا پورا احساس ہو گیا کہ ایک آزاد زندگی بظاہر تفتی شہر میں بھی

لیکن افعال کے نقطہ نظر سے مسید صی لکڑ چوتی ہے۔ چکا ہے — لیکن میں اسے سماج کی کھوئی ہوئی لاش سمجھتا ہوں

جناب اختر ہوشیار پوری بی اے

## معصوم اقرار

تو نے اس طرح سے کچھ جرم کا اقرار کیا  
مجھ کو شرما کے بتانا یہ ”مری بھول ہوئی“  
تھر تھرا نا وہ زباں کا وہ پریشیاں ہونا  
اب تلک ہے تری گفتار کی کاغذیں مٹھاس  
ہائے معصوم وہ الفاظ وہ پر کیف صدا  
آہ وہ تیری شرارت میں جیا کا انداز  
اُنہ پیشانی کہ جس طرح سوکندن کی چمک  
وہ حجابوں میں تبسم کی ضیائیں توبہ  
بات کے ساتھ نگاہوں کو جھکانا تیرا  
تیری پاکیزگی شوق کے قرباں ہوں میں  
تیرے لہجے سے محبت کی ہوا آتی تھی  
زہرِ فرقت کو تما ترِ باقِ ترکیف سخن  
میں ہوں اور تیرا تصور ہے خدا جانتا ہے

باتوں باتوں میں مری رُوح کو بیدار کیا!  
آؤ فاقم کو زحبا تا یہ مری بھول ہوئی“  
ہائے وہ اپنی شرارت پہ پشیاں ہونا  
جس سے قائم ہے مری دردِ محبت کی اساس  
اب تلک دلیں ہے اُس فقرۂ رنگیں کی ادا  
لو کے اک گرم سے جھونکے میں صبا کا انداز  
اُن وہ آواز کہ جس طرح سولہیوں کی چمک  
وہ نزاکت میں شرارت کی ادائیں توبہ  
ہائے معصوم جوانی کا زمانا تیرا  
تیری دھنیز گئی ذوق کے قبراں ہوں میں  
تیری آوازیں حوروں کی صدا آتی تھی  
لگ گئی اور بھی میرے دل محروں کو لگن  
سوزشِ دل کو بھلا دوسرا کیا جانتا ہے

R. L. No. 3521





متنور کردہ محکمہ تعلیم پنجاب صوبہ سرحد ریاست جیل آباد دکن

مکتبہ اُردو لاہور کا

کثیر الاشاعت و ارزاں ترین ماہنامہ

# ادب رسالہ لطیف لاہور



جون ۱۹۳۹ء

ادارہ تحسیر

چودھری برکت علی بی اے

میرزا ادیب بی اے

مقام اشاعت

مکتبہ اُردو لاہور

چودھری محمد یونس

پشت فی پاریچ

کتبہ ممتاز انعام حاضریں گھوڑشاہ لاہور



چند سالہ بد فہم سالانہ سرو

انسانہ نہیں تین روپے چار آئے

علاقہ محمد آباد

چند  
مالک فیسہ  
آٹہ شنگ

## فہرست

## جلد ۹ بابت ماہ جون ۱۳۹۶ نمبر ۳

| نمبر شمار | صاحب قلم                         | مضمون                    | نمبر شمار |
|-----------|----------------------------------|--------------------------|-----------|
| ۱         | ادارہ                            | اشارات                   | ۲۶        |
| ۲         | جناب علی احمد صاحب               | پریم سیاسی               | ۵         |
| ۳         | جناب عبدالمکریم صاحب بی اے لاہور | میری اینونٹ              | ۹         |
| ۴         | جناب جوہا، صاحب                  | تجربت کے خطوط            | ۱۱        |
| ۵         | ڈاکٹر نعیمی بی اے پٹنہ           | نارہ دل                  | ۱۳        |
| ۶         | پید فہر جعفری بی اے              | ... کی طرف جاتے ہوئے     | ۱۵        |
| ۷         | میرزا ادیب                       | غلاموں کی بغاوت          | ۱۷        |
| ۸         | جناب امین حزیں صاحب اسیانکوٹی    | محکات                    | ۳۰        |
| ۹         | شاہد باہتھی                      | بیکاری                   | ۳۱        |
| ۱۰        | کمرن چندر                        | بکین                     | ۳۵        |
| ۱۱        | اثر صاحب چولی بی اے              | خوشی                     | ۴۰        |
| ۱۲        | عزیز احمد                        | خبر                      | ۴۱        |
| ۱۳        | جیل احمد                         | باغی ڈورا انگارہ رک ابسن | ۴۲        |
| ۱۴        | حضرت وجودی                       | ہیر کا ایک ورن           | ۴۸        |
| ۱۵        | جناب راجہ مہدی علی خاں صاحب      | ایک رومان                | ۵۲        |
| ۱۶        | دعشی صاحب                        | قیدی کی دائری            | ۵۴        |
| ۱۷        | سجاد صاحب ہاشمی                  | بادہ شیراز               | ۵۷        |
| ۱۸        | خندان مرحوم                      | ایک نا تمام غزل          | ۵۸        |
| ۱۹        | شش صاحب مظفر پوری                | خدا سے فریاد             | ۵۹        |
| ۲۰        | جناب اختر انصاری صاحب            | قطعات                    | ۶۰        |
| ۲۱        | ادارہ                            | نقد و نظر                | ۶۱        |

چودھری کرکٹ ملی اے ریٹر پلٹا ڈرٹنے راجہ کو ہرڈ کیشل، رنگ بکس وطن لوگ لاپتے سے جیوا کرہ نر ادب لطف نہ کر لارہ لاپتے سے شائع کیا

# اشارات

## مہاراشٹر کے اردو پرست حضرات کی خدمت میں

کارنن اوب لطیف و مکتبہ اردو نے اردو کی نشر و اشاعت کے لئے  
 نئی کوششیں کرنا شروع کر دی ہیں۔ اس کا عمل حال آپ نے درامہ نمبر کے صفحہ اول میں  
 پڑھ لیا ہے۔ مکتبہ اردو کے پیش نظر صرف اردو کی اشاعت ہے اور اس  
 سلسلے میں وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ دہشتے مالی  
 نقصانات جو اسے ہر گز اس کے باوجود کار پر داناں مکتبہ اردو کا مقصد بھیجے  
 ہیں۔ بلکہ اردو کو ہر جگہ پھیلانے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے جا رہے  
 ہیں۔ چنانچہ اسی جذبے کے زیر اثر نئی سکیم بروئے کار آئی ہے۔ کارنن کرام  
 جاننے میں کہ ہندوستان کے کئی حصے ایسے ہیں جہاں اردو صرف اس وجہ سے  
 ترقی نہیں کر سکی کہ اس مقصد کے لئے قطعاً کوئی ذریعہ اختیار نہیں کیا جاتا  
 مہاراشٹری سرزمین میں اب تک اردو کی نشر و اشاعت کی کوشش نہیں کی  
 گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہاں چند اردو پرست حضرات تو موجود ہیں مگر ذرائع  
 و اباب نہ ہونے کی وجہ سے ان کی آواز دور نہیں آتی۔ اردو کے لئے زیادہ کار آمد  
 و مہیات افراد ثابت نہیں ہو سکی۔ اب مکتبہ اردو کے کارکنوں نے مصمم ارادہ  
 کیا ہے کہ اردو کو ہندوستان کے ہر گوشے میں پھیلایا جائے اور یہاں تک  
 عمل بھی مہاراشٹری سرزمین ہے۔ ہمارے محترم ناظم اقبال آروستو نے  
 ایک تجویز سکیم مطاق مہاراشٹر کا دورہ کریں گے۔ اور انتہائی کوشش سے کام  
 لیں۔ اردو کی منتخب کتابیں ہر ایک شخص کے ہاتھوں میں پہنچائیں گے۔

سٹ کی قیمت گیارہ روپے ہے۔ اقبال صاحب یہ مکمل سٹ اردو کے ہر  
 سر پرست کی خدمت میں پیش کریں گے۔ اور پہلی قسط ساڑھے تین روپے ان  
 سے لیں گے۔ بقیہ رقم خریدار بحساب . . . پر بالاقساط دیں گے۔  
 کارنن کرام کہتے ہیں کہ اس سکیم کے پس پردہ ملنی فائدہ کا تصور نہ ہو  
 نہیں خور گئے گیارہ روپے کی کتابیں اس طرح پیش کر دینا محض اردو کی خدمت  
 نہیں تو اور کیا ہے؟

سکیم صرف اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب اردو کے محترم سر پرست  
 اردو سٹ کے محترم ناظم صاحب کی ہر ممکن مدد فرمائیں۔

جم مندر جو ذیل معروضات کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ اردو کی  
 نشر و اشاعت کے سلسلے میں کرم فرمائی سے کام لیں گے۔  
 بھدیدی نذیر احمد

# بھوپال

میاں اسلام الدین صاحب بالندھری چیف جسٹس

## چونہ چھاؤنی

خان صاحب عبد القدیر خان صاحب ایل اے عبدالرفیق عبد القدیر خان صاحب

احمد نگر مشہر

## چونہ مشہر

حکیم جیل احمد صاحب حاجی اسماعیل ابراہیم صاحب

احمد نگر چھاؤنی ڈھونڈ سیکر فرم پنجابی

جناب شیخ غلامت و حبیب اللہ صاحب کلاٹر مرچنٹ و کرانہ مرچنٹ

## ضلع بیڑ

گھدیدی سردار خاں صاحب گتہ دار و شہاب الدین فاروقی

## گیورانی

جناب عمر بن علی چاؤش رئیس اعظم گیورانی۔

## جالندہ

جناب پیداضل علی صاحب وکیل و حمید الدین صاحب وکیل

اورنگ آباد۔

حضرت درد کاوری

## مکتبہ اردو کا عظیم الشان اقدام

وقت کی ایک اہم ضرورت

## ادبی سٹ کا انتخاب

اردو جس ہلاکت بکنار دور سے گزر رہی ہے۔ وہ بیک کی نگاہوں سے  
 پوشیدہ نہیں مخالفان اردو کا زہر آؤ و تعصب ایک طاقتور سیلاب کی صورت  
 اختیار کر کے اسے ایک جزیرے کی مانند پہلے جانے پر تلی ہوئی ہے۔ اور  
 ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان زندگی اور موت کی کشمکش  
 میں گرفتار ہے۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ تشویشناک سے تشویشناک صورت  
 حالات پیدا کر رہی ہے ضرورت ہے کہ نئی خواناں اردو اپنی تمام تر وجہات  
 اردو کی بقا کے اہم ترین مسئلے پر مرکوز کر دیں۔ مخالفت جیتنے کے  
 باوجود مخالفت ہے۔ اور اس سلسلے میں کسی چیز کے متعلق حسن ظن  
 انجام کار تاسف کی صورت اختیار کر رہا ہے۔

موجودہ دور میں جہاں جہاں اردو کی مخالف طاقتوں کا مقابلہ کرنا

جے وہاں ہیں اپنوں کی توجہ بھی اس اہم ترین مسئلے کی طرف مبذول کرنا ہے۔ ہمارے کلاں میں ہمیشہ یہ شکایت پہنچتی ہے کہ ملک کے زر پرست مہاجر شرمناک تاجرانہ ذہنیت کا ثبوت دیتے ہوئے حیا سوز لٹریچر کی ترویج میں مصروف ہیں اور اس طرح نوجوان دل و فحش میں بد اخلاقی کے جراثیم پیدا کر رہے ہیں اس طرح جہاں فحش تنزل کی پرورش ہو رہی ہے۔ وہاں اردو کے مستقبل کو بھی تاریک کیا جا رہا ہے۔ توجہ بر مخالف بھانٹ دہل کہتا ہے۔ کہ اردو میں بہت معیار لٹریچر ہیں کیا جا رہا ہے۔ جو قوم و ملک کیلئے زہر سے بھی زیادہ مہلک ہے!

مجھے ستمبر ۱۹۷۳ء سے لیکر مئی ۱۹۷۴ء تک بیٹی مخاندیس جہاں شہزاد کن میسور اور ہندو اس کے اکثر مقالات پر زبان اردو کی مشرو اشاعت کے سلسلے میں جانے کا موقع ملا۔ میں نے ہر مقام پر ہی خوانان اردو سے گفتگو کی۔ ۱۹۷۰ء اردو کی سانی عظمت شیرینی فصاحت بلاغت کے معترف ہیں مگر اس کیساتھ ہی ان حضرات کو اس بات کی سخت شکایت ہے کہ ہندی زبان میں فحش لٹریچر شیب کی طرف بہتے ہوئے مانی کی مانند بڑھتا جا رہا ہے جس کا مطالعہ دماغوں کو تاریک دلوں کو پامال دیرہمتوں کو پست کر رہا ہے۔ عربیاں پسندی قوم کی اخلاقی پستی پر شاید جے اور اس طریانی کی ذمہ دار وہ قابل نفرت ذہنیت ہے جو تاجرانہ خروخ کے ماتحت فحش لٹریچر کو فروغ دینا زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھ رہی ہے میں نے ان تمام حضرات کی شکایات کو عمل سے سنا، افسوس دل سے ان پر غور کیا۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس وقت جہاں فحش افغان اردو کے مقابلے میں مدافعتی اقدامات کی اشد ضرورت ہے وہاں زر پرست اور عربیاں پسند تاجرانہ ذہنیت کا سید باب کرنا بھی ہمارا فرض ہے!

دور سے واپس آنے کے بعد میں نے عزیز بھائی چودھری نذیر احمد صاحب پر دہلی لکچر اردو ادب لطیف لاہور سے گفتگو کی پھر ملک کے چند صاحب الرائے اردو زر پرست حضرات سے مشورہ کیا اور اپنی مجوزہ سکیم انکی خدمت میں پیش کی اور توجہ میں نہایت مسرت کیساتھ اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ ان حضرات نے اس تجویز کو بھی پسند کیا۔ اور ہر طرح آمادہ عمل ہوئے یکم یہ ہے کہ تیار دو بہترین کتابوں کا سٹ شائع کیا کرے گا۔ جو ادب کے ہر موضوع پر مختصر ہو گا اس سٹ میں افسانہ، تاریخ، نظم، سوانح عمری، تنقید، ڈراما، الغرض ہر موضوع پر ایک ایک کتاب محیط ہوگی! اس طرح یہ سٹ ایک قسم کے دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) ہوگا۔

ایک سٹ مکمل ہو چکا ہے جو میں اردو زر پرست حضرات کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔

شرائط یہ ہیں -

سٹ کی قیمت گیارہ روپے ہے۔ ادبی سٹ کے ہر زر پرست کو مکمل سٹ دیتے وقت ساڑھے تین روپے کی پیشگی دینا ہوگی۔ ان رقم ڈیرہ ہندو ہے۔ ہانچ مسلسل قسطوں میں دینا ہوگی اس طرح ہر سٹ ان کی خدمت میں ہر سال پیش کیا جائیگا کہے گا۔ امید واقعی ہے اردو نواز حضرات حسب دستور میری ہمت افزائی فرمائیں گے۔ مکتبہ اردو کے ارباب مل و عقد نہایت دیادہ کی سے کار لے کر اس کام کو شروع کر رہے ہیں۔ مندرجہ بالا تجویز کے ۵۵۰ کے بعد آپ بھی ان کی دیادہ کی کے معترف ہو گئے ہوں گے۔ اس صورت میں ہر ایک اردو دان کا فرض ہے کہ وہ مکتبہ اردو کے کام کو فروغ دے کر اردو کی نشر و اشاعت میں حصہ لے! میں اپنے تمام محترم و معزز ہی خوانان اردو سے قوی توقع رکھتا ہوں کہ وہ دستور سابق اردو کی نشر و اشاعت میں میرا ساتھ بنائیں گے۔ موجودہ صورت حالات میں جب کہ اردو کو مٹانے کی منظم کوشش کی جا رہی ہے۔ اردو دان پبلک کا یہ سمجھ لینا کہ اردو خود بخود ترقی کرتی رہے گی۔ حقیقت کو جھٹلانا اور خود کو لٹلی میں مبتلا کرنا ہے۔ ہم نے صورت حالات سے متاثر ہو کر یہ اقدام کیلئے اور اگر آپ کو اردو سے بے دردی ہے تو آپ کا فرض ہے کہ اس اقدام کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کریں۔ تاکہ ہمارے لئے زیادہ وسیع میدان مل پیدا ہو!

کارکنان مکتبہ اردو نے نہایت قابل ماسب رائے حضرات کے مشورے کے بعد ادبی سٹ شائع کیا ہے۔ جس میں آپ ادب کے ہر اہم موضوع پر ایک مکتبہ اردو کا پائیکل! میں اپنے تمام محترم ہمدردوں کا بھیم قلب شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہی خوانان اردو میری ہمت افزائی فرماتے رہیں گے!

فہرست ادبی سٹ

- (۱) چاند کا گناہ (۲) ترکی مجوریہ (۳) نندہ حرم (۴) ظلم خیالی -
- (۵) لیسن (۶) کپنی کی حکومت (۷) شہنشاہ حبش (۸) حور توں کے افسانے
- (۹) حاجی قی قق کے افسانے - جملہ ۱۰ محکمہ اقامت سلیم گاندھری

# ہر کم اپیلی

کہا۔ جس کی شاخوں سے ٹھٹھکی ہوئی لاجی جنیں زمین کے سینے پر ناگنوں کی طرح لہرا رہی تھیں کچھ دور ایک پرانا ٹشکتہ مندر دکھائی دے، اقد جس کے ستونوں میں قدماست کیوجہ سے غم آگیا تھا۔ اور جس کی سیہ صوبوں کے پائیں کو نہی کا ستر جل اپنے داس سے جہاز رہا تھا کنول کے منوہ بھول پانی کی گود میں جھولا بھول رہے تھے۔ راجہ گھوڑے سے اتر پڑا۔ اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اس نے اور عہد اس کے گھوڑے نے نہی سے خوب سیہ ہو کر پانی پیا پھر راجہ گھاس اور تھوڑے گھوڑے کے پیچے کو پوچھنے لگا۔ ابھی وہ اپنے گھوڑے کی نگہداشت میں مصروف ہی تھا کہ کچھ سے اس نے کچھ گھوڑا ہٹ سنی، "رسالہ ہی کسی کے چلانے کی مدد کم آواز راجہ نے گھر کر تجھے دیکھا۔ اور کیا ایک جیسے کسی نے اس پر جادو کر دیا جو۔ وہ اپنے گھوڑے "بہنی ہستی" اور دنیا کی تمام چیزوں کو بھول گیا۔ کچھ فائدہ پر بھولوں کے ایک خوشنادرخت کے قریب اس نے ایک عورت کو دیکھا۔ شاید وہ بھی کی پری تھی، اس کے گدازبانہ اور پاؤں عریں تھے نہرے ہاؤں سے نیلے پھولوں کا ایک لاجباز شاخوں پر سے ہوتا ہوا، سینے پر آکروٹ رہا تھا، باؤں کی گھٹنگو گھٹائیں، اور اس کی نیلی ستاروں کی طرح گول آنکھیں بجایوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ گال پتل کے تپوں کی طرح اجھر ہوئے اور ہونٹ لائے کے پھولوں کے مانند سرخ تھے حیرت سے اس کے رخسار درخت سے لگے ہوئے پھل کی طرح لال ہو گئے تھے ابھرے ہوئے سینوں کے درمیانی نشیب میں کنول کا ایک نیلا پھول لگا تھا۔ اور ان چھوٹی پہاڑیوں پر بہت کے ڈاکو کسی بھولے بھنگے راہرو کی گھات میں منڈلا رہے تھے۔ اسکا بایاں ہاتھ درخت

آج سے ایک ہزار برس پہلے خوب کے گئے جنگلوں کے پرے ایک راجہ کی راہدہانی تھی۔ لیکن انی ٹری ریاست اور حکومت راجہ اور رانی کی نظروں میں غارتھی، اس لئے کہ ان کا کوئی وارث نہ تھا لیکن ہیشور کی کرپا سے اس آخری جیون میں ان کی آشا پوری ہوئی رد والک بڑھ کر ایک خوبصورت اور توند جوں ہوا اسوقت تک راجہ اور رانی دونوں کے بال یک چلے تھے۔ اور انکی آخری آرزو صرف یہ رہ گئی تھی۔ کہ اب اپنے پتر کی شادی رچائیں۔ لیکن جب والک سے پوچھا گیا تو وہ ہنسا اور بولا۔ کہ بھول کے مچھانے کے بعد کون اس کو لیکر بھرے گا۔ یہ استر کیا کیا ہیں۔ بھول جو صرف اس قابل ہیں کہ انکو جمع کیا جائے۔ جسوقت وہ تازہ اور شگفتہ ہوں اور جس سے وہ مرعبا جاشیں۔ انکو پھینک دیا جائے عقل نہ صرف وہی ہے جو شہد کا کھیوں سے شہد میں طرح حاصل کرے کہ انکی نیش زنی سے محفوظ رہے علاوہ اس کے عورتیں پر بت آگئی، سوری اور دیرا ہیں جو صرف دوسری سے دیکھنے سے سند معلوم ہوتی ہیں۔

ان شہدوں کو سنکر راجہ پتا غم سے پھر پوچھ جاتے وہ سمجھ گئے کہ ان کے پتر کے دل میں عورت کے لئے جگہ نہیں —  
آخر اسی غم میں وہ مر گئے۔

x x x x x

اب رد والک راجہ تھا ایک۔ روز وہ شکار کرتا ہوا ایک گئے جنگل میں جا نکلا۔ اس کا گھوڑا شکار کے تعاقب میں اونچے اونچے در اور غار دار جھاڑیوں میں سے گزرتا ہوا جنگل کے عین درمیان پرچ گیا۔ اور نہی کے قریب ایک پلانے بڑے درخت کے قریب تک

کہنے لگا: میں نے بھی کبھی عورت کو نہیں دیکھا۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ عورت کو دیکھ رہا ہوں گو: میری عمر کا ہر لمحہ اب تک ضائع ہوتا رہا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے تاریک جیون کی نیا یکا یک سورج کے دھماکے میں بنے نئی ہے پھر خاموشی کو توڑتے ہوئے اس نے کہا: اسے نیلے پھولوں سے لہری ہوئی عورت کیا تیری اس گہری سی آنکھوں نے جو مصوہ پتوں کی آنکھوں کے مانند ہیں، کبھی کسی آدمی یا گھوڑے کو نہیں دیکھا۔

وہ چونکی، جیسے کوئی چنے سے بیاہ رہا ہے، پھر قریب آئی اور ہاتھ اٹھایا گویا... وہ اس کے بازوؤں کو پکڑ لینا چاہتی ہے۔ لیکن اس نے صرف اپنی ایک انگلی سے اس کے شانوں کو چھوا، راہ کے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی پھر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر رہ گئی۔

لیکن اسے خوبصورت بہادر اور بڑی آواز والے آدمی! میں نے چیزوں کو کس طرح دیکھی، اس نے کہ نہ تو اس جھگ کے باہر ہی کسی ملاتی ہوں اور نہ کوئی اس طرف آتا ہے، برے بھرتے درخت جیسے تھے چوں جھگ کے بالوں اور سیاہ بڑا باب یہ میری کل کائنات تھی۔

راجہ نے کہا: تمہارا باب: کیا وہ کوئی انسان نہیں ہے؟ اس نے جواب دیا: نہیں، مگر تم انسان ہو، تو وہ نہیں ہے۔ اس کے گرد وہ بوڑھا — بہت بوڑھا ہے۔ اور مجھ سے بھی زیادہ چھوٹا ہے۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال سفید ہیں اس کے بازو اور ہاتھ بڑی کی طرح سخت اور پتلے ہیں۔ وہ ہمیشہ ایک جگہ پر کی طرح بے جس اور خاموش بیٹھا رہتا ہے اور کسی بوڑھے درخت کی طرح لکڑی جکائے، بہ وقت عبادت میں مصروف رہتا ہے اس کا رات اور دنیا دونوں برابر ہیں لیکن نولانا سیدھا، مضبوط اور خوبصورت ہے اور میری طرح وہاں ہے اور قد میں مجھ سے بہت بڑا ہے۔ میں شکل دیرے کا نہ حوں تک پہنچ سکتی ہوں، شیروں کی طرح بال پیڑوں جیسے بازو، تیری ہر چیز مجھے عجیب معلوم ہوتی ہے۔ میرے خیال میں ایسی شکل کبھی نہ ملتی تھی، اس نے کہیں بیشہ انسانوں کے ہاتھ سوچا کرتی، پھر دن خود کرتی کہ وہ کیسے ہوں گے لیکن میرے تصور کی حسین سے حسین شکل بھی ایسی نہ ملتی جیسا کہ تو ہے، تمہارا سہ اعضا

کی ایک شاخ پر تھا، دندواں ایک دوسری نرم شاخ کا گھیرا لیتے تھے اس کے چہرے کے سامنے آکر رک گیا تھا، اس طرح کہ دو میانی لانی انگلی اس سے ہونٹ کے نیچے جیسے کوس کر... رہی تھی۔ راجہ کی طرح اس کی نازک بانہوں اور ہاتھ کے شاعرانہ دائرہ میں مصوہ ہو گئی تھی، مراد پاشا ایک سورتی کی طرح خاموش کھڑی اسے تک رہی تھی دائیں پاؤں کے پنجوں پر اس کے جسم کا سارا بوجھ تھا اور بائیں پاؤں ٹھیک اس کے پیچھے اسبا معلوم ہوتا تھا جیسے حسن برنی کیلین جگر بھرتے یکا یک کسی آئیوانے خواہ کے خوف سے رگ گئی ہو۔ وہ مجھ پر عورت تھی، بجز اس کے کہ نیلے کنوٹی کا جوں اس کے سینے پر دل کے دھڑکنے کی جڑ سے جوں کی طرح اچھل رہا تھا۔

دھماکے تھی دیر تک دونوں ایک دوسرے کو حیرت دے دیتے ہوئے خاموش کھڑے رہے۔ دونوں با... مراد یہ جذبہ کر محبت کے خوابوں کی اس بادگاہ میں پہنچ گئے تھے، جہاں برس لیے معلوم ہوتے ہیں اور دست سسکین لیتا ہو، مردہ پڑا رہتا ہے، آخر اس نے اس کو کوڑا، اور اس قدر نرم بے جس کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا بولی:

”یقیناً تو کوئی آدمی ہے۔“

ہاں اسے اپسرا“ راجہ نے ہیرت سے جواب دیا۔

اس نے پھر پوچھا: اور تیرے ساتھ یہ کیا ہے؟

اور راجہ نے کہا: یہ میرا گھوڑا ہے۔“

تب اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا کر اور تھیلی کو بجاتے ہوئے وہ

بولی:

”اچھا، کچھ دیر ایسے ہی خاموش کھڑے رہو مجھے دونوں کو فوٹے دیکھنے دو۔ اسلئے کہ میں نے آج تک نہ تو کسی آدمی کو دیکھا اور نہ ہی کسی گھوڑے کو۔“

اس کی فوٹیشن کے مطابق وہ ساکت ٹھہرا جگیا، اور دونوں ایک دوسرے کا معائنہ کرتے رہے، اس کی نیلی آنکھیں راجہ کے دل کی گہرائیوں تک پہنچ گئی تھیں۔ اور اس میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں راجہ فطرت میں صرف پاؤں تک لڑا تھا، اور اپنے دل میں

نفاذ میں میرے مازور میرے ہاتھ پاؤں کتنے چھوٹے اور کمزور  
نہیں ہستی وسیع اور میری ہستی چھوٹی اور مختصر ہے :

جب تک وہ ہستی رہی، راجہ اسے دیکھتا رہا۔ اور جب خاموش  
نی تپ جوش مسرت سے ہنس پڑا، اور کہنے لگا :

”خوبصورت نیلی آنکھوں والی ساعہ تجھ کو اپنی شکل کی کا اندازہ  
سے اور نہ تو جانتی ہے کہ وہ کس چیزوں میں پوشیدہ ہے۔ چنانچہ  
کہانی میں کوئی مال بھی رہی یا تو پھولوں کی طرح جنگل سے کسی درخت  
پر پیدا ہو گئی :

تب اس نے کہا ”نہیں میری مال بھی لیکن بہت زمانہ ہوا  
اور چلی گئی۔ میری مال ایک دیوی تھی، اسے اندر اپنے میرے باپ کو  
نے کیجھا اس جنگل میں بھیجا تھا جو اسے دن رات عبادت میں  
لے آتا دیکھنا نہیں جانتی تھی۔ تب وہ اگر کچھ عرصہ تک میرے پتا  
کے با رہی تب وہ چلی گئی۔“ — مجھ کو اور بڑھے باپ کو اس جنگل  
یہ چھوڑ کر اڑتی ہوئی آسمانوں کی طرف چلی گئی :

راجہ نے کہا ”میں تیرے پتا پر دوش نہیں لگا سکتا شاید اپنے  
سے کے جاؤ۔ اسے اسے تیرے پتا کو مسخ کر لیا ہو یقیناً وہ اپنی چلنے  
والی ڈھکی سے زیادہ سندر اور کوئلہ ہی ہوگی اور ایسا ہونا بھی چاہیے  
میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بے پناہ حسن کا اندازہ ٹھیک ٹھیک لگا سکتا  
ہوں میں بڑھ چڑھ چھاپے اپنے گھوڑے کو کسی درخت سے باندھ لینے  
— چ اگر تو عاجز نہ دینی۔ تو ہم دونوں جیہ کر کچھ دیر باتیں کریں گے  
نہ نہ اسے بند لگا اور تجھ کو وہ تمام باتیں بتاؤں گا جو تو نہیں جانتی۔  
تب چہ کہنے کی ضرورت نہیں اور کچھ کہنا بھی ہے، تو صرف اپنے ہی حلقے  
تب مسکراتے ہوئے اس نے کہا : اچھا اس کو باندھ آؤ۔  
راجہ نے ایک لمحہ تک اسے غور سے دیکھا اور پھر کہا :

”یہ آنکھوں والی کیا تو مجھ سے ڈرتی نہیں ؟  
اور اگر کسی بدگمانی کے راجہ کی طرف حیرت سے دیکھتی ہوئی  
— ”دیکھو کس کا کیا آدمی آدمی کو نقصان پہنچا سکتا ہے ؟  
راجہ نے اسکی مسکراتی ہوئی آنکھوں کی کھڑکیوں سے اس  
کی مصوہیت اور اسکے رُوح کی پاکیزگی کو دیکھا اور فرط خوشی سے

قبضہ کر رہنے لگا، اور ہنسنے ہوئے اپنے دل میں کہا : آپ اسکی مددوش  
کن سادگی کتنی لطیف ہے اپنی مصوہیت کی بدست افسوس وہ  
نہیں جانتی کہ وہ ہی کی ۔ اسی ہستی ہے جو ابلا پر حکومت کر سکتی ہے :  
اور تب وہ اس سے مخاطب ہوا : ”حسین جگلی بھول ! اگر میں تجھے توڑ  
لینے کی کوشش کروں اور اپنے گھوڑے پر بٹھا کر تجھے لے جاؤں تب  
بھی ڈرنے کی بات نہیں، اس لئے کہ تیرا خیال ٹھیک ہے۔ انسان  
انسان کو دکھ دینا نہیں جانتا، چونکہ سب ایشور ہی کی بنائی ہوئی  
غفلت ہی تو ہیں — اور مردوں کو اسی لئے قوی اور بہادر پیدا  
کیا، کہ وہ تجھے جیسی نازک اور کوئلہ سستیوں کی حفاظت کرے۔“

پھر راجہ نے دل میں کہا : ”کاش میرے چمکے ہوئے سامنے مجھے  
شام تک تلاش نہ کر سکیں۔ اور پتا بتا کی دیا ہے میں اس کینا کے دل  
پر قبضہ پاؤں، اور اسکو اپنے ساتھ چلنے پر راضی کر لوں — اور  
اگر ایسا نہ ہو تو اس کے ساتھ اس جنگل میں ہمیشہ ہیٹھ کے لئے رہنے  
لوں، اسکی خاطر میں اس جنگل کا کوئی ہر ابھر اور سخت ہی بن جاؤں گا  
تاکہ اس کی نظروں میں تو رہوں۔ خواہ وہ اسے جڑ سے اکٹھا کر صلیک  
ہی کیوں نہ دے۔“

تب اس نے گھوڑے کو دور ایک درخت سے باندھ دیا، اور  
دونوں ٹی کر سبز گھاس سے لدی ہوئی ان سیرمیںوں پر بیٹھ گئے جگے  
قدموں کو ندی کی موجوں آ آ کر چوم رہی تھیں۔

راجہ دیر تک اس کو دیکھتا ہوا خاموش بیٹھا رہا لیکن وہ اس  
کو اس سے زیادہ حیرت سے دیکھتی رہی، ایک پل کے لئے بھی اسکی  
نگاہ اس کے چہرے سے نہ ہٹی، اور یکایک راجہ نے اس سے پوچھا  
” نیلی آنکھوں والی کیا تو بتا سکتی ہے کہ تجھے اس جنگل میں تیرے  
کرتے ہوئے کتنی دیر گزری ؟“

تب اس نے کہا : ”زیادہ نہیں صرف چند لمحوں“  
راجہ بولا ”تو غلطی پر ہے، کئی ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے  
اور جب جنگل کی دوشیزہ نے اسے حیران ہو کر دیکھا، تو راجہ نے کہا  
”اٹ تو کتنی حسین ہے، تیری آنکھیں حیرت سے بھری ہوئی

ہیں اور میرے بدن میں روح مسرت کی فراوانی سے مرز رہی ہے۔  
 موسیٰ! دیکھ اس بچی ہوئی ندی نے جب سے خم لیا ہے اس وقت  
 اسی طرح سو میں مار رہی ہے اور یہاں میں بول تیرے لئے سبک  
 پہلا اسان، کیونکہ اس سے پہلے تو نے کسی انسان کو نہیں دیکھا اور  
 اصرار ہے میرے لئے سبک یہی عورت جس سے میں باتیں کر  
 رہا ہوں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اب تک دنیا کے پہلے انسان  
 کی طرح تاریکی میں تیرے بغیر نہ کر رہا ہوں، مگر تیرا ہنسنے حال  
 شادمانہ سر اور کھیلنا آخر تیرے پایا، جو عورت نہیں بلکہ عورت کے روپ  
 میں کوئی پوری ہوئی ہے اور جب میں تیرے مکہ کی طرف دیکھتا ہوں تو  
 حوش سے میری آتما کا ذرہ ذرہ مسکراتے لگتا ہے۔ اور مجھے ایسا محسوس  
 ہوتا ہے کہ میرے ہر دے کے مندر میں صرف تو ہی توس رہی ہے  
 اور یہ سب صرف چند لمحوں میں ہوا، وہیں لے جیون کا ایک نیا  
 دروازہ ہمارے لئے کھول رہے ہیں۔ شاید یہی ہمارا آغاز اور یہی  
 ہمارا انجام ہے۔

تب اس نے کہا: میں تیرا مطلب نہیں سمجھ سکی، لیکن کہے جا  
 گفتگو کا سلسلہ ختم نہ کرتا کہ میں محسوس دیکھتی رہوں، اور تیری مٹی آنکھ  
 ہمیشہ سنتی رہوں۔

اور راجہ نے کہا: نیلی آنکھوں والی، اگر تو نہیں سمجھ سکی، تو کوئی  
 ہرج نہیں ہو سکتا ہے کہ میرے منہ سے بے تکے اور بے معنی الفاظ  
 نکل رہے ہوں، اس لئے کہ تیرے جاوہرے غینوں نے میرے ہوش  
 و حواس چھین لئے ہیں۔ اور میں نہیں جانتا، کہ مجھے کیا کہنا چاہئے لیکن  
 اب تیری باری ہے۔ اس خاموش سونے جنگل میں تو اکیلی کیا کرتی  
 ہے۔ کیا میرے سوا اور کوئی تیرا ستر بھی ہے؟

جب وہ بولی: میرے ہر دے کو شافی دینے والے بہت ہیں  
 جیگر ہر راجہ جس جو مندر کی گری ہوئی دیوار پر نظر آ رہے ہیں،  
 چڑیاں جو دین بسیرے کو روز یہاں آتی ہیں، اور پھول جیگر خوشبو سے  
 میں اپنے بالوں اور کپڑوں کو بسا رہی ہوں، ان کے علاوہ مجھے اور بھی  
 بہت سے کام رہتے ہیں، کبھی گھومتی ہوئی جگمگ میں بہت دور چلی  
 جاتی ہوں کھینچے ہوئے بند اور بھاگتی ہوئی گم یوں کو پہرہ دیکھتی

رہتی ہوں جب تک جاتی ہوں، تو مٹیہ کر اپنے ہی بالوں سے کھینچتی  
 ہوں، انگلیوں میں لپٹتی ہوں، پھر کھول دیتی ہوں، پھر شانوں پر بکھرا  
 لیتی ہوں، اور کبھی اس کی درازی سے بیزار ہو کر انہیں کس کر دیکھ  
 دیتی ہوں، کیونکہ یہ میرے قد سے زیادہ بڑے ہیں، کبھی اپنے پتہ کو  
 دیکھنے جاتی ہوں، لیکن ان سے ڈرتی ہوں، اس لئے کہ اس کا شیر  
 قود میں رہتا ہے، مگر اس کی روح عالم بالا کی سیر کرتی رہتی ہے اور  
 کبھی جب جو اہم جاتی ہے، تو نہ ہی کے کتابت پاؤں لٹکا کر جاتی  
 ہوں، اور اس کی تہ میں نیلے اکاش پر تیرے ہوئے بادلوں کو دیکھا  
 کرتی ہوں اور ندی خود میری سمجھتی ہے، اس لئے کہ روز میں اس میں  
 اشنان کرتی رہتی ہوں، اور پہرہ میں سوچتی ہوں کہ یہ کہاں سے آئی  
 ہے، اور کہاں جاتی ہے، رکھاں میں تو اس کا رنگ ہی بدل جاتا ہے  
 غصے سے سرخ ہو جاتی ہے، دن بھر شور مچاتی اور بڑبڑاتی ہے، اور  
 کبھی — چند دن اپنے مندر روپ سے پردہ سر کا لیتی ہے  
 تو میں درختوں کی آڑ میں چھپ کر ان ہاتھوں کو دیکھتی ہوں، چند ہی  
 کے کنارے پانی کیلئے راتوں کو منڈلاتے دیکھتے ہیں؟

راجہ نے پوچھا: کیا جاؤ گے کوئی تکلیف نہیں پہناتے؟  
 تب اس نے جواب دیا: نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتے، وہ سب ستر  
 باپ کو خوب جانتے ہیں، جو ان کی زبان جانتا ہے، وہ سب اس  
 سے ڈرتے ہیں، اس لئے کہ اگر وہ ان کو بدعا دیدے، تو وہ ہمیشہ صبر  
 کا شکار رہیں۔

راجہ بولا: ہاں جو تجھے دکھ پہنائیں، حقیقت میں وہ اس قابل ہیں  
 انکو ذہن کے ساتویں طبقے کے نیچے ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا جائے، میں  
 تیرے بوڑھے باپ کا شکر گزار ہوں کہ وہ اپنی و عاکی شہنشاہی سے تجھ کو  
 ہر مصیبت سے محفوظ رکھتا ہے، ان تمام چیزوں کے باوجود تیری  
 زندگی تنہا اور بے مقصد تھی، کیا تو نے کبھی ایسا نہیں چاہا، کہ تیرا ستر  
 تیرے ہی جنس سے کوئی ہو، جو تیرا دل بھلا کرے؟  
 تب ایک خاص انداز سے اس نے سر کو جنبش دیتے ہوئے  
 کہا۔

(باقی آئندہ)

ہدایہ الکریم بی

# سیری انیٹونٹ

سوموار ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو پریس کی انتظامی عدالت میں  
ب مقدر محل رہا تھا۔ یہاں مقدر جس کی مثال پتھر کی بن بوسیدہ  
یادوں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ سیری انیٹونٹ۔ لونی شانزدہم کی  
بہ کا مقدر۔ علی تبار ملک بے یار و مددگار ترقی تہا عدالت کے گنہگار  
میں کھڑی اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کر رہی تھی۔ گزشتہ شب اس  
بزدل جرم گناہی گئی تھی۔ انسانی قسمت کے ایسے دردناک فیصلے  
کے اظہار کے لئے کونسے الفاظ مؤثر ہو سکتے ہیں؟ صرف غمناکی!

اس قسم کے اہم انجیز اور خونا ک شائع کی حامل مثل شاید ہی  
کبھی مرتب کی گئی ہو۔ گرد و پیش کا منظر ایک بیباک تصویر پیش  
کر رہا تھا۔ ہر چیز سے غصہ ٹپک رہی تھی۔ مثل کا سر زار زور تھا  
۷۔ سمیت ناک تصویر صالت، ہر چیز گویا موت کا پیغام تھی۔ صفائی  
کے جو گواہ طلب کئے گئے تھے، وہ خود مصیب موت کا اعلان کر رہے  
تھے۔ بسا و ہر نگاہ کاؤٹ اینگ جو خود کو محب وطن ثابت کرنے کے  
لئے بقرار تھا۔ بچاؤ کا کوئی پہلو نہیں پاسکتا تھا۔ اور بلی جو اس کے  
جواب میں کہ آیا وہ طرز کو جانتا ہے، اسکی طرف تظہیر جھک کر جواب  
دیتا ہے۔

”ہاں! میں میڈم کو جانتا ہوں! بالکل جیس تھا سابق وطن سے  
اور سابق دوزخ جی قسمت کا ستارہ ڈوب چکا تھا۔ وہاں حاضر تھے۔  
برطانیہ انصوفی برجیانب یاوسی اپنے بچائے سب دشمن۔

سیری انیٹونٹ فرائض کی فکر اس انتہائی بیماری کے عالم میں  
بھی مطمئن نظر آ رہی تھی، فرد جرم سنگراس کے پہرے پر گھبراہٹ کے  
ضعیف تریں آثار بھی نمودار نہیں ہوئے۔ گناہ کا ہے، اسکی انگلیوں  
میں جنبش پیدا ہو جاتی، جیسے چنانچہ بجا رہی ہو، وہ اپنے شانہ و قارۃ  
شان و شوکت کو بالکل برقرار رکھے ہوئے تھی۔ اس کے چہرے

تیں نے اسکا جواب نہیں دیا ہے۔ کیونکہ ایک ماں کے خلاف  
ایسے اتہام کا جواب دینے سے قنوت اٹھا کر کرتی ہے۔ میں اس نام  
ماؤں کی تہہ اس طرف ملائی ہوں جو یہاں ہیں۔ اس پریرے  
ایک مشہور بریٹر نے جب یہ سنا۔ تو اس نے سیرٹ کی سمیت  
پر بہت پیچ و تاب کھائے، مگر کچھ ہوسکتا تھا؟

آخر برہ واد کی صبح چار بجے دو دن اور دو راتوں کے متواتر سوال  
در جواب۔ تہمت تراشیوں، ریاکاریوں، سکھارانہ چالوں کے بعد نتیجہ  
برآمد ہوتا ہے۔ سرائے موت! کچھ کہنا چاہتی ہو؟  
لمرد نے زبان سے کچھ کہے بغیر سر اڑا دیا۔ آخر شب کے چراغ  
ٹمٹما رہے ہیں۔ اور اسکی نسیج حیات جی گئی ہو رہی ہے۔ عدالت میں  
سوائے اس جگہ کے جہاں وہ کھڑی ہے روشنی دھندلی ہے۔ وہ  
خاموشی کے ساتھ موت کی آغوش میں ابدی نیند سو جانے کے لئے  
چلی جاتی ہے۔

دو جلوس جن کو تیس سال کا وقفہ ایک دوسرے سے جدا کرتا





سعود جاوید

# نگہت کے خط

نشاط روح :

نہایت یا مکتوب شوق ایک نکتے سے گایا ہوا دکھا ہے اور میں نے اس لئے اب تک جواب نہ لکھا کہ میری تعریفیں نکھاری گئی سلفی تہوار جذبہ شکوہ گزاری کہیں نہیں نہ جہانے جس نامہ اذق ب نہ بظاہر کے کبھی دست کی کا خوب جی نہ دیکھا ہو — جس بظہت نہ لگے کسی اس سپردگی بے اختیار کہ تجربہ نہ کیا ہو جس کے مقدس وجود کا اعتراف کر کے مذہب و خلق نے بھی عورت کے لئے کچھ دیر کیے ترک کیا گوارا کر دیا — اس نامہ اذق ب جہان نہ لگے کیلئے ایک محبت کرنے والی بستی کی شکوہ سنچیاں کیے ہیں اس کا جواب تم مجھ سے نہ چھوڑو — میں جی ہتی ہوں گرا حاشا رہوں اور تم کبھی ہنس کر کبھی پرہم ہو کر اپنی محبت کے سامنے جھکنا جھکنا کر شکایات لطیف کی راگینیں خلیق کرتی رہو جی اپنے معصوم جسم کی بوجھ میں مجھے شرابور کرو اور کبھی پی کیو پڑے کی کمان بھی محبت آئیں پشانی پر سین ٹکس ڈال کر مجھے اپنے خلوص کی پوری قوتوں کے ساتھ سخت رست کہنی ملی جاؤ۔ اور پھر تبسم دیکھنے کی کوششوں میں اکام ہو کر جب تم خود بھی مضی ہو کر پیچیدہ ہو تو میں اپنے پشیمان آنسوؤں کے درمیان سکراتی موٹی مبادی بلوریں کروں میں اپنے اذہمائل کروں!! — تم ہنس رہی ہو پردیسی میری دیوانگی پر؟ — ہاں خوب ہنسو — اذہمائل خلقت کے یہ تین برپہ در سال ستاروں اور اشکوں کی موجودگی میں بسر کرنے کے بعد اب میں بھی مہنا چاہتی ہوں آہ تم عاقبتی نہیں سکی نہبت کی اس خلق تشنگی کو جو انسان اور خصوصاً عورت کے غیر میں حلیل لگوں کٹی ہے۔ محبت عورت کا جہلی مذہب ہے جس طرح اس نے دنیا میں کسی مذہب کا پابند ہونے بغیر نہ وہ نہیں رہ سکتا اسی طرح عورت کے لئے اسکا یہ جہلی مسلک ناگزیر ہے۔ عورت کسی حال میں جو اس

کی اذہمائل مقدس تقاضا اچانک ہو کر رہتا ہے۔ اذہمائل سے پہلے وہ اپنی دنیا کو چاہتی ہے اور اپنے قریب ترین اعزاء کو — اذہمائل پر وہ شوہر کی پوجا کرتی ہے اور پھر اپنی اولاد کا پرہم — اور کبھی محبت کا یہ فزنی مظہر ہی بند تیز شہ ہے۔ چہ اگر کوئی عورت — پرہم کی مادی دیکھ عورت — سماج کی ستانی ہوئی نیم جان عورت اپنے شوہر کی نہ ہوں کی فزنی اور کیفیت سے اپنی محبت کو ارتقا کے بلند ترین درجے پر روانہ نہ کر سکتی پرہم ہو کر دیکھئے تو تم ہی بتاؤ کہ وہ پرہم کر خود یا کلاذہمائل سے تو کیا کرے اور اگر مذہب و اخلاق کے قوانین کا احترام کر کے وہ اس جواں مرگ سے دست کش ہو کر نہ لگے بھی رہے تو اس خود کا فزیب حیات دینے کا ذریعہ تم جی بے لوث دوستوں کے علاوہ اور کہاں مل سکتا ہے مجھے اس سہ ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو لیکن جی کبھی اپنی نارادوں کے تحت یہ احساس بھی ایک خود فزیب معلوم ہوتا ہے اور تہاری محبت کا یقین پھر اس وقت تک نہیں آتا جب تک تم اپنے معصوم شکوں کا کوئی شیریں وجاں آئیں تیر میرے دل کی گہرائیوں میں پوست نہیں کر دیتی ہو — ایک بے جس چٹان پر تھی تھی مچوں کا کیا اثر جب تک کہ کوئی طاقتور سیلاب اس چٹان سے متصادم نہ ہو — پھر مجھ سے زیادہ جس چٹان کا اطلاق اور کس پر ہو سکتا ہے اور تہاری شکایت ہائے زنجیں سے زیادہ اور کس چیز کو طاقتور سیلاب سے تعبیر کیا جاسکتا ہے؟ تم بوجھتی ہو کہ میں شعر بھی کہہ لیتی ہوں کہ نہیں؟ — کتنا معصوم ستھار ہے! تم نے یہ لہ کیوں نہ کیا کہ تم دیکھ لیتی ہو کہ نہیں؟ — ہمیں کلام نہیں کہ اتنی مدت تک میری دوست اور ہراندہ بننے کے وجود تم نے میری دوسرا لہ کو نہیں سنا شاید اسی لئے کہ میں خود بھی استثنیٰ فی تصور نہیں کرتی لیکن کیا تم اب تک صرف اس قدر ہی تصور نہیں کر سکتیں کہ محبت کی نہ ملنے کا فرض ایک لہ بہ سونہی

انکھیں کی تسوہیں جاتی تھیں یہ ہے : پہلے فرادی محراب فرما دیوں  
مر رہی ہوں اور مر سکتی نہیں : آئے اب تک میں تمہیں کس یادوں  
میری بربادی سے نصیب تھا تمہیں : در نہ میں بربادی برباد ہوں

.....

دل بھی اب بونے لگا ہے اے درد  
دیکھ لے آتسو میں سرخ آگ  
تم سے تو اچھی تہب رہی یاد ہے !  
آئی اور آکر ہمیں بہلا گئی :

اب کہاں خونِ تشا کی وہ پیہم بارش  
اب تو دامن کی طرت دیکھ کے رویتی ہوں

.....

تمہیں نہ چاہو تو بتاؤ پھر کہاں سے آئے  
وہ صبر جس کو تمہا رہی مجھ نے ٹوٹا تھا  
جولب تک آکے غوشی میں کھو گئی ہائے  
اس ایک آہ میں کس کو خبر ہے کیا کیا تھا

.....

ناچیز آنسوؤں کی اللہ سے قسم و نیت  
ہم حال کہہ رہے ہیں وہ مسکرا رہے ہیں  
یہ ہے میری وہ درو سرائی جس کے سننے کے واسطے تم استعد  
ہے تاجیوں کا مظاہرہ کر چکی ہو : اب تم خود ہی کہو کہ مجھ سے کوئی سننے  
کی چیز ہے ؟

توہ : کیسے ہیں : — اس کا جواب میں دوں تو کیا : —  
کاش تمہیں اپنا تلخ دکھا سکتی کہ اس پر کتنے زخموں کا اضافہ ہو چکا  
ہے : اس میں شک نہیں کہ ان کے تیرو سنال کی طرت سے اپنے  
پہلو کو بے جس دنگیں بنانے کی کوشش کرتی ہوں : لیکن میری  
مجدد کی اس تہ کے نیچے سوئی ہوئی انسانی کمزوری تو دوزخ میں کھینچ گئی  
ہاں یہ خبر صبح ہے کہ میں دوبار سینما جا چکی ہوں : تم جانتی ہو کہ  
کہیں سینما کے فلات کس درجہ شدید جذبات رکھتی تھی : وہ

کی : — ایک راگنی ہے کسی برہ کی ماری نیوگنی کی — یہ حقیقت  
ہے کہ محبت اور شاعری میں چونی دامن کا ساتھ ہے خصوصاً اس قسم  
کی شاعری میں جسے صفت میرا بانی کی قورہ سراہیوں سے تعبیر کیا جا سکتا  
ہے : — اور یہ بھی حقیقت ہے کہ محبت کا قلب اب تک اس  
نہیں چپک سے مانوس ہے : — اور اس لئے شاید کوئی کہہ دے  
کہ تو شعر کیسے کہہ سکتی ہے : لیکن اگر شاعری صرت جذباتِ حزن و طرب  
کی ترجمانی ہے : تو میں کہوں گی کہ میرے دل سے زیادہ حزن و طل اور  
کہاں ملے گا : — میں محبت سے محروم ہوں — صبح — لیکن  
پنے پلے اس جاں موز مخرو کا احساس بھی تو رکھتی ہوں : کیا یہاں  
جذبات کو : — تجنن اور لبوں کو ترنم کر دینے کیلئے کافی نہیں ؟

ہاں جس نے اب تک جو کچھ کہا ہے اسے شاعری نہیں سمجھی  
پاس ان پریشان خیالیوں کا کئی ذخیرہ جمع ہو چکا ہے : مات کے سنا  
میں : — دوپہر کے سکوت میں : — شام کی خاموشیوں میں : —  
سوئے جا گئے : — دلی چند دھڑکیں زپ کر افسانہ کی صورت میں  
لبوں سے باہر نکل پڑتی ہیں : جن کے اندر نہ کوئی ربط ہوتا ہے : اور نہ کوئی  
سلسلہ : — وزن اور قافیہ کا وجود نہ ہوتا : تو میں ان کو ٹرپی کہہ دیتی  
خدا جانے یہ کیا ہے : — تم مصرعہ تو سنائے دیتی ہوں : مگر صرت  
یہ پوچھنے کے واسطے کہ تم ان منتر شینوں کو کیا سمجھتی ہو : — لیکن پہلے  
یہ خوب سمجھ لو کہ ان ہائے جذبات کا مخاطب کوئی نہیں : کر بے کراہ  
کی یہ آنازیں کس کے سنانے کو بلند لگتی ہیں : اس کا جواب خود مجھے بھی  
معلوم نہیں : — میں نے تو جو کچھ محسوس کیا کہہ دیا :

مات میرے سر میں غمت درد تھا اور کسی طرح غینہ نہ آتی تھی :  
" وہ حسب قاعدہ میری بھلائی سے بے نیاز اپنا لب لہا کرتا : انا سے پڑ  
سورہ ہے تھے : ان ہنے چن لہات میں تنہائی کے احساسات کو دور  
نرت داسے میں نے مجھ پر ادب لطیف کا سالنامہ دیکھنا شروع  
کیا : لیکن درد کے باعث دواسی دیر میں سرگھونے لگا : مجھ کو رسلہ  
بند کر دیا اور چپ چاپ لیٹ گئی : مندرجہ ذیل اشعار اسی وقت  
کی کیفیات سے متعلق ہیں : —

یہ کرم بھی کم ہے کیا ستیا و کا : قید کی دھت میں آزاد ہوں

اور اب غالباً تم سب کچھ کو حاصل کر کے پناہ پرست ہو گئی ہو  
ہاں ضرور ہو جاؤ مگر اتنا خیال کرو کہ آخر دنیا کا یہ نظام بھی قائم نہ رہے  
دوگی یا نہیں؟ مصر کی ماہ جس ملک قلوب پر نہ، حساس مجال کے نشہ  
میں بدست ہو کر سلطنتوں کو ٹھکر کر پامال کر دیا۔ ورسینگر طس جوائیو  
کو صوف ایک لمبی نشاط کی خاطر زہر کے جام پلوادیے۔ خندانہ  
کرسے کہ قلوب پر نہ بنو۔ لیکن کیا میری زندگی کو بھی تم انطوائی کی طرح سحر  
کردینا چاہتی ہو، اور اس قدر سحر کر دینا کہ سب کچھ چھوڑ کر تباری ہو جاؤں  
اگر خدا ناکردہ یہی ارادہ ہے تو میرے علان خود تمہارے ان کا....  
بس اللہ ہی سہی ہے۔ شاعر تو وہ پہلے ہی سے ہیں۔ اور تم جانتی  
ہو کہ شاعری سے آگے دوسری منزل مجذوبیت ہی کی ہے!! یہ  
کوئی ہمارے وہ نہ باشد کہ زمین جنبہ زماں جنبہ جنبہ گل محمد  
— یا عقل شریف میں؟

انسانے؟ — جی ہاں انسانے مجھے بہت محبوب ہیں میری  
تقریریں رسائی میں اولیں کام ہی کرتی ہیں کہ انسانے تلاش کریں  
تم نے یہ تذکرہ کا صفت چھیڑا ہے۔ تو اب صاف صاف مجھے کس ہوا  
رسالی میں یہ بلاناہ شائع ہونے والی داستانیں جن کو انسانہ کہا جاتا  
ہے پچانوے فیصدی خرافات سے زیادہ نہیں ہیں تم خود جانتی ہو  
کہ انسانہ جب تک حیات انسانی سے مربوط نہ ہوتی تھا کہ اسے انسانہ  
نہیں ہو سکتا۔ ہمارے انسانے حیات انسانی سے مربوط تو ہیں، مگر  
صرف اس شعبہ حیات میں جس کے جذبات سے جوڑ ہو کر غم نہجیاں  
کرنا ایک ترقی یافتہ قوم کی کو ذریعہ ہے۔ ہمارے انسانے صرف  
واردات محبت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور وہ بھی بعض اوقات بہت  
ترین انداز میں۔ یہی وجہ ہے کہ تم بلا سالفہ ہر ایک انسانے کا  
مطالعہ کئے بغیر یہ بتا سکتی ہو کہ اس میں ایک ہیرو ہو گا، ایک ہیروئن  
دونوں میں سے کوئی ایک محبت کرے گا یا دونوں — اور انجام ہو گا  
شادی پر یا موت پر! — یہ ہے وہ عالمگیر خاک جس پر اردن کے  
کے کم و بیش تمام تمہا انسانے محیط نظر آتے ہیں۔ یہی سبب ہے  
کہ ان میں یکسانیت اور یکجہتی ہوتی ہے۔ تنوع نہیں۔ جس  
طرح زندگی کا کوئی ایک واقعہ ایک شاعر سے اشعار موزوں کر لیتا

جذبات آج بھی موجود ہیں۔ میرے نزدیک سینما آج بھی ایک مخرب  
ذائقہ اور دشمن اخلاق چیز ہے۔ لیکن جب طبع ایک جاں بلب مرضی  
کے واسطے شرب کا استعمال جائز ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ ہو وعب  
اور نشاط نفس کے ذرائع میرے واسطے کھل گئے ہیں۔ پھر میں ہاں  
اس لئے نہیں جاتی کہ فلم کی مشورہ فروش اداکاروں سے محظوظ اور  
اسکے انسانے کی پیش پرستیوں سے متکلیف ہوں۔ حاشا ہرگز  
نہیں۔ — یاد رکھو میرے واسطے تو سینما کے ہر تکلف الہ و ایک  
قبرستان میں بیٹھا برابر ہے۔ آہ — سماج کے خوں ریز اصولوں  
نے میرے مسترت و تفریح کے تمام جذبات کو ذبح کر ڈالا ہے جس  
عورت کے پہلو میں اپنے شوہر کی بے حسی اور بے نیازی ہمیشہ ایک  
خون آشام کانٹے کی طرح مٹکتی ہو، وہ سینما کی تفریح سے کیا خط افتاد  
ہو گی؟ — شوہر عورت کا ذیوتا ہے، اور جب یہ دو تاجی ایک  
پتھر کی موتی بن جائے، تو پھر ساری دنیا بھی قسم ہی قسم بن جائے  
تو کیا — آہ! پڑاؤں

مے سے مرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو  
ایک گونہ بخود ہی مجھے دن رات چاہیے  
کہو ہمارے بہتیا تو اچھے ہیں ناہ — ان کے پارہ ہائے  
جذبات سننے ہوئے تو مدت ہو گئی۔ اگر احساسات و رشک جلدت  
ویں تو سراسر اسلام کہہ دینا ان سے۔

تمہاری نگہت

سرایہ انسانہ!

خوب! — قسم کھاتی ہو کہ اب کبھی شکوہ نہ کرو گی۔ —  
گویا یہ جواب دیا ہے تم نے میری محبت کی ان بچاؤ گیوں کا جو تمہاری  
شکایات کو میرے لئے باعث تسکین بنائے ہوئے ہیں؟ — تم  
بہت شوخ ہو چلی ہو پھر دیکھو! اگر ان معصوم شہزادوں کا یہی ارتقا  
رہا، تو مجھ جیسی نحیف و نازکے پاس تو بڑپنے کی بھی سکت نہ رہے گی  
شاید سینہ زدن نے کہا تھا — وہ محبت کرنا کچھ نہیں، محبت کیا جانا  
البتہ کچھ ہے۔ مگر محبت کے بدلے محبت کیا جانا سب کچھ ہے۔

مواقع کے اندر افسانہ نویس کو اپنے قارئین کی مینافٹ و بصیرت کا کوئی سامان نظر نہیں آتا؟ — اس میں شک نہیں کہ افسانے پڑھنے والے کم از کم میرے حیاں میں محبت ناگزیر ہے۔

انسان نویں ایک نئے لطیف ہے اور تمام ذہن لطیفہ جمالیات کے انہار کا آئینہ ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ جو افسانہ صرف عاشقانہ انہار پر ختم ہوتا ہے۔ وہ خواہ قارئین کے جمالیاتی ذوق کی تشنگی کو کدے میں رکھ دے۔ عاقبت اسے ہونے کے اہم ترین فرض کو انجام نہیں دے سکتا۔ تو یہ! — میں نے جانے کیا کیا کئے گئے۔ تم کہتی ہو گی مجھ کو دیوانی ہے ایک بات پوچھ کر دس جھڑانا دشتیاد ہو گیا۔

میں افسانہ لکھتی ہوں یا نہیں؟ — وہ! یہ تمہیں خوب سوچی! افسانہ لکھنا دی پر میں نے اردو اور انگریزی کی چند کتابیں ضرور دیکھی ہیں۔ لیکن اسکا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں خود بھی کوئی کہانی تخلیق کر سکتی ہوں۔

— یہ میری زندگی تو خود ایک جالگاز افسانہ ہے قدرت کے قلم کا۔ — اور اسے تحریری صورت میں پہنچنے کے لئے بھی ضرور افسانہ نگاروں کی ذہنیت کے انقلاب کی ضرورت ہے۔ ”محبت پریشاں“

اسی طرح وہ ایک افسانہ نگار کے قلم کو کہانی تخلیق کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لہذا یہ ظاہر ہے کہ ایک کا سیب افسانہ زندگی کے کسی حقیقی یا قیاسی و اسکاکی زندگی تفسیر ہونا چاہیے۔ لیکن حیرت ہے کہ اگرچہ زندگی کا کوئی ایک واقعہ دوسرے سے ملتا جلتا نہیں ہوتا، مگر ان کے تقابلیہ کی یہ افسانوی تصویریں بالکل ایک دوسرے سے وکس معلوم ہوتی ہیں۔ — کیوں؟ — صرف اس لئے کہ ہمارے افسانے بہت کم زندگی کے حقیقی یا اسکاکی واقعات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ افسانہ نگاروں میں شاید وہ حیات اور تنقید زندگی کی اہمیت ہی نہیں حالانکہ ایک افسانہ نویس کے لئے مفید حیات کا فرض اتنا ہی لازم ہے، جتنا کہ دیکھنے کیلئے آنکھیں۔ — مگر کوئی چاہے تو کیا ہمارے سامنے کے حدود میں افسانہ نویسی تک لئے کچھ کم مانا ہو جو ہے؟ معصوم دوستو! ان کیوں کے خشک معصوم پر غمان ان! — ہرگز! گوئی عظمت کا تیر خیر کہ کر بیا از دواج کے سننے میں جبر و فہرناں کہلایا جاتا ہے۔ — جب رہم کی زبان کا پندرب و خلق کے صحیح اصولوں بصیرت یز صاف کیلئے انتخاب شوہر کے لئے میں مشرت کی میں پردہ و شیرہ کی خاموشی کو نیمہ رضا سمجھ لیا جاتا ہے۔ — جب صرف دوست اور ومارنسبی کیلئے سماج نو جوان ہستوں کی زندگی خود ان کے وادہ بین کے ہاتھوں تفسیر کے واسطے ہر باور کر دیتا ہے۔ — کیا ان تمام

محبت پریشاں

## نالہ دل

اختر انصاری  
بلی اسے آفر

ہاتھ وہ بستیاں اجسرتی ہیں  
انہ میری آنکھیں چمکی پڑتی ہیں  
اے دل اپنی متاع سے ہشیار  
اے دل اپنی متاع سے ہشیار  
شکوہ کیوں کیجے کہ تقدیر میں  
یونہی بنتی ہیں اور سبکداری میں  
رات بھگی ہے اور حواہی خشک  
قلمندہ میندی پھواریں پرتی ہیں

لیکن خستہ تیسری آنکھوں سے  
کیسی چکا ریا سی جسرتی میں

سید نعیم جعفری  
بی۔ اے

# ... کی طرف تے جاوے

سلام اسے یزیم غم، اب محفل عشرت کو جاتا ہوں  
ہجوم پیاس میں سرخسہ، راحت کو پاتا ہوں  
مری جنت جہاں ہے، میں ہی جنت کو جاتا ہوں  
اڑا جاتا ہوں میں، اک نغمہ بے تاب کی صورت  
کسی نہ ہرہ بدن کے آسمانی خواب کی صورت

یہ وادی نو بہاروں کی، یہ وادی نغمہ زاروں کی  
یہ وادی، روو باروں کی، یہ وادی آبشاروں کی  
یہ وادی ماہ پاروں کی، یہ وادی چاند تاروں کی  
مرے خوابوں کی شہزادی اسی وادی میں تہی ہے  
وہ روح جان آبادی اس آبادی میں رہتی ہے

وہاں خوابیدہ قسمت کو جگانے جا رہا ہوں میں  
بلایا جا رہا ہوں، اور بلانے جا رہا ہوں میں  
خود اپنے ہاتھ سے بگڑی بنانے جا رہا ہوں میں  
بہت دلشاد جاتا ہوں، بڑا مسرور رہتا ہوں  
لیکات کو نہ، مانتے نہ برقی طور جاتا ہوں

جہاں وہ حور — حور آسمانی بن کے رہتی ہے  
 شباب و شعر کی رنگیں کہانی بن کے رہتی ہے  
 نہیں پر۔ چاند تاروں کی جوانی بن کے رہتی ہے  
 چلا جاتا ہوں سیل کیف و مستی کے سہا رے پر  
 بھی جاتی ہے، میری رُح اس لنگہ کے دھائے پر  
 میں جاؤں گا اور اپنے مشق کے نغمے سناؤں گا  
 وہ میرے گیت گائے گی، میں اس کے گیت گائوں گا  
 اور اپنی رس بھری تانوں سے تارے توڑاؤں گا

مری دنیا بنے گی اک بہار و رنگ کی دنیا  
 شباب و شعر و مستی — نغمہ و آہنگ کی دنیا

ستم کو بھول جاؤں گا، جفا کو بھول جاؤں گا  
 زمانے کے ہر اندوہ و بلا کو بھول جاؤں گا  
 محبت کی قسم ہے میں خدا کو بھول جاؤں گا

~~~~~

شعلے

پہننی کی حکومت

فطرت، انسانی کے اسرار و رموز، شکار گریز، لے یا کار کی خوش خاشاک  
 جہاں دینے والے

افسانے

حسن و اعلیٰ، مہربان و محنت، غربت و غیرت کی کش مکش  
 دوسرا دینش کثرت و طباعت نہایت علی دیدہ زیب  
 قیمت مجلد عدد

گبن کا رانل اور سیکالے کے طرز میں چہند دست کے اس مدرساں دور  
 پر آشوب کی داستان جو خستہ سے خستہ تک پھیلا ہوا ہے  
 تاریخ کے، قصادی قلوب کی تشریح ہرگز نہیں خیر، معاذ بنیاں پر جوش ہر  
 ایک لفظ لاری کا خون گرا رہے کیلئے کافی ہے

تاریخ . . . . . ادب . . . . . تنقید  
 کتابت و طباعت نہایت دلانیز قیمت

مکتبہ آرزو لاہور





خونخوار انکیں اس کے چہرے کے قریب آگئی تھیں۔ کیوں کہ وہ  
پاجامی، یہاں تک تاپ رہے ہو۔۔۔ مصلحت نے گرج  
کر کہا۔

”مختار! میں بوڑھا۔ بوڑھا آگے وہ کچھ نہ کہہ  
سکتا۔ اور اس کے حلق میں ایک گتھی تھی۔ وہ اپنے ظالم آٹکے  
چہرے پر صوف بھجیانہ نظریں ڈال کر رہ گیا۔

”تم کام کرنا نہیں چاہتے پاجامی!۔۔۔  
یہ کہنے ہوئے مصلحت نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اور اپنا ہاتھ ایک  
غلام کی طرف بڑھایا۔ غلام نے چاہے اس کے ہاتھ میں دی سی۔  
پتہ نہ دیا۔ مصلحت نے انکیں پھاڑ پھاڑ کر مصلحت اور چاہے کو  
دیکھا۔ آخری بار اس کی انتہائی گتھیوں نے زبان خاموشی سے  
جھپٹنے کی شکلہ روز نظروں سے جم کی جھپٹ مائی۔ اور اپنے ہاتھ  
مصلحت کے ہاتھوں کی طرف بڑھائے۔

”شمار کی آواز نہیں آتی۔ اور اس کے جھڑی دار ہاتھ پر  
چاہے کا نشان اس طرح نظر آئے گا۔ جس طرح جیسے مجھے جنگل  
پر دھوئیں کی ایک کثیف چادر چھانی ہوئی ہو۔ ظلم کی مشینیں  
اپنا کام کرنے لگی۔ اور ضیافت تبسم کی کھال پر سے پرزے مرنے  
لگی۔ ظالم سردار کے لئے اس قسم کے ظلم کا مظاہرہ روزمرہ معمول  
تھا۔ قدرت نے اسے یہ ایسی اس لئے کیا تھا کہ وہ بے کس  
انسانوں کی کھال ادھیرے، مکروہ مخلوق کے سینے کو اپنے پاؤں  
کے نیچے پکڑے، وہ خلق خدا کے خون سے ہولی کھیلے۔ کوئی سفاکی  
مٹتی جس سے اس کے خونخوار دل نے پرہیز کیا تھا، کون سا ستم  
تھا جس سے اس کا دامن حیات بے داغ تھا؟

سچی تین سو سال پیشتر اس نے ارض سامین پر بے کسی کی  
حالت میں قائم رکھے تھے۔ اس کے ساتھ تین چار آدمی تھے۔  
شہانہ رز محنت کے بند وہ غاروں میں سے چند چمکتے ہوئے  
مکڑے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ مصلحت کی زندگی  
کی پہلی کامیابی تھی۔ اس کے بعد اس کی دولت کے بنائے  
اضافہ ہونے لگا اور جیسے جیسے اس کی طاقت بڑھتی گئی

اس کے مظالم بھی بڑھتے گئے۔ اسے ظلم سے کون روک سکتا تھا،  
ارض سامین ایک بٹھرا علاقہ تھا۔ زمین طرف سے پہاڑوں میں  
گھرا ہوا۔۔۔ آباہی سے کوسوں دُور۔

مصلحت کا جہاز سال میں ایک مرتبہ میرے اور جوا سراٹ  
سے کروانا ہوتا تھا۔ اور کچھ مدت کے بعد علاوہ ضروریات زندگی  
کے چند اُن بدغیب انسانوں کو بھی لے جاتا تھا۔ جنہیں مصلحت  
یا اس کے ساتھی لالچ وغیرہ دے کر جہاز میں سوار کر لیتے تھے۔  
مصلحت ان بد بختوں کو نہ بڑے غلام بھجھتا تھا۔ اُرداں نہ۔ ایسے  
ایسے ظلم کرتا جن کا تصور بھی ایک دہذب ذہن میں نہیں آ  
سکتا۔

سیح سے لے کر شام تک یہ تیکس غلام اُل چلا کر اس کے  
کھیتوں اور باغوں کو سرسبز کرتے۔ اور بڑے بڑے پتھروں سے  
اس کے عالیشان مکانات تعمیر کرتے۔ اگرچہ ہر ایک غلام مشقت  
سے باوگراں کے نیچے کچلا جا رہا تھا، پھر بھی اگر کوئی شکوہ کرتا یا  
چند منٹ کے لئے آرام لیتا تو ظالم مصلحت کی چاہے سے اس  
کی کھال اُدھرنے لگتی۔ ظالم مصلحت کبھی یہ خیال بھی نہیں کر  
سکتا تھا۔ کہ اس کی عدول مکی ہو سکتی ہے۔

ارض سامین میں اُس کے دو نام تھے۔ ایک مختار تھا،  
اور دوسرا خونخوار بھڑا۔ یہ ایک شخص اس کے سامنے اسے مختار  
آواز کرتا اور ہر ایک غلام اس کی عدم موجودگی میں اسے خونخوار  
بھڑا پکارتا۔ وہ یقیناً خونخوار بھڑا تھا۔ انسانیت کا گوشت کھانے  
والا سیکسوں پر پے در پے ظلم ڈھانسنے والا سفاک ظالم خونخوار  
بھڑا۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ اور ہر دن کے گزرنے پر اس  
کی خونخوارانہ خوشی میں ترقی ہو رہی تھی، وقت بیت رہا تھا۔ اور  
وقت کے ہر لمحے پر مظلوموں کی مظلومیت میں اضافہ ہوتا جا  
رہا تھا۔

مظلوم بوڑھا گر پڑا۔ اس کے جسم سے خون نکل نکل کر جم گیا  
تھا۔ مگر ابھی تک بھڑیہ کے سفاک دل کی تشنگی نہیں بجھی تھی۔

پتھر پتھر کر رہے تھے۔ لگا۔ جھونپڑی میں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا چند منٹ کے بعد دروازہ کھلا۔ اور ایک بیمار غلام اندر داخل ہوا۔

”رو کیوں رہے سو سہیل؟“ اس نے پتھر پتھر کے پاس آکر کہا۔

”ڈر لگتا ہے؟“ سہیل نے کہا۔

مریض نے آہ بھری اور چہرہ پر اند شہادت سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ”میری گود میں سو رہو!“

”میں چھپا کے پاس جاؤں گا“ اس نے دوتے ہوئے کہا۔

”لمبارا چھا ابھی آجائے گا؟“

چند منٹ تو سہیل خاموش رہا۔ پھر چیخ مچھ کر دوتے

لگا طوعا کر یا۔ بیمار نے مریض نے سہیل کو گود میں اٹھایا اور

جھونپڑی کے باہر آکر چلنے لگا۔ کچھ دیر وہ چلتا رہا۔ پھر اچانک

ایک شخص اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ دونوں کی آنکھیں چار

ہوئیں اور اجنبی چپ چاپ وہاں چلا گیا۔ اور مریض پھر چلنے

لگا۔ چند منٹ کے بعد وہ ایک جھونپڑی کے دروازے پر

کھڑا تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔

دروازہ کھلا اور ایک شخص باہر آیا۔

”یہ چھا چھا کر رہا ہے؟“ مریض نے سہیل کے سر پر

ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”اسے کیوں لے آئے۔۔۔ خیر“ وہ اندھ کھولنے والے

شخص نے کہا۔ ”اندھ سہیل کو اندھ لے گیا۔“

جھونپڑی میں ایک پتھر کے اوپر مٹی کا چراغ جل رہا

تھا جس کی بدیم روشنی ایک چھوٹے سے گوشے میں تار کی کو

چوس رہی تھی۔ پتھر کے پاس سہیل کا چھا کھڑا تھا۔ اور پتھر کے

دروازے پر دستک غلام بیٹھتے تھے۔ اس کا چھا کہہ رہا تھا:-

”یہ تو تم پر واضح ہو گیا۔ کہ ہم یہاں کیوں آئے ہوئے

ہیں غلام بیٹھنے سے ہمارا خون چوس لیا ہے۔ اور اب اس کے

س کے ساتھی چپ چاپ یہ دروازہ منفرہ کی طرف تھے غلام

سے اپنی پست اور سروں پر بھاری بھاری پتھر اٹھائے گزر رہے

تھے۔ یہی ہیں یہ جرات نہیں تھی۔ کہ اس غلام کا ہاتھ پکڑے کسی

بہن یہ حوصلہ نہیں تھا۔ کہ بوڑھے کو دروازہ مرنے کے منہ سے

بچائے۔ صولت کا الہ ظلم سمجھا جاتا تھا۔ اور الہ ظلم کے لائق اور

غلام نے بنا۔ گانہ بیکس کے صیروں کو مڑوہ دیا۔ انہوں کو سوچنے

نہیجے سے قاصر اور لوگوں کو بچے جس بنا دیا تھا۔

بوڑھے مر چکا تھا۔ اور اب صولت دوسرے غلاموں کو

دیکھ رہا تھا۔

”کمزور و ضعیف انسان کو مر ہی جانا چاہیے۔ صولت نے

پہلے تو قوت کرنے کے بعد کہا۔

”اب تم سب سنا جب وہ مشقت ہی نہیں کر سکتا۔ تو اس

کی زندگی کی کیا ضرورت ہے؟“ اس کے ایک ساتھی نے کہا۔

”اور پھر ہماری حکم عدولی؟“

”آپ درست فرماتے ہیں محترم آقا! ضعیف انسان کو

مڑوہ مر جانا چاہیے۔“ دوسرے ساتھی نے کہا۔

صولت مڑا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلنے لگا۔ بوڑھے

کی خون آلود لاش وہیں پڑی تھی۔ غلام پتھر اٹھائے جا رہے

تھے۔۔۔ مٹھا اور کا سہیل کہیں چھپا ہوا تھا۔۔۔ !!

(۲)

سہیل جھونپڑی میں بیٹھا پرانا۔ میدا کھیلنا اٹھاتا اور

سو کھے ہوئے گھاس پر کر دیتا تھا۔ خورناک خراب جو

اس نے رات کے ابتدائی حصے میں دیکھے تھے۔ اس کے دل و

دماغ پر خوف و وحشت طاری کر رہے تھے کبھی تو وہ محسوس کرتا

کہ صولت نے اس کی گردن کو دو بوج رکھا ہے۔ اور بھی اپنے بابا

کی بے رحمانہ و سفاکانہ موت کا دہشت ناک منظر اس کی آنکھوں

کے سامنے پھرنے لگتا۔ یہ دہشت انگیز منظر دیکھتے ہی صبح مار کر

وہ اٹھ بیٹھتا۔ اور انکھیں پھاڑ پھاڑ کر دھرا دھرا دیکھنے لگتا۔

تھا ساہلی، نا بھرہ کار و ماخ اور یہ ہولناک خواب! آخر کار وہ

ایک ذیل کتا ہے۔ جسے اس دروازے پر اس وقت تک ،  
دھکا دیا جاتا ہے۔ جب تک وہ غلام ہے۔ ذرا سوچ کیا آج  
تم غلام بن کر کتوں سے بھی زیادہ ذلیل نہیں ہوؤ  
سب کی گردنیں فریادیں سے جھک گئیں۔  
"غلامی انسانیت سوز وقت ، مظلومیت لئے ایک طرف  
کھڑی ہے۔ اور دوسری طرف آزادی ، زندگی کی روح ، زندگی کی  
شہ۔ اپنی اور زندگی کی عزت و حرمت لئے تمہاری منتظر ہے۔  
بتاؤ کس طرف جانا چاہتے ہو؟  
"آزادی ، آزادی !! غلاموں نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر  
کہا۔

"تو چلو آزادی کی طرف؟  
"ہم تیار ہیں! مجمع نے پرجوش لہجے میں کہا۔  
"مگر یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ یہ الفاظ اس شخص نے کہے  
جس نے سہیل کی دروازہ کھولا تھا۔  
سہیل کا چچا ایک قدم اور آگے بڑھ آیا۔ اس کی آواز  
پورے جوش ہو گئی۔ "تمہارے جسموں میں صرف غلام برداشت کرنے  
ہی کی قوت ہے۔ غلام کو روکنے کی قوت نہیں؟ تمہارے بازو  
صرف زخمی ہونا ہی جانتے ہیں۔ تلوار اٹھانا نہیں جانتے۔۔۔  
تم۔۔۔"

"نہیں نہیں" مجمع نے جواب دیا۔  
"تو پھر بہادر جوانوں کی طرح زندگی اور موت کا فیصلہ کر دو۔  
زندہ رہو تو آزاد رہ کر، ورنہ غلامی کو مٹاتے ہوئے مرنا چاہو؟  
مجمع میں سے ایک شخص اٹھا اور کہنے لگا۔ یہ درست  
ہے۔ کہ ہم انتہائی غلام برداشت کر رہے ہیں۔ مگر ہم کبھی کیسے  
ہیں! قدرت ہی سے ہمیں ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا  
ہے؟"

انتہائی صغیر کی آنکھیں فریادیں دے رہی تھیں اور  
سرخ ہو گئیں۔ وہ ایک قدم اور بڑھ آیا۔ اور کہنے لگا۔ قدرت  
کسی کو غلام بناتی ہے۔ اور نہ کسی کو آزاد کرتی ہے۔ انسان کی

غلام دانست ہماری ہڈیوں میں پیوست ہو رہے ہیں۔ کونسا  
ہتم ہے جو اس نے نہیں کیا؟ کونسا غلام ہے۔ جو اس نے نہیں  
توڑا؟ ہم خون پسینہ ، ایک کر کے اس کے کھیتوں کی پرورش کئے  
ہیں۔ اس کے باغات کو پھلوں سے بھرتے ہیں۔ اور اس کے  
مشاندہ امکانات بناتے ہیں۔ مگر اس محنت و مشقت کا عوض  
کہا جاتا ہے؟ یہی کہ ہماری کھانوں کو اچھا جاتا ہے۔ روٹی کے  
"وٹھے ٹوٹے کھانے کو جلتے ہیں۔ اور رہنے کے لئے ایسی  
جھوٹ پڑیاں دی جاتی ہیں۔ جن میں ذلیل کتے بھی سانس لینا  
کو ارا نہ کریں۔ آج ہمیں اس پیر کا فیصلہ کرنا ہے۔ کہ اسی طرح  
ذلیل کتوں کی مانند زندگی بسر کرنا ہے یا آزاد رہ کر جینا ہے؟  
نٹھاسہیل ایک گوشے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس کا  
ہاتھ کبے جا رہا تھا۔

"بے جس مظلوم کی زندگی ایک قابل لغوت ، اور ایک قابل  
محنت زندگی ہے۔ کیونکہ بے جس مظلوم ہی غلام کو ظلم کر رہے ہیں۔  
بجور کہتا ہے۔ اگر مظلوم ظلم نہ ہو۔ تو ظلم کیونکر ظلم کر سکتا ہے؟  
یہ آہ۔ یہ بلا نہ ہو کا نتیجہ ہے۔ کہ خود اور بیٹے کی خود غوری بھتی  
جاسی ہے۔ اس کا لہجہ پرجوش ہو گیا تھا، اس کی آنکھیں سرخ  
ہوئیں اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"آج تک تم آہوں اور آنسوؤں کے کمزور ہتھیاروں سے،  
غلام صولت پر حملہ آور ہوتے رہے ہو۔ مگر کسی کامیاب نہیں ہو  
سکے۔۔۔ آہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ آنسو پانی کے معمولی  
قطرے ہیں۔ اور آہیں ہوا کی حقیر لہریں، کیا تم ان ہتھیاروں  
سے چٹان کو اپنی جگہ سے ہٹا سکتے ہو؟۔۔۔ اگر تم اس  
چٹان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہو۔ تو اپنے اندر پہاڑ کی قوت  
پیدا کرو۔ یا رکھو۔ تم نے آج تک صولت کے ظلم برداشت کر کر  
کے اس کی صف کا نہ خو کی پرورش کی ہے۔۔۔ تم خود اس کی  
ذیل غلامی پر قانع رہے ہو۔۔۔ اگر قانع نہ رہتے تو آج  
غلام کیوں ہوتے؟ یاد رکھو! غلامی انسانیت کی سب سے  
بڑی توہین ہے۔ بے جس غلام انسانیت کے دروازے پر،

یہ مانا کہ غلام اپنے غم کو زندہ رکھنے کے لئے مظلوم کو پہلے دست و پا کرویتا ہے۔ مگر اس پر بھی مظلوم آزادی حاصل کر سکتا ہے۔ تمہارا سے پاس بھر نہیں تلواریں نہیں، مگر فصلوں کو کاٹنے والی درختیاں تو موجود ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جات تو موجود ہیں۔ اگر تمہارا جذبہ آزادی غلص حاصل کر چکا ہے۔ تو تم اپنی ہمتیادوں سے غلام کو مٹا سکتے ہو۔۔۔ اور اگر غلامی پر قائم رہنا چاہتے ہو۔ تو ساری دنیا کے ہتھیار بھی تمہارے لئے جھپٹنے لگیں گے۔ زیادہ حدیث نہیں رکھتے! بس اب زیادہ وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو شخص آزادی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس پر غدار راستہ پر قدم رکھے؟

”ہم سب تیار ہیں ش۔۔۔“ محمد یکب آزاد

لکھا۔

”تو آؤ ہمد وہیمان کریں۔۔۔ کیا تم ہیں سے ہر شخص  
حلفت اٹھانے کے لئے تیار ہے؟  
بہیں غلام کو مرادوں گام۔“

ہر شخص نے آگے بڑھ کر، یہی الفاظ دہرائے۔ اب سہیل باقی رہ گیا تھا۔ اس کا دل بے اختیار چاہتا تھا کہ آگے بڑھ کر یہی الفاظ کہے۔ مگر اس کے قدم جیسے رہتے نہ معلوم کیوں؟ جمع جب تم پہاڑ پر چتر اٹھانے جاؤ۔ تو اپنی اپنی آستینوں آٹھ کپڑوں میں ہتھیار بے جاؤ۔ میں اس پر حملہ کر دوں گا۔۔۔ اس وقت تم بھی اپنا فرض ادا کرنا۔ بس یہ ہے پروگرام۔۔۔ یقین رکھو۔ کل صبح ہمارا نئی زندگی کی صبح بھی طلوع ہوگی!

”بچا میں بھی یہی کہنا چاہتا ہوں! سہیل نے تھوکار سے بڑھ کر کہا۔

”سہیل! میں تو تمہیں بھولی ہی گیا تھا۔۔۔ خبردار  
جو کچھ تم نے یہاں سنا ہے کسی سے نہ کہنا؟  
”تو ہچکا: میں بھی کہوں؟  
”کیا؟  
”میں ظلم کو مٹا دوں گا۔۔۔“

ہست کا فیصلہ اُس کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ اپنی زندگی  
 با فیصلہ قدرت کو سونپ دینا، زندگی کی سب سے بڑی فطری  
 حالات نہیں بدل سکتے، انسان بدلا کرتے ہیں۔ جو  
 شخص آزاد مونا چاہتا ہے۔ وہ آزادی کے لئے جنگ کرتا ہے  
 گا۔ یہاں تک کہ موت اس کے اندر اس کے مقصد زندگی کے  
 اذیان و یواہر حاصل کر دے۔ انسان کی زندگی، اصول  
 کی زندگی سے وابستہ ہے۔ مرنے والا مرجاتا ہے۔ مگر اس کا اصل  
 زندہ رہتا ہے۔ اور یہی انسانیت کا انتہائی عروج ہے۔ یاد  
 رکھو۔ انسانیت کی جبین خوں کے انہی قطروں سے چمکتی ہے۔ جو  
 آزادی کے راہ میں بہائے جائیں۔ ہم سے پہلے جو لوگ یہل آئے  
 اہ اپنی زندگی کو ظلم و ستم کے جور و استبداد کے سپرد کر دیا۔  
 ہم انہیں بڑول کہتے ہیں۔ اگر ہم بھی غلامی پر قانع رہ کر ظلم پر شہت  
 کرتے رہے تو دنیا کے لوگ ہمیں جھوٹ ایکس ہی لفظ سے یاد  
 کیٹھے۔ اور وہ ہے بڑول۔ تم ستم کے ظلم برواشت کر کے  
 اپنے اوپر ہی ظلم نہیں کر رہے۔ بلکہ اسے دوسے لوگوں پر بھی ظلم  
 کر رہے ہو۔ اپنے ہونے والے بچوں پر ظلم کر رہے ہو۔  
 وہ تمہیں کیا کہیں گے؟ وہ تمہیں کس نام سے یاد کریں گے؟  
 مجھے کا جوش بڑھ گیا تھا۔۔۔۔۔ سب کھڑے  
 ہو گئے تھے۔

”میں خوش ہوں۔ کہ تم نے انسانی مقصد کو سمجھ لیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے۔ کہ صولت کا چہرہ دیکھتے ہی تم پر لڑنے تو نہیں ملے گی جو جانے گا؛ جان کے خوف سے کوئی ذلیل حرکت تو نہیں کر بیٹھو گے؟ اور اس پر حملہ کرنے کی بجائے تنہا سے بازو و شل تو نہیں جو جایش گمے؟“

ہرگز نہیں۔۔۔ ہم صولت پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اُد  
اس وقت تک علیحدہ نہیں ہونگے۔ جب تک کہ اس کے خون کا  
آخری قطرہ بھی خاک پر نہیں بہ جائے گا۔ ایک ظلم نے سمیٹتے  
ہوئے شیر کی طرح گرج کر کہا۔  
”مگر بہتیار؟ دوسرا غلام بولا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو۔۔۔؟ صولت نے لڑکے کو خوشگلیس نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ سہیل کے تمام بدن پر لوندہ طاری ہو گیا۔

"بتاؤ! صولت نے گرج کر کہا۔ اب بھی وہ خاموش رہا۔  
"تم اس طرح نہیں بتاؤ گے؟؟ صولت نے گرم جہتی ہوئی آواز میں کہا۔

سہیل کی نگاہوں کے سامنے صولت کی خوفناک شکل دیر تک اٹھیں تھیں اور اس کی دہشت ناک چابک۔۔۔ صولت کے استفسار کو بھول گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ صولت نے کیا پوچھا ہے۔ اور نہ اس میں یہ جرات تھی کہ سامنے کھڑے ہوئے ظالم دزدے کو استفسار دہرائے کے لئے کہے۔

"اگر نہیں بتاؤ گے۔ تو میں مار مار کر تمہاری چٹری اڑھڑاؤں گا۔"

"یہ الفاظ سننے ہی بچے نے لڑتے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ میں ظلم کو۔۔۔ مٹا دوں گا!"

"کیا کہا؟ صولت نے سہیل کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ دود کی وجہ سے سہیل کی آنکھیں آنسوؤں سے لہریں ہو گئیں۔ اُس نے آنسو پونچھنے کے لئے ہاتھ آنکھوں کی طرف بڑھائے۔ مگر صولت نے پھر بازو جھنجھوڑا۔۔۔ بچے کی بائیں دھیلی پکڑ لی۔

"کیا کہا؟"

"وہی۔۔۔ کہتے تھے؟"

"وہ کون؟ یہ کہتے ہوئے صولت کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"میرا چچا اور۔۔۔"

"کیا کہا تھا انہوں نے؟"

"انہوں نے کہا تھا۔ کہہنا تھا؟ لڑکا آگے نہ بول سکا۔

"جلدی بولو!"

"میں ظلم کو مٹا دوں گا! انہوں نے کہا تھا۔"

"ابھی بتا رہی تھی۔ یہ کہتے ہوئے صولت نے سہیل کی پیشانی پر ہوسہ دیا۔ اور آست گریں اٹھایا۔  
"بہا چراغ ہو بجھاؤ۔۔۔ کل صبح ہماری زندگی نے افق پر آزادی کا آفتاب طلوع ہو گا؟"  
ایک شخص نے چہرہ رخ بچھا دیا۔ اور وہ آہستہ آہستہ باہر نکل گئے۔۔۔

مٹی کے ایک چھوٹے سے تودے کے اوپر کھڑا بچہ اپنے سامنے کھڑے ہوئے ایشیا پر جھانپ رہا تھا۔ سہیل رات کے واقعات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں ظلم کو مٹا دوں گا۔ یہ الفاظ بار بار اس کے کانوں میں گونجتے تھے۔ اور وہ ہار ہار محسوس کرتا تھا کہ اپنے چچا کے چہرے میں کھڑا ہے۔ اور اس کے سامنے ہر ایک غلام چھتر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا کر یہی الفاظ دہرا رہا ہے۔ یہ بات تو اس کی سمجھ میں آئی تھی۔ کہ اس کا چچا اور دیگر غلام ظالم صولت کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ بات اس کے دہم و دہمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ کہ وہ خود بخود بھیڑیا ان کے ہاتھوں ہلاک ہو جائیگا اس کا خیال تھا کہ صولت تمام دنیا کا بادشاہ ہے۔ اور جو شخص اس کا حکم نہیں مانتا۔ وہ فوراً ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اس کے چچا نے اسے گھر پر ہی رہنے سے منع کیا تھا۔ مگر وہ یہاں آکھڑا ہوا تھا اس کی خواہش تھی کہ چچا کے پاس جا کر دیکھے۔ کہ کیا ہو۔۔۔ ہے۔ مگر جب سامنے اس شخص کی طرح یہ خیال آتا۔ کہ وہ ہاں صولت آجائے گا۔ تو اس کا دل دھڑکنے لگتا۔ اور قدم اٹھانا۔ دھیر ہو جانا وہ کسی صورت میں بھی صولت سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔۔۔

اس خیال ہی سے اس کی روح ہوا ہوتی تھی۔

چند منٹ کے بعد وہ تودے سے چپے اترتا۔ اور اپنی جھونپڑی کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ ابھی وہ چند قدم چلا تھا کہ اس کے کانوں میں ایک گرم جہتی ہوئی آواز آئی۔ وہ درخت سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ صولت اور اس کا ساتھی اس کے سامنے کھڑے تھے۔

آج بدمستی سے ہمارا مقصد ناکام رہا۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں۔  
کہ تیرا ظلم زندہ رہے گا۔

یہ الفاظ سنتے ہی صولت کی آنکھوں سے چوگاریاں نکلنے لگیں۔ تیرے پیچھے ہزاروں دیوتے ترپ ترپ کر مڑ گئے۔ اور میرا بال بھی دھیکا نہیں ہوا۔ صولت نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔  
”مگر اب وہ وقت آگیا ہے۔ کہ تیرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دینے جائیں۔“ صفد نے کہا۔

”گرتاخی کی انتہا جو سچی ہے محترم آقا! ایک محافظ نے کہنا شروع کیا۔ ان بچھڑوں کو پاؤں کے پھل دینا چاہیے؟“  
صفد رتپ گیا۔

”انسان ہو کر یہ درد نہ گی۔۔۔ یہ کیسی؟“ اس نے محافظ کو

مخاطب کر کے کہا۔ تیرا دل اس قدر تارک یک ہو چکا ہے۔ کہ انسانی ہمدردی کی ٹپ سی لہریں وال پیدا نہیں ہو سکتی۔۔۔ تیرے روح پرورد سے اس درجہ قبضہ کر لیا ہے۔ کہ تو انسانیت کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔“

محافظ نے منہ پھیر لیا۔

”ہیں ان کمینوں کو عبرتناک سزا دینا چاہتا ہوں۔ جن کے ہاتھوں کو نیچروں سے باندھ دو! صولت نے محافظوں کو حکم دیا۔

”جو چاہے کر۔۔۔ عنقریب انصاف کی قیامتی تیری دہریا پیس ڈالے گی۔۔۔ ہمارے ہاتھوں کو جکڑ دے۔ مگر توجہ نہ آزادی کو نہیں جکڑ سکتا۔۔۔ آج تو ہمیں عبرت ناک سزا دے۔ مگر تیری سزا وہ ہوگی جس سے جہنم کی عقوبت بھی پناہ مانگے! صفد نے کہا۔ یکایک اس کی نظر ڈر سے کاہنتے ہوئے سہیل پر پڑی۔

اور وہ صحت اتنا کہہ سکا سہیل! اس کے بعد اس کے لبوں سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ محافظوں نے سب سے پہلے صفد کو گرا دیا۔ اور اس کی کھال ادھیرنے لگے۔ سہیل ڈر کر بے ہوش ہو گیا۔ غلاموں کے سامنے ان کے لیڈر کے ساتھ یہ ظالمانہ رتاؤ کیا جا رہا تھا۔ وہ خود کو چھڑانے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ مگر

کب؟

رات کو؟

وہ کہاں اکٹھے ہوئے تھے؟

سہیل اس کے جواب میں ہچکیاں لے لے کر روئے لگا۔ صولت نے متفکرانہ اپنی انگلیاں بالوں میں ڈالیں۔ اور لڑکے کے چہرے کو بخور دیکھنے لگا۔ پھر وہ اپنے محافظ کی طرف مخاطب ہوا۔ ”سمجھ گئے معاملہ؟ ذیل غلام شرارتوں سے باز نہیں آتے۔ میرے خلاف بغاوت کر رہے ہیں۔۔۔ کیلئے؟“ اس نے محافظ کو خاص اشارہ کیا۔ اور وہ بھجھکت چلا گیا۔ سہیل کا دل بڑے زور زور سے حرکت رہا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ بہت بڑی مصیبت آنے والی ہے۔

صولت نے سہیل کا ہاتھ پکڑا اور چلنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ ایک گنجان وخت کے پاس کھڑے تھے، قریب غلام پہاڑ سے پتھر نیچے لاکر رکھ رہے تھے۔ اور پتھروں کے پاس صفد کھڑا تھا۔ صولت کی آنکھیں خون آلود ہو گئیں۔ بھجھکیں مٹ گئیں۔ اور اس نے غیر احتیاطی حالت میں بچنے کے ہاتھ کو زور سے دبا یا۔ بچنے کے منہ سے صبح نکلی گئی۔ صفد ادھر اُدھر کھینچنے لگا۔ صولت نے سہیل کے ہاتھ کو چھوڑ دیا۔ اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

غلام پتھر رکھ رہے تھے۔ آواز ایک دوسرے کو خاص انداز سے دیکھ رہے تھے۔ صولت نے چابک کو حرکت دی۔ اور ظلمی کمین ایک غلام پر چلنے لگی۔ یکایک صفد رگڑے پڑھا۔ مگر اس سے پتھر تیز کہ اس کے بازو اوپر اٹھیں۔ صولت کے محافظوں نے اسے آہ وہ دوسرے غلاموں کو اپنی آہنی گرفت میں لے لیا۔

”ذیل غدارو! اپنی شرارت کا انجام دیکھ لیا۔ صولت نے نفرت انگیز قبضہ لگاتے ہوئے کہا۔ میرے خلاف یہ سازش کمینوں؟

”کمین تو تو تھے۔ جو بن بھیڑیوں کی مدد سے ظلم کر رہا ہے۔“ صفد نے خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اگر

کے افق پر نئی مسرت کا آفتاب طلوع ہوا۔ اسے کائنات کا وہ ذوق  
مستروں سے لبریز نظر کرنے لگا۔ اس کی روح ہر وقت تھر تھری نغموں  
کے آغوش میں تیرنے لگی۔ — صولت کی اکوٹھی بیٹی پہلے اس  
پر جہرین تھی۔ — مگر اب اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ !

(۴)

متواتر مظالم پر وہ صحت کر کے غلاموں کی قوت احساس غم  
ہو جاتی ہے وہ اپنی مظلومیت کو قہر سے کھٹکا۔ اور ظالم کے ظلم  
کو منسلکے ایزدی بجھنے لگتے ہیں۔ مصیبتوں سے نجات پانے کا  
اگر کوئی خیال ان کے ذہن میں آتا ہے۔ تو وہ موت ہے۔ ان کے  
بزدلانہ جذبات ہر ایک انسانی کوشش کو حقیر گردانتے ہوئے ظلم  
سے بچنے کے لئے صرف تپہ کی کاہن پکڑتے ہیں۔ اور صولت کے  
غلاموں کی زندگی بھی اسی حقیقت کا اعلان کر رہی تھی۔

سہیل ہر روز بیکس غلاموں کی گریہ ناری کو جھنجھٹا بکاڑا سننا  
تھا۔ روزہ خیز سے روزہ خیز دانتوں کو ہر وقت دیکھتا تھا۔ مگر غلاموں  
کے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ ان سے بے حد دور تھا۔ مسرتوں کے  
آغوش میں سانس لینے والی زندگی، دکھوں سے بھری ہوئی زندگی کا  
کیونکر خیال کر سکتی ہے؟ مگر اس دن سہیل غلاموں پر حملہ فکری تھا۔  
اس دردناک واقعے نے جو ایک دن میسر اس نے اپنی آنکھوں  
کے سامنے دیکھا تھا۔ اس کے دل کو جھڑکا تھا۔ اور واقعہ  
یہ تھا کہ ایک غلام عورت نے کھیت کا کام چھوڑ کر اپنے بیمار  
شریر خوار بچے کو اپنی چھاتی سے لگا رکھا تھا۔ جب ظالم صولت نے  
دیکھا۔ تو اس کی آنکھوں سے غصے کی چنگاریاں بجھنے لگیں۔ ہنہائی  
بے رمی سے کام لے کر وہ بے کس مل کو بید سے مارنے لگا۔ ظالم  
نے اسی ہاتھ نہ کیا۔ بلکہ نئے بچے کو زمین پر گرادیا۔ مال نے اسے  
فوراً اٹھالیا۔ اس پر صولت کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اور اس  
نے نفی جان کوکتوں کے آگے ڈال دیا۔ مال کی استائی ظلم کیونکر  
برداشت کر سکتی تھی؟ وہ بچی کی کسی تیزی کے ساتھ بڑھی۔ اور بچے کو گود  
میں اٹھالیا۔ کتنے اس سے لپٹ گئے۔ اور اسے لہو لہان کر دیا۔ وہ  
اپنے تخت بچہ کی جان بچانے کے لئے بھاگی۔ اور جب اس کی نفی

وہ بچی کی بچیروں اور مظلوموں کی آہنی گرفت نے انہیں باہل کیس  
بنا دیا تھا۔ صغیر سے ترپ ترپ کر جان دے دی۔ اس کے بعد  
معاظہ دومہ سے غلاموں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور جب انہیں اس  
قد زخمی کر دیا۔ کہ وہ ذرا بھر بھی حرکت نہ کر سکیں۔ تو ہاتھ روک لئے۔  
یہ ہے ہمارے خلاف سازش کرنے کا نتیجہ۔۔۔ — آئندہ جو  
شخص اس غم کی ذلیل حرکت کرے گا۔ اس کے ساتھ یہی ہوگا۔ — بلکہ  
اس سے بھی زیادہ۔ تم غلام ہو۔ غلاموں کی طرح زندگی بسر کرو۔ یہ  
الفاظ کو کم صولت پھر آواز ہے ہوش سہیل کو ساتھ لائے کا حکم ہے  
کر چلا گیا۔ جس طرح تلاطم کے بعد سمندر کی سطح پرسکون ہو جاتی ہے۔  
اس طرح اس ہونکے منظر کے بعد غلاموں کا جذبہ بغاوت ٹھنڈا  
پڑ گیا۔ بھیجی جہروں کے اندر دل باہل مڑو ہو گئے۔ یہ تو انقلاب تھا  
غلاموں کی زندگی میں۔ اور سہیل کے دل میں انقلاب پیدا کیا جا رہا  
تھا۔ و صولت کے اب محافظ خاص کی محافط میں پرورش پاتا  
تھا۔ اور اس کے پیر صولت ایک کام تھا۔ اور وہ تھا جاسوسی جیسے  
جیسے وہ غلاموں کی خبریں محافط کے کاڈوں تک پہنچاتا تھا۔ محافط کی  
نظر غائبیت اس پر زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ اسی طرح دن ہفتوں میں  
آور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔

سہیل اب مظلومیت کی باؤ مسموم کے تھپڑ سے کھٹتا ہوا بچہ  
نہیں تھا۔ بگا۔ وہ صولت کی بہار پر ور غنائیوں کے ساتھ تھے گئی  
خندوں کی صورت اٹھنا کر چکا تھا۔ اس کی عمر چودہ سال کی ہو گئی  
تھی۔ اور اپنے فرائض و ذمہ داری کے ساتھ ادا کرتے کرتے وہ صولت  
کے اکرام خاص کا مستحق ہو چکا تھا۔ جب کبھی اسے اپنے بابا اور چچا  
کی بے رحمانہ طاقت کا خیال آتا۔ تو اس کے دل پر سونیاں ہی چھینے  
لگتیں۔ اس کے ضمیر میں غش پیدا ہو جاتی۔ مگر اسی اثنا میں صولت  
کی کرم فرمائیں اور موجودہ مسرتوں کا سیلاب آتا۔ اور دل کی تپہن وہ  
ضمیر کی غش کو بہا کرے جاتا۔ اور وہ پھر جاسوسی سہیل بن  
جاتا۔ — صولت کا وقار اور۔۔۔ — غلاموں کے لئے ظلم۔

ترقی کرتے کرتے اس سے اتنا اقتدار حاصل کر رہا تھا کہ اسے  
غلام سے صولت کا بیٹا سمجھنے لگے۔ یہی اثنا میں اس کی زندگی

”زیرینہ؟ سہیل نے ذرا کراخت آواز میں کہنا شروع کیا۔



اپنی محبوبہ کو دھوکا دیا۔ عداایک دوسری عورت سے محبت کرنے لگا۔۔۔ پہلی عورت نے ذمہ بھرا کر جان دے دی۔

”تو پھر؟“

”میرے اس قسم کی اویچی کہانیاں سنی ہیں۔ جس میں مردوں نے نورتوں سے بے وفائی کی ہے۔۔۔ میرے سہیل بقم تو ان مردوں میں سے نہیں ہوتا؟“

سہیل نے زہینہ کی ہانکھوں کو دیکھا۔ وہ خوبصورت بڑی بڑی آنکھیں، سنہری آنکھوں سے لہریز تھیں۔ اس کا دل بے تاب ہو گیا اور اس نے بغیر ہنسی کی گردن میں حائل کر کے کہا ”یہ خیال نہ کر۔۔۔ زہینہ! جی بھرت کامیاب رہے گی۔“

”مگر میں بڑتی ہوں۔“

”تو نے کیا اہل ضرورت نہیں؟“

”اچھا قسم کھاتے ہو؟“

”قسم کھاتے کی ضرورت کیا ہے۔ ہتھار باب ظالم ہوئے کے بارے میں ہمارے ت کے لئے ظالم نہیں؟“

”مگر مجھے خوف ہے۔ باواقظ ظالم ہو جاؤ۔“

”یہ نہیں بڑکا۔ زہینہ!“

”تو بھلا حلفت کھائیں؟ کیا رہے سے وفا کریں گے؟“

”جس قسم میں اذہ سانچہ ہو گیا۔ گردن خون میں تیزی لگنی اسے کہہ کر زہینہ رونا سنت یا دہنے لگے۔۔۔ اب سے پہلے وہ منظر

اس کے سامنے آیا۔ جب وہ بچہ تھا۔ اور چچا کو ملنے کے لئے جھونپڑی میں گیا تھا۔۔۔ اور ہر ایک غلام کی زبان سے سنا تھا۔ ”میں ظلم کو بٹا دوں گا۔“ اس منظر کے بعد دوسرا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے آیا۔ یہ منظر وہ تھا۔ جب اس نے بچہ بڑی میں اپنے چچا اور دیگر

غلاموں۔ غلامی نہ تھی اسے وہ اقدہ می یاد آئیں۔ جب اس کے چچا۔ اپنی بے جہان موت سے پہلے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

سہیل!

جند غم میں اس کی یاد اسے کہاں سے کہاں لے گئی۔

”حلفت اٹھا کر کہو۔ میں وفا کروں گا۔“ زہینہ نے پوچھا۔ سہیل کے سامنے میں ظلم کو بٹا دوں گا۔“ کے الفاظ شطرنج کی صورت میں تڑپے۔ اور اس کے کانوں میں ”سہیل“ کہتی ہوئی ایک آواز آئی۔

”کیا سوچا رہے ہو؟“

”تم کیا چاہتی ہو؟“

”میں وہ مسکرائی۔ ہم یہاں محبت کے مہم و پیمان کریں گے۔“

”مگر پھر؟“

”کیوں؟“ وہ کی نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

”میری طبیعت خراب ہے۔ اس وقت مجھے ہتھار چڑھ رہا ہے۔“

”پہلے جو میں کہتی ہوں وہ کرو؟“

”میں اس وقت کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے ہتھار چھوڑ دو۔“

”تمہاری طبیعت خراب ہے۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی!“

”زہینہ مجھے پراعتقاد کرو؟“

”مگر مجھے یقین دلاؤ؟“

”کیونکر؟“

”جو میں کہتی ہوں وہ کرو۔ حلفت اٹھا کر کہو۔ میں محبت

میں وفا کروں گا!“

”انتہی غم اچھی نہیں!“

”تمہارا اس سے کیا بگڑتا ہے؟“ زہینہ نے سہیل کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ایک دم سہیل کے سامنے وہی مناظر یکے بعد دیگرے آئے

اس کے کانوں میں بار بار یہ الفاظ گونجنے لگے۔ ”میں ظلم کو بٹا دوں گا!“ اس کے ساتھ ہی اس کے چچا کی ”سہیل“ کہتی ہوئی آواز آئی اور

کے لمبوں کو حرکت ہوئی۔ ایک لمحت۔۔۔ زہینہ کے چہرے کا رنگ متیز ہو گیا۔ اور اس نے سہیل کے ہاتھ کو زور سے دبا دیا۔ ”سہیل

سہیل!“



اپنے آقا کو۔ ؟؟

”اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا؟“

زرینہ بیت بنی کھڑی رہی!

”شاید تم میری بات پر اعتبار نہیں کرتی۔۔۔ حالانکہ میرے خون آلود ہاتھ تمہیں اس بات کا یقین دلانے کے لئے کافی ہیں۔ میں نے ظالم عدالت کو قتل کر دیا ہے۔ میں نے ظلم کو مٹا دیا ہے!“

”کتنی ظلم۔ کتنی دغا بازی؟“

”دل کھولی کر لذت حاصل کرو۔۔۔ مگر پہلے میرے چند الفاظ سن لو زرینہ! تم جانتی ہو صولت نے غلاموں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ اس کے پائے استبداد کے نیچے مظلوم زندگیاں بلی جا رہی تھیں۔ وہ ظلم کرتا جاتا تھا۔ اور اس کے ظلم کی پیاس بڑھتی جاتی تھی۔ اور ہماری کوئی کوشش غلاموں کو اس کے دست ظلم سے نہیں بچا سکتی تھی۔ اس کی مرض کا علاج نیرینہ، ایک تھا۔ اور وہ تھا موت!“

”تم اور میرے باپ کے قاتل؟“

”ہاں زرینہ! میں تمہارے باپ کا قاتل ہوں۔۔۔ ظلم کو مٹانے کے لئے مجھے یہ انتہائی ناخوشگوار فرض ادا کرنا پڑا۔“

زرینہ چپ چاپ کھڑی سہیل کو دیکھتی رہی

”اب میں جاتا ہوں۔۔۔ ہمیشہ کے لئے رخصت! یہ کہتے ہوئے سہیل نے قدم اٹھائے اور بلا غچے سے نکل کر چلا گیا۔ زرینہ بے اختیار دانہ دروازے پر آکر اسے دیکھنے لگی۔ سہیل تیزی کے ساتھ چلنے لگا۔

زرینہ نے دودھ اس کا من پکڑ لیا  
سہیل!

”زرینہ میں نے ایک ناخوشگوار فرض ادا کر دیا ہے۔ اب دوسرا ادا کرنا ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔ موقعہ کی نزاکت مجھے زیادہ بچھرنے کی اجازت نہیں دیتا!“

”تم جادو ہے ہو۔۔۔ تو میرا کیا ہوگا۔۔۔ میں کیا

کرؤ گی؟“

”میں نے تم سے بے وفائی کی ہے۔ مگر زندگی کی مسترتیں

تم سے بے وفائی نہیں کر سکتی!“

”میری زندگی کی مسترتیں تو تم لئے جا رہے ہو؟“

”میں قاتل ہوں زرینہ! مجھے اپنے انجام کی طرف جانے دو۔۔۔ تمہارے محافظ اور خادم بے کس غلاموں کو اس جرم کے مرتکب سمجھ چکے ہوں گے۔ اس حالت میں میرا یہاں ٹھہرنا کتنا خطرناک کام ہے؟“

”تم نہیں جاسکتے؟“

”تو پھر؟“

”تم نہ جاؤ۔۔۔ تم۔۔۔ آؤ ہم یہاں سے چلے جائیں؟“

”یہ نہیں ہو سکتا زرینہ! مجھے اپنا فرض ادا کر لینا دو!“

”اس وقت محبت کا فرض ادا کرو!“

”مگر انسانیت کا فرض؟۔۔۔ انسانیت کا فرض

کیونکر ادا ہوگا؟۔۔۔ نہیں نہیں نہیں جاسکتا۔۔۔ میں

یہ بزدلانہ کام ہرگز نہیں کر سکتا!“

”مگر سہیل! جو کچھ ہونا تھا۔ وہ ہو چکا۔ اب آؤ یہاں

سے چل دیں؟“

”مجھے اپنا فرض ادا کرنے دو زرینہ! تمہارے خادم غلاموں

پر ظلم کر رہے ہوں گے۔“

”وہ ظلم نہیں کر سکتے۔ وہ ظلم نہیں کریں گے۔ تم مجھ

پر ظلم نہ کرو۔ تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی!“

”یہ خیال خام ہے اسے دماغ سے نکال دو!“

”میں نے تمہارا کیا قصور کیا ہے۔۔۔ مجھ پر کیوں ظلم

کرتے ہو؟“ زرینہ کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔

”زرینہ تمہیں ایک قاتل سے ہرگز محبت نہیں کرنی چاہیے

۔۔۔ اور پھر میں قاتل بھی تمہارے باپ کا ہوں؟“

سہیل نے غدار سے زرینہ کے چہرے کو دیکھا۔ اور چلنے

لگا۔ چند قدم چلا ہوگا۔ کہ پھر زرینہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

”زیرینہ! یہ بات مجھے پسند نہیں۔ تم میرے آدمی سے فرض  
کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو رہی ہو۔“

”تو کیا مجھے مار ڈالنا ہی چاہتے ہو۔۔۔ اگر یہ بات ہے۔  
مجھے قتل کر دو۔۔۔ میں تمہارے ہاتھوں قتل ہونا اتنا ہی شرف  
میں حُل محل کر مرنے سے زیادہ پسند کرتی ہوں؟“

ہسپل کے آگے زیرینہ کی اشکات ہر وہ آنکھیں رحم کی دھڑکتی  
کر رہی تھیں۔ ایک منٹ تک وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

آؤ ہسپل! یہاں سے چل دیں؟

سورج طلوع ہو چکا تھا۔ آؤ اس کی روشنی کائنات  
تے ذرے ذرے کو منور کر رہی تھی۔ زیرینہ برابر منت و سماجیت  
کر رہی تھی۔

”زیرینہ! اس کا کچھ فائدہ نہیں۔۔۔ تمہاری التجا مجھے فرض  
وا کرتے سے نہیں روک سکتی۔۔۔ مجھے بہر حال اپنا فرض ادا  
کرنا ہے؟“

تو حجت کا فرض۔۔۔

”میں نے محبت کے فرض پر انسانیت کے فرض کو ترجیح  
دی ہے؟“

ہسپل نے اپنا بازو پھیر لیا۔۔۔ آؤ دوڑنے لگا۔ زیرینہ  
ہسپل! ہسپل!! کبھی گرتی پڑتی اس کے پیچھے بھاگنے لگی۔  
اس کے پاؤں زخمی ہو رہے تھے۔ مگر وہ برابر بھاگی جا رہی  
تھی۔

(۱۱)

میدان میں غلام صولت کے محافظ و خادم ایک ایک غلام  
کو زنجیروں سے۔۔۔۔۔ باندھ کر چابک سے پیٹ رہے تھے۔ معلوم  
نہاں کے جسم سے خون بہ رہا تھا۔ اور مضامین ان کی پیچیں بلند ہو  
جی تھیں۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے صولت کو زخمی کر دیا  
ہے۔ صولت کی موت پر پورے ڈالا جا رہا تھا۔ یکایک دوسری طرف  
سے گردو غبار اٹھا آؤ ہسپل تیزی کے ساتھ بھاگتا ہوا آیا۔ ایک دو منٹ  
کے بعد محافظوں کے پاس پہنچ گیا۔

”ظہور! ہسپل نے بنا۔ آؤ زمین کہا۔  
محافظوں کے ہاتھ رک گئے۔

”ان کتوں نے عزم آقا کو زخمی کر دیا ہے۔ محافظ بولے۔ غلاموں  
نے سر ہٹا کر نہیں نہیں کا شوق چھایا۔  
”صولات کو شین نے قتل کیا ہے؟“

ہسپل کی زبان سے یہ الفاظ سننے ہی مجمع پر سنسنی چھا گئی۔ موت  
کا قاتل ہیں ہوں؟

غلام آنکھیں پھل پھل کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ محافظوں  
کی نگاہیں اس کے خون آلود ہاتھوں پر جم کر رہ گئیں۔ ہسپل ایک ٹوٹے  
پر چڑھ گیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اس نے مایاں ہاتھ اوپر اٹھایا  
اور کہنے لگا۔

”صولت۔ ایک خوشخوار بھیر یا تھا۔ اور آج وہ مر گیا  
ہے۔۔۔ تمام غلام آزاد ہیں۔“  
غلاموں کے چہروں پر سرخی دوڑ گئی۔

”میں نے اسے قتل کر دیا ہے۔ انسانوں پر ظلم کرنے والا کبھی  
زندہ۔۔۔ وہ فقر و مکمل نہ کر سکا۔ ایک محافظ نے اس کے سینے میں  
خنجر بھونک دیا۔ غلام تڑپ کر اٹھے۔ ہسپل نے سینے سے خنجر نکالا۔ اپنا  
ہاتھ اوپر اٹھایا۔ اور دوسرا ہاتھ زخم پر رکھ کر کہنے لگا۔

”سینے رہو۔ کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ آج سے تم آزاد ہو۔ ہو۔  
تم پر کوئی ظلم نہیں کر سکتا۔ ظلم کرنے والا مر گیا ہے۔“

ایک طرف سے ہسپل! کہتی ہوئی آواز آئی۔ ہسپل آگے  
بڑھ گیا۔ کنا سے پر جہاز کھڑا تھا۔ اڑتا دکھ رہا ہے۔ ہلا! تم آزاد  
ہو۔

مگر غلام مطلوب الغضب ہو چکے تھے۔ ہر ایک سویا ہوا جذبہ انتقام  
بیدار ہو چکا تھا۔ وہ ایک دم اٹھے اور محافظوں پر ٹوٹ پڑے۔ جرم میں سے  
ہسپل! کہتی ہوئی آواز آئی۔ ہسپل نے ایک طرف دیکھا۔ اس کی  
محبوبہ مطلوب الغضب لوگوں میں پس۔ جی تھی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر بلبل  
نہ سکا۔ اور وہیں سے گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی زیرینہ کی آواز بھی ہمیشہ کے  
لئے خاموش ہو گئی۔

مکرم ہے

یہ ہے

لاؤ

۱۱۰۰ بیروا

نہی ہو گی کہ نہی ہو

آئیں میں نہ جیو، بات کیا، ایک دہائی کے

ساتھ جھکاؤ کے جواب

ہاں کی تہ صوم ہوتے تھے

آئی ہے، جھکاؤ ہنسنا

حکارت نے اپنے سپرد آؤ اور ہڈی کی نکھیاں سے

چھینیں وہ، ایک برس ایک سنہ کی چھینیں

منوہ

دل ہوں

میں بری نہیں

میر جی یوں

ایک بات سنو

کو

کس کو؟ دواوت؟

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

جڑی میں نہیں ہوں گا

میں جانی ہوں، نہ کہ میری بات

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

مکرم ہے

یہ ہے

لاؤ

۱۱۰۰ بیروا

نہی ہو گی کہ نہی ہو

آئیں میں نہ جیو، بات کیا، ایک دہائی کے

ساتھ جھکاؤ کے جواب

ہاں کی تہ صوم ہوتے تھے

آئی ہے، جھکاؤ ہنسنا

حکارت نے اپنے سپرد آؤ اور ہڈی کی نکھیاں سے

چھینیں وہ، ایک برس ایک سنہ کی چھینیں

منوہ

دل ہوں

میں بری نہیں

میر جی یوں

ایک بات سنو

کو

کس کو؟ دواوت؟

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

جڑی میں نہیں ہوں گا

میں جانی ہوں، نہ کہ میری بات

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

مکرم ہے

یہ ہے

لاؤ

۱۱۰۰ بیروا

نہی ہو گی کہ نہی ہو

آئیں میں نہ جیو، بات کیا، ایک دہائی کے

ساتھ جھکاؤ کے جواب

ہاں کی تہ صوم ہوتے تھے

آئی ہے، جھکاؤ ہنسنا

حکارت نے اپنے سپرد آؤ اور ہڈی کی نکھیاں سے

چھینیں وہ، ایک برس ایک سنہ کی چھینیں

منوہ

دل ہوں

میں بری نہیں

میر جی یوں

ایک بات سنو

کو

کس کو؟ دواوت؟

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

جڑی میں نہیں ہوں گا

میں جانی ہوں، نہ کہ میری بات

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

میں وہی ہوں، میں ہی نہیں ہوں

”کدھر ہے؟“

”یہ ہے“

”لاؤ“

”دسے تو رہی ہوں“

”مجھے کچھ بھی دکھانی نہیں دیتا“

”آنکھوں میں اندھیرا معلوم ہوتا ہے کیا؟ ایک وہی ہنسی کے ساتھ بھکارن نے جواب دیا۔

”ہاں! آج سے معلوم ہونے لگا ہے“

”آج سے؟“ بھکارن نے ہنس کر کہا۔

بھکاری نے ہاتھ پھیلایا تو دو شیرازہ کی پرکی جھیلیاں اسے چھٹیں اور اس کے جسم میں ایک سنسنی سی پھیل گئی۔

————— ۲ : —————

”سفر تو؟“

”اول ہوں“

”تھیں میری قسم“

”پھر وہی بیوقوفی؟“

”ایک بات سن لو؟“

”کہو“

”کس سے کہوں؟ دیوار سے؟“

”سن تو رہی ہوں کہوں میں بہری نہیں ہوں؟“

”جاؤ میں کچھ بھی نہیں کہوں گا“

”میں جاتی ہوں، نہ کہو میری جاسے؟“

”ناراض ہو گئیں یہ بی بی عادت ہے“

”تم کچھ کہتے ہی نہیں تو میں کیا کروں؟“

”ادھر آکر سٹو“

”کہو“

”کل میں اپنے منگر جانا چاہتا ہوں۔ ہے بہارت؟“

”اچھا؟“

جس طرح ایک چاند برب پرست بلاناغہ عبادت گاہ میں

جاتا ہے، اسی طرح بھکاری بھی سرشام دھرم سالہ بیچ جاتا۔ وہ دوپٹو بھکارن بھی اپنے باپ کے ساتھ ٹھیک وقت پر آ جاتی۔ جب کہیں وہ دیر سے پہنچتی بھکاری کی بے چینی بڑھ جاتی۔ اور وہ بڑی بے تابی کے ساتھ اس کا انتظار کیا کرتا۔ اور انتظار کی چند لمحوں میں کس طرح گزرتی، اسکول ہی جاتا۔ وہ بچہ نہ ہو جاتا اسے ہر طرف اسی نظر آتی، لیکن بھکارن کے آتے ہی سب بے چینی کا فور ہو جاتی۔ ساری اداسی ہنسی میں تبدیل ہو جاتی وہ اپنے دل میں ایک گونگی محسوس کرتا کتنی ہی برسات کی کالی کالی راتیں کتنی ہی بسنت کی پیاری پیاری دوپہریں آئیں اور گزرتیں مگر بھکاری کی زندگی اس کشتی کے مانند تھی جو موجوں میں ٹھگتی ہو۔ موجیں اسے جھڑپ مارتی رہتی چلی جاتی ہے۔ بھکاری دکھ اور روکی موجوں کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ کبھی کدھر پہنچے جاتی ہیں۔

ایک دن اس نے بھکارن سے کہا:

”تمہارے تپاکی حالت نہ روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے پھر کیا تم کبھی ہی رہو گی؟“

”تمہارا اس سے مطلب؟“ بھکارن نے تنک کر جواب دیا۔

”مطلب کیوں نہیں خوب کہتی ہو؟“ بھکاری کہنے لگا۔

”میں تمہاری کون ہوتی ہوں، جو میری عمر میں دن رات بے چین ہو رہے ہو؟ میں اپنے ماموں کے پاس رہوں گی؟“

”میں تمہارے ماموں کا سر توڑ دوں گا! بھکاری چڑھ کر کہنے لگا۔

”بڑے آئے سر توڑنے والے! میرے ماموں کپڑی میں بھیک مانگتے ہیں پولیس والوں سے انکی دوستی ہے۔ بڑے صاحب ہر اتوار کو چار آنے دیتے ہیں۔“ بھکارن نے دل ہی دل میں مسکرا کر جواب دیا

”ٹھیک ہے، میں تمہارے ماموں کا سر کیوں توڑنے لگا، میں

مسا۔ ہوں۔ ہی کون ہوں جس خود ہی کانٹھی جانیوالا تھا ہر دن جا سکا

بھکاری نے اپنے دل کی بے چینی دبا کر کہا۔

”ہنوسیرے سٹنے سے! میں تم سے نہیں بول سکتی! کانٹھی جانو! یا

پریاگ! مجھے اس سے مطلب؟“

”جی تیری سے بھکارن نے اتنا کہا اور اپنے پتا کے چال گئی جو

سرے کو نے میں پڑا کر رہا تھا وہاں جا کر وہ آہستہ آہستہ رونے لگی اس کا دل امتڈا آ رہا تھا۔ وہ اپنے دل کو سنبھالنا چاہتی تھی مگر سنبھال سکتی تھی۔

نئی گا ایک چوٹا سا چراغ بجھنے کے قریب تھا۔ اور ایک پروانے کے اور دیگر چترنگی لگا کر اپنے آپ کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن چراغ کی روشنی تیز نہ تھی نہ اپنے پر ہی کو جلا سکے۔ رات آئی اور ہوا کے ایک سہلے سے چھوٹنے کے چراغ کی زندگی ختم کر دی۔ چلنے ہوئے کیلئے کو سکون ملا۔

دھرم سہلے میں اندھیرا چھا گیا۔ ایک کونے میں اپنے چلنے کے پاس بیٹھی ہوئی بھکاری آنسو بہا رہی تھی۔ سرے کو نے میں چپ چاپ آنکھیں بند کئے ہوئے بھکاری پڑا تھا۔

(۳)

بی سردی ہے۔

۔ ات! اب ہی نہیں جاتی! باجی رات کیسے کاٹیں گے میں  
تیرہ لوٹگی لیکن.....  
"اں بڑی سردی ہے! ایک کبل جو تو..... کام  
نوشکل ہے؟"

۔ اں"

کیا کہا تم نے؟ ایک کبل! کہاں سے پاؤں کبل، تھوڑا سا پیال بھی لے تو کافی ہے باجی کی مخالفت ہو سکے ات کیسی ٹھنڈی ہو ہے۔ میں مر جاؤں گی!

کیا کروں؟ کہاں سے پاؤں پیال..... کبل.....

کبل جو تو تمہیں بھی آرام لے؟

۔ کتنے درپہر میں کبل لے گا؟

۔ یہی پانچ چھ روپے میں"

۔ باپ رے اتنی قیمت! بھتیجی کر ڈیڑھ دو روپے میں؟

۔ سستا کبل بیکار ہوتا ہے! جاؤ نہیں جانا۔

۔ چاہی کی بڑی ٹھہر ہے! باپ رے ایسی سردی۔

اُس مالک کی ڈراوڑ کی رات، انصاف میں روت کے چھوٹے چھوٹے ذرات اڑ رہے تھے جو اتو ایسی تھیں کہ بڑیوں کو چیرتی ہوئی نکل جاتے

ورخت کا پتہ تہہ کانپ رہا تھا بھکاری نے ٹھنڈی سانس بھر کر حنا شہ۔ رو کیا۔ اسے ایک کبل چاہیے اپنے لئے نہیں۔ تو پھر کس کے لئے؟ اس بھکارن کے لئے۔ اس کے پتا کے لئے۔ وہ بوڑھا حسرتی پانچ کبل ۱۱ روٹھ کر رات کاٹے گا۔ لیکن اس سے بھکاری کو فائدہ آتا تو کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ لیکن جب اسے بھکارن کا پتا اوزھیکا۔ تو بھکارن کتنی خوش ہوگی۔ اور اس کی خوشی ہی اس کے لئے سب کچھ ہے۔ بھکاری نے رات کو سوچ دیا۔ کراسے لیا کرنا ہے ایک کبل کے لئے اسے کتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پہلی بات یہ ہے کہ اپنی بیانیگی کا احساس ہو۔ کیا وہ اپنے پریم کے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتا ایک مولی کبل ہی جب اس کے لئے پہاڑ ہو۔ ہا ہے تو کس بل پر کسی مولی بھالی ڈیڑھ کا دل ۱۱ روٹھ کر رات دن منصوبے کا خاکہ کرتا ہے۔ اس کی مجھو بھکیا کہے گی۔ وہ اپنے دل میں بہت شرمندہ ہوا۔ اس کے دل کی ٹلکے کھٹکی کر وہ کس کے دل کی دانی ہے جو مجبوری لاچار ہے، بیکسی اور غلغلی کا رعبو ہے بھکاری مجبور تو تھا ہی۔ لیکن یہ بات اسے نہایت تکلیف پہنچا رہی تھی۔ کہ وہ اپنی بھکارن کے سامنے غلغلی کے باعث گردن جھکا دے۔ اپنی خیالوں کی دنیا میں اس نے رات کاٹی۔ صبح کی سفیدی پہلے ہی اس کا خیال بھکارن کی طرف گیا۔ وہ اپنے تمام پیسے اپنے پتا کو اڑھا کر چپ چاپ بعضی دکھ کی گھڑیاں مگن رہی تھی وہ آگ تھی، نہ پڑے، بھکاری سے یہ مستلزدیکھا گیا۔ اس نے اپنے دل میں مہر کیا کہ بغیر ایک کبل لئے اپنا منہ بھکارن کو نہ دکھائے گا یہی بڑبڑاتا ہوا بھکاری بانڈا کیلٹ چلا۔ اس کے پاس مرٹ پانچ چھوٹے کو پیسے تھے۔ اور آج لے پانچ چھ روپے کا سودا کرنا تھا۔ آٹھ دس ٹھٹوں میں وہ اتنے روپے کیسے کما سکے گا؟

(۴)

دن ایک خواب کی طرح ختم ہو گیا۔ بھکاری سارا دن ایک خست کے نیچے بیٹھ کر سوچتا رہا کہ کبل کیسے حاصل کرے۔ سامنے خوبصورت اور شاندار دروازوں کی قطار تھی شیشے کی الماریوں میں بے شمار کبل پڑے تھے موٹروں کی دیل پیل تھی آگ آتے اور چپ چاپ کبل خرید کر چلے جاتے۔ ایک صاحب آئے ساتھ چار پانچ چھوٹے بے

بچے تھے۔ دوکاندار نے خوشی سے بڑھ کر خوش آمدید کہا۔ دیکھتے دیکھتے  
کئی گرم شال، کبیل، خربزہ بکرنے لگے۔

دوسرے صبح آتے جنوں نے کئی کبیل خریدے۔ پورے پورے  
رنگ کبیل خود اپنے سے خرید کر واپس چلے گئے۔ سامنے ایک سپاہی  
موتو سیکس اور سے چلا آ رہا تھا۔ وہ دی کی لٹروں میں تمام دنیا  
کبیل پوش دکھائی دینے لگی۔ لیکن ہم دنیا میں صرف وہی بڑھیب تھا  
جس سے پاؤں کبیل رہتا۔ وہ ہم سے مل گیا۔ کوکالیاں دینے لگا۔

رات آئی۔ بھکاری کو دس این پیس سے لے کر پنے کا لیکن  
مست ہوئی۔ نہیں سے چین کہیں۔ اب تو وہ کس لیکری اپنی رانی  
کے سامنے۔ اونچا کر کے کھڑا ہو گا جس طرح ایک بہادر سپاہی  
کا رہنما باں انہما دیہ پنے سروا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔

سوچتے سوچتے رات ختم ہو گئی۔ لیکن کبیل ہاتھ نہ لگا۔ ہسٹیا ج  
بھکاریوں کے کئی دس بی لگی ہیں۔ ہونگے۔ اس نے دھرم سارے کی  
طرح۔ قدم بھی نہ اٹھایا۔ اس کا دل تڑپ تڑپ کر رہا تھا۔ اس کا دل  
ہر وہیر بادلاتا کر اسکی مجبور نے یلی بار شاد سے جو چہ مانتی تھی  
اس کو پورا نہ کر نہ پے دفانی میں داخل ہے۔ بھکاری کبیل لیکری اپنی عزت  
بڑھا رہا تھا۔ اپنی پے پایاں محبت کا ثبوت پیش کرنا چاہتا  
تھا۔ اپنے پیسوں سے چہ خرید کر رکھتا، اور خاموشی سے پڑے پڑے  
کبیل کی دوکان دیکھتی بانہ کر دیکھا کرتا۔ قریب قریب ایک ہفتہ پہلے  
ختم ہو گیا۔ جگہ ی اٹھا گیا۔

چہ رات آئی

میتھ کی طرف ناٹھ کر بھیا ایک رات اور آئی۔ گنگو رکھا کیرتہ  
غضب کی سردی تھی بادل اتہائی تھے سے گرچے لگا سارا سنا کر اپنے  
لگا۔ رات میڑتی ہی گئی۔ اور دیکھتے دیکھتے سناٹا چھا گیا۔ دوکان بند  
ہو گئیں۔ سارا شہر گرم کبیل اور گرم ہو گیا۔ کم سے کم بھکاری کو تو ایسا سونا  
ہونے لگا۔ سردی نے پھر اسے ایک دیکھنے کی یاد دلائی۔

رات کی تاریکی کو بہ لہر بڑھ ہی تھی۔ بھکاری آہستہ آہستہ کبیل  
کی دوکان کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ رولوں رولوں لگا  
رہا تھا۔ کچھ منڈ کر نہ کو آ رہا تھا۔ وہ کبیل کی دوکان کے پاس آیا  
اور دھڑک دیکھ کر اپنے کپڑوں میں سے کچھ نکال کر آہستہ سے شیشوں  
کو توڑ دیا۔ ایک بکلی سی آواز فضا میں کھو گئی۔ ایک سیکنڈ میں  
بھکاری نے اپنے آپ کو کبیلوں کے پیازوں میں پایا۔

اس نے بہت سے کبیلوں کو چھو، گنتا لطف آ رہا تھا۔ اسے خوشی  
سے اسکا دل اچھلنے لگا۔ اب اسے یہ فکر لاحق ہو گئی کہ ان کبیلوں  
سے کونسا کبیل لے۔ جلدی میں اس نے ایک موتو کبیل اٹھا لیا  
اور ادھر ادھر دیکھ کر پناہ راستہ لیا۔ وہ سیدھا دھرم سارے کی  
طرف اڑا جا رہا تھا۔ گویا اس کے پیروں سے پر لگے ہوئے تھے۔ پیچھے  
دیکھ کر وہ غور اپنی بھکاریوں کا دل سہ لے گا۔ وہ کتنی خوش ہو گی۔ اور پھر  
ایک بار اسی طرف اپنی درد بھری آنکھوں سے اسکی طرف دیکھ کر مسکرا  
پڑے گی۔ وہ اپنے آپ کو چھپاتا ہوا بڑی تیزی سے بھاگا جا رہا تھا  
سامنے دھرم سارہ نظر آیا۔ وہ خوشی میں پھولانہ سما یا۔ بڑی جلدت کے  
ساتھ دھرم سارہ میں داخل ہوا۔ اسکی آنکھیں کسی کو تلاش کرنے لگیں۔  
دھرم سارہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ دل شکستہ ہو کر چلا۔ تھا۔ کہاں گئی وہ؟

فونابی ایک کونے سے جواب ملا۔ کون ہے؟

بھکاری کہنے لگا۔ تم کون ہو اور یہاں جو ایک بوڑھا اور بڑی  
لوڑکی رہتی تھی۔ کہاں گئے؟

نہیں نہیں جانتا! بوڑھا شاید مر گیا اور لوڑکی کو اس کا کوئی رشتہ دار اگر  
لے گیا۔ لیکن تم ہو کون؟

”آہ!“

بڑی تندہ سے بادل گر جا ہوا کے ٹھنڈے جھونکے کیساتھ مولا دھا باں  
ہونے لگی بھکاری جہاں تھا وہیں ٹھیلہ۔ رات آہستہ آہستہ اپنا سفر ختم کر رہی تھی

آ۔ مختلف اور میں مختلف تھا۔ میں جب نہاتے ہیں اس صبر میں۔ یہ کوئی یہ محصل ڈاک اور گریہ رینی کا قاتل ہوتا پڑتا ہے۔ اگر آپ ہر  
ایک کتاب آدھ۔ خواہ وہ کتب کس سے شائع ہوئی ہو۔ مکتبہ اردو کو دیدیا کریں تو محض دو لاکھ کے اخراجات کے علاوہ آپ کو ہماری مخصوص مزاحمت سے  
بھی مستفید ہونے کا موقع مل سکتا ہے۔

مستم کش بازار لاہور



نیشن چند اکیم اے

# نبین

کے ہر خوشے کو، اپنے گلوں کے اندہ یا شاید، اپنے دل کے اندر بچھپائے وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ دنیا کا کوئی اور فرد بھی اسکے سیوے آڑوں، انگوڑیوں اور ناشپاتیوں کی طرف نگاہ بھی نہ اٹھائے۔ اسے یقیناً ان سے محبت تھی اور بارغ کے مانی کو یہ بھی صریح معلوم تھا۔

اور پچھلے اپنی انا سے بھی محبت تھی۔ جب اماں انا کو کسی عکس کی دیکھتے، اور انا اس صورت بننے سے اچھل کے ایک کونے سے آنسو بہتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی جاتی، تو رفیع اور احمد دیکھتا ہوا، ہم کہہ کر قدم اٹھاتا ہوا، چپکے سے انا کے کمرے میں چلا جاتا اور انا کی سیاہ ٹھکری کا کونا پکڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ انا سے معصوم اور پیار جری نگاہوں سے اپنی انا کی طرف دیکھتا، اور وہ انا کو چپ کرنا چاہتا وہ اسے ڈھارس دینا چاہتا، لیکن تیرہ برس کیوں وہ کچھ نہ کر سکتا، پھر یکایک اس کا گلا بھرتا اور انا کو روٹ دیکھ کر وہ بھی بے اختیار سسکیاں لینے لگتا، چنانچہ انا اسے اپنی گود میں لے لیتی اسے پٹ باڈو میں زور سے بھینچ کر چھاتی سے لگاتی۔ اپنے کیلے رخسار اس کی نرم نرم گلوں سے لگاتی، اس کا منہ اتنی بار چومنی کہ اسی کا دم رکے لگتا پھر آہستہ آہستہ انا کی سسکیاں بند ہو جاتی اور اس کے آنسو خشک ہو جاتے۔ ہاں اسے اپنی انا سے بہت محبت تھی۔

لیکن انا سے محبت کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اسے ہی اچھی نہ لگتی تھیں، انا تو اس کی جان تھی، لیکن وہ کہا کر اسے اماں ہی اسے ہر وقت اپنے پاس نہ رہنے دیتی تھیں، اجاڑنے، بارغ میں کھیلو، جاؤنے سکول جانا، رفیع میر کو وہ جب دیکھتا ہی کسی نہ کسی کام میں مصروف ہوتی، اسی کچن میں جا بیٹھتا تو وہ پیچھے بھاگتا، اور کروٹیا یا سلاٹیاں لے کر بیٹھتا تو وہ صوفے کا کونا پکڑ کر کھڑا ہو جاتا، اور اسی کے بالوں سے کھینچے لگ جاتا۔ اماں گڑبڑ دیتی، ننھے ننھے سب سے نہیں یا کیا اور

رفیق کو نیلا سے بہت محبت تھی یوں تو رفیع کو ہر چیز سے محبت تھی، حوشیار بھگارتنگ کی تیروں کو باغ میں اڑتے دیکھ کر سکا دل کا ایک بے تاب ہو جاتا، اور وہ انکے پیچھے خوشی کی وحشیا نہ چھین مانتا ہوا پھولوں کی کھادوں کو روڈ تار ہوا بھاگتا بھاگتا پھرتا، اور محبت سے اپنی چندنے والی ٹوپی سر سے اتار کر لاہور دی رنگوں والی ایک تیزی اس میں قید کر لیتا، پھر آہستہ سے حیرت اور پیار بھری نگاہوں سے میٹری کی طرف دیکھتا، اسے ہی چھوٹی چھوٹی نازک آنکھوں میں پکڑ کر احمد کو مٹھو مٹھا، تیزی کے پرچہ بھڑاتے اور یکایک اس کا دل روم کے جذبات سے اتھا بھرتا، کہ اس کی آنکھوں میں آنسو چلنے لگتے اور وہ اسے بھٹکتے چھوڑ دیتا، تیزی اڑتی ہوئی دوسروں کے پردے نہ چھوڑنے سے شفا آؤں گے درختوں کی چوٹیوں سے گزر جاتی، رفیع حیرت جہان خاہوں سے ڈرتی ہوئی خوبصورت تیزی لیرت دیکھتا۔ کتنی ہی تیزی تھی، محبت اور انس، یکایک ایک اور تیزی، سبز اور پیچھے پھلے پردوں والی، پہلی تیزی سے بھی زیادہ حسین اور درخشاں شکر راج کے پھولوں کے اوپر اڑتی ہوئی دکھائی دیتی، اور وہ اپنی چھوٹی بھونٹا، انگوڑوں سے لمبی لمبی چھلانگیں مارتا ہوا سنکھ راج کے تختوں پر طوفان دوڑنے لگتا، اسے واقعی تیزیوں سے محبت تھی۔

اس آڑوؤں سے بھی محبت تھی اور سیوے سے بھی اور اماں انکے گھر کی انگوڑوں سے بھی، جب درختوں پر صیغہ پھینکے نہ لکھندوں کی طرح چمکتے، اور لمبی لمبی سبز پھلوں میں پیار سی انگوڑیاں تو انکے دانوں کی طرح دھمکتے، تو انہیں دیکھ کر رفیع کا دل کسی نامعلوم خوشی سے کانپنے لگتا، صرف دل ہی نہیں، بلکہ انکے بھی وہ چاہتا۔ وہ جلدی جلدی درخت کی اونچی شاخوں پر چڑھ جائے اور ہر ایک آڑو کو اپنی بھڑکی ننھی ننھی سیوے میں بھرے، ہر صیغہ کو انگوڑیوں

سے بات بھی نہ کی تھی، بلکہ جب کبھی وہ رفیع کے پاس سے گزرتی،  
راور رفیع کو ایسے موقع بہت کم آئے ہونگے، تو سر اٹھا کر اپنے  
خوبصورت گھونگروائے بالوں کو چمکا کر اس کے پاس سے گزر جاتی،  
غریب رفیع کو اس وقت بہت ہی ذہنی تکلیف ہوتی تھی، وہ اس  
چھوٹے سے قصب کے ہرنے لہدیے سے ہنس ہنس کر بات کرتی  
تھی۔ مگر بچا ہے، رفیع کو ہی یہ مسرت حاصل نہ ہوتی تھی،  
یوں تو یہ کوئی بہت بڑی بات نہ تھی، رفیع کی معصوم، زندگی  
میں چند ہی ایک ایسے تکلیف دہ لمحے آئے تھے اور نہ دن بھر تو وہ  
نیلا گوتم دیش یا دبی نہ رکھتا تھا، سکول کی تیار ماسٹر کی نظر  
حساب کے سوال، جمع تفریق ضرب و تقسیم، باغ میں اچھل کود،  
کو وہ جب تنگ کر ستر ہوتا تو بس پھر صبح اسی سے شکل  
سے جگاتی تھیں۔

لیکن جب نیلا سننے آجاتی، یا وہ جب باغ میں بھولوں سے  
اکیڑا کھیلنا کھیلتا، آگے جاتا، تو نیلا کی حسین گڑیا جیسی صورت کھیل  
کر کے وہ ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا، اور اس کا  
جی چاہتا کہ وہ خود نیلا کو بلائے، بھلا وہ اسے کیا کہے گی، اچھا تو بھلا  
وہ اس سے ہی کیوں نہیں بولتی، ایک دن جب وہ یونہی کھیلتا  
کھیلتا ندی کے کنارے چلا گیا تھا، جہاں ندی پہاڑ کے قدموں  
سے ٹکر کر، نیلا پہاڑ تبدیل کرتی ہوئی جنوب کی طرف مڑ جاتی تھی  
تو وہاں اس نے ایک تنگ کے بہت بڑے درخت کے نیچے بہت  
سے اپنے بھونے دیئے، کئی پنکٹیں چڑھا رہے تھے، کئی بانسریاں بچ  
رہے تھے کئی بچڑی ہوئی جڑ بکریوں کو آوازیں دے دے کر واپس  
لا رہے تھے، دو تین ندی کے کنارے بنا رہے تھے، اور ندی کے  
نیچے پانی میں تیرنے کی، کام کو کشٹیں کر رہے تھے، ایک طرف  
منوہر، صادق، جسنی، نوران، تھیری اور بہت سے لڑکے لڑکیاں  
ریت کے ٹھنڈے کھود کھود کر عایشیاں من بنا رہے تھے، رفیع بھی ان  
کے ساتھ جا کر کھینے لگا، ان میں نیلا بھی تھی، وہ بہت ویرانہ ان  
کے ساتھ کھیلتا رہا، لیکن معلوم نہیں کیوں نہ اس نے نیلا سے بات  
کی نہ نیلا نے اس سے کھینے کھینے نیلا، اور کبھی تنگ کے قریب

وہ سہم جاتا، جاؤ کام کرو، اور وہ دھیمے دھیمے قدموں سے واپس لو  
جاتا، اسے تو ان سے محبت تھی، لیکن اماں ہی اسے بروقت پیدا  
نہیں کرنی تھیں، جب مگر میں جہاں عورتیں آتیں تو وہ چل جاتا اور  
بار بار اماں کے پاس جا کر ہوتا، لیکن اماں اسے یونہی چک کر کہہ  
دیتیں، رفیع بیٹا، باہر کھیلو۔

ہاں کبھی کبھی وہ اماں کی ٹوکریوں کی بھی پروا نہیں کرتا تھا  
اماں شستری، اٹھ سو تے اٹھ سو تے کھانے کے کمرے میں تراشے  
ہونے پھل لیا رہی ہوتیں، کہ وہ انکی ٹانگوں سے لپٹ جاتا، شربتی  
شرر رفیع کہنے سے کیا ہوتا تھا، وہ اردو کی تیسری کتاب اٹھائے  
ہوئے اماں کے، روگرد شور پاتا ہوا بھاگتا، اور نہیں ایک قدم بھی  
آگے نہ بڑھنے دیتا، تنگ کر، ہاں کر وہ اسے اپنے بازوؤں میں لٹھا  
لیٹیں، اماں کی قمیض اور ہر بان بٹا ہی دیکھ کر وہ انکی گردن سے لپٹ  
جاتا، میری اچھی امی۔

وہ باجی کو بھی بہت چاہتا تھا، اگرچہ اسے پتہ تھا کہ باجی بہت  
بڑے آدمی ہیں، وہ بڑے لمبے میں بہت کم بات کرتے ہیں، پھر بھی وہ  
انہیں بہت چاہتا تھا، اگر وہ دور سے پر جاتے تو وہ ہمیشہ مندر کرنا  
تہجے بھی ساتھ لپیٹا تا لپیٹا آتا، اچھے باجی، باجی، لیکن ان فٹوں  
سماجتوں کا باجی پر ہمیشہ کہ اثر ہوتا تھا، اور تو اور وہ شام کو سیر  
کرنے کے وقت بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ چلے جایا کرتے، اور کچھ  
رفیع جیٹا ہی رہتا، باا دوسرے سے واپس آئے تو وہ کتنی دیر ہی  
ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر باا کی راہ دیکھتا رہتا، اور جب آتا تو اسے  
ہی ٹھونسنے پر سوار ندی کے قریب کی پکڑ ندی پر نظر آ جاتے، تو وہ  
فرط شہ سے چلا اٹھتا، باجی آئے، وہ آئے، وہ آئے، ہاں وہ باا  
جی کو بہت چاہتا تھا۔

لیکن محبت تو اسے نیلا سے ہی تھی، نیلا بچہ فح وین چہرہ اسی کی  
لڑکی تھی، عمر میں شاید رفیع سے ایک برس بڑی ہی تھی شاید، سیوچ  
سے وہ چاہے رفیع کی پروا تک نہ کرتی تھی، ممکن ہے کہ کوئی اور بچہ  
بھی ہو، لیکن اس کا رفیع کو تہ ذلت، ہر حال رفیع کو جتنی نیلا سے  
محبت تھی، انی نیلا اس سے بیگانہ نہ تھی، اس نے تو آج تک کسی رفیع

انہاں سے بیروں کی کہانیاں سناتی۔ تو وہ سوچا کرتا کہ کیا یہاں سیلا کی طرح خوبصورت اور مغرور ہو کر رہتی ہیں۔ لیکن اس سوال کو انہاں سے پوچھنے کا اسے کبھی حوصلہ نہ ہوا، نیلا اسے ایک صورت کی طرح پیاری لگتی تھی، کبھی وہ سوچتا، سنے گا لیکن کتنے لالہ ہیں اس کے ہونٹ اس کے اپنی گالوں یا ہونٹوں کا رنگ تو اتنا صاف نہ تھا، اچھا تو اگر وہ بھی نیلا کی طرح خوبصورت بن جائے تو کیا پھر بھی نیلا اس سے نہ بولے گی، یہ خیال اسے اس وقت آیا جب کہ وہ سنبھو کی ایک اونچی جھاڑی کے قریب کھڑا ہوا کہ ہوتے سرخ سرخ سنبھو لاور توڑ کر کھا رہا تھا، ان سنبھوؤں کا رنگ کتنا سرخ تھا، سنبھو کھاتے کھاتے اس نے چار پانچ سنبھو تو کراچی گالوں پر مل لئے اور اپنے سونٹوں اور ٹھوڈی کو بانٹ لال کر لیا پھر یکایک اسے دوسری جھاڑی کے قریب ایک خوبصورت تیتہ بی دکھائی دی، اور وہ نیلا کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔ وہ کتنی دیر تک تیتہ بیاں بکھڑنے میں مصروف تھا آج اس نے سات خوبصورت تیتہ بیاں بکھڑیں۔ اور انہیں پھر اس نے اپنے چھوٹے سے دریا میں جمع کر لیا اور انہیں گھر لے گیا۔

اماں نے پوچھا: یہ منہ نیوں لال کر کھا ہے، شاید آج پھر سنبھو کھاتے رہے ہو میں نے تمہیں کئی بار بھیایا ہے کہ سنبھو نہ کھایا کرو۔ لیکن تم مانتے ہی نہیں، کیوں؟ ان بھاری تیتروں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟

جب رفیع کو یک دو مل پانچے پڑے تو وہ زور زور سے ہونٹے لگا۔

عید کے دن رفیع کی لڑکی حسب معمول ایک دریا میں خربازیاں باڑھ کر رفیع کے گھرونیے آئی رفیع گھر پر موجود نہ تھا وہ باغ میں لڑکے کے قریب چنبلی کے پھولوں کے پودوں سے بھول توڑ رہا تھا، اور ہار بنا لے کر کوشش کر رہا تھا۔ نیلا جب خربازیاں دیکھ کر باغ کے قریب گزری، تو رفیع کو باڑھ کے قریب بیٹھے دیکھ کر رک گئی، دھڑک سے ہار بنانے میں مشغول تھا۔

رفیع بھارے کو تیتہ بی نہ تھا کہ نیلا پاس ہی کھڑی ہے یکایک نیلا نے باڑھ سے ایک تیتہ بی توڑی، رفیع نے سر اٹھا کر دیکھا، نیلا

چل گئیں۔ اور چنگ چڑھانے لگیں، رفیع حیرت سے اپنی طرف دیکھ کر دنگا، اس نے آج تک کبھی چنگ نہ چڑھائی تھی، اتنی اونچی اسے تو چنگ پر بیٹھنے سے بھی ڈر لگتا تھا۔

صادق بانسری بھار ہا تھا، رک کر بولا چنگ پر چڑھو گئے رفیع انکار نہ کر سکا، خاص کر نیلا کے سامنے جو دوسری چنگ سے اتر کر اب پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔

رفیع ڈرتے ڈرتے چنگ پر چڑھا لیکن اب اسے چنگ کو آگے بڑھانے کا ڈر نہ آتا تھا، ناچار کہنے لگا مجھے جھولا دو۔

یسٹرکرت لڑکے لڑکیاں ہنس پڑے، رفیع کو ایسا معلوم ہوا کہ نیلا کی ہنسی ان سب میں سے بلند تھی، وہ شرمندہ سا ہو گیا اور چنگ سے اتر آیا، اور سیدھا گھر کی طرف چلا گیا۔ وہ غمگین اور اداس جا رہا تھا، اسے کسی پر غصہ نہ تھا، صرف اسے بار بار نیلا پر غصہ آ رہا تھا گھر نیچے نیچے اسکی سسکیاں تیز ہونے لگیں، اور جب وہ بڑے پھلک کے اندر داخل ہوا، تو وہ زار و زور رو رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ انہاں نے پوچھا۔

”کیوں زور ہے ہو گیا؟“

”بیٹا رفیع کیا بات ہے؟“

”میرے رفیع کو کس نے مارا ہے؟“

”نہیے تم اتنی دیر کہاں کھیلے ہو؟ یہاں بھارا مالی ڈیرہ دو گھنٹے سے تمہاری تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے، ہلو رفیع، نہیے۔“

لیکن تمہارا رفیع دیر تک رو تا رہا آخر جب وہ چپ ہوا۔ تو سسکیوں کے درمیان میں رک رک کر بولا۔

”میں..... میں..... ایک..... ایک..... چنگ..... ایک چنگ لگوا دو امی؟“

نیلا رفیع کے ہاں کئی بار آئی کبھی امی سے تنہائی لینے کے لئے کبھی کوئی بکھڑوں کا جوڑ لینے کے لئے، کبھی بچے ہوئے اخروٹ دینے کے لئے، جو اس کے گھر کے آگن میں آگے ہوئے درخت پر لٹکتے تھے لیکن رفیع اسے دیکھتا ہی دھچکا، کئی بار رات کو سوتے وقت جب

مٹی اس کا چہرہ شجر سے لاپرواہ کیا۔ اس نے بار بار پوچھا: دیا اور  
آنکھ بازو کے قریب کھڑا ہو گیا۔

نیلا بولی تمہارا نام بھی ہے۔

ہاں رفیع:

بھی:

ہاں رفیع:

بھی کیا نام ہے؟ میں نے نیلی جونی سی ناک کو ہوا میں پھینکا  
کر کے کہا

بھی نہیں رفیع:

نیلا بولی تمہارا نام یہ ہے، جو وہاں رہتے ہیں انکی سے انکو  
کر کے وہ ان اخروٹ کے درختوں کے نیچے۔

رفیع کہنے لگا: جو سے ہاں تنہا کے بیچوں بہت نیچے ہیں  
نیلا بولی: ہمارے ان خوبائیاں بہت جی ہوتی ہیں

رفیع کہنے لگا: ہمارے باغ میں بھی بہت اچھی خوبائیاں ہیں  
نیلا نے سر ہلا کر کہا: جھوٹ، ہماری خوبائیاں سب سے

مٹھی ہوتی ہیں:

رفیع کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بولا: میں جذبات پر محالہ کیا ہوں  
بہت اونچی اچھا سکتا ہوں:

اچھا: نیلا نے ایسے کہا۔ جیسے اسے اس بات پر یقین نہ رہا ہو  
میں اپنے باغ کے ہر درخت پر چیزہ سکتا ہوں:

ہوں؟

میں — میں چھٹی کے بار بار پوچھ رہا ہوں۔ یہ دیکھو:

نیلا وہی ہم تم سے چھپا ہوا نہایت ہے، اور وہ کیا دیکھو!

رفیع نے نیلا کو بہتر سمجھا اور ساتھ ہی دیکھ کے۔

یہ دونوں غیر متحرک رہے۔ بہت جلد جانتے نیلا نے نیلی سے

رفیع نے حیران ہو کر پوچھا: کیوں؟ نیلی نے کہا: بات ہے

نیلا نے کہنے کو نہ کہا۔ . . . میں کہتی ہوں تمہاری

نہایت۔ اور کیا؟

رفیع کو جو غصہ آیا تو اس نے نیلا کے ایک منہ پر تھپکا دیا: نیلا

نہایت ہنس رہی تھی۔ کہاں اب زور زور سے رونے لگی۔ نیلا تو دیتے  
دیکھ کر واقعہ بہت پریشان ہوا۔ کیا کرے، کہا نہ کرے، اگر انکی کو پنگ  
گیا۔ کہ اس نے نیلا کے منہ پر تھپکا دیا ہے، تو پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ نیلا  
کی قفس کھلنے لگا۔

چنانچہ نیلا جانے وہ مت روؤ، میں کہتا ہوں مت روؤ، دیکھو میرے  
پاس تجربوں کے تین سوپر میں وہ اندر ڈبہ میں بند رکھے ہیں، میں  
وہ سب نہیں دے دوں گا۔ اب تمہارے روؤ، میں نہیں ابھی لا کر  
دیتا ہوں۔

رفیع دھڑکا: پھر گھبرا گیا اور تنہا کے چہروں والا ڈبہ لے آیا اور  
ڈبہ کھول کر نیلا کے سامنے رکھ دیا۔ کتنے اچھے پر ہیں، یہ دیکھو دیکھو  
نیلا مت روؤ، اور یہ سب چھوڑ دو اور بارہا پھر ہمارے ہوتے۔ رفیع  
نے ایک دو بار تھپکا کر نیلا کے گلے میں پہنا دینے۔  
نیلا روئے، روتے ہوئے لگی۔

اس دن سے نیلا اور رفیع اکٹھے کھیتے رہے۔ انہوں نے جھاڑوں  
سے سنبھل کر جن کرکھائے، انکو دیکھ کر سنبھل کر سونے کو طرح چھلنے  
روئے، انکو دیکھ کر سنبھل کر سونے کو طرح چھلنے کے درختوں کے  
سامنے تھے جیسے قہر میں کوہا۔ اور کھس کے دوسرے محبوب درختوں  
کے نیچے کھیلے۔ ندی کے کنارے جا کر گزریوں کے ساتھ تھے۔ . . .  
پتلیں چڑھائیں ہانسیوں کے گیت سے کبھی کبھی رفیع وہ لہا  
نہایت درختوں اور ٹھکانے کے واسطے میں نئے نئے گڑھے بناتی  
نئے ہوتے ٹھکانے ہوتے کاغذ کی دھلیاں بجاتے ہوئے بھاگتے  
چرت تھے۔ کیسے عجیب نظارہ ہوتا تھا، اور جب کبھی نیلا کھیل ہی  
کھیل میں تھوخی یا نہایت سے کسی دوسرے گڑھے کی دھلیاں بن جاتا  
بڑا کی جاکر رہتی، تو رفیع جھک کر ابھوتا، اور کھیل میں حصہ لینے سے  
بے رغبتی دھاری پرتی جاتا یا سیدھے روٹھ جاتا روٹھے ہوئے کو  
منانے کے لئے نیلا بہت بہت قفس کھلنے پر تھی، اور بہت سخت  
سخت قفس کھلنے پر تھی۔

اس طرح میں سال گزر گئے، اس خوبصورت وادی میں دو نئے  
دلوں نے پاک و معصوم بہت کا ایک نیا سہارا، اور چار سہارا

میں اور نیلا وہ ننھی شوخ سی گڑیا تھلا کر باتیں کرتی ہوئی ایک عجیب کشادہ منہ سے ہنسنی ہوئی۔

لیکن اب جب گرمیوں کی چھیٹیوں میں اس نے گھر آکر نیلا کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ آخری بار جب اس نے نیلا کو دیکھا تھا تو وہ ایک ننھی سی بچی تھی جو ان کی طرف دیکھ کر روئی جاتی تھی، اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے آنسو پونپتی جاتی تھی، پھر تیرہ سال تک اس کے بچپن میں نیلا کی ہی تصویر رہی وہ خود لڑکپن سے شباب میں آگیا، اسکے والد کے سر کے بال سفید ہو گئے، باغ میں شہابیوں کے وہ درخت جو آج سے تیرہ سال پہلے نہایت پختہ اور چھوٹے تھوڑے توں کے مالک تھے آج اپنی شاخیں آسمان کی طرف بلند کئے کھڑے تھے اور نیلا۔۔۔۔۔ وہ ننھی سی گڑیا؟

لیکن جلد ہی وہ نیلا کو دیکھ کر حیران رہ گیا، وہ باغ میں ایک سیب کے درخت کے نیچے کتاب کھولے بیٹھا ہوا تھا کہ کوئی اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا ہاں یہ نیلا ہی تھی، سرور کی طرف ہندوستان شہابیوں کا مرکز تھیں، اسکے بچوں پر بھی معصوم سی مسکراہٹ تھی، جو شاید سورج کی گزیروں سے مل کر بنی تھی، اسکی گود میں ایک ہنستا ہوا بچہ تھا رفیع اٹھ کھڑا ہوا۔

بیلاؤ لی تم نے مجھے پہچانا جیسا؟

رفیع کے منہ سے نکلا۔ نیلا؟

نیلا جھٹکے لگی وہی دلکش ہنسی، پھر رفیع کو دیکھ کر کلکار یا رانے لگا، اور زور زور سے بازو ہلانے لگا۔

رفیع نے آگے بڑھ کر اور بچے کے شانوں کو چھو کر کہا، یہ تمہارا بھائی کا بھائی، کتنا خوبصورت ہے، اسکا کیا نام ہے؟

نیلا نے کانپتی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا ہاں اس کا نام ہے رفیع محمد رفیع۔

کتنی ہی دیر رفیع خاموش کھڑا رہا، نہ اسکے پاؤں تلے زمین تھی اندر نہ سر پر آسمان، وہ خلا میں گھوم رہا تھا نہایت تیزی سے گھوم رہا تھا، پھر کایک ایک جھٹکے کے ساتھ وہ بچپن کی زندگی میں لوٹ آیا وہ چھڑا سا تھا، خفا رفیع، اور نیلا کے ساتھ بھاگ بھاگ کر تیریاں

کھینچا۔ ماسپنا جو سپارڈی جھرنک کے گیتوں کی طرح دلغوبہ تھا وہ محبت جو ستاروں کی طرح روشن اور بلند تھی پھر نیکارہ رفیع کے والد کی تبدیلی کسی اور جگہ ہو گئی، اور رفیع اور نیلا نے دھڑکتے ہوئے دلوں اور ڈوب جانی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کو الوداع کہی۔ رفیع نے جانتے وقت وہ چیز بھی نیلا کو دیدی جسے وہ اپنی جان سے بھی عزیز رکھتا تھا، یہ ایک چاقو تھا جس کا چل بہت تیز اور چمکا متا اور دستانے پر رنگ برنگ کے میپ بچے ہوتے تھے، اور نیلا۔۔۔۔۔ نیلا نے بھی اپنی سرنگوں کی مالا جسے وہ بوقت اپنے گلے میں پہنے رکھتی تھی، اتار کر رفیع کو دیدی اور یہ سب کچھ چھپ چھپ کر ہوا، لیکن ٹھیک اسوقت کہ جب رفیع کے گھر کے لوگ وہ بڑے ہوئے کو دیکھے، اور رفیع کو ایک ٹھوڑے پر سوار کیا جا رہا تھا نیلا مسکریں لیتی ہوئی رو پڑی، رفیع کا دل بے تاب ہو گیا، لیکن اسوقت اس نے نہایت محنت سے کام لیا، اس نے اپنی آنکھوں کے آسروں سے اور منہ پھر کر آسمان کی طرف دیکھے مگر جہاں سفید سفید بادلوں کی دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔

تیرہ سال اور گزر گئے اور پھر اکیبارہ رفیع کے والد کی تبدیلی ہی حسین وادی میں ہوئی، جہاں نیلا رہتی تھی، رفیع کے دل میں بچپن کے خواب جاگ اٹھے، اور اس جہد کی معصوم خوشیاں اور اس زہیں زمانے کی تمنائیں دل میں گزریں لینے لگیں کیا وہ نیلا کو بھول گیا تھا، کیا کالج کی جگہ می زندگی نے اسکے دل پر بچپن کا کوئی بھی نقش باقی رہنے یا ختم کیا اب بھی وہ نیلا کو اسی طرح چاہتا تھا؟ ان سب کو کابو اب شاید خود رفیع ہی اچھی طرح سے نہ دے سکتا تھا ہاں شاید نیلا کو تیریاں قریب بھول ہی گیا تھا، لیکن بالکل نہیں وہ سبز شگوب کی مالا ابھی تک اس کے پاس تھی، اور کہیں قیمت پر بھی وہ اسے اپنے آپ سے جدا نہ کر سکتا تھا۔

کالج کے پرستاروں میں بھی اس نے اکثر نیلا کو یاد کیا لیکن یونہی کبھی وہ اپنے بچپن کے دلکش کھیلوں کو یاد کر کے مسکرا دیتا، عجیب زمانہ تھا، نہ ہاں نہ فٹ بال نہیں، پھر بھی کتنی مسرت تھی ان کھیلوں

پکڑ رہا تھا۔ نیلا اور وہ سنبلو کی شاخوں پر جیسے سنبلو کھا رہے تھے  
 ندی کے کنارے اونچے تنگ پر جو نا جھول رہے تھے گندیے ...  
 بانسہ میں بجا رہے تھے۔ گھڑیہ براتی بنے ہوئے تھے۔ اور نیلا  
 اسکی دلہن .....  
 بچے نے رفیع کے چہرے کی طاب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا  
 با... با... با... با...  
 رفیع بچے کی طرف جھکا ہوا اس نے آہستہ سے اپنی جیب سے

اندھے کوئی چیز نکالی یہ سبز بوتلوں کی ایک مالا لٹھی، آہستہ سے اس  
 نے یہ مالا بچے کے گلے میں ڈال دی  
 نیلا کی آنکھوں میں آنسو چپکنے لگے۔ لیکن رفیع نے نہایت ہمت  
 سے کام لیکر اپنے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں روک لیا۔ اور نگاہیں  
 اٹھا کر گھٹی سے اوپر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں سفید سفید  
 چمکتے ہوئے بادل ایک دوسرے کے پیچھے چھب گئے ہوئے  
 جا رہے تھے۔

# خموشی

اثر چکوالی بی اے

نہ کہہ کہ میسری محبت میں سوز و ساز نہیں نہ کہہ کہ میسری محبت جنوں طراز نہیں  
 نہ کہہ کہ میسری خموشی میں دلکشی ہی نہیں دل خراب کو احساس دوستی ہی نہیں  
 غلط کہ ننگ و فاپیں تعلقات مرے گداز و کیف سے غالی ہیں وار و قمرے  
 غلط کہ میسری امیدوں میں اقسام نہیں غلط کہ مجھ کو محبت کا احترام نہیں

بشعبہ شاعری

میں دست کش نہیں ہرگز تری محبت سے ہیں یاد مجھ کو فنا نے تری نگاہوں کے  
 شکست ضبط ہے تو ہیں رسم الفت کی کہ حشر خیز ہیں خاموشیاں محبت کی

خموش رہ کے مجھے تجھ سے عشق کز ناہے

محیط غم سے مجھے اس طرح گزرا ناہے

عزیز احمد

# ”مخ“

وہ آئی طو کے جلوؤں کو شرماتی ہوئی آئی جہاں آرزو کو آج گرماتی ہوئی آئی  
 حیات افزا تبسم جانفزاہو تنواری قصا ہے ہزاروں بھلیاں گنگیوں راتی ہوئی آئی  
 فضا میں تیرتی ہیں نغمہ مدح و شس کی جویں بُباب چنگ کے تاروں کو ترپاتی ہوئی آئی  
 بہکتی، آہ بھرتی ہر قدم پر زیر لب ہنستی فسانہ الفت رفتہ کا دہراتی ہوئی آئی  
 کسی نے کہہ دیا تھا ہوش سے بیزار ہے دنیا حریم ناز کے پروانی سرکاتی ہوئی آئی  
 چمکتاؤں کی آنکھوں میں نظریں گدگدی نہل زمانہ کو گراں خواہی سے چومکاتی ہوئی آئی  
 فضا میں چھا گئے برق و شر کے چار سو طوے صبا کے دوش پر لہروں کو کھراتی ہوئی آئی  
 چمن پاؤں ہوتا ہے بہار آنکھیں بچپاتی ہیں اداسے مسکراتی پھول برساتی ہوئی آئی

مہِ کامل تری بے کیف یہ مے باریاں کب تک

وہ آئی چاندنی راتوں کو شرماتی ہوئی آئی

تمیل احمد کندھا پوری

# باغی ڈراما نگار نرگس

اس سے مطلق جبروتی نہ بنی اور حتی الامکان ہم اس کو تنگ کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ چونکہ ہم دونوں کی وابستہ اس کو اپنے ساتھ کھیل کود میں شریک کرنے کی ہوتی اس لئے ہم مل کر اس کے کمرے کے دو دروازے پر تھپڑ اور برت کے ڈھیلے پھینتے، اس خیال سے کہ شاید پریشان ہو کر باہر آئے اور کھیل کود میں ہمارا ساتھ دے، مگر وہ کبھی اس سے سنبھوتا ہاں جب اس کا غصہ ضبط سے باہر ہو جاتا تو وہ کمرے سے نکل کر صحن تک صرف ہمارا تعاقب کرتا اور جب ہم فوجہ ہو کر واپس ہو جاتے تو وہ پھر سب سابق اپن کرے میں چلا جاتا اور ڈراموں کے ساتھ اپنا دل بھلائے لگتا۔ چونکہ وہ مطلقاً باغی تھا اور نیکدل واقع ہوا تھا اس لئے بیسہ ہونے کے باوجود بھی ہمیں کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچاتا۔

زندگی کے جوہر سال گزار چکے تھے بعد ازاں ہم نے نقاشی کو بطور پیشہ اختیار کرنا چاہا مگر اسکے لئے میوں کی ضرورت تھی اور اسکے والدین کی عین غلی میں چنانچہ اس کے سارے ارمان خاکستری ہو گئے۔ اور آخر مجبور ہو کر وہ ایک سال بعد ایک دور دراز مقام پر ایک طبیعت کے ساتھ بطور عطار کے رہنے لگا یہاں اس نے پورے پانچ سال گزارے، شعر و شاعری اور علم ادب کا شوق اسکے دل پر سب سے پہلے میں پیدا ہوا، چنانچہ اپنے فرصت کے اوقات وہ ادبیات کے مطالعے کے علاوہ نظمیں لکھنے میں بھی مرت کمرے لگا۔ روز بروز اس کا شوق بڑھتا گیا یہاں تک کہ وہ اپنا بیشتر وقت نوشت و خواند میں گزارنے لگا سن بلوغت کا ایک سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کیلئے ایک امتحان کی تباری میں مشغول ہونا پڑا مگر اس دوران میں ہی وہ سرٹیفکیٹ تقریریں یاد کرتا رہا۔

اسی سے ایک صدی پیشتر دیات عالم میں تاروس کا کوئی درجنہ ٹاٹا سے تھارت، تیز نظروں سے دیکھا کرتے تھے مگر کب نہ جیتی رہا تو وہ تاروس کا یہ غیر معروف مقام ایک دن تاروس سن ۱۹۲۹ء میں ۱۹۲۹ء میں جیسا عظیم الشان شاعر اور بالکل ڈراما نگار پیدا کر کے گا

اور عائد کج سب سے ممتاز و دروہی خود مانگا جس نے رشتہ خاندانہ کی بنیادیں ہی منہ زلزل کر دیں جو پتے سے تاروس سے تمام یورپ میں انقلاب کی آگ بھی روشن کر دی۔ باغی سے ایک سو سال پیشتر تاروس کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ۱۸۶۱ء میں ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوا اس کا باپ گاؤں کے سربراہ اور دیسوں میں سے تھا لڑک اس کو قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس نے ۱۸۷۰ء میں ۱۸۷۰ء میں تاروس کے دربار میں ہوئی گئی۔ بہانہ کہ جب اس آٹھ سالہ ہو تو اس کے باپ کی کل کائنات بلام ہو گئی جس کے باعث سب گلوں کو وہ تاحہ پید کر ۱۸۷۷ء میں ۱۸۷۷ء میں چلا جانا پڑا یہاں پہنچ کر وہ ہشتا غربت و انداز کی زندگی بسر کرتے تھے اور سن اپنے ایام طفلی میں ہو کر اور فاند کشی جیسے کمزور سے روشناس ہوا

اسن میں ہی سے نظم، نابت متین سنجیدہ اور خاموش طبع بنی ہوا تھا اپنے ہم عمر ساتھیوں کے جوش سے کھیل کود سے سخت نفرت میں تمام کے مکان سے باہر نہیں کودا تو کچھ کم کیلوں میں وقت گزارتے مگر یہ ہونا لڑکا باوجودی خانہ کے پاس ایک چھوٹے سے کمرے میں چھپ کر تمام دن کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا، اسکی سن نے اس کے بچپن کے حالات بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہم دونوں کو



امداد تجارت اور رہے حاصل کرنے کی۔ دمیترین میں معروف رہا کرتے، مگر یہ نوجوان جس کے ہونٹوں سے رہاں کے باشندوں کے خیال میں ابھی دودھ کے نشان بھی خشک نہیں ہونے تھے ارباب کے خواب دیکھتا تھا، ہرے سماج یوں کسی کو ترقی کی راہ پر گامزن نہیں دیکھ سکتی چنانچہ گاؤں والوں کے دلوں میں اس کے غلات نعت کی ہنگ ٹھٹھٹھی اسی نفرت جس میں ضد کی آمیزش ہوتی ہے۔۔۔ اس کی خوش نصیبی سے سمندر قریب ہی تھا جس سے مٹی و نیل کی رحمت بخش ہوئی تھی، ہاں وہ کبھی کبھی گاؤں کے شور و شغب سے محال کر چھوٹا اور ساحل پر خراماں خراماں بچتے ہوئے دور در دور سے دور عشق کے پارنگاہیں بہائے، شمالی موجوں کے دوزخ تھے منا کرتا رہتے رہتے اس کی طبیعت اچاٹ ہوتی گئی، ایک چھوٹے سے قصبے میں زندگی کے دن گزارنا اس کو نہایت غیر شاعرانہ ماحول معلوم ہوا، اس کے بچوں میں جو صلے اور نئی نئی اسٹیکس موجزن تھیں اس چھوٹے سے غیر مقام میں وہ کرشمہ وہ اپنے بلند حوصلے پر سے نہ کر سکتا تھا، اپنی شاہراہ ترقی اس کو کسی اور جگہ دکھائی دیتی تھی، چنانچہ شہر میں وہ گریہ پھینچا چلا گیا، اور وہاں مضامین لکھ کر گزارا وقت کرے گا۔ اس کے پاس تین ایکٹ کی ایک مختصر سی زنجیر تھی

صدیق نامہ جی بھی تھی، جو قافیہ وغیرہ سے آلود تھی، اسی سال مری دشواریوں سے وہ اسے شائع کرانے میں کامیاب ہو کر کلام نقادوں نے اس کا غیر مقدم نہایت غصہ و عقارت سے کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ صرف ۴۰ کاپیاں وہ وقت میں ایک کاپی کا خریدی جس نے کتاب لیکر نوجوان ادیب کی ہمت افزائی کی تھی، معمولی و کاغذ تھا، جس نے کتاب اس کے باطنی اوصاف کے باعث نہیں، بلکہ اس نے خریدی کہ اس کا کاغذ پارسل پیٹنے کیلئے بہت سونوں اور عمدہ تھا۔ اس کی وجہ اس کی خبر ملی، تو اس نے صرف اس کا کنارہ سے کتاب واپس خریدی، بلکہ روپے ویکو پبلشر سے بھی کتاب کی تمام کاپیاں واپس لے لیں۔

شعبہ میں کرچھینا میں وہ اس آرا کے گیا تھا کہ وہاں نچو یونیورسٹی امتحان کی تیاری کرے مگر اس کی توقع اور امید کے

خلافت جب سٹیج ہونے پر اس کا ایک مختصر اور معمولی سا ڈراما بلک میں بے حد مقبول ہوا، تو اس نے ہمیشہ کے لئے امتحان میں شریک ہونے کا خیال ترک کر دیا۔ مور یہ قسم راہہ کر لیا کہ وہ اپنی تمام زندگی گنگستین علم، ادب کے اندر سٹے اور نوکھے چنے لگا میں صرف کر دے گا۔ چنانچہ شہر کے ایک مسکن اور معمولی سے یہ اس نے بود و باش کے سے ایک چھوٹا سا مکان کرایے پر لے لیا۔ وہ رہے جو اس کو اپنی ڈرامے کے ذریعے سے بے تحاشے بلدی میں صرف ہوتے، اور اب اس کی زندگی نہایت کلفت و مصیبت کے ماحول میں لگی تھی کہ کھانے پینے کا کوئی کچھ نہ، بالہ اسے مجبوراً اپنے درپے ناقد کشی کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ مسایوں کے طنز آمیز حملوں سے بچنے کے لئے وہ حالت نے وقت کھرے باہر نکل جایا کرتا کہ لوگ یہ نہیں کہ وہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے ہونٹ لگیا ہے، درج جب اس طرح ٹھوڑا وقت گزر جاتا، تو وہ پہلے سے بھی زیادہ کرسنہ واپس آ جاتا، اگرچہ اس کے ہمسائے یہی سمجھتے کہ وہ کم سہرہ کو واپس آ گیا ہے

الفرض بڑی بڑی دشواریوں کے بعد شہر میں برجھ کے ایک نئے تھیٹر میں اس کو ایک جگہ ملی اور وہ ڈرامائی مشاء Dramatic Poet کے عہدے پر فائز ہو گیا اس کے یکسال بعد تھیٹر کے منجھوں نے اس کو عمر دار کر کے اپنے اخراجات سے تین ماہ کے لئے سفر پر روانہ کیا، تاکہ وہ بیرونی ممالک میں حاکم کر سٹیج کے فنی تجارب حاصل کرے۔

دس سال تک یعنی اپنی ذہنی نشو و نما کے دہائی دور میں اس نے اس قومی ترکیب میں نہایت ہی سرگرم حصہ لیا، جو ناروے کے اندر ۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۶ء تک زور شور سے جاری رہی، اس دور میں اس نے اپنے وطنی ذرا سے قلبد کئے جو جذبہ حب وطن سے پُر ہیں، اور کالی شہرت حاصل کی۔

قومیت کے لئے اس کی اس کا سچا جوش و خروش اس امر سے آشکار ہوتا ہے کہ اس نے ایک سماجی اس غرض سے قاعدگی جو بیرونی اثرات کا سد باب کرے، اور قومیت کی سیٹ آ رٹ



مستحق ہوتا ہے پائے کا حق دار نہیں، بلکہ وہ اس لائق ہے کہ ایک سبوتاژ سے اس کی کافی تلافی کی جائے۔

شہداء میں برکن کا تحیر دہیہ ہو گیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نہ مت اہسن کے ہاتھوں سے جاتی رہی، بس کے ذریعہ سے ایک متاع اور معقول آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔

اب پھر وہی غربت مٹی اور وہی ناقہ کشی... یہ دوا یہ سب دشمن تھے جو بار بار اہسن پر حملہ کر دیتے۔ غرض کہ اس قدر بچ نہاس اور نگہ ستی نے سے بہت سستایا، بیان تک کہ جب اس کی ضروریات سے تیار کرنے لگیں تو اس کے بعض احباب نے تہائی کوشش کی کہ اسے کم از کم تحصیلہ کی جڈی مل جائے مگر اس ان کی سعی مشکور نہ ہو سکی اب مصدیت کے ہولناک نہمت کد سے مخلصی پائے کی اہسن کو اس وقت حدت ایک در نظر آتی تھی، حدت ہی ایک کہ جس طرح مٹی ہو وہ جندہ نہمت داخل ہاگے۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر وہ کچھ دیر بھی یہاں نہ خیر تو تباہ ہو جائے گا، کبھی کبھی اس کے دل میں یہ خیال آتا کہ اب خطرناک قہر کے کنارے کھڑا ہے۔ اور وہ قبر ہے مقام کھرچینا جو نادرے کے وسیع قبرستان میں واقع ہے۔ لافض بڑی بڑی دشواریوں اور مختلف سرکاری دفاتر میں رہتا شاہد کرنے کے بعد وہ شاہی خزانے سے اپنے سفر کیلئے نہ مختصری رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔

۱۱ اپریل ۱۹۳۹ء کو شاعر نے کرسچینا کو خیر باد کہا جس وقت اس سے جہاز روانہ ہوا۔ اور اہسن نے اپنے وطن نادرے حرمی نگاہ ڈالی، تو اس وقت اس ملک کے لئے اس کے دل میں تنہا تھا۔ بلکہ ایک لاجوردی جذبہ حقارت جو وہ نادرے والوں کے خلاف اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا۔

نہت سے وہ واپس آیا۔ اپنے شہور ڈرائے تھان کے بیرو ملک کی مانند اسے یہاں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایک بدھیار کے اندر سے نکل کر فرار ہو گیا ہے جہاں وہ پانچ خبر تھا۔

۱۲ سے ایسا معلوم ہوتا، جیسے اس نے نادرے میں کبھی آگیا

کی تعاین ہی: دیکھی تھیں اس غلام کے مانند جسے ابھی آزادی ملی ہو۔

اطالیہ میں اس نے اپنی شہرہ نظم پر آٹھ لکھنا شروع کی، اسی نظم میں ایک جگہ اہسن گرجا کے ایک پادری کی زبان سے اپنے جیسے بلند نمودہ گوں کو درخواست جیسے کہلوانا ہے۔ آف ہندی نہ ہوا... بلند جھولوں کی طرف تھیں ابھی عیان تو جہت صفت نہ کرنی چاہئے ایہ اہسن کے وقت ہی تھیں ہی تھیں ہی تھیں ہی تھیں کی ہر شہت کردی تھی ہے! کیا تم اپنی زنجیریں توڑ سکتے ہو؟ تھیں اپنے روزمرہ کے فرائض انجام دیتے ہیں: تھیں اہسن مقدس کا مٹاؤ کرنا ہے!۔ بس ان چیزوں کے علاوہ سر ہڑی اور اعلیٰ چیز تھارے لئے ضرور ساں ہے آخر اتنی ہی کا غذات تھارے کس کام ہی تھیں ہیں: ہتھ ہی ہے، کہ تم اپنے گھر کے چولوں کو نہت سمٹا رکھو۔ میرے بچو! کہ گدھ اور بازے کس قسم کی توقع نہت ہو، بھڑ اور بھال سے کس چیز کے متنی ہو؟ اس کے بعد اہسن نے ملک کے سامنے، پناہ و سرا ڈراما

۱۳ جولائی ۱۹۳۹ء میں اس میں بھی جمہور یعنی عام پبلک کے ذمہ وہ خیالات کے پرچے ڈرائے گئے ہیں اور ان کے ناظرین افعال پر، لیری کے ساتھ نکتہ چینی کی گئی ہے۔ نادرے میں سب سے پہلی مرتبہ جب ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو یہ ڈراما ایک شہور تھیٹر میں پیش کیا گیا تو اس وقت اہسن بندرگاہ سعید میں غنا پر وہ اٹھنے پر جیسے ہی۔ ابتدائی سطور پبلک کے گوش گزار ہوئیں ہاں میں شور و غل کا طوفان برپا ہو گیا، اور جب ہنگامہ حد سے تجاوز کر گیا تو فوج کو جمہور کو کر تھانہ روک دینا پڑا اس کے بعد سامنے کا پردہ گرا دیا گیا، اور خیر نے خود سیچ پر سامنے آکر عاجزی سے کہا، کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ تھانہ جاری رہے، تو ازراہ کرم ذرا صبر اور خاموشی سے کام لیں۔

چنانچہ پبلک نے اس کی عرض قبول کر لی، اور تھانہ دوبارہ شروع ہوا، تین ایکٹ تو ڈراما بغیر کسی غلط اندازی کے جاری ہا مگر چونکہ ایکٹ میں جب ڈراما کے ایک کردار ۵۸

monogamy نے کہا کہ تمہیں معلوم ہے قوم کے کہتے ہیں: — قوم عبارت ہے ان ذلیل آدمیوں سے جو علامہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ بس اتنا سنتا کہ تماشہ جنوں کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی سب غصہ سے لال پیٹے ہو گئے اور ہال: بیکار عمر بحرستان بن گیا۔ غرض کہ وہ وہ Auldence جیسے قابل تریف ڈرامے کا ناٹک دالہ نے ایسا نفرت انگیز اور بگڑاؤں پر مشتمل کیا۔

۱۵ سال کی عمر میں افسانہ نے اپنا زندہ جادو ڈراما گریا کا گھر A Doll's House لکھا۔ جس کو جلد ناقدان فن نے اس کا شاہکار اور لاہور اولی کار نامہ قرار دیا ہے۔ یہ پہلا ڈراما ہے جو اس عظیم التعلیم ڈراما نگار کو سکینڈ نیو یارک کے دو سو باہر بھی مقبول و مشہور بنانے میں مدد معاون ثابت ہوا۔ ویسے ناروے میں وہ اپنے رومانوی ڈراموں اور مائٹھوس برینڈ کی زبردست کامیابی کے باعث کافی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ مگر اس تازہ ڈرامے نے اس کو تمام یورپ میں مقبول و معروف بنا دیا۔ غالباً اب سے پہلی مرتبہ یہ ڈراما کاپن ہیگن میں پیش کیا گیا۔ پھر ۱۸۹۹ء میں بمقام لندن درخشیدیں بمقام پیرس اس کی کامیاب پیشکش ہوئی۔ اور ڈراما کے موضوع نے ہر جگہ سنسنی پیدا دی۔

اسن آزادی نسوان کا بہت بڑا حامی اور علمبردار تھا چنانچہ اس ڈراما کا بنیادی نظریہ بھی اسی آزادی نسوان کی حمایت ہے اس ڈراما کی ہیروئن نورانے اسی حصول آزادی کی خاطر ہمیشہ کیلئے اپنے شوہر اور اپنے منہ سے جو کچھ کو خیر باد کہہ دیا ظاہر ہے کہ ایسا انجام ملک میں سنسنی پھیلائے بغیر ممکن نہ رہ سکتا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اولد اسن پر ہر طرف سے کافی سے دے ہوئی۔

اسن نے نہ صرف اس ڈراما بلکہ اپنے دیگر نثریہ ڈراموں میں بھی سماج کی کمزوریوں کی طرف انگشت نمائی کی ہے ان کمزوریوں کو دور کرنے کے ذرائع بتانے کی زحمت اس نے گوانا کی۔ یہ فرض اس نے ان لوگوں کے لئے چھوڑ دیا جو ڈراما نگار نہیں تھے۔ اسن نے گویا مرض وریانت کر دیا۔ علاج کی ذمہ داری اس نے دوسروں پر چھوڑ دی۔ اس کے خیال میں

ایک ڈراما نگار کا اہم ترین فرض یہ تھا کہ وہ سماج کی برائیوں کی برطرفی سے بے نقاب کرے اور سدھارنے کی تدابیر: دوسروں کیلئے چھوڑے۔ جب سنسنی میں مہمان اشاعت پذیر ہوا تو اسن کے ذاتی بکرا بھی اسکی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے۔ اور اخبارات و رسائل کے عالم پرچم نقادوں نے تو اس قدر ذہنی اور نفرت انگیز تبصرے لکھے کہ محبت کی کاسیڈی والے تبصرے ان کے آگے مانڈ پڑ گئے۔ اس کے بعد اس کے دوسرے ڈرامے جنگلی بلی کا بھی دنیا ہی نفرت انگیز تبصرے کیلئے آخر اس اس قدر تنگ آ گیا کہ اسے جذبہ تنفر سے مغلوب ہو کر کہہ دیا کہ یہ کتنا بڑا کرناؤ ہے کہ آدمی دو لاکھ انسانوں پر نہیں بلکہ دو لاکھ لاکھ اور بلیوں پر مشتمل ہے۔

اسن نہایت زبردست کیڑا کا حال تھا۔ اس کا سبب و فشر ثبوت یہ ہے کہ ملک میں ہر گوشہ میں اس کے غلات علم بغاوت بند کیا گیا۔ مگر اس نے اس بغاوت کو ذمہ مبرا سمجھتے ہوئے اور کبھی بھی اس سے شائستہ نہ ہوا جو راہ وہ اپنے لئے منتخب کر چکا تھا۔ اس پر تو وہ واپس سختی سے گامزن رہا۔ دنیا کی کوئی طاقت بھی اس کے اپنی امداد سے کوئی تزلزل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس جیسے کسی اور نگار یا دنیا میں اسکا کوئی ہم خیال نہیں بلکہ اس نے تو ایک بار صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ مضبوط ترین انسان وہی ہے جو تنہا کھڑا رہتا ہو۔ آخر دشمنوں اور حریفوں نے منہ کی کھائی۔ اور یہ باغی ڈراما نگار کامیاب کامراں ہوا وہی دشمن جنہوں نے ایک دن اسکی مخالفت کی تھی آخر اس کی عدم التعلیل قابلیت اور پراثر شخصیت کے سلسلے میں ہو گئے انہوں نے اس کے سامنے اپنے سپردال دیئے۔

اطالیہ میں ہی اسن نے دو نہایت عمدہ اور قابل ستائش ڈرامے نظمیں A Doll's House اور The Enemy of the People جنہوں نے بے حد و بیکریے شایع ہو کر اسکی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ یہ نظمیں مقبول و مشہور ہوئیں کہ ناروے والوں نے بھی آخر کار اپنا سر عقیدت اسن کی قابضیت کے سامنے خم کر دیا۔ اور اس کے بدترین حریف بھی رفتہ رفتہ اسکی بے مثل و داعی کاوشوں کی مدح سرائی کرنے لگے۔ اسن کو اب سرکاری پیش کشا شروع ہوئی اور اس طرح نگار

اندس کا دور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

مشتہ میں یہ جلاد من ڈرانا نگار نادر سے واپس آیا اور اپنے  
دین نام ذہن کی آغوش میں گزارنے کیلئے اس نے کریمینیا  
مست اختیار کر لی اپنی عدم چھٹی میں وہ تمام یورپ کے اندر مشہور  
رہا اس نے جب وہ اپنے... گھر واپس آیا تو اس کا نہایت  
یاد خیر مقدم کیا گیا۔ وہی لوگ جو اس کی مخالفت کرتے تھے اب  
کونوں میں اس کی تصدیق خوانی کرنے لگے۔ مشتہ میں اس کی ستویں  
سالہ دہائیوں نے نہایت دھوم دھام سے منائی، اور اس کے  
بے سال بعد کریمینیا تعمیر کے سامنے اس کا ایک مجسمہ پبلک کی طرف  
سے بنایا گیا۔ پھر ایک طویل علالت کے بعد جب ہنرک بس  
نہیں رہا تو اس کی وائی اہل کو لیک گیا۔ تو پبلک نے اپنے خرق  
ت نہایت شاندار طور پر اس کی تجزیہ و تفسیر کی۔

اسن کے ایک سوانح نگار نے اس کی صورت و شکل کی متعلق  
سہ ہوا کہ اس کا قدمیانہ تھا اور اس کی شخصیت زبردست اس کے  
سورج والائی حستہ بہت مضبوط تھا، اور ضعیفی کے باوجود اس کے چہرے  
نہیں ہر دور سے رنگ کے بال ہرے رہتے تھے۔ اسکے فار وادار پٹوں  
اور اس کی آن آنکھوں سے جن پر ہمیشہ بینک چڑھی ہوتی تھی، اس  
نے ماوسے کا استحکام آشکار ہوتا تھا۔ اسن کے نن بدن سے...  
نہت بینک نمایاں ہوتی تھی۔

زندگی میں شاذ و نادر ہی وہ کبھی طویل ہوا، حتیٰ کہ ضعیفی میں بھی  
کسی کسی دن کو کھار نہ بنا، وہ صحت جسم تھا، طوفان آندھی  
رو یا بادش کسی چیز سے اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا، پابندی و اوقاف  
کا وہ ہر کام میں بہت زیادہ خیال رکھتا، اور یہ اس کا وہ وصفت تھا  
نہ کلانی تمام روئے زمین میں بھی تلاش کرنے پر نہیں لی سکتا  
نوسم گرما میں اسن سات بجے ہی بیدار ہو جایا کرتا تھا  
عمر میں قدرے تاخیر سے کپڑے تبدیل کرنے میں وہ علوان بہت  
پہلکا تھا کہ چونکہ اس کی عادت تبدیلی پوشاک کے دوران میں  
نہے کے ارد گرد و خرواں خرواں میں گرہ لگنے کے پلاش پر

غور کرنے کی تھی اس سے فارغ ہو چکے کے بعد وہ ہلکا سا ناشتہ  
کھاتا، اور ٹھیک و بجے نہایت پابندی کے ساتھ ڈراما لکھنے میں  
مردت ہو جاتا۔ چر جب ایک بج جاتا تو وہ لکھنا ترک کر کے چل  
قد می کے لئے باہر نکل جاتا۔ یوں کہ دن کا کھانا تو س کرنے سے قبل  
ٹہل سینے کا عادی تھا۔ سہ پہر کا وقت وہ مطالعہ میں صرف کیا کرتا تھا  
اور پھر معمولی مقدار میں کچھ کھاتی کر... سویرے ہی بستر استراحت پر  
دراز ہو جایا کرتا غرض کہ یہ اس پر درگرم کام کا معمولی سا خاکہ ہے، جس پر  
وہ سختی سے عمل کیا کرتا تھا۔

اسن نہایت متین اور خاموش طبع واقع ہوا تھا، اگر اس کے  
سامنے دو چار حضرات جمع ہو جاتے، تو وہ کبھی زبان کشائی نہ کرتا  
اور سنی الاسکان خاموش رہنے کی سعی کرتا تھا۔ لکھنے لکھانے کے علاوہ  
اور کسی کام میں اس کی طبیعت نہ لگتی تھی۔

وہ عموماً تنہا اپنے کا عادی تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمام راہ کسی  
نہ کسی موضوع پر غور و خوض کیا کرتا تھا، اور جب اسے بہ بڑت سے  
نقشی ہو جاتی تھی، تو پھر اس پر چڑھنے لکھنے کو مینا اور جب تک وہ ٹھکانہ  
سے اپنے موضوع کے نشیب و فراز پر غور نہ کر لیتا، کبھی اس پر قلم نہ اٹھاتا  
اس کیلئے تصنیف کا سب سے بہتر زمانہ موسم گرما تھا۔ سہرا وہ صرف  
پلاٹ کی تعمیر و تشکیل میں صرف کیا کرتا تھا، اور جو پلاٹ اسے جائزے میں  
ہاتھ آ جاتے، ان پر وہ گرمایں خاصہ فرمائی کرتا، اس نے اپنی تقریباً تمام  
تصانیف گرمایں ہی لکھی ہیں۔

سب سے لمبے بات یہ ہے کہ جب وہ کوئی ڈراما لکھنا بیٹھا تھا  
تو کھانا نہایت ناکافی مقدار میں کھاتا، بس صبح کے وقت تھوڑی سی  
روٹی اور ایک پیالہ تہوہ نوش کر کے لکھنے کو بیٹھ جاتا۔ اس کا خیال تھا  
کہ اگر اس نے زیادہ کھا لیا، تو پھر وہ ٹھکانہ سے کچھ نہ کھائے گا۔

کہ جب کہ لکھنے کی اس عادت نہ تھی کیونکہ دوران تحریر میں کبھی کبھی وہ  
کرو کے اندر باہر ٹہل کر پائپ پینے لگتا۔ اسکے علاوہ اور کسی وقت وہ ہرگز  
پائپ نہ پیتا تھا۔ لکھنے کے اوقات میں وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھنے  
کا عادی تھا۔ البتہ کبھی اس کی بیوی وہاں آ جایا کرتی، مگر اس کی ذات  
سے اس کو کوئی مزاحمت نہ ہوتی تھی۔

# مترجمہ وجودی حضرت وارث شاہ کی ہیر کا ایک ورق

دہ زبان میں الجھنے والے ادبی جواہر، وجود ہی۔ اہل زمین ان پر فخر کرنے میں ہم انگریزی، فرانسیسی، روسی، جاپانی اور ایسی ہی دوسری زبانوں کے تراجم پیش کر کے بگڑتے ہیں کہ ہم نے بہت بڑی علمی و ادبی خدمت سر انجام دی، مگر ہم اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ہمارا ملک بھی برسے برس مطالعہ کرتا ہے۔ وہ علمی جہانبات کہ ہم اپنی علمی زبانوں کے تراجم پیش کر کے انکو چار چاند لگائیں۔

انہوں نے کہہ مئے انیسویں صدی کی زبان پنجابی کو اس قدر چھوڑ دیا ہے کہ اس کے استعمال کو اپنی زبان کے خلاف ہی نہیں سمجھتے۔ بلکہ اسکو علم و درست مفروضات کے ساتھ پیش کرنا ایک قسم کا گناہ بھی خیال کرتے ہیں اس زبان میں بعض ایسے ایسے گوربا یا ب پوشیدہ ہیں کہ وہ اپنے بغیر جانچ کر بہت سی بات میں حضرت وارث شاہ کی ہیر کا ایک ورق پیش کرتے ہیں اس میں اس واقعہ کا ذکر ہے جب ہیر سہرا ل کے گھر ہے۔ اس کا عاشق راجھا اس سے کوسوں دور سے اس کے ذوق میں ڈوب رہا ہے۔ اور یہ اس کے راز کی گھڑیاں گن گن کر گزار رہی ہے وہ اپنے عاشق کو پیغام بھجواتی اور خط لکھتی ہے اس کے برابر ہیں اسکا عاشق راجھا اسکو خط لکھتا ہے۔ (وجودی)

## ہیر قاصد کو پیغام دیتی ہے

(۱)

اے او جانی نہ صد

خدا کے لئے

تم میرے پیارے راجھے سے

میرے داستانِ غم اس طبع بیان کرنا کہ تیرے فراق میں

میں بہت دہلی ہو گئی ہوں۔

اور قریب رگ معلوم ہوتی ہوں — مجھ پر قدرت کو

(۲)

قلم خدا نے

دشمنوں کے گھر میں

پیدا کیا

اب تو

تیرا راستہ دیکھتے دیکھتے

میری آنکھیں

درد بھی کرنے لگیں

اتھیرے مالک!

کبھی اپنی صودت بچے دکھا جا

(۳)

تیرے بغیر۔

میں رات دن۔

جاگتی رہتی ہوں

میرے اس بیان کے گور

میری آنکھوں کے۔

وہ زون گڑھے میں۔

اے میرے مالک!

جسندی۔

میرا دین بھی جا رہا ہے اور دنیا بھی۔

آ۔ اور میرے دین اور دنیا کو کھالے۔

(۴)

میں ہمیشہ  
مجھے پکارتی رہتی ہوں۔  
میں کوہ اڑاتی ہوں۔  
"حیرا انتظار کرتی ہوں  
میری قسمت میں یہی تھا ہے۔  
اگر تم  
میرے جسم کے چرب کا  
ہوتا بنا کر  
اپنے پاؤں میں بننا چاہو۔  
تو بھی  
مجھے کوئی عذرت ہوگا۔

(۵)

اگر تم  
سیرا استخوان کر رہے ہو۔  
تو پیارے۔  
اب آجباؤ۔  
پھر تیار را دیں بعد آنا۔  
کس کام آئے گا؟  
جب میں نہ ہوں گی۔  
میں اپنے پیارے رانجھے کے پاس  
کس طرح جاؤں؟  
مسم میں طاقت نہیں ہے  
وہ پاس دام نہیں۔

رانجھے کو سیر کا خط ملتا ہے

(۱)

قاصد نے آکر۔  
رانجھے کو خط دیا۔

کہ مجھ پر قریب مرگ ہے۔  
تو نے اسے  
خدا معلوم  
کیا دھوکا دے کر  
لوٹ لیا ہے۔  
تو نے اس پر  
جادو کر دیا ہے۔  
ایک گھر ہی بھی۔  
اس کو چیں نہیں۔  
تو نے۔

کوئی ایسا۔  
محبت کا تیر چلا پایا ہے — ک  
تیرے رقبوں سے  
اس کو محبت بالکل نہیں ہوئی۔  
اگرچہ لوگوں نے بہت ہی کوشش کی

(۲)

تیرے رقب کو۔  
وہ پاس تک پہنچنے نہیں دیتی۔  
وہ تو۔

اس کے پاس تک نہیں جاتی  
جب وہ۔

اس کے قریب جانے کا۔  
اما وہ ہی کرتا ہے۔  
تو اسی وقت

وہ برہم ہو جاتی ہے۔

(۳)

تیرے انتظار میں۔  
وہ رات بھر جاگتی ہے۔  
تارے گن گن کر۔

وقت گزارتی ہے۔

اس کی زندگی کی مثال۔

یہ ہے۔

جیسے مغرب نوح کی کشتی۔

طوفان میں ہو۔

بچتے بیٹھتے

وہ تیرا ہی نام لیتی ہے۔

(۱۲)

م جوگی بن کر بھی۔

اس شہم میں۔

بہاں سپر رہتی ہے۔

آج بٹاؤ۔

محبوب ہے۔

دو گھنٹی ل کر

اپنی زندگی کا لطف حاصل کرو۔

اے حضرت وارث شاہ!

اس وقت سب کام درست ہو جاتے ہیں

جب خدا مہربان ہو۔

ہر کے خط کا پڑھا جانا

(۱)

تیری محبوب نے۔

تیسرا نام

خط تھا ہے۔

اس میں۔

سوز و گمراہی دیا ہے۔

رانجے نے اس خط کو۔

محبت پٹ پڑھایا۔

خوش ہوا۔

اور دل سے

ایک شہنشاہی آہ بھری۔

(۲)

اے میاں طال:

تو میرا درد اور فراق سے بھرا ہوا خاک

وہ درد اور فراق۔

جو آسمان سے تارے توڑ دیتا ہے

اس خط میں لکھا۔

وہ گمراہ کرنا۔

وہ دل کا درد کہنا۔

جو پیار سے۔

اپنے پیار سے کو بکھتے ہیں۔

(۳)

قاصد خط دے کر۔

ناراض ہوا۔

تو میرا سنے

خدا کا شکر ادا کیا۔

اے حضرت وارث!

میں اس کی قدرت کے

قربان!

کام دہی سرانجام پا ہے۔

جو خدا کر پسند ہو۔

رانجے کا ہستی کی طرف خط لکھنا

(۱)

آخر اس حسین نے۔

یہ جواب لکھا کہ۔

جب ہمارے دل میں

اس کی محبت پیدا ہوئی۔



جب ہم کو۔  
حسن کے چہروں نے لوٹ یا  
اسی روز سے۔  
ہم فقیر ہو گئے۔

(۲)

پہلے پیارے کو  
دعا سلام قبول ہو۔  
پھر یہ معلوم ہو۔  
کہ حضرت!  
آپ ہم کو تو  
مذاق کے کوشش میں ڈال گئے۔  
ہم نے،  
مال و جان تک  
پیش کر دیا۔  
اور تم!  
رشتہء محبت ہی کو  
توڑ کر چلے گئے۔

(۳)

اب  
ہم سے کوئی۔  
سیدھے منہ۔  
بات بھی نہیں کرتا۔  
جب سے پیارا  
میرے پاس سے چلا گیا۔  
ہمارا بسنا۔  
خدا کو۔

ایسے آدمیوں میں منظور ہوا  
جو محبت کا نام تک نہیں جانتے۔  
محبت کرنے والے۔

ہم سے جاگ کر۔  
اس طرح چلے گئے۔  
جس طرح نور اذکر  
چلا جاتا ہے۔

(۴)

میری قربانیوں کی  
پرہیز کرتے ہوئے  
انہوں نے۔  
رقیبوں کے ساتھ راہنی  
اب رقیب کے مگر۔  
خوشی سے جا کر میٹھی گئی ہیں  
جب ہم نے۔  
اپنی حسن و خوبصورتی۔  
ان پر شام کر دی۔

(۵)

وہ!

خود تو،

پہلو میں  
محبوب بن کر جا بیٹھے  
اور اس کے انتظار میں۔  
ہماری آنکھوں کی بینائی بھی۔  
کھو گئی۔

اُسے حضرت وارث شاہ!  
وہ ہم کو چھپے تو چھوڑ گئے ہیں!  
مگر جب ہم۔  
ان کے پیچھے دوڑنے والے۔  
اُن سے جا ملے۔  
تو دشمنی پیدا کرنے والوں کا  
ہیں نہ چلے گا۔

اور وہ ہمارے ہی ہو جائیں گے۔

### میر کی طرف رانجے کے خط کا مضمون!

(۱)

ہم خیریت سے ہیں۔

اور تمہاری۔

خیریت چاہتے ہیں

اب تم

میرا حال اس طرح لکھو۔

خدا اور ماستہ دکھانے والے کی

مہربانی کے بغیر۔

جہاں ری مصیبتوں کو

بھلا کون آسان کر سکتا ہے؟

(۲)

تم جو چوہہ بری جیسے

معزز شخص کا بیٹا

اور

میر کے والد کے۔

موشی چراستے؟

اس پر بھی۔

دھوکا دے کر۔

خود تو دلی میں بیٹھے کر۔

رذیل کے ساتھ چلی گئی

بھلا اب۔

ان کنواریوں کا

کون اعتبار کرے؟

(۳)

یہ جادو کے زور سے۔

زستی کو سانپ بنا دیں۔

اور آسمان کے تاروں کو

ڈگری کے نیچے چپا دیں۔

والدین کے گھر بیٹھ کر تو۔

یہ جانوں کو قفس بنا دیتی ہیں۔

اور سہراں کے گھر جا کر

وہ خوب خوشی سے رہتی ہیں۔

(۴)

خود تو۔

یہ وہ بن بن کر۔

سب کچھ بھول جاتی ہیں۔

اور اپنے چاہنے والوں کو۔

نیم جان چھوڑ جاتی ہیں۔

معززین کے بیٹوں کو

موشی چراسنے والا بنا کر۔

خود جا کر۔

معزز بن جاتی ہیں۔

(۵)

وہاں۔

بب کوئی

ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے۔

تو خود بن سنور کر۔

بیٹھ جاتی ہیں

اسے حضرت وارشہ شاہ۔

جہاں ہم سے۔

کب بازمانیں گے۔

جب راجہ بھوج جیسوں سے

انہوں نے ہار نہ مانی۔

میں نے یہ سب سنا ہے

راجہ ہمدی علیاں

# ایک ماں

چھپٹے کے وقت شیشم کے درختوں کے تلے  
 لہ رہی تھی جب ہوا مسرو شاخوں کے تلے  
 جب زمین خلد منظر کیف سے معمور تھی  
 شام کی دیوی محبت کے نشے سے چور تھی  
 گاؤں کی ویراں سڑک پر محکوک لڑکی ملی  
 نیلگوں ملبوس میں مورت چھپی تھی نور کی  
 ساتھ اپنے دھول اڑائے جس طرح موج صبا!  
 جس طرح سے بھول کیساتھ ایک کانٹا ہولگا  
 نوجواں بھی آ رہا تھا ایک اس کے ساتھ ساتھ

وحشی جنوں

# قیدی کی ڈائری

کر دی۔ اور مجھے ایساں کی طویل قید..... طویل کیوں نہ کہوں  
آزادی کی گود میں پورے پانے والے طائر نوگرفت اکیلے نفس کی  
زندگی کا ایسا ایک پہل کتنا مشکل ہے یہ وہی جانتا ہے ایک سال  
کی قید کیوں کہ کس نے کس جرم کی پاداش میں یہ..... میرے  
دل میں انتقام کی آگ جبرک، ہی متھی، وہ میرا خون تھا ایک ہی ماں  
کے پیٹ سے پیدا ہوئے لیکن..... اس نے میری ستروں کے  
گلشن کو بیدوی سے پامال کرنے کی کوشش کی، وہ لالچی کتاغت  
عفت، عصمت کی دیوی، شرم دھیا کی تہی میری بیوی دھیا کو  
اس نے بڑھگاہ سے دیکھا، اس کے حق سے متاثر ہو کر وہ انسانیت  
تک کو بھول گیا، مجھے چہل چل گیا، لیکن میں نے اسے وہی سے طلبا  
محبت کرتے ہوئے دیکھ لیا، وہ اس سے کہہ رہی تھی، شرم کرو، میں  
تمہاری جانی ہوں، لیکن وہ ہوس کے نشے میں اندھا ہو رہا تھا  
اپنی خواہشات کی تکمیل نہ ہونے کی وجہ سے زبردستی ہر اثر کیا، میں غصے  
سے کہنے لگا، میں نے چاہا تو نکالا، اور چاہتا تھا کہ اسے ہمیشہ کے لئے  
سوت کی آغوش میں ہی سداوں لیکن وہ تار گیا، اور ہاتھ جاگ  
گیا، دوسرے دن پولیس والوں نے مجھے اقدام قتل کے جرم میں  
گرفتار کرنا چاہا، میں نے کچھ پس و پیش کرنا پسند نہ کیا، اور اپنے  
آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

۱۸ اپریل - جس خانے کی چار دیواری میں میا دم گنا جاب  
آہ! آزادی! آزادی! تیرا نام ہی فرودس برس ہے، اسمانی نصیب  
میں ٹرنے والے طہور کتے خوش ہیں، جھوٹری کی رادی کی زندگی  
گر نیو لاغریب مزدور جو اپنی تقدیر سے ڈر رہا ہے، کتنا ہی خوش تیرے  
ادب جن کا ہر قدم اور ہر فعل دوسروں کی مرضی پر منحصر ہے، کتے ہی غیب  
خیر..... یہ اکیسال بھی گزرتا ہے، اگر اس مہربان اند

۱۹ اپریل آج مجھے سسے سپاہی اپنی حراست میں جج کے ساتھ  
لے گئے۔ رات میں مجھے بے شمار گالیاں ملیں اور ایک ظالم نے تو  
اپنے ڈھٹے سے جی کام لیا، جس کی یاد کا رب تک میرے پہلو میں  
موجود ہے میرا قصور کیا تھا؟ مجھے تیز چلنے کے لئے مجبور کیا گیا، میں نے  
انکار کر دیا، بعد انکو میں رو باجو انسان کبھی تیز بھی چل سکتا ہے، میں  
رات میں اپنے مستقبل کے متعلق سوچ رہا تھا اور پولیس والے  
اپنے رعب و داب کے متعلق..... میرا اندھا پاگل مٹی  
نیکتا جو امیری بیوی کی رہبری میں مجھے آخری بار لے گئے، لیکن  
بے نیل درام وٹا میں جج کے سامنے پیش ہو، مقدمہ کی سماعت  
شروع ہوئی، یہ اوٹیل ایک اپوڈیٹ جٹلیں تھا وہ اپنی جینوں کے  
بالائی سے سے میری طرف فنی خیز بگاڑوں سے دیکھتا، جس سے میں  
کاف اکتا مجھے بے قصور ثابت کرنے کے لئے اس نے ہر کوشش  
کی، لیکن بے سود، میں جانتا تھا کہ میرے نروپوں کی قیمت جو بعد  
فیس ادا کئے گئے تھے، صرف لفظی ہوگی، دریں بہت بڑے کیل  
کی لفاظی.....! کیسا ہی بگاڑت تھا وہ ویل..... اور اس  
کا وہ خشی، اگر یہ بات آجائے تو اس کی مہی، پنجیس بکھڑوں اس  
نے خوب چھانسا، وکیل ایسا بے ویسا ہے، اس نے محنت دار سے  
سینکڑوں جھوٹ کو اتارا ہے، ہزاروں کو قید خانے کی تنگ تاریک  
کوٹھڑیوں سے نکال لایا ہے، اور چھ فیس بھی کچھ نہیں صرف پانچ سو  
روپیہ۔ پانچ سو روپیہ بندہ وستان کی سرزمین میں پانچ سو پانیاں  
بھی تزیین کے گھر سے نکال مشکل ہیں لیکن یہ روپیہ؟ میری آزادی  
کی قیمت تھی نئی زندگی کا معارفہ تھا، اس لئے مجبوراً سب سے غم  
کرنا پڑا، جج نے محاضرات کے بیانات ٹک نہ کرنے کے بعد میری آزادی  
قانونی ذخیروں میں جکر کر لیا خانے کی تاریک کوٹھڑی کے حوالے

پ کا خیال نہ ہو۔ جو بیٹے کے خیال میں نہ حال ہو رہا ہو گا اس  
نہا، جو کی دھیان نہ ہو جو خاندان کے فراق میں دن رات گھل رہی  
دی پائل اگر انہی خیالات میں کھویا رہا۔ تو شاید اسی قید میں تیر لی  
بہر قید سے آزاد ہو جائے گی۔

۱۹ اپریل۔ آج جیل خانے میں ہر ایک قیدی نے مجھ سے اپنا  
مارت کرایا۔ ان میں ہر قسم کے قیدی ہیں سفاک قاتل، خور خفاک  
وہیے، رحم و کرم، دہر اور سنگدل جو۔ ان کے چہرے مکروہ اور غیبت  
میں کچھ قیدی کو کوئی میں سر جھکا کے کسی فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں  
نہا یہ اپنے ماضی پر کھٹکے افسوس مل رہے ہیں۔ یا مستقبل کے متعلق  
۲۔ چ رہے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے خیال ہی نہیں بلکہ یقین ہے  
۳۔ وہ لوگ ہیں جن کا غمیر زیادہ ہے۔ جن کی روح گناہوں کی  
گرفت سے پاک ہے یہ کسی کی خود غرضی کا شکار ہوئے ہیں کئی  
یک نے تو اپنے ماضی کے ظلم و ستم کی دستان اس دلیری سے  
ساتی کچھ اس سے نفرت ہو گئی۔ ایک قیدی نے تو مجھ سے دوستی ہی  
گوانڈی وہ جعلی سکے بنانے کے جرم میں گرفتار ہوا ہے۔ کہتا ہے کہ  
یری زندگی بڑے غم سے گزر رہی تھی۔ بدووں کی کمی نہ تھی۔ لوگ  
ادست کھاتے ہیں اور میں دوست بناتا تھا۔ لیکن میرے ایک بکا  
اور فری دوست نے مجھ دھوکا دیا۔ اور اس رات سے پولیس کو آگاہ  
کر دیا۔ میں بکا گیا۔ اس نے ملنے میں کوئی کسی کا دوست نہیں رہ  
فری اور مطلب کے بندے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ دوستوں  
کو فری کہتا ہے۔ لیکن خود ذات شریف کی ماضی کی تاریخ کے ادا  
جسٹس ازیوں اور فریب کاریوں سے سیاہ ہیں۔ یہ وہ لوگ جو دوستوں  
کے تھکے کو دیکھتے ہیں۔ لیکن انہی آنکھوں کا شہسیر انہیں نظر نہیں آتا  
۱۵ جولائی۔ آج جب سب قیدیوں میں کھانا تقسیم ہو رہا تھا  
ایک قیدی نے چپکے سے موٹی چرائی۔ لیکن چلنے دیکھ لیا۔ بس اس  
بکا کے کی شامت آگئی ہنڑوں سے مارا کر اسے ادمہ مار کر دیا  
ضدیوں کو شکایت ہے۔ اس شکایت کے سننے کے لئے انسٹان بالا  
کے کان پر سے ہو گئے ہیں اور محالان قیدیوں کی سننا ہی کون کون  
شکایت ہے کہ کھانا اچھا نہیں تھا، سالانہ محنت و مشقت اور

چر کھانے کو دو چپائیاں چنے کی۔۔۔ تھوڑا سا گوبھی یا شلغم کے  
توں کا سالن اور ایک پیاز پانی کا مشکل سے نصیب ہوتا ہے اہا  
کتنے ناشکرے ہیں یہ قیدی! آزاد دنیا کے باشندوں میں بھی کچھ لوگ  
ایسے ہیں جو غرب کے نام سے پکڑے جاتے ہیں جن کو تین دن کے  
فالتے کے بعد ایک وقت کی روٹی مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔ وہ  
میں پیٹ بھر کر نہیں ان کی جھوک کی گود میں جگتے ہوتے جوں کے  
روٹے کی آزاد سے انکی سوٹی ہوئی تہمت نہیں جاگتی محنت و مشقت  
چر ہو کر۔ جب ذرا آرام لینے کے لئے وہ کسی پتھر کا سہارا لیکر بیٹھتے ہیں تو  
اپنی قسمت کا خیال آتے ہی ایک سداہ بھرتے ہیں۔ لیکن یہ آہ کائنات  
میں بھل رہ کر سکتی ہے تاروں جراتنگ اس سے نوزد براہ نام ہو سکتا  
ہے لیکن بہت پرکڑی اثر نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ قدرت مجھ پر ہے سنا ہے  
کہ دوسرے ممالک میں قیدیوں کے لئے آرام دہ آسائش کا ہر لائن  
بھیلا ہے۔ ہوا دار کمرے۔ اچھے اچھے کھانے۔ آرام دہ بستر لیکن مجھے تو  
اعتبار نہیں۔ نا قیدی چر بھی قیدی ہے۔ قید کرنے کیلئے قانون ہے۔  
لیکن قید خانے میں آرام کرنے کیلئے کوئی قانون نہیں شاید یہ مصائب  
قیدی کو سدھارتے کے لئے ہوں لیکن آزادی چھیننے سے زیادہ اللہ  
کو نسا دکھ دیا جاسکتا ہے؟

۱۲ اگست۔ اب لاہیلٹا نے سے قدرے مانوس ہو گیا ہوں لیکن  
جب کسی باہر رشک پر لوگوں کو شاداں و فرجاں ہٹتے ہوئے دیکھتا ہوں  
تو پھر آزادی کا خیال آ جاتا ہے۔ اگرچہ میں یہ جانتا ہوں کہ اس مست  
کی نقاب کے عقب میں ایک نمک مند اور سنگین چہرہ ہے۔ جس پر رشک  
آلود آنکھیں اپنی تقدیر کو رو رہی ہیں۔ لیکن انسانی فطرت کا تقاضا  
ہے کہ انسان جب تنہائی سے کل کروینا کے شور و غلب میں گم ہو جاتا  
ہے تو اس کے دل سے فکر اور غم مٹ جاتا ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے  
کے لئے اپنی ارد گرد کی چیزوں بلکہ اپنے آپ کو بھی بھول کر مسرت کی  
دنیا میں پھنچ جاتا ہے۔ لیکن تنہائی میں جا کر پھر وہی غم۔

۱۶ ستمبر۔ ایک نیا قیدی ریجنڈ میں جکڑا ہوا لایا گیا وہ زرد زند  
سے نعرے لگا رہا تھا۔ مجاہد ناگ کی ہے۔ بہا تھانگادی کی ہے۔ پولیس  
کے سپاہی اسے تنگ کر رہے تھے لیکن پھر بھی ایسا کرنے سے وہ باز نہ

ہوئے اس موت کے سند میں کو دہڑا، لیکن ڈوبا نہیں، کنارے تک گیا۔ کنارہ چیلنا نہ ہے۔ تو اس وقت تماشا دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اور وہ کانپ رہا تھا۔ تو موت کی گود میں دم توڑتے ہوئے زخمیوں پر ہنس رہا تھا۔ انہی ہمدردی کے لئے نہیں بلکہ اپنی کامیابی پر یہ مسکرتیڈر نے سر جھکا لیا۔ آہ دنیا میں وہ کہیں دنیا کو نہ سمجھ سکا، لیکن جیلانے میں آکر میں نے دنیا پر نگاہ ڈالی تو نکادی، اُد زبیب کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

۱۰ ستمبر۔ آج اس سوراخ سے اودہ ایہ سوراخ تو نہیں روشن دان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن روشندان اتنا تنگ! روشندان ہی ہو گا جیلانے کے روشندان اتنے نہ ہوں تو اودہ کیا۔ یہ لال تلخ تو ہے نہیں میں نے سائے نگاہ اٹھائی، آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ شعلہ می شعلہ می ہوا چل رہی تھی، آفت یہ دوکان انگریز مقرر! اس میدان میں شراب محبت وہ آتش پھٹتی ہے۔ چاند تو ہے۔ لب لب، جونوں سے لگا سکتا ہوں، لیکن ساقی کے بغیر مزہ کہاں، ساقی۔ جس کے ہاتھ میں قدرت نے میری مسرت کا جام دے دیا ہے میری غمگین تہائیوں کی ہم جلس میری رنیتہ حیات رفیتہ جس کے مرمی اور صبح جسم پر بھگا ہیں چٹا سے پہلے ہی دکھتی ہونی سلاخیں جو تک کر ادھی کر دیجائیں، جان پہ تیری یاد اس بوڑھے باب کی محبت پر غالب آگئی، جس کی آغوش شفقت میں میرا بچن آ نام سے گزرا ہے، اور جس نے تجھ جیسی چاند سی ذہن میرے لئے محبت پوری کا چراغ لیکر دھونڈ لکائی، لیکن میں اسکی تلواروں میں بس کر زندگی کے لطف سے نا آشنا تھا تیرے تیرے گھائل چوکر میں نے زندگی کی لذتوں کو پا لیا ہے، لذتوں کو جو گناہوں کی غمی کو انسانی دماغ سے ہمیشہ کے لئے نکال دیتا ہے۔

۱۱ مارچ۔ گذشتہ رات ایک عجیب واقعہ ظہور پذیر ہوا، فکر و فائدہ کے مادے ہوئے مجرم بے غم کی آغوش میں سکھ کی فینڈ سوراخ تھے، تھوڑی دیر کیلئے انہیں دنیا کے انکار سے رہائی حاصل ہو گئی تھی میں دنگ رہا تھا، کہ اتنے میں کسی کے شور بے ہنگام سے میں چونک پڑا۔ ایک قیدی کسی گیت سے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا، وہ کس کی بیوفانی کا گھر کر رہا تھا، سینہ چیر کر زخم دکھا نا چاہتا تھا، لیکن جیوہ

آیا۔ میں نے سبھا کہ یہ قومی لیڈر ہے لیکن جفاکش اور ادا سے کالچا جونا گندم فروش لیڈر نہیں، تو مکاوہ سرگرم، بہر نہیں، جو اپنے حلوے مانڈ کیلئے دوسروں کی جان و ملن کی چوکت پر قربان کرتے ہیں، جو ملن خلوہ میں ہے، سودا ج ہما مایہ انشی حتی ہے۔ سب پر شہید گنج کو مار کر لوگ کے پیٹنٹ، نفٹے لوگوں کے بیقرار جمع کے سائے کہہ کہہ کر لوگوں کو جذبات اور غصے کو شعلہ کر دیتے ہیں۔ اور پھر اس آگ کو لگا کر دوسرے ہی دوسروں کے جھونپڑوں کو جلتے ہوئے دیکھ کر اپنی کامیابی پر غرور کرتے ہیں، ہاں! تو میں اپنی خیالات میں غرق تھا کہ دروازے کی آواز سے چونک پڑا۔ میں نے دیکھا کہ قیدی کو چھو کر سپاہی دروازہ بند کر رہے ہیں۔ قیدی میرے پاس ہی بیٹھا تھا۔ جب سپاہی چلے گئے تو اس نے مجھے اب جارت کے سپوت! کہہ کر مخاطب کیا۔ پھر اپنی مام کہانی بیان کرنا شروع کر دی اس نے کہا کہ میں ایک بہت بڑا آدمی ہوں، لاکھوں کی جائیداد کا مالک، لیکن ملک کی غلامی کو میں نہ دیکھ سکا، میرے دل میں قوم کا درد تھا، میں نے اپنے وطن کو آزاد کرنے کا عزم کر لیا، اپنے بھائیوں سے غفلت کی فینڈ سوئی ہوئی قوم کو جگا بار، ان کے مردہ دلوں میں نکل پیدا کی ان کے تن بدن میں غصے کی آگ لگا دی میں ایک مشہور مقرر ہوں میرے الفاظ تیرے دشت سے بڑھ کر ہوتے ہیں میں نے ان نشتروں سے بھارت کے سپوتوں کے دماغ کو چیرا، اور ان سے غفلت کا مواد نکال کر انہیں اس قابل بنایا کہ وہ اپنی برائی بھائی کو نہ بچ سکیں، وہ یہی کہہ رہا تھا کہ دوسرے کو نہ سے ایک شخص جانا تھا، جھوٹ! بالکل جھوٹ! تو نکار اور زہری ہے، تو لوگوں کو دھوکا دینا اچا الو سیدھا کرتا ہے، اتنا جھوٹ! کل تجھے پیٹ پالنے کیلئے ہو کے منگڑے تک نصیب نہ تھے، تو لوگوں کی غفلت نہ مانے کی روش اور اپنی جرب نہ بانی سے فائدہ اٹھا کر لیڈر بن گیا، تیری ہر جگہ بت ہوئی ہے، تیرے گے میں بچوں کے ہار ڈالے جاتے ہیں، بگڑو زہری ہے، تیری ظاہری حالت نے لوگوں کو دھوکا دیا، بیشک تو ایک آتش بیان مقرب ہے، لیکن ایک بزدل اور کینہ لیسڈر تیرے ہی ان آتشیں الفاظ نے میرے غصے کی آگ کو جبر کا لیا، اور میں اپنی جان کی پروا نہ کرتے

مات کی تاریکی میں معلوم نہیں اس کا خیال کیوں ایسی عادی میں جا بھٹکا  
جہاں انسانی سکھ آباد نہ پھرتا ہے۔ دن بھر گیارہیں اپنا خون صوف کرنے  
والے بے گناہ مجرم جو کسی فرد سی نہیں کھوٹے ہوئے تھے۔ اور زندگ  
مجرم جو اپنے مستقبل کی بلیا تک تصویر دیکھ کر خوفزدہ ہو رہے تھے چمک  
ہوئے۔ دھنسنے پر پروٹنے والے سپاہی، سرکار کے نمک خوار جرات  
کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر متوڑی دیر کے لئے کر سیدھی کرنا چاہتے تھے  
شہر ٹھہرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ناشایستہ گالیاں، موٹی موٹی غلطیات  
جو اکثر پولیس والوں کے حافطہ کی نوٹ بک میں ایسے ہی موقعوں کے  
لئے ہی وضع رہتی ہیں۔ زبان سے نکل کر کاؤں سے ٹکرانے لگیں تھیں  
مجرم کے لبوں پر مہر سکوت لگ گئی۔ نیند کے نشے میں مست قیدی  
پھر اس پتھر پر فرش پر گر کر روئیں بیٹھے لگے۔ ..... صبح میں کھلے  
میدان میں جبری ورزش کے لئے لے گئے۔ رات والے زندہ دل  
شخص کے لئے پتھر کوٹنے کا حکم صادر ہوا، اور شام تک اس بچارے  
پر وہ ستم ڈھایا گیا۔ کہ تو یہی محفل۔

۵ مارچ، آج میں پلٹا نہ سے آزاد ہوا۔ ایک خواب، خوفناک  
دل ہلا دینے والے خواب سے ..... پیدا ہوا جو ایک فاضلت  
تک مجھ پر طاری رہا۔ خواب ہاں اس خواب کی دنیا سے میں جلد  
ٹھٹھکا چاہتا تھا۔ اس خواب میں میں نے کیا دیکھا؟ دنیا کی حالت بگڑ  
فریب، ظلم و ستم، دنیا کسی کی نہیں جو اس کے تعاقب میں جاگتا  
ہے، دنیا اس سے الگ ٹھٹھک رہنا چاہتی ہے۔ اور جو اس آگے  
جاگتا ہے۔ دنیا چاہتی ہے کہ اپنی تمام رنگینیاں اس کے

داسن میں ڈال دے۔ ..... .

میرا باپ میری بیوی کی رہبری میں مجھے قید خانے کے دروازے  
پر لے گیا۔ لیکن میرا بھائی! وہ شاید کسی جگہ اپنے خیالات میں جو خاموش  
انتقام کی تجویزیں سوچ رہا ہوگا۔ وہ سوچتا ہوگا کہ اب نمبر کی  
لعنت طاعت اور اس کھنٹے جہانی کی نظروں کی تاب نہ لانا مشکل  
ہے۔ وہ خیال کر رہا ہوگا کہ اب غمزدہ دنیا سے اس کا نقش ہستی  
مٹا دوں یہ خون دینا دی رشتے کی آہ میں ہمیشہ کے لئے دنیا کی  
نظروں سے پوشیدہ ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن اس کا یہ خون بیٹو  
ہے جس خاندان کے پے در پے مصائب نے مجھے اس قابل بنا دیا ہے  
کہ میں اسے خستہ پشانی سے معاف کر سکتا ہوں۔ اسے پھر  
اس سینے سے لگا سکتا ہوں جس میں بے قرار دل انتقام کے لئے تڑپتا  
رہا تھا۔ ..... . باپ نے مجھے گلے سے لگایا،  
وہ اپنی ماضی کے غموں کو خوشی کے آنسوؤں کے طوفان میں بہا دینا  
چاہتا تھا۔ وہ دل کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ کہ یہ سیرا جگر  
نوشہ ہے۔ لیکن ظاہر میں نگاہوں سے میری تبدیلیاں نہیں دیکھ  
سکتا تھا کیونکہ آنکھیں تو اس سے چھین لی گئی تھیں۔ دنیا کے  
بٹھتے دل کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن دنیا کی تبدیلیاں  
ظاہر میں آنکھوں سے ہی نظر آ سکتی ہیں۔ میرے باپ کی غیر فانی محبت  
کے سیلاب میں میری رفیقہ خیانت کا اظہار محبت بھی بہ رہا تھا۔  
ایک کاسینو جے جینے ہوئے تھا۔ تو دوسرے کا دل بچے اپنے آپ  
میں گم کر لینا چاہتا تھا، ہمیشہ کے لئے ..... .

سجاد ہاشمی

بادۂ شیراز

شراب آہ من آتش زدہ کا شانہ خود را  
نمیدانم پر گویم روئے ساقی را بہ بدستی  
باز ماہیں گویم اگر پیمانہ خود را  
لیدستی کہ ہر تنس تہی تن پے خود را  
بدہ مد آب و رنگ از سجدہ ام تھانہ خود را

شدی بجا دسر گروہاں بہ کوئے عشق مہرواں  
تو رسوا ساختہ آخ و اول دہانہ

# پشت خنداں مرحوم کی آخری ناتمام غزل

پشت خنداں مرحوم  
LHI

خنداں مرحوم اردو کے نہایت کامیاب شاعر تھے۔ سونہ گداڑ آپ کی شاعری میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے؛ افسوس آج دستِ نو نے ہم سے ایک نعلی ترین دوست اور ایک بہترین شاعر چھین لیا۔  
ذیل کی غزل شاعر مرحوم نے رحلت سے قریب دو ماہ پیشتر جناب مشتاق جلی اور حفصہ سراج الدین ظفری کے ایل ایل بی کی موجودگی میں کہنی شروع کی تھی، یوں تو نظم کا ہر شعر الہامی ہے۔ مگر مطلع اول اور مطلع خاص طویل و سرایہ و اہام ہیں۔  
خنداں صاحب نے تا دمِ واپس تکلیفوں کا مقابلہ زندہ پریشانی سے کیا اور ایک لمحہ کیے بھی بے چینی ظاہر نہ کی۔  
ہیں مرحوم و مغفور کے عزیزوں سے ہمدردی ہے

(ایڈیٹر)

بہاںیں حالِ زبوں جینے کا ساماں کر رہا ہوں میں

جو ہو سکتا ہے تیرے غم پہ احساں کر رہا ہوں میں

ہر اک داغِ محبت کو فزراں کر رہا ہوں میں

مقدمہ کی سیاہی میں چسپاں کر رہا ہوں میں

یہ لحاظِ مصائب اور تصویرِ سیری محفل کا !!

بیا بانوں میں گلگشت گلستاں کر رہا ہوں میں

ازل سے نیتِ ساحل ہے، ہر دم یادِ ساحل ہے

مگر کشتی کو نذرِ موجِ طوقاں کر رہا ہوں میں

قریبِ مرگ ہوں خنداں مگر لب پر تبسم ہے

یہاں تک احترامِ در و پنہاں کر رہا ہوں میں





اختر انصاری  
بی۔ اے  
لاہور

# قطعات

## داغِ محبت

مجھ سے اک دن کہا محبت نے میرے پیارے! ادم تو آؤ غم  
میں تمہیں ایک داغِ دیتی ہوں تاکہ مجھ کو نہ بھول جاؤ تم

## چاندنی رات

چاند تیری بلانیں بیتا ہے بھول تجھ پر نثار ہیں سارے  
میری خواہش یہ ہے کہ نذر کرں تو ذکر آسمان کے تارے

## زبان

قلب زندہ ہے لفظ ہیں بیجان کیجئے کیا اگر نہ چپ رہیے  
جس کو دنیا زبان کہتی ہے! اس کو جذبات کا گفن کیجئے

## کرم نامہ

مانجے زخمِ جگر کے ٹوٹ گئے آنسوؤں میں ہے خون کی سرخی  
خوب کی تم نے پرشِ احوال خط نے اچھی یہ غم گسادی کی

ادارہ

# تقدیر و نظر

ہر نیچے جو بی خبر۔ کتابت و طباعت و کٹنگ و ڈیزائننگ

۱۳۸۔ قیمت ۵ رو۔ ارسال زر کا پتہ: غیر صاحب اخبار مدینہ منورہ یو پی  
مدینہ منورہ پر ہندوستان کا مائے ناز جریہ ہے۔ اور اپنے جہدار  
سے لیکر اب تک اس کا جو قدم بھی اٹھایا ہے وہ ترقی ہی کی طرف اٹھایا ہے  
اخبار ملک و قوم کا ماہر ہوتا ہے۔ اور یہ اس وقت تک ملک و قوم کی روح  
معنوں میں راہبری نہیں کر سکتا جب تک ترقی پسندانہ رجحانات کا حال  
نہ ہو اور یہ یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوتی ہے کہ مدینہ اپنے راضی بڑی  
ایمانداری و خلوص کے ساتھ ادا کر رہا ہے۔ زیر نظر ہر دور کا عظیم انڈیئر  
جو بی خبر ہے جو تعلیم کے مہم صفحات پر چھاپا ہوا ہے ان صفحات  
میں ہر قسم کا مضمون شامل ہے۔ ہر ان محرم نے مسائی حاضر سے متعلق  
بہترین مضامین کو اخبار میں جگہ دی ہے۔ بالخصوص اشتراکیت اور اند  
زبان ہر مضامین میں وہ ہر لفظ سے کامیاب و مفید ہیں۔ رشتہ نریل  
ڈاکٹر سر سید علی ہودا نے اردو زبان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا بجز  
ہے۔ کچھ مضمونوں پر ایک نہایت مفید و عالمانہ مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ لکھنؤ  
ناروی ایم لعلی ایچ ڈی کا مضمون ہم کیا ہوئے: ایک مختصر۔ اور  
کارآمد مضمون ہے۔ اسی طرح جناب حبیب احمد مدنی نے بہار فی بطن  
اور بہنوں کا سودائے خام پر اپنے خیالات کا اظہار کر کے پبلک کی  
راہبری کی ہے۔ جناب سید مرتضیٰ صاحب قادری کا مضمون اردو ناپ  
بھی نادری نقد و نظر بہت مفید مقالہ ہے۔ ملک کے مشہور شاعر  
پروفیسر و گوتی سہلے راق کا مضمون اردو کی عشقیہ شاعری بہت  
کامیاب اور قابل تحسین تحقیق ہے۔ اشتراکیت پر جناب ڈاکٹر محمد اشرف  
جناب منظر نقوی اور جناب محمد اشم قدوائی کے مضامین جامعیت کے  
لحاظ سے بہت کامیاب کرشمات ہیں۔ حسن نظم بھی بہت بلند ہے۔ جانا  
ماہر اتحادی حضرت اعجاز مدنی جناب شری محبوب پالی حضرت میکش  
اکبر آبادی کی تعلیم بہت و قدیم ہیں۔ جو بی خبر میں ۲۰ کے قریب نوٹوں

ویٹے گئے ہیں مختصر یہ کہ مدینہ کا جو بی خبر ادب میں ایک مفید  
اہم اضافہ ہے۔ ہم ادارہ ادب لطیف اورق وین ادب لطیف کی طرف  
سے ادارہ مدینہ کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ (۱۰ م ۱۱)  
**محبت کا افسانہ**۔ مصنفہ لطیف الدین احمد کتابت و طباعت  
و ڈیزائن و زیب صفحات ۲۵۴ قیمت دو روپے کتاب جلد ہے اٹھ  
کا پتہ: عظیم الحسن صاحب محلہ خوشنوس گرو۔

جو حضرات اردو ادب سے زندہ بحر بھی مس رکھتے ہیں وہ یقیناً  
حضرت لطیف الدین احمد کی ادیبانہ عظمت کے معترف ہونگے آپ ملک  
کے چوٹی کے ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ زیر نظر آپ کا ایک نہایت  
دلچسپ و دلآویز ناول ہے جس میں فاضل ناول نگار نے اردو ادبی زندگی  
کے ہر رخ اور ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے کتاب کا ماحصل یہ ہے۔ اس  
مسیح کے بعد ہم دونوں نے کیا سیکھا؟ ہم نے یہ سیکھا کہ اردو ادب کیا  
نہیں ہے۔ اردو ادب کسی مذہبی معاشری قانون یا رسم و رواج کی غلامی  
کا نام نہیں خطبہ کجارج احمد شتروں کے دوہرانے کا نام نہیں کسی عقیدہ کو  
باقید و پابندی کا نام نہیں بلکہ وہ ایسی حالت کا نام ہے جس میں تغیر  
ہوتا ہے جس میں تبدیلی ہے جس میں حرکت عمل ہے اور جس کے اندر  
دو تضاد باہر گرد و خم ہو جاتے اور ایک نجات ہے۔

اردو ادبی زندگی کی کشتی کو نیراہن طغیانوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اس کے  
ساتھ ہی کئی جہاز جھلٹے آتے ہیں گدھاپن کئی رکاوٹیں مائل کر دیتا ہے مگر  
یہ کشتی نہ جھکتی ہے نہ ڈوبتی ہے بلکہ اسی سکون سے ہی چلی جاتی ہے۔  
ناول نگار کی بلند فنی تخیل و رنگینی نگارش ماحفظ راہیں۔

آفتاب کے اپنی آرام گاہ میں جانے کے جذبے سے کائنات  
و حرکت ہوتی محسوس ہوتی تھی خواجہ خورشید کے سرخ رنگ پر وہ  
طلائی ستونوں پر لگے تھکاتے تھے۔ گچھلا ہوا سونا جسکی قمر قرابٹ چمک  
رہی تھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان پہاڑی چوٹیوں کے اس طرف

اعلیٰ مصنف ۱۹۲۲ء حریت ایک روپیہ - ملنے کا پتہ۔ منیر صاحب نظامیہ  
کڑوا، بنیالہ پنجاب

گداگری ایک لعنت ہے جو ہندوستان پر مسلط ہے۔ اس لعنت  
نے ہمارے ملک کو ہر طرح تباہ کیا ہے، اس کا اندازہ وہی شخص لگا  
سکتا ہے جو ملک موجودہ اقتصادی و سیاسی حالات سے آگاہ ہو۔  
یہ ہے کہ جہاں ہماری بسق و تنزل کے کئی اسباب ہیں وہاں گداگری  
نے بھی ہندوستان کو پست کر دیا ہے۔ گداگری نہ صرف ملک کے اقتصاد  
حالات پر ایک نہایت زہر پلائے ہوئی ہے بلکہ یہ لعنت افراد قوم کے  
ذہن کو بھی بالکل پست کر دیتی ہے۔ اور اس کے بچے میں پھنس کر انسان  
ذہنی طور پر بالکل مردہ ہو جاتا ہے۔ گداگری ایک مہلکی مہلکی لعنت ہے ایک  
چھینی چھاتی بھتی ہے اور ایک حرکت کرتی ہوئی بے غیرتی ہے۔ موجودہ  
دنیا کے ترقی یافتہ ممالک پر نظر ڈالئے، آپ کو اول تو وہاں گداگری  
نہیں آئیں گے اللہ نہیں گئے بھی تو بہت ہی کم، مگر اس ہندوستان -  
اس غلام آباد - اور اس لعنت کو تنزل میں تو پہنچے ہیں گداگری  
کے دل کے دل کھڑے بد نصیب ہندوستان کی انتہائی بد نصیبی کا مطالعہ  
کر رہے ہیں: اس میں کوئی شک نہیں کہ گداگری کا مرکز غیر ملکی تسلط  
اور اقتصادی بد حالی ہے۔ مگر یہ حقیقت بھی جھٹلاتی نہیں جاسکتی کہ جتان  
کے بیشتر گداگر محض فاقہ خالی رسم کے مطابق گداگری کو مقصد حاصل بنائے  
ہوئے ہیں: اس وقت گداگری کو دور کرنے کی سب سے فوری تدبیر، کاش  
ہمارے رہنما یاں ملک اس طرف توجہ فرمائیں۔

ہم جناب وجودی صاحب کے ممنون احسان ہیں کہ انہوں نے اسلام  
مسلک پر ایک نہایت جامع و مکمل کتاب لکھی، کتاب ایک سو دس صفحات  
مختلف پر مشتمل ہے۔ اور ہر عنوان نہایت اہم ہے۔ وجودی صاحب نے  
دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب کے اسناد و گداگری کے متعلق احکام  
نکد کر کے ثابت کیا ہے کہ گداگری ہر مذہب میں منع و ذلیل بھی جاتی  
ہے۔ آپ نے گداگری کی مختلف دھڑکیاں بھی دور کی ہیں اور  
ہر قسم کے گداگری کی ذہنی کیفیت بھی ہے: ہر شخص کو اس کتاب کا مطالعہ  
کرنا چاہیے۔

نور کا ایک نوارہ اچل اچل کر بچے حوض میں گر رہا ہے، اور وہ حوض  
بہر زہر ہو کر چھلکا چاہتا ہے۔

ساری کائنات خوشی اور شجیت کی ہنسی بن گئی تھی، چرخ و دوران  
کو تزیین کر لیا، اسکی ہنسی تیز ہو گئی تھیں، اس کے خساروں میں بھی مسرت  
کی ایک جھلک جلو گر تھی؟

اس ناول میں اور اردو کے باقی تمام ناولوں میں ایک اور خاص  
نقطہ بھی ہے۔ اس ناول میں یا تو ہیر دی زبان سے واقعات و ہرے  
گئے ہیں یا ہیر دی زبان سے اور یا ہیر سے کسی اور شخص کی زبان  
سے اور ظاہر ہے یہ ناول نویں کا نیا طریقہ ہے۔ ۱-۴

رہیلہ پوٹورائے -۔ منصف جناب فضل حق قریشی دہلوی کتاب  
و طباعت نہایت اعلیٰ، صفحات ۹۷ قیمت چھ - ملنے کا پتہ عزیز کینو  
تروں باغ دہلی۔

رہیلہ پوٹورائے اردو کے جلیل القدر افسانہ نویس و نثر نگار جن کا  
فضل حق قریشی کے ان ڈراموں کا مجموعہ ہے جو دہلی یا دیگر ریڈیو سٹیشنوں  
سے بڑا کاسٹ ہو کر ہر جگہ مقبول ہو چکے ہیں، جناب فضل حق  
قریشی کو گونا گوں جذبات کی عکاسی میں مہارت تامہ حاصل ہے اور  
یہی وجہ ہے کہ ان کے قلم سے جو چیز نکلتی ہے وہ جذبات نگاری کے  
لغات سے خاص چیز ہوتی ہے۔ ان ڈراموں میں بھی یہ خصوصیت بد جاہل  
پائی جاتی ہے۔ مجموعے میں کل بارہ ڈرامے ہیں، اور ہر ایک اپنے موضوع  
کے لحاظ سے کامیاب ہے۔ اس میں طنزیہ اور مزاحیہ ڈراموں کے ساتھ  
ساقی حزن و غم کے بھی ہیں۔ اللہ ہر ایک دل و دماغ پر لطیف اثرات  
طاری کرتا ہے

مجموعے کے آغاز میں اردو کے مقبول ترین مزاح نگار جناب شیخ جعفر  
کا چٹا بھی شامل ہے جو جذبات خود نہایت دلچسپ چیز ہے۔

اس مجموعے کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ زیر نظر کتاب  
تیسرا ایڈیشن ہے۔ ۱-۴

اسناد و گداگری -۔ منصف جناب وجودی کتاب و طباعت نہایت

میرزا شاعر۔ مصنف پر غیر عشرت و عمانی ایمر اسے کتاب و طباعت  
عزیز اور صلوات، ۲ نمیت حر۔ خط کا تہ جدید بکراؤ پوزیشن گستان  
دراگھ ولی۔

یہ ایک مسلح حقیقت ہے کہ جب کسی قوم پر بلا بد و منزل کی طعون  
گھنائیں چھا جاتی ہیں، تو اس قوم کے افراد زندگی کے حقیقی مقاصد سے  
اس طرح دور ہو جاتے ہیں گویا انہیں ان مقاصد سے کوئی تعلق ہی نہیں  
نہ صوت یہ بلکہ ان حقیقی مقاصد حیات سے یکسر علیحدہ ہو کر ان پسند و نفور  
مشاغل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جو ایک طرف تو زندگی کی رہی  
سہی صلاحیتوں کو تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں اور دوسری طرف زندگی کے  
حقائق سے آگاہ ہونے کا بھی موقعہ نہیں دیتے۔ علامہ اقبال نے چرچ کیا

آنحضورؐ تباؤں میں تقدیر ام کیا ہے۔  
شمسِ سننِ اول، طلوعِ دربابِ آخر،

چنانچہ اس صورت حال میں بد نصیب قوم کے بد نصیب افراد و سنی مفوی کی تحریروں کو مضبوط سے مضبوط کرتے چلے جاتے ہیں۔ قارئین کرام! نیچرل صدی کے و بچہ اول کے ہندوستانی رڈسا کی عیا شانہ زندگی سے یقیناً آشنا ہونگے۔ ان کی عیاشیوں نے قوم کی ذہنی تحریب میں جو مصداق ہے وہ جس عالم افکار ہے۔ زیر نظر اسے یہی پروغیر عرشرت رسانی نے اسی قسم کے ایک خوش دل مگر مست و ماخ و رئیس کی عیا شانہ مصروفیات کا بنیاد کا عیانی کے ساتھ خاک کی گھنچا ہے۔ گویا کتاب کے ہیرو میر صاحب لکھنؤی نرناکت و لطافت کا ایک چمکا پھرتا نمونہ ہے جسے زندگی کے معانی سے تعلق کوئی تعلق نہیں، جو ملک کے موجودہ سیاسی و اقتصادی حالات سے بالکل نادر احد ہے۔ اور جو صورت نرناکت آب مصروفیتوں کی کو اپنی دنیا سمجھتا ہے۔ بلکہ سمجھنے پر مجبور ہے..... ملک کے موجودہ سیاسی حالات کے ابھی بچے میں اسی طرح غلام قوم کی اپنی مصداقیوں کو تیار و براد کیا جاتا ہے!

میر صاحب قبلہ داغ دہری کی بانہری شاعری کے عاشق ہیں اور اس قسم کی شاعری ہی کو شاعری کا نکل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ عجیب و غریب تراکٹوں سے کام لیکر شاعرے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ ان کے ہم ہمیں

بھی انہیں کی طرح نزاکت پسندوں کے گالک ہیں، مشاعرہ ہوتا ہے اور  
اسی لکھنوی آن ان کے ساتھ ہوتا ہے شعر کی حرکات و سکنات جیسا  
فسفکاء، غمزہ جی، وہاں عبرت انگیز بھی — آخر عجیب، اعجازی مشاعرہ  
فخم ہوتا ہے۔

محترم پروفیسر صاحب نے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنا فرض پورا کیا ہے اور ان کے لیے ہی انسان لکھنوی نرنگتوں سے جبر ہو جاتا ہے۔ یہ دوسرا آل انڈیا ریویو پلی سے براڈ کاسٹ ہو کر ہندوستان کے گوشے گوشے میں مقبول ہو چکا ہے۔ قارئین ضرور مطالعہ فرمائیں! (۱۰۰)

کالیڈاس اور دوبا۔ مضافہ جوش صاحب، بنالوی ضلع،  
کتاہت و طاعت، علی گڑھ، کتاب محلہ، بیعت، ۸۷، ملے کا پتہ۔ دوبا  
پیشنگ اوس، بنالوی ضلع۔

یہ ایک نازک ہے جس میں کا لید اس کی زندگی کو رمانی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ سب سے پہلا اضافہ تو کتاب پر یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی زبان نہایت ادبی اور منسکرت آمیز نہ ہوتی ہے۔ جسے وہ کہنا حقیقت کو چھلانا ہے اس میں شک نہیں کہ کا لید اس منسکرت زبان کا ڈراما نویس تھا اور یہ نازک اس جہد سے تعلق رکھتا ہے۔ جب کہ ملک کی زبان منسکرت تھی، محاس سے یہ کہیں لازم آتا ہے کہ اب کے اس جہد کے متعلق جو کچھ لکھا جائے۔ وہ منسکرت ہی کی قسم کی کسی زبان میں ہو۔ شروع میں جناب مولانا قار کا دیا چاہے۔ جس میں وہ فرماتے ہیں کہ اسکی زبان نہایت صاف ستھری اور رواں ہے اور شستگی زبان کے اعتبار سے انہوں نے نہایت لطافت اور سادگی پیدا کر دی ہے۔ نہ معلوم قار صاحب زبان کی معافی شستگی اور روانی سے کیا مراد لیتے ہیں اور شستگی زبان کے اعتبار سے لطافت و سادگی ان کے ذہن میں کیا حقیقت کہتی ہے، بہر حال یہ حقیقت ہے کہ قار صاحب نے قمر وارانہ دیا چاہ نہیں لکھا۔ دیا چاہ میں جا بجا انہوں نے لفظ ڈرامائی لکھا ہے، شاید ڈرامائی سے انکی مراد رمانی ہے ؟

شہید مکینونی اور نوجوان نوجوانوں کی کاپی صاحب کتابت و طباعت

خوشگوار، قیمت ۱۰ روپے کا پتہ اور ایک مثال ادب سے مراد  
آئرلینڈ کے زندہ جاوید محب وطن ٹرنس میکوننی کے حالات نگار  
کا یہ مجموعہ ہندوستان کے موجودہ دور ابتکار و کشش میں خاص طور پر مفید  
ہے۔ ان کتاب کے مولف جناب پنڈت اندھ دی پٹیل صاحب کی  
کوشش سے جیسے ادب میں ایک ایسی کتاب کا اضافہ ہو گیا ہے جو  
ہندوستان کے تنگ و تاریک سیاسی راہوں میں رہنمائی کی روشنی  
ڈال سکتی ہے اور جس کے مطالعے سے غلام باشندے کئی اہم سبق حاصل  
کر سکتے ہیں۔ سب سے بڑا سبق جو اس کتاب سے حاصل ہوتا ہے وہ یہ  
ہے کہ جس آنا دوی اور استحصال وطن کی رو میں ہر قسم کی قربانی اور بطرح  
کے پیشانے لئے آواز دہنا چاہیے! جب تک ہم اس راہ میں نبی جان  
تک قربان کرنے پر تیار نہ ہوں آواز دہی کا حاصل ہونا ایک خواب کی شیا  
سے زیادہ حقیقت نہیں رہتا!

کتاب کو کہیں اہم باب سچ منل کیا گیا ہے۔ اور باب میں  
آئرلینڈ کے اس لعل اعظم کی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو پیش کیا گیا ہے۔  
کتاب کا انداز بیان دلچسپ ہے زبان بہت سلیس اور عام فہم ہے ۱۱۴

جیا - سالگرہ نمبر - زیر ادارت محترم کینز فاطمہ جیا کتاب طباعت  
نہایت اعلیٰ قیمت ۱۰ روپے کا پتہ دفتر رسالہ جیا لکھنؤ۔

جیا ایک نسوانی رسالہ ہے جو ملک کی مشہور ادیبہ محترمہ کینز فاطمہ  
جیا کی زیر ادارت نہایت کامیابی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے جو رسالہ  
محترمہ جیا جی جلیل القدر شاعرہ کی ادارت میں شائع ہو رہا ہو اس کی  
کامیابی و ترقی کے متعلق کوئی کہنا تکمیل حاصل ہے! محترمہ جیا صاحبہ پرچہ  
کو ترتیب دینے میں بہت صاف متواضع و کمٹی ہیں۔ اور جیا کا ہر پرچہ  
پہلے پرچے سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ زیر نظر جیا کا سالگرہ نمبر ہے جس  
کے متعلق یہی کہہ دینا کافی ہے

زمرہ پانچم ہر کجا کہ می نگرم!

کرشمہ دامن دل کی کشمکش جانناست

ہر مضمون و نظم و نثر دلآویز ہے۔ رسالے میں تصاویر بھی ہیں۔ ہر حال  
جیا کا سالگرہ نہایت کامیاب نمبر ہے! (۱۰۴)

ہل - زیر ادارت شری ناتھ سنگھ کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ  
سلامت چندہ لکھنؤ پرچہ ۱۰ روپے کا پتہ۔ انڈین پریس لیمٹڈ لاہور،  
ہندوستان ایک ذرا حق ملک ہے۔ جہاں تریا پاجی فی صدی  
آبادی کو کتنی بڑی کر کے ہی گزرا ان اوقات کرتی ہے جب یہ حالت  
ہے تو لازماً ہمارے راہنماؤں کو دیہات مسدود کی طرف سب سے  
زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ کیونکہ جب تک کسانوں کی حالت درست نہیں  
ہوگی ہندوستان کی بستی میں قطعاً کوئی فرق نہیں آئے گا چنانچہ اس  
مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے انڈین پریس لیمٹڈ لاہور کے کارکنان محترم  
نے ایک مفید رسالہ شائع کرنا شروع کیا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے ظاہر  
ہے۔ تہی یکسر ذرا حق ملک ہے۔ جس میں شروع سے لیکر آخر تک  
زراعت سے متعلق ہی مضامین دیئے جاتے ہیں۔ اس وقت ہمارے  
پیش نظر ان کا فردی نمبر ہے جس میں متعدد نہایت کارآمد و اعلیٰ  
مضامین دیئے گئے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر کے اس داس کا مضمون: دیہاتی کنوین  
اور زندگی سے ان کی حفاظت: عہد اعلیٰ عباسی کا مقابلہ جانوروں کی پرورش  
اور ترقی دیہات: ڈاکٹر اگر حسین کا مقالہ نئی تعلیم، نئی زندگی  
ٹائٹل پیج پر ایک رنگین تصویر ہے، اس کے ساتھ ایک سورتھن  
تصویر بھی رسالے کے آغاز میں ہے۔ قریباً قریب ہر مضمون کو مصور کیا  
گیا ہے جس سے رسالے کی افادیت میں خاص اضافہ ہو گیا ہے۔  
ہر حال کارکنان انڈین پریس یہ رسالہ شائع کر کے ملک کی ایک  
اہم خدمت انجام دے رہے ہیں۔ (۱۰۴)

عزرا کے خطوط، مضمون اے ایچ آغا کتابت و طباعت خوشگوار قریب  
آٹھ روپے کا پتہ نیشنل بک ڈپو اینڈ بک کیشنل پبلشرز لاہور۔

اس کتاب کے مصنف جناب فاضل شری ایک ذہین و جوان ہیں۔ یہ کتاب  
آپ کے ہر پرچہ کے تجربات زندگی کا ماحول ہے کتاب اکیلا لاری محرماس  
اور خوشگوار کے ان ہر پرچہ خط و کتابت کا مجموعہ ہے جو وہ اتنا فرما اپنے دوستوں  
میں بھیجے! معلوم ہوتا ہے ان کے ہر پرچہ میں ایک زخم صیب خورشید کے آنسو  
مجلد ہے بچ لکھنؤ کی پہلی کشش ہے اسلئے ہیں انہی ہمت افزائی  
کرتی چاہیے موجودہ کشش سے اندازہ لگایا جاسکتا ہو کہ آغا صاحب کمر  
مشق جلدی رکھیں وہ مستقبل میں صد کے ایک نایاب ناولیاب ثابت ہونے شروع

•

•

•

•

•

•

•

مکتبہ اردو سبکی ہر غیر مطبوعات

نامی لائق کدہ کے لئے جو زمین تیار کی گئی ہے۔ یہ زمینیں بھی  
 کے لئے ہیں۔ ان کے لئے زمینیں تیار کی گئی ہیں۔

تلفہ نہ کیا اس کرتی خند کے نوروں کا جو مہنہ ہائے فلسفہ : نہ اند کی بند  
نور میں نہ جانتا : نہ کہ اس کا حال تہ موجود و محانت چھڑ گئی نہ نہ جی میں اور نہ  
محنت نہ مانتا نہ توں جی کرتی چند ایک است مجھ کو پہنچا ۔

مجلس اول

[illegible][illegible][illegible]

بانی بچوں - بدست حسن و - - - - -  
 - - - - -  
 - - - - -

میں نے اس وقت تک اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی کہ وہ ایک ایسی ہیروئن ہے جس نے اپنے ملک کی آزادی کے لیے اپنی جان قربان کر دی۔

نقصان در مریط و بی - تعادل غلیظ شدن مریط و آب از سطح او و نمک  
 ۱۹ - - - - - مریط و آب و نمک  
 مریط و آب و نمک

۱۔ تالیفات ماری علیہ السلام

عمر الخیر ذی القدر : میں نے اپنے دوستوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ اگر آپ کو کوئی کام ہے تو اسے جلد ہی کر لیں ، کیونکہ آپ کو پتہ نہیں ہے کہ کب آپ کا وقت ختم ہو جائے گا ۔

نچے کی چھوٹی دھوپ کے نیچے ان اداؤں کا احاطہ کبھی نہ ہو سکا۔

شہنشاہ ہونے سے پہلے ہی میں نے کہا تھا کہ میں نے اپنے لئے کوئی تختہ نہیں بنایا ہے۔ میں نے تو صرف ایک تختہ بنایا ہے۔

مکتبہ - اجناس حاصل کرنے والی کتاب دوسرے پیش روئی نہیں ہی شامل ہیں۔

عورتوں کے افسانے

پیشاب خاص طور پر بڑھ کر اس کے لئے بھی گئی ہے۔ اس وقت باطن ہماری مشرتہ معدن کی حالت میں طبیعت خوب تر ہو گیا اور اس کا اثر فوہول کر کے دھو رہے تھے۔

پھول اور پتے  
میں اور تمہیں بھی ہے ایک ہی میں وہی شے ہے۔  
گوشت میں بھی ہے۔

تفہیم فہرستِ طلبِ مسرہائیں

۴۰۰ فیبریت است طلب و سیرایش



عالمی ادبی و تحقیقی مائزہ

# مصطفیٰ طیف لاہور

ایڈیٹر

پروفیسر برکت علی بی

نئی پلاچہ ۱۵/-

خالد چندا 3,8/-

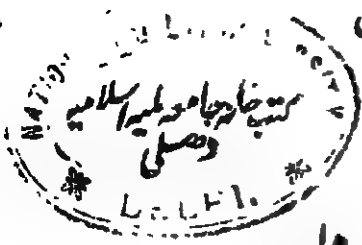
دارالاشاعت

منزلہ اردو ۱۵ سرکار روڈ لاہور



منظور کردہ محکمہ تقسیم پنجاب، سو پسر مستحقانہ آبادکن

مکتبہ اردو لاہور کا



کثیر الاشاعت و ارزانی ترین ماہنامہ

# ادب رسالہ لطف لاہور

جولائی ۱۹۳۹ء

ادارہ تحریک

چودھری برکت علی بی، اے

میرزا ادیب بی، اے

مقام اشاعت

مکتبہ اردو لاہور

چند کتب و رسائل  
مکتبہ اردو لاہور

کتبہ ممتاز القلم حاضری گنیش لاہور

چند کتب و رسائل  
مکتبہ اردو لاہور

اسماء نمبر وڈا ما نمبرین میں  
آٹھ آنہ علاوہ محصول تک

ممالک غیر سے  
شلت

فہرس

| نمبر شمار | صاحب مضمون                                       | مضمون                              | نمبر شمار |
|-----------|--------------------------------------------------|------------------------------------|-----------|
| ۱         | ۱۰۱                                              | اشارات                             | ۳         |
| ۲         | جناب سید اشرف صاحب کاظمی                         | وہ                                 | ۴         |
| ۳         | جناب مولانا محمود صاحب اسراہیلی                  | تظہیر برغزل مرزا سید اللہ خاں غائب | ۵         |
| ۴         | میرزا ادیب                                       | وہ سات مجرم                        | ۶         |
| ۵         | جناب محمد اشرف صاحب عفا                          | محلات اور جھوپڑیاں                 | ۸         |
| ۶         | جناب سید راحت صاحب مولائی بی۔ اے ایل بی بیلیک    | کیرجی کا تفسیر                     | ۹         |
| ۷         | جناب سید موسیٰ صاحب کفیم                         | جنون                               | ۱۵        |
| ۸         | جناب پروفسر رفیق صاحب گورکھپوری ایم۔ اے          | خود فراموشیاں                      | ۲۰        |
| ۹         | جناب علی احمد صاحب                               | پریم پیاسی                         | ۲۱        |
| ۱۰        | جناب سید مقبول حسین صاحب احمد پوری۔ ایل۔ ایل۔ بی | شکوہ حبش                           | ۲۹        |
| ۱۱        | جناب پروفسر کھیلال صاحب کپور۔ ایم۔ اے            | علامہ ظہور                         | ۳۰        |
| ۱۲        | جناب امین خریس صاحب سیانکونی                     | منزل شوق                           | ۳۲        |
| ۱۳        | جناب طاہر نظام ناصر خاں ایم۔ اے                  | انتقام                             | ۳۲        |
| ۱۴        | جناب شاطح عجمی                                   | نوجوان کسان                        | ۳۴        |
| ۱۵        | جناب سراج الدین قنبر بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی         | لالہ دگل                           | ۴۵        |
| ۱۶        | جناب پروفسر عشرت رحمانی ایم۔ اے                  | طوفان حیات                         | ۴۶        |
| ۱۷        | جناب مجید صاحب لاہوری                            | کادہ بار شوق                       | ۵۱        |
| ۱۸        | جناب راجندر سنگھ صاحب بیدی                       | دس سنٹ بارش میں                    | ۵۲        |
| ۱۹        | جناب اثر الحق بی۔ اے                             | عروں کا جگی ترانہ                  | ۵۶        |
| ۲۰        | جناب احمد ندیم صاحب قاسمی بی۔ اے                 | پہلا تجربہ                         | ۵۷        |
| ۲۱        | جناب سناز صاحب رضوی                              | ات دوست                            | ۶۱        |
| ۲۲        | جناب احمد ندیم صاحب قاسمی بی۔ اے                 | مردہ انقلاب                        | ۶۲        |
| ۲۳        | ۱۰۱                                              | نقد و نظر                          | ۶۳        |

۴۷۔ حمزہ برکت علی لہ۔ اسے پڑھنا، پیشتر اپنے پڑھنے پر اچانک کوہِ شوخی کیلئے برنگِ بکسِ وطنِ ہند گم ہونے سے حیران کر دیا تو اب لطفِ سرِ کارِ روضہ شمس نے شائع کیا۔

# اشارات

میں اور میرے دوست آپجی سکیم کی بڑے ذور کے ساتھ تائید کرتے ہیں۔ پہلی قطعہ بھی راجوں، میرے جیسے کی کتابیں بھیجیں شاید آپ یہ نہیں کہہ سکیں کہ قیمت تو کیا روپے ہے یہ تو پہلی پانچ روپے میں آتی کتابیں بھیجیں یہی محسوس کر کے میں نفع دے بیچ رہا ہوں۔ آپ بیک نصف سٹم بھیجیں۔

کبا انبال صاحب پیلے یہاں نہیں آئیں گے یہاں انشیرکائی کا بیانی ہوگی؟

نظم حسین

اس خط آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ ادبی سٹ کی سکیم کئی کشش اپنے اندر رکھتی ہے مگر ہم اس امر کا اظہار کرنے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہماری اردو ہی فطرتی دلکش آسان اور موثر زبان ہے اگرچہ اس کی طرف ذرہ بھر کی توجہ کرے وہ اسکی شیرینیوں سے محظوظ ہونے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آپ ملک میں اردو کی مٹی لغت کے مظاہرے دیکھ رہے ہیں اس کا مطلب لازماً یہ ہے کہ بعض حضرات محض مہاسجایا نہ ذہنیت کے تحت یہ روش اختیار کر چکے ہیں جو وہی تعصب ہی نہیں ایسے قابل اعتراض اخلو کش رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ نہ صرف صوبوی تعصب بلکہ مذہبی تعصب بھی برسر کار ہے۔ ہمارے محترم دوست غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے جو قرآنی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے درحقیقت یہ غبیہ جھوٹ ہے اور حقیقت سے پرے درجے کا انماض اگر وہ حقیقت کو آشنا ہو جائیں تو آج ہی لسانی تعصب ان کے دلوں سے دور ہو جائے اور اسی تعصب کو دور کرنے کے لئے اردو کے جہان مخلص پیہم و مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔ خدا کرے انکی کوشش جو وطن کے لئے بیدار مفید ہے۔ کامیاب ہو جائے !!

ادب لطیف کا عظیم المنظر افسانہ نمبر ۱۰ ادب لطیف کے، خاندان نمبر ۱۰ قدر مقبول ہو چکے ہیں، اگر آپ کے افسانہ نمبر کی بجائے ڈراما نمبر شائع ہوا تو لوگوں نے افسانہ نمبر کی اشاعت پر بھی زور دینا شروع کر دیا ہر روز دھمک سے متعدد خطوط ایسے موصول ہوتے ہیں جن میں افسانہ نمبر کی اشاعت پر خاص اصرار کیا جوتا ہے۔ چنانچہ اپنے قارئین کے پیہم اصرار کے پیش نظر ادارہ ادب لطیف نے اپنی کوششیں افسانہ نمبر

اولی سٹ - قارئین نے ڈراما نمبر میں ادبی سٹ کی سکیم کے متعلق پڑھا ہوگا جون کے شروع میں بھی اسکی تفصیل درج ہے، اور یہی توقع تھی ہماری سکیم کو بڑی مستحضر کے ساتھ پڑھا لیا ہے ملک کے طول و عرض سے اس سکیم کی تائید میں خطوط بھیج رہے ہیں۔ ان خطوط میں ہمارے بھائی بھائیوں نے سکیم کو بیکسیر بنانے کی طرف توجہ کی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس مفید سکیم کو ہندوستان کے ہر گوشے میں پھیلا یا جائے۔ ظاہر ہے یہ چیزیں دلی توجہات سے علیحدہ نہیں۔ ہماری انتہائی خواہش ہے کہ ایسے وجود کو اردو ادب کے لئے زیادہ سے زیادہ کار آمد بنائیں اور اس کے لئے ہمارے دائرہ عمل کو اتنا وسیع ہونا چاہیے کہ ملک بھر کو اس سے متاثر ہو سکے یہ تہمت ہمارے مہربانوں کے تائیدی خطوط کا اصل نگرش زیادہ مسرت ہیں یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ بعض خطوط ایسے علاقوں سے موصول ہوتے ہیں جہاں اردو کے جاننے والے تھے کم ہیں کہ ہاں اردو کی اہمیت ایک بے معنی چیز ہے۔ ان حضرات نے لکھا ہے کہ ایسی مفید سکیم کو ہمارے دور افتادہ علاقوں سے شروع نہ جائے بعض نے تو سکیم کا مطالعہ کرتے ہی ممبری کی درخواست کے ساتھ پہلی قطعہ بھیج دی ہے ایسی چیزیں اس حقیقت و صداقت پر شاہد ہے کہ ہماری سکیم جہاں گہرائید کی مستحق ہے اور دوسرے اردو کو کو تینی مقبولیت حاصل ہے کہ ایسے علاقوں میں بھی جہاں اردو بظاہر لغت و لسانی شیت رکھتی ہے۔ اردو کی سچی تڑپ رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ ذیل میں پیہم ایک عجب اردو جو فاندیس کے رہنے والے ہیں کے خدا کا نقشب میں پیش کرتے ہیں اور

مخبری!

میں ایک ایسے علاقے میں رہتا ہوں جہاں اردو کو جاننے والے بہت کم ہیں مگر میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ اردو کی خدمت کی کیڑا۔ دو بڑی مٹی اور آسان زبان ہے جب میرے یا میرے کسی دوست کے سامنے اردو کی کوئی اچھی سی کتاب بتائی ہے تو جہم خوش ہوتے ہیں۔ لیکن۔ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ جب بھی ہم بڑے شوق سے کسی کتاب کا اشتہار دے کر کتاب ملگواتے ہیں اور کتاب بڑی دایات ثابت ہوتی ہے۔

کی تعمیر پر نگاہی ہیں۔ ہمارا یہ حکیم انظیر افسانہ نمبر اپنے جرمودی محاسن کو لئے ہوئے اپنی تمام معنوی حقوق میاں کے ساتھ ستمبر کے پہلے پہنچے ہیں شائع ہو کر تارین کی خدمت میں پہنچ جائے گا۔ آئندہ نمبر میں جو افسانہ نمبر کے چند مندرجات کے متعلق کچھ لکھیں گے

**مکتبہ اردو کی علمی سرگرمیاں**۔ مکتبہ اردو کے کارکن ادبی سٹم کی حکیم کو بر جگہ کامیاب بنانے میں مصروف ہیں اور حکیم کا سب سے اہم حصہ یہ ہے۔ درقرینہ ہر ماہ ایک کتاب شائع کی جائے اس سے نئی کتابوں کی اشاعت میں خاص سرگرمی کا اظہار کیا جا رہا ہے اور ادارہ ادب لطیف افسانہ نمبر کو کامیاب ترین بنانے میں منہمک۔ قارئین شغرتے کہ مصداق اور کے خطوط جلد سے جلد ان تک پہنچ جائیں اور اب سہرت کے ساتھ ہم اعلان کرتے ہیں۔ خطوط شائع ہونے ہیں انکے ایشیا کی کثرت پر کتاب کا انٹیل پچ عا۔ نظریات میں رتین اور وکادیر انٹیل پچ کے علاوہ کتاب میں متعدد تصویریں بھی ہیں۔

**ایک ہنگامہ خیر اعلان**۔ مکتبہ اردو کی طرف سے

مغربی دنیا کی نادر ادبیہ مسز پریل بک کی شہرہ آفاق تصنیف

مسز پریل بک کی تصانیف نے دنیا سے ادبیات میں ایک نیا پیرا کرہ پایا ہے۔ اور اسکی دماغی کاوشیں دنیا کی کئی زبانوں میں منتقل ہو چکی ہیں۔ قومی گذارۃ اس نامور ادیب کا وہ عمدہ جادو کا زمانہ ہے جس پر موصوفہ کو نوبل پرائز ملا ہے۔ اس ناول میں چینی زندگی کو اس کامیابی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ آپ ایک لمحے کے لئے بھی یہ یقین نہیں کریں گے کہ یہ کسی غیر چینی دماغ کی کاوش ہو سکتا ہے اس ناول کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ یہ نہ صرف دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ بلکہ اسے فلمایا بھی جا چکا ہے ترجمہ اردو کے جلیل القدر انشا پرداز حضرت احسان فیضی نے کامرہوں منت ہے۔ احسان صاحب کو اصل غوریاں ہر قرار رکھے میں یہ طرے حاصل ہے اور آپ کے ترجمے رسالوں میں شائع ہو کر بے حد مقبول ہو چکے ہیں۔ یہ ترجمہ انہوں نے بڑی محنت سے کیا ہے

نوشہ در ذرورتہ

”۵۹“

مترجمہ سید اشرف کاشمی

وہ انسانی قدموں سے نا آشنا راستوں پر رجتی ہے۔

ڈو کے رداں چٹوں کے قریب  
حصین دوشیزہ جس کے حسن کی رعنائیوں کو سہا ہے والا تو کوئی تھا ہی نہیں۔  
اور بار کرتے والے بہت کم!

بچنے کا حسین پھول . . . . . کاٹی سے ٹکے ہوئے پتھر کے پاس . . . . . ہنگاموں سے نیم نہیں  
اس ستارے کی طرح حسن جو آسمان کی دستوں پر تنہا عینا بار ہوا  
اس نے گناہی میں ہی زندگی کی گھڑیاں ختم کر دیں۔  
اور جب بے رحم موت نے اسے اپنے تاریک آئینے میں چھپا لیا۔  
تو کوئی جان بھی نہ سکا۔

لیکن اب جبکہ وہ قبر کی سکوت آفریں تنہائیوں میں ابدی خوابوں میں مہوش ہے  
تو میرے سینے میں درد کرب کی سیجان برپا کر دینے والی لہریں موجود ہیں  
مگ کہہ دو، اس درد کو، مگر کھاتے!

## نحو اسرائیل تشطیر بر غزل حضرت اسد اللہ خاں غالب

تشطیر اردو شاعری میں نئی چیز ہے۔ یہاں محسوس کا عام رواج ہے۔ جس میں شعر سے قبل تین مصرعوں کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ بحر تشطیر کو عرب میں بہت مقبولیت حاصل ہے۔ اس میں شاعر کے پہلے اور دوسرے مصرعوں کے درمیان دو مصرعے اس خوبی سے کہلاتے ہیں کہ ہر مصرعہ مکمل شعر بن کر قطع بند کا لطف پیدا کر دیتا ہے۔ گویا چار مصرعوں میں پہلا اور چوتھا مصرعہ اصل شعر کا ہوتا ہے اور دوسرے اور تیسرے مصرعوں کا اپنی طرف سے اضافہ کیا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل تشطیر میں حضرت غالبؒ کے مصرعوں پر نشان لگادیا گیا ہے۔

غم دنیا سے گرفت مست بھی پائی سر اٹھانے کی مجھے نہلت کہاں ہے دو گھڑی آرام پانے کی  
گھڑی بھر کو تجھے دل سے نبھایا بھی تو کیا ظالم فلک کو دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

پیشا پر نیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہے کہ اس میں پھر بھی کچھ قوت ہے حدت کو دبانے کی  
یہ ممکن ہے کہ کافذ شمع کا ناز بن جائے دے شکل ہے حکمت دل میں سوز غم چھپانے کی

انہیں منظور رائے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا ضرورت ورنہ ایسی تو نہ تھی کچھ باخ جانے کی  
ننگہ تھی کئے وہ سکراتے اپنی محفل سے !! آئے تھے سیر محل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

ہماری سادگی مٹی القعات ناز پر مرنا دل ناداں کو عادت ہے فریب حس کمانے کی  
یہی ایفائے وعدہ تھا تو اس وعدے کو کیا کیے تر آنا نہ تھا ظالم مگر تہبید جانے کی

لکھ کو ب حادث کا تحمل کر نہیں سکتی نہ پوچھو اس پہ اتنا دوس پڑی ہیں کیا زلمے کی  
اب اس نے آہ اپنا بار غم بھی اٹھ نہیں سکتا مری طاقت کہ مٹا من قہمی تلوں کے ناز اٹھانے کی

کہوں کیا خوبی او ضائع دنیا نے زماں غالب مری قسمت کی خوبی ہے شکایت کیا زماں کی  
کے مخلص تجھے یا محب با مصفا کیے !! بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی مٹی بارہا نیکی

### عاجی قلیق

کے افسانے

ملک کے شہر مزاج نگار عاجی قلیق کے بہترین مزاحیہ مضامین کا مجموعہ جس کے پڑھنے سے آپ کا دل کشت زعفران بن جائے گا۔

مکتبہ اردو - لاہور

### نغمہ حرم

ان سرمدی تھنوں کا مجموعہ ہے جو سحر طراز شاعر نے نسائی فطرت سے متاثر ہو کر اپنے ہیں ادب و دنیا سے ادب کی فضاؤں میں گونج رہے ہیں۔ نغمہ حرم کو آفتاب کی طرح جلوہ برقرار بنانے کے لئے پبلشر نے اعلیٰ قیمت میں ڈاکٹر ڈام آفر کی ہے۔

جلو ملاحظہ

میرزا ادیب

# ”وہ سات محرم“

صوفیوں کے خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ یہ اس سلسلے کی پہلی جلد ہے۔ فی الحال یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے لئے روک کر نیا سلسلہ شروع کیا جاتا ہے۔

اس نمبر میں اس کا آستانہ شائع ہو رہا ہے۔ پہلا نمبر باب جربیات خود مصداق اور دیکھ کے ہر خط کی مانند مکمل انسان ہو گا۔ انسان نمبر میں مکمل رہا ہے۔

وہ سات محرم بھی ہماری اور آپ کی طرف انسان ہیں۔ مگر ان کی دنیا ہماری دنیا سے مختلف ہے۔ ان کے جذبات مختلف ہیں ان کے افعال اور کردار مختلف ہیں، خالق نے انہیں انسان بنایا، مگر خالق کی پیدا کی ہوئی دنیا نے انہیں حیران بھیجا۔ اور مخلوق کا فیصلہ خالق کے فیصلے پر غالب آ گیا۔

(میرزا ادیب)

## ”منور محرم“

دیکھا — ہمیشہ کے لئے اس تاریک اور خوفناک قید خانے کو چھوڑنے ہوئے دیکھا، مگر وہ تنہا انسان سب کچھ دیکھنے کے باوجود، اپنی کی ہر سید سے ایوس ہونے کے باوجود جینے جا رہا تھا!

وہ بچتی ہوئی بڑیوں اور سیاہ جھریاں پڑے ہوئے گوشت کے بیچانک پردوں کا ذخا پن، خاد کے کسی گوشے میں اگا ہوا ایک اندرہ پودا تھا، جس پر کسی کسی ہوا کا کوئی جھونکا پہاڑ کے شکلات میں سے داخل ہو کر فیلوں کے لئے ایک لڑش سی پیدا کر دے۔ یا وہ دن رات کے چوڑے ٹھنڈوں میں چند بار کھانسی کر اور دو ایک ہار پیٹ کے بے رنگ کر زندگی کا ثبوت دیتا ہوا، نحیف و نزار مگر تیزی کے ساتھ جلتا ہوا ایک جہاز تھا، جس کا باوبان شعلوں کے آتشیں سانسوں سے ہر

کیا ایک دلنویس قیدی کے جسم میں ایک لڑش سی دور مٹی، چار سال کی طویل، حوصلہ فرسا اور حوس شکن مدت میں یہ چلا ہو قید خانہ اس کے کانوں میں اس قسم کی آواز قہر ترائی — ایک لے کے لئے قہر ترائی اور پھر ہوئی لبروں میں تحلیل ہو گئی۔

وہ اپنی کمزور کہنیوں کے بی ممبروں بند کر کے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا، کئی لمحے قید خانے کی سنگین دیواریں اور آہستہ آہستہ اس کی نگاہوں کے سامنے بچتی رہیں۔ آخر ایوس ہو کر اور آواز کو گھڑی قریب تکل جھج کر اس نے ہر مگر مٹی کے تختے پر رکھ دیا، مگر اس حالت میں بھی، کئی نگاہیں سامنے قید خانے کی دیوار پر گری ہوئی تھیں۔

آج سے چودہ سال پیشتر وہ ایک بہت بڑے جرم کی پاداش میں سببوں کی تلو ابدل کے سامنے تھے۔ یہاں — اس وحشت ناک مقام پر لایا گیا تھا۔ چند ماہ بعد وہ اور جرم جی اس اندھیرے غار میں دھمکنائیوں لگنے، مگر اس کے ساتھیوں نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ وہ چپ کے چھ ایک ایک کر کے اس اندھیرے غار سے نکل کر موت کی انتہا دار کھجوں میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئے، اس نے اپنے سامنے ہر ایک کو شکست سسک کر تڑپ تڑپ کر، اڑماں رگڑ رگڑ کر آخری سانس لیتے ہوئے

اس کے کان پر لمحہ ایک خاص آواز سننے کے لئے بے تاب تھے۔ اس کی آنکھیں ہر گھڑی ایک خاص سترو دیکھنے کی منتظر تھیں، اور اسی موقع کے انتظار میں وہ نحیف و نزار جسم موت کی ٹھوکر میں کھانچا کر سانس سے رہا تھا۔ اس کی ہر بے حیات کے تمام آثار ٹوٹ چکے تھے۔ مگر ابھی ایک تاریک صلیب تھا۔ یہ تاریک — یہ حقیر — بہت جلد ٹوٹ جائیگا اور



برہموت کے حملوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کا چراغ حیات کچھ چکا تھا۔  
 کئی ابھی اس چراغ حیات کا نہایت مدھم — نہایت حیرت انگیز موت  
 نے جو غلوں کی آغوش میں لرز رہا تھا۔  
 ابھی اچھڑی آواز گونجی۔

قیدی کی بوڑھی رگوں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا، اور  
 اس کے لیے، نیلے نیلے ناختن، دیوار میں ایک الجھے ہوئے قیالے  
 پھر، جس کے ایک سرے پر مسند دی جھاگ کی مانند کوئی سفیدی  
 پڑ چکی ہوئی تھی اور گرد گرد مدھم سی خراشیں ڈالنے لگی۔ اس نے گردن  
 اچھڑا کر دشت ان کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے سینے کی  
 سستہ ڈھپ سے درد کی لہریں ٹھکرائیں، اس پر کھانسی کا شدید دھڑکا  
 دغا میں کھانسی کی آواز اس طرح گونجنے لگی جس طرح کسی کوئی چوٹی  
 مسترد ہانے میں غزاسں رسیدہ سوکے سوکے تے گرد گرد کھر کھرا رہے  
 رہا۔ وہ کھانسی انتشار ہا، اور جب کھانسی قدرے رکی، تو اس کے منہ سے  
 ایک سیاہ سی چیز نکل کر ٹھوڑی کے موٹے موٹے گرد آلود بالوں پر جم  
 گئی۔ قیدی نے اپنی پٹنی ہوتی گت سے منہ کو پونچھا — کت کے پٹنی  
 پر جا جا خون کے دھبے چڑے ہوئے تھے — اور اب ان میں  
 چند درد دھبوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔

چند منٹ اور گزر گئے، سانس مٹی ہوتی لاش موت کے غار کے  
 من کنارے پر جا پہنچی  
 آواز پھر گونجی،

قیدی کی آنکھیں جھک اٹھیں۔ اس طرح جھک اٹھیں جس طرح  
 رات کے اندھیرے میں پہلی کی روشنی سے کسی جیل کا ایک گوشہ ایک  
 لہ کے لئے روشن ہو جاتا ہے!

وہ ابھی زخمی کہنیوں پر جسم کا بوجھ ڈال کر دیوار سے کچے آگے  
 لٹک آیا۔

آواز کی بجائے اب مسلسل شور بلند ہو رہا تھا۔  
 قیدی پیٹ کے بل ریٹھے لگا۔ اس کا کمرے پچلا حصہ مغلوج  
 ہو چکا تھا۔

شور میں سے تباہین کہتی ہوئی آواز بلند ہوئی، اور قیدی کے نل  
 ادماغ میں ایک طوفان اضطراب بن کر پھیل گئی۔

قیدی کی نحیف کہنیوں سے خون بہ رہا تھا، پیٹ کے زخم بگڑ  
 کھا کر پیٹ رہے تھے مجروحہ زخموں کی تکلیف سے بے پردہ آگے بڑھا  
 جا رہا تھا۔

اب تباہین کا شور بلند ہوا، قیدی کی کہنیاں اور تیزی سے  
 جسم کو گھسیٹنے لگیں، اسکا دل، اس کا دماغ، اس کی روح اسوقت  
 کاؤں میں اٹھتی تھی، وہ جسم گوش بن گیا تھا صرف ایک لفظ سننے  
 کے لئے صرف ایک شردہ سننے کے لئے!

شور بلند سے بلند ہوتا جا رہا تھا، معلوم ہوتا تھا، قید خانے  
 کے باہر کی ہر چیز ٹھکرا رہی ہے۔

قیدی آٹھیں سلاخوں کے قریب پہنچ گیا، اس کی دائیں کہنی  
 کی بڑی ہڈی آئی تھی، اس نے سلاخوں سے باہر دیکھا، لوگوں کا ایک  
 بے پایاں جھوم قید خانے کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔

قیدی تڑپ کر آگے بڑھا، — اور آگے بڑھا، ابھی وہ سلاخوں  
 سے کچھ دور ہی تھا،

— سامین آزاد — ہمارا وطن آزاد! ایک شور بلند ہوا، قیدی  
 کی آنکھیں پھیل گئیں، — اس نے ایک لمبی آہ بھر کر  
 باہر خطاب گھمے کی طرف دیکھا، اور اپنا سر سلاخوں سے لگا دیا۔  
 سچ خراش شور کے ساتھ قید خانے کے تالے ٹوٹنے لگے،  
 درد آنے لگے، دیواریں گرتے لگیں۔

ہر طرف قیامت خیزہ شور — ہر جانب ہلکا ہلکا ستیز  
 چند منٹ کے بعد آخری تالہ بھی ٹوٹ گیا کھدو دواں باغی کوئے  
 میں آموچو ہوئے، سب کی نگاہیں مضطربانہ ادھر ادھر  
 دیکھ رہی تھیں۔

شور کا ایک تم گیا۔  
 جھوم کے ساتھ قیدی کی لاش ٹری تھی۔

قیدی کا ایک ہاتھ اوپر اٹھا ہوا تھا، جیسے وہ کچھ کہنا  
 چاہتا تھا — — — اس کی آنکھیں  
 چمک رہی تھیں!!

چند منٹ پہلے

صحرا نور کے خطوط کی بانگ یہ حال ہے کہ کتاب سیرۃ تک ختم ہو جائیگی۔ جلد طلب کیجئے۔

تسینگ ناو  
چینی شاعر

ترجمہ محمد اشرف خاں عطا

## محلات اور جھونپڑیاں

اسے نوادارو مسافر!

تو میرے وطن کی دستوں میں کیفیت آفریں رعنائیوں اور نظرائوز خوبصورتیوں کو دھونڈ رہا ہے لیکن یہ سامان طرب نشاط میرے وطن میں نہیں ملے گا  
فلکت زدہ انسانوں کے ملک میں خوبصورتی برعکاسی اور نظر افروزی کے سامان فرحونڈ نے واسے نوادارو مسافر! دیکھ ان ادنیٰ ادنیٰ نعمتوں  
کی منڈیریں پر مسترت و شادمانی کی پرہیزگار تصنیفیں ہیں۔ اور مریں کدوں سے چنگ رباب کی وجد آفریں اور حیات افروز تانیں بلند ہو رہی ہیں۔  
لیکن ان ملک بوس محلات کی مریں دیواروں کے نیچے فادکش، غم نصیب خردو دلی کی بے گوند کفن نشیں سراپاہ واسے غلم کی  
بھانگ تصویر پیش کر رہی ہے۔

شہر سے دور کھلی فضا میں دور تک پھیلی ہوئی خس کی جھونپڑیوں کی طوت نظر اٹھا۔ جو جھپٹوں سے محروم ہیں۔ ——— مزدور راہ کسان سے  
فادکش بچے موسم بہا میں سکڑ کر بیٹھے ہیں۔

+ ————— +

اسے نوادارو مسافر!

کٹار آب کے گہائے رنگارنگ کو دیکھ کر خوش ہو۔ ان کی ٹکڑیوں میں شہیدان وطن کا خون ٹھاہا ہے۔  
یہ ملک بوس سبز پوش پہاڑ جن کے دامن میں دریا بہہ ہے میں اور پھل مل رہے ہیں، اپنے پہلو میں میرے ملک کی غربت و افلاس کے پڑا  
انسانے لئے ہوئے ہیں۔

+ ————— +

میرا ملک، اس پرانی ریشتہ دوانیوں اور توہم پرستیوں کا مرکز زمین نوجوانوں سے خالی ہے۔  
میرے ملک کی وسیع و عریض زمین پر پڑھوں کی حکومت ہے، جو دن رات گناہوں کی وادیوں میں منحوس ہیں۔  
وہ اپنے لڑنے آفریں، درانسانیت سوز گناہوں کا کفارہ، جوانوں کا خون بہا کر ادا کرتے ہیں۔  
یہ بوزے لوگ گھروں کی چار دیواری میں بیٹھے باقاعہ امر کے غم پر غم لندہ سار ہے ہیں۔  
لیکن نوجوان دواہا جس کے ہاتھوں میں مہندی بھی خشک نہیں ہوئی، میدان کارزار میں اپنی جان بیکر بڑھوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا ہے

+ ————— +

نوجوان، بہادر، جری۔ نڈر۔ محب وطن چینی۔

زندہ ان کی آہنی سلاخوں کے عقب میں چین کی نئی تاریخ مرتب کرنے میں مصروف ہے، وہ ایک ایسے خواب کی تعبیر دیکھنا چاہتا ہے  
جس نے اس کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔  
وہ مستقبل کی خوبصورت تصاویر جو حال کے آئینہ میں دیکھ کر بارش باغ ہو رہا ہے۔ اسے اس چنکی پروا نہیں کہ جہاد حریت وطن میں  
شہادت پانے کے بعد اس کی بے گوند کفن نشیں کتوں اور چلیوں کی خوراک بن جائے گی، بلکہ وہ جانتا ہے کہ خون شہادت کا ہر قطرہ ملکیت  
کے تابوت کے لئے کیل ثابت ہوگا۔ لاریب!

چین کا غیور نوجوان باطل کی تاریکیوں میں حق و صداقت کا نور پھیلا رہا ہے۔  
وہ حریت کا لہ کا سچا علمبردار ہے۔

# کیریبی کا قصہ

آمریکہ کے موجودہ دو بڑے ترقی میں اب باب تقریباً کے صرف ان ہی دو حصے میں آبادیوں کی طرف منوجہ ہیں جنہوں نے اب اب میں ایک تھک چکا دکھا ہے۔ لیکن ایک تیسرا آمریکی لوگوں کو اپنی ستم رانیوں کی محکلیاں دکھا دیکھا کر اگر غور فرمائیں تو حیران و متعجب ضرور گرد آئے ہیں اس کی طرف ابھی بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ آج اپنے نظروں کے احاطہ معلومات کے لئے ان کے کچھ حالات پیش کرتا ہوں

جمہوریہ ڈومینیکی اور جمہوریہ ہٹی دونوں جزیرہ ہٹی میں واقع ہیں۔ اس جزیرہ کے مغرب میں کیریبی بحر مشرق میں پورٹو ریکو واقع ہے۔ لیکن اس جزیرہ کی آبادی کا تقریباً نصف باشندگان سینٹو ڈو سنکو پر مشتمل ہے۔ اس جزیرہ کی ڈومینیکی کا صدر جنرل ریٹائل یونڈاس ٹرو جولو مولینہ ہے۔ جسکی عمر چالیس سال سے کسی طرح کم نہیں۔ اس جزیرہ کے افراد میں ٹرو جولو کا نام بدل کر ٹرو جولو دیا گیا ہے۔ جسٹس کے اعداد و شمار کے مطابق جمہوریہ کی آبادی پندرہ لاکھ ہے۔ جس میں یورپی، افریقی، ہندوستانی اور شاہی تمام اقوام شامل ہیں۔ لوگ عام طور پر سپانوی زبان بولتے ہیں۔ سرکاری زبان بھی سپانوی ہے۔ یہاں کے لوگ پانامیت کے قاضی ہیں۔ تین کی آبادی پچیس لاکھ ہے۔ ۱۹۶۰ء تک ڈومینیکی جمہوریہ ایٹمی دونوں ریاستوں کے اتحاد کے تحت امریکہ کے بڑی ممالک کے قبضے میں تھے۔ لیکن اب وہاں بھی دو بڑی حکومت ایسیلیو کونسل اور ایسیلی کاؤنٹی ہے۔ مگر سیاسی رجحان اس نام نہاد جمہوریت کے کرنا دھڑا ہے۔ اتفاقاً طور پر ہی انتخاب کی زمینیں گوارا کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ کالیکشن رانی صورت دیکھتا ہے شاید یہاں قبوہ بکثرت ہوتا ہے

شکریہ ادا کرتے ہیں۔ عام صنعت ہے۔ اکثر بچوں پر معذرت کی جاتی ہے۔

راحت

شروع ہونے میں ان کا ارتکاب ہوا۔

سب سے بڑی حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس ظلم و استبداد کی کوئی اثری ہوئی اطلاع بھی امریکن پریس کو نہ پہنچی اور معاند ڈومینیکی جمہوریہ کے اندر ہی اندر پک پکا کر رہ گیا۔ جرم کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے یہ کس طرح تعین ہو سکتا ہے کہ خود کیریبی اخباروں کا "اخبارات اطلاعات کا صفحہ" نکالی تھا۔ اس لئے قدر تائیں اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ کیریبی اور ڈومینیکی جمہوریہ کے مابین کوئی ایسا غیر معمولی حادثہ وقوع پذیر ہو گیا ہے جس سے کاتب خط اپنے جذبات کی شدت کو ضبط نہ کر سکا۔ اور اس لئے جذباتی رہیں ایک معمولی سے واقعہ کو اس قدر زبردست اہمیت دیدی۔

کچھ دنوں بعد نیو یارک کے سپانوی زبان کے پریس میں نے یہ خبر پڑھی کہ کیریبیوں کی ایک کافی تعداد کو ڈومینیکی کا شہر نکال دیں نے قتل کر دیا ہے۔ اس کا مطلب صرف ایک ہو سکتا تھا۔ اور وہ تھا سرکاری سازش حکومتی اشتراک۔ کیونکہ جنرل ٹرو جولو مولینہ کی آمریت اس قدر مظلم و باقائدہ

دست اور تیر میں ہے ایک امریکن کا خط ملا جو سینٹو ڈو سنکو سے آیا تھا اس خط میں اس نے وائچاؤن کے خونخوار قتل و غارت کی تفصیل لکھی تھی۔ جہاں ڈومینیکی فوج اور پولیس شراب کے نشے سے مدھوش ہو کر کر امن پسند ہیٹوں پہنچاؤں کے نام پر جن میں مرد و عورت، بچے، جوان اور بوڑھے سب ہی شامل تھے۔ حملہ آور ہوئی اور سخت وحشیانہ طریقوں سے تقریباً پانچ ہزار باؤن کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس خط میں اس امر کا اظہار بھی تھا کہ کاتب نے مجھ کو ان گناہوں کو دیکھا ہے۔ جن سے خون ٹپک رہا تھا۔ اور جن کے اندر مقتول لاشیں اس سمندر کی طرف لے جانی جا رہی تھیں۔ چچاں شادک چھلیاں ان کو اپنی خوراک بنانے کے لئے ساحل والوں کی مٹائیوں کی صفحہ پہنچتی ہیں۔ ہزاروں لاشیں اوپر تلے چلی گئیں اور اس کے بعد ان پر نشہ گیر مادہ ڈالی کر آگ لگادی گئی۔ یہ دھڑکائی کوئی دھڑکائی اپنی بدبو ڈھانپتی روشنی سے اور دھڑکائی کو متعجب و متحیر کرتے رہے۔ یہ جرائم صرف سرحدی علاقوں ہی میں رونما نہیں ہوئے۔ بلکہ تمام ڈومینیکی جمہوریہ میں اکثر بڑے

نے جنوبی امریکہ کی اصل آمریت کو یاد دلائی کہ اگرچہ امریکی ہزار ہا سال سے گھرے ہوئے مگر آئندہ اس کے ایکٹ میں کئی جزا واقع ہیں۔ ان کو جزا کر تیری کہا جاتا ہے۔ ان جزا میں کئی جزا

(راحت)

سینٹ ڈومینیکی کا بہت نمایاں اور اہم حیثیت رکھتے ہیں۔

کے ساتھ جہاں دیتے گویا اپنی بہادری، محبت، خوش قسمتی، باضابطگی اور سچائی سے سنہری بالوں والا بہادر اپنے دشمنوں کی تمام چال بازیوں اور حیلہ تراشیوں پر غالب آتا۔ خطہ نبات کی دختر مصل و حرب کو خطرہ سے نکالتا اور اس طرح حسن و عشق اور عزت و دولت حاصل کرتا اور اس عبادت میں جو سراپا ہے، جنرل تولین ہی کا ہے،

لیکن بعض اوقات حقیقت بھی ایسی ہی تعجب انگیز و حیران کن ہوتی ہے جیسے کہ انسان۔ اگر کوئی شخص رچن پانڈیگ دیوس کے متعلقہ و مشہور پیمانوں کی نئی دنیا میں صبح شام دیکھنا چاہتا ہے، تو وہ جنرل ٹرولین کی ذات ہے جو اپنے ظہور و اقتدار کا جو ایک ہمارے نام جہوریہ سینوڈو مکتور پر جاتے ہوئے ہے وہ، باری انسانی روایات کی ایک ترقی منکوس ہے، جس نے ہمارے کمرے میں پرکشی نئے نئے ولاد داغ لگا کر آنے والی نسلوں کے لئے ایک بہترین مثال قائم کر دی ہے، جس نے اپنی بہادری اور جواں مروتی کو بڑی اور ناموری میں تبدیل کر دیا ہے۔ وہ واقعہ عساکر کا سردار اعظم ہے، لیکن یہ سردار اعظم وہ خطاب ہے جو اس نام نہاد جہوریہ کی کاٹریس نے جس کا وجود جنرل تولین کے ہاتھ میں ایک کدہ تیلی سے زیادہ نہیں، اس ظالم کی خدمت میں پیش کر کے گویا اپنی عہد امتیاز حاصل کر لیا ہے اس کے علاوہ محسن الملک یونیورسٹی کا فاضل بھی یعنی اعزازی فاضل معاشیات و سیاسیات اور ایک ایسی وطنی کشتی جو جنگ سے کہیں پہلے و قتل کی ہے، اور جس میں ایک بھونڈے سے عہد پر چند شبنم گئیں بھی دکھی ہوئی ہیں، امیر امیر بھی ہے اور یہی نہیں بلکہ وہ ایسی تدبیریں بھی کر رہا ہے، جن سے وہ اس جہوریہ کا صدورام

(محمد نواز درویش) ہو جائے۔ اس نے نئی دنیا کی سب پرانی یونیورسٹی کے ساتھ ایک عجیب و غریب کیا، اور اپنی عقل و فراست سے یہ فائدہ اٹھایا، کہ اس دارالعلوم نے یہ معاملہ شروع ہونے کے ایک ہفتہ بعد ہی اسکو معاشیات و سیاسیات کی اعزازی ڈگری سے نوازا دیا وہ معاملہ یہ تھا، کہ اس نے سینئر فٹری مونا جو نیز کا تمام علاقہ کا شتم دس ہزار اسٹرلنگ کے عیوض میں خریدا، اور فوراً ہی ریاست کے ہاں ایک لاکھ اسٹرلنگ کا فروخت کر دیا۔ اس پر وزیر اعلیٰ کی رعیت کیسٹرون ٹیونے اتر کر اس پبلک سپرٹ کو سراہتے ہوئے لوگوں کو بتایا کہ اس طرح اس قدر قیمتی قطعہ آراضی دیکھ کر و جہوریہ کی ترقی تعلیم و رعیت کے لئے ایک آسانی ہم پہنچا دی ہے، تمام جہوریہ ٹرولین کے لئے جذباتی تشکر و امتنان کیا اس کے اس عمل پر خوش تھی کسی کو یہ خیال تک بھی نہیں ہوا کہ ریاست کو دس ہزار اسٹرلنگ کی قیمت کی ایک چیز کے لئے ایک لاکھ اسٹرلنگ یعنی اس گنا، ادا کرنے پڑے ہیں۔

ہے کہ کوئی ڈائمنڈی بغیر سرکاری رضامندی کے معمولی سی ہی انجسٹ نہایت نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی کوئی ڈائمنڈی سوائے اداکین فریج و پولیس کے اپنے اپنا اختیار رکھ سکتا ہے۔ اس خبر کے شائع ہونے کے بعد دوسرے اخباروں میں بھی اس کا چرچا ہونے لگا۔ اس طرح سینوڈو مشکو سے چاروں طرف اطلاع پھوٹ پڑی

جی۔ اے۔ نمبر ۱۳۳۵، کوئیو بارک بریڈر میون کے اور صفحہ پری موٹی موٹی سرفیوں کے ساتھ اس وحشیانہ قتل و خون کی پوری تفصیلات شائع ہوئیں۔ ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ کس طرح کیوں کو نہیں پر اچھا لایا گیا۔ قتل کو موت کی نیند ملایا گیا۔ اور مردوں کو خبر ہوئی کہ جو تک کر جان سے مارا گیا ان تمام تفصیلات کی تصدیق ان بیادوں اور لاکھوں مصیبت زدہ قتلوں سے ہوئی تو وہ قتل کی فریج کے اس وحشیانہ ظلم پر اپنی اپنی جانب لیکر بھاگتے تھے اور کسی طرح ملک کی سرحدوں تک پہنچ کر خود کو بچا سکتے تھے۔

یہ خونخوار قیامت صغریٰ ان لوگوں کے لئے شاید تعجب انگیز نہ ہو جو دنیا کی سب سے کچھ رافینیت و رابٹلی رکھتے ہیں، اور جانتے ہیں کہ قریباً ۱۵ سال سے جب کہ ٹرولین و جہوریہ سینوڈو مشکو میں کیا گیا حشر یہاں ہو چکا ہے، اس کے ذمہ عورتوں کی قتل و غارت اور بربریت و استبداد کی ایک ایسی مثال قائم ہو چکی ہے، جس نے عہد قدیم کی بہت سی داستانوں کو دماغ سے محو کر دیا ہے، صرف وہ یکہ ہی نہیں شاید دنیا بھر کی تاریخ میں اس سے زیادہ ظلم و ستم کی مثال نہیں مل سکتی یہاں ہلاک و ہلاکتوں کی بدنامی ہم خون آشامیاں بھی مات ہیں، قتلوں اور ڈرستار کے تاریخی حملے بھی حقیقت میں اور ابتدائی اور مشکوٹوں کی سرشتی داستانیں بھی انسانہ شکر وہ جاتی ہیں۔

بہادری اور جنگ کے خاصے لیکر خطہ تک جڑا نہ گنا ہے وہ امریکی ادب میں خاص اہمیت رکھتا ہے، اس وقت کا جتنا جذباتی و انسانی لڑا ہے، اس کا پلاٹ بہت سادہ ہوتا تھا، جو معاش کسی ایسے آمر کو بنا دیا جیسا کہ خا جو چھوٹے سے قہر ہو، اس کے سر پر شاہیٹ دکھا ہو، مگر نہیں تھی ہوتی اور نہ ہی شکتی ہوتی ہوئے ہو، کچھ خطبات میں پائے ہوں، چڑا بھٹا یہ نہ تھا، اس سے بھی نرین جو جہالت کو کٹ کر بھری ہو، حوصلہ ظلم، جبری اور انتہائی بکارتی و خاندان جو ہمارے چھوٹے رڈ یارڈ کپنگ، بن جو افرادوں کی مستایش کرتے تھے جو نیلے لباسوں میں قسمت کو آزار داتے، طیریا اور وحشی جانوروں کا مقابلہ کرنے اور دشمنوں کی گولیوں کو تپوں کی سی بیکری اور ہنسی خوشی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے سینوں پر کھاتے تھے، ہمارے بہادر اپنے ہوطن سست، کابل اور پورے انسانوں کے لئے محبت، باضابطگی و قاعدہ اور دلیری پریدہ کرنے کا باعث ہوتے اور اپنے دشمنوں کو نہایت قیامتی بکتر

خبر سال ہوئے ایک دفعی نکی مرحوم لڑکی کی لاش رہا سہاے مقبرے وطن کو اس لئے بھی گئی کہ اس کو خاندانی قبرستان میں دفن کر دیا جائے لیکن یہاں یہ افواہ کرم ہو چکی تھی کہ اس لڑکی کی لاش میں کوئی سازشی اور عداوتی تماہر پوشیدہ ہیں۔ جن پر ڈسٹینسی لوگوں کو عمل پیرا ہونے کی سخت تاہمید کی گئی ہے۔ چنانچہ سمندری جنگی پراس لاش کو اتروا لیا گیا اور ان تماہر پوش کی تلاش لا حاصل میں اس لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ ٹرو جولو کا شان و شوکت سے نفی خیر معشوق، احتیاجی اور بغاوت سے خوف کٹنا محض دتار یک پہلو دکھتا ہے۔

لیکن ان چیزوں سے قطع نظر اور بہت سی باتیں دلچسپ بھی ہیں۔ ہر اس شخص کو جو زندہ رہنا چاہے انتہائی چالپوس اور خوشامدی بننا چاہے اور خوشامد اور چالپوس جو ستاد دولت رکھنے والوں اور قوم کے صحیح ہمدردوں کی دلی شکستگی اور ان کے ناؤک احساسات کو مجروح کرنے کا باعث ہو وہ دیگر حلقوں میں لطف و انبساط پیدا کرتی ہیں۔ بعض اوقات تو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ نئی نوع انسان کی سادی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسی مافوق البشر ہستی ہوئی ہے جسکی اس طرح دفنی کی گئی ہو ان لوگوں میں جن کے غلام ٹرو جولو کی خدمت میں غیر معمولی عزت و وقار کے تحائف پیش کرنے اور بے انتہا تعریفوں کے پل بانٹنے کا خوشگوار فرض سپرد ہوا ہے۔ یہ وہ نصیب سابق صدی کا ایک بٹب فوٹل بھی ہے جس کو ایک تہہ امریکی حلقہ سیاسیات کے دباؤ پر یہ مجبور مل گیا تھا۔ سب سے آخری انتخاب مہدات کے موقع پر جو نشانہ لوگوں میں تقسیم ہوئے تھے۔ ان پر خدا اور ٹرو جولو کے الفاظ کندہ تھے۔ اور اس روز سے تمام اخبارات کچھ اس انداز سے جو سابق قیصر کے دل میں بھی رنگ و حسد کی آگ بھڑکا دے۔ ہمیشہ ٹرو جولو اور خدا کے جملہ کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ڈوئی نکی پریس کا روزانہ مطالعہ نئی نوع انسان کی مجبورانہ جھڑکی و کم قدری کی تعلیم کے مترادف ہے۔ وہ اخبارات جو آج اپنی زندگی تقاسم دکھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس امر کے لئے مجبور ہیں کہ ہر اشاعت کے سب سے پہلے صفحہ کو سیاہ جھنڈے کے نشان سے آماستہ کریں اور اس میں اس امر کی ہر ممکن تعریف کے راگ گائیں۔

ہیٹیوں کے اس قتل و خون سے بہت پہلے ٹرو جولو کے سیاسی و شمولی اور ان لوگوں نے جو ہزاروں کی تعداد میں دنیا کے دیگر بہت سے حصوں میں جلا وطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ اعلان کیا تھا کہ ان مقتولین کی تعداد جو اس آمر کی وحشت و ہریریت کا شکار ہو چکے ہیں کئی ہزار تک پہنچتی ہے۔ ان بتوئین میں ۱۱ ڈوئی نکی بھی شامل ہیں جو آسمان ادب و مصیقت کے آفتاب اور دھماکے کا وہ مار کمرہ ۳۰۰۰۔ ۱۰۔ ۱۰۔

ٹرو جولو کا فوسالہ لکھا بھی جو اس کی پسندیدہ و محبوبہ عورت کے بطن سے بچے طوطا کے زمانہ ہی میں طبع کا کرمل بنا دیا گیا اور ایک کرنل کی پوری تنخواہ کا کٹنے لگی۔ چند سال گزرے کہ کراٹھولیس نے جس کو دارالسلطنت میں ہر یک نو سب سے پہلے دریافت کرنے والے کے نام کی مناسبت سے کولیس چان لیا جاتا ہے۔ اسی رئیس (Ramsay) کو ٹرو جولو کا لڑکا جو کرمل رئیس کہا جاتا ہے خال ترین بچہ (The most beautiful child) کا خطاب یا ہے۔ کراٹھولیس کی تجربہ کے الفاظ یہ ہیں کہ اسے یاروں میں بھرا یا دیکھئے وہ مرد و عورتی افعتی طعانی جس سے مقدمہ کے قلمب اعظم نے قوت جب کے میدانوں میں سنگد کا مقدس و منبرک شجر سدا بہار قبول کیا: اور یہ کہ کس طرح اس باپ کا دل اس میں اپ کا دل جسکی حب الوطنی اور جس کے شعور و فراست اور جس کے فائدہ گردانے کا عقول میں ہماری مہوریہ کی قسمت دیدی گئی ہے۔ سہاٹی س لبر انٹار سے متاثر ہو گا۔ جو ہر نے اس لڑکے کی خدمت میں پیش کی ہے۔ ٹرو جولو نے اپنے نام کا ایک بالکل نیا صوبہ قائم کیا ہے۔ اور ملک کے سب سے شہر کا نام بدل کر اپنے نام پر رکھ لیا ہے۔ بہت سے یلوں اور دیگر اتحادیہ مامہ کے کاموں میں اس کا نام نظر آتا ہے۔ حالانکہ ان کی تعبیر کا تعلق اس سے بہت ہی کم ہے اور یہ تراس کے زمانہ سے پہلے کے تعبیر یا منتہ ہیں نام ہر کار کی طائزین اور شہری باشندوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اس کا ایک بت نسب کر لیں اور اس کے ذاتی استعمال کے لئے ایک عالیشان عمارت خواش : سب سے بہت سے مستعد حکمرانوں کی طرح اس کو بھی اپنے ملک اور دیگر ملکوں سے کافی تحفات مل چکے ہیں۔ جو گویا اس کی عزت و حکومت کے اعترافات ہیں یہ تحفات ایسے ہیں کہ شاید ان کا مقابلہ وہ انسان اپنے تحفات سے کسی نہ بے جو ہوش سنبھالتے ہی نئی نوع انسان کی بھلائی اور خدمت شروع رہے اور مرتے وقت تک کرتا رہے۔

ی جھڑکی سی گرم سلطنت کا خود مملو حکمران ایک ایسا انسان ہے جس میں خوف و خود ممانی کی شکست نے مل کر استبدادیت کا خطرناک ترین اور ہمد گردا ہے۔ جب وہ طاقتوں کو عارضی کی اجازت دیتا ہے تو جلد بند دینی ہر آئے والے پر چھوٹی گولوں کی بند و قفس و جن کے لئے مترجم کے ایک ٹکڑوں کا بہترین لفظ وضع کیا جاسکتا ہے: تانے کھڑے رہتے ہیں۔ جاتے وقت ملاقاتی اس کی طرف پشت نہیں کر سکتے بلکہ ان کو پیچھے کی طرف چننا پڑتا ہے۔ اس کو کسی کا اعتبار نہیں وہ لوگ جو اس کے بڑھکھٹ صاحب اور سلطنت کے اعلیٰ مرتبہ اور اکین ہیں۔ یک نخت جیل میں ڈال دیتے جاتے ہیں۔ یا ان کے خاندان والے ان کو گھاس اور کھجور میں تپت پاتے ہیں۔

کا شکار ہو چکا تھا۔ دماغ رہے کہ اس وقت اس کو اس امر کی بحری دستہ فوج نے گرفتار کیا تھا جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس کو وہ اسکی بیوی کو نہایت بے دردی سے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ اس سے چند سال پہلے تقریباً چھ سو دوی نیکی کا شکاروں کو موکا اور پرتلو پلاٹا کے موجب میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان بیٹا ہوں کا تصور یہ تھا کہ انہوں نے جیسے جسے شکر سازی کے اداروں کو اپنی اراضیات غصب کر لینے سے روکا تھا ان کے علاوہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ کئی ہزار اور قیدی بھی تربیت کر دیے گئے۔ ہزاروں کو ناخوابی برداشت اذیتیں دی گئیں اور لاکھوں کو کھوٹاکی جیل کی کال کوٹھی میں جلا کر مار ڈالا گیا۔

کیونکہ اپنے سردار گرگورسن مارٹن کی قیادت و ماتحتی میں سینٹوڈوٹو ملکات منقطع کرنے پر مجبور ہو گیا۔ کیونکہ وہاں کے باشندوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کئے گئے تھے۔ شہر جلو کے مقتول ملازمین میں دو پورٹی رہی بھی تھے اور بڑی بڑی برکامیوں اور پڑوسیوں میں سے بعد ان مقتولین کے چند رشتہ داروں کو ریاست کی تاخیری احاد حاصل ہو سکی تھی۔ گو اس امداد کو کوئی خاص اثر دیتا نہیں ہوا، مگر ابھی عرصہ ہوا کہ تقریباً پچاس عورتوں نے ایکٹائیٹل خوشامدار عرضداشت تیار کی، اور اس میں اس سے اپنے رشتہ داروں کو ڈیوٹو کی رہائی چاہی۔ اس عرضداشت کے لفظ لفظ سے ان غمگین دامن نامک دھو کی درد آمیز اور حسرت بھری حالت پکی پڑتی تھی جنہوں نے اپنی بکھرے ہوئے زندگی کو گناہ آہوں کے بیلوں پہلو ایسے جھلے بھی استعمال کئے تھے جیسے انتہائی درد اندیش دھکتے ہیں سیاسی۔ جو مرد بہادر دھمکے۔ مافوق البشر سنی وغیرہ وغیرہ۔ پھر بھی ان قیدیوں کو آزاد نہیں کیا گیا۔ اور اسی پرستو یہ ہوا کہ دستخط کنندگان میں سے بہت سی عورتوں کو جرحنتی تھیں، قتل کر دیا گیا۔ شہر جلو کا عروج۔ شہر جلو علاوہ اور باتوں کے دراصل طاقتور و نفی شکریت اور امریکی بحری قوت کی تکلیف ہے۔ سب سے پہلے اس نے اور اس کے بھائیوں نے لی کر ایک گردہ قائم کیا، جو سادے علاقے میں اپنی شہر اور بکھرے ادیوں کو جو سے بن نام ہو گیا۔ اس گردہ کو

*Paulista de Pelela* کہتے تھے۔ اور نرو پو پستہ *Chachach* کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے جلاوطن مخالفین اس کو اب بھی اسی نام سے پکارتے ہیں۔ اس نے اور اس کے بھائیوں نے جو اب یہاں کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں، جیت سے سوتھوں پر قانون شکن ہیں۔ اس کے دو سو اٹھ گھر گئے اور اسٹیشن کے احوال کے مطابق فرد حسب نے مسئلہ میں سان کر سونہلی کے سرکار دی ذاک فائدہ سے تمام سرکار۔ دویدہ جرایا۔ اور ایک عرصہ تک سینٹ طاس میں خفیہ اور جلا وطن کی

قیدی برسوں سے جیلوں میں بند پڑے ہیں۔ پولی سس جو رانگ جس نے ملک پر انتہائی تعدد ظلم کی حکومت کی تھی۔ اور آخر کار مسئلہ میں قتل کر دی گئی تھا، کسی بن۔ انتہائی عذرت گری وہاں کسی کے اعمال کے رنجاب کی جرات نہ کر سکا تھا جو آج شہر جلو کے لئے بھوں کا کھیل بنے ہوئے ہیں۔ اور نہ ہی اس کے خلاف اس ضد غم و غصہ اور نفرت کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس طویل طویل کھیت میں جو مجبور یہ دوی نیکی کے باشندوں کے خون سے رنگی ہوئی ہے اور جس کے قتل و قتل سے اس اظہار کی کوشش اس معنوں کے دامن سے کہیں نہ ہو سکتی ہے، ملک کے ناہر و بار بڑے بڑے سماعت دہان اور مشہور سردار بھی شامل ہیں۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ امر کے مدد خواہ نہ تھے اور اس پر اعتراضات کرتے تھے یا اس کے خلاف لوگوں کے دلوں میں ملامت انصاف کا احساس پیدا کرتے تھے۔ اس فہرست میں وہ لوگ بھی ہیں جو حکومت سابقہ کے معتد عبد جبار اور معتد امراتے۔ اور جنہوں نے موجودہ حکومت میں پیش پیش حصہ لینے میں یا تو کوتاہی سے کام لیا یا نہایت وفاداری سے شریک رہے۔ وہ لوگ کا انجام ایک ہی ہوا مزید اس فہرست میں وہ کا شکار وہ ہیں جو جنہوں نے سب سے پہلے اس عمل پر کہ وہ ان کے مویشی اور فصل چرا لیتے ہیں اور حکومت کے اس اقدام پر کہ اس نے ان کی جائدادیں ضبط کر لی ہیں، کچھ اعتراض کیا۔ گو باہر دو افعال قانوناً ناجائز ہیں، بن کے خلاف عدائے اجتماع بلند کرنا موت و دعوت و نیلے ہیں یہیں نہیں بلکہ اس خیر فہرست میں ان طالب علموں اور استادنوں کا رد و باری لوگوں اور سو ڈیگروں و غرض کہ ہر پیشہ اور ہر درجہ کے لوگ کے نام بھی نظر آتے ہیں جن کے اندھ غم و سامی جوش اور ذمائی بھی صداقت تھی، ان سب لوگوں کا جرم لون اخلاقیہ کہ وہ اپنی حکومت کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتے تھے۔ اور اس کے مظالم کو بخوشی نہیں قبول کرتے تھے

ایک سرکاری خفیہ مصلح اور سخت دل گردہ جس کا نام لاسٹ اسٹاٹس رکھا گیا ہے کہ اب ست تیس دہاں ایک بیالیسویں امریکی بحری دستہ فوج تھا جس نے سینٹوڈوٹو ملک میں اپنے اعمال و انحال کی ایک بیخ زہین یادگار چھوڑی ہے۔ صرف اس کام کے لئے مقرر ہے کہ وہ لوگوں کی مار پیٹ کر رہے تاکہ کوئی سرکش نہ ہو سکے جن لوگوں پر حکومت کے دشمن ہونے کا معمولی سا بھی شبہ ہو، ان کو لا پتہ کر دے۔ اور زیادہ مشکوک لوگوں کو بے تکلف قتل کر ڈالے مشہور شہر و جیلو دینا اور اس کی بیوی کا انوسٹانک قتل وہ سیاہ ترین عمل ہے جس نے ہسپانیہ اور تمام لاطینی امریکی میں غم و غصہ کی آگ بھڑکادی۔ جیتو جو اپنی حب الوطنی و وسیع النظری صفت گوئی اور صحافتی زندگی کے لئے مظاہر شہرت کا مالک تھا۔ اسے اس قتل سے بہت پہلے بحالت قید حل ہی مرق

رجی گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ صدر کابینہ کے خلاف بغاوت کے وقت آ کر وہ اس کے کام کو بدل گیا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد وہ اس کا بجائے لٹل دس مویشی خریدنے کی کوشش میں گزرتا کر گئے۔ مسئلہ میں اس نے بہ ایک آٹا کی طرف سے چک پر جعلی دستخط کر دیئے جس کی پاداش میں اس کو چھ ماہ کی سزا سنائی گئی۔

ہائی کے بعد اس نے نیشنل گارڈیں شرکت کر لی۔ یہ گارڈ امریکی داخلی فوجوں نے خفیہ اطلاع دہانی کے لئے قائم کیا تھا۔ اس نے اپنی اس فوجی گروہ سے فائدہ اٹھا کر بہت سے خلاف قانون کارخانوں اور عیش گاہوں کی تحفظ کے حصول میں کافی مدد پہنچا دی۔ لیکن کچھ ایسے اسباب کی بنا پر جو بعض تو ریں نہیں لانے چاہتے، اور جن کو وجہ سے وہ ایک امریکی افسر کے مقصد کے حصول میں بڑا کارآمد ثابت ہوا، اسی امریکی افسر نے اس کو پانچ کی کوشش میں لے کر وہ ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔

کچھ عرصہ تک وہ سن آئڈیز کے مرکز شکر سازی کے گارڈوں میں کام کرتا رہا۔ لیکن پھر اس نے نیشنل گارڈوں میں ایک معمولی دیگر ٹھکانے کی حیثیت سے شرکت کر لی۔ وہ ابتدائی سے بے رحم و مستعد تھا۔ اور یہاں اس نے بہت جلد ہی شروع کر دی وہ اپنی سنگتوں، ڈاکوؤں کے باعث رسوا ہو چکا تھا، کئی مرتبہ اس کے بالادست افسروں نے اس پر زیادہ انچوری کے الزامات لگائے لیکن ہر دفعہ مذکورہ بالا امریکی افسر اس کا معاون ثابت ہوا۔

امریکی بحری فوج کی واپسی کے بعد بڑے جلد بہ نیشنل گارڈوں میں کام کرتا رہا اور اپنی چالیاؤں سے ترقی کے ذریعہ بڑھنے لگا۔ اس نے اپنے ایک فسر کو اس کے ہی ایک خفیہ ناک ملازم سے بیکار ہو کر قتل کر دیا۔ ایک دوسرے فسر کو حیدرستان وزارت کے جھوٹے اور جعلی ہونے کی سزا سنائی گئی۔ ان دستاویزات میں ٹرو جولو کو ایک انقلابی سازش کا شریک کار بتایا گیا تھا۔ اس طرح آہستہ آہستہ قدم قدم پر نیشنل گارڈ پانچ پورے پورے ملک کے لئے راستہ صاف کرتا رہا۔ اس کے یہ خواب بغیر تعبیر کے نہ رہے۔ پہلے اس گارڈ کی حکومت اس کے ہاتھ میں آئے ہی اس نے اس کا نام نیشنل ایمریٹل اسکور توئی رکھا۔ اور پھر اس حکومت کے پیدا کرنے کی کوشش میں سرگرم ہو گیا جس کو امریکی حکومت نے اٹا دیا تھا۔

اس کمیشن کی مشق تحقیقات پر اس کمیشن کا ایک ممبر امریکی امیجور انڈیکس ٹری آف سٹیٹس سنٹر وٹس بھی تھا۔ ملک کی مالی حالت کو درست کرنے اور نیشنل امریکی فوجی خزانے کے لئے حاصل کیا گیا۔ اس امر کی کوشش لگائی کہ فوج کو مبالغہ آمیز اخراجات اور ٹرو جولو کے زیر انتظام قیدیوں کی زیادتی اور گھیر دینے کی ضلعی کمرہ سے ایک سرے سے سزا ہی دیا جائے۔ اگرچہ کمیشن کی

آخری رپورٹ میں کسی مخصوص الزامات کا اظہار نہیں کیا گیا۔ تاہم فوج کے اخراجات کو کم کرنے پر زور دیا گیا۔ بہت سے افسروں کو جن میں کمپنیاں بائرنز بھی شامل تھا بریز سے اپنی جائیں بیکار کیا گیا تھا۔ کیونکہ انہوں نے کمیشن سے اصل واقعات چھپانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور کمیشن کی کوششیں کامیاب بنانے کی بھی سعی کی تھی۔ تحقیقات میں بہت سی عجیب عجیب باتوں کا انکشاف ہوا مثلاً یہ کہ فوج کے کپڑے دھونے کے کارخانہ کا انتظام ٹرو جولو کی ایک مشین کرتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ تعداد زیادہ شرح پر یہ کام کرتی ہو گی فوجی دستوں میں بہت سے ایسے بیکار آدمیوں کے نام بھی درج تھے جو خواہ تو پوری بات تھے۔ لیکن جنہوں نے کسی سند یا کاغذ سے تک نہیں دیکھی تھی۔ ۱۶ مشرنگ میں سے جو ایک سپاہی کی حیثیت تھا تھا۔ یہ انڈیا گیا گیا کہ ان کے دس اسٹرلنگ تک ٹرو جولو کی جیب میں چھ جاتے تھے۔ وہ سپاہی جنہوں نے کسی اس عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی یا تو حفاظت ختم کرنے میں بھی مدد دیتے جاتے تھے یا غائب ہو جاتے تھے۔

فوج کو ڈاکوؤں کی کوشش سے انفران پیدا ہو گیا۔ اس کمیشن نے اپنی نامی کی وجہ سے گواہوں کی کوششوں میں کسی قسم کی غداری یا بے ایمانی کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقت کی حکومت و اسکوئیر کے لئے تو کھودوی فوری مشق میں ٹرو جولو نے تمام فوج کی معیت میں بغاوت شروع کر دی۔ ریٹائرل اسٹرٹیا اور نیا کوئٹہ تہی کی طرح وقتی صدر کی حیثیت سے اس وقت تک قائم رکھا گیا۔ جب تک کہ ایک خاص قسم کا فوج کے زیر اثر ایکشن ہو۔ اور اس میں ٹرو جولو کو کرسی صدارت دیدی جائے۔ دچا پھر یہی ہوا، اس کے بعد اسٹرٹیا آریٹا نائب صدر بنایا گیا۔ اس انتخاب، صدر میں سب سے زیادہ پرہیز گار بات یہ تھی کہ ٹرو جولو کو مندرجہ فہرست رائے دیندگان سے کہیں زیادہ ووٹ ملے۔ شاید شیطان کی فدا بات بھی اپنی رائے دینے آئی ہو۔ عدالت عالیہ کے ایک جج نے جب ان انتخابات کو خلاف قانون و فاسد قرار دیا تو اس غریب پر اس قدر مصائب گئے کہ آخر کار اس کو وہاں سے جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ حال ہی میں فرانزوار و مطیع آریٹا کو بھی اس کی خوش اعراض روکنے کی کوشش کی وجہ سے اپنی جان کی خاطر جریرہ کو خیر باد کہنی پڑی۔

عسکری حکومت بہ ٹرو جولو نے اسی فوج کے ذریعہ سے جو باشندگان کی حفاظت کے لئے تیار کی گئی تھی، اور جس کو نیشنل گارڈ یعنی قومی محافظ کا نام دیا گیا تھا۔ ہر مخالفت کا سرکھلاہ اور آج بھی اسی طرح کھل رہا ہے۔ مثلاً اور اجاڑیے جو کہ اس وقت تک صرف عسکری حلقوں ہی کی نمایاں شخصیت تھی اب قومی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ ٹرو جولو نے اپنے اس بلند مرتبہ اور

انچاس اعلیٰ حیثیت کو انچی ذاتی امامت و دولت کے لئے استعمال کیا ہے وہ خود یا اس کے عزیز برہمن کے کھانے اور دیگر ضروریات زندگی کی رسید کے اجارہ دار ہیں۔ بوجہ خاوان میں ٹرڈ جلو کے سوا کوئی اور شخص موٹی فروخت نہیں کر سکتا۔ تباہوار اور اس کی بیوی کی تجارت کلیتہً اسی کے ہاتھوں میں ہے اس کے پاس تمام ریشمی کپڑے کا اجارہ ہے۔

دو تہائی بیکامیں زندگی گزارنا اس قدر گھریں ہو گیا ہے کہ معمولی معمولی اجناس تک کی خرید و آمد مدد بردہ برہمن ہی جاد ہی ہے حال ہی میں ایک بہت بڑے غیر ملکی بینک کے خلاف انڈیا بینک عربی کا دعویٰ کیا گیا تھا کیونکہ اس نے ملک میں کچھ ایسے قرضے جن کو نا شروع کئے تھے جن میں ٹرڈ جلو خود شریک تھا بڑی بڑی جاگیروں کی ضلع کی ہی عجیب عجیب داستانیں مشہور ہیں۔ امریکی کاروباری اداروں کے ایجنٹ اور تاجروں ٹرڈ جلو کی ذاتی تجارت کا مقابلہ کرنے کی سزائیں جیل خانے بھیج دیئے گئے۔ ان پر سیاسی سازش کا الزام لگایا گیا اور کسی ان کی عرض و معروض اور ان کے مقصد کی سماعت نہیں کی گئی۔

آخری قریب ازیم جو امریکی بکری فوج پھٹنے کے وقت اسلئے میں اتیار ہوئی تھی۔ اس کے مطابق جمہوریہ پر تقریباً دو کروڑ اسٹریلنگ برٹنی قرضہ جات تھے جن میں سے سائے پانچ فیصدی ایسا سونا تھا جس کے سو سے یہ قرضہ ادا کیا جاتا۔ یہ قرضہ سلسلہ میں شروع ایک سو ایک فیصدی واجب الادا ہوتا ہے۔ صدر ریاستہائے متحدہ کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ محصولات چھٹی ہر قسم کے جمع کرنے کے لئے اپنا آدمی مقرر کرے تاکہ ادائیگی کی ضمانت ہو سکے۔ اصل پر ادائیگی سلسلہ تک شروع نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اس سال ٹرڈ جلو برسرِ اقتدار ہوا اور وہ یہ ادا کرنے سے معذور رہا اور مزید دو سال تک روپیہ ادا کرنے کا اعلان کیا حکومت ہو اس سے رضا مند اور اس سے شفق الراء نہ ہو گئی۔ لیکن پھر سلسلہ میں مزید چھ ماہ کی توسیع دیدی گئی۔ حال ہی میں دستاویز اداروں سے ایک محلہ بولہ ہے جس کی مدد سے سالانہ ادائیگی کو بہت ہی کم کر دیا گیا ہے۔ اور محصولات چھٹی پر اب بھی معروف مزید ہم سال کے لئے بڑھا دیا گیا ہے۔ اصل مہلت مانگنے اور دینے جانے کے سبب کڑو نہ تھے مالک کساد باز اور کسی وجہ سے قومی منکی شکر نہ دے اور تباہی کی مہمتوں کو بڑا نقصان پہنچا تھا۔ سلسلہ کے ختمناک طوفان ہاونے جزیرہ کے کافی حصہ کو بری طرح برباد کر ڈالا تھا۔

ہیٹیوں کا قتل بظاہر دو وجہ کی بنا پر معوض و جو میں آبا ہے اٹا آئندہ دے نئے انتخاب کا قریب۔ باوجود ٹرڈ جلو کی فولادی حکومت کے

سازش و بے اعتمادی اور اس کے خلاف بغاوت کے امکان کی انہیں روز بروز گرم ہوتی جا رہی ہیں۔ ٹرڈ جلو غیر ملکی منسلک کو دیگر ملکی خاوان دانا چاہتا ہے۔ یہ وہ عقل مندانہ طریقہ ہے جس پر چند سال ہوئے چرچہ کی دھڑکی امر سائنسیر میر نے عمل کیا۔ جب کہ اس نے لیبیا کی گہری سر کو لیبیا کے سرگھو پا۔ یہ ہی وہ پوشندہ فن ہے جو ایسی ملک بنا دوسرے کام میں لاتا ہے۔ اور اکٹھڑ میں بیٹھ کون و فساد کی آگ ملگنی رکھتا ہے اور یہی وہ زیرکانه تدبیر و شعور ہے جس پر یو پی امرین عمل سید اس جو حوام انسان پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لئے ہمیشہ خود سی ملکوں کی حالت تلواریں بلند کرتے رہتے ہیں ٹرڈ جلو ارادہ قریب قریب مدد و سر کی برتیز والی مثال کی تعلیم تکرار اور نا حیثیت کے اصول کے مطابق خود کو مستقل آمر زار دینا چاہتا ہے۔ ہیٹیوں کے قتل سے بھی نہیں ہوا کہ ملک کی توجہ جنگ کے امکانات کی طرف رجوع ہو گئی۔ بلکہ اس نے قومی تلواریں کو یہ بھی یاد دلادیا کہ ٹرڈ جلو کے جہد حکومت میں معمولی سی مخالفت بھی خون و آتش میں غرق کر دیتا ہے۔

دوسری وجہ قتل ٹرڈ جلو کے جرمنی سے سرین افراد و ملکی تعلقات کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ تمام جنوبی امرین چاہے وہ ریاستہائے متحدہ کو کتنی ہی دوستی کے قریب کیوں نہ دیں۔ اور مدد و ملٹ کے جمہوری ضمانت کی کتنی ہی حمایت و تائید کیوں نہ کریں۔ لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ وہ لوگ تمام جمہوریت پسند خیالات کو اپنے دعوے دار اپنی قوت و حکومت کے لئے خطرناک ترین بدعات سمجھتے ہیں مگر وہ ایک طرف ریاستہائے متحدہ سے خندہ پیشانی کے ساتھ آتے ہیں۔ تو دوسری طرف جرمینوں اور اطالویوں اور اکثر چارپائیوں سے بھی خفیہ گفت و شنید کے سلسلے قائم رکھتے ہیں۔ ٹرڈ جلو کے جرمنی سے تعلقات متواتر روز بروز مستحکم ہوتے جا رہے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ شلر کی حکومت سینٹو دو ملگو پر ایسی نظرس ڈال رہی ہے۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو کسی بھی الانوائی آدمی پر بیش و کم کشمکش کے وقت سینٹو دو ملگو کو جو کہ ہر بنا ما کے قریب واقع ہے ایک دستانہ جنگی اساسی بنیاد بنالینے کے امکانات نظر آ رہے ہیں۔ ٹرڈ جلو نے حال ہی میں جرمنی سے سرحد یعنی پرچائیں ہزار جرمینوں کو آباد ہونے اور کشت اور دیگر ضروریات کے لئے آراضیات دینے کے معاہدہ کی تمکین کی ہے ان ہیٹیوں میں جو قتل کئے گئے ہیں۔ بہت سے وہ ہیٹی بھی تھے جنہیں آراضیات پر اپنا قبضہ و دخل جمائے ہوئے تھے۔ جو ٹرڈ جلو جبرین لینے والوں کو دینا چاہتا تھا۔

جرمنی سے ٹرڈ جلو کی تمام حرکات و سکنات اور اس کے تمام



ایک امری کی حیثیت رکھتا ہے مگر اس نے فوجی تیاریوں پر درپردہ پیل  
صرف نہیں کیا ہے۔ اس کے پاس قومی حفاظت کے لئے صرف ایک تحریک  
جھڑتی سی فوج ہے۔ جو کسی زبردست یا دائمی جنگ کے بعد سامانِ حرب  
سے بھی آراستہ نہیں اور شاید حفاظت کے لئے بھی ناکافی ہے۔ لیکن اگر قیصر  
طول پکڑی گیا، تو خیال کیا جاتا ہے کہ بری لوگ جو دہائیوں سے تعداد میں  
کہیں زیادہ ہیں بعد یا دیگر تمام جزیرہ کو تباہ کر ڈالیں گے اور اس پرانی  
حکومت کا جھنڈا گاڑ دیں گے، فی الحال جیٹ شاید ہر وہ معاوضہ قبول کرتے  
جو اس کو اس کے شہریوں کے قتل کے عوض میں دیا جائے، اور جیٹا  
قابل قبول بھی ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ ٹرو جیٹل نے جزیرہ پر ہونے  
والی جنگ باجج ہو دیا ہے۔ اور شاید جیٹل نے دہائیوں کے زوال اور اس  
کی موت کا بھی

محرم و غفل۔ روزِ موت کی ان تمام کوششوں پر جو مفسرِ بی نصبت  
 برہنہ میں جمہوریت، امن اور غیر فساد کی موافقت اور ترویج میں  
 ہو رہی ہیں۔ ایک ضربِ کاری ثابت ہو رہی ہے۔ برہنہ و مصلحت  
 و ملیت پرستی کی تحریک کی مزید توسیع کی نیابت کر رہا ہے۔ برہنہ و مصلحت  
 و ملیت پرستی کی شمولیت سے ایک شعلہ کی شکل اختیار کر چکا ہے ایک  
 ناکند لہر کاغذوں والا لہجہ لایا ہوا ہے۔ اور یہ کائنات روز بروز ان مہلک سرگرمیوں  
 کے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ جنہوں نے ابھی تک برہنہ  
 و مصلحت پرستی سے مستبعد حکمرانوں کی جیسٹ ناک بے پناہ قوت کو تسلیم نہیں  
 کیا ہے۔

نہی جس نے سیاسی طعنے میں بھی داستانِ قتل و خون کا ارتکاب  
 سات۔ درمل جنگ نہیں چاہتا۔ اگرچہ صدر و نشست بجا تہ قریب قریب

اعتراف اصل مقصد ضائع ہو سکتا ہے یہ تعریف ایک دو جگہ ہی کرنا پڑا ہے۔ ماقی ترجمہ نقلی ہے۔ راحت

## پہلے کی حکومت

۱۰ شترانک لایب باری علیگ،

گبین کا نائل اور میکالے کے طرز بیان پر ہندستان کے اس سداۃ  
مذہب پر آشوب کی داستان جو حصہ سے حصہ تک پھیلا ہوا ہے تاریخ  
کے انصافی نظریہ کی تشریح طرز تحریر خطیبانہ انداز میں پرورش  
اس کتاب کا لائق قاری کا حق نہ کہ لکھنے کا کافی ہے۔

وطن و ادبیات میں اس سے بڑھ کر کتاب شائع نہیں ہوئی۔

تاریخ ————— اب ————— تنقید

طرز تحریر ملاحظہ فرمائیے

توت کے مقابلہ میں سازش کا سیلاب ہو جاتی ہے۔

اور وہ بلا جھجکل کے ماہرِ حریت کا آخری سنگ میل تھا۔ اس نشان سے آگے  
 اور بلا دیکھنے والا منظر ہے ایسا مقام جب کامرہ، آتش پار و کبھی اٹھاموم  
 اور جسکے انسان پیٹ کے بل بیٹھنے والے جیوان ایک دوسرے کو  
 کھانے والے ہوتے ہیں۔

کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ مصحفات تین سو کے قریب۔

قیمت مجلد ۳۰۰

شہنشاہِ حبشہ

اور کہانہ نازیب سید اختر اور مغربی کامیہ نازیشیل کارنامہ  
جس میں

ظلم اور بے کسی  
قتل اور بے بسی  
استبداد اور بے جانگی

کے دو بیان متقابلہ دکھایا گیا ہے

میں یونانی، ہندو، اور مسلمانوں کی عظمت، عظمتی، ہوتی، ملواری، سنسکرت،  
ہونے، تیروں اور چھتے ہونے، نیوز سے وابستہ، کئی، اطالیہ کی، شہر، شہر،  
اس وقت کی، جذب، نیا کے، دل میں، پرست، تھی، اور، ہر، ترس، کے، پانیوں،  
پڑ، کو، رہیں، کی، جو، میں، پر، اور، افریقہ، نایشیا کے، ساحلوں، پر، جو، قہر، کے،  
ساتھ، حکومت، کرتا، تھا، مصر، و افریقہ، ایشیاء، فلسطین، یونان، بلقان،  
فونس اور انگلستان، ہائے، تختہ، سپاہیوں کی، کھڑ، کروں، تھے، تھے،  
کتابت، و طباعت، نہایت، اعلیٰ، صفحات، ۱۰۰، قیمت، ۸/۰

مکتبہ اردو پتہ لاہور

نوشتہ: ایڈیٹر گرامین پو

## جنون

مترجمہ: سید موسیٰ نعیم

میں نے نجات پانے کا ایک ہی طریقہ سمجھا..... غریب پونے کی بنیاد..... اور میں اس کے لئے تیار تھا۔ میں نے سمجھا کہ وہ کر لیا کہ پونے کو خاتمہ کر دوں۔ اس حالت..... بتائیے آپ میری جگہ پر تو آپ کو اس سے بہتر اور کوئی صحیح سوچ ہو سکتی تھی..... کیا اب بھی آپ مجھ کو دیوانہ تصور کرتے ہیں.....؟ جناب دیوانہ آدمی کچھ نہیں جانتا۔ میری فراست کا بھی آپ کو اندازہ نہیں ہوا..... کاش آپ مجھے دیکھتے..... آپ دیکھتے..... کتنی عقلندی کتنی دور اندیشی..... کتنی احتیاط..... کتنی چالاکی کے ساتھ میں نے اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے قدم اٹھائے۔ مجھے اس بوڑھے کی حالت پر اس قدر رحم شاید ضرور ہو جائے کہ اس کو ختم کرنے سے ایک ہفتہ پہلے آیا..... ہر رات کو..... آدمی رات گزر جانے کے بعد..... میں اس کے کمرے کا دروازہ کھولتا..... نہایت آہستہ کی آہستہ..... اور جب دروازہ اتنا کھل جاتا کہ میرا سر سامنے تو نہایت خاموشی سے تبدیل کو اندہ داخل کر دیتا..... تبدیل..... اتنی دھیمی دھیمی جگہ جگہ ہوتی ہو..... بالکل خاموش..... پھر آہستہ سے سر داخل کرتا..... ہاں! جھانک کر دیکھتا..... وہ..... اگر آپ میرے اس عمل کو دیکھتے تو یقیناً جنتے..... میں نہایت آہستہ کی آہستہ ساتھ حرکت کرتا..... اتنا آہستہ..... اس قدر آہستہ..... کہ اس نے مجھ کو دیکھنے کے عمل میں پورا ایک گھنٹہ صرف ہوتا..... اور اتنی خاموشی سے کہ بوڑھے کی نیند میں خلل نہ ہوتا..... کیا اب بھی آپ مجھے دیوانہ تصور کرتے ہیں.....؟ اب بھی.....؟ بتائیے کہ کیا ایک دیوانہ آدمی اتنی احتیاط..... اتنی چالاکی اور ایسی عقلندی سے یہ کام انجام دے سکتا ہے.....؟ خیر جب میں اپنا سر کمرے میں داخل کر دیتا، تو نہایت خاموشی کے ساتھ تبدیل کی روشنی بڑھاتا..... صرف اس قدر کہ ایک دھندلا شعاع اس کی..... اس کی خوشنوا..... گدھ کی سی آنکھوں پر نہایت یہ عمل میں نے مسلسل سات طویل راتوں تک کیا..... اور ہر رات کو اس وقت جب کہ آدمی رات گزر چکی ہوتی..... لیکن انہوں نے اس کی آنکھوں کو بند پایا..... ہر مرتبہ.....

عصی کروری..... ہاں بہ خطرناک حد تک بڑھ گئی ہے۔ لیکن جنون.....؟ آپ مجھ پر لڑام لگاتے ہیں۔ عصی کروری نے صیحت قرار دہنی کو کر دہنی بلکہ سردست سے زیادہ قوی بنادیا ہے..... اور توت سامعہ..... اس میں غیر معمولی ترقی ہو گئی ہے۔ کائنات بسیط اور فضائے عظیم کی ہر آواز سے میرے کان آشنا ہیں۔ جنت کی سرد و گرمیوں میں اور درخش کی ہر بولی آواز میں..... میں نے سنی ہے..... پھر.....؟ پھر کیا آپ خود دیوانے نہیں ہیں۔ جو مجھے دیوانہ کہتے ہیں..... سنو..... سنو..... میں کس قدر متاثر ہو گیا..... سے اپنی ساری داستان دہرائی ہوں.....؟ یہ بتانا میرے لئے قریباً ناممکن ہے۔ کہ کب یہ خیال میرے دل و دماغ پر چھایا گیا..... لیکن ہاں اتنا کہ کہتا ہوں کہ وہ دن اور رات ہاں..... دن اور رات..... ہر وقت میرے حواس پر مسلط ہو گیا تھا..... کیا اس میں کسی خوفناک جذبے کو دخل تھا؟ مطلق نہیں..... ہر خلاف اس کے مجھے اس بوڑھے سے محبت تھی..... اس نے کبھی مجھے نقصان نہیں پہنچایا تھا..... کبھی میری توہین و تشویش نہیں کی تھی..... اور آپ یہ بھی غلط سمجھ رہے ہیں کہ مجھے اس کی دقت لے اندھا کر دیا تھا..... نہیں..... لیکن ایک چیز..... خوفناک..... انتہائی خطرناک..... اس کی دھندلی بے نور آنکھیں تھیں..... جو گدھ کی آنکھوں سے بہت مشابہ تھیں..... اُف! وہ خوفناک آنکھیں جن پر ایک دم جمی جڑی بوٹی معلوم ہوتی تھی، اور جب کبھی ان آنکھوں سے میری آنکھیں ٹوٹتی، تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ وہ میرے سامنے صبر کا خون سمیٹ کر میری آنکھوں کے راستہ سے کھینچ لے رہی ہیں..... اور کبھی..... کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ میرے دل کو چھید رہی ہیں..... ایک سیس..... نامعلوم..... خوفناک سیس میرے دل میں پیدا ہو جاتی تھی..... چنانچہ..... رتہ رتہ..... میرے دل میں یہ خیال..... یہ ارادہ..... یوں بکھے کہ یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان آنکھوں سے..... ان پتھروں سے..... نجات حاصل کروں..... جو دیر سے دیر سے میرے دل میں سوراخ کر رہی تھیں۔ ان آنکھوں سے ہمیشہ ہمتی کے







فراق گورکھپوری  
ایم، اے

## خود فراموشیاں

دلوں کو چارہ درد محبت بھول جاتا ہے  
وہاں ہر آدمی اپنی ضرورت بھول جاتا ہے  
حیاتِ محض پا جاتا ہے ناکام محبت بھی  
اقتیت سے گد جاتا ہے مادت بھول جاتا ہے  
جسے راحت زمانے کی شکلیاں کر نہیں سکتی  
وہی دل تیرے جو بے نہایت بھول جاتا ہے  
ہنگامہ شوق میں ہوتی ہیں وہ چنگاریاں پہلا  
کہ حسن شوخ بھی اپنی شرارت بھول جاتا ہے  
غیبت جان اسے دل فرصت دیدار جاناں کو  
محبت کو یہ عہد با فراغت بھول جاتا ہے  
کہاں کا ہوش کیسی بے خودی اس میں اگر  
خود اپنا عشق کو رنگ طبعیت بھول جاتا ہے  
یوں ہی کچھ فرض کر کے اُل لطیف کرم تحب کو  
دل اندوگیں کیوں اپنی حالت بھول جاتا ہے  
کسی ایسا درد غربت بھی ہے لے دل کو گھڑی  
جنون عشق کو بھی جوشِ وحشت بھول جاتا ہے  
وہ کیا ہے جو نہ یاد آ جائے تحریک محبت سے  
مگر کیوں وعدہ روز قیامت بھول جاتا ہے  
تغافلِ حسن میں ہوتا ہے لیکن اس طرح کوئی  
محبت بھول جاتا ہے ہر وقت بھول جاتا ہے  
دل یا اس پر آتا ہے ایسا وقت بھی جس میں  
یکسی دلدہی ہے حسن کی کیسی دل افنائی  
دل دار فتنہ دیدار کی اللہ ری محویت  
گستاخِ عشق بھی اپنی غلامت بھول جاتا ہے  
تین سے گزر کر جس کو ہر عالم نظر آئے،  
تصور میں ترے جو تیری صورت بھول جاتا ہے  
بسا اوقات دل کے ساتھ بار غم اٹھانے میں  
وہ کثرت بھول جاتا ہے کہ وحدت بھول جاتا ہے  
سنا ہے حسن بھی اپنی نزاکت بھول جاتا ہے

فراق اس طرح کھونا رنجِ فزنت میں سجا لیکن

کوئی اس درجہ بھی اپنی حقیقت بھول جاتا ہے

**۱- ایتھوپیائی**

مترجمہ: علی احمد۔

پیکم پرسی

گزشتہ پوسٹ

تے گونجی اٹھی راجہ نے خوف سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا : یہ خوفناک آواز کس چیز کی ہے ؟  
 وہ کہتے ہوئے بولی : کچھ نہیں یہ تو گائی ہوئی ہوائیں ہیں جو بالکل اچھے درختوں میں سے گزرتی ہیں ۔

راجہ نے اطمینان کی ایک لاجبی سانس لی اسے شبہ ہوا تھا کہ شاید اس کے تمام ساتھی اسکی تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے ہیں وہ

”نیلی آنکھوں والی، تو نے اب تک اپنا نام مجھے نہیں بتایا؟“  
تب اس نے کہا: میرا وہی نام ہے جو میری ماں کا تھا۔  
اور راجہ نے پوچھا: وہ کیا تھا؟

عورت نے کہا: بہت دن ہوئے، جب مجھ میں میرے باپ  
نے پٹے پہنے میری ماں کو دکھا تھا، اس وقت وہ ایک بھولوں کی جھادری  
کے پاس گھڑی تھی، اور بھونے کثرت سے اس کے چہرے کے ارد گرد  
اڑ رہے تھے۔ میرے باپ نے دیکھا، اور اسی مناسبت سے اس کا نام  
رکھا، اس کے بعد وہی میرا نام ہوا۔

راجہ نے پوچھا: "آفرود نام کیا تھا؟"  
اور وہ بولی: "الی حستہ۔"

راجہ نے خوشی سے ہنسیوں کو سجاتے ہوئے کہا: یقیناً تیرا باپ بہت غافل ہے۔ تجھ میں اور بھولوں میں کتنی مشابہت ہے اور اس لیے مجھے شک ہوتا ہے کہ تیرا باپ کا قصہ درست نہ تھا۔ اس لئے کہ جس کو اپنی اُن کہتی ہے، وہ کوئی عورت نہ تھی، بلکہ خوشبودار بھولوں کی ایک مجموعہ روح تھی، جس کے گرد بھونرت منڈلا رہے تھے۔ میرا مطلب یہ ہے اسے نیلی انگوٹوں والی راتہ جمع روح تو ہے اور میں بھونرتا :

اس میں پہلے یہ نہ جانتی تھی، لیکن اب جبکہ تو آگیا ہے جس محسوس  
 نے فی ہاں کہ میں اب تک اکیلی تھی۔ اس لئے کہ اکثر جب میں پانی میں پاتا  
 ہوں لکھتی تو اس سے بات کرتی اور چاہتی کہ وہ میرے سوا اور کاجو اب  
 وہ اور کبھی چاندنی راتوں میں اپنے سایے کے ساتھ چلتی اور آواز دے کر  
 کہ میں ہیں جان اپنے آگے اور کبھی میں اپنے ماحول میں کسی چیز کی کمی محسوس کرتی  
 ہوں کہ آواز دہندہ ہوتی، یہ نہ جانتے ہوئے کہ مجھے کیا چاہئے لیکن اب مجھے  
 جس کے کہ وہ تو ہی ہے۔ اور اب جب میں تیری طرف دیکھتی ہوں اور  
 یہ آواز سنیتی ہوں تو میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتی کہ میں تیرے بنا کسے  
 رہتی تھی اور کیسے رہ سکتی ہوں؟

راجہ نے غور سے اسکو دیکھا، اور اپنے دل میں گہرا کہتی بھولی بھولی  
اپنے منہ سے نکلتے ہوئے الفاظ کا مطلب سمجھنے بغیر بوقتِ علی جا رہی ہے  
اپنے شہر میر کے روئیں روئیں سے جھلکتی رہا ہے۔ لیکن وہ نادان  
ہیں جانتی، وہ نہیں جانتی تو نہ ملنے میں تو جانتا ہوں، اب میں محبت  
کے معنی سمجھنے لگا ہوں، اپنے حسن کے اثرات سے بے خبر ہو کر اس نے میر  
لہا کا شعلے کی طرح بھونگ دیا ہے۔

تب وہ بولا: "اے نلی آنکھوں والی! کیا تو مجھے یہ نہیں بتائے گی کہ انگریزیت پانی کے عکس میں جان پڑ جاتی، جیسا کہ تو چاہتی تھی اور وہ عورت نہ ہوتا، تو رانی سخی کے ساتھ اتنی ہی خوش رستی جتنی کہ اب ہے؟"

دو شیزہ نے جلدی سے کہا: "نہیں! اب جو کچھ ہے ٹھیک ہے۔"

ماجد خوشی سے کانپ گیا اور پوچھا: "لیکن کیوں؟"

وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی اور پھر بولی:-

یہ ہیں کہ سکن، کام میں محسوس کرتی ہوں کہ میں اپنی سکھی سے بہتر تھی خوش ہوئی اور کیوں؟ یہ نہیں جانتی، لیکن اس میں ہر ج بگیا اور راجہ جذباتی ہے میں ہوا۔ حسینہ زکوٰۃ کہتی ہے عورت اور مرد کی تسکین کا مقصد ہی ہے۔

۱۰ سنسکرت میں آتی بھوز کے کہتے ہیں یعنی دیا بھول جسکو بھوز ہے جو میں۔

جب اس نے کہا: میں اب بھی تیرا مطلب نہیں سمجھتی:

اور راجہ نے جواب دیا: اسے سمجھ کی جی! تیرے واس میں بھری ہوئی سیسوں کو لگھٹانا چاہیے۔ اس لئے کہ وہ تجھ سے بھری ہوئی ہیں لیکن۔ لگھٹانے کی باتیں بہتیں کہا جاسکتا اب تو غالباً تو سمجھتی ہوگی کہ میں غلطی پر نہ تھا کہ جب سے میں تیرے تو اس جنگل میں ملے ہیں برسوں گزر گئے تیرے لئے کہ میں اپنی زندگی کے تمام واقعات کو بھول گیا ہوں اور جیسا کہ میں پہلے بھی کہ چکا ہوں، میری زندگی تو اسی وقت سے شروع ہوتی ہے جب سے میں نے تجھ کو دیکھا ہے اور تیرا بھی یہی خیال ہے کہ مجھ سے پہلے تیری زندگی بالکل بے لطف اور تنہا تھی۔ گویا ہم دونوں اب تک سو رہے تھے۔ ادا جیکہ ہمارے جنوں کی سنہری صبح ہو چکی ہے، ہم بیدار ہو رہے ہیں، اب ہم ایک ساتھ مل کر کھیں گے۔ میں راجہ ہوں گا، اور تیرا میری رانی ہوں گی کیونکہ کبھی راجہ اور رانیوں کے لئے بھی تھے ہیں؟

وہ بولی: ہاں! میرا باپ جب عبادت میں اتنا مصروف نہ رہتا تھا تو وہ مجھ سے راجا ہوں اور میں انہوں کی کہانی سنایا کرتا تھا:

اور راجہ نے کہا: اگر میں کہوں کہ میں راجہ ہوں، تو کیا تو میرے ساتھ چلے گی اور میری رانی بنے گی؟

وہ ہنسی اور بولی: لیکن میں رانی کیسے بن سکتی ہوں؟ نہ تو مجھ کو رانی کے کام آتے ہیں اور نہ رانی کا سلیقہ!

راجہ نے پوچھا: بھولی رانی! اگرچہ تو نہیں جانتی، لیکن تجھ میں رانی کی تمام خوبیاں ہیں۔ اور رانی کے فرائض ہیں ہی کیا ان کا سیکھنا تو بہت آسان ہے۔ اور اس زندگی میں اتنے عیش و آرام ہیں کہ تو ان کا قصہ بھی نہیں کر سکتی۔ میرے ساتھ مل کر تمام باتیں میں سمجھو سکھا دوں گا جو رانی کو جانا چاہیے اور اگر تو چاہے تو میں اسکا ایک خیالی نقشہ تیری آنکھوں کے سامنے ہوا میں کھینچ سکتا ہوں اور یہ تیری زندگی کا آئینہ ہوگا جس کی تندہ دیر امکان ہے تجھے مدہوش کر دے۔ اس ندی کی چمکتی ہوئی سطح پر کیا تو نے کبھی جاپوں کو نہیں دیکھا۔ ہر جانب اپنے اندہ ایک چھوٹی سی دنیا رکھتا ہے اور آسمان کی زمینوں کو کچھ دیر غمکس کرنے کے بعد بھوٹ جاتا ہے۔ لیکن آسمان دیے ہی باقی رہتا ہے۔ یہی حال میرے کئے ہوئے فتنے کا ہوگا، یہ لفظوں کی بنائی ہوئی رنگین دنیا ہے جس کے ساتھ ہی مثل حباب کے ختم ہو جائے گی۔ لیکن اس کے رنگین نقوش تیرے دماغ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ رہ جائیں گے:

تب اس نے کہا: چھاپ اپنی تصویر کھینچ، اور مجھے اپنا سورگ دکھا: وہ سننے کیلئے تیار ہو گئی اور اپنے گال کو تھیلی کا سبب اور دیکر استعد

سبیدہ نظر سے راجہ کی طرف دیکھا۔ کہ وہ کاتب الشاہ پر ہوا، نیلی آنکھوں والی، آمیری رانی بن جائے، جس کو ایک عالمیاد میں رکھوں گا۔ اور اس کو تیرے واسطے سات منزلہ اور پانچاؤں گا جس کے بل بوتے پر وہ اور چاندی کے ہونگے، ہم میرے ساتھ سنگ مرمر کی ہوئی سیر جیوں پر چڑھنا، اور تیری چہرے سے بہنے ہوئے نریش پر چلنا یہ وہ اجڑی زمین تیرے ان نازک پاؤں کو زیب نہیں دیتی، تو میری رانی بن جا اور میں تجھ کو اون اور دشمن کے کپڑوں سے ڈھکتا دل گا۔ تو اس نریش کی دھاریوں کا رنگیں لباس تجھے بہت زیب دے گا اور اس میں تیرا لہجہ جاپو ایسا دکھائی دے گا۔ جیسے سورج نکل آیا ہے۔ زریں آنکھیں، ادا میں تیرا عریاں حسن اور نکھر جائے گا، آمیرے ساتھ مل کر میری گردن اور بازوؤں کو جو ابروؤں سے بھر دوں گا، اور تیرے کھینچنے سے سندھ کے خزانوں سے سانچی موتیوں اور سیسوں کے انارنگ گہوارے اور اگر سونے کے چھپانے سے تیری نازک آنکھوں سے خون کا ایک تودہ بھی ٹپکا تو اس کی تلافی میں ایک لعل سے کروں گا، اور اگر آنسو کی کوئی ہول تیری ان نیلی آنکھوں سے ٹپکے گی تو اس کو میریوں سے تولی دوں گا۔ نیلی آنکھوں والی! میری کینز تیری خدمت کریں گی، سوئے کے ہنوں میں تجھے کھانا کھلائیں گی، اور تیرے گلاسوں میں تیرے پینے کیلئے پانی ڈالیں گی، اور جب تو چاہے گی تو وہ اپنے دلوانہ نقوش سے تیرے کان خبر دےں باغی تجھے اپنے اوپر جٹا کر مستی میں مچھو میں گے اور اگر تو چاہے تو مجھ کو کشمیر میں مچھ کر کنول سے لدی ہوئی نبروں میں گشت لگانا یا بہت سے زیادہ نرم بستر پر لیٹ جانا، اور دوپہر کی گرمی میں تیری خادیاں تجھے خوش کے کچے جھلیں گی، آنکھوں والی! اس لئے کہ میں تیرے کعبہ نہیں رہ سکتا، اور سب سے زیادہ یہ کہ میں خود تیرے پاس ہر وقت موجود رہوں گا، اور تیری خدمت کروں گا۔ میں تیری رنج کو آب حیات بن کر دوں گا، پھر افسانوں اور سپنوں کی صلیب پر خوشبوؤں میں غرق کر کے سولوں اور جذبات کی جھیلوں کے مقطر اور لطیف نرہتوں میں رنگ دینگا میں تیرے حاصل کرنے کے لئے ساری دنیا کو تیرا لاکروں گا، اور ان میں سے کی کوڑوں سے لطف اندوز ہوں گا، جن کو تیری نیلی آنکھیں منکشی کرتی ہیں راجہ حقنی در تیک کتنا ادا وہ اس کو گھورتی رہی اور جب جھپٹا ہوا ہوگا تب بھی وہ کچھ دیر تک اس کو اسی طرح دیکھتی رہی، پھر کیا ایک اسکی جگہ میں راجہ کے چہرے سے ہرٹ کر زمین میں گر گئیں، دراز مڑ گئیں کہ چاؤں میں اس کے گالوں پر ایک رنگ ادا تھا، اور ایک جا رہا تھا

مبہدہ ہوئی۔



نہیں، تو میری جہنی ازار ہے اس لئے کہیں ناخبر بہ کار ہوں  
بہ نہ تو کتاب ہے ترے الفاظ صرف حباب ہیں، سند، مگر جو بی ایک  
سے سے نکراتے ہیں، بھوٹ جاتے ہیں یہ بخش و حو کا ہیں۔  
راجہ نے متعجب ہو کر کہا: ہر اسے ساتھ! میں اپنی رانی کو، خوش  
سے لئے اور کیا کر سکتا ہوں؟  
لج، یہ وہ خاموش رہی، لہجہ اپنی نگاہیں، اسی طرح زمین پر جہائے ہوئے

۱۰۰ کہ نو سیرے باپ نے بھی ایک رانی کا ذکر کیا تھا، جس کے حالات  
یہ بتائی ہوئی رانی سے بہت مختلف ہیں۔ وہ ساقیہ تو ہیں مجھ سے نہیں کہہ  
تے۔ اس لئے کہ میں کوئی پندت نہیں ہوں، لیکن اس نے مجھے ایک راجہ  
نہ کہلی سالی تھی، جس کو دس سال کا لڑکا لایا گیا تھا، اور جب مصری کے ساتھ  
سیوں نے اسے ٹھکرا دیا، تو صرف ایک ہی ہستی نے اس کا ساتھ دیا، وہ  
رانی رانی تھی، اس رانی نے جلا وطنی میں، اس کی سیوا کی، اور سامنے کے  
ہاتھ، اس کے ساتھ بن بن کی خاک جھاتی رہی، جیسا تو نے کہا ہے اس  
نے تو نہ کی کو کوئی لطف نہیں اٹھایا، بلکہ خود کو اپنے ہی راجہ کی قسمتی کو سزا  
تیرے خیال میں اس وفا کی دہری کے لئے وہی سب سے بڑی خوشی تھی،  
راجہ وہ مگر کیا، تو وہ اس کا ماتم کرنے کے لئے زندہ نہیں رہی، بلکہ اس کے  
ساتھ خود بھی آگ میں جل گئی۔

(۴۴)

راجہ جیت سے سستار رہا اور جب اس نے پورا قصہ ختم کیا، تو اسے  
پہلی سمرت سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیر تک دیکھتا رہا، وہ نظریں نمی  
سے جھپکی، شاید وہ اپنے کہے ہوئے الفاظ سے خرم نہ تھی۔  
راجہ نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا:

میں آنکھوں والی! تیرے چٹانے جو کچھ کہا ہے وہ ٹھیک ہے، لیکن  
میرا طریقہ تعلیم جہاں ہے۔ میں نے اپنی رانی کے شغل جو باتیں کہی ہیں، وہ بھی  
غیب ہیں۔ اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اپنی رانی کا جو انتخاب  
کیا ہے، وہ بہت ہی موزوں ہے۔ لہذا اب تو گمراہی میں تیرا چیلہ اب تو مجھے  
۱۰۰ قریب بتا، جو میں نہیں جانتا!

جنگ کی رانی کس کھلا کر ہنس پڑی یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں  
آنسوؤں کے قطرے چھلکنے لگے اور پھر بولی:۔  
"تو میرا غائی اڑانے لگا، میں جنگ کی رہنے والی ایک ایسے پرش  
و کیے تعلیم دے سکتی ہوں، جو شہروں کا رہنے والا ہے؟  
اور ماہر نے جلدی سے کہا: نیلی آنکھوں والی سندھی! یہ سچ ہے۔

لیکن تو نے مجھے اب تک بہت سی چیزیں ایسی سکھا دی ہیں، جن سے  
میں پہلے واقف نہ تھا۔ اس لئے کہ شہروں کی رہنے والی روحیں بری صورتوں کی  
وجہ سے گھٹت ہو جاتی ہیں، ہر غلام اس کے تیری بڑھتی اتنی ہی پاکسے  
جتنے تیرے بالوں میں لگے ہوئے پھل ہاں، تو نے رانیوں کے شغل کو مجھے  
بہت سی نئی نئی باتیں بتائیں۔ اب کچھ راجا کے افسانے بھی سمجھا، علاوہ اس  
کے یہ بھی سمجھا، کہ جس کو تو اپنے جیون کا ساتھی بنانا چاہتی ہے، اسے کیسا ہونا  
چاہیے؟

ایک حد تک وہ اس کو دیکھتی رہی، پھر چٹا ہنسی کر لیں، راجہ نے دیکھا  
کہ اس کی چاندی سی گردن میں خون تیزی سے چڑھنے لگا، اور سیاہ بالوں کی  
جڑوں تک ہنسیکھڑا ہو گیا۔ جیسے شغل کی لالی شام کو ورپ کے افق پر  
پھیل کر گردن کے ختم ہوتے ہوئے رات کی تاریکیوں میں گم ہو جاتی ہے۔  
ایک بے خودی کے عالم میں راجہ نے اپنے دل میں کہا:

"اوہ! یہ چاندی معصوم دیوی رات کی اس شرمیلی ہوئی تاریکی میں  
مجھے محبت کی صبح سے پہلے اس سورج کی کرنوں کے تصور میں غرق ہے جس  
کو، اس نے کبھی نہیں دیکھا، اور اب میں خود کو اس کا خوش نصیب کہہ سکتا ہوں  
کہہ سکتا ہوں، اس لئے کہ میرے سوال سے اس کے بدن میں خون کی گردش  
تیز ہو گئی ہے۔ لیکن اب ایک بے ربط سوال سے میں اپنی ہرئی کو چھوٹا کر سکتا  
ہوں، دیکھوں وہ اس کا جواب کیا دیتی ہے؟

۱۰۰ راجہ نے کہا: نیلی آنکھوں والی چھٹی رانی! اگر میرے الفاظ  
تیری دوشیزگی کے جذبات کو شمس لگی ہے، تو مجھے معاف کر، یہ جاننا  
میرے لئے کافی ہے، کہ ایسا راجہ جو تیرے جیسے پاک خیالات رکھتا ہو  
وہی تجھ میں رانی کے لائق ہے۔ اور اس کو دنیا کے تمام مردوں سے مختلف  
ہونا چاہیے۔ جیسے کہ تو خود دنیا کی تمام عورتوں سے جدا ہے۔

نگاہوں کو اسی طرح زمین پر جہائے ہوئے اس نے مدھم آواز میں  
جواب دیا:

"آخر میں دوسری عورتوں سے کن باتوں میں مختلف ہوں؟  
اور راجہ بولا: "نیلی آنکھوں والی! یہ پوچھ کر کن باتوں میں تو ان سے  
ملتی جلتی ہے؟ اس لئے کہ اختلاف تو اتنی باتوں میں ہے، کہ ان کا جہان کرنا  
ایک طویل داستان ہے، میری عمر تو چاہے تو میں کوشش کروں گا، کہ  
ان میں سے چند کا ذکر کروں، تاکہ معلوم ہو جائے، کہ تو اپنی صفت سے کتنی  
مختلف ہے؟

عورت نے کہا: "ہاں کہہ میں اس اختلاف کو جانتا چاہتی ہوں؟  
راجہ نے کہا: "اچھا اب میری طرف دیکھ، تاکہ میں کہنے سے پہلے جھکوں

خوسے دیکھ لوں<sup>۲</sup>

جنگل کی دو شیرازے اپنی آنکھیں، شاخیں پھر مسکرائی، پھر ہنسی اور نیچے نیچے لگی۔

تب راجہ نے کہا: نیلی آنکھوں والی! ہر عورت حور ہے اور تو بھی ان میں سے ایک ہے۔ یہی ایک خاصیت ہے جو تجھ میں اوتیری صفت میں مشترک ہے۔ اس کے سوا تیری ہوا میں ایک خاص معصومیت ہے جو جنگلوں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس لئے کہ نیلی آنکھیں تو سبھی رنگت میں لیکن تیری آنکھیں نیلی تری ہیں، ان کے ہونٹے سرخ ہیں لیکن تیرے گہرے سرخ، ان کی ہنسی سیاہ ہیں لیکن تیری بہت زیادہ سیاہ۔ ان کی ہنسی دلاور ہے لیکن تیری ہنسی پھول برساتی ہے۔ ان کے بال کاٹے ہیں لیکن تیرے بالوں کی سیاہی آدمی رات کی سیاہی سے زیادہ ہے۔ تیری گفتگو بہت میں جسم اور تیرے جسم میں فخر ہے۔ اور یہ باتیں سوا میرے کسی کو حاصل نہیں، اور سب سے بڑی خوبی یہ کہ تیری جنس کی دوسری لگتا ہے، عقید اور تو آزاد ہے۔

جب راجہ رک گیا تو وہ بولی:

لیکن مجھ میں کوئی خاص بات ہے، میں نہیں سمجھ سکتی:

اور راجہ نے کہا: پیاری! میں تجھ سے بیان نہیں کر سکتا حالانکہ تجھ میں اور ساری عورتوں میں جڑاوت رکھ کا وقت ہے وہ چلی ہوئی آستریاں، انسانی پنجوں کی زد میں رہ کر سر پا نقش اور بنادٹ ہو کر رہ گئی ہیں، لیکن تو جو آزاد عورتوں کی طرح جنگل میں گھومتی پھرتی ہے، قدم تیرے کی سادگی کا مکمل نمونہ ہے، اور یہ بات کسی کو حاصل نہیں تو ایک جنگلی انگور کی سیل ہے، جو راجہ کے باغ کے پھول مادہ دھنوں پر پڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ تیری نیلی آنکھوں میں اب تک معصوم بچوں کی سی معصومیت نظر آتی ہے باوجود اس کے تیری جوانی کا عالم شراب خند کے جوش، دھلکے کے پھٹ پڑنے والے شباب کی مانند ہے، میں نہیں جانتا، کہ اپنا مطلب تجھے کس طرح سمجھاؤں لیکن دیکھ جو جوں شام ہوتی جا رہی ہے نہ ہی کے پانی کی رفتار سست اور ہوا کے جوہر کیوجہ سے سلی ہوا ہوتی جا رہی ہے، دیکھ! اور ادھر تیری جوتی بطور کا عکس پانی میں پڑ کر کسا متکس ہو رہا ہے۔ اور وہ ان ابھری چٹانوں کے پاس راجہ ہنس کا جو لگتا ہے معلوم ہوتا ہے نیلی آنکھوں والی! یہ قدم تیرے تمام سناو تیری ایک اداسی پوشیدہ ہیں تو مجھ سمجھتا ہے، اس لئے مجھے ڈر ہوتا ہے کہ کبھی تو اپنے ہم جنسوں کی صحبت حاصل کرنے کے لئے کیا کپ پانی میں نہ کود پڑے، اور مجھے اس جنگل میں تنہا چھوڑ کر غائب نہ ہو جائے۔ . . . .

اور ابھی وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ پھر کچھ کھڑکڑاٹ ہوئی، اور ساری فضا گونج اٹھی، راجہ نے بے چین ہو کر جنگل کی رانی سے پوچھا: یہ کیا ہے؟ تب وہ بولی: یہ مرغابوں کے پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز ہے جو رین بیکہ کیلے جنگل کو لوٹ رہی ہیں:

(۵)

راجہ نے اطمینان کی ایک لانی سانس لی، جیسے کسی ٹرے غلب سے اس کو نجات مل گئی۔ دو شیرازے اس کی بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے کہا: تو کیوں ڈرتا ہے؟ آخر تیرے ڈرنے کا سبب؟

اور راجہ نے جواب دیا: پیاری نیلی آنکھوں والی! ہاں میں ڈرتا تھا، صرف اس لئے کہ کوئی ناگوار واقعہ ہماری گفتگو کو فخر نہ کر دے، اور کہ مجھے موت سے خوفزدہ نہ ہونا چاہیے۔ جبکہ میں جانتا ہوں کہ میری زندگی کی ابتداء تجھ سے ملنے کے وقت سے ہوئی ہے۔ اور اب موت ہی ایسی چیز ہے جو تجھے تجھ سے جدا کر سکتی ہے اور ایک کجوس کی طرح میں اس دولت کو جو تجھ سے گفتگو کر کے حاصل کر رہا ہوں، ہر لمحہ کھودینے کا خوف رکھتا ہوں، اسی لئے میں ذرا دیر سی آزاد ہو چکا ہوں، اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، مجھے خوف ہے کہ تو کیا کپ پانی میں کود کر غائب ہو جائے، اور کچھ کہتا ہوں، سیرلس ہے تو میں تجھ کو کسی غائب ہو جانے کے خیال سے گھوڑے کی طرح کسی طرف سے باندھ دوں؟

وہ ہنسی اور بولی: اب اس کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ میں تجھ سے جدا لگتا نہیں چاہتی، اور میں کوئی پھلی تو نہیں ہوں کہ پانی میں کود جائوں تب اس نے کہا: پیاری! کیا تیرے باپ نے کسی تجھ سے ان پروں کا ذکر نہیں کیا، جو پانی کے اندر چلی ہیں؟ اور اگر نہیں کہا تب بھی میں تم کو ان میں سے ایک خیال کرتا ہوں، جو مجھے دھوکا دینے کیلئے پانی سے باہر نکل آئی ہے۔

اور اس نے پوچھا: لیکن تیرا ایسا خیال جو اکیس؟ راجہ نے کہا: اس لئے کہ وہ پرہیز خواہ عورت ہوتی ہیں، جیسی کہ ہے اور تیری طرح وہ بھی چٹیوں اور نہروں کے قریب بیٹھی ہوتی نظر آتی ہیں اور وہ میری طرح بھٹکے ہوئے مسافروں کو لہسا کر انہیں تنہا ویراں کر دیتی ہیں، اس لئے سنجیدگی سے پوچھا: اور وہ کس طرح مسافروں کو تنہا ویراں کر دیتی ہیں؟

راجہ بولا: نیلی آنکھوں والی! وہ خود کو تھوڑی دیر تک دھک کر غائب ہو جاتی ہیں، اور پھر کسی واپس نہیں آتی، یہ بہت دھن والیاں تنہا نہیں جاتیں، بلکہ اپنے ساتھ اپنے برصفت شکاریوں کا دل بھی لے لیتی ہیں

کچھ دیر تک وہ اس کو دیکھتی رہی پھر کہا : دیکھو ! جو کچھ مجھے کہنا تھا  
میں نے کہا یا نہیں تو نے مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا اور کیا حقیقت میں تو کوئی  
واجبہ جو کہ اپنے سہا پیوں کو میرے متعلک کے چاروں طرف مقرر دیکھا  
مجھے اپنے دل میں کہا : یہ بہت چالاک معلوم ہوتی ہے اور  
مجھ کو پرکھنا چاہتی ہے لیکن ابھی میں یہ نہ بتاؤں گا کہ میں کون ہوں اس لئے  
کہ معلوم ہو جائے کہ وہ کجائے میرے میری سلطنت سے محبت کرنے لگے  
گی اور مجھ اس سے کہا :

یقیناً جیسا کہ ہم میں پہلے وعدہ ہوا تھا، اگر تو مانی ہے تو میں راجہ  
ہوں، اور میں کسی آدمی کو اپنی رانی کے پاس نہ آئے دوں گا، میں ایکٹ بھی  
ذات کو ہوں اور راجپوت ہوں، اپنے فائدہ میں ہر شے کرے گا، کیا بھی اچھا  
ہوتا، اگر پہنچ میں کوئی راجہ ہوتا اور مجھ کو دیا جاتا، لیکن کیا تو ایسی  
حالت میں میرا ساتھ دیتی، جس کا کہ تو نے کہا ہے؟

وہ ہنسی اور ہنسی نہ تھیں! لیکن ابھی میں تیری رانی نہیں ہوں میں  
 قریبے ساتھ کیوں گھر نے لگی؟ یہ تیری رانی لہو رانیوں کا کام ہے؟  
 راجہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دل میں کہا: کیا یہ بلا سوچے  
 سمجھے باتیں کر رہی ہے، یا قہراً مجھے پریشان کرنے کو کہہ رہی ہے یا رشک  
 سے یہ جانتا چاہتی ہے کہ میں کسی اور سے تو محبت نہیں کرتا، مگر اس سے  
 مخاطب ہوا۔

نعلی آنکھوں والی! قطع نظر اس کے کہ میں راجہ ہوں یا نہیں! یہ یقینی ہے کہ سوا تیرے نہ میری کوئی رانی ہے نہ رانیاں۔ سچ تو یہ ہے کہ نہ تو دنیا میں اب تک میں نے کس استری سے پریم کیا ہے اور نہ کسی کو اپنی مافی بنا چاہا ہے۔ اس لئے کہ اب تک تو نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا کہ میں اتر حقیقت میں راجہ ہوں، تو تو میری رانی بننا پسند کر گئی؟ اور اس نے کہا: میں بھی ایک اعلیٰ خاندان کی ہوں اور آراہوں

لیکن اس بات کا قطعہ میں خود نہیں کر سکتی میرا نام . . . . . ۷

اسی جملہ ختم بھی ہو اٹھا، کہ وہ زور سے چلائی اور کھڑی ہو گئی راجہ  
خون سے اسکی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھا، میری رانی تجھے کیا ہوا؟  
وہ اس کے قریب ہو گیا، اور دیکھا کہ اس کا چہرہ کھٹائے ہوئے  
پھول کی طرح نمد ہو گیا ہے، پھر بے قرار ہو کر پوچھا۔  
"انی جیستہ! کیا معاملہ ہے؟"

لیکن وہ مجھے بتولی تھی کہ کوئی شہر تو ہے، جیسے کہ وہاں کوئی مسجد، منار،  
راجہ اس کو محبت اور یاس سے دیکھتا ہوا درگاہ تک کھڑا رہا۔ غلام کا وصف  
دلت، بدتمیز، بدمعاش اور بدکار تھا۔

یہ بت کے دیوانے انکی تلاش لہہ انکی یاد میں ہمیشہ بھگتے رہتے ہیں۔ اس لئے  
انہی آنکھوں والی پری میں تجھ سے پھر کہتا ہوں کہ اب جبکہ تو نے مجھ  
سے سو کر لیا ہے۔ تو مجھ ہمیشہ میرے ہی ساتھ رہنا ہوگا۔ وہ نہیں اپنی  
خافوں کی طرح تباہ و برباد ہو جاؤں گا۔ اور اگر تجھے یہ مسئلہ نہیں تو بتاؤ  
میرے ساتھ کیوں آئی؟ اور ڈاکوؤں کی طرح ایک راہ گیر کو روٹ کر  
نہیں جھٹرائیگا کہنا۔

قبیلہ ہنسی اور اس ہنسی کا نغمہ راجہ کے کانوں میں گونجنے لگا۔

لیکن اگر وہ پانی سے کچھ دیر کھینے باہر نکلتی ہیں تو اس میں ان کا قصور لیا رہ یہ ہرگز نہیں چاہئیں کہ جھولے بچکے مسافر آئیں دیکھیں اور تباہ ہوں ۔۔۔ پیسہ بڑی خطا ہے کہ تو نے مجھے دیکھا۔ یہ تیری غلطی ہے کہ تو میرے بچکل میں آگیا۔

راجہ نے مجھ پر انکڑا کہ: نیل آنکھوں والی! میں تجھ پر کوئی الزم نہیں لگاتا،  
میرے اس بات کی درخواست کرتا ہوں کہ تجھ کو اس جگہ میں تنہا چھوڑ کر  
میری بیوی کو نہ بٹھانا۔

اور وہ بولی یہ لیکن کیا مجھے اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں کرنا چاہیے کہ  
میرے بچے کو ہلا جائے گا کیسا ستری ہی سر اس پر فریب اندہ ہو گا ہے اور کیا  
لی کی رہوں گی طرح مانی کے مرد نہیں ہوتے ؟

مہاجرین کے مطالبہ پر کہ کہ جواب دیا: نیکو آنکھوں والی سنسکی!

جواب: "یہ سب پہلے دیکھ لی، اور شہزادہ امیرنگاہوں سے اٹھ  
دھتے ہوئے گولی دے۔"

”کیا تو نے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ دنیا مردوں سے بھری ہوئی ہے؟“  
 ”ان میں سے ایک مرد آج اس مجلس میں آیا ہے۔ توکل دوسرا  
 میرے گاہک“

راجہ چونک پڑا اور اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ پھر اپنے  
 دل میں کہا۔ ہاں! وہ مجھ کو افسانہ حال دے رہی ہے اور ایسا کرنے میں وہ  
 اتنی تسلسل معلوم ہو رہی ہے، عورتوں کی یہی فطرت تو انہیں جاذب نظر  
 بنا دیتی ہے۔ اور عجب تو یہ ہے کہ جھگل کی رہنے والی اس دوشیزا نے  
 ہنر صنف کی یہ ادائیں کہاں سے سیکھیں۔ تب اس سے مخاطب کر کہا کہ  
 ۔ آپہرے کی خوبصورت مینی! اپنے دوسرے آنے والوں کو خبردار کر دو  
 اسلئے کہ میں جھگل کے اطراف میں اپنے سپاہیوں کا پہرہ متحد کر دوں گا  
 اور جگہ دوں گا کہ وہ دوسرے آنے والے تو نہ کر دے گا۔



میرے غم کو بڑھانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اور اپنی ناجائز ترغیب کے ذریعہ چاہتے ہو کہ میں اپنا ارادہ بدل دوں۔ جاؤ، چلے جاؤ، اس لئے کہ میں اپنا ارادہ نہیں بدل سکتی۔

جنگل کی رانی جب یہ کہہ رہی تھی تو اس کا چہرہ اکودا کے بھول کی مانند درد پر گین تھا۔ درخت کا سہارا لیکر وہ کھڑی ہو گئی، اس کی آنکھیں چامکیں میں ناموں کی طرح چمک رہی تھیں۔ چہرہ ہلکا ہوا،

”جاؤ، پناہ گز، لیکر چلے جاؤ، اس لئے کہ میرا فیصلہ میرے لئے بہت جاگسل ہے۔ شاید میں اسے دیر تک پروا شاف نہ کر سکوں۔ اور اس طرف ایک بھولی عورت کو بھگائے جانے کا الزام تھا۔ اسے ہی مہر جوگا راجہ اسکو مت سے گھورتا رہا۔ پھر اپنے دل میں کہا،

”بھولی جنگل کی درد شیرہ جو کچھ دیر پہلے میرے پاؤں کے پاس بیٹھی تھی، میں نے اس کی باتیں کر رہی تھی، اب اسکی جگہ میں ایک ایسی عورت کو دیکھتا ہوں، جس کے پاگ جذب بات کو میں نے نہیں لگائی ہے۔ جو بگڑی ہوئی رانی کی طرح مجھے چلے جانے کا حکم دے رہی ہے۔ اور میں ایک مجرم کی طرح اس کے سامنے کھڑا اپنی ناکامی پر ہنس رہا ہوں۔“

پریم کے سندھ بننے میں کھو کر خود کو وہ اس دیوی کے قدموں پر گرنا دیکھا جاتا تھا، اور کیا جنگل گھوڑوں کی ٹاپوں کی صدادے کوئی گھٹا اور چند گھنوں میں دیکھنے دیکھتے سواروں کی ایک بڑی جماعت نے جنگل میں سے نکل ان کو گھیر لیا۔

(۷۷)

ایک چنچ مار کر لائی تپتا پچھے بٹ گئی اور حیرت سے کہیں راجہ اور کہیں اس کے سپاہیوں کو دیکھنے لگی۔ راجہ نے مفردانہ انداز میں خود سے کہا،

”میں اپنے ساتھیوں کی اس بے جا مداخلت کو معاف کر دوں گا۔ اس لئے کہ میری بھولی رانی اسوقت بالکل اس بارہ سلگنے کے مانند معلوم ہو رہی ہے۔ جو شکاریوں کو دیکھ کر جو کڑی بھڑنا بھول گیا ہو۔ اور جس کی خراب صورت تپتی تپتی ناگہیں خوف سے کانپ رہی ہوں۔ اور جس کا بے بس حسن بھیا کرنے والے کے دہن میں گھر کر جا رہا ہو۔ میرے ساتھیوں کی گردنیں بھی اس کے آگے خم ہو گئی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا پر محبت کرنا والی چیز صرف حسن ہی ہے۔ اس لئے کہ اگر میں ان کے لئے اجنبی ہوتا، تو یہ کہیں میرا خیال نہ کرتے۔ یہ خفا اس کے میری نیلی آنکھوں والی رانی کے حسن سے متاثر ہو کر وہ سب اس کے غلام بن گئے ہیں۔ جیسا کہ ایک نظری میں خود اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔“

لے اپنے مقابلہ میں اسکو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتا۔ لیکن مگر وہ اپنی بات پر یام سہے اور میری بات نہ لے۔ تب میں جاؤں گا۔ یہ سیر بائیں دیا ہے۔

اور تب وہ اس سے مخاطب ہوا، ”انی چھبتا! اس روز الگ کا خیال چھوڑ دے جو کالی۔ سبھی کے مانند یکا یک یکا ہماری سیرت کے پہلے پہلے بلے کو روک دے گا اور ہم دونوں کی آٹھائیں ان سے گزرنے والی بکلیوں کی تھوہو جائیں گی۔ اور وہ دانک یہ ہے کون۔ جو مقدم سے یونٹا کو کھیت سے دیتا ہے لڑنا چاہتا ہے۔ اور کیا میں تجھ کو مجبور نہیں کر سکتا۔ اور اس کا خیال چھوڑ دے۔ جسکو تو نے کبھی نہیں دیکھا۔ اور ایٹور ہونے اس کا کہیں وجود ہے بھی یا نہیں؟ جو سکتا ہے کہ وہ تیری ماں کا کوئی سہ پنا ہو۔ تو کیا اس پھنے کی خاطر تو اپنی اور میری دونوں کی آٹھائیں کا خون کر دے گی۔ وہ ایک طرح کے لئے روکا اور پھر کہنے لگا دیکھ تو کھیت کی شکست میں اچھ کر تو نے اب تک کوئی رائے قائم نہیں کی، بالکل اس بھول کی طرح جو باد تھا لکھتے پھیروں سے لہہ رہا ہو، تو بھی ایک بھول بنے۔ اور بھول ہی تیری قسمت کا فیصلہ کرے گا۔ یہ نیلا کنول جسے تیرے بیٹے کا ذوق حاصل ہے، یقیناً اسے تیرے دل کا راز معلوم ہو گا۔ اور یہی اب ہمارا رہبری کرے گا۔“

یہ کہتے ہوئے راجہ اس کی طرف جھبک گیا۔ اور آہستہ سے بغیر اس کے جسم کو ہاتھ لگانے کنول کو لے لیا۔ وہ اسی طرح خاموش کھڑی ہی رہا۔ راجہ بولا، ”ایک پتھر دی تیرے لئے۔ اور دوسری میرے لئے۔ اس میں پتھر دوں گے کیے بعد دو گجہ اکڑوں گا، ایک تجھ کو دوں گا۔ اور دوسری میرا لیتا جاؤں گا۔ اور اگر آخری پتھر دی تجھے لے۔ تو تجھ کو میں رہنا ہو گا۔ میں اکیلا جاؤں گا۔ اور اگر آخری پتھر پر ختم ہو تو تجھے وہ دانک کو چھوڑنا ہو گا جس طرح کہ لٹنے والا بھول اپنی شاخ کو چھوڑ دیتا ہے اور میری تپتی جگر تجھ کو میرے ساتھ چلنا ہو گا۔“

تب وہ ایک ایک کر کے پتھروں کو بھول سے جدا کرنے لگا۔ جو زمین پر گر کر منتشر ہو گئیں، اور جب وہ شمار کر رہا تھا، تو رانی چھبتا اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے اسکو دیکھتی رہی۔ میان تک کہ کنول میں لٹا ہوا پتھر ہی باقی رہ گئی، اور وہ راجہ کے جیسے کی تھی تب یکا یک وہ مسکرائی اور بولی،

”اوه! تم بہت جاگالک معلوم ہوتے ہو۔ اور ساتھ ہی ساتھ بیدار بھی نہیں معلوم تھا کہ کنول میں صرف سولہ ہی پتھریاں ہوتی ہیں۔ اور آخری تھیں پر ختم ہو گئی، اتم بڑے بے رحم ہو، اور خود غرض بھی، اس لئے کہ



سید مقبول حسین  
لاہور

# شکوہِ عہت

ہم محو رہے، بیخود رہے، وہ دادِ محبت دے بھی گئے  
لیفیتِ غم کا شکوہ عہت جو دے گئے تھے وہ لے بھی گئے

(۱)  
یہ آرزو اب تک دل میں ہی  
آنکھوں سے لگاتے قدموں کو  
اور اشکِ رواں سے جی بھر کے  
اے کاش و حلائے قد و دل کو  
اس دل کی تمنا کر کے سوا وہ آئے بھی اور چلے بھی گئے  
ہم محو رہے، بیخود رہے وہ دادِ محبت دے بھی گئے

(۲)  
اے بادِ محسوس پھولوں کی قسم  
اس منزلِ پاک سے ہر جو گندہ  
کہنا کہ بہت اب خواہر ہیں ہم  
ایسے کر نہیں کیے اپنی خبر  
تمنا سچی عمل جو شکار گیتی، افسوس کہ اب اس سے بھی گئے  
ہم محو رہے، بیخود رہے وہ دادِ محبت دے بھی گئے

(۳)  
خاموش ہوں اب کیا منہ سکوں  
وہ طاقت گو یا نہی ہی نہیں  
دکھلاؤں کے یہ حصالِ نبیوں  
وہ جذبِ مسیحا ہی نہیں  
یاں شرمِ عبودیت نہ رہی، وہ اپنی امانت لے بھی گئے  
ہم محو رہے، بیخود رہے وہ دادِ محبت دے بھی گئے

پروفیسر کنبہا لال کپور  
لاہور

## علامہ ظہور

کہ تو کم کو یہ جاننے کی اتنی ضرورت نہیں کہ علامہ کون کونسی سہزادیاں زیادہ پسند فرماتے تھے جتنی اس امر کی کہ اتنے پسندیدہ مہلوں کے نام کیا تھے چنانچہ اسی دن انہوں نے اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر ایک نہایت دلچسپ مضمون لکھا کہ علامہ انجمن اہل علم کے چاہ اور شوق سے کھاتے تھے۔ مہجور ان کا سن بھاتا پھل تھا مگر انار سے انہیں ادنیٰ نفرت تھی، لیجئے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ جب وہ میرے دیوان خانے میں بیٹھے تھے، میں نے غلطی سے انہیں ایک قندھاری نارپیش کر دیا، اس کو دیکھتے علامہ کو مثالی شروع ہو گئی، اور پورے دو گھنٹے کے بعد شکل سے انکی طبیعت سنبھلی:

(۲)

تعب کی بات یہ تھی کہ جیسے جیسے دن گزرتے جاتے، علامہ کے دوستوں کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا، ان کے دوستوں کے زمرے میں ہر قسم ادب ہر شعبہ کے لوگ شامل تھے، پروفیسر ادیب، محکم، ہنساری، سماجی باورچی، سائنسٹ، مضمون نگار، چھوٹے طبقے سے ہوتا، اور جس کو اپنی کم مائیگی کا زیادہ احساس ہوتا وہ اپنے مضمون کی تہنید اس طرح باندھتا کہ علامہ کے ہاں چھوٹے اور بڑے کی تفریق نہ تھی، وہ ایک قلی سے مصافحہ کر کے اتنے ہی خوش ہوتے تھے جتنے ایک شہنشاہ سے میں کئی دفعہ ان کے مکان پر ان سے ملا اور انہوں نے ہمیشہ خندہ پیشانی سے مجھے شربت ملاقات بخشا:

جس مضمون نگار نے اپنے مضمون کو زیادہ دلچسپ بنانا ہوتا وہ علامہ کے متعلق فرضی کہانیاں لکھ کر مضمون میں ٹھونس دیتا، مثلاً ایک صاحب نے جو کسی امریکن بیہ کینی کے ایجنٹ تھے لکھا کہ ایک دفعہ وہ ان گفتگو میں میں نے علامہ سے کہا کہ آپ اپنی زندگی کا بیہ کیوں نہیں کراتے، اس پر علامہ مسکرا دیئے، اور کہنے لگے کہ بیہ وہ کرائے جس کو موت کا ڈر ہو، میں تو موت کو راحت دہی تصور کرتا ہوں موت تو وہ واہ ہے جس میں سے گزر کر انسان بہشت میں داخل ہوتا ہے اس کے بعد آپ نے بار بار یہ شعر ہر بار یہ

موت اک ماخذ گی کا دفعہ سے

میں آگے چلے گئے دم لیکر

علامہ نے یہ شعر کچھ اس طرح ادا کیا کہ مجھ پر وہ طاری ہو گیا چنانچہ

علامہ ظہور کی وفات کے دو گھنٹے بعد ہی لوگوں نے اس کی زندگی ان کی شاعری اور ان کے لکھے ہوئے مہلوں کے نام یاد کر دیئے، معلوم یہ ہوتا تھا کہ ملک کا ہر چھوٹا موٹا نقاد، افسانہ نویس، اور شاعر اگر علامہ کا ہم نوا نہیں تو ہم حال دور تھا اخبارات و رسائل نے ظہور منبر لگائے، ان کی مجلسوں نے ظہور ریمو ریس قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، بی خدانیت نے ظہور ریکارڈی ڈراما منسٹ، ظہور لائبریری اور ظہور فٹ بال کلب قائم کرنے کی سعی پیش کی، قرآن آتش خوانے علامہ کے کلام پر تقریریں کر کے خلیج تحسین حاصل کیا۔

الغرض علامہ کی موت ہر ایک شخص کے لئے رحمت باری ثابت ہوئی جو شخص بھی علامہ ظہور پر مضمون لکھتا مضمون اس کا مجلسوں میں اس طرح استقبال کیا جاتا تھا صاحب علامہ کے گفتگو کے چند دوستوں میں ایک ہیں، شہرت حاصل کرنے کا اس سے نادر موقع شاید ہی کسی کو ملا ہو۔ یہ سب باتیں مرزا رحمت ہر روز دیکھتا، اور بڑھتا، اور دل بیل میں کڑھتا کہ وہ شخص جن کو علامہ کی زندگی میں ان کے دلی چوکھٹ دیکھنے کا یہ موقع میسر نہیں ہوا، ان کی موت کے بعد اس طرح باتیں کرتے ہیں گویا ان کی ساری عمر صرف علامہ کے ہی گھر کئی۔ مثلاً ایک افسانہ نویس نے جس کا نام ملک اس سے پہلے کسی شخص نے نہیں سنا تھا، لکھا ہے کہ علامہ ہمیشہ ایک چادر پانی پر سوتے تھے، اگرچہ علامہ بے حد فریب پذیر تھے ہوتے تھے، اور تنگ چادر پانی پر میرے ساتھ سوتے کی وجہ سے انہیں کبھی کبھی ساری رات خندہ ذاتی تھی، مگر دلی خلوص کا یہ حال تھا کہ کبھی زبان سے اُفت نہیں کی، برابر چالیس سال وہ میرے ساتھ اسی کھٹ پر سوتے رہے، ایک اور صاحب جو کسی گمنام اخبار کے ایڈیٹر تھے اس طرح رقمطراز ہوئے:

”علامہ دوبر کا کھانا ہمیشہ میرے ہاں کھاتے تھے علامہ کو شائے سے جتنی رحمت تھی اتنی ہی میٹنگ سے نفرت تھی، مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے ایک رکاب کو کہ جس میں میٹنگ کی بجائی تھی اس زندہ سے فرش پر ٹپک مارا کہ ٹکڑا اس سو یا ہوا بچہ خواب میں بیچ اٹھا: اس مضمون کو پڑھ کر پروفیسر صاحب تھلائے، ان کا حقیقہ تھا





ادب۔ ایڈیٹر، نقاد، ان کے مکان، واقعہ کوچہ زرگر، پر  
تیراغ تحسینی کا مسودہ ذکر جس کو مرزا نے نہایت عروت میں  
ایک رات بارہ بجے تک ہنسی کر لکھا تھا، دیکھنے کے لئے  
اٹھتے ہوئے۔

—————

کہ ان کا آخری کلام المعروف تیراغ تحسینی: محتاط! اتھوں  
میں دیا گیا تھا؟

(۴)

اس مضمون کے چھپنے کے دو تین دن بعد مرزا ظریف کا شدید  
علامہ ظہور کے جسگری روستوں میں ہونے لگا۔ اور مسنداروں

امین حویں  
ایسا کولی

# منزل شوق

منزل شوق میں کیا جانے یہ کیا ہوتا ہے! دل وہی ہوتا ہے پتہ ایک بلا ہوتا ہے  
آبلہ پانی سے ہوتا ہے قدم اور بھی تیز درو سے شوق بہر حال سوا ہوتا ہے  
ہفتواں بٹے ہوئے جاتے ہیں دھڑپ آپ بربط ذوق ادھر گرم نوا ہوتا ہے  
ایک دھن ہے کہ ہر کیفیت لئے جاتی ہے یہ بھی محسوس نہیں ہوتا کہ کیا ہوتا ہے؟  
سیل دریا ہے کہ رکنا جسے آتا ہی نہیں کوئی طوفان سا طوفان بپا ہوتا ہے!  
دشت ہو، بحر ہوتا روں کی فضا ہو کچھ ہو شوق خود مثل خضر راہنما ہوتا ہے

منزل شوق کا ہر ذرہ ہے تصویرِ شربت

دن کو یہ مہرا میں شب کو دیا ہوتا ہے

سے میں جانتا ہوں کہ پھر مگر کے معنوں میں متروک ہے۔ لیکن یہاں اس کے بغیر کام نہ چل سکتا تھا۔ اس نے استعمال  
کیا گیا۔

(امین حویں)

عابر غلام ناصر خاں ایم اے

## انتقام

ذرا تیردی چڑھا کر لہا، اتنی دیر کیوں لگائی تو نے؟ تجھے معلوم نہیں تھا کہ میں یہاں انتظار کر رہا تھا، بھوک کے مارے برا حال ہو جا رہا ہے بول اتنی دیر کیوں لگی تجھے؟ بول؟

اس نے مارنے کو ہاتھ اٹھایا، مڑکی ہم گئی اور خوفزدہ نظروں سے گزرتی ہوئی دیکھنے لگی۔ جس نے پہلے تو اس کے چادر چھین لئے تھے، اور اب اس کو پھینے پر آمادہ تھا۔

”تجھے مارو مت؟ بھلانے منت کے بعد میں کہا، تاہم ابھی پتا ہی کے لئے چادر لیکر کمیت پر گئی ہیں۔ جب وہ ہلی گئیں تو میں چل پڑا چکر یہاں لائی ہوں۔“

میں نے اپنا ہاتھ روک لیا اور بقیہ کچھ کہے پھر نیم کے درخت کے نیچے آکر بیٹھ گیا۔ بلا بھی خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چلی۔ لیکن میں نے تیسرا رخاں دیکھ کر کچھ فاصلہ پر بیٹھ گئی۔

میں کا غصہ ابھی تک نہیں اتر اٹھا۔ اس نے سر اٹھا کر سبھا کی طرف دیکھا۔ اور کہنے لگا: اتنی دیر تک مجھے بھوکا رکھا، دیکھ تو اب میں بھی تجھے اپنے ساتھ نہیں کھاؤں گا؟

اس نے پہلے اپنی گھڑی کھول کر دو موٹی موٹی روٹیاں نکالیں جن پر تھوڑا سا گدھ بھرا ہوا تھا۔ پھر چادر کی پوٹی بھی کھول کر برابر ہی رکھ لی اور کھانا شروع کر دیا۔

بھلا چپ چاپ بیٹھی میں کو دیکھتی رہی۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ اس کے چراتے ہوئے چادر کوں کو اکیلا میں ہی ختم کر دے گا، تو اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ اور وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا کر رونے لگی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا، اور پھر جھڑک کر کہا: اری اب روتی کیوں ہے؟

”مجھے بھوک لگی ہے۔ بھلانے سسکاں لینے جوتے کہا۔“  
”بھوک لگی ہے؟“ میں نے کچھ نرم ہو کر کہا: ”اری تو تو کھا کر آئی ہوگی غم سے؟“

بھلانے سر ہلایا: ”نہیں میں نے تو صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔“

۱۱  
گھاؤں سے باہر ایک بڑے نمکے درخت کی چھاؤں میں میں نے آکر بیٹھا تھا۔ سامنے میدان میں گائیں اور بھینس گھاس چر رہی تھیں۔ ان کی دشمنی اور تیز نگاہیں تمام جانوروں پر پڑ رہی تھیں۔ اور جب کوئی جانور دھرتے بہتے یا ڈر کر نکل جاتا تو وہ دھڑک کر سے گھیر لاتا۔ اس کی عمر باہ سال سے زیادہ نہ ہوگی، لیکن گاؤں کی مکھی اور تازہ ہوا میں قدرت کے ہاتھوں سے اس کی نشوونما بہترین طریقہ پر ہوئی تھی، قدامت و جتن میں وہ اپنے باقی تمام جانوروں سے بڑھا ہوا تھا۔ وہ صبح پو پھٹنے سے پہلے اپنے باپ کے مویشی کے محل جاتا تھا۔ اور شام کو چارے کے قریب واپس آتا تھا، شام کا باقی رات اس کا اپنا ہوتا تھا، جسے وہ مکھی میں گزارتا تھا۔

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا، ایک گائے نزدیک کے کھیت میں داخل ہو گئی تھی، میں نے اپنی لکڑی لیسکر اس کی طرف دوڑا: اری خبردار، کھیت میں جاتی ہے؟ اس نے گائے کو ڈانٹتے ہوئے کہا: بھگوس نے بھلا تو تجھے کاٹ ڈالے گا۔

گائے بجائے کہ باقی جانوروں میں لی گئی، اور میں پھر درخت کے نیچے آکر بڑے سہارا لیکر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ کچھ بے چین تھا۔ غالباً اسے کچھ اٹکا رہا تھا، وہ بار بار مرکز گھاؤں کی طرف دیکھتا تھا۔ آخر جب اس کا اضطراب بہت بڑھ گیا، تو اس نے اپنی گھڑی میں سے جس میں وہ پی رہی تھی بائرنہ کر لیا اور کھانا کھا۔ بائرنہ لٹکلی لٹکلی بھانے لگا۔ بائرنہ کی بائرنہ آواز جھپٹاتے ہوئے ہندوؤں کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر نصف میں گونجنے لگی۔

بکایک جیسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی، میں نے بائرنہ دھڑکا سے بھاگ کر مڑ کر دیکھا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی بغل میں کچھ دباہے۔ اری غی، میں بائرنہ لہانے میں لے چکی، اس لڑکی کی طرف دوڑا، اور نزدیک آکر بولا: کیوں دی بھلا لائی چادر؟

بھلانے اپنی بغل میں سے ایک پوٹی نکالی اور طفلانہ معصومیت سے سر ہل کر کہنے لگی: ”ہاں ہاں لائی ہوں، یہ دیکھو!“

میں نے پہلے اس کے ہاتھوں سے چادر نکال کر دیکھا۔

بائسری کا نغمہ ختم ہو گیا۔ اور وہ بہن اس ستارہ نغمہ کی طرح خار بن گئی۔ جو تمام رات اپنے کمال کا مظاہرہ کرنے کے بعد صبح کے ابتدائی گھنٹوں میں اپنے ستارہ پر سر جھکا کر سو رہی ہو۔

(۲۶)

شباب نے انگڑائی لی، حسن بیجا ہوا.....  
میرزا اب حسینہ نے آنکھیں کھول دیں، اس کا ہاتھ خود بخود ساری پرہیز جو سوتے میں ڈھلک گئی تھی، اور اس کے ٹخنوں میں اپنے سینے کے اٹھتے ہوئے طوفان کو چھپا لیا، اس وقت وہ کچھ کوئی ہوتی سی محسوس ہوتی تھی، اس کی آنکھیں دور افق پر تھیں، وہ اس کی نظری انگلیاں بتائی کے عالم میں نکڑی کے ایک ٹکڑے کے ساتھ مشغول تھیں وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

ایک دم خود بخود سمٹ گئی، گویا کسی کی آغوش سے نکلنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر چونک کر ارد گرد نظر ڈالی، اور اپنے سینے تھپا پا کر خود ہی سسکا۔ وہ خواب دیکھ رہی تھی۔ ایک زمین اور دو لفظ خواب۔  
وہ اسی طرح اپنے خیالات میں غرق بڑی دیر تک جھٹی رہی سوچ افق کے نزدیک پہنچ گیا تھا، لیکن اسے بالکل طبر نہ ہوتی، وہ اس نیم خوابی سے اس وقت جاگی، جب کسی نے دونوں آنکھوں سے اس کی آنکھیں بند کر لیں، بلا اچھل پڑی اور کچھ دیر تال کی کہے ہوئی، "اگر وہ سوچتی تھی تو یہی آنکھوں میں در و کر دیا۔"

وہ چہ نے بھائی آنکھوں پر سے اپنے ہاتھ ہٹا لئے، اور اس کہہ "جیہ کہ چہنے ہوئے کہنے لگی۔" اس وقت کیا سوچ رہی تھیں رقم؟  
"یہاں بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی ابھی....."

بھلانے سر سر کر کے دیکھا، تو وہ سوچ کر اسکا رہا تھا، اس کی آنکھیاں کسی فوری جذبہ سے چمک اٹھیں، لیکن لمبے کوئی خیال آئے ہی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا، اس نے شرار کرتے چمکائیں، اور کچھ اس طرح۔۔۔ سمٹ گئی۔ جیسے اب سے تھوڑی دیر پہلے خود بخود سمٹ گئی تھی، اس کا سہ۔ بدن کا پتہ لگا، اور وہ خاموش ہو گئی۔

وہ سوچ بھلا کے برابر بیٹھ گیا، اور بولا: "ابھی ابھی وہ سوچ کر رہی تھی، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ جب میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے تو کچھ لگی کہ بھلا کے سامنے ہی بتاؤں گی۔"

تو وہ بھلانے بغیر تقریبی اٹھائے جواب دیا۔

اسے یہ آج کیا بات ہے؟ وہ سوچنے سے پوچھا۔

وہ سوچ کر دھمکیا ہوا۔ اسے تو قوت نہ پہلے ہی کہوں نہیں کہہ دیا۔  
پہلے جلدی سے آجیہ کیا معلوم تھا، کہ تو بھی بھوکے ہے۔  
بھلانے سادھی کے آنکھ سے اپنے آنسو پونچھے اور وہ سوچ کے برابر جیہ کر کھانے میں شریک ہو گئی۔

کھاتے کھاتے وہ سوچ کو کچھ خیال آگیا کہنے لگا، بھلا تجھے یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں؟

بھلا بولی نہیں تو۔۔۔ ہاں راستہ میں سوچنی ہی تھی، میں نے اسے بھی بلایا، مگر وہ کہتی تھی کہ مجھے بتانی کی روٹی لیکر کھیت پر جانا ہے۔

وہ سوچ نے کہا، مگر وہ ہوتی تو اس وقت وہ بھی چاول کھا لیتی نا۔  
تھوڑی دیر میں دونوں کھانے سے فارغ ہو گئے، اور جیہ کر باتیں کرنے لگے، ان کی گفتگو بالکل ایسی تھی، جیسے وہ محسوس فرشتے ایک دوسرے سے مصروف کام ہوں، بعض اوقات دونوں کسی معمولی سی بات پر نہایت زور سے کھلبکھار مٹھ دیتے تھے، ایسی رو میں آ کر نہ تھیں، ہر پل کے چہنے میں چلنے والی اس خوشگوار، بوا کی طرح جس کی طہریزی اور مشک ریزی مشابہ جان کے لئے پیغام نشاط لائی ہے۔

اس وقت دونوں زمین پر آئے سانسے اند سے بیٹھے ہوئے تھے، وہ سوچ کی کہنیاں زمین پر تکی ہوئی اور ٹھوڑیاں دونوں ہاتھوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ سوچ کھانے کے چہرے پر تھکاؤ سے اس کی باتیں سن رہا تھا، وہ دھڑکی کر بھی بھول گیا، اور اپنی بائسری کو بھی، جو اس کے برابر پڑی تھی، اس نیم کے درخت کے نیچے دو محسوس رو میں بچا تھیں، جو سفر حیات کی دلکش ترین اور حسین ترین منزل میں ایک دوسرے کی رفاقت کر رہی تھیں بھلانے کو دھڑکی اور آنکھیں سل کر بولی تھیں "تجھے شہنا آئی ہے سوچ" وہ سوچ نے اپنی چادر کا کھلیہ بنا کر بھلا کو دیدیا، اور کہا "تجھے یہاں آ جیہ یہاں کافی تھوڑے۔"

بھلانے ہاتھ بڑھا کر چادر اس طرح سے لپی، گویا وہ اس کی اپنی ہی ہے، اور اسے سر کے نیچے رکھ کر آرام سے لیٹ گئی، سوچ بھی درخت کے تنے سے کمر لگا کر بیٹھ گئی، اور اپنی بائسری کو ہونٹوں سے لگا کر ایک لمبے لمبے ماری، ساتھ ہی اس کی آنکھیاں اس بے حقیقت نکڑی کے ٹکڑے پر دھس کرنے لگیں۔

سادھی نصاب پر حقیقت چھا گئی، بھلا کی آنکھیں آہستہ آہستہ چمکنے لگیں، اور وہ ابھی وہ سوچ بائسری کے ٹکڑوں نے اسے تھپک کر خواب کی پر سکون دنیا میں پہنچا دیا، پھر وہ سوچ کی آنکھوں میں سستی آگئی۔

موسمی نے کہا: بھوکے تپاجی نے کہا کہ میری تو خود ہی پی مضمیٰ  
کہ ان دونوں کا سمندر ہو جائے۔ . . . . . لو اب جلدی  
جا کر بلا کو بچاؤ:

بلا کچھ اور نکل گئی تھی، موسمی اس کے پیچھے آواز دیتا ہوا تھا  
اور آخر وہ تین ہی منٹ میں اسے جا پہنچا۔

بلا چلونا، موسمی نہیں بلارہی ہے، اس نے بلا کا ہاتھ پکڑ کر کہا  
بلا کی سامنے چڑھی ہوئی تھی، اس نے لہجہ زائد سے موسمی کو  
دیکھا اور بولی: بچے جانے دو موسمی، میں تم سے انتہا کرتی ہوں  
موسمی کو کچھ رحم آگیا، موسمی کو آواز دیکر اس نے کہا: موسمی یہ  
نہیں آتی، اب جی کی کاروں ہے

موسمی نے پکار کر کہا: تم نے جو وعدہ مجھ سے کیا تھا، وہ پورا کرو  
موسمی دوبارہ بلا سے مخاطب ہوا: بلا چلونا، آخر کیوں خطا ہو  
نہیں موسمی میں نہیں جاؤں گی اس وقت، وہ اپنا ہاتھ چھڑانے  
کی کوشش کرتے ہوئے بولی:

موسمی نے پھر موسمی سے پکار کر پوچھا: بتاؤ موسمی میں کیا کرنا  
اور موسمی نے دہی کھڑے کھڑے جواب دیا: نہ تو کیا، نہ کرو  
میں اٹھا کر آؤ، مرد جو تم سے اتنا بھی نہ ہو سکے گا

موسمی نے کچھ دیر تالی کیا، اللہ بھر جھک کر اسے اپنے مضبوط اور  
قوی بازوؤں میں اٹھا لیا، بلا کچھ دیر اس کی گرفت سے نکلنے کی جدوجہد  
کرتی رہی، لیکن اپنی تمام کوششیں ناکام ہوتے دیکھ کر اس نے اپنا  
جسم چھڑ دیا، اس کی چیشانی پر پسینہ کے قطرے جمع ہو گئے، اور اس  
کاسرے کے کوڑھلک گیا۔

موسمی بخیر دی کے عالم میں اس مرحرہ مجسمہ کو اپنی آغوش میں لے  
کھڑا تھا اس سے پہلے اس نے بلا کو کسی گود میں نہیں لیا تھا، اتنی نجیب  
سے اسے دیکھنے کا کہیں اتفاق نہیں ہوا تھا، اسے بلا سے محبت تھی اسلئے  
کہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا، وہ بلا کے ساتھ کھیل کر ہی  
ہوا تھا، لیکن آج اسے بلا میں کوئی نئی بات نظر آ رہی تھی، اس کے من  
میں ایک نئی کشش اور جاذبیت پیدا ہو گئی تھی۔

بلا ایک بے جان مجسمہ کی طرح اس کی گود میں پڑی تھی، اس کی  
قوتِ ممانعت سلب ہو گئی، اور کسی خوش آئند وقت کے تصور سے اس  
کی آنکھیں بند ہو گئیں، موسمی نے اس کے گمراہ سینہ پر نظر ڈالی، جس کے  
مناسب آواز چڑھاؤ اور جس کی تیز تیز حرکت نے پہلی مرتبہ اس کے دل میں  
عشق و محبت کے لطیف احساسات پیدا کئے تھے، پھر اس کی نگاہ بلا

اس کا منہ اور ہر کو اٹھایا، لیکن جب اس کا چہرہ موسمی کے چہرے کے سامنے  
آیا، تو بلا نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ موسمی سے آنکھیں ملانا نہیں چاہتی تھی  
موسمی یہ سب کچھ دیکھ کر اس طرح مسکرا رہی تھی، گو با کوئی وزحسا  
آدمی بچوں کی شوخی دیکھ کر خوش ہو رہا ہو، تاہم اس سے نہ ہلکا ہوا۔  
وہ میں سب کچھ جانتی ہوں موسمی، اس کا تعلق بھی اسی بات سے ہے جو  
میں نہیں جانتے تو کہہ رہی تھی:

موسمی نے ایک لمبی سی سانس لیکر کہا: اچھا تو سنو، کل شام  
موسمی جان بوجھ کر رک رک کر بات کر رہی تھی، بلا پہلے تو کچھ  
آنکھوں میں شمع کرتی رہی، لیکن موسمی نے کچھ پروا نہ کی اور اسی طرح  
بات بلا کر بات کرتی رہی، آخر بلا سے خاموشی نہ رہا گیا، جلدی سے  
اٹھ کر موسمی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

کیا کرتی ہو موسمی، اس نے آہستہ سے کہا  
موسمی مسکرا کر بولی: کیوں تبہارا کیا ہرچ ہے؟

بلا نے پہلے کھجیوں سے موسمی کو دیکھا، اور اس کے چہرے پر  
سرخی چھا گئی۔ پھر آنکھیں بند کر کے اس نے کہا: مجھے شرم آتی ہے  
"شرم آتی ہے؟" موسمی نے بتاؤنی استعجاب سے پوچھا: کس سے  
شرم آتی ہے؟ پھر موسمی کی طرف اشارہ کر کے کہا: کیا ان سے؟

بلا نے جواب نہیں دیا، اور دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپایا  
"ہاں تو کل شام، موسمی نے پھر کہنا شروع کیا: تبہارے تپاجی بلا  
کے گھر گئے تھے، اور اس کے تپاجی سے کہنے لگے . . . . .

بلا نے موسمی کے منہ سے چٹکی لی ہے چار ہی بلا اٹھی، اب تو  
جیسا کہ پہلی بتاؤں کی، اس نے پیشانی پر نہ مال ڈال کر کہا:

آخر تم نے یہ بات مجھے کیوں بتائی تھی، میں تبہارے گھر سے کیلئے  
منوڑا ہی گئی تھی، پھر موسمی کی طرف منہ کر کے بولی: تبہارے تپاجی نے  
اس کے تپاجی سے کہا، کہ دیکھو چودھری موسمی اور تبہاری پری ہلکا آپس  
میں نہیں سے ہی بہت پریم ہے، میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں کی شادی  
ہو جائے:

پھر کیا جواب دیا بلا کے تپاجی نے؟ موسمی نے یہ درخواست  
سے پوچھا:

پھر اس کے کہ موسمی کچھ کہے، بلا دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ  
چھپا کر دہان سے بھاگ گئی، موسمی کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی: موسمی وعدہ  
کر دے کہ تم بلا کو واپس لے آؤ گے، نہیں تو میں نہیں آؤ گے نہیں بتاؤں گی  
"میں وعدہ کرتا ہوں، موسمی جلدی سے بولا۔

کے خاموش مگو ترقراتے ہوئے گلابی ہونٹوں پر پری ان ہونٹوں کے قسم اور ان سے نکلی ہوئی آواز کے ترنم سے اس کے کان اس درجہ آتش ہو گئے تھے کہ ان کی دھنکی اس کے نزدیک ایک بے معنی سی چیز تھی۔ لیکن آج موہنی کے الفاظ نے اس کی حالت بدل دی تھی۔ اس کے کانوں میں ایک نیا احساس اور اس کی آنکھوں میں ایک نئی نگاہ پیدا ہو گئی تھی۔ گرد و پیش کی ہر چیز اسے رومان میں ڈوبی نظر آ رہی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے سے پردہ اٹھ گیا تھا۔ اور وہ حسن و عشق کی دلفریب دوا کی کو صبح کی تمام نعمتیوں کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔

موہن نے کہا کہ چاہتا تھا۔ لیکن آواز اس کے صحن میں اٹک جاتی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ بھلا وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ لیکن اس ایک لفظ ہی میں وہ سب کہہ گیا۔ اس بے معنی سے نام میں اس کی تمام حسرتیں اور ادا بنیائیں تھیں۔ جب وہ دل نشہ محبت میں سرشار ہوتے ہیں، تو ایک ایک لفظ اور ایک ایک اشارہ میں وہ وہ کہہ رہا جاسکتا ہے۔ جس کی ادائیگی کے لئے الفاظ قطعاً ناکافی ہوتے ہیں۔ بھلانے اپنی مشغلیں، تمہیں کھولیں، اس نے پر شوق نگاہ سے ایک لمحہ کے لئے موہن کے چہرے کو دیکھا، پھر اس کے ہونٹوں کو حرکت ہونے لگا۔ اس نے دھکم دھکا کر کہا: کیا کہتے ہو موہن؟

”بھلا مجھے تم سے پریم ہے؟ موہن کے دل کی گہرائیوں میں آواز نکلی۔ بھلا کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ ”میں تمہاری ہوں موہن؟ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا: اور ہمیشہ تمہاری ہی رہوں گی میں۔ انتہا کرتی ہوں کہ....“

موہن نے جواب نہیں دیا۔ اس نے بھلا کو اپنی گود میں ڈرا دیا اور مسکرایا، بھلا بھی مسکرا دی، اور اس نے شرما کر منہ پھیر لیا۔ اس تمام گفتگو میں آدھے منٹ سے زیادہ نہیں لگا ہو گا۔ اور موہنی نے پھر آواز دی: ”کیا باتیں کر رہے ہو موہن جیسا؟ بس اسی لمحہ لئے آؤ؟“

موہن اسی طرح بھلا کو گود میں لئے موہنی کے پاس آیا اور اسے نہایت آہستہ سے زمین پر اتار دیا۔ اس کے بعد جیب خینوں زمین پر بیٹھ گئے تو موہنی نے مشرارت سے کہا: ”اری بھلا! اگر موہن بھلا کی گود میں بیٹھنے کو دل چاہتا تھا، تو صاف کیوں نہیں کہہ دیا؟ ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟“ بھلا شرما کر مسکرا دی۔ بولی: ”موہنی، تم مجھے بروقت کیوں چھڑتی ہو؟“ آسان کا سفر ہی گوشہ سسر خ ہو گیا تھا۔ موہن نے بائیں سرے ہونٹوں سے لگائی، اور شام کی خاموشی اور ہر کون فضا میں ایک دھنکی دھنکی مچا

(۳۳)

ان باتوں کو ایک پسند ہو گیا۔ محبت کے بھوکے وہ دل پر فز تہائی میں ملے تھے۔ موہنی ان کی راز و مخفی دو معصوم دھڑکن کو اکٹھا دیکھ کر اس کو بے انتہا مسرت ہوئی تھی۔

لیکن نشاط و انبساط کا یہ دور کچھ دیر پائا نہ رہا۔ نہیں ہوا۔ یہیں اور اداؤں کا مفرور باو مخالف کے تیز و تند چھوٹوں نے سر باد کر دیا۔ شام کا وقت تھا کہ گاؤں کا خبردار بھلا کے گھر سے نکلا۔ بھلا کا آپ اسے باہر تک پہنچانے آیا، اس وقت وہ بہت خوش معلوم ہوتا تھا، اور وہ بھلا کی ہر بات پر اس کی باجیں کھل جاتی تھیں۔

خبردار اس سے دفعہ تو بھر کر چلا ہی تھا کہ اسے پھر کچھ خیال آیا اور مکرر آواز دی: ”چودھری جی ایک بات ادر کہنا ہے مجھے؟“ بھلا کا باپ ایک زرخیز غلام کی طرح دور گر خبردار نے پاس آیا اور ادب سے جھک کر بولا: ”فرمائیے سرکار! اور کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میں چاہتا ہوں کہ سب بات جلد ہی ہی ملے ہو جائے؟“ خبردار نے کہا: ”گو بال میرا ایک ہی جینا ہے؟“

”جو حکم سرکار کا؟“ بھلا کے باپ نے پہلے سے بھی زیادہ جھک کر کہا۔ ”لڑکی آپ کی ہے کل ہی لیجائیے؟“

خبردار نے پھر سامنے کا ارادہ کیا، لیکن ایک اور بات سوچ کر ٹھہر گیا۔ ”مجھے ایک اور ذکر ہے چودھری جی؟“

بھلا کے باپ نے اتنے پر دل کو چھایا: ”وہ کیا ذکر ہے سرکار؟“

یہ ڈھٹا کہ بھلا میں کوئی عیب نکال کر خبردار معاملہ ختم ہی نہ کر دے۔ ”مجھے اس لڑکے کی طرف سے شک ہے؟“ خبردار بولا: ”وہی نا موہنی؟“

بھلا کے باپ نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ ادا کہا۔ ”اور نہ! اس چوگر کا کیا ہے؟ اس کا میں آج ہی انتظام کر دوں گی؟“

”اں مجھے یہی شک ہے کہ ان دونوں کی سنگائی ہو چکی ہے؟“

اجی سرکار تو اس سے چوکیا؟ بھلا کا باپ بولا: ”ایک سنگائی کیا ہو تو یہاں سنگائیاں تو ڈوں گا جیسے بھلا کیا معلوم تھا کہ بھلا کو آپ پسند کر لیں گے؟“

”چھا چودھری! بس اب میں جاتا ہوں؟“ خبردار جاتے ہوئے بولا: ”نستے سرکار! بھلا کے باپ نے وہ نہیں ہاتھ جوڑ کر زمین پر جھکتے ہوئے کہا۔“

تھوڑی دیر کے بعد جب بھلا باہر سے آئی تو اس کا باپ کا انتظار کر رہا تھا اس نے بھلا کو اپنے پاس بلایا اور اس کے سر پر ہاتھ پھر کر

کہ بی بی بلا! میں جانتا ہوں کہ تم اب موہن سے نہ ملا کر رہو۔  
 بلا کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے شرمناک سر جھکا لیا اور اس کے  
 پرہیزگار غریب رنگ چھا گیا اس کا دل خوشی سے ہلکے اچھلنے لگا اور وہ  
 موت کا تصور کرنے لگی۔ جب وہ موہن کی بیوی بن کر اس کی آغوش  
 محبت میں بھی ہوگی۔ وہ سمجھتی کہ اسے موہن سے ملنے سے کیوں منع کیا  
 جا رہا تھا۔ گاؤں کے دستور کے مطابق شادی سے کہیں دین پہلے تو  
 بڑے اور بڑی کو اس میں ملنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی تو کیا کہیں میں  
 لے بعد وہ کچھ بچ موہن کی ہو جائے گی؟ اسے اس بات کا اندوس تھا۔  
 وہ اتنے دنوں تک موہن کو بالکل نہ دیکھ سکے گی۔ یہ دن وہ کس طرح گزار  
 لے گی؟ انتظار کی عمر یاں کتنی گزرتی ہوئی ہیں۔ یہ وہ جاتی تھی یا موہن  
 اب شام سے دوسری شام کا انتظار ہی ان کے لئے دو بھر تھا پھر اسے  
 موہن کا خیال آیا۔ بارہ موہن! جب اسے معلوم ہوگا کہ وہ مجھے کہیں دین  
 ملے۔ نہیں دیکھ سکتا۔ تو اس کا کیا حال ہوگا؟ وہ خود اپنی زبان سے کتنی بار  
 نہ چلا تھا کہ بلا میں نہیں دیکھنے بغیر ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ مگر  
 یہ بات سے اس کی تسکین ہو گئی۔ کہیں دین وہ موہن کے اور موہن اس کے  
 میں ہیں تو رہ سکتا تھا۔ اس کے بعد دنیا کی کوئی طاقت انکو علیحدہ نہیں کر  
 سکے گی۔ وہ محبت کی پیاسی روحیں ہمیشہ کے لئے اکٹھی ہو جائیں گی اور  
 اس موہنی جو موجود ہے۔ وہ اسی طاقت کی کوئی نہ کوئی سہیل نہ در نکال دے گی۔  
 یہ کچھ سوچ کر بلا کا دل کا خوش ہو گیا لیکن وہ اپنے باپ کی زبانی بھی  
 اس سنا چاہتی تھی۔

”کیوں پتا چلی گیا بات ہے؟ اس نے پھرے پن سے پوچھا۔ وہ صبح  
 ایشیانی بی بی جی تھی۔ اس کے دل میں امید و ہم کی کلکشی ہو رہی تھی۔  
 اب تو خبر دار کی ہو بخند والی ہے؟ اس کے باپ نے کہا۔  
 بلا کے دل پر کل گزرتی۔ اسے اپنے گاؤں پر تھیں نہیں آتا تھا۔ شہر  
 نے اسے کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے سرگوشی سے انداز میں کہا  
 ”ہاں بی بی! اب تو خبر کی ہو بنے گی۔ ابھی وہ گراں پال کے متعلق بات  
 کر کے گئے ہیں؟ اس کے باپ نے جواب دیا۔

ملا کر سر جھکاتے لگا جتنے منصوبے اس نے اپنے دل میں باندھے  
 ان سب کا خون ہو گیا۔ اس کی حالت اس پرندے کی سی تھی جو خوب  
 بانٹنے آپ کو نادہی کے ساتھ پھولوں کی ٹہنیوں پر اڑتا ہوا دیکھے لیکن  
 سنا نہ کھلتی ہے۔ تو خود کو نفس کی میلوں میں بند پاتا ہے۔ اس کے باپ  
 اس کی تمام آرزوؤں اور امانوں پر پانی پھر دیا اسے موہن کا خیال آیا۔  
 اب اسے معلوم ہوگا کہ اس کی بلا اب اس سے چھین جائے گی۔ تو بلا اس

کی کیا حالت ہوئی؟ اس کا تو دل پھٹ جائے گا۔ پھر اسے اپنے وہ الفاظ  
 یاد آئے جو اس نے اس وقت کہے تھے۔ جب موہن اسے ایک بے بس  
 بچہ کی طرح اپنی گود میں لئے کھڑا تھا۔ اس وقت اس نے کہا تھا: میں تمہارا  
 ہر سہرا ہوں اور ہمیشہ تمہاری ہی رہو گی۔ کیا اسے اپنا وہ وعدہ توڑ دینا  
 چاہئے۔ جو اس نے اپنی عمر کے سب سے زیادہ پرکیت لمحہ میں کیا تھا؟  
 کیا موہن اسے معاف کر دے گا؟ کیا موہن اس وعدہ خلافی کے بعد اس  
 کی صورت دیکھنا گوارا کرے گی؟

وہ کانپ گئی۔ اس سے ایسا کہیں نہ ہو سکے گا۔ موہن اور بلا کی پریم  
 میں ڈوبی ہوئی باتیں اس خیم کے درخت نے سنی تھیں جس کے نیچے وہ ہر  
 روز ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے۔ ان پرندوں نے سنی تھیں جو ان دو معصوم  
 رگوں کو دیکھ کر ان کی باتیں سننے کیلئے نزدیک کے درختوں پر بیٹھ جاتے  
 تھے۔ اور بادشیم کے ان خوشگوار جھنجھوٹے بھی جو ان کو دیکھ کر اس میں  
 سرگوشیاں کرتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ جو وعدہ ان تمام چیزوں کو گواہ  
 کے کیا جاتے۔ اسکا توڑنا محال ممکن ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنے باپ کی  
 تجویز کی مخالفت کرنے کا ارادہ کر لیا۔

”پتا چلی! وہ سراٹھانے بغیر بولی۔ آپ ایسا نہیں کر سکتے؟“  
 ”میں ایسا نہیں کر سکتا؟ اس کے باپ نے حیرت سے پوچھا۔  
 ”اس کا کیا مطلب؟“

”پتا چلی گاؤں میں سب جانتے ہیں کہ۔۔۔“  
 ”کہ بڑی شادی موہن سے ہوگی؟ اس کے باپ نے بات کا سہارا  
 کیا۔ اگر میں تیرے متعلق کسی سے وعدہ کر سکتا ہوں تو تیرا باپ ہونے کی  
 حیثیت سے مجھے پورا اختیار ہے کہ اپنا ارادہ بدل دوں۔ اس میں کسی کا  
 کچھ نہ رہتا۔“

بلا کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ اس نے بے لوثی ہوئی آواز میں کہا  
 ”میں موہن کو دھوکہ نہیں دے سکتی پتا چلی۔ میں اس سے ہمدردی رکھتی ہوں اس  
 کو بڑا دیکھ کر۔“

”مجھے موہن کی کچھ فکر نہیں جائے جنہم میں وہ۔ میں تو کچھ سہی دیکھنا  
 چاہتا ہوں؟ اس کے باپ نے ذرا بڑبڑا کر کہا۔

”موہن کے ساتھ میں بہت سہی رہو گی پتا چلی! بلا ڈانڈائی ہوئی  
 آنکھوں سے اپنے باپ کی طوط دیکھ کر بولی۔

اس کا باپ اور بھی صحت پر ہوا۔ تو خواہ مخواہ منہ کرتی ہے  
 بلا۔ جیسا میں کہتا ہوں۔ مجھے ویسا ہی کرنا پڑے گا۔“

”میرا دل ٹوٹ جائے گا تاج۔۔۔“ بلا نے آواز دھڑکاتے ہوئے کہا۔

میں کیا۔

میری بات کو غور سے سن لے بھلا: تو ابھی تک اور نا سمجھ ہے۔ اپنی اچھائی اور برائی کو نہیں پہچان سکتی، میں نے دینا دیکھی ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تیری بہتری کس صورت میں ہو سکتی ہے۔ گو پال نہرو ملک کا جیسا ہے اس کے پاس دولت ہے، مویشی ہیں اور بہت سی زمین ہے، اسی پر تیرے عزت ہے گاؤں میں بہاں جاتا ہے، سب اسے سلام کرتے ہیں، نہرو بارہوڑ جا ہو گیا ہے۔ چار دن کا صمان ہے، اس کے بعد ان تمام چیزوں کا مالک گو پال ہو گا۔ اور تو ہو گی، باپ کی موت کے بعد گو پال نہرو دار بن جائے گا اور تو نہرو دار کی بیوی ہو گی۔ سستی ہے بھلا: نہرو دار کی بیوی — تجھے اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہیں کرنا پڑے گا، جبراً حکم ماننے کے لئے بہت سے لوگ چاکر ہو گئے، اور پھر جب تیرے پاس دولت ہو گی، تو بھی بھی اس سے فائدہ پہنچ سکتا ہے، مومن کے پاس یہ باتیں کہاں ہیں، اس عزیز کو کھانے کو دعائی تو میسر نہیں ہے، وہ کیا خوش رہ سکتا ہے؟ صبح سے شام تک وہ کھیت میں مل جاتا ہے، تجھے اس کے ساتھ کام کرنا پڑے گا، اور تیرا بھول سا بدن کلا جائے گا، خدانے تجھے محنت کرنے کیلئے پیدا نہیں کیا ہے؟

”بتا جی، بھلانے کا تقبی ہوئی آواز میں کہا: من کو کبھی دکنے کے لئے دھن کی ضرورت نہیں، میں دولت کی بھوک نہیں ہوں؟“

بھلا کے باپ نے تیری چڑھائی: بھلا تو نہیں جانتی تو کیا کہہ دی ہے۔ اس نے کہا: اگر تو گو پال سے شادی کر لے تو تیرے بھاگ کھل جائیں گے، ہم سبکے بھاگ کھل جائیں گے، گاؤں کے سب لوگ میری عزت کریں گے۔ تو خود غیث اور میں سے، ہر گویا پانی تیرے واسطے بہت سا زیور اور خوب صورت کپڑے لاکڑے گا، غمزدہ سے ہی دونوں میں لوگ تجھے فیروزی کہیں گے، سبھی بے

بھلانے اچلتے ہوئے آسمانوں کی دھند میں سے اپنے باپ کے ظالم جہو پر نکلوالی، جس کی آنکھوں پر لالچ اور حرص نے ٹپی ہاندہ دی تھی، دولت کا یہ ظلم سمجھتا تھا، کہ اصل خوشی وہ چیز ہے جس سے حاصل ہوتی ہے۔ اسے کیا معلوم تھا، کہ جس شخص کے من میں پریم کا سمندر موجیں ڈال رہا ہو، ہر قسم کی دنیوی آسائش سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ دولت اس کی دیوی تھی اور وہ اس کا پجاری، اسی دیوی کی قربانیاں وہ پروردہ اسوقت اپنی معصوم بیٹی کی بھلی بھائی پر آئندہ نہیں اور چڑھتے ہوئے ارمان بھینٹ چڑھا رہا تھا، آہ! اپنی بیٹی کی فطرت سے وہ کس قدر نا آشنا تھا، اس کے شیشے جیسے نازک اور اس کے مقدس جذبہ کو کس بے رحمی سے ہلال کیا تھا

بھلا کی حسرت آمیز اور مایوس نگاہ سے اس کے باپ کا دل ملن نہ سچا، وہ بولا: اسوقت میں باہر جاتا ہوں، تو اس معاملہ پر غور کرے، یہ بھکر وہ بھلا کو تنہا چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

(۴۱)

اس رات بھلا کو بالکل نیند نہیں آئی، اپنے باپ کی باتیں اسے رو رو کر یاد آ رہی تھیں، اللہ ان کا ایک ایک نکتہ اس کے دل میں نشتر بن کر چھو رہا تھا، آج تک اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے باپ کو دولت سے اتنی زیادہ محبت ہے، لیکن اس کی شام کی گفتگو نے اسکی آنکھ پر سے پردہ سا اٹھا دیا تھا۔ اور اسے ایک نئے حقیقت کا احساس ہو چلا تھا، مومن کے متعلق بھلا کے باپ نے جو افادہ مسئلہ کئے تھے ان سے اس کا دل اندر ہی اندر دھڑک رہا تھا۔

”جے مومن کی کچھ حکمت نہیں؟“ اس نے کہا تھا، جائے جہنم میں: میں تو تجھے کبھی دیکھنا چاہتا ہوں؟“

میرا باپ میری طبیعت سے کتنا ناواقف ہے؟ اس نے دل ہی دل میں سوچا: اسے کیا معلوم کہ مومن سے علیحدہ رہ کر میں کبھی یہ نہیں رہ سکتی؟

یہ وہ جانتی تھی، کہ گو پال میرے، لیکن اسے دولت کی تھانیں تھی، اس کا دل محبت کا بھوکا تھا، اور صرف مومن ہی اسکی مدد کی منتظر کو بھجھا سکتا تھا، اس نے آنکھیں بند کر کے خود اپنا تصور کیا، وہ گو پال کی بیوی بن گئی تھی، اس کے بہت سے لوگ تھے، وہ ایک خوبصورت سارے چہرے ہوئے تھی، اسکا جسم سونے کے زیوروں سے بھرا تھا، لیکن اسے اس مومن کی دھندلی سی صورت نظر آئی، جو لکڑی جھک صاف چوہی نما مومن اسے دیکھ کر تنگیں اٹھا کر سے مسکرا رہا، اس کے چونٹ بے

بھلانے یہ افغانی تھے: بھلا کیا پریم کا یہی اشت ہے؟

بھلا کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے، وہ وہ نقشہ ہی اس کے دل میں جا آ رہا تھا، اسے وہ وقت یاد آیا جب وہ مومن کے کندھوں پر اپنا سر رکھے، بڑی دیر تک جھپٹی رہتی تھی، مومن اس سے پریم کا کیا کرتا تھا، وہ وہ مست و بخود غرق نہیں سنا کرتی تھی جب وہ کسی نہ ختم ہونے والی بات ختم کر لیا کرتا تھا، تو بھلا کو اپنی آغوش میں آہستہ سے دبا کر لیتا تھا، تہہ تیہ پائی جھپتی ہوئی بھلا جب بھلا اس پر جھپتی، کیوں پائی کیوں؟ تو وہ جواب دیتا تھا: بھلا پریم میں اپنے دیوتا ہی ہوتا ہے، وہ بھلا مسکرا کر اس سے کہتی تھی: تم مجھے کبھی اللہ یہ بھکر دل کی گہرائیوں میں سے ایک سانس فینی تھی۔



اے خود ہی خود اسے اپنے من پر حیرت جو گئی پٹے ہوئے اور پیلے کھیلے کپڑوں میں اسے اپنے متعلق کچھ گمان کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ آج پہلی مرتبہ اس میں بہ احساس پیدا ہوا تھا کہ وہ بھی خوبصورت ہے جی رہے ہیں وہ بہت سی آئینہ میں اپنی شکل دیکھ رہی۔ پھر اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے اپنے گراپے بال بنائے اور ان میں ایک پھولی لگایا۔ اور پھر آئینہ میں اپنا منہ دیکھا۔ اس وقت وہ بلا مبالغہ خود معلوم ہوتی تھی۔ اس کے لیے وہ سیاہ بال ناگن کی طرح اس کی کر تک لٹک رہے تھے۔ اس کی مخمور آنکھیں گھبراہٹ میں تھیں۔ اس نے خود سے سر اٹھا کر پیچھے کی طرف دیکھا لیکن وہ بالکل تنہا تھی پھر آئینہ میں اپنی شکل دیکھ کر آپ ہی مسکرا دی۔ اس کے عارض تاہاں پر سرخی سی چھا گئی۔ ساڑھی کے باریک ٹکٹوں میں اس کا شغاف سینہ اور اس کا دفریب آثار چڑھاؤ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کا چاند سا کھڑا، گلابی بوخت اور اس کے اٹھے ہوئے جوہن کی بہا کسی دیکھنے والے کے دل کا صبر شکنیب لوٹ لینے کو کافی تھے۔ اس نے اپنے سر پر ایک پراکیم مچھلی سی نگاہ ڈالی۔ اور پھر خود ہی کسی سوچ میں پڑ گئی۔ اسے اپنے حسن اور دلربائی کا احساس ہو چلا تھا۔ اور اب اس دل میں خود میں آہستہ آہستہ پیدا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی جہاں حسن ہو وہاں پرستار بھی ہونگے۔ جہاں شمع جلے گی وہاں پردے ضرور آئیں گے۔ اگر اسے دیکھ کر گو پال اٹھا دل کھو گیا تھا، تو اس میں تعجب کی بات ہی کیا تھی۔ درحقیقت وہ اس قابل تھی، کہ لوگ اسے آنکھوں میں رکھیں، اور دل میں جگہ دیں۔ سوہن نے اس سے محبت کر کے اس پر کچھ احسان نہیں کیا تھا۔ بلکہ سوہن کی محبت کا جواب محبت سے دیکر خود سوہن پر اس نے احسان کیا تھا۔ جب تک اس کی مرضی تھی، وہ سوہن سے ملتی رہی اب مگر وہ اس سے ملنا چھوڑ دے تو سوہن کو شکایت کی قطعاً گنجائش نہ ہوگی۔ وہ سوہن سے ملنے پر کچھ مجبور نہ تھی، اس نے سوہن کا خیال کیا، جو اس وقت کھیت میں بل جلا رہا ہو گا، اس کے پٹے ہوئے کپڑے پسینہ میں تہہ بہہ ہونگے۔ اور اس کے چہرے پر خاک جم گئی ہوگی۔ پھر اس نے ایک اولے آئینہ کی طرف مگر پٹا خوبصورت چہرہ، مڑول جسم گلابی بوخت اور بیش قیمت ساڑھی دیکھی، اور خود بخود لغزت کے ساتھ منہ نہایا۔ اس دن صامت کو بھی بلا بالکل نہ سو سکی، لیکن سلی لالت کی طرح اس کا دل ٹپکنے لگا۔ وہ اب دولت، عزت، اور اچھے اچھے کپڑوں کے سہاؤ نے خواب دیکھ رہی تھی۔ خدا نے اس کو یہ موقع دیا تھا کہ گاؤں کا نمبردار اس کو اپنی بیوی بنانے کی خواہش کر رہا تھا، کیا اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا ناگذا، نعمت نہ مگاہا اسے حسرت نہ ہو کہ اتنے دنوں

آہ! اب یہ سب باتیں خواب سوہن کی طرح ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گی۔ سوہن کو اب وہ کبھی نہ دیکھ سکے گی، اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری بندھ گئی، اور وہ سسکیاں لگنے لگے کہ وہ نے لگی۔

دوسرے دن اس کا باپ صبح صبح اس کے پاس آیا تو تمام رات رونے اور جاتگے رہنے کے سبب اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کا باپ یہ دیکھ کر بغیر کچھ کہنے سے کھیت کو چلا گیا۔ دن بھر کام کر کے جب شام کو وہ واپس پٹا تو اس کے پاس ایک گھڑی تھی، اس نے وہ گھڑی لا کر بلا کے آگے ڈال دی اور کہا: "سے بلا نمبردار نے یہ تیرے واسطے ساز گیا بھیجی ہیں"

بھلانے گھڑی لے لی، لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو بھرائے اس کی حالت اس مال کی طرح تھی، جس کا بچہ مر گیا ہو لیکن اس کے کھلونوں کو دیکھ کر اس کے دل میں کچھ کی یاد تازہ ہو جاتی ہو، اور وہ آنسو بہا لیتی ہو۔ گھڑی میں چار خوبصورت اور بیش قیمت ساڑھیاں تھیں، لیکن بھلانے لاہروانی سے انہیں ایک طرف ڈال دیا۔ اس رات اسے بچہ بھی نہیں ضرور، مگر اتنی نہیں، جتنی اس سے پہلی رات ہوئی تھی، جاگتے رہنے کی وجہ سے اس پر نمین کا بچہ غلبہ تھا، اور چار پائی پر بیٹھے ہی وہ دنیا و دنیا سے بے خبر ہو گئی۔

صبح کو جب اس کی آنکھ کھلی، تو وہ سوپ کا پیسل چکی تھی، اس کا باپ آج ابھی تک کھیت پر نہیں گیا تھا، اسے بلا کا انتظار تھا۔ بھلانہ وغیرہ صبح ساٹنے آئی تو اس کے باپ نے نہایت محبت سے بچہ میں کنا: "بیٹی بھلا! آندا ساڑھی پہن کر میں دکھائی تو ہوتی، ایک کونے میں سبک کپڑا ڈال دیا"

"چاچی اس وقت کچھ دل نہیں چاہتا، بھلانے آنسوؤں کے ساتھ جواب دیا۔

"نہیں بیٹی ابھی پہن لو نا، میں اسی وجہ سے تو کھیت پر نہیں گیا، اس کا باپ بولا۔

بھلا بادل نا فرامستہ اٹھ کر اند گئی، اور گو پال کی بھی ہوئی ایک خوبصورت ساڑھی پہن کر باہر نکل، اسے دیکھ کر اس کے باپ کی ہاتھیں کھل گئیں، بولا: "بیٹی اس وقت تو کتنی سندھ معلوم ہوتی ہے، اور ابھی ہے ہی کیا؟ شادی کے بعد دیکھنا تو کتنے خوبصورت خوبصورت کپڑے بنا کر بیٹی اس نے صحتاً زیادہ دیر نگھو کر نا مناسب نہ سمجھا، وہ بلا کی پیڑ پر ہاتھ پیر کر کھیت کو چلا گیا۔

سازمہ رانارنے سے ملے اس نے آئینہ حرا، اندر، صورت دیکھا،

بھلانے والی آواز میں کچھ شرمناک کہا: "پتا جی! گوپال میرے لئے بہت سی سازشیاں لادینگا؟"

"ہاں ہاں جی!"

"اور بہت سا زور بھی؟"

"ہاں ہاں جی!"

"بہت سے نوکر میری خدمت کیا کریں گے؟ اس نے پوچھا۔"

"ہاں ہاں: اس کے باپ نے اتنے یقین دلانے ہوئے کہا: "تو اپنے ہاتھ سے کچھ بھی نہیں کرے گی، تیری خدمت کو بہت سے نوکر ہونگے۔"

"سب میری عزت کریں گے پتا جی؟ بھلانے پوچھا، سب نے سلام کیا کریں گے۔"

"ہاں جی! سب تجھے سلام کریں گے۔"

بھلانے غصہ سے سراٹھایا اور بولی: "اور — اور موہن بھی پتا جی؟"

"ہاں ہاں موہن بھی جی: اس کے باپ نے زندہ سے ایک ٹکڑہ لگا کر کہا۔"

(۵)

نیم کے تنہ سے سہارا لگے ہوئے موہن اکیلا بیٹھا تھا، اس کی ٹوٹی ہوئی بانٹری اس کے پاس رکھی تھی، وہ کسی گہرت سوچ میں تھا، اور اسکی نگاہ دود افق پر جمی ہوئی تھی، اور اس کا سر ایک جانب ڈھلکا ہوا تھا۔

بھیتا موہن! کسی نے آہستہ سے کہا۔

موہن نے بغیر کچھ سرگرمی کے جواب دیا: "کیا کہی ہو موہنی؟"

موہنی برابر آکر کھڑی ہوئی، اس کا چہرہ نند تھا، اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے، یہاں اکیلے بیٹھے ہو تم! اس نے سسکی لیکر بوجھا۔

"ہاں اکیلا ہی بیٹھا ہوں!" اس نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا: "بھلا کی تو شادی ہوگئی، اب وہ یہاں کسی نہیں آئے گی، موہنی! کہی نہیں۔"

موہنی نے محنت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: "موہن"

بھیتا تم رنج نہ کرو۔ بھلا تمہاری محبت کے قابل نہیں، اس نے تہا سے مقدس جذبہ کی قدر نہ کی، اس نے تمہیں دھوکا دیا، اور اپنے تمام عہد پیمان توڑ دیئے جو اس نے تجھے گواہ کر کے کئے تھے، آہ! کسے معلوم تھا، کہ اس کے خوبصورت جسم میں تپ کر کا دل ہے؟"

"ایسا نہ کہو موہنی! موہن نے اس پر لہجہ میں کہا: "اسے مجبور کیا گیا ہوگا۔"

موہنی نے غصہ سے زمین پر پاؤں مارا: "یہ سب لکھتے ہیں"

موہن کے ساتھ کس طرح محبت کرتی رہی، موہن کو یہ جرات ہی کیوں ہوگی کہ اس سے اظہار محبت کرے۔ اس نے یاد کیا، کہ بار بار موہن نے اسے اپنی آغوش میں لیا تھا، اور شرم و ذلت سے اس کا چہرہ تنہا تھا، اسے اپنے آپ پر غصہ ہوا تھا، اس نے اپنے پیوں جیسے جسم پر ہاتھ لگانے کی موہن کو اجازت ہی کیوں دی؟

سچ تھا کہ وہ موہن سے بہت کچھ عہد پیمان کر چکی تھی، لیکن اگر وہ عہد کر سکتی تھی تو اسے پورا نہ کرنے کا بھی اسے ہی اختیار تھا، اب اسے اپنے باپ کے اظہار کی قدر ہو رہی تھی، "موہن کے پاس یہ باتیں کہاں؟ اس نے کہا تھا، اس غریب کو کھانے کو روٹی تو میسر نہیں تھی وہ کیا خوش رکھ سکتا؟ صبح سے شام تک وہ مکیت میں بل جلاتا ہے، تجھے اس کے ساتھ کام کرنا پڑے گا، اور تیرا پول سا بدن کھلا جائے گا، خدا نے تجھے محنت کرنے کے لئے پیدا نہیں کیا ہے، واقعی اس لئے یہ سب کچھ کہا تھا۔"

اس نے سوچا میرے باپ کو کچھ سے کتنی محبت ہے، میری بیوی اور خوشی کے لئے وہ کس قدر کوشش کر رہے ہیں، اور میں نے ان کو صاف جواب دیئے، ان کی سب تجویزوں کو رد کر دیا، میں بھی کتنی بڑی بیوقوف تھی، وہ تو انہوں نے عقلندی سے کام لیکر مجھے سوچنے کی ہدایت دیدی، وہ نہ اگر میرا جواب منبر دار کو پتہ چلتے، تو منبر دار اپنے بیٹے کے لئے کوئی اور لڑکی تلاش کر لیتا، اور میں پھر اس موہن کے سر نہ جی جاتی تمام دن بچے محنت کرنا پڑتی، چوبہا جھونکتی، اور اس کے بچوں کی پرورش کرنی نہ اچھے کپڑے پہننے کو ملے، اور نہ زلیخہ، اس غریب کے پاس روٹی کا سہلا تو ہے ہی نہیں، میرے واسطے کپڑے کیا خاک لانا؟

صبح کو اس کا باپ پھرا آیا، بھلا کا چہرہ لبلاش تھا، اور وہ بہت شرم سے معلوم ہوتی تھی، باپ نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھرا اور کہا: "جی میں چاہتا ہوں کہ اس منہ سب معاملہ ختم ہو جائے، منبر دار کی بھی کیا خبر ہے، اور گریباں تو ایک ایک گھڑی گن رہا ہے۔"

بھلانے سر جھکا کر جواب دیا: "جیسے آپ کی خوشی ہو پتا جی!"

اس کے باپ کی باجیں کل گئیں، بولا: "شباباش جی، تو نے اس وقت ہماری لاج رکھ لی، لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں میں بھی منبر دار کے گھر جاتا ہوں۔"

وہ جانے کے لئے مڑا ہی تھا کہ بھلانے اسے روک لیا: "پتا جی! اس نے کہا۔"

ایم آر اے پور پور گئی تھیں (درجہ کیا ہے؟)



بہلا کا باپ کچھ دیر خاموش رہا۔ چراس کے ذہن میں کوئی تبدیلی  
یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ یہ بکروہ باہر چلا گیا۔

ادھی رات کو جب تمام گاؤں دسے دن لبرکی محنت کے بعد  
میشی مشد سو رہے تھے۔ نبرد ار کے ٹھکری طرف سے چور چور کا غلغلہ اٹھا  
سب بڑا کر اٹھ بیٹھے اور لامبیاں لیکر دوڑ پڑے۔ اندھیرے میں لوگوں نے  
دیکھا کہ نبرد ار کے ٹھکری کی طرف سے کوئی آدمی کو دکر ایک طرف بھاگا  
اب کیا تھا۔ سب شور مچا رہے تھے اس کے بچے لپکے۔

کیا ایک مخالف سمت سے ایک دھندلی سی شکل آئی ہوئی دکھائی  
دی۔ یہ موہن تھا جو بہت دیر سے واپس آ رہا تھا اپنے نئے مکان کو جانے کے  
لئے اسے اس گاؤں میں سے گزرنے پڑا تھا۔ دن کے وقت تو وہ گاؤں  
سے بچکر ہی نکلی جاتا تھا۔ لیکن اب چونکہ رات تھی اس لئے اسے کسی  
سے دوچار ہونے کا فہم نہ ہی تھا۔ جتنا بچہ وہ اس گاؤں میں سے ہو کر  
جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ گاؤں کی طرف سے ایک شخص بھاگت  
ہوا آ رہا تھا اور اس کے پیچھے بہت سے آدمی چور چور پکارتے ہوئے  
دوڑ رہے تھے۔

موہن دوسرے ہی چور کو پھانسنے لے ارادہ سے راستہ روک کر  
کھڑا ہو گیا۔ اور جب چور نزدیک آیا۔ تو اسکی طرف جھپٹ پڑا چونکہ  
لہر کے لئے ٹھنک گیا اور پھر لائی اٹھا کر ایک جہاں ہوا تہ موہن کے سر  
پر مارا۔ موہن اس اچانک حملے سے بوکھلا گیا۔ لائیں اس کے سر پر پڑی  
اور وہ تورا کر زمین پر گرا۔ لیکن گرتے گرتے بھی وہ چور سے گنبد گیا۔ اور اسے  
بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

اتنے میں سب لوگ بھی بچ گئے۔ اور چور کو ہاتھوں ہاتھ پکڑ لیا  
ایک آدمی نے جھک کر ٹھکری، ٹھالی جو چور کے ہاتھ میں سے چھوٹ کر  
زمین پر گر گئی تھی اس ٹھکری میں پکڑے اور زور دیا۔ ایک اور آدمی نے  
دھنکی چور کی طرف کر کے اس کا منہ دیکھا۔ یہ بہلا کا باپ تھا۔  
میں نے چوری نہیں کی۔ اس نے چیخ کر کہا۔ سچے نہیں معلوم  
یہ ٹھکری یہاں کس طرح آئی؟

اس کی بات پر کسی کو یقین نہیں آیا۔ سب اسے گھسیٹتے ہوئے  
ایک کٹھری میں لے گئے۔ جہاں اسکو بند کر دیا گیا۔ دوسرے دن اس  
کے خلاف چوری کی ریت نکالی گئی اور پولیس کے سپاہیوں نے اسے  
تھانہ میں بند کر دیا۔

(۷)

موہن کی بدترین حالت ہی میں موہنی کے مگر بنیاد باگسا

جہاں وہ بڑی دیرویت ہی پڑا رہا۔ موہنی بہت پریشان تھی۔ وہی دن  
ہوئے موہن اس سے ملنے آیا تھا تو اچھا خاصا تھا۔ اور اس سے بڑی  
دیر تک باتیں کرتا رہا تھا۔ اب وہ زخمی تھا۔ یہ دوسری بار بھی کر بھانگے  
باپ نے اسے زخمی کیا تھا۔ جسمانی زخم بھر جاتا۔ لیکن کیا روحانی زخم کا  
مندی ہو جانا بھی ممکن تھا؟

ہوش نے بوجھ موہن نے اپنے گھر جانے کی خواہش کی  
موہنی نے یہ بکروہ سے روک لیا۔ کہ جب تک زخم مکمل طور پر ٹھیک نہ ہو  
جائے۔ تنہا راحرت کرنا ٹھیک نہیں۔ اس تمام عرصہ موہنی ایک  
مستحق باں اور محبت کرنے والی بہن کی طرح موہن کی تیار داری کرتی۔ یہ  
اکثر گزشتہ باتوں کو یاد کر کے وہ آفسوہا لیا کرتی تھی۔ بہلا کی طرف سے  
اسکے دل میں رنج تھا۔ لیکن اس کے باپ سے تو اسے نفرت تھی  
خصوصاً جب سے اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ اس نے ہی موہن کو چوٹ  
لگائی تھی۔

ایک دن موہنی جب اندھ آئی تو موہن کسی گھر سے سوچ میں  
تھا موہنی نے اسکی فوج بٹھانے کو ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں  
یہ ایک موہن نے گفتگو کا رخ پٹ ڈیا اور بولا۔ موہنی اس تمام  
واقعہ سے بہلا تو بہت دکھی ہو گی۔

ہاں وہ بہت دکھی ہے موہن بھتا۔ موہنی نے کہا۔ اول تو تم  
گاؤں کے طعنے نہیں سنے جاتے ہو گئے۔ کہ باپ بیٹے کے گھر چوری  
کرنے کو آیا۔ اس پر طرہ پر کہ نبرد ار اور اس کے بیٹے کے بھی تو قریب  
رہتے ہیں۔ بات بات پر گوپال کہتا ہے کہ گھر سے نکال باہر کر دیں گا  
یہ تو بہت بری بات ہوئی نا بھرا۔ موہن نے پیشانی پر ہاتھ مارنے  
ہوئے کہا۔

اور موہنی منہ بنا کر بولی۔ تو یہ بات اس کے باپ کو پہلے سے  
نہ سوچھی تھی؟ کیوں کیا تھا جی کے گھر چوری کرنے؟  
موہن نے کچھ دیر تال کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دماغ  
میں کوئی زبردست کشمکش ہو رہی ہے۔ آخر اس نے صراحتاً یہ  
کہا۔ موہنی؟

یہ کیا کہتے ہو موہن بھتا؟

موہنی اب انتقام کا وقت آگیا۔ اور مرتبہ بہلا کے باپ نے  
مجھے زخمی کیا۔ اب میری بار ہے۔

یہ کیا مطلب ہے تمہارا آخر؟ موہنی نے کچھ سمجھنے کی کوشش نہ کی  
ہوئے پرچھا۔

مومن نے ایک گہری سانس لی اور بولا: اگلے بختہ بھلے کے باپ  
 یہ مقدمہ چلے گا۔ اور مجھے وہاں گواہی کے لئے جانا ہوگا۔  
 مومن نے اپنا سر ذو سے ہلایا، گویا وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ ٹھیک  
 اب بھی ہیں، کیوں مومن بھلا لکھے گہری میں نے پلو گئے؟  
 مومن نے محبت سے مومن کی پیڑ پر تھپی دی اور بولا: کہوں  
 نہیں، تم بڑی خوشی سے چلو۔  
 مومن خوش ہو گئی، مومن کے چہرہ پر بھی ایک ہلکا سا تبسم آیا،  
 بد اس نے سر جھکا لیا اور کسی سوچ میں غرق ہو گیا۔

گہری کا کہہ تھا شایوں سے کچھ کچھ بھرا ہوا تھا۔ بھلا کے باپ پر  
 آٹ مقدمہ چلنا تھا اور تمام گاؤں اسناد آیا تھا۔ اس ذہنیت کا مقدمہ  
 جج ٹاک پش نہیں ہوا تھا۔ جس میں کسی شخص کو اپنی بیٹی کے ہاں چڑی  
 کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ جو گہری میں ایک طرف مومن بیٹھا تھا  
 اس کا زخم ایسی اچھا نہیں ہوا تھا، اور اس کے سر پر پی بندھی ہوئی  
 تھی اس کے برابر مومن بیٹھی تھی، وہ سری طرف کچھ فاصلہ پر بٹھا بیٹھی تھی  
 مومن نے اسے دیکھا اور اس نے مومن کو، لیکن آنکھ ملنے ہی اس نے  
 سر جھکا لیا، وہ کچھ شرمندہ سی تھی۔

گزارا ہوا زمانہ ایک بار پھر مومن کی نظروں کے سامنے آ گیا اس  
 نے آنکھیں بند کر لیں، اور اس کے دماغ کے پردہ پر چند مشکلیں آگئیں، ان  
 میں اس نے بھلا اور مومن کو اچھی طرح پہچان لیا، اسے ایک بڑا سا  
 نیم کا درخت بھی دکھائی دے رہا تھا، جس کے نیچے ان کی ملاقاتیں ہوا  
 کرتی تھیں۔ اچانک مومن اور بھلا اور مومن کے ساتھ تھیلے کو دنا۔ آؤ:  
 کیسا بے تحشری کا زمانہ تھا، پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ اور بھلا بڑے ہو  
 رہے تھے، اور عمر کے ساتھ ساتھ ان کے احاسات اور جذبات میں  
 بھی نمایاں تغیر ہو گیا تھا۔ وہ منتظر بھی اس کی آنکھوں کے سامنے آیا۔  
 جب وہ بھلا کو اپنی آغوش محبت میں لئے کھڑا تھا۔ بھلا کی نیکیوں انھوں  
 میں پریم کا سمندر موجیں مارتا تھا، اور وہ اس سے محبت اور دعا کے  
 اترار و پیمانہ کر رہی تھی، میں تمہاری جوں مومن، اس نے کہا تھا تو  
 تمہاری ہی رہو گئی، میں وہ دعا کرتی ہوں۔

مومن نے اضطراب کی حالت میں آنکھیں کھول دیں، بھلا سامنے  
 بیٹھی تھی، وہ اب بھی حسین تھی۔ زمانہ کی ہیرم دستبر سے اس کی ہاؤسین  
 ابھی تک محفوظ تھی، اس میں وہی رعنائیاں تھیں جنہوں نے ایکسا  
 زمانہ میں مومن کو مست و خجود بنا دیا تھا اس کی نمود بچا ہوں میں اب

میں ساغر و بیانی کی جھلک تھی، اور اس کے شباب میں اب بھی حشر  
 سا ماناں تھیں، لیکن اب اس کا چہرہ مضمحل سا تھا، گزشتہ درمات  
 کے مدد کی وجہ سے اس کا رنگ کد گیا تھا۔ اور وہیں سوچ رہا تھا: وہ  
 کتنی دکھی ہوئی؟

بچہروں کی جھک کرنے مومن کو بھکا دیا، چار سپاہیوں کی حراست  
 بھلا کے باپ کو داکر طرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا، اس کے ہاتھوں  
 میں جھکڑیاں پٹی ہوئی تھیں، اس نے آتے ہی وحشت زدہ نظروں سے  
 مومن کو دیکھنا کو دیکھا، اس کی آنکھوں سے وہ نقشہ گر گیا جبکہ مومن اس  
 کے خلاف گواہی دے گا، اور عدالت اسے اپنی سزا دے گی، یہ معلوم کئے  
 سال اسے لوہے کی زنجیروں کے پھیرے گزارنا ہونگے!

گھنٹی بجی اور مجسٹریٹ اندر داخل ہوا، اسے دیکھتے ہی بھلا کے باپ  
 نے پکارنا شروع کیا، حضور! میں بے گناہ ہوں، میں نے کوئی جرم نہیں کیا  
 ہے، ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کے کہنی ماری، اور اسے خاموش  
 کر دیا۔

سب سے پہلے مومن کا بیان تھا، وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر گواہوں  
 کے کٹہرے میں آکھڑا ہوا، اس نے پہلے سر پھر کر بھلا کی طرف دیکھا، جس کا  
 چہرہ کیا ایک درد پر لگا تھا، پھر ایک فاسقانہ انداز سے مسکرا کر اس کے باپ  
 کو دیکھا، جو اس طرح کانپ رہا تھا، اور یہ تھی سب سے زیادہ بات اس کے  
 جرم تفسیر پر یہ بات بخوبی ظاہر تھی، کہ اس نے مومن کے خلاف ہر امکانی  
 کارروائی کی تھی، ایک مرتبہ اس کی آرزوؤں اور انگوں پر پانی پھیر دیا تھا  
 اس کے حسرت اور امان بوجہ دل کو چکلیوں سے مسل کر چھینکر یا تھا  
 اور دوسری مرتبہ اس کی جان پیسے کو ہاتھ اٹھایا تھا، اب مومن کی باری  
 تھی، انتقام کا وقت آ گیا تھا

عدالت نے طرم کی طرف اشارہ کر کے مومن سے پوچھا: تم اس  
 شخص کو ہانتے ہو؟

مومن نے طرم کی طرف دیکھا اور بولا: ہاں میں اس شخص کو، اچھی  
 طرح جانتا ہوں، مجھے، انوس ہے، کہ میری بیاری کے سبب اس شخص کو  
 اتنی تکلیف اٹھانا پڑی؟

تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ مجسٹریٹ نے حیران ہو کر پوچھا۔  
 یہی کہ یہ شخص بے گناہ ہے، میری بیاری نے اتنی بھلت ہی نہی  
 کہ میں تمام بات صاف کر دیتا، مومن نے تب:

عدالت نے سوال کیا: تو پھر اصل قصہ کیا ہے؟  
 مومن نے کہا: مجرم میں ہوں چوری کرنے میں نبرد ار کے گھر گیا تھا

اور جب خبر ہو جانے پر میں کڑکی سے کوڑ کر لیا گا۔ تو گاڑوں والے سب شور مچاتے ہوئے میرے پیچھے دوڑے۔ سامنے سے یہ شخص آ رہا تھا اور شور مچا کر میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کو لاٹھی مارنا چاہا لیکن پیچھے وار کر چکا تھا۔ پھر مجھے معلوم نہیں کیا ہوا جب مجھے موش آیا تو میں نے سنا کہ اس شخص کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔

عدالت کے کمرہ میں شور مچ گیا۔ گوٹ چسکوٹیاں کرنے لگے۔ ہوا کا چہرہ مسرت سے چمکنے لگا۔ اس کے باپ نے اطمینان کی سانس لی تو کتا بہوت سی جیٹی جیٹی اس کا سر جھکوا رہا تھا۔ اور وہ تمام کارروائی کچھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس کے بعد ہلاک باری آئی، اس نے کہا یہ رات کے وقت میں ہو رہی تھی کہ کسی کے پاؤں کی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ لائین کی روشنی میں نے دیکھا کہ کوئی شخص میری طاقت چیرے ہوئے صندوق کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اس نے میری طاقت منہ چیرا تو میں نے چوہن لیا وہ یہی شخص ہے۔ پہلے میں نے اس کی طرف اشارہ کیا تو کھڑا ہوا سکڑا ہوا تھا

ہلاکے باپ نے بیان دیتے ہوئے کہا یہ میں رات کو منڈی سے واپس گاڑوں آ رہا تھا کہ قعدے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا دکھائی دیا۔ جس کے پیچھے اور بہت سے آدمی شور مچاتے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ میں راستہ آگ کر کھڑا ہو گیا تو اس نے مجھ پر حملہ کرنا چاہا۔ لیکن میں نے پہلے اسے گروہ اس کے بعد سب آدمی آگئے۔ اور انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔ مجسٹریٹ نے اس کی طرف دیکھا۔ اور پوچھا تم کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟

مومن نے سیکڑا کر پیٹے ہلاک اور پھر اس کے باپ کو دیکھا اور کہہ نہیں سکا کہ میں نے جو رہی کر کے ایک گناہ کیا ہے اب جھوٹوں کر اسے اور بھاری کرنا نہیں چاہتا۔

عدالت کی طرف سے مومن کو ایک سال قید اشتکات کے نام سے مومن کے منہ سے ایک پنج بجلی سبھیوں نے آگے نہرو مومن کے جھکڑی لگا دی۔ لیکن وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا اس نے انتقام پورا ہو گیا تھا۔ ۱۱۱۱

شاطر عجمی کا مٹی

## نوجوان کسان

دھوپ کی شدت سے دریا خشک ہیں محراب اس  
لو کا یہ عالم کہ مانگے سے نہیں ملتی پناہ!  
آگ کے شعلے اگلتی بت زمین گل عسار  
یہ ہوا کے تند جھونکے اور یہ آمد صحرانور!  
سر بہ نہ پاؤں نیچے، دھبیان میں کھویا ہوا  
آنکھ میں غصہ کی سرخی دل میں دردنا اضطراب  
یہ جوانی یہ تن نازک یہ کسدر کا لباس  
بانی جبہ دشت و دین یعنی اسے سرمایہ دار  
جانور کچھ پھر رہے ہیں کیتوں کے آس پاس!  
دن کی پیشانی پہ جیسے رات کا عکس گناہ  
بچہ کو ڈر ہے سنگ و آہن میں نہ آجائے گداز  
کبر کی محفل میں جیسے وقت کے ماروں کا شور  
بل چلائے جا رہا ہے عافیت کا۔ "دیوتا"  
اور ماتھے پر پسینہ کسار ہے بچ و تاب  
کیوں نہ مر جائے مرے حساس دل کی بھوک تپاس  
دیکھ کس محنت سے کھیتی کر رہا ہے کاشتکار

دیکھ تیری ہستی ناپاک مٹ جانے کو ہے  
ہاں تری دنیا میں ظالم انقلاب آنے کو ہے

سراج الدین ظفر

## لالہ گل

دُتے دُتے میں محبت کا جو اعجاز نہ ہو  
 میری ہر سانس کوئی سلسلہ راز نہ ہو  
 پردہ راز میں سرگرم تگ و تاز نہ ہو  
 بے کسی جرم سرِ عجب ناز نہ ہو  
 دُور رہتا ہوں ترے ورے ہمیشہ کہ کہیں  
 تو نہ آئے جو گلستاں میں تو ات جانِ ہلد  
 عشق مجھ کو مہ انجم سے بھی آگے لے جا  
 کہیں یہ بھی نہ ہو آدابِ محبت کے خفا  
 اور بھی را و وفا میں ہیں مسائلِ درپیش  
 مسکراتے ہیں ستارے مجھے چھوڑو کہ کہیں  
 پردہ زینست اٹھا اسے ہو جس رُسنے حبیب  
 درد پر ناز ہے مجھ کو کہ عنایت ہے تری  
 دیکھ پائے کسی کافر کا جو اندازِ خدام  
 روزِ سننا ہوں ہواؤں کے ترانے کہ کہیں  
 ابرِ آوارہ نہ ہو سبزہ سرا فراز نہ ہو  
 پردہ جاں میں کہیں خود حری آواز نہ ہو  
 اس طرح آگ کوئی پردہ نہ ہو راز نہ ہو  
 ذر رہا ہوں کہ شکایت کا یہ انداز نہ ہو  
 عشق آلودہ ذوقِ ہوس و آرز نہ ہو  
 پھر کبھی بادِ سحر نہ مزہ پر داز نہ ہو  
 زندگی میری اگر مسائل پر داز نہ ہو  
 سانس بھی لے کوئی اس طرح کہ آواز نہ ہو  
 رُوح بے تاب ابھی برسرِ پردہ راز نہ ہو  
 اس طرف سے یہ مجھے دعوت پر داز نہ ہو  
 یہ جو اٹھ جائے کوئی پردہ نہ ہو راز نہ ہو  
 کون ہے جس کو عنایت پہ تری ناز نہ ہو  
 بوئے گل پھر کبھی آوارہ پردہ راز نہ ہو  
 ترا پیغام نہ ہو یہ تری آواز نہ ہو

شاعر راز ہوں ساز اپنا اٹھاؤں جو ظفر

دوسری میرے مقابل کوئی آواز نہ ہو

پروفیسر عشرت رحمانی  
(ایم اے)

(ریڈیائی ڈراما)

# طوفانِ حیات

افرادِ تمثیل

- (۱) ماشا . . . . . ایک نوجوان طالع
- (۲) شامو . . . . . ایک ماہی گیر کی نوجوان لڑکی (ماشاکا شکیستہ)
- (۳) سمندر کا دوپٹا . . . . .
- (۴) ہوا کا دوپٹا . . . . .
- (۵) چند اور آوازیں . . . . .

تمہیں یہ درخت ایک مسجد ہے۔ جسکو دنیا کے بڑے بڑے مسافر عالم، پنڈت اور سیانے حل نہیں کر سکے۔ کہنے ہیں محبت انسان کو دنیا سے مکودتی ہے اس عبادی کا کوئی علاج نہیں مگر جاننے والوں کے نزدیک محبت کا درد دل کی دوا بنتا ہے۔ اسکو علاج کی حاجت ہی نہیں محبت اصل میں ایک سہاؤنا خوب ہے جسکی تعبیر میں ایک نئی زندگی ملتی ہے۔ اور اس زندگی کے دھبہ زائسٹکل کسی انتہا نہیں ہوتی۔ موت ہی محبت کی زندگی کا ایک پیارا گھیل ہے۔ آسمان کتنے ہی رنگ ہوتے۔ کیسے ہی طوفان آئیں۔ گھٹائیں چھائیں۔ آندھیاں چلیں دنیا کی سرچیز مسٹ کر خاک میں مل جائے مگر محبت سے بڑھ کر جوئے پودوں کا کچ نہیں جھاڑ سکتا۔ محبت میں فنا موتا حیاتِ جاودانی ہے۔

آبادی سے دور بہت دور ایک مختصر سا جزیرہ تھا۔ اس جزیرے میں سوائے چند پتھروں کے یا پھر محنت جان بھاریوں کے اور کوئی چیز نہیں تھی۔ اور آندھیاں آتی تھیں۔ اور چند جانی سینٹ لیکر مل جاتی تھیں۔ چاندنی راتوں میں چار بھانا آتا۔ اور وہ بھی چند زندگیوں کا خراج وصول کر لیتا آبادی سے دور۔ بہت دور بسنے والے نوجوان اسی جزیرہ میں پکڑے جاتے تھے۔ اور بڑے لوگ کنہ رہ پڑے ہوتے انہی سلامتی کی دعا میں لگا کر تھے عورتیں گھروں میں بکے آنے کا انتظار کیا کرتی تھیں۔

اس جزیرے کی مختصراً آبادی میں۔ دو نوجوان دل ایسے تھے۔ بکے دلوں میں محبت کا سمندر کا سمندر تھا انہیں یاد رہا تھا اللہ اسکی لہریں ان دنوں بڑی جتنی تھیں۔ ماشا ایک نوجوان طالع تھا۔ اور شامو ایک غریب ماہی گیر کی لڑکی۔ دونوں محبت کی گد میں پل کر جوان ہوئے تھے۔ چلنے آبادی سے دور۔ بہت دور۔ اس بستی میں جہاں ماشا اور شامو کی محبت اپنا گھر اجاڑ رہا تھا وہاں ہی ہے انکی شادی کی تاریخ تحریر کی ہے،

## پہلا سہن

[ ایک ماہی گیر کی جھنپڑی۔ رات کو وقت ہے۔ شامو بے خبر سو رہی ہے۔ کل اس کے بیاہ کی تاریخ ہے۔ اس کے دل باب رشتے کہنے کے لوگوں کو بٹھانے لگے ہیں۔ شامو کو سوتے ہیں ایسا معلوم ہوا ہے۔ جیسے محبت کے رشتے: دوسرے اسے جتنے جتنے سروں میں گھیسے تاکر بگا رہے ہیں۔

عشق بھی غراب ہے  
سو رہی ہے زندگی  
سرد ہے شباب بھی  
جاگ اسے صیہ جاگ

وہاں بہت دیر سے گانے کی سی ماوا آتی ہے۔ گویا شامو خواب میں  
ہی ہے  
گانا، جاگ اسے حسین جاگ . . . . . جاگ  
تو جو محو خواب ہے



شامو ایک بھانگ خواب بیکار جاتی ہے

شامو : (ایک دم سوختے سے جاگ کر دبی اور بھی آواز میں) ہا — ہا ہا  
ہاں : دوپٹا بھگون : یہ ..... یہ ..... کیا تھا۔ میں  
نے کیا دیکھا۔ ایسا بھانگ سپنا۔ ۔ ۔ ۔ وہ ..... کیسا ڈراؤنا  
خواب — کیا تھا یہ۔

شامو : (ماشا آگئے)

شامو : (آہٹ سے گھر کر، کون ہے یہ؟ کیا —؟)

ماشا : کیا ہو رہا ہے؟

شامو : کون ماشا تم؟

ماشا : ہاں میں — کیوں! میں اس وقت نہ آؤں کیا؟

شامو : نہیں تو — کیوں نہ آؤ — میں ابھی .....

ماشا : ابھی سوکے انھی ہو — اوں — میرے آنے سے بے  
چہن ہوتی؟

شامو : نہیں ماشا! تمہارے آنے سے بے چہن —؟

ماشا : کیوں نہیں کیا؟

شامو : نہیں دیکھنا سب سے بڑا چہن ہے۔ تمہارے نہ آنے سے  
بے چہن —

ماشا : یہ میرے دل کی بات تمہاری زبان سے

شامو : کیوں نہیں — جو تمہارے دل میں ہے وہ میری زبان پر

ماشا : شامو! ہمارے کیے اچھے نصیب ہیں — ہماری قربت  
کے خواب کی —

شامو : خواب — اور — ماشا — ابھی میں نے ایک خواب دیکھا۔

(آواز دکانچی ہے)

ماشا : ہیں شامو۔ تم کانپ رہی ہو — کیا خواب؟

شامو : آٹ — بہت ڈراؤنا — خواب —

ماشا : تم خواب سے ڈر گئی شامو۔ رہنما

شامو : ہاں ماشا — بہت ڈراؤنی باتیں دیکھ رہی تھی۔

ماشا : رہنما، اسے چھوڑو — خواب کی باتوں کا کیا کہنا۔

شامو : تم نہیں رہے ہو ماشا — سنو تو، میں نے کیا کیا دیکھا۔

ماشا : اور نہ — بھول جاؤ — سب خیال کی باتیں ہوتی ہیں —

خواب کوئی چیز نہیں — ہم محبت کے پیار سے خواب دیکھتے ہیں

میں ڈراؤنی باتیں ہمارا کیا بجاڑ سکتی ہیں! رہنما، یہ ہماری

خوش نصیبی کے دن ہیں — ہنسو شامو، خوش رہو۔

شامو :۔ سکرا کر، دیوتا میں مدد اپنی خوش رکیں۔

ماشا :۔ مدد خوش رہیں گے شامو — خوشی کا زمانہ آگیا ہے۔

جاننی ہوگی کیا دن ہے —

شامو :۔ کل — (شرما کر ہنسا، میں جانوں — پرست ہے۔

ماشا :۔ رہنما ہے، ہاں پرست تو ہے۔ مگر یہ ہماری زندگی میں

پہلا پرست ہے۔ غم ہی رہی ہو — یہ کہہ کیلے ٹھہرا ہے شامو  
ڈراؤنا۔

شامو :۔ میں کیا جانوں — سنا ہے — کہیں کسی کا بیاہ ہے۔ اوں!

ماشا :۔ کہیں! کسی کا! بیاہ! رہنما، واہ ری میری بھولی دہن! چھا

تمہارے تپاؤ، ماما جی کہاں گئے ہیں۔

شامو :۔ برادری میں لوگوں کو ملاوے دینے گئے ہیں۔

ماشا :۔ کیوں؟ کسی کے بیاد کے؟ وہ کیوں دینے گئے۔

شامو :۔ میں کیا جانوں — تم ہی ان سے پوچھو نا!

ماشا :۔ ان سے کیوں پوچھوں — میں آپ ہی نہ بتا دوں۔

شامو :۔ کیا ہے

ماشا :۔ تمہارا بیاہ ہے رہنما،

شامو :۔ (شرما کر، ہوں — ایسی باتیں کرو گے، تو ہم نہ بولیں گے۔

ماشا :۔ واہ — یہ کوئی بری بات تھی!

شامو :۔ پھر ہم کی کہیں گے —

ماشا :۔ بھلا تم ہوگی کیا؟

شامو :۔ یہی کہ تمہارا بیاہ! رہنما،

ماشا :۔ اچھا — یہ تو سب سے اچھی بات ہے — کہے جاؤ — میرے

لئے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہے۔

شامو :۔ ماشا —

ماشا :۔ شامو۔

شامو :۔ کیا کس سچ تمہارے بیاہ کا دن ہے؟

ماشا :۔ ہاں ہاں؟ — اور تمہارے بیاہ کا دن — کیوں! ہمارے

بیاہ کا — مدتوں بعد ہمارے نصیب کے بھول کھلے۔ بس

تو مراہوں کے دن ہیں مراہوں کی راتیں۔

شامو :۔ آج کی رات کسی پیاری ہے؟

ماشا :۔ کل کا دن اس سے بھی پیارا ہوگا۔

شامو :۔ ماشا۔ بھولوں کی خوشبو کس۔

ماشا :۔ بھولوں کا خوشبو، مسکندہ — شامو، ناگ۔ جو۔



گناہیں مان گئے۔

ہاشا!۔ گیدن نہ مانا گا۔ شامو۔ مگر۔ آؤ دیکھو تو طوفان کا کیا حال ہے۔ بنانے۔

دو طوفانی شور جاری ہے شامو گھبراتی ہے:

شامو!۔ اسی لئے۔ اسی لئے میں نہیں نہیں جانے دو جی۔ میں نے یہی خواب میں دیکھا تھا۔ اٹ۔ میں جی اور تم۔ ہم دونوں سمندر کے کنارے پھروں سے کھیل رہے تھے۔ تم بچے تھیک تھیک کر سناؤ تھے۔ اور سر پر آواز میں گنگا گارہے تھے

ہاشا!۔ یہ سب خیال ہے شامو۔ ہم سدا ہنسی خوشی کھیلتے رہیں گے شامو!۔ جلد ہی جلد ہی گھرائی ہوئی آوازیں، نہیں۔ سنو۔ وہی سب کچھ اسنے میں ایکم بائی کا شہر اور ہوا کا نذر بند کیا۔ طوفان آیا۔ اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ سمندر کے طوفان میں تم جا کر گھس گئے۔ اور آواز غبر جاتی ہے! نہیں مکل سکے۔ آہ! میں نے بہت دھڑکا بہت دیکھا۔ سمندر کی تہ میں کھوج لگایا۔ پھر بنانے کیا ہوا! ہم دو کہاں گئے۔

ہاشا!۔ شامو یہ سب خیال کی باتیں ہیں۔ کچھ جانا چاہیے میرا فرض۔ شامو!۔ کل جہاں آیا ہے۔ اور تم طوفان میں جا رہے ہو۔ ہاشا غبرو۔ ہاشا!۔ میں ابھی کہاؤں گا۔ تم نہ غبرو۔ جہاں ڈوب نہ جائے۔ شامو!۔ نہیں۔

پھر سے آواز!۔ ہاشا۔ طوفان بہت بڑھ گیا ہے۔ جلدی چلو!

ہاشا!۔ دیوتا ہماری مدد کریں۔ شامو!۔ میں جاتا ہوں۔

ہاشا جاتا ہے۔ شامو اس کو بچتی ہے بچتی ہے۔ ہوا کی

سائیں سائیں انسانی چخوں کی طرح... سنائی دیتی ہیں!

آواز!۔ شامو۔ نہیں۔ ہاشا نہیں۔ مت جاؤ۔ آہ۔ تم کہاں جاتے ہو پھر۔ نہ جاؤ

ہاشا!۔ چھوڑو شامو۔ مجھے جانا ہے۔ دھچکا جاتا ہے!

شامو!۔ آؤ! ہاشا کہاں جاتے ہو۔ چلا گیا۔ وہ کہاں گیا! شہر وں او

طوفان!۔ اور دھواں اگم تیز!۔ آف!۔ مدد۔ میرے ہاشا کو بچانا

دیوتا بھگوان!!

دو طوفانی شور اور ہواؤں کا نذر۔ طوفان کی تباہیوں کی آواز

لگ چلا ہے!۔ اسی میں دیوتاؤں کی آوازیں بی جاتی ہیں!

دیسے شامو کے کانوں میں گنگا گارہے ہیں!

ہوا کا دیوتا!۔ دسائیں سائیں سائیں! سمندر کے دیوتا اب نہیں کرو۔

(خوش گستاخ)

سمندر کا دیوتا!۔ (دشائیں شائیں، ہوا کے دیوتا!۔ ابھی اور ابھی اور

ہوا کا دیوتا!۔ سمندر کے دیوتا یہ نذر۔ (خوش گستاخ آواز میں)

سمندر کا دیوتا!۔ ابھی اور۔ ابھی اور۔ ابھی اور۔ ابھی اور۔

شامو!۔ آہ! کیا شور۔ کیا زور کا طوفان۔ دیوتاؤ!۔ یہ کیسی

آوازیں۔ ہاشا کو کہاں دھندل کیے جاؤں۔ ہاشا تم کہیں

ہو۔ کہاں ہو۔

ہوا کا دیوتا!۔ سمندر کے دیوتا!۔ اب دھچکا چوڑو۔

شامو!۔ آہ دیوتاؤ!۔ مدد۔ مدد۔ ہمارا بیاہ۔

شہر میں آوازیں دب کر رہ جاتی ہیں!

میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ ہاشا کہاں ہو۔

سمندر کا دیوتا!۔ ابھی کچ نہیں ہوا۔ ابھی اور۔ ابھی اور۔ ابھی اور۔

اور۔ اور۔ اور۔ رہنما ہے!

(خوش گستاخوں کی گونج)

دو طوفانی زور ہوا بادل کی گونج۔ آوازیں چنے پکار

## دوسرا حصہ

(سمندری صحن)

طوفان کی رات کے بعد۔ صبح کی وقت

سمندر کا کنارہ۔ حرارت بحر طوفان کا زور شور رہا ہے۔ اب آہستہ آہستہ ہلکا ہوا

جاتا ہے۔ عوامی بقی ہے۔ شامو نے مات شکل سے اس آہستہ

میں گمادی ہے۔ صبح ہوتی ہے۔ سمندر کے کنارے ہلکے پھلکے

ہے۔ جہاز تیار ہو چکا ہے۔ ڈوبے ہوئے لوگوں کی بچ۔ پکارا ابھی

لگ جادی ہے۔ ہلکا ہلکا ہوا کا نذر!۔ اس کے ساتھ یہاں بھی

لگی نذر کی مہل کاں مل کر ایک دھڑلہ سماں پیدا کرنا!

شامو!۔ انگریزی ہوئی آوازیں، دیوتاؤ!۔ مدد!! طوفان تو کم ہو گیا۔ میرا ہاشا

کہاں ہے۔ کسی سے! بھائی تم نے ہاشا کو دیکھا ہے!

جواب!۔ کیا وہ بی لڑکی ہے۔ یہاں کسی کو انہی خبر نہیں۔ ہاشا کی کسے

پڑی ہے! دکنی آوازیں! لڑکی راستے سے ہٹ جا۔ یہیں لائیں

لانی ہیں۔

شامو!۔ آہ! لاشوں کا ڈھیر۔ بنانے! کون کون ہونگے میرے!

آواز!۔ لڑکی تو کون ہے! یہاں سے ہٹ جا۔

شامو!۔ میں کہاں جاؤں۔ تمہیں بتاؤ! ہاشا۔ میرا ہاشا کہاں ہے!

لوگ اس پر ہنستے چلے جاتے ہیں،

دیوانی۔ جیسے شاہ جہاز کا کپتان جو سب اسی کو دیکھ رہے ہیں ہونہ  
بٹ جا رہا ہے، جہاز ٹوٹ چکا۔ ہزاروں آدمی ڈوب گئے۔ کسی کو  
کسی کی خبر نہیں۔

شامو۔ دیوانہ میرا شاہ کباب ہے، جہاز ڈوب گیا، لوگوں کی نجات  
ہو لیں۔ آئے جانے، میرے جانے کی آوازیں، آٹا۔ آٹا۔ شاہ کباب  
جو وہاں دیکھیں وہ فطرت اس کنارے پر آ رہے ہیں۔ نہیں میں  
— میرا شاہ ہوگا۔ طوفان کم ہو گیا۔ اب میں اسکو ساتھ لیکے ٹھہرتی  
جاؤں گی۔ لاشیں نکال رہا ہوں گا۔ گندے مردے نہیں چھرنے دوں گی  
آج ہمارا۔۔۔۔۔

آوازیں۔ ارے دوڑو۔ کشتی میں جہاز کے بچے ہوئے آدمی۔ کشتی  
بھونڈ میں آگئی۔ دوڑو۔ تاج گھر گیا ہے۔ چوہ نہیں ملنا  
چلو چلو مددو۔ وہ ڈوبے۔

شامو۔ ارے تیرے کون۔ شاہ۔ شاہ کباب ہو۔ میں یہاں ہوں  
کشتی بھونڈو۔ میرے شاہ چلو۔ شاہ۔ نہیں تھے۔ میری بات  
سنو۔ شاہ۔ شاہ کباب جانتے ہو۔ ارے کشتی۔ تہا رہی  
کشتی ڈوبی۔ ذرا آٹا۔ بچو۔ آہ۔ پانی کا بچو۔ آہ۔ آہ  
دیوانہ۔ وہ نہیں ڈوب گئے۔ شاہ کباب گئے کیا ہونے  
آہ۔ آہ۔ شاہ۔

آواز۔ دیوانی لڑکی کشتی ڈوب چکی۔ وہ سب ڈوب گئے۔ اکبیل ہیں۔  
شامو۔ وہ بھی ڈوب گیا۔ شاہ ڈوب گیا۔ میرا شاہ دیوانی ہو جاتی  
ہے، میرا شاہ۔ نہیں وہ نہیں ڈوب سکتا۔ آج ہمارا بیاہ ہے  
شاہ چل نہیں رہے ہیں۔ شاہ کباب ہو۔ کہیں: تم کباب ہو  
دھنس جے، ہا، ہا، ہا، شاہ تم بھی دھنسو۔ سمندر بھی دھنس رہا ہے۔ آہ ہا  
سہنا۔۔۔۔۔ دھاتی ہے، میں تمہارے پاس آ رہی ہوں شاہ  
دشمن کو دانا چاہتی ہے۔ کوئی دیکھ کر کچھ نہیں سمجھتا،

آواز۔ لڑکی کیا کرتی ہے۔ جان دیتی ہے، ٹھیکو۔  
شامو۔ تم کون ہو۔ چھوڑو مجھے۔ ہمارا آج بیاہ ہے۔ مجھے چھوڑو  
ہا، ہا، ہا، ہا، ہا، آج ہمارا بیاہ ہے۔ تم جانتے ہو۔۔۔۔۔ ہم نے پہلے  
کی تیاناں لی تھی۔

شامو۔ آگاتا،

اب دھب چلی موری پریم کی تیا۔ ٹوٹ گئے تھار

ڈوبتے سرے ناگیا۔ ڈوب گیا شامو

پریم جن کی آس بندھا کے  
چھوڑ کے موہے گردا نگا کے  
آن لے تھے پریم کے دودے  
بھڑت ہو اب پریم پیاسے  
جیون ساسنی، نگ کے تائے

کباب گئے جو پریم کھو یا، دھب چلی موری پریم کی تیا  
وہ دیکھو آٹا۔ میرا شاہ بچ رہا ہے۔ شاہ کباب ہیں یہاں  
ایک دم کو دہری ہے۔ پانی میں کو دے کی آواز،  
لوگوں کی آواز۔ یہ کیا ہوا۔ دیوانی لڑکی۔ سمندر میں ڈوب گئی  
اتنی دیر سے بچ رہے رہے۔ ذرا آٹا دھب ہو گیا۔ وہ دیکھ  
چھوٹ کے کو دہری۔ کسی کی محبت میں دیوانی تھی۔  
دوسرا۔ محبت کی طاقت نے ہی اسے کیجئے لیا۔ محبت کا طوطا  
بھی عجیب ہے۔

خونناک شور کی آوازیں،

ہوا کا دیوتا۔ سمندر کے دیوتا۔ یہ کیا ہوا۔

۱۔ ہوا کے دیوتا۔ اچھا ہوا۔

۲۔ سمندر کے دیوتا۔ دن دو دیکھیں کو ڈوب دیا۔ آج  
ان کے بیاہ کا دن تھا

۳۔ ہاں آج انکے بیاہ کا دن ہے۔

۴۔ خوشی میں غم ڈال دیا۔ غریبوں کو مٹا دیا۔ اب  
بیاہ کباب ہوگا۔

۵۔ ہوا کے دیوتا۔ تم کیا جانا۔ بیاہ کباب ہوگا۔  
جانتے ہو۔ وہ کسی نہیں مٹ سکتے

۶۔ پھر وہ کباب گئے؟

۷۔ وہ دونوں محبت کے دھنی تھے۔ انہیں ایک دوسرے

سے سچی محبت تھی۔ پاک اور معصوم محبت نے انہیں بچو دیا

ہے۔ وہ کسی الگ نہیں ہو سکتے۔ وہ محبت کی کشتی میں سوار ہیں دیکھ

وہ محبت کی جہت میں ہیں۔

ہیں۔ یہ کیا۔ سمندر کے کنارے کھوہ میں۔ شامو اور شاہ

دونوں بچے جنس رہے ہیں۔ یہ کباب۔

وہاں ہیں۔ جہاں محبت کی بستی ہے۔ محبت لڑتے ہیں۔ سترے

ہے۔ ننت ہے۔ کوئی طوفان جھٹکا نہیں جلاؤ سکتا۔ وہ دونوں پریم

کی تیاناں میں کسی کی پیاس ہے ہیں۔ وہ دونوں وہاں ہیں۔ جہاں

سے ہر بندہ کے فنوں کو — محروم کی خوشبو کو — بچوں کی  
ہنسی کو — سورج کی روشنی کو — چاند کی کرنوں کو — ہوا  
کی آہوں کو — ستاروں کی شاعری اور ساری دنیا کو حکم دیتے  
ہیں — آج ان درن کا بیاہ ہے۔ یہ محبت کا آخری بناو ہے۔  
(تہجد کی گونج)

”بچاؤ کہاں ہیں“

دھمکنے کی آواز اپنی جو بھاتی ہے،

اور ان دیتاؤں کا گنا،  
اس پار چلو، اس پار چلو  
جہاں بہتی پریم کی وحار ہے  
جہاں پریم کے سندر بھول کھلے  
وہی پیانا دلیس جانا ہے  
اس پار چلو

نہ چنچہ ہر وہ شجر

مجید لاہوری

## کارِ بارِ شوق

ترے خیال کو تجھ سے حسین بناؤں گا ترے جال کو کیف آفریں بناؤں گا!  
خزاں کو دلکشی رنگِ آرزو دے کر چین کو جانِ بہشت بریں بناؤں گا  
کلی کلی کو جوانی کی مستیاں دوں گا روشِ روش کو شبابِ آفریں بناؤں گا  
سکوتِ مرگ میں ہنگامہ بقا بن کر نوائے شوق کو میں آتشیں بناؤں گا  
جس اضطراب سے پُر اضطراب ہے عالم اس اضطراب کا دل کو میں بناؤں گا  
تو مسکرائے گی ارماں بھری نگاہوں سے بعدِ نیاز تجھے ناز نہیں بناؤں گا  
سنا سنا کے ترے حسن کی حدیثِ جمیل بلند و پست جہاں کو میں بناؤں گا  
شرابِ برے کی نطرت کے میکدے سے مجید  
سروِ عشق کو یوں دل نشیں بناؤں گا

نوٹ:۔ جن خریدار حضرات کی میعاد خریداری ختم ہو جائے، اور انہیں ختم میعاد کی اطلاع دیکھ لے تو بہتر ہے کہ وہ حضرات دفتر کو پیش کاغذ اب جلد دیں،  
بمدرت دیگر پرچہ دی، پی آنے پر دی، پی وصول کر لیں ان کا اخلاق فرض ہے۔ (خیر)

راہنما کی شش کی گونزی اور جوڑو پر ہادی کو بھی کے ساتھ محوم  
رہی ہے۔ وہ اس کا خب تار یک کا سا رنگ صوف اس کے چہنٹانے اور یا  
کیمر کمر کیا کہہ چکے تھے اس کے وہ کلا جہ تھے۔

ہاں۔۔۔ چائے کے پردوں کی دھلون جنوب کی طرف ہے  
ابو بکر وہ دکا تمام پانی اور نہیں جاتا سگر زیادہ ہر چھا چائے کے پردوں  
کے لئے نقصان ہے۔ جڑیں گل جانے کا اندیشہ ہے۔ ہلکی ہلکی بھوڑا کا  
تو کہتا ہی کیا۔۔۔ کچھ بھی ہو۔ یہ بارش ایسوسی ایشن کی سندھ بحث کے لئے  
فائدہ مند ثابت ہوگی۔ ہماری آمدنی بڑھ جائے گی۔ کیوں؟ ہے نا؟

ہاں؟

ایٹور اپنی دیا بارش کے ذریعہ سمجھتا ہے:

ہاں۔۔۔ دیا۔۔۔ آمدنی۔۔۔ ارے! رانا کی جھونپڑی  
کی کچھریل اڑ رہی ہے:

”یہ بھی ایٹور کی دیا ہے۔۔۔۔۔“

اب بارش بہت زیادہ ہونے لگی ہے۔ گو یا سب کی سب ابو بکر  
روڈ پر ہی برس پڑے گی۔ بکھر کے پتے بکھر کے پردوں کی طرف بھگتے نہیں  
پانی کے قطرے ان پر بارے کی طرح لڑکتے ہیں۔ کہیں کہیں ایک کواک  
مدور ہیرے کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد ایک اور قطرہ وہیں  
ٹپکتا ہے۔ تو ہیرا زیادہ مدور اور بڑا ہو جاتا ہے۔ مگر ٹانگ ٹانگ رات کی  
رانی کے بچوں اس بوچھاڑ کی تاب کہاں لاسکتے ہیں۔۔۔۔۔ اب بکھر  
کے دور یہ کوشیوں میں بچنے والے میکٹر کے پتوں کی طرح ہیں۔ بارش  
انہی سلیٹ کی جھتوں پر سے بہتی لڑھکتی ہوئی ابو بکر روڈ پر آ رہی ہے۔  
بارش کے قطرے ان کے لئے مدور ہیرے ہیں۔۔۔۔۔ مگر رات کی رانی  
۔۔۔۔۔ رانا سر ہینکدہ تھی ہے گا۔ گا۔۔۔۔۔ سراٹھا کر کچھریل کو باندھا ضرور  
کر دیتی ہے۔ اور اپنے بھگتے ہوئے بالوں کی وجہ سے دو گن ویلیاں صین  
بیل دکھائی دیتی ہے۔

پچلے بچاری مٹکی گھوڑی کو ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ اب یہ اس کیلئے  
ایک نئی مصیبت ہے۔ جھونپڑی کی تمام چھت سے پانی بہنے لگا ہے۔ پوٹ  
کی اوڑھنی تو محض رسمی پناہ ہے۔ اس کے تمام کپڑے بیگ کر صبر کے ساتھ  
چپک گئے ہیں۔ شام کے اندھیرے میں جب بکلی چمکتی ہے، تو وہ عریاں  
سی دکھائی دیتی ہے۔

بارش میں ایٹور کی دیا سے کوئی نرم گرم جائے زیب تن کرتا ہے  
کوئی عریاں ہو جاتا ہے۔ کسی کی آمدنی دو گنی ہو جاتی ہے، تو کسی کی کچھریل  
ٹوٹ جاتی ہے۔۔۔ کوئی شب سو گندرتا ہے۔ کوئی بے کس شب تنہا  
دو گن ویلیاں کی سیل کو حب مند ہوا تھی ہے، تو وہیں دکھائی دیتا ہے  
گو یا کوئی سینہ سرو ہونے کے بعد لب بام اپنے میکیلے سیاہ بالوں کو نذر  
سے خد بکھوڑا، رات، رات، رات سے محانتہ ہے۔ رانا کالے حقا کا۔۔۔۔۔

نئے بشن کافرک کر کر صمن میں ہیں بڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جیسے کئی  
مری ہوئی ناک ہو، ہاں ناراض ہے۔ کہ میں نے بشن کافرک کیوں نہیں  
اٹھایا؟ حالانکہ رانا کی گھوڑی پکڑنے میں میں سوسے پاؤں تک بھیک لیا  
ہاں اس لئے بھی خفا ہے۔ کہ میں پر اثر سے آوارہ مزاج نوجوان کے ساتھ  
بارش میں ٹنگوٹا باندھ کر نہانے کے لئے چلا ہوں، ہاں کا خیال ہے کہ میں  
بھی اس کے ساتھ رہ کر آوارہ ہوجاؤں گا۔ حقیقت میں ہاں کے ماتھے پر  
اس لئے جس، کہ میں نے رانا کو شکی گھوڑی پکڑنے میں مدد دی ہے، مگر کوئی  
کوشم کی تاریکی سے علیحدہ کرتے ہوئے اسکی ایال رانا کے ہاتھ میں دیدی  
ہے اور اس فعل کے ارتکاب میں اس سے چھوٹا ہوں۔

میں نے کہا: اسی پراشخت میں تو میں نہا رہا ہوں، مار؟  
حقیقت یہ ہے، کہ اس قسم کی آلودگی کو میں پسند کرتا ہوں۔ پراشخت لکھا  
، تو جس قسم کی آلودگی کو پسند کرتا ہے۔۔۔۔۔ کش! بھرا بال بھی نہ لے  
اور رانا کو ہر ایک کام کے لئے ہمارا مہون منت ہونا پڑے۔ کیا وہ گھوڑی  
بھی پکڑ دے گی، اور کوئی کام نہیں کھے گی؟

ہاں کہتی ہے۔ لو! بڑی سنی پھڑوٹنے والے ایک برہمن کو چوبیس  
قدم، تازی پینے والے تین قدم، جاوہن ہونے والے اتر تالین قدم ہونا  
مانس کھانے والے چوتھے قدم سے لبرٹ کر سکتے ہیں، مگر میں ہاں کو بتا  
ہوں، ہاں! ان لوگوں کی وجہ سے تو ہم زندہ ہیں۔ ہمارا من بھتیگی یہ لوگ باڑ  
ہیں۔۔۔۔۔ اور پھر گھوڑی بہت برائی چائی کو کھانے کے لئے روزانہ سے  
زندہ ہے۔ ہاں کہتی ہے۔ کل جگ ہے۔ گھوڑی جگ!

بظاہر ہاں بشن سے باقی کر رہی ہے۔ مگر دراصل وہ سب کچھ  
سنارہی ہے۔ ہمارا بچہ برہما کا ایک دن ہوتا ہے۔ کرت کرتا، دھارتے لاکھ  
برسوں کے ہیں۔ کل جگ چار لاکھ تیس ہزار برسوں کا ہے۔ پچلے برس جیت  
کے زمین میں کل جگ کو مرٹ پاچھرا تھیس برس گذرے ہیں۔ رام جہانے  
ابھی کتنے باقی ہیں۔۔۔۔۔ اور یہ وقت کی بارش!

”بارش نے کافی سردی پیدا کر دی ہے؟ میں نے کہا  
ہاں۔۔۔۔۔ میرے تو دانت بچنے لگے ہیں۔۔۔۔۔ چلو براہ

میں طہر!

چلو۔۔۔ ابھی بہت وقت تو نہیں ہوا“

”چائے بنو دنا۔۔۔۔۔ سووی ہو رہی ہے“

”چائے بن جائے گی۔ سگرٹ نہیں ملیں گے“

”کوئی بات نہیں! بیڑیاں جو میں میرے کوٹ کی جیب میں“

”مماسے ٹی سندھ کٹ کو آکھو، رات، رات فائدہ مند ہے“

”میں کہتا ہوں کیوں نہ ہم خود ہی چلے جائیں؟“  
”مگر ماں کہتی ہے۔ کل جگ کو صرف پانچ سو برس گئے ہیں۔  
رام جلنے ابھی کتنے باقی ہیں۔“

چروہی گالیاں.....  
”مجھے آدے ڈھائی گھڑی کی..... بکے تیرا خازن لیٹا ہے  
..... گور میں ہے..... خون تھوکے تو.....“

شاید وہ چوکر کھڑا ہو گا۔ میں کیوں اس عورت کے عمر پرانے  
جو مجھے گور میں بھیجا جاتی ہے۔ وہ بے وقوف کیا جانے کہ حقیقت میں  
وہ اسے آبی گور سے بچانے کے لئے اپنی جان تک لٹا رہی ہے۔ وہ اس  
سال بے عمل، غافل، کابل چوکر اسب تک اپنی جگہ سے نہیں ملے۔ صرف  
اس لئے کہ رانا کو اس سے محبت ہے۔ جس کا اس کو اچھی طرح سے امر  
ہے۔ وہی رانا کی زندگی کا سہارا ہے۔ وہی رانا کی آنکھوں کا نور ہے۔ اسی  
لئے وہ بیکس اور اندھی ہے..... اگر رانا پھر مالال کو محبت  
نہ کرتی۔ اگر وہ اس چوکر سے پرانی تمام امیدیں نہ لگادیتی تو سبھی جو جانی

ابو بکر روڈ حرکت ہو کر کھٹے کی کان میں جاتی ہوتی دکھائی دیتی ہے  
ہواؤں کے خلاف ایک دھقان بیٹھتا ہوا آہستہ آہستہ اسی جانب آتا  
ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیل کی دستھی ہے۔ شاید وہ بیل کو کہیں سے  
چرا لایا ہے۔ غالباً اسکی خواہش ہے کہ ہم اسے ہم آہستہ میں کچھ دیر ٹھہرنا  
کے لئے جگہ دیں۔ اور یہ ممکن نہیں کون جانے بیل گوبر سے براہ راست کا  
فرش غراب کر دے۔ اور ماں..... پھر چوری کے مال کو اپنے پاس  
رکھنا.....

”باوجودی سلام“ دھقان کہتا ہے۔

”سلام“ پراسٹرنے زیر لب کہا۔

پھر وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں سے ایک گیلہ کاغذ پرانے  
کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ پروانہ مارا داری..... یہ اس بات  
کا ثبوت ہے کہ بیل چوری کا مال نہیں، اپنا ہے۔ جسے وہ سال مل کی تہ  
میں بیچنے کے لئے لے جا رہا ہے۔

باعث تحریر آنکھ

ایک راس گاؤں میں کے سنگ اندھ کو مڑے ہوئے ہیں، دم  
سیاہ باؤں میں سفید.....

— اور باقی کا بارش نے وجود یا ہے۔ کتنے بے ربط ہوتے ہیں۔  
دھقان لوگ۔ پہلے سنگ اور پھر دم، بعد ایشرفتن، ان کے لئے کو آدم  
اور سنگوں کے درمیان کوئی جگہ ہی نہیں جسم کا رنگ پہلے آنا چاہئے تھا

لڑکا چھوڑ پی میں سویا پڑا ہے۔ بجھے ہوئے چولہے کے پاس گرم ہو کر  
..... اگر وہ جاگتا ہوتا۔ تو شکی گھوڑی پھرنے کے لئے اسکی ماں کو سیرا  
مردوں منت نہ ہونا چڑتا۔ پھر ایلال تو چلا ہی گیا ہے کاش! وہ کابل  
لڑکا ہمیشہ کی نیند سو جائے!

شاید رانا کھڑی بندھوانے کے لئے ہمیں بلائے۔ اس کے بارے  
کیونکہ سے بدن کے ساتھ چپکے ہوئے کپڑے؛ بکلی کی چمک میں اس کا  
بدن کتنا خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ اور ماں..... ان کچی بے  
کل جگ ہے۔  
— اور رانا بالکل بیگ چکی ہے۔

گلہ کی مارٹ میں چائے کتنی بکے گی؟ کتنی دساور کو جانے گی  
میری آہنی بڑھ جائے گی پراسٹرنے بھی..... مگر وہ کجست اللہ بڑیاں چوکر  
چائے کے پیالوں کے چائے اور شراب اور..... مگر رانا کی کچلی  
اڑ رہی ہے۔

”بجھے بکے گئی، اپنے کتے توڑے..... سوئے کا سو یا رہ جائے  
تو.....“ رانا اپنے چوکر کے کولگالیاں دے رہی ہے۔

رانا کو چائے کی ضرورت نہیں، گالیاں دیتے ہوئے اس کے  
جسم میں کافی گرمی آ رہی ہے۔ وہ نکماست لڑکا اس کے ساتھ کھڑی  
بھی تو نہیں بندھوانا۔ آرام سے بجھے ہوئے چولہے کے پاس پڑ رہا ہے  
پانی کی چھٹلیں پڑتی ہیں۔ تو ناگھیں سیکڑ لیتا ہے۔ جب اندھ پانی ہی پانی  
ہو جائے گا۔ تو وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھے گا۔ صرف یہ کہے گا۔ ماں کیا بات ہے  
جو اتنا شور مچا رہا ہے؟ چین سے سونے بھی نہیں دیتی..... بھلا کوئی  
بات ہی نہیں۔ وہ تو شاید یہ بھی کہے میں اسی عورت کے گھر کیوں پیدا  
ہوا۔ اور اسی اسی گالیاں دیتی ہے۔ جسے میری کوئی بھی ضرورت نہیں۔  
کہتی ہے۔ سوئے کا سو یا رہ جائے تو..... وہ بے وقوف کیا جانے  
کہ جب ماں یہ کہتی ہے کہ سوئے کا سو یا رہ جائے۔ تو اسوقت وہ اسے  
ہمیشہ کی نیند سے بچانے کے لئے طوفان باد و باران میں محسوس تباہی یا رو  
دو گا رانی جان تک لٹا رہی ہے۔

ابھی انتہائی گرمی کیونکہ سے اسکی شکی گھوڑی یوں مختار ہی تھی  
جیسے سکندر سے جا ہونے پر بوس فلیس مختار تھا۔ مگر اب وہ خاموش  
ہے۔ شاید اس نے رانا کی بے بسی کو دیکھ لیا ہے۔ اور پھر ایلال کے پیار  
کو..... اب وہ کہیں نہیں مختار کی!

پراسٹرنے کہتا ہے۔ وہ ایک مرتبہ مد کے لئے اشارہ تو کرے؟  
..... سارا..... اور میرے دل..... میں نے جواب دیا۔



ملیں جسم، اندوہ بارش میں گیا ہو کر سفید ساٹن کیلچر دکھائی دینے لگے۔  
درجہ میں اس کا سفید رنگ نظر آتا ہے۔ مگر جب بجلی چمکتی ہے تو بیل  
جلی کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ . . . . بیل تمام زور لگا کر ہلکا ہے جس  
درجہ طوفانی مہاراج کو دیکھ کر پیار سے ان کا ہندی گن ہانک رہا ہو شاید  
بیل چمکتے ہو کا ہے۔ مگر اپنے بوڑھے، مکروہ شکل مالک کو پیار کئے جانا  
ہے اگرچہ جانتا ہے کہ بوڑھا کل اسے نال محل کی منڈی میں بیچ ڈالے گا  
اسے! بھگت اور جنوں کے اعزاز بھی کسی جھٹکتے ہیں؟  
دیکھیں جیتے ہوتے خود بصورت بیل کو؟

”باپوئی۔ . . . . بھٹکتے تباہ ہو گئی ہیں۔ . . . . مالید دینا ہے  
۔ . . . . ایسے ہی ہے وقت کی بارشیں۔ کیا میں امداد جاؤں اس جھٹ  
کے نیچے؟“

”اوں ہوں۔۔۔۔۔ تباہ راہ بیل گو برے برآمدے کو خواب کر دیا  
”میں صاف کر دوں گا باپو جی!۔۔۔۔۔ شیشے کی طرح۔ . . . . بیل صحت  
کے بھر کا ہے۔ اتنی سوری کہاں برداشت کر گیا لہذا پردہ سری بات نہیں  
نقد یہ پروانہ راہداری وصل گیا تو یہ بیل چوری کا مال سمجھا جائے گا۔ نال  
محسوس کاٹھانے دار جہاں خاں بڑا گڑھا آدمی ہے مار مار کر ادھ مو کر دیا  
میں جاتا رہے گا۔ نال محل میں اس بیل کی قیمت پر ہی تمام امیدیں لگا  
رہی ہیں۔ . . . . ہائے یہ بے وقت کی بارشیں“

”جاؤ! پراثر لے کہا۔ . . . . ہم نہیں یہاں بک نہیں دے سکے  
عباد۔ . . . .“

دہقان سہم کر چلا گیا کسی کسی چمے پر دکر دیکھ لیتا ہے۔ گویا رات کو  
ہمارے ہاں ہی سینہ لگاتے گا۔ اگر وہ سینہ لگائے ہی تو حق بجانب ہے  
تیناے سوچتے ہوئے کہا۔

بیل ابو بکر روٹے چوک پر گڑھا ہے وہ دہقان کے اٹھانے۔ . . . .  
کسی کے اٹھانے نہ لگے گا۔ وہ ہندی گن کی طرح دہقان کو دیکھ کر کسی نہیں  
ہانک لگائے گا۔

”اور کدھ سٹگ جانے ہی نہیں؟۔ . . . . نہیں؟۔ . . . . کتنے کاہل ہو تم  
راٹکے چوک سے کی طرح۔ عوہم تم سے محبت نہیں کرتے۔ ہمارا کر جان  
کمال دیں گے۔۔۔۔۔ جی کی کیتھ کے مکر تو کر لوگ حوام کی کھاتے  
ہیں۔ ہرنی مہاری عورتیں انہیں مانگتے نہیں دیتیں۔ چو کا انہیں نہیں  
لگتا ہوتا۔ اور ماں کو تو اس کی صفائی بھی پسند نہیں۔ بچانے وہ  
کرنا کیا ہے؟ میں نے کہا۔

بچہ میں نے پراسش سے پوچھا۔  
”کتنی پیالیاں پیو گے تم؟“

”چچہ!  
”پارہ شش۔ . . . . اور ورجن بیسٹریاں؟  
کہ دو ہاں۔“

”زیادہ۔ . . . .  
”چھی؟  
”بارش اور بھی تیسرہ ہو رہی ہے۔ . . . . اور رانا کی گالیوں  
کی بارش بھی!“

کچھ مل گرا ہی جاتی ہے۔ دیواروں میں شکاف پورے ہیں۔  
قریب ہی ایک سیٹھ کے سہ منزل مکان کا پر نالہ رانا کی جھونپڑی  
پر گرنے لگے۔ جھونپڑی کے اوگرو ابو بکر روٹے چمکتے ہوئے پانی کو  
دیکھ کر طوفان روح کا خیال آتا ہے۔ کیا ہم رانا کی مدد کر سکتے ہیں؟  
باوجود کل جگ کے۔ . . . . ہمارے برآمدے کے سوا اور کوئی  
نزدیک پناہ ہی تو نہیں ہے۔ پراسش خوش ہے۔ اس کے پاس  
چائے ہے۔ بیڑیاں ہیں۔۔۔۔۔ اور بے پناہ رانا ادھر رہی  
جانے گی۔ . . . .

رانا چادوں طرٹ دیکھ رہی ہے پراسش بولا۔  
”ابھی وہ کہے گی۔ مجھے اپنے دامن میں چھپا لو باپو جی  
۔ اوں ہوں؟ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”تو اس کے سوا اسے چارہ ہی کیا ہے؟  
”یہ بارش کا دامن کیا اس کے لئے کم ہے؟۔ . . . . رانا  
کی سی عورت کو میں جانتا ہوں۔ . . . . جب کسی ایسی  
مصیبت زدہ پر عورت کے دامن تنگ ہو جاتے ہیں۔ . . . . تو خود  
بخود ایک بہت بڑا دامن اس کے لئے کھل جاتا ہے۔ . . . .  
۔۔۔۔۔ رانا کی تو ٹھیکیاں بند ہیں۔ کبھی کبھی وہ راحت پیتے  
ہوئے چیخ لیتی ہے۔۔۔۔۔

”جو ان مرے۔ . . . . کھوئے۔ . . . .  
۔ . . . . میں نے تو دلیا تجھے بے چین“

”خاکتہ کرتے ہتھیاری نہ بکھو دینا ضروری ہے۔ بچہ  
خاکتہ کرتے ہتھیاری نہ بکھو دینا ضروری ہے۔ بچہ

# عربوں کا جنگی ترانہ

ہم تقدیر سے بھی زیادہ  
تیز رفتار ہیں۔

ہم ہر وقت ٹھوڑوں پر سوار  
جنگ کے لئے تیار رہتے ہیں

ہم مغربی حکمرانوں کی  
تہذیب و تمدن کو

کھل دیتے ہیں۔  
اور مغرب کے

سفید فام بادشاہوں کو  
خبردار ہو جاؤ

ہم شہسار ہو جاؤ  
عیش و آرام ہم سے

ہم دور رہتے ہیں  
اور ہم ہر دلوں کی موت

مرتے ہیں۔  
عورتوں کی طرح

ہم آہ و بکا نہیں کرتے۔  
اور نہ ہی بچوں کی طرح

بڑ بڑاتے ہیں۔  
بلکہ

ہم غموں کے رستوں پر  
سوئے ہیں

ہم نئے جذبوں اور نئے دلوں کے ساتھ  
بیدار ہوتے ہیں۔

اور میدان جنگ کی سمت  
فتح مندانہ انداز سے

روانہ ساتے ہوئے۔

سورج اور حسانہ  
ہماری دھنسا کر تے ہیں

اور نسیم بہار  
ہمارے بالوں کو

چھوٹی ہوئی — گزرتی ہے۔  
ہم — شمال سے جنوب

اور مشرق سے مغرب — کی جانب  
فتح مندانہ انداز سے

بڑھتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔  
تلوار ہماری پیش قدمی کرتی ہے۔

اور ہمارا قومی پرچم  
ہلائی نشان کے ساتھ

ہر جگہ ہراتا ہوا دکھائی دیتا ہے  
ہم میدان جنگ میں

موت کے دانت کھینچ کر دیتے ہیں  
ہماری تلواریں اور نیزے

دشمنوں کے دلوں میں  
ایک غیر فانی براس

پیدا کر دیتے ہیں۔  
ہماری ڈھالیں

ایک پرسکون چٹنے کے  
پانی کی مانند جھکتی ہیں۔

دشمن کے بڑوں اور جوان مرد سپاہی  
ہماری تلوار کی محض جنبش ہی سے

بے موت مر جاتے ہیں۔  
خدا کے فضل سے

ہم — فتح مند و کامیاب ہیں۔

احمد نیم قاسمی

# پہلا تجربہ

اب وہ بڑی سڑک پر آگیا۔ ایک موٹر آئی اور دو، تین بجھنے لگتی ہوئی اس کے قریب سے گزر گئی، اس نے اپنی جھریوں اور دھوئے ہوئے چیتروں سے کچھ پونچھے ہوئے ایک لمبی آہ بھری کہ اس کے ماتھے کی گہری انچھڑائیاں اور آؤہر دیکھا۔ سامنے ہسپتال نظر آیا۔ سوچا، اگر میں سے بخار کے معاملہ جانے تو شہر جانے کی کیا ضرورت! بھنے کا بخار بھی تیز وقتا کہیں وہ بے ہوش ہو کر کھاٹ سے ٹپے نہ آ رہا ہے!

ڈاکٹر صاحب ایک بڑی میز کے سامنے کرسی پر بیٹھے کہ کھڑے تھے۔ اس پاس سفید پوش مریضوں کا ہجوم تھا۔ بوڑھے بچے چیتروں سے قہقہراتے ہوئے ہاتھ باہر نکال کر تھوڑی کے بچے چولہے اور ہلار سے سلام حضور!

وہ سلام کے جواب میں ڈاکٹر صاحب کے سر کی ایک خفینہ سی حرکت کا فطر تھا۔ لیکن مایوس ہوا، اور دھڑکیا کہ ان مریضوں ہی میں سے شاید کوئی بچلے ناش ہمدردی کرے اور سفارش کر دے۔ لیکن سب ڈاکٹر صاحب کے علم پر ہنگامیں گاڑے انہوں پر تھہر کے بے جان تہوں کی طرح بیٹھے تھے۔

انگنائی ڈاکٹر صاحب کو عجیب لگتی، جب پر رومال لے کر سامنے دیکھا، پھر دھاموق غنیمت جان کر اس ادب سے فرش پر جھک گیا۔ اور بکرا۔ سلام حضور! — اور جب سر اٹھایا تو ڈاکٹر صاحب کا قلم اسی طے فر فر علی رہا تھا۔

اس نے سوچا، اس طرح تو شاید ہی کام بنے۔ چودہ ماہے قضا صاف ہے دھڑک بہہ ڈالتا چاہیے۔

”حضور! میرا ننھا بچہ برسوں اترسوں سے سخت بخار...“ ڈاکٹر صاحب کے ٹھونسنے نے میز کی چولیس ڈھیلی کر دیں کاغذ دو اتیں، اور سرخ ریز کی لٹیاں لہڑا لٹھیں بوڑھے کا دل بے اختیار پسلیوں سے ٹکرا کر رہ گیا، اس کے منہ سے ہونے لگا آپ سے آپ چیتروں کے نیچے چلے گئے۔ اس کی ہانگ، کان اور ہونٹ ہلدی کی طرح زرد پڑ گئے۔ پھر واپس سڑک پر آگیا، ایک اور موٹر جھبک سے اس کے قریب سے گزرتی۔ مرنے کے معنی پر دے کے قریب اندھنی طرف رنگ برنگ کی ایک گڑیا اپنی اچھلتی موٹر کے ساتھ غائب ہو گئی۔ پھر چلنے

پھر اور پڑی تھی۔ بوڑھا اپنے دھوئے ہوئے چیتروں سے لپٹا ہوا باہر نکلتا نکلتا آنکھوں پر ابرو ٹٹک رہے تھے، اور ہونٹ چہرے کی بے شمار جھریوں میں غلط ہو گئے تھے۔

وہ اپنی گدشتہ زندگی نہایت باعزت طریق پر گزار چکا تھا۔ آخری دہائی میں بڑا اینٹوں کے بچنے میں کام کرتا ہوا اصل کر مر گیا اور بوڑھے کے بار کو سخت دھکا لگا۔ گاؤں میں ایک چھوٹی سی لون مرچ کی دوکان بنائی تھی چند بہتوں کے بعد اسے بھی بند کرنا پڑا۔ گاؤں میں جو تھوڑی بہت مالک قائم تھی، وہ بھی بھنے لگی، خود وہ طبیعت پانی تھی گاؤں سے اٹھ کر یہاں رہ رہا گیا تھا۔ یہاں بھی کوئی باعزت جگہ نہ مل سکی، ایک بہت سلاچر تھا، انھیں خدا نے کچھ سے بیمار کر گیا۔ چادر کے پلوں جو دو چادر ٹھیکریاں بنائی تھیں وہ ختم ہو گئی تھیں، جیم نے چوٹی کا ایک ننھا بچہ کیا تھا، اس کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ بچہ کر دے۔ بیسک، ہانگے، شرم آتی تھی کوئی شہاسا تھا نہیں کہ اس سے ترندے لیتا۔ راضی ہر مانا ہو کر بیٹھ رہا لیکن بچے کی دھکی دھکی اتھاڑ اس نے کبھی جھس دیا دانتوں میں اٹھی داب کر لے لیا سوچا، کوئی جگہ جاتا تو ہے نہیں۔ دو چار جگہ ہاتھ پھیلاؤں گا، کچھ لگیا دیکھو نہیں تو اپنا لہرے کا لاکھونٹ کر مر جاؤں گا۔

آج وہ مجبور ہو کر بیسک لگے کے لئے جھونپڑے سے باہر نکلا۔ آج جھونپڑی کے دہانہ پر ایک بڑیا کھڑی تھی۔ بولی۔ کہاں چلے جئے

سید! بڑھے کے پسے منہ سے یہ لفظ جیسے پھسل کر نچے گر گیا۔ شہر۔  
- بھنے کا بخار اتر گیا؟  
- نہیں، اور تیز ہو گیا۔  
- کوئی دوا پلائی؟  
- خریدنے جا رہا ہوں؟  
بڑیا سر جھکا کر اندھنی گئی اور بوڑھا سوچنے لگا۔ کہ کیا بھیک مانگے  
پہلا اصول جھوٹ بولنا ہے!

وہ کچھ نہیں پسٹا گڑا پڑتا چلا جا رہا تھا۔ دھڑک پڑ گئی چلتے ہی بڑھے کے بھاری بھاری دھن پنے شب شہر پر کھڑے ہو گئے۔

دل میں کہا: "میں چار آنے کی ہوگی یہ گڑبا: اور مجھے چوٹی کی دوا خریدنی چاہیے" اس نے پلٹ کر ہسپتال کی طرف دیکھا۔ دروازے پر سفید دھن سے بنییراتی ہسپتالی نگہ بوا تھا۔ بوڑھے کو یوں معلوم ہوا جیسے یہ الفاظ اس پر سن رہے ہیں، وہ کچھ سوچ کر تیز قدم اٹھاتا شہر میں گھس گیا۔ پھوار کے نئے نئے قطرے اسکی انجمی ہوئی میل ڈاڑھی میں ٹپک رہے تھے، اور اس کا سارا دم سردی کی شدت کی وجہ سے اس کے دل کی طرح کانپ رہا تھا۔

ایک بہت بڑی عمارت کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ رک گیا۔ کسی اخبار کا دفتر تھا۔ سامنے ایڈیٹر صاحب کا کمرہ تھا۔ اس نے چن اٹھانے کا اور وہ کیا سگر پائے کہ جسے کسی نے کبھی سے پکڑ کر کھینچ لیا، زبان میں جیسے گا نہ پڑی۔ اور ان کو بیک دینے والا خود بیک مانگ رہا تھا۔ اس کا سر جھکا گیا، جھگی ہوئی ڈاڑھی کے بال زوٹھم سے اکڑ گئے مگر بہت کم کے ہاتھ آگے بڑھا ہی دیا۔ حضور! ایک پیر اللہ... ایڈیٹر نے اپنے تختوں سے سگرٹ کا دھواں نکالتے ہوئے کہا: "جھاگ جاؤ، بوڑھے کا ہاتھ بڑی تیزی سے واپس چھتھروں میں گھس گیا۔"

باہر نکلا تو ایک شکرم سے ایک عورت نرم و گرم سوروں ملفوف اتری، اور ہاتھ میں پھرتے کا ایک پیگ لٹکا کر اندر جانے لگی۔ بوڑھا قدرے جھکا مگر میرے اختیار پر اٹھا۔ بے بی بی جی میرا بچہ... بی بی جی نے جیب سے رو مال نکالا، اور ناگ پر ٹپک کر لڑائی ہوئی ایڈیٹر کے کمرے میں گھس گئیں۔

اس نے سوچا کیا آج میرے بہت سے آ رہے ہیں! اس چارہ کم کی آبادی میں میں نے سینے کے اندر دل نہیں کیا! پیسے لوگوں کو اتنے محبوب کیوں ہوتے ہیں کہ انہیں دم بھر کے لئے بھی اپنے بٹوسے سے جدا نہیں کرتے۔ اور میرے کمرے میں گزری گروہوں کے ساتھ کس شان سے کہتے ہیں: "پیسہ! پیسہ! پیسہ! تو میرے ہاتھوں کا میل ہے! جھوٹے۔ ریاکار!"

وہ اب تنہا تنہا بائیں سوچنے لگا۔ فقیروں کی امیدیں مر مر کر زخمی ہونے کی جو گرگیوں ہوئی ہیں! میں کتنا ڈھیٹ ہوں لیکن یہ میری دشمنی نہیں قوت برداشت ہے۔ بڑے بڑے جرنیل بھی فقیروں کی سی قوت حوصلہ کے مالک نہیں ہوتے۔ آٹ! جب میں نے اپنے جیسے انسانوں کے آگے بائیں لٹکا کر ہاتھ پھیلائے تھے تو خدا جانے کائنات دیرہ دیرہ کیوں نہ ہو گئی۔ آسمان کیوں نہ ٹوٹ پڑا۔ زمین کیوں نہ بھٹ پڑی۔ ان امیر لوگوں کے پاس تو غریبوں کے لئے ضد نرم الفاظ بھی موجود نہیں

وہ چھتھروں میں ہاتھ پھیلانے تیز تیز قدم اٹھاتے بڑھ چلا، ہاتھ اس کے سر کی ٹوٹی تیز لمبا کر نہ دھک سکی۔ اس کے گجے سر پر ہنستا ہانی موٹی موٹی ہونڈ میں بن کر گر رہا تھا، اسکی آنکھوں میں کبر سے یادہ کیوجہ سے آنسو تھے۔ جہریوں میں پھوار مانگ رہی تھی، آدھی ڈاڑھی چھتھروں میں چھپ گئی تھی، جسم جھکا ہوا تھا، ہونٹ نیلے پڑنے لگے۔ ناگاہ سے کچھ دور ایک بوڑنگ ہاؤس نظر آیا، وہ سوچنے لگا: یہ کم عمر بڑے اتنے چھروں میں ہونے، اور پھر انہیں پیسے کی اتنی پروا بھی تو نہیں ہوتی، باپ کا مال، بوت نہال، سینا یا سٹھانی کے منہ پر سے دو چارے بچے دے دیں گے۔ انہیں ثواب ملے گا، اور سب اچھا ہو جائے گا۔

وہ دروازے کی سیڑھیاں چڑھ کر اندر داخل ہوا چار لڑکے اکٹھے کھڑے بائیں کر رہے تھے۔ اب اس نے اپنے سینے میں سے خود داری عزت نفس اور غیرت کی دھن کیلے کر باہر فرش پرستہ مائل اور پیشہ ور گدا گروں کی طرح بولا: "بابو جی... ایک لوکا بولا: بابا! یہ بڑا امیر ہے۔ اس کا باپ ٹوٹی ہے۔ دوسرا لٹکا بولا: بابا! اس کا باپ بڑا زہید ہے۔ پانچ بوڑے ہیں ان کی۔ پانچ؟"

تیسرا لڑکا بولا: "اس سے مانگ اس سے۔ اس کا باپ پورا زہد ہے۔ زہید اردوں کی کھالیں اوھینے والا۔"

بوڑھے نے محسوس کیا، کہ وہ ایک کھلونا ہے جس سے یہ سب لڑکے کھیل رہے ہیں۔ لیکن اسے چوٹی کی فوری ضرورت تھی، اور وہ بڑا بادشاہوں کو فقیروں کے قدموں پر جھکا دیتی ہے۔ وہ تو ز مانے کا شکر یا ہوا ایک بد نصیب بوڑھا کھوسٹ ہے جس کے لئے کو چوٹی کی دعا کی ضرورت ہے۔

اس نے چوتھے لڑکے کی طرف اٹھکی، اٹھادی: "تم ہی مہربانی کرو بابو جی!"

وہ تو میرا شیا تھا۔ کہنے لگا: میرے والد صاحب گدا گروں کے سخت خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہندوستان کی غلامی کیوجہ یہ ذلیل بیکاری ہیں، جو چھوٹے بڑے کے آگے ہاتھ پھیلا کر انسانی غیرت بچتے رہتے ہیں۔ چل ہٹ دور ہو، مجھے تیری غلیظ ڈاڑھی سے بڑا ہی چاروں لڑکے قدر زود سے بھٹنے لگے اور اس نے محسوس کیا کہ بوڑنگ ہاؤس کا براؤہ مٹا آرہا ہے۔ اور غریب اسے یہ دیوانہ جکڑیں گی۔ اور وہ چمٹا چلا مار جائے گا۔ مر جائے گا؟ — اسے اپنے

ایک اور شخص پر جاندار جس کا طرہ مور کی دم کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ وہ بولا: دفع ہو غلط کئے۔ مائٹھی کی سی جگہ ہے کیا؟

بوڑھا چھاتی لٹا ہوا جلسہ گاہ سے نکل آیا ایک مرل سی کتیا جو دم کو ناٹھوں میں دبانے ایک پودے کی اوٹ میں بیٹھی تھی۔ حسرت بھری نگاہوں سے گھومتی تھی پوڑے کے آسوا آنکھوں سے نکل کر جھروں میں اٹکی چوٹی بھوہ میں ل گئے اس نے اپنے جی میں کتیا کو خنقاب کرتے ہوئے کہا: ادھر آ ادھر آ۔ ادھر آ جا کتیا، تو بھی دیکھ کی ٹھکرائی ہوئی معلوم ہوئی ہے۔ تو بھی میری طرح ٹھٹھ رہی ہے۔ اونٹیری پسلیاں بھی میری طرح ابھری ہوئی ہیں۔

کتیا فقیر کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر جلسہ گاہ کی طرف چل دی۔ اس کی لٹکی ہوئی دم اور جھجے ہوئے بے کاؤں کے کناروں پر سے چوڑا موٹے موٹے قطرے بن کر نیچے گر رہی تھی فقیر نے اپنی خاموش تقریر جاری رکھی، ادھر ادھر نہ جا۔ وہاں بھارت مانا کے سپوت تیری پسلیوں میں ایسی کہیں لگائیں گے۔ کہ تیرا بھیا نکل جائے گا۔ وہاں غلامی کا جوا اتارنے کے مشورے ہو رہے ہیں۔ ادھر غریبوں کا گزر نہیں؟

دماغ یوں بے تحاشا کام کرنے لگا تو پوڑے کے کان بجنے لگے اس نے جہاں میں پاگل ہو رہا ہوں۔ کتوں سے باتیں کرنا داناؤں کا کام نہیں۔ وہ چید اس کی مٹھی میں انگارے کی طرح دہنے لگا، وہاں پھینک دینا چاہتا تھا۔ سسل دینا چاہتا تھا۔ لیکن شاید اس سے ایک سیب خرید اجائے! اب اس نے مٹھیاں بھینچ کر دوڑنے کی کوشش کی مٹھالے فضا میں موجی موجی آنکھوں سے آنسو گرتا، منہ بہورہ سسکتا لٹکرایا۔ اب وہ فوجوں کی طرح دوڑنے لگا!

چانک اس کے قدم رک گئے۔ سامنے کارخانے کی لمبی لمبی چمنیاں دھواں اگل رہی تھیں۔ دھک۔ دھک۔ دھک۔ دھک۔ دھک۔ اس کا دل شین کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر تڑپنے لگا۔

وہ جی میں کہنے لگا کیا میاں سے بھی نا امید ہوتا ہے گا! اس جگہ سے تو ابھی بچے کچھ۔ لواصے کھنے کے پاس خالی ہاتھ کچے جاؤں خالی ہاتھ جانے سے تو کتنا بستر رہے گا۔ کہ کتنے مرچا۔ بے شک مرچا بچے سے تیرے لئے چوٹی کی دعا نہیں خریدی جاسکتی۔ بے شک مرچا۔

الٹی۔ الٹی!

وہ کارخانے میں داخل ہوا۔ کالے کالے چہرے۔ کالے کالے لباس! کالی کالی مٹھیاں! گونا گونا میرا! سلام حضور!

نئے کا خیال آگیا۔ چھاتی کی دوا بائیں جانب چوتھی اور بائیں پسلی کے ر۔ بان کوئی تھے اس زور سے اٹھتی کہ وہ گرتے گرتے بھا۔ وقتیں لوٹنا چاہا تو ایک لڑکے نے بڑھ کر ایک پسیدہ اس کی کمر اور آویں ہنگیوں میں مقنا دیا اور بولا: بے بابا! حاتم یہ تو نہ کہے گا۔ کہ اس کے بعد اس دنیا میں اس کا نامی نہیں۔ آج ہم نے اس کی قبر روت۔ ادھی دی!

چاروں لڑکے پھر پھوہوں میں غرق ہو گئے۔ وہ یہ مٹھیاں ہنگیوں پر آگیا۔ ایک لڑکے کی آواز آئی: بابا! بے کو مضبوطی سے ٹکے رکھنا رہے یا بڑی تیز ہے؟ جیسے فقیر کا کوئی گنا گنٹ رہا تھا۔

مجھے واپس ہو جانا چاہیے۔۔۔۔۔ مجھے واپس ہو جانا چاہیے کب یہ انتھا اکیلے ہی دم توڑے۔ اس کا جسم ٹھنک رہا تھا اس کی آنکھیں سرخ تھیں، اور اس کی سانسیں بہت تیز چل رہی تھیں مجھے واپس ہو جانا چاہیے!

چید مٹھی میں دبانے وہ ایک اور مٹے سے واپس آنے لگا۔ سے ایک بہت بڑے سید لن میں ایک بہت بڑا ڈھام تھوڑا سا ایک بہت بڑے شامیانے کے نیچے لوگ ایک دوسرے سے چٹے بیٹھے تھے یہ بہت بڑے قوی رہنا ایک بہت بڑے اینچ پر اچھل رہے تھے کہ درہے تھے۔ جھکتے تھے۔ تھتے تھے۔ گھونٹے پانتے تھے۔ بائیں جہاتے تھے۔ منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ آنکھوں سے خرابے برس رہے تھے۔ اینچ کا پ رہا تھا۔ خود پ رہے تھے۔ بوڑھا سوچنے لگا۔ ان لوگوں کے دل اتنے بڑے سید کی باتیں سن سن کر سب رہے ہوں گے۔ ان میں سے کوئی خدا ترس مجھے ضرور سہارا دے گا۔ اوشا! کوئی چوٹی کے بجائے اٹھنی دے دئے۔ شاید میں کھنے کے لئے کچھ پھل بھی خرید سکوں گا۔ بچے چاہا بچے بوشی میں سیب مانگ رہا تھا۔

وہ آگے بڑھا۔ اس وقت رہنا صاحب فرما رہے تھے ہم ہندوستانی ہیں۔ ہم ہندو ہیں نہ مسلمان نہ سکھ نہ عیسائی نہ پارسی نہ یہودی۔ نہ۔۔۔۔۔ ہم ہندوستانی ہیں۔ ہم سب ہندوستانی ہیں۔ ہندوستان ہمارا خیم بھوی ہے۔ ہندوستان ہمارا دیوتا ہے۔ ہندوستان ہمارا سب کچھ ہے۔ ہندوستان کی ہے۔ بھارت مانا کی ہے۔ انقلاب نہ بادو

حافریں زما جوش میں فرش پرست کو دو دواتے تھے ہر آنکھ پر خون تھا اور برب پر لغو۔ پوڑے نے مجمع میں ایک شخص کے اندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا: بے مولوی جی۔ مجھ غریب کا ننھا۔۔۔۔۔ بوڑھے کی چھاتی کہنی کے سیدھے نشانے سے چٹ گئی وہ لوٹ کر

میں دو تار تھا۔ وہ دس سال پہلے کا پرانا باغ تھا۔ چودھوی  
نظر آنے لگا۔

.....  
اچانک کارخانے میں بجلی بج گئی۔ اسے لیٹا۔ پڑنا۔  
وہ گیا۔ وہ۔ وہ۔ وہ گیا۔  
خون سے لہڑا ہوا ایک، مٹائی ہاتھ، جس نے اپنی زبردست بھاری  
میں ایک چیمہ تمام رکھا تھا۔ دن سے میجر کی میز پر آگرا!  
میجر نے حیران ہو کر پوچھا کیا ہوا؟  
ایک مزدور ہراساں لہجے میں بولا: حضور۔ وہ فقیر مشین کی  
جھپٹ میں آکر جھڑنے کھڑے ہو گیا۔  
توپولیس میں اطلاع کر دو۔

باہر کارخانے کی لمبی لمبی چیمیاں دھواں اٹھ رہی تھیں  
دھک۔ دھک۔ دھک۔ دھک۔ دھک۔ مشینوں کی آواز آ رہی تھی

۔ اسے باتریاں کیسے گھسی آیا! بھاگ جا!۔  
حضور۔ میرا غصا سا بچہ ہے۔ تین دن سے بیمار پڑا ہے۔ اگر ایک  
چوٹی.....  
”معاف کر جا!۔“

پورے نے سوچا، اب نے کے ہی ٹلوں گا۔ یوں تو یہ لوگ بڑی  
کی باتیں ایک کان سے سنتے نہیں، اور دوسرے نکال باہر سمجھتے ہیں  
بولتا با بوجی۔ اگر میں.....  
۔ اسے پیرہ ہے کیا؟۔ بھاگ جا۔

۔ میں حضور۔  
۔ چیرا سی اسے دھکیل کر باہر کر دے۔ یوں مانگتا ہے۔ جیسے مجھے  
اس کے آپ کا قرضہ دینا ہے۔ لہا۔ بد معاش۔ کنگھا!۔  
پورے کا کارخانہ بجائی چیرا سی! مجھے دھکا نہ دینا۔ میں غریب  
صاف دس گا۔

پورے صاحب بڑے اطمینان و سکون سے واپس مڑا۔ اس کے  
چہرے پر سنجیدگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ اس کے انداز

.....

## پنجاب کے عظیم اشران ادارہ مکتبہ اردو

اور

ہندوستان کے بلند پایہ علمی، ادبی، و تحقیقی رسالہ

## ادب لطیف

کی ہر آنچ ماہ شمسیہ میں سلطنت آصفیہ کی پانچواں حیدر آباد کن میں کھول دی جائے گی

نظام اسٹیٹ کے اردو میں حضرات کو پنجاب سے وی بی نہیں بھیجا جاسکتا، کیونکہ پوسٹ آفس عثمانیہ پنجاب کا مٹی آرڈر وی بی پنڈ  
کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اس وجہ سے قدر دان حضرات کا شوق تشذیب رہتا ہے۔ اور پبلشروں کے پاس سوائے پوسٹ آفس کے اور کوئی ذمہ  
نہیں ہے۔ ان نکالیات کے پیش نظر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ماہ شمسیہ حیدر آباد میں رسالہ و مکتبہ دونوں کی ہر آنچ کھول دی جائے  
اس سلسلہ میں مکتبہ و رسالہ کی جانب سے جناب محترم اقبال..... سکرم گاہندی ناظم ادبی سٹیٹ حیدر آباد و مکتبہ نے جارہے ہیں۔  
اسی وجہ سے کہ تمام انتظام وہ سہینہ کے اندر مکمل کر کے ایک عظیم اشران ادارہ حیدر آباد میں قائم ہو جائے گا۔

مخلص  
نذیر احمد

صدر سائز رضوی

# اے دوست!

(۱)  
میں اپنی ساری راقیوں شمار تم پہ کر چکا!  
سکوں طلب، وفا کی مستزلوں کے بھی گند چکا  
جب اپنی رومج و قلب کو میں درد و غم سے بھر چکا  
ہزار بار کہہ چکا کہ . . . ہاں میں تم پہ مرکب چکا

تو پھر یہ کیا کہا: مری وفا کو بھول جاؤ گے!!

(۲)  
نشاط مرگ کی طرح وجود میں سما گئے،  
سمویر زیت بن کے تم فضا نے دلہ چھا گئے  
مرے زمین و آسمان کچھ اور ہی بنا گئے  
میں تو ہو جو مجھ کو اپنا بھولنا سکھا گئے

تو پھر یہ کیا کہا: مری وفا کو بھول جاؤ گے!!

(۳)  
سہا کے مجھ میں تم نے زیت کا نیمارہ دیا  
نشاط جادواں کا درس روح کو پڑھا دیا  
فنا کو اپنی سکراہٹوں سے جگمگا دیا  
تمام کائنات کو حسین تر بنا دیا

تو پھر یہ کیا کہا: مری وفا کو بھول جاؤ گے!!

(۴)  
وہ مسکرا ہٹیں جو میرے دل میں جذب ہو چکیں  
وہ آنکھیں جو مرے لئے ہزار بار رو چکیں  
جو کیف روح میں تمام قلب کو ڈبو چکیں  
میں ان کو بھول جاؤں گا جو مجھ کو مجھ سے کو چکیں

تو پھر یہ کیا کہا: مری وفا کو بھول جاؤ گے!!

(۱) پرچہ وصول نہ ہونے کی اطلاع ہینہ کے اندر آ رہی تھی چاہیے۔ دو دو تین تین ماہ بعد دفتر کو لکھنے سے پرچہ نہیں بھیجا جائے گا۔

(۲) طویل چندہ ہے میں سالانہ۔ ڈراما نمبر اولہ افسانہ نمبر کے علاوہ۔ قوام پرچے دئے جاتے ہیں۔

(۳) ادبی سیٹ کی سکیم شذرات میں پڑھے۔ ادبی سیٹ میں اردو کے ہر موضوع پر کتابیں ہوا کریں گی۔

(۴) ادب لطیف کا افسانہ نمبر دنیائے ضائع کا ریکارڈ توڑینگے۔ اس کے علاوہ نمبر میں اشتہار و نیچر اپنی تجارت کو فروغ دے چکے۔ (خبر)

احمد ندیم قاسمی

# شرذمہ انقلاب

توڑ کر چھوڑوں گا لیکن میں تو انہیں کہیں !  
ایک دن کروٹ بدلنے کا مراپا یا وطن  
فقط ہیں اس ٹھڑی کے جانفروشیان بہن  
خون کتے دھاروں سے دھل جائیگا رنگ انہیں  
اک نئے سانچے میں دھل جائیگی مہربانے کہن  
اک صداقت بن گئے چمکے کا مرا دیوانہ پن  
کھیل ہے میرے جنوں کے سامنے دایورسن  
تم کو زیبا ہے کہ پہنچتے جی کالے کفن  
حم نہیں کھے کہ جنگل میں سے فیروں کے وطن  
اس سے چین سکتی نہیں زہار سورج کی کرن  
کچھ اڑ کر تا نہیں روحوں پر نور مسلم دفن  
خواب غفلت میں پڑی ہے انہیں کی انہیں  
جس کی ضمیریں دیکھتا ہوں ہند کے کوہ و دس  
اور اہل دیں کے ڈیلے فرغلوں میں مکرو فن  
اس طرف پکار میں مصروف شیخ و برہمن !  
اس طرف مردوں کے رخ پرورد توں کا باہمن !  
میری قتلروں میں مگر یہ ملک ہے بیت الحزن  
میری فریادوں سے جھنجھلاتے ہیں یاران وطن !  
اب بہت رس رس کے دکھاتے مراد لغ کہن  
میری آہیں برقی سماں میرے نالہ شعلہ زن  
دڑھ خاک ہند کا بن جانے گی مصل بین  
شیر کی مانند گونجیں گے یہاں گھستہ تن  
آندھیوں کی طرح ابھریں گے یہاں سکے بہن  
اپنی آزادی کے فتنے خوشنویان بہن

مضطرب ہیں میری فریادوں سے یاران بہن  
چونکتا ہوں ان کے کاؤں میں سرود زندگی  
ڈنٹے ڈنٹے سے اٹھے گی جب مدد انقلاب  
نالہ ہائے درد سے گونجیں گے اس کے مرغزار  
لی سکیں گے اس سے درویش و امیر و بادشاہ  
میری وحشت ہو شیاروں سے کبھی لے گی خزان  
زندگی اور موت اک تصویر کے دو عکس ہیں  
ٹھٹھے دیتے ہو مجھے لیکن جوانان غیور  
تم نہیں سمجھے غلامی اور آزادی کا فرق  
تم نہیں سمجھے کہ جب شیٹے پر ہم عاتابے میل  
تم نہیں سمجھے کہ جب دل فیر کے شکوم ہوں  
میں نہیں کہتا کہ ہے تنہا تنہا راہی تصور  
میرے سینے میں مگر شمع ممل ہے شعلہ ریزہ  
لیڈروں کے دلی میں رقعاں خواہش نام و نمود  
اس طرف اختیار کا ہر فرد ہے مصروف کار  
اس طرف بارود کی بو اور توپوں کی گرج  
تم ابھی تک ہند کو فردوس ہو بجے ہوئے  
جانتا ہوں اس حقیقت کو باس دیوانگی  
لیکن اس اجڑی ہوئی محفل کی حالت دیکھ کر  
اب سراپا آگ ہے میرا وجود غم نصیب  
انقلاب آجائیکا اب انقلاب آجائے گا !!  
برق کے مانند کونہیں گے یہاں کے بد نصیب  
آگ کی مانند لپکیں گے یہاں کے مولوی  
ذالیوں پر جھوم کر ہر قبیح مل کر گائیں گے !!

میرا سرمایہ برا احساس ہے۔ در نہ ندیم

میں نہ عالم ہوں نہ فاضل ہوں نہ استاد سخن



# نقد و نظر

کے لحاظ سے اتنا کامیاب ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کتاب کے آغاز میں لکھا ہے:

اس کتاب میں متوسط طبقہ کی خواتین کی معاشرتی اور اخلاقی کمزوریوں کو بے نقاب کر کے زندگی کی تلخیوں سے کامیاب مقابلہ کرنے کے طریقے پیش کئے گئے ہیں۔

اور کتاب کے سلاک سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سطور مبالغہ پر مبنی نہیں۔ واقعی محترمہ نے کھاتے پیتے طبقہ کی کمزوریوں کو نہایت کامیابی کے ساتھ بے نقاب کیا ہے۔

محترمہ کا نظریہ نگارش بہت سنگین ہے! معلوم ہوتا ہے کہ لطیف النساء صاحبہ ایک پیدائشی ادیبہ ہیں! (دم ۱۱)

**من کی دنیا:** مصنفہ جناب رشید قریشی، کتابت و طباعت اعلیٰ صفحات ۴۰، قیمت ۸ روپے کا پتہ۔ ادارہ ادبیات اردو خیریت آباد حیدر آباد کن۔

من کی دنیا مجموعہ ہے جناب رشید قریشی صاحب کے افسانوں کا۔ رشید صاحب اپنی نوشتیں ہیں اور ان کے افسانے بھی زیادہ کامیاب نہیں۔ مگر اسید کی جاتی ہے کہ ہمارے نوادر و صاحب قلم منتقین میں ضرور اردو کے مشاہیر کی صف میں شامل ہوگا۔ انداز نگارش کے تصور صاحب قلم کی صلاحیتوں کا پتہ دے رہے ہیں۔

آغاز کتاب میں ایک مختصر سا ویسا چہ ہے۔ جناب محی الدین صاحب ترد کے قلم سے پھر جناب پردیس مولوی عبدالقادر صاحب سروری، ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ کا قلم ہے جس میں انہوں نے افسانے کے عناصر ترکیبی پر روشنی ڈالتے ہوئے قریشی صاحب کی خصوصیات کا بھی ذکر کیا ہے۔ عرض حال کے ماتحت افسانہ نگار نے اپنا اور اپنے افسانوں کا تعارف کر دیا ہے۔ اور افسانوں کے مطالعہ سے پیشتر ان سطور کا پڑھنا بہت ضروری ہے۔

بہر حال اس مجموعے کی قدر کرنی چاہیے۔ (دم ۱۱)

**غلاموں کی بغاوت:** مصنفہ چوہدری عبدالرشید صاحب

مدراس میں اردو، مصنفہ نصیر الدین صاحبہ ہاشمی طباعت و کتابت اعلیٰ۔ صفحات ۱۵۰ سو کے قریب قیمت ۱۲ روپے کا پتہ۔ ادارہ ادبیات اردو، رفعت منزل خیریت آباد۔

موجودہ صورتِ حالات میں جبکہ اردو دشمنی کے مدعا پر سے ہندوستان کے گوشے گوشے میں بروس کا راز پھیل رہا ہے اور قوم پرست جن کی قوم پرستی علم اور سن کی وسیع عالمی مشہور صورت ہے موجودہ اردو ہندی نزاع کے سلسلے میں ایسی کسی حرکتیں کر رہے ہیں جن کا تصور بھی ان کے عقیدت مند نہیں کر سکتے اور کیوشن تفتیش سے ہم میں ایسے اور انہیں اشخاص بھی موجود ہیں جن کا ۔۔۔۔۔ اور حنا بھیم نا اردو ہے جو ہر وقت اردو کو ترقی و فروغ دینے کے لئے تیار رہتے رہتے ہیں۔ اور جو ہر وقت اردو کی نشرو اشاعت کیلئے کوشش کرتے رہتے ہیں۔

جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی ان ہی اشخاص میں شامل ہیں۔ اس کتاب سے پیشہ بھی آپ کی مختلف مقالات تحریر فرمائی ہیں۔ مدراس میں اردو اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت کامیاب کوشش ہے ہاشمی صاحب نے مدراس میں اردو کی رفت وارتق پر روشنی ڈالتے ہوئے مدراس کے ادباء کی ذہنی کاوشوں پر تبصرہ کیا ہے جو ہر لحاظ سے ہاتھ نہیں ہے!

کتاب کے شروع میں ایک شبہ ادیب جناب سید محی الدین صاحب رد کرنے ایک مختصر پندرہ ویسا چہ لکھا ہے۔

اسید ہے ہمارے یہاں اس کتاب کی کما حقہ قدر کرے گی۔ (م ۱۰)

**من کی دنیا:** مصنفہ محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ طباعت اعلیٰ۔ صفحات ۸۰، قیمت ۸ روپے کا پتہ۔ ادارہ ادبیات اردو خیریت آباد حیدر آباد کن۔

محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ اردو کی مشہور انشا پروردہ ہیں اور آپ کے متعدد و مفید مقالات سب رس میں شائع ہو چکے ہیں مجموعہ آپ کی ان تقریروں پر مشتمل ہے جو آپ نے لکھے گئے ہیں، مختلف طبقوں میں کیں۔ کل مضامین اٹھارہ ہیں اور ہر مضمون اپنی مفادیت

تسمیہ کی اسے۔ کتابت و طباعت، نہایت اعلیٰ صفحات ۲۰ قیمت ۴  
لے کا پتہ۔ اردو انکسٹی لاہور۔ مکتبہ اردو لاہور۔

غلاموں کی بغاوت ایک دور انگیز نظم ہے۔ جناب عبدالرشید  
صاحب تسمیہ کے قلم سے: تسمیہ صاحب پنجاب کے جو اس سال جون تاخ  
اور جون تک کاروبار میں رہے آپ جو کچھ لکھتے ہیں سوچ بچار لکھتے ہیں  
زیر نظر نظم موجودہ فضا کے لئے بہت مفید نظم ہے۔

شروع میں سورخ اسلام مولانا علم الدین صاحب سالک ایم، اے،  
علیگ، کا مکتعہ مقالہ ہے۔ جس میں انہوں نے تنزل کے غبار میں گئی  
ہوئی قوم کی ذہنی پستی کی نفسیاتی تحلیل کر کے تسمیہ صاحب کے اشعار  
کی خوبیاں واضح کی ہیں۔

(۱۱ م)

مظاہر و مہنیات :- مصنف ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب  
ایم، ایم، پی، آئی، ایم، ڈی۔ کتابت و طباعت خوشگوار۔ صفحات ۱۸۴  
قیمت دو روپے لے کا پتہ۔ کوثر چاند پوری دایسن بھوپال۔

مظاہر و مہنیات میں فاضل مصنف نے انسانی زندگی کے تمام  
غناور کی نفسیاتی تحقیق کر کے کامیابی کے ذرائع بتائے ہیں۔ سب سے  
پہلے حقیقت نفس پر روشنی ڈالتی ہے۔ نفس کیا چیز ہے؟ اسکی کون کونسی  
خفیت کینیتیں ہیں۔ شعوری، تحت شعوری، البتاسات حسیر، خارجی  
موثرات یا حیات کی نہایت کامیابی کے ساتھ توضیح و تشریح کی ہے  
چر قوت حافظہ، اس کی گونا گوں کیفیات، اسے تیز اور کارآمد بنانے کے  
ذرائع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کے بعد دوسرے اہم لوازم حیات  
کو معروض بحث میں لایا گیا ہے۔ مصنف کا انداز بیان نہایت شگفتہ اور  
دلآویز ہے۔ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی انسانی زندگی گہرائیوں سے واقف  
ہو سکتا ہے۔ جس فاضل مصنف کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے اتنی  
کامیاب، مفید اور کارآمد کتاب لکھ کر جاری معلومات میں اضافہ کیا،  
لاریب مظاہر و مہنیات ایک مشعل کامیابی ہے جس کی ضرورت  
ہر شخص کو ہے۔ امید ہے قارئین اس کتاب کی قدر کریں گے اور اس  
سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے! (۱۰ م)

## سیاسی لشکر

نولین ہونا پارٹیا :- ناممکن کو ممکن بنانے والے کے سبب آواز کا زنا ہو  
حالات زندگی۔ ۱۰  
سوشلزم کیوں؟ سوشلزم کے بنیادی اصول ۸  
ہم سولرج کیوں چاہتے ہیں؟ اعداد و شمار کے ذریعہ باور و حق کی سنہ  
بوقی تصویر۔ ۴  
آئینہ ہندوستان درجیل آڈیا کا اردو ترجمہ ۱۲  
چنگاریاں۔ پرنسپل جمیل داس ۱۲  
میرٹری :- مصنف لالہ لاجپت رائے ۱۲  
گیری بالادی :- " " " " ۱۲  
تواریخ کانگریس۔ مکمل تاریخ، گیارہ سو سے نیا صفحات۔ جلد ۱۸  
اوداق پارینہ :- چودہویں شیر جنگ۔ مشہور شاہی قیدی کی خود نوشت داستان  
قیمت ۸  
آندادی ہند :- چودہویں فصل حق ۶

کپنی کی حکومت :- جہد کپنی کے صد سالہ دور کی داستان جلد ۱  
لینن :- مزدوروں کے سپربروس کی کا پلٹ دینے والی شخصیت  
کی سوانح حیات :- جلد ۱  
شہنشاہ حبشہ :- اطالیہ حبشہ کی خوشچکانیوں کی داستان۔ الم ڈرا کی صوت  
میں۔ قیمت ۵  
میری جہد جہد :- ہٹلر و کیتھیرمن کی خود نوشت سوانح حیات تہی جہد جہد  
شعلے :- فحاشی کی شمس و خاشاک جلا نولے افسانے دوسرا ایڈیشن جلد ۱  
ترکی جمہوریہ :- ترک کے متعلق تاریخ و حال کے مکمل حالات سوانح آثار جلد ۱  
گولیس :- گولیس کی دلیری کی مکمل داستان ۸  
آئینہ ہند :- شجاعت و طریت سکھانوالی تمکین جلد ۱  
قوم کی آواز :- مہاتما گاندھی کی زبان سے سوانح کی تشریح  
خود روئی کا منظر :- کارل مارکس کی سوانح ۴  
سوشلزم :- مصنف پرنسپل جمیل داس ۸

لے کا پتہ  
مکتبہ اردو لاہور

100

1

1

1

1

مکتبہ ادیبہ کی ہر غیر مطبوعات

ماہیاتی قی  
سے افسانہ  
مکمل سہ ماہیاتی قی کے بہترین مزاحیہ مضامین کا مجموعہ  
اس کے پڑھنے سے آپ کا دل کشتی بخولن میں بہا جائیگا  
ماہیاتی قی  
ایک روپیہ

ماہی قوت ایک دوسرے

لیسنج بشین یزد: کا بنامیر میس کی میں سب ترانسی میا بنے تھے ہی دیکھتے ہوں کی کیا  
ہٹ: ہی کون سے جو اس لوگ سے انسان ہی نہ دوشے فیروز بن! پرپاسی کے سوا بیانات  
پڑ پڑی دوشا کو انہیں کیج۔ صفحہ دہی میں مرکی متعجبہ انما حارث جلد ط  
طلسیم خیال کشن ہند کے نام کا جو بوشہ بن کے صفحہ دہی زندگی کے تجرباتی کرتے  
نیر: انہیں بیانات کا کراہا اعلیٰ ہے اور جو دشا حارث چننے کے نیز شتر می میں اور قدیم  
مست: دہا دیت کے خوشتر ہیں! کشن چند: ہم سے جلد ایک پورہ پڑانے

[illegible]

پہاڑ کا گنہار اس محبوبہ میں دنیا بھر کے عقلمان دوست کے بہترین مسلمہ مدافعات شامل ہو کر اٹھائے ہیں۔ جواب سے اس روایت متفق نہیں ہوئے تھے۔

راجہ محمد علی علی خان مجاہدِ حقا و درویش  
 انعام نگاری کے سابق اور فاضلوں میں مکتبِ زون و محنت  
 و نوس کے لئے ان فاضلوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔  
 (اور دیگر افسانے) قاضی عبدالغفار خان (مصنفِ لیلے کے خطوط) مجاہدِ حقا و درویش  
 یہ نگار سہ دستِ زبانِ برہنہ ترقی کا پہلا محرمہ شجاعت اور جرات کے  
 ابدِ بابت بجانے والی کتاب۔ دوسرے نمبر ۱۰۰۰ میں بھی شامل ہیں۔

دنیا کی غور  
اللہ عزوجل نے

یہ کتاب خاص طور پر لڑکیوں اور عورتوں کے لئے عجیبی نوعیت کی سہولت  
باجل بھاری مشقت اور تھکن کے باطن میں طبیعت خود کو دھنسا کر ان کو قبول کرتی ہے

۱۔ کوثر چاند پوری جلد ایک دوسرے

محکم دہشت کتب طلب و سرمایہ

ترکی جو کہ وہ ترک کی مختلف ترقیات کا حال نہایت پذیرہ پرست میں بیان فرماتا ہے۔  
 سے پہلے کیا حال تھا۔ کچھ بعد میں اس نے جو میں نے کیا انقلاب چاہے تو ترک کی اسے متعلق ہے۔  
 متعلقہ اس کے لیے یہ کتاب بڑی ہے۔ یہ سید احمد رضا باقی محمد علی

باسی بھجول۔ تیرے علی و اس کی سب سے پہلے انسانوں کا جو مجھے میرے سید رہا۔  
 فتنے نے نہ ہارنا۔ سیر کیا ہے اس جو حیران کن فلسفے کی مثال ہیں اور طریقہ بھی ان میں نہ ہیں۔  
 اور سو شکر ہے مجی اور وہ کہ میں حضرت کا فخر اور مہذب ظرافت بھی جوتی ہو جو وہ۔

یہ کیم کا جادو۔ ہر دستان کی اہلی دنیا کی دنیا ہے جس کے سامنے ہر  
 صبر و استقامت اور دنیاویوں کی دنیاوی دنیا کی دنیا ہے جس کے سامنے ہر  
 دستان کی اہلی دنیا کی دنیا ہے جس کے سامنے ہر  
 صبر و استقامت اور دنیاویوں کی دنیاوی دنیا کی دنیا ہے جس کے سامنے ہر

۶۔ محفلِ یادِ بیکسے، حنفی خطہ کا کتابخانہ، مہملہ مکہ، ۱۳۱۰ھ

سوا کے لئے نقیض دوام کا سالہ کریں :

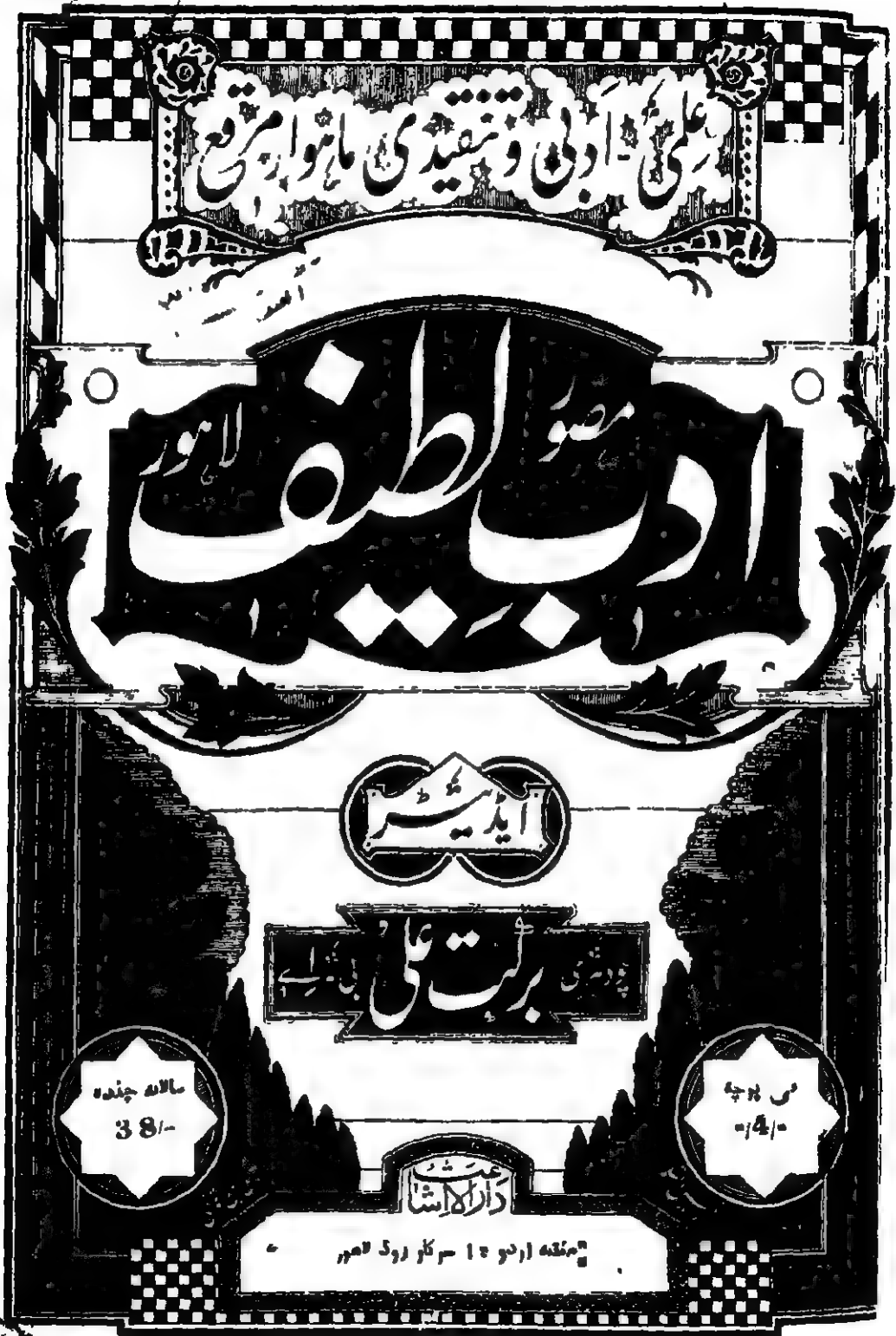
نور کے خطوط

شاہ جیہہ نیشل ہوا جس کا ہر تاج فخر دنیا کی نہیں قبول کرتی۔  
اختر اور تری ایہ لے آئے

نئے افغانی  
ہندوستان کی عورتوں کے ڈھکے ڈھور کے جیسے اور ان کے ٹوٹے ہوئے  
دلوں کی آوازیں سننے کیلئے اس کتاب کا مطالعہ لازماً ضروری ہے۔  
کوثر مازوری  
ڈیڑھ روپے

کافے بن افسانہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ محض نکتہ عالمیابیات سے عبور کرتا ہے۔ اس میں اس قدر بیکہ دھیر کر لیتا ہے جتنی کہ ایک نئی دنیا کو پیش کر سکتا ہے۔

R. L. No. 3521



مکتبہ ادوبہ کی پبلشرز مطبوعات

شعلے، غصہ، ہنسائی کے لہو ویزا دکھا کر نیرالے ریاکٹری کی خوشنیتانگ جبر  
افسانے و کتابچے ایب شاعر محب چکر پڑھتے ہیں۔ زبانی کہتے ہیں کہ افسانے، کتابچے  
اور محفل ایب کے لیے دھن دھن کا نہ کہ کتاب کا موسم ہے۔ مہاراجہ

باسی بھول۔ یہ دلی جاسوسی سکھانہ انسان کا مجبور ہے جس پر سب کا  
 فن نے شکار کر لیا ہے جس مجبور میں اپنے ہی مثال میں ابھری ہے ان میں ملک  
 اور دشمنوں کی اور ایک دوسرے کے خلاف اور مذہب خلاف بھی ہوتی موجود ہے۔  
 طلسم خیال۔ کرشن چندر کے انفل کا مجبور ہے ان کے فیاض ہاری زندگی کی ترجمانی  
 میں وہ ان ہی حیات فانی کا گہرا مطالعہ ہے موجود معاشرت چمکے کرشن چندر بھی یہ  
 محبت و معائنات کی خوشبو بھی: کرشن چندر نے اسے محبت ایک دوسرے

مفتی محمد وحید نظامی نے ارتقا اور تطبیق جذباتی رنگ سخن سے لطف اندوز کیا۔

میتھ جیڈ محمد ہدیم  
مجدد و مطلق ۱۱۰۲ھ

عورتوں کے افسانے  
 ہندوستان کی عورتوں کے دکھ درد کو سمجھنے اور ان کے دکھ سے  
 دلوں کی آوازیں سننے کیلئے اس کتاب کا مطالعہ آپس ضروری ہے۔  
 کوثر چاند پوری

ہو! اور کہے: ان افسانوں کی سبب جڑی غریبی یہ ہے کہ یہ مرنے والے عالمیابیات سے ہیں۔ اور اس قدر پاکیزہ و نیک بختی ہیں کہ کوشش کر سکتے ہیں کہ پائل مل جاتی ہے۔

پیریم کا جادو۔ ہندوستان کی افسانوی دنیا ایک ایسی تھی ہے جسے سامنے بھروسہ نہ کر سکتے تھے۔ یہاں پر ہر شے کی اپنی ہی جادوئی قوت تھی۔ ہندوستان کی افسانوی دنیا ایک ایسی تھی ہے جسے سامنے بھروسہ نہ کر سکتے تھے۔ یہاں پر ہر شے کی اپنی ہی جادوئی قوت تھی۔

مشورہ اور سرپرست کا شیخ غلام طیف نے یہ خبر کائنات کے حالاتِ ثلثیت میں درج کی ہے۔  
 پرنٹ آف دی ڈیزرٹ "عاصمہ طیف کا بچہ" جلد و ملاحہ دو روپے  
 اسٹین ہے اس معاملہ دو روزہ شب کی جب ہندستان کو ساسی طور پر  
 حکوم و اقتصاد کی لحاظ سے غلام طیف نے ایسا بیان کیا ہے۔

چاند کا گھناہ اس مجنوں میں لیا ہمارے عقداں اب کے سب سے تیریں تسلیم نہ وہاں سے شامل اور دگر گھناہ میں جو ہر شک نہ وہاں سے نقل نہیں ہوئے تھے

تم: ہرگز جگر مریم!  
 انسان نگاری کے شائق اور مسائل میں حقیقی روح دیکھنے

یہ چوتھی چوٹی دلوں کے لئے بنی ہوئی کا معاملہ اور بس ضروری بات ہے  
(اور دیگر افسانے) قاضی جلیل نقی (معتمد علیہ کے خطوط) جلد دیگر پر پیش  
ہے۔ ہندوستانی زبان میں ترقی یافتہ لوگوں کا پہلا مجموعہ شعاعت اور غیرت کے  
بہت گہرے اہمیت والی کتاب ہے۔ دوسرا ڈیڑھ سو فیسیں ہی شامل ہیں  
وہ کتاب ہالی جلد آٹھ آنے

دنیا کی عورت  
بہل جامی شہزادہ حسن کی باقی ہے جسیت فرخندہ کا کاثر قبول کرتی ہے چ  
اور عیراٹانے

عمل فہرست کتب طلب و سرمایہ

نغمہ حرم - ان سہولتوں کا مجموعہ ہے جو عورت شام نے سنانی خلوت سے متاثر ہو کر لاپے  
ہیں اور بننے کے سبب کی انفرادی گرج ہے۔ یہیں نغمہ حرم کو آفتاب کی شمع ہوئے اور برحق اپ  
پہنچانے کیلئے پیش کرنے کی قیمت میں اس کا دم تقویٰ ہے۔ اختر علی بلیغی

لینن، یقیناً فرورڈس کا بنیادی میں سے ہیں جب انسان تھکتے ہی دیکھتے ہی دیکھتے دوس کی کیا ہٹ دی، کن ہے جو اس کے انسان میں خود کو سے بغیر اس بلورپاسی کے کو اس حیات کو لپچی پڑھا اور انہیں کر گیا۔ مضحکہ خیز ہیں مگر حرمیہ الجھن شرف جملہ علی

منظور کردہ تحفہ تعلیم چلب منو پر سرحدیاست جیڈ آبادکن  
مکتبہ ابرو و لاہور کا



# کثیر الاشاعت و ارزاں ترین ماہنامہ ادب رسالہ لطیف لاہور اگست ۱۹۳۹ء

خریداران ادب لطیف کیلئے بہتائی رعایت !  
صحرا نورو کے خطوط حبیبی عظیم النظر کتاب  
صرف ایک روپیہ آٹھ آنے میں !

جیسا کہ قارئین جانتے ہیں صحرا نورو کے خطوط شائع ہو چکی ہے۔ انکی قیمت ڈھائی روپے علاوہ محصول ڈاک اور محصول ڈاک کیساتف میں سے ہے۔  
لیکن ہم خریداران ادب لطیف کیساتف ایک روپیہ کی رعایت کرتے ہوئے اعلان کرتے ہیں کہ خریدار صاحبان  
یا تو ۱۱ ایک روپیہ آٹھ آنے کی قیمت اصر پاچے آٹھ ڈاک خرچ کئے ایک روپیہ چھ آنے بذریعہ مئی آرڈر بھیج دیں۔ کتاب فرائض کی  
قیمت میں بھیج دیجائیگی۔ مزید میں آٹھ آنے سے بھیجے والے حضرات کو کتاب بصورت رہنمائی بھیج دیجائیگی۔  
۱۲) ہمیں اجازت دیں کہ کتاب دی ہلی برائے مبلغ دو روپے انکی خدمت میں بھیج دیں۔ کتاب دی ہلی بھیجنے کی صورت میں محصول ڈاک  
ساتھ آٹھ آنے صرف ہوتے ہیں۔

جو حضرات چند ماہ پیشتر کتاب آرڈر بھیج چکے ہیں ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ دوبارہ آرڈر رعایت فرمائیں تاکہ فرائض کی جائے۔  
یہ اعلان نئے خریداروں کے لئے بھی ہے۔ نئے خریدار حضرات پاچھ روپے پاچھ آنے بذریعہ مئی آرڈر بھیج دیں۔ اس رقم میں کتاب کی قیمت  
اور دسے کا ایک سال کا ذریعہ سالانہ دو قسط شامل ہیں۔

کتاب فرائض کا ایک ہی ہے۔ قارئین بہت جلد قیام کریں۔ قیام ممکن ہے۔ دوسرے ایڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑے !

(نوٹ) آرڈر دیتے وقت خریداری ہنر کا سوالہ ضرور دیں

مکتبہ ابرو و لاہور

جنگ آندائی شہر کے دو قلعوں کی بھی تصویر کھینچ دی ہے :  
صوت کا راک - معنفہ مہر کا ادیب :

یہ مجموعہ میرزا ادیب کے سولہ اشعار کا جس میں کئی اشعار

غیر مطبوعہ ہیں۔  
پروفیسر فضل حق کی وفات : ہمیں یہ پڑھ کر نہایت غم  
ہوا ہے۔ کہ بروز اتوار ۳۰ جولائی کو پروفیسر قاضی فضل حق دنیا سے ہمیشہ  
کے لئے رخصت ہو گئے۔ پروفیسر مرحوم اسی شرفیہ کے بہت بڑے عالم تھے۔  
ذہاب، خدام مرحوم کو چار رست میں جگہ دے۔

ادب لطیف کی موجودہ مسطر :- ادب لطیف کی موجودہ مسطر  
تیس سو ۳۰ سطروں پر مشتمل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دسے میں ایک کپلی  
کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اب ہم نے دو بیانی لکھ دیئے ہیں کہ وہ کالموں میں تقسیم کرتی  
نئی آواز دی ہے۔ جس کی بابت کئی کئی لکھروں کا اندازہ نہیں مل سکتا ہے۔ تاریخین  
ملاحظہ فرمائیں گے۔ کہ ادب لطیف کا ہر حصہ نہ صرف معنوی خصوصیات  
کے لحاظ سے پہلے پہلے پر فوقیت رکھتا ہے۔ بلکہ اس کے صورتی محاسن میں  
بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

میں خیر صاحب کی علالت :- محکمہ اردو اور ادب لطیف کے  
میں خیر صاحب جو بددیوبند شاعر صاحب کئی دنوں سے طویل میں تھیں۔ تاریخین کا  
کہنا کہ خداوند تعالیٰ ان کو صحت کاملہ و عاجلہ عطا کرے۔

علامہ اشرف انجیری کے خطوط :- میرٹھ صادق انجیری قارئین ادب  
لطیف سے درخواست کرتے ہیں۔ کہ اگر ان کے یا ان کے کسی دوست کے  
پاس علامہ اشرف انجیری کا کوئی بھی یا عزیز و متدین وغیرہ کے سلسلے میں کوئی  
خط موجود ہو تو اردو ماہ و کرم ان کے پاس فوراً بھیج دیں۔

اگر مکتوب الیہ کی خواہش ہو۔ تو موصوف انکی نقل رکھ کر اصل بحفاظت  
و بعد شکر وہ آپس بھیج دیں گے۔ خطوط کے علاوہ اگر کسی صاحب کے پاس  
کبکٹاں (ردود) اشاعت پنجاب سے شائع ہوتا تھا (کامل فائل) یا اس  
کے کچھ حصے موجود ہیں۔ تو وہ اندوہ ہریان یا مینا سرمد صادق کے چہ پہر  
بھیج دیں۔ جناب صادق انجیری کو بہت ہے۔

صادق انجیری الم سے :- کوچہ چیلان - دہلی۔  
ادب لطیف کے گزشتہ شماروں میں اور افسانہ نمبر :-

ادب لطیف کے گزشتہ شماروں میں افسانہ نمبروں کی بہت کم کاپیاں نشر  
میں آئے ہیں۔ جیسا کہ ہر حصہ میں بیان کیا جاتا ہے۔ یہ ضمیمہ نمبر رعایتی قیمت  
پر دئے جاتے ہیں۔ قارئین کہ ہم ان نمبروں اور ان کی رعایتی قیمتوں کی بکثرت  
اس نمبر میں نہیں ملاحظہ فرمائیں گے۔

## ادب لطیف کا معرکہ آرا شانہ نمبر

اس شانہ کے بعد جو نمبر شائع ہوگا۔ وہ افسانہ نمبر ہوگا۔ یہ افسانہ نمبر  
یقیناً واثق ہے۔ ادب لطیف کے تمام گزشتہ افسانہ نمبروں سے زیادہ قدیم  
اور دلچسپ ہوگا۔ افسانہ نمبر کی تعمیر میں ملک کے چوتھے کے افسانہ نگار حضرت  
رہے ہیں۔

ان حضرات کے مضامین اور افسانے دفتر میں پہنچ چکے ہیں  
محرر صاحب امتیاز علی کا ایک نہایت دلآویز اور دلہیز دہقان۔

کرشن چندر ایم اے کا ایک لاجواب افسانہ  
ادیب نہایت اشک کی ایک حسرت انگیز کہانی۔  
چودھری منظور احمد غور جالندھری آؤ فوج لاہوری کے گہرے مضمون افسانہ  
پروفیسر کمال جلیل احمد گاندھاپوری، سر جلالین احمد نقوی کے بلند پایہ افسانے  
احمد ندیم قاسمی کا ایک نفسیاتی شاہکار۔

ناگارتھ جیدر آبادی کا ایک چمکدار لفظ مزاحیہ افسانہ  
محمود مسر محمد اقلد کا ایک دلچسپ داستان  
راجندر سنگھ بیدی کا ایک معاشرتی شاہکار  
ماہر انصاری، سید بلال شاہ حسین، اختر اور نوری، اور سید راحت مملانی  
کے بلند پایہ مقالات۔

ان کے علاوہ دنیا کے مشہور افسانہ نگاروں، شاعرانہ ماہرین،  
ایڈیٹرز اور دیگر حضرات کے شاہکار افسانے اردو میں پہلی مرتبہ شائع  
ہو رہے ہیں۔

گزشتہ اشاعت میں "دست بزم" کا ابتدائی شائع کیا گیا تھا  
یہ ابتدائی اس قدر مقبول ہوا ہے۔ کہ کئی حضرات سے یہ دو صفحہ پر لکھی  
کتاب کا ذکر بھیج دیا ہے۔

افسانہ نمبر میں اس کتاب کا ایک مکمل باب جو ایک طویل طائفہ  
ہے۔ تو نوری کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے۔ امید ہے۔ یہ افسانہ  
مصرافوں کے تمام خطوط کے مقابلے میں زیادہ دلچسپ ہوگا۔

ضروری :- جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے۔ تبصرہ کا حصہ افسانہ نمبر پر  
ہمیشہ ڈاک میں کم ہوتے ہیں۔ اسلئے اطلاع رکھنا چاہیے کہ ہر نمبر کے اشعار  
بجائے مکمل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ضروری ہوگا کہ ہر نمبر کے اشعار



# ہماری زبان

اردو ہندی کے سلسلے میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ ہمارے سامنے ہے۔  
 حقائق کو لکھ چھپایا جائے مگر وہ بھی نہ کبھی دنیا کی نگاہوں کے سامنے آجی  
 جاتے ہیں۔ چھپے ہوئے واقعات کو تو ایک طرف رکھتے، ہمارے مشاہدات ہی  
 اس امر پر شاہد ہیں۔ کہ موجودہ دور میں جو سلوک اردو کے ساتھ کیا جا رہا ہے  
 وہ ایک دایک دن اس کو ختم کر کے چھوڑ دیا جائے۔ وہ لکھ جائے۔ جو کچھ ہمارے  
 اپنے موبہ میں ہو رہا ہے۔ وہ کم از کم اسٹاک نہیں۔ مندرجہ ذیل نوٹ ہم  
 قارئین کی نگاہ کی لئے آج ترقی اردو کے نیم ماہی آرگن ہماوی زبان  
 سے نقل کر رہے ہیں۔

کچھ سال پہلے یہ بحث جاری تھی۔ کہ اردو کی ابتدا پنجاب سے ہوئی یا  
 کن سے۔ اردو کی ابتدا خواہ کہیں سے بھی ہوئی ہو۔ مگر یہ بات بالکل بحث طلب  
 نہ تھی۔ کہ پنجاب لوگ اردو بولتے اور لکھتے ہیں۔ بے شک پنجاب سے اردو کی  
 بڑی خدمت کی ہے اور اس خدمت میں ہندو مسلمانوں کی کوئی تخصیص نہیں۔ اردو  
 پر وہ ان بڑے حصے میں اپنی اپنی جگہ دو فون کا حصہ ہے۔ ہندو اور مسلمانوں کے  
 اردو میں روزانہ اندر ہشتہ دارا اخبارات اور ماہوار رسالے نکلتے ہیں اور کتابیں  
 چھپتی ہیں۔ مگر کچھ جس طرح پنجاب میں ہندی کو آگے بڑھانے اور مشترکہ  
 زبان کو کم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اگر ابھی  
 سے پیش بندی نہ کی گئی۔ تو اردو کے لئے اتنے والا زمانہ کافی نازک ہوگا۔ یہ  
 کوشش زیادہ تر اسکولوں اور کالجوں میں ہوتی ہے۔ وہیں عام نیم زبان کو  
 اٹال کر ایک اصل ہے جو طرح کی زبان داخل کی جا رہی ہے۔ ہمارے سامنے  
 اس وقت ایک کتاب ہے جو پنجاب کے اسکولوں میں لڑکوں کو ہندی و  
 انگریزی میں ترجمہ کھانے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ آرٹ آف انکلس  
 انیلیشن۔ یہ کتاب پنڈت وشرانا تھ اور لالہ دولت رام کی تصنیف ہے۔  
 درانی سکول کے طلباء کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس میں ہندی کے جو کچھ ترجمہ  
 کے لئے دیئے گئے ہیں۔ ان کے چند نمونے ہم آپ کی خدمت میں پیش کرتے  
 ہیں۔

ڈاکٹر صاحب گنی: ان سے بہتر بیچے کا بہت (اخلاق) کر رہے ہیں۔  
 صفحہ ۳۰۔

کیا میسور (معدے) کے اوکل نہیں؟ صفحہ ۳۰  
 تہی تہہ (آدنی) کو بڑا اور وسیع (خرچ) کو کم کر۔ صفحہ ۳۰  
 "آو تھ اتھ" (بیلہ) دیکھنے کے لئے چلیں۔ صفحہ ۳۰  
 "جب میں اسکول پہنچا۔ تو ادھیانک (مستحق) حاضر (پکار) ہوا تھا۔"

"کیا اس کا بھائی بہر جیوت (مدفن) کیا جا چکا ہے؟ صفحہ ۶۸  
 "جب اس کا مکان گرایا گیا۔ تو اس نے میری پہنچی پر ابھی متوگ  
 (مقدور) چلایا۔ صفحہ ۷۰  
 "کر شک لوگ ورشا کے آرمیہ ہونے سے پہلے ہی اپنی اوپے  
 کاٹ لیں گے۔ صفحہ ۶۰

"جب ابھی تک ایک (مزم) نے دیکھا۔ کہ اس کے سہندھیوں نے  
 اسے پھڑانے کے لئے دیکھ کر لپسا ہے۔ تو اس نے دوش ہونا اسوکار کر دیا  
 صفحہ ۱۰۰

"جب ساہوکار نے دیکھا۔ کہ ہمنسین (دقنندہ) مال منول کر  
 رہا ہے۔ تو اس نے ناش کر دی۔ صفحہ ۱۰۸  
 "کیا تم اس کے (وگرہت) ہو؟ صفحہ ۱۳۱

"دشواس نے (قابل) اختیار۔ ہوتی ہیں صفحہ ۱۴۲  
 ان فقروں کو ملاحظہ کیجئے۔ ایسی مثالیں بہت پیش کی جا سکتی ہیں۔  
 ان میں جو خاص بات نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ سخت ہندی الفاظ کے  
 عام نیم الفاظ بریکٹ میں لکھے ہوئے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ اس لئے  
 کہ جو لڑکے پنجاب میں ہندی پڑھتے ہیں۔ وہ ہندی اور سنسکرت کے  
 فقیر الفاظ نہیں سمجھتے۔ اس لئے ان کی آسانی کے لئے اردو کا عام نیم  
 لفظ بریکٹ میں لکھ دیا جاتا ہے۔ اور یہ صورت اس وقت تک جاری  
 رہے گی۔ جب تک کہ ہندی کے طلباء سخت الفاظ عام طور پر سمجھ سکیں  
 اب ذرا الفاظ پر غور کیجئے۔ علاج کی جگہ چکستا۔ آمدنی کی جگہ آئے۔ مقدمہ  
 کی جگہ ابھی متوگ، مزم کی جگہ ابھی نوک و غیرہ سخت الفاظ استعمال  
 کئے گئے ہیں۔ حالانکہ اردو کے الفاظ عام طور پر سب سمجھ سکتے ہیں۔

جو سکتا ہے۔ کہ ان الفاظ کی اصل عربی یا فارسی ہو۔ اور چونکہ اس جملہ عربی  
 اور فارسی کے الفاظ سے نفرت کرنا تو ہم پرستی کی سب سے بڑی علامت  
 ہند۔ اس لئے یہ الفاظ بدل دیئے گئے۔ اور ان کی جگہ ہونے والے سنسکرت  
 کے الفاظ لکھ دیئے گئے۔ مگر ایک بات اور بھی ہے۔ ان الفاظ کے متعلق  
 کیا کہا جائے جس کی اصل نہ عربی ہے نہ فارسی بلکہ سنسکرت ہے۔ مگر کثرت  
 استعمال سے وہ اپنی صورت بدل چکے ہیں۔ آج ان الفاظ کو پھر اپنی شکل  
 میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔

مثلاً برست کی جگہ ورشا، کسان کی جگہ کرشک وغیرہ کیا جا رہا ہے

پتہ نہیں چلتا کہ زبانِ برہنہ پر برس پھلنے کا تہذیبی رنگ کیا جا رہا ہے؟ بعض الفاظ کے سامنے کوئی بریکٹ نہیں ہے۔ حلالہ وہ بھی افسوس اور نا افسوس ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اب ان کو بریکٹوں کی مدد کی ضرورت نہیں۔ اب وہ زندگی دالوں میں بچے جاسکتے ہیں۔ یہ ہے وہ طریقہ تین سے آہستہ آہستہ پنجاب میں اردو کی موجودہ حیثیت پر چھری چلائی جا رہی ہے۔ مگر جس سے زندہ دلائی پنجاب اب تک بے خبر

ہیں۔ کیا وہ اسی جہنمی میں زندگی گزار دیں گے۔ یا اٹھ کر کچھ کام بھی کریں گے؟

ملاحظہ فرمایا آپ نے کس طرح پنجاب میں اردو کو مٹی کا منہ کیا جا رہا ہے۔

جو حضرات اس سلسلے میں خرید و فروخت ہم پہنچائیں گے۔ ہم ان کے فکروں کو رگڑتے ہیں ان کے مضامین کو ادبِ لطیف میں شائع دیں گے

## ترکی جمہوریہ

اس کتاب میں ترکی کی مختلف ترقیات کا حال نہایت دلپذیر پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ترکی انقلاب سے پہلے کیا تھا۔ انقلاب کے بعد ترکوں کے ذہن میں کیا انقلاب پیدا ہوا۔ ترکی کے متعلق مستند اور تازہ ترین معلومات حاصل کرنے کے لئے یہ کتاب بے حد مفید ہے۔

سید ضمیر احمد ہاشمی کی تصنیف ہے۔ جلد مطالعیت و دورہ اپنے اعجاز

## سوشلزم

(خیالی اور عملی)

کیا ہے؟ اس کے اصول کیا ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام جس سوشل کی تشکیل کرتا ہے، اس میں

امیروں کیلئے سب کچھ ہے!

غریبوں کیلئے کچھ بھی نہیں!!

ہمارے مروج میں کیا خامیاں ہیں۔ اور ان کا علاج کیا ہے۔ کیا اشتراکیت سرمایہ و محنت کی کشمکش کو ختم کر سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب اے! کس دستِ فریڈرک انجیلز کی کتاب اشتراکیت میں ملتا ہے۔ کتاب ترجمہ کامریڈ باقری شہرہ روضہ کمپنی کی حکومت انقلاب فرانس وغیرہ نے کیا ہے۔ کتاب کی کھائی چھپائی اٹھ کاقد اتنا شاندار ہے کہ اردو کی کوئی کتاب مثال کے طور پر پیش نہیں کی جاسکتی قیمت صرف ۶

ملنے کا۔ ممکنہ اردو بازار

## تراجم

## کس نے بچے کی موت پر

انسان جو بچہ نہیں سہتا ہے۔ اور قادر مطلق موزوں وقت پر فیصلہ کرتا ہے۔ ان تدبیروں کا۔

میں رہتا ہوں۔۔۔ وہاں تم لیٹے ہوئے تھے۔

حسین گلاب کا ننھا نازک بچہ

گلاب کے بچوں کی آغوش میں

نہیں لے جانا۔۔۔ تم دیکھنا نہیں تھے۔

معلوم ہوتا تھا

تھکے تھے تھے۔۔۔ نازک پاؤں تھک گئے ہیں۔

اور تم آرام کر رہے ہو۔۔۔ گلوں کے نازک انبار میں

میں آباد!

تم نہ سکاٹے اپنے گل پوش بستر پر

میں بچھا۔۔۔ تم کھوئے ہوئے تھے اپنی رنگین ہیڈوں میں۔

گوہار ہفتاری روح پرورد کرچی بچی قلعش خاکی ہے۔

حقیقتاً تم سورج تھے ابدی خواب کی شیریں آغوش میں۔

لیکن پھر بھی!

تہااری حسین بلیکس کتنی خاموشی سے اپنی بولی بھیں آسمان

کی طرف۔

تہاارے پیارے بال بکتے پر سکون تھے۔

یقیناً میں جانتا ہوں۔

تم بھانک رہے تھے۔۔۔ اپنی معنی معنی پیاری پیاری بچی نکھول کر۔

اس لئے۔۔۔ میرے نامے دیے رہے پر وہ دل میں۔

میں جانتا ہوں!

خالق بصیر و ناظر ہے۔ وہ فیصلہ کر دیتا ہے موزوں وقت

پر انسانی تدبیروں کا۔

مجسم میرے لبوں پر لہرایا۔۔۔ میں نے تہاارا نام پکارا۔

اور اپنے گلاب کے حسین بچوں کو، شیریں نازک گلوں کے

لطیف انبار میں شامل کر دیا۔

اور تمہیں تہااری رنگین کھیلوں میں مستغرق چھوڑ دیا۔

(چروٹ لٹن)

## راز محبت

نہت فطرتوں میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ درست!

یہ دلوں میں پنپنے چہنے پر شیدہ۔ خاشا نہ ہراتی ہے۔

جیسے باور دہاں کے نرم نازک جھونکے۔

میں نے اپنا جھگڑا دل کھل کر رکھ دیا مجھ کو یکساں دوست!

اور اپنے سینے میں پنہاں محبت کی تمام باتیں۔

گھر۔ آہ! وہ چھری بچہ دہاں فرقت دے گئی!

ایک مسافر آیا۔

خاموش لفظوں سے پوشیدہ اور اسے لگیا۔

سرد آہ کے ساتھ! (ولیم بلیک)

## خاموش محبت

لے دو دست! تو اگر محبت کی ہوشیار کایف! ایوں میں کھو گیا ہے۔

تو لوگوں کو داند کر۔

اپنے سینے کی گہرائیوں میں محبت کی آگ جڑ کا گر جڑ بلب!

کیونکہ ظہور محبت کی وسعت ہر سکوت مسلط ہے!

اگر تیرے لب آہوں اور نالوں سے واقف ہو گئے۔

تو درد و غم تیرے آنکھیں دل کو پارہ پارہ کر دیگا۔

(لوناٹ فیلو)

## مرگ شباب!

وہ گل نہی ایسے

جیسے صبح کی وقت شام کے قطرے مٹ جلیں اس کے بلند پر پہنچنے

سے پیشتر۔

آہ کتنی مختصر زندگی!

وہ سمجھی نہ سکی۔ محبت کی آہوں کا مفہوم

محبت کی شیرینیاں اس کے گرد و لہروں ہراتی بھیں

جیسے گلاب کے گرد اس کی نازک بھیتیں!

وہ برسی۔ اپنے محبوب کی الفت بھری نگاہوں کے روبرو سایہ میں

غریبم خوف ہراس بے نیاز، ظالم موت لے کر لیا بچکے چٹکے!

اس دنیا میں فرشتہ الفت اس کا نگہبان تھا۔

اس نے اسے موت کے ہاتھوں سے روک دیا۔

وہ فرشتہ اس پر ہرمان تھا۔ تو پھر کون کون کھائیں گے

مکن ہے مقدس موت اس سے بھی زیادہ عزیز ہو

غزل

طالب انصاری

ستم کی خو ہو گئی ہو تیری ستم کا ہنسنا ہو کام میرا ! پھری میں جب تری نگاہیں بد لگیاں نظام میرا  
جو عشق میں جاں مٹا چکے ہیں حیات جاوید پا چکے ہیں جریڈہ دہر پر لکھا ہی، علی قلم سے دوام میرا  
ہر اک فضل لالہ از میری ہو آسماں کی بہار میری ستارے ہیں میری نئے کے چھٹنے مڑنے نشاں جو جام میرا  
نہ رک سکا آنسوؤں کا طوفان نہ لاسکا تابعدار ہجرال ہوئی جو لب ز چشم پر خوں چھلک پڑا خود ہی جام میرا  
جو میرے بڑے کو عار سمجھے، میری فاؤں کو خوار سمجھے تو اس سنگر کے آسماں کو ہو دور ہی، ہو سلام میرا  
ریہگی کتنک بے نیازی کرو گے کتنک دلنوازی یہ وقت ہو وقت چارہ سازی کہ غم سی ہوتا ہی کام میرا  
جفا و آسوخ کہہ کر غربت ستم کی خو ہو ستم کی عادت ہوئی ہو کس نگہ دل سے الفت پڑا ہو کس بک کام میرا  
نہ کرو فاؤں کو میری رسوا ہر اک باں پہ ہے اسکا چرچا اچھالتا ہوں میں نام تیرا، ڈبور باہے تو ہام میرا  
نہ بندگی ہو، خود دل کو رغبت نہ کیف بچہ نہ ذوق عطا ! فقط دکھا دے کی ہو عبادت نماز میری سلام میرا  
خدائی اُس محتسب کو سمجھے، اڑا دیئے اُس نے ہوش مجھے بکھری سب شراب میری، ٹال گیا مجھ کو جام میرا

# ادب میں فن و ادب پر تنقیدی تصانیف

دن کے ہر آدمی کا ہر کام ہر گاہ اگر یہ ہے کہ کشیدہ کے بود ماند دیہہ، تو اسے بھی سچ ماننے کے تاثر کے اعتبار سے کسی کتاب کا مطالعہ ڈرامے لگانے کا سکا۔ حضرت انسان کے دیگر سوانح نگار و نقاد سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ جو کچھ ازمنہ ماضی میں ہو چکا اسے بیان کر کے اپنا دفتر لپیٹ لیتے ہیں۔ لیکن ڈراما جو فطرت انسانی کا باہر کال ہے ان سے بہت آگے بھٹ جاتا ہے۔ اور ممکنات کو بعض محض میں لاکر یہ بھی دکھا دیتا ہے کہ فلاں کا مال ایک ایسی صورت میں بھی ممکن ہے۔ جو آج تک رد نہ ہوئے ہوں۔ تاریخ آپ کو خود غم و دلش، تو کر دے گی، مگر فکر و ادب آزاد کرنا ڈراما ہی کا کام ہے۔ وہ تاریخ، آپ کو تباہ کر دینا نہیں کیا کیا اور ڈراما آپ کو دکھائے گا کہ دنیا کو کب کرنا چاہیے؟

ظاہر ہے کہ جب ڈراما میں یہ اہلیت ہے، اور یہ ہمارے ادب و زندگی کا ایسا زبردست عامل اور اس میں اسوجہ و دھند رکھتا ہے، تو ضرور اور یقین ایک مستقل اور باضابطہ فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور فن ایسی چیز ہے جس کے کچھ اصول و قیود مقرر اور کچھ ضوابط و حدود متعین ہوں۔ ان کے کچھ خاص اصطلاحات، ان کی کچھ علیحدہ خصوصیات ان کے کچھ منفرد اصول منضبط ہوں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دنیائی ساری زبانوں میں کل علوم اور سارے فنون کے ساتھ ساتھ فن ڈراما سے متعلق بھی ایسی ایسی ضخیم کتابیں تصنیف و تالیف ہوئی ہیں جن میں اس فن یا اس علم کے اصول و قیود اور قواعد و ضوابط سے بحث کی گئی ہے۔ اور اس فن یا علم کو جاننے اور پرکھنے کی کوئی گستاخی صورت میں ممکن ہوئی ہے۔ خود قدیم ہندوستان کی سب سے بڑی زبان سنسکرت میں بھی بمبارتی ناٹک یا کاسٹریک کے علاوہ متعدد تصانیف ایسی دستیاب ہوئی ہیں جن میں فن ڈراما کے قواعد و ضوابط متعین کئے گئے ہیں۔ اور اصولی فن سے بحث کرتے ہوئے ان پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ مگر اردو زبان نے جب اس فن پر

تاک تک کیے یا ڈراما دونوں ایک ہی چیز تو نام ہیں۔ تاک تک ہر آدمی یا انسانی ہوتی شکل ہے۔ ہندوستان کی سب سے بڑی قدیم زبان ہر اکرت کے لفظ، نارٹ، ہرمینی، رقص، نٹ، یعنی بازو، اور تاک تک ہرمینی بنیادی۔ اسی طرح ڈراما ہشتن ہے۔ ورنہ لفظ ڈراما سے جس کے معنی کام کرنے اور ایک جگہ کے ہیں۔ چرکہ تاک تک یا ڈراما انسانی زندگی کا جزو لا ینفک ہے۔ لہذا اس کی صحیح تعریف میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک طرف تو انسانی زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے میں ایک صحیح تصویر کا کام دیتا ہے، اور دوسری جانب زندگی کو سمجھانے کی ایک اچھی حرکت یا مددگار ہے۔ کیونکہ اس میں اقوال و افعال کے ذریعے انسان کی راجھی ہو رہی، معاشرت، تمدن، تہذیب و اطریق اور کی حرکت تصویر دکھائی اور آٹا دی جاتی ہے۔ بقول محمد عمر و نورانی صاحبان ڈراما ایک رو داد ہے، جو عملاً کر کے دکھائی جاتی ہے ڈراما ایک مکالمہ ہے، جس سے ایک ایسا نتیجہ برآمد ہوتا ہے جو خود راست انصاف انسانی سے شترج ہوتا ہو۔ ڈراما ان لوگوں کا لڑچپ ہے جو مکالمہ کی زحمت گوارا نہیں کر سکتے اور ڈراما

خوشتر آں باشد کہ سب دریاں

گفتہ آید در حدیث و دیوان

کی تحریک تشریح ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

تشر کرتے ہیں جو کچھ نیک و بد کام

دکھا دیتے ہیں ہم ہر اکرت کا انجام

حقیقت یہ ہے کہ تاک تک یا ڈراما ایک ایسا فن ہے جو باغیچہ طبع، با جبر تربیت، بلا زحمت تعلیم اور بلا قصت و حجت سوا غفلت انکار رکھتا یا کام دیتا ہے۔ اس مسئلے میں اس کا مقابلہ دنیا کا کوئی دوسرا تعلیم کوئی طرز تربیت اور کوئی صنعت ادب نہیں کر سکتی۔ خود عمر و نورانی صاحبان نے باطل و درست اور قطعی و مجاز فرمایا ہے۔ کہ۔

”جب تہذیب عالم کے ہم و یکم مظاہر محل تاریخ

تذکرہ، سرور دیا یا صفت انسان کو نکلتے کار نہانے کی

اہلیت رکھتے ہیں، تو ان کا چلنا پھرنا، منہ و لہجہ

ڈراما یا تاک تک، جو اثر انسان کے دل و دماغ پر کرے

اجم صنف ادب ہی کو ہی پشت ڈال دیا ہو تو پھر اس زبان میں ایسی تصانیف کے وجود میں آنے کی کوئی صورت تھی؟

اردو زبان آج سے نہیں صدیوں سے ہندوستان میں رائج ہے اور اردو میں ناموں کا وجود آج سے نہیں عرصہ سے پایا جاتا ہے۔ لیکن شک ہے کہ اردو میں اس فن پر یا اس سے متعلق کوئی تعینیت و تالیف موجود نہ تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اس دور میں اس فن پر اردو میں اکثر بلند پایہ مقالے لکھے گئے۔ مگر وہ صرف رسائل کے ادوار ہی تک محدود رہے۔ نہ انہیں کئی شکل میں منضبط کیا گیا نہ ان سے ملحدہ جوکر اس فن کے متعلق کتابیں لکھی گئیں۔ البتہ اردو میں محمد عمر نواز اپنی مد جان نے ٹائمک ساگر تالیف کی جو شکستہ ملک بقصد مدت دست سال و حدہ لا شکر ایک لکڑا خرہ لگائی رہی۔ شکستہ میں دوسری تالیف ہمارے اردو میں ڈراما نگاری، عالم وجود میں آئی جس کے مولف اردو ضلع کے مشہور ریستار جناب سید بابا شاہ حسین حیدر آبادی ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اس وقت میرے پیش نظر ہیں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ ملی الترتیب ان دونوں ادبی کاوشوں کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں

## ٹائمک ساگر

ٹائمک "جیسا کہ ابتدائی صفحات میں ظاہر کیا گیا ہے اس تراشہ کا نام رکھا گیا ہے جس میں بولی چال اور حرکات و سکنات کے ذریعے انسانی زندگی کے کسی روشن یا تاریک رخ کو پیش کیا گیا ہو۔ اور ساگر کے معنی سمندر کے ہیں۔ لہذا ٹائمک ساگر کے معنی ہوتے ہیں وہ کتاب جس میں ڈراما کا ایک بحر بیکراں موجیں مارتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اسم سہلی ہے۔

ٹائمک ساگر کے فاضل مولفین نے اپنی اس مشترکہ تالیف کے تحتاً ساڑھے چار مضمونوں میں تمام دنیا کے ڈراموں کا ایک ایسا سمندر بند کر رکھا ہے جس کی وسعت اس سہ سے اس سہ سے تک تمام کا احاطہ کرتے ہوئے ہے۔ اور جس کا آغوش ادب آنکھوں ہمدی قبل مسیح سے جیسوں ہمدی بعد مسیح یعنی ذہانی ہزار سال سے زیادہ کے ڈرامائی تذکرے کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

اس کا دوسرا خود مولفین نے اور مقدمہ ملک کے مشہور انشا پرداز خصوصاً ان ڈرامائے مغرب عالم جناب کتنی دہلوی نے لکھا ہے۔ خوش قسمت ہے نہ ان اردو کہ اس میں انسانی جامع تالیف موجود ہے جس

کی مثال دنیا کی دیگر زبانوں میں نہیں دکھائی دیتی۔ اور لاجپت ستر ہیں خوش خالق مولفین جنکی عبقریہ سیرانہ چانچ اور شمع محلو نے بقول کتنی اردو ادب میں ایک ایسی گرا نیسا تالیف کا اضافہ کیا ہے جس کے احسان کی گرا نیسا ہی سے اردو زبان کبھی جھڑکا برا نہیں ہو سکتی۔

ٹائمک ساگر کے بندہ ابواب ہیں جن میں سے جوہ ابواب میں تمام دنیا ہندوستان کو چھوڑ کر ہر کے ڈراموں، ڈراما نگاروں، سینوں، انجیلوں، ڈراما کی بنیادوں، فنی خصوصیتوں، ہستہ یہ یک ترقیوں اور ان کے عروج و زوال سے بحث کی گئی ہے۔ اور ہر لکھا گیا ہے۔ وہ نہایت محققانہ اور مدلل و سلیس ہے جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں انگریزی تعانیف سے مدد لی گئی ہے۔ اور انگریزی میں تمام ممالک کے ڈراموں سے متعلق بے شمار پیشہ یا کتابیں تصنیف تالیف اور ترجمہ کی گئی ہیں، اور کافی سے زیادہ وقت بن چانچ پڑنا مال اور تحقیق و تدقیق کر کے مواد ہم کئے گئے ہیں۔ ورنہ مشکل تھا کہ اسی سہل اور جامع کتاب تالیف ہو سکے، یا لکھا جائے۔ ٹائمک ساگر کا بار حواں باب ہندوستان سے متعلق ہے۔

جس میں قدیم و جدید ہندوستانی سینوں، ہندی اردو اور بنگالی ڈراموں ڈراما نگاروں اور ڈرامائی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے ان چیزوں میں بھی جہاں تحقیق و تدقیق کا موقع آگیا ہے وہاں مغربی مصنفین مولفین اور محققین کی تصانیف و آراء سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ہر چند کہ اردو ہندی یا بنگالہ میں ایسی کتابوں کے فقدان کی وجہ سے انگریزی تصانیف سے استفادہ ناگزیر تھا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اس وقت ہندوستانی ڈرامائی ادب سے متعلق جو کچھ قابل قدر سرا یا لیا ہے وہ انگریزی اور جرمنوں ہی کے شوق تلاش و جستجو اور ذوق تحقیق کا نتیجہ ہے۔ مگر میری فاضل مولفین بذات خاص نہ ہی دیگر ابواب نظر کے تحقیقی نتائج سے مشورہ یا استفادہ فرما لیتے۔ تو کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا۔ نیز وہ مقامات غیر محققانہ یا قشہ نہ رہ جاتے جو اس وقت ریموٹ اور محفل نظر ہو رہے ہیں۔ یا پہلے ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ڈراما کی ابتدا کہاں سے ہوئی، یا یہ کہ اردو زبان میں ڈراما خصوصاً اندر سہل کی بنیاد کیسے پڑی۔ یہ درجہ سبزی ایسی ہیں جو حد و ریموٹ طلب تھیں، افسانہ پر تفصیلی محققانہ مقالے کی ضرورت تھی۔ مگر فاضل مولفین نے انہیں صرف مغربی محققین کا سہارا لیکر قطعی محفل اور کسی حد تک اپنی بات لکھی ہے کہ کتاب کا مزہ فیہ بنا دیا ہے۔ میں اس کتاب سے

تعلق اس مجاز ان ہی دونوں عنوانات کے تحت کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں

۱۔ ڈراما کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟

یہ چیز کہ ڈراما کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟ یا یہ کہ ڈراما کی بنیاد سب سے پہلے ہندوستان میں پڑی یا یونان میں؟ بڑی متنازعہ چیز ہے جیسا کہ نامک ساگر کے مقدمہ میں حضرت کتی ولبوی نے فرمایا ہے۔ سب سے پہلے جرمی کے ایک محقق و تہر نے یہ سوال اٹھایا کہ سنسکرت نامک یونان سے آیا یا یہ کہ..... یونانی نامک متاثر ہوا۔ جب یہ خیال عام ہوا، تو اسی سلسلے میں دو جہاتیں متعین ہو گئیں اور یہ بات کے افراد مختلف دلائل پیش کرنے لگے مگر بقول ہندو نام سرورپ باسٹنٹل چند تمام افراد نے بالآخر اپنی جہاتیں کھینچ لی ہیں اور اپنے آدھار کی غیر قطعیت تسلیم کر لی۔ فاضل مولفین نے اس سلسلے میں صفحہ ۳۱۴ میں علامتے ہند کے ڈرامے کی ایک دو کو دیکھنا تو اس سے خبر کرنے کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہانی درج فرمائی ہے جو زبان مذہبی دام ہے۔ اور صفحہ ۳۱۵ میں فرمایا ہے کہ

”یہ روایت کوئی باور گرسے یا نہ کرے، مگر اس میں کام نہیں کہ چوتھی صدی قبل مسیح میں غربی ڈراما ہندستان میں ایکاد ہو چکا تھا“

پھر صفحہ ۳۳۰ میں ہندی اور یونانی ڈراما کے عنوان سے فرمایا ہے کہ:

”ہندوستان میں ڈراما کس طرح پیدا ہوا، ایک ایسا سوال ہے کہ قطع نظر روایات مذہبی اس کا جواب دینا مشکل ہے۔ لیکن اس سے مجال انکار نہیں کہ سنسکرت کی صرف و نحو کے موجد یونانی سے قبل ڈراما ہندوستان میں رائج تھا۔ سنسکرت صرف و نحو کا نامور شارح گیتا پللی بھی اپنی تصنیف میں ڈراما کا حوالہ دیتا ہے۔“

لیکن اس کے باوجود آئے ہیں کہ فاضل مولفین نے مغربی محققین کے خیالات کی ترجمانی فرماتے ہوئے ان وجوہ کا ذکر کیا ہے۔ جن کی بنا پر ہندوستانی سنسکرت ڈراموں پر یونانی اثر ثابت کیا جاتا ہے پھر آگے بڑھ کر مومنت انساٹیکو پیڈیا اور شینگیل کے حوالے سے یہ تذکرہ کرتے ہوئے کہ ڈراما فاضل ہندوستانی چیز ہے۔ فرمایا ہے کہ:

”اسی صورت میں یہ تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ ڈراما فاضل ہندی چیز ہے“

گویا فاضل مولفین باطمینان تمام اس کے قائل نہیں کہ ڈراما فاضل

ہندوستانی چیز ہے۔ بلکہ انہوں نے مومنت انساٹیکو پیڈیا اور شینگیل کے اقوال و تحقیق سے متاثر ہو کر چارہ تاجار یہ تسلیم کر لیا ہے، کہ ڈراما دراصل ہندوستان کی چیز ہے۔ کیونکہ پھر انہوں نے آخر میں یہ لکھ دیا ہے کہ:

”ہندوستان کے ماہرین فن ڈراما کی ترویج راستے سے

کہ خود یونان نے ڈراما ہندوستان سے لیا، لیکن چونکہ

ابھی یہ دعویٰ شائع ہو کہ تنقید کے خداداد پر نہیں چڑھا،

اس لئے اس پر کہ گہنا قبل از وقت ہے، در قفہ ۳۳۴

شاید یہ اشارہ حضرت کتی پللی کی اس محنت شامہ کی طرف ہے، جس کے ذریعے وہ ثابت کرنا چاہتے تھے، یا جس کہ یونان کے نامک پر ہندوستان کے ادب کا بنی اثر رہا ہے، بہر کیف فاضل مولفین اگر چاہتے تو تصدیق سہی جیسا ہی اس پر روشنی ڈال سکتے تھے۔ کہ ڈراما قطعاً ہندوستانی چیز ہے اور اس کی بنیاد میں پڑی۔

جیسا کہ خود فاضل مولفین نے تحریر فرمایا ہے۔ سنسکرت صوفیہ نحو کے نامور شارح گیتا پللی نے اپنی تصنیف میں ڈراما کا حوالہ دیا ہے یہ شارح دو سو سال قبل مسیح گزرا ہے۔ اور اس نے اپنی شرح تمہا بھاشیہ میں جو کس بندہ اور ملی بندہ وغیرہ مکمل ڈراموں کا پتہ دیا ہے، اس کے معنی یہ ہیں، کہ مسیح سے دو سو سال قبل ڈراما باضابطہ ایک فن قرار پا کر مروج کمال حاصل کر چکا تھا۔ نیز حسب اعتراضات مولفین، مرجع لکھ: ”تحقیقی طور پر دو سو سال قبل مسیح کا ڈراما ہے، جو مکمل صورت میں موجود ہے۔“

اب آئیے تیسری صدی قبل مسیح میں۔ اس وقت بھی ڈراما مکمل صورت ہی میں موجود تھا۔ کیونکہ اشوک اعظم تیسری صدی قبل مسیح گزرا ہے۔ اور اس وقت تک اس کے جتنے کتبے دستیاب ہوئے ہیں ان میں سے اکثروں پر ایسے احکام درج پائے جاتے ہیں۔ جو ڈراما کی حمایت میں ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے، کہ تیسری صدی قبل مسیح میں ڈرامے بکثرت ہوا کرتے تھے۔ اور ان کا بڑا انداز تھا۔

فاضل مولفین اس سے بھی مجال انکار نہیں پائے کہ سنسکرت صرف و نحو کے موجد یونانی سے قبل ڈراما ہندوستان میں رائج تھا۔ اس کو نہ ماننے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ کیونکہ مرثی پانی (۱۹۵۷ء) نے سنسکرت کی یہ گرامر جس کا نام ”اشٹادھیاٹی“ ہے اور جو ماہا شیہ و شرح کی تصنیف سے اچھتوبرس اور مسیح سے تین سو برس قبل تصنیف ہوئی ہے، اس میں نہ صرف یہ کہ ڈراموں کا ذکر موجود ہے بلکہ یہ بھی تحریر ہوا ہے کہ شتائی اور کر شاشو نے دونوں سوترہ یعنی نامک

اگر حقیقتاً صرف اس طرح کے مذہبی رسوم کی ادائی بہت  
ثبوت ہے۔ ڈراما کے یونانی نظریہ ہونے کا۔ اور اس کی مدت چھٹی  
قبل مسیح قرار دی جاتی ہے۔ تو پھر ڈراما کو ہندی نژاد کہوں نہ مانا جاوے۔  
جبکہ ہندو مذہب کی بنیاد چھٹی صدی قبل از مسیح میں پڑی، البتہ ہندو  
کی اکثر کتابوں میں ڈرامائی تذکرے پائے جاتے ہیں جن کے معنی یہ:  
ہندو مذہب سے کہیں قبل ہندوستان میں ڈراما پایا تھا۔  
آگے چل کر تیرناضل مولفین نے یونانی ڈراما نگار امیس کاہر  
Amis کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ:

”جس طرح تھس میں فن ڈراما کا موجود ہے اسی طرح  
باقاعدہ ترمیمی کی داغ بیل ڈانے کا سہرہ ہر گائیوس  
کے سرچسما نے لے کر اس کو بہت حد تک عضو معطل  
کر کے مکالمہ کو جزو اعظم بنایا۔“

اگر واقعی ڈراما کو ڈراما بنانے کا فرامیس کا سلسلہ کو بعض اسرار  
حاصل ہے کہ اس نے ”گورس کو بہت حد تک عضو معطل کر کے مکالمہ کو  
جزو اعظم بنایا اور اگر واقعی صرف مکالمہ کی موجودگی ہی ڈراما کے وجود کو  
ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ تو پھر یہ قسم کراہی پڑے گا۔ کہ ڈراما ہندی  
جز ہے۔ کیونکہ یہ اہرم ہے کہ یہ مقدس دنیا کی سب سے پرانی اور قدیم  
کتاب ہے۔ اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ وہ کے چند سوکھت  
ایسے ہیں جو کیتا ایک ڈرامائی مکالمے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت  
کے مسلم الثبوت شہید  
شکیت میں فن نہیں شامل تھے۔ گانا، بجا نا اور رقص، اسی شکیلیت کے با  
رشی لوگ وید کے ان مکالموں کے منسروں کو گاتے تھے اور کچھ انیت بھی  
کرتے تھے۔

دیدوں میں رنگ وید سب سے پرانی کتاب ہے۔ اسے سوکھت  
سے پڑھتا ہے۔ کہ سوم وداہوتی میں کاس نکالی کر پیا جاتا تھا، کی زلفت  
کے وقت ایک قسم کی ایکٹنگ ہو کر تھی تھی۔ جس سے مقصود یہ تھا۔ ہے  
واسے اور خریدے واسے دونوں محفوظ ہوں۔

”یہ جو پیش منٹا شیلوس متعدد مقامات پر موجود ہے۔ جس کے من  
ایکٹ کے ہیں۔ نیز جو یہ ہیں رقص و سواد کا ذکر بھی انٹرچیلوں پر ہے۔ یہ  
تقول جناب رام سروپ شاستری جادرات مستوم کے موقع پر لکھا دی  
لڑکیاں پوجا کے لئے لکھی کے اور دگر و طرات کے وقت نچا اور گایا کرتی  
تھیں۔ اور شریہ بھاگوت وغیرہ کئی پرافوں میں ایسے اڈوں اور رنڈیوں  
کے نچنے گانے کا بھی ذکر موجود ہے۔ پھر کہیں نہ کہ جاسے کہ نہ نا بندہ سنا

کے متعلق دو کتابیں تصنیف و تالیف کی تھیں۔ اس کے معنی یہ ہوتے  
کہ عین سو برس قبل مسیح میں ڈراما سے متعلق ایسی کتابیں مسطور ہو چکی تھیں  
جن میں ڈرامائی ادب پر مقدمہ نظر کی گئی ہو۔ البتہ چونکہ تاریخ کا مطالعہ  
بتاتا ہے کہ، ادب میں فن تنقید اسی وقت عالم وجود میں آ گیا ہے اور  
اس کے اصول و قواعد اسی وقت مرتب ہوتے ہیں جب اس ادب  
کی بنیاد ہو جاتی ہے۔ لہذا یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ چوتھی صدی قبل از مسیح  
صدی قبل از مسیح میں بھی ڈراموں کی بنیاد تھی۔ کہ کمرے اللہ کمرے  
کو پرکھنے کے لئے اس فن پر کتابیں تصنیف کی گئی تھیں۔ اس خیال  
یا حقیقت کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ وید ویا رشی اور  
وامیک رشی کی نایہ ناز ادائی کتابیں مہا بھارت اور راجا میں بھی  
جو علی الترتیب چوتھی اور پانچویں صدی قبل از مسیح کی تصنیف ہیں۔  
”نہ اللہ نرگس“ دینی اخیر اور اپنے واسے، وغیرہ قسم کے بے شمار  
الفاظ ملتے ہیں۔ یہ بھارت نایہ شاستریا ہے جس طرح بھی عالم جو  
میں آئی ہو۔ لیکن آئی، اور یہ قسم ہے کہ وہ مکمل طریقہ پر فن ڈراما سے متعلق  
ہے۔ اور اس میں تفصیلات و تعینات اصول و ضوابط اس طرح درج  
ہیں۔ جن کو دیکھتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے۔ کہ اسی وقت ڈراما طریہ مولی  
طور پر مکمل اور بھرپور تھا۔ اور چونکہ ایسی جامع ادب سب کتاب کے وجود  
میں آنے کی صورت جب ہی ممکن ہے جب فن ڈراما نے حد ترقی  
کر چکا ہو۔ لہذا یہ یقینی ہے کہ حضرت مسیح سے چار پانچ سو سال قبل  
ڈراما موجود تھا۔ اور دو ہزار ترقی کر رہا تھا۔

ناضل مولفین نے مغربی محققین کی تحقیقوں کے مطابق باسلاقل  
میں یونانی ڈراموں کی ابتدا سے متعلق فرمایا ہے کہ:-

”اہل یونان کی طبائع میں ڈراما کا عنصر موجود تھا۔ اور

اس کی شہادت ان مذہبی رسوم سے ملتی ہے جنہیں سلا  
پروخ کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی پوجا تھی جس میں پوجاری  
ڈائیٹیرادسیرس نامی دیوتاؤں کے معجزات اور سوانح حیا  
ان کا بہرہ و پھر کر جان کرتے اور احترام و وزخ اور  
بہشت کے نظارے دکھا کر حیات بعد الموت کا نقشہ  
آنکھوں کے سامنے کھینچتے تھے۔ اور اس سے تعلق تبلیغ  
کا کام لیتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی باکس پوجا رائج تھی  
میلن اس ادائے فرض مذہبی کے علاوہ قوی اور متعلق  
بہبود کی دعا میں بھی شامل ہوتی تھیں۔ باقاعدہ ڈراما  
کا مرکز پوجی باکس پوجا تھا۔“







نہیں، صرف اندر سجا اور شرح اندر سجا کو ایک بار تو  
سے پڑھ لیتا کافی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ پروفیسر صاحب کے اس جواب سے فاضل  
مولین کے غلط و غور کی قرار دہانی ترقی تر دید ہو گئی ہے۔ لیکن پھر بھی اگر  
تمام چیزیں کو تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ  
فاضل مولین "انگل ساگر" اس بارے میں زبردست شوق رکھتا ہے۔  
ابھی حال ہی میں پروفیسر آزاد نے جلیلی نے اندر سجا اور فاضل مولین کی  
جلیف "انگل ساگر" کے اس جھگڑے سے بحث کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ۔

۱۱۔ جنوری ۱۹۳۷ء اور پھر نومبر ۱۹۳۷ء میں جو معاہدہ واجد علی

شاہ اور انگریزوں سے ہوا، اس کی وضوح خاص اس  
امر سے متعلق ہے کہ قذاف اپنی طامشت خواہ راہ راست  
میں بحر بکینی کے لائزموں را انگریزوں کے کسی فریق کو پہنچنے  
کی اجازت نہ دیا۔

۱۲۔ اور پھر انیسویں صدی میں کل جدید لٹریچر کی حیثیت رکھتا  
تھا۔ کیونکہ ادیبوں کا بنیاد سوہویں صدی عیسوی میں ملی  
میں پڑی تھی۔ اسکا بانی رستہ و گامی ہے جو ان کی  
مشہور ماہر طبقات کا باب تھا، اور جو سوہویں صدی  
عیسوی میں گزرا ہے۔

۱۳۔ ہندوستانی ناٹھوں میں بروہے کا استعمال آج سے  
نہیں زمانے سے تھا۔ سنسکرت کے ڈراموں میں سنسکرت  
کا مشہور لفظ "اپاچکھے پے نا" یا اجاتا ہے جس کے  
معنی ہیں پردہ اٹھا کر یا پردہ کھینچ کر "ٹھاکر شس" سنسکرت  
زبان کا مشہور ڈراما ہے جس کا مصنف و تیاگ دت  
ہے۔ یہ ڈراما آٹھویں صدی عیسوی میں لکھا گیا تھا اس  
میں یہ عبارت موجود ہے "پردہ ہٹا کر آگے پرستار ہے"  
اور "شس" میں سنسکرت لکھا ہے سلام کرتا ہوں۔

۱۴۔ ستر ہزار برس قبل مسیح نے اپنی تصنیف "تھیٹر آف  
دی ہندو" میں سنسکرت کے بعد قدیم ڈراموں کا ذکر کیا  
ہے جن میں بروہے کے متعلق ہر آیات درج ہیں مثلاً  
"طشکیت و تناکر" میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ "تاقہ پر  
کے پیچھے آگے بڑھے" وغیرہ وغیرہ۔ لہذا ثابت  
ہوتا ہے کہ ہندوستانی ڈراموں میں پردہ کا رواج  
سوہویں صدی عیسوی سے بھی قبل تھا۔

۱۵۔ امانت نے اندر سجا واجد علی شاہ کے حکم سے نہیں  
لکھی اس کے متعلق خود امانت کا بیان پیش کردہ  
پروفیسر مسعود حسن کافی ہے۔ البتہ یہ جاننے کے لئے کہ  
مذکورہ دو شخص اس جملے کی تیاری پر آمادہ ہوئے۔  
یہ بتا دینا کافی ہے کہ مذکورہ خوش معرکہ نیا مصنف ناصر  
لکھنوی میں امانت اور اندر سجا کے متعلق خود مولانا  
باصنعت کے چشم دید حالات درج ہیں جس میں بتایا  
گیا ہے کہ حیات کے اصرار سے امانت نے اندر سجا  
لکھی اور سنسکرت نڈت کشمیری اور میر عافظ نے اس کو  
سیکھایا۔

پروفیسر آزاد نے اس بارے میں کافی... لکھا ہے، مگر کچھ  
بیچتر بھی خاصی دلچسپ ہے۔ لہذا میں اس جگہ خود میر ناصر لکھنوی کے  
بیان کا کچھ حصہ نقل کرتے دیتا ہوں۔ اب اس سے بڑھنے اور ثبوت  
کیس ہو گا۔

..... میر امانت صاحب کی زبان میں نکتہ بھی تھی  
اور یہ مرض ان کا ابائی ہے۔ بلکہ انکی اولاد ان کی زبان  
میں نکتہ موجود ہے۔ لہذا مرثیہ تصنیف ان کا ان  
کے شاگرد پڑھا کرتے تھے۔ اور ان کے شاگردوں  
میں جو ہے اس کے تخلص کے اخیر میں تے دت، ہوئی  
ہے۔ شل جنت و عبادت اور میان فرقت و طیر کے  
میاں امانت نے ایک میر تقی کی طرح مثنوی اندر  
سجا تصنیف کی تھی۔ اس میں بجائے امانت تخلص  
استاد اچا قرار دیا تھا۔ اور اس مثنوی میں غزل اور  
ہولی، غمری اور صندریاں سما شامیں کھی تھی چنا پڑ  
میں کو سنسکرت نڈت کشمیری اور میر عافظ نے ہندوستان  
حسین اور اردان باج میں خوب صورت جمع کر کے، اور  
لوگوں کو مثنوی یاد کرانے اور تعلیم راگ اور ناچ دیا  
ایک رہیں کھڑا کیا تھا۔ چنا پڑ خلافت نے یہ جلسہ جدید  
دیکھ کر بہت پسند کیا۔ اور ہزار ہا لوگ بازار میں جمع  
ہونے لگے۔ ایک روز مولف بھی اس جلسہ رہیں  
اندر سجا میں گیا۔ دیکھا میں نے کہ ہزار ہا لوگ ان  
اردان حسین پر مثنوی و شہادت میں۔ بقول ترجمان  
سہ جہم ماہ ویاں اسٹہ تھا کہ کھکھو دیکھیں چاہیے کھکھو

دیباچہ میں قابل موصفت نے تنقید کی تعریف، نقد کے اصول، اور  
نقاد کے فرائض کی حد بندی، جہاں تک ڈراما سے تعلق رکھتا ہے،  
اپنے نقطہ نگاہ سے کی ہے اور ہر شخص کی پسند و ناپسند کے ساتھ  
رہنے کو ڈراموں پر تنقید کرتے وقت سب سے زیادہ اہمیت دی ہے  
نیز بطور پیش بندی ان تمام اختلاقی مقامات، اسباب و اسباب  
پر ایک ایسی تحریر پر قلم فرمادی ہے کہ بظاہر گنجائش گفتگو نہیں رہی  
ہے مگر اس کا کیا جواب کہ فاضل موصفت کی اس تحریر کے آگے ہر شخص  
اپنے کو تسلیم خم کرنے پر آمادہ نہیں پایا۔ صاحب موصوفت ایک جگہ  
فرماتے ہیں،

”ہم نے اس کتاب میں کوشش کی ہے کہ اپنی طبع  
کا اظہار کریں۔ یہ تو قریب قریب ناممکن ہے۔ کہ ہر چیز  
بڑی بات کے لئے ہم اپنی ذاتی رائے پیش کرتے کیونکہ  
بعض دفعہ ایک کے خیالات دوسرے سے کسی خاص  
اثر کے تحت جاملتے ہیں۔ اور بعض دفعہ دوسرے کی رائے  
استعداد جاذب نظر اور اسد جکشش رکھتی ہے، کہ وہ  
دوسروں کی رائے کا خود بخود جزو بن جاتی ہے یہی  
اعتراض ہے کہ ہم نے بعض جگہ دوسروں کی رائے  
کو اپنا لیا ہے جس کا تفصیلی ذکر ماضی میں کیا جائے گا اور  
جہاں ہم اپنا کون سے قاصد تھے۔ یا جہاں ہم دوسروں  
سے احاطت نہ کر سکیں، انہی رائے کا اظہار کیا“

اس سے تو قطعاً انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دوتا فرقتاً دوسروں کے  
خیالات اپنائے جاتے ہیں۔ اور اس سے دنیا کا کوئی بھی بڑے سے بڑا  
شاعر و ادیب انکار نہیں کر سکتا۔ مگر اس کے لئے مقام و محل کا خیال کیا  
منووی ہے۔ نیز یہ بھی درست ہے کہ بعض اوقات دوسروں کے خیالات  
لو جاتے ہیں۔ مگر ساری کی ساری تصنیف میں ایسا نہیں ہوتا۔  
آر دو میں ڈراما نگاری: ایک ایسی کتاب ہے جس کے متعلق یہ کہا  
جاسکتا ہے کہ وہ ناٹک سا لگا پڑا جوا عطریا ہے کہ یہ لکھنا ناٹک سا لکھنے  
باب و ازیم کے اجمال کی کسی قدر ترقی یافتہ، تفصیل ہے جس کے  
متعلق میں اگلے جلد میں کتاب کو پڑھنے کے سلسلے میں مجھے کچھ عرض  
کروں گا۔

دوسری چیز جو دیاچہ میں ملکتی ہے، وہ فاضل موصفت کا یہ  
فسر نامہ ہے کہ۔

”اس سلسلے میں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہم

اور میں امانت مستند پر شے تھے۔ اور ایک لمحہ  
بہہ باریا آگے گاتا ہے یہی بیوہ کی گرجدے توتف کے  
بھانپنے مکان پر جلا آیا۔ غرض کہ یہ اندر سمجھا خوب  
محکی اور مشہور غلطی ہوئی۔۔۔۔۔

پھر گیتا اس بابے میں حقیقت یہ ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو لیکن  
نہ تو لاگتور سین میج راستے پر ہیں نہ حضرت کین کا بیان مستند ہے اور  
یہ واقعہ ہے کہ اس مقام پر فاضل موصفین نے زبردست غور و کما فی  
ہے جس کی وجہ انکی محنت و تپا س آرائی اور نقد ان ذوقی تحقیق ہے۔  
صفحہ ۳۸ میں فاضل موصفین نے آفا مشر کے بیان میں بڑے  
جی بھنسل سے کام لیا ہے۔ دراصل اس وقت اردو میں مشر کا پایہ  
سلم تسلیم کیا جا چکا تھا۔ انکی ڈرامائی تصانیف کی تعداد بھی قطعاً غیر  
محکم ہے۔ اسی طرح چند اور ڈراما نگاروں کے تذکرہ سے یہ تالیف  
خالی نظر آتی ہے۔ نیز سب سے بڑی کمی جو اس کتاب میں ہے۔ وہ  
فن ڈراما کی اصطلاحات کا تفصیل عدم بیان ہے۔ ڈراموں کی اصطلاح  
اتنی اور ایسی ایسی باریک و نازک ہیں۔ جن پر حوام کو قطعی دسترس  
نہیں۔ اگر اس سلسلے میں فاضل موصفین اس امر کو بھی ملحوظ خاطر رکھتے  
تو کتاب کہ اور یکساں جاتی۔

پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ جتنا کچھ اس تالیف میں جمع کر دیا  
گیا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ اپنی جگہ بے مثل و نایاب ہے۔ بلکہ یہ وہ سبیل  
علم ہے جس نے اس کی تالیف کے بعد کتنوں کے گرد و من کے یہی

## آر دو میں ڈراما نگاری

یہ دوسری تالیف ہے۔ جو عید آباد کے مشہور ادیب جناب سید  
بادشاہ حسین صاحب کے قلم کی مرہون منت ہے۔ اس کتاب کے  
پندرہ عنوان قائم کئے گئے ہیں جن میں سے آخری ماخذ ہے۔ قیصر  
عزائم کے ڈراما کی ابتدا۔ دوتا کی فیس۔ ڈراما اور قیصر۔ آر دو لونا  
اور قیصر۔ آر دو لونا کی پیدائش۔ اندر شجہا۔ قدیم آر دو لونا  
کی بعض اہم خصوصیات۔ طرز قدیم کے طبع دار و قیصر کے ترجمے۔  
قدیم ترجمے۔ قدیم ناٹک کینیاں۔ طرز قدیم کے پیش رو۔ طرز قدیم کے پرورد۔  
قدیم آر دو لونا اور ڈراما۔ آر دو لونا کا مستقبل۔ پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔  
شروع میں آٹھ صفحوں کا دیاچہ بھی شامل ہے۔ جو خود موصفت کا لکھا  
ہوا ہے۔

تمام ڈراما نگاروں کے تمام ڈراموں کا ذکر نہیں کیا  
اس کے کئی اسباب ہیں۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس چھوٹی سی کتاب میں ان تمام  
کے تخیلی تذکرہ کی گنجائش نہ تھی۔ دوسری وجہ ان  
لوگوں پر زیادہ واضح ہوگی جنہوں نے اردو ڈراموں  
کا مطالعہ کیا ہے۔ ڈرامے نانک کہنیوں کیلئے لکھے جاتے  
تھے اور نانک کہنیاں لاتعداد قائم ہوئیں۔ کچھ دنوں  
پہلے اور ٹوٹ گئیں۔ ایک ہی نام کے متعدد ڈراما نگار  
گزرے۔ اور ایک ہی نام کے متعدد ڈرامے لکھے گئے  
کہنیوں نے ڈراما نگاروں کو مستہر نہیں کیا۔ بلکہ بعض  
نقد ان کے نام کی اشتہار نہ جوتا تھا۔ اگر ڈرامے شائع  
ہو جاتے۔ اور اداکاروں کے سینوں میں مدھون پڑ گئے  
ڈراما عام کے ہاتھوں میں ہونے کی وجہ سے تاریخ  
اور تنقید کی نظروں سے بچ رہا۔ اور اسکی حیثیت محض  
کھیل تماشا کی رہی۔ ان ہی مختلف اسباب کی بنا پر  
اردو کے پورے ڈراما نگاروں اور ان کی تصنیفات و  
تالیفات کا صحیح یہ چھاننا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن بھی ہے  
تیسری وجہ یہ ہوتی کہ ایسے ڈرامے اور ڈراما نگار جن  
میں کوئی خصوصیت نہ تھی اور جو صاحب طرز نہ تھے  
معاطالت کے خوف سے نظر انداز کر دیئے گئے۔

پہلی وجہ قطعاً نا کافی ہے۔ کیونکہ سمندر کو کوڑہ میں بند کرنا ہی تو  
میں ایک ادیب و شاعر کا کمال ہے۔ پھر کیا اس دوستو اس صفحہ کی  
تألیف اتنی گنجائش نہ تھی کہ اس میں اردو کے تمام ڈراما نگاروں  
اور ان کا نام ایک ہی آچکا تھا۔ نام یا ان کا مختصر ذکر سما سکے دوسری  
وجہ یہ حد تک درست ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایسے افراد کا نام  
میں درج فرمایا گیا ہے جو ایک ہی آچکے ہیں۔ اور جن کے ڈرامے کسی  
نوع میں ایسی خصوصیت ضرور رکھتے ہیں جن کا ذکر کیا جانا مقتضائے  
مصلحت تھا۔ تیسری وجہ اور بھی پہلی ہے۔ کیونکہ محض طوالت کے خوف  
سب ڈراما نگاروں کو نظر انداز کر دینا جن کے تصنیف کردہ ڈرامے  
موجود ہیں۔ مگر اس میں فاضل مولف نے کوئی خصوصیت نظر نہ آئی اور نہ  
بائے ان اصحاب کا ذکر فرمایا جنہوں نے ڈرامے خود نہیں لکھے۔  
بلکہ جنہوں نے صرف دوا ایک ڈراموں کے ترجمے کئے ہیں۔ مگر وہ مولف  
لوہند ہیں۔ ہرگز قرین الصاف نہیں۔ نیز جیسا کہ خود مولف نے دیا ہے

میں فرمایا ہے کہ۔

تجو چیز ایک کو بہترین معلوم ہوتی ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی  
معیاری اور فنی خوبوں سے مالا مال کیوں نہ ہو۔ دوسری  
نہیں کردہ دوسروں کو بھی بہترین معلوم ہو۔

انہوں نے یہ کیسے سمجھا کہ جو ڈرامے انہوں نے ناپسند فرما کر  
نظر انداز کر دیے ہیں وہ دوسروں کو بھی یقینی ناپسند ہو گئے۔ اور اسلئے  
ان کا نام بھی کتاب میں لکھنا ضروری نہیں؟ ہر کیفیت ان تینوں وجوہ  
کا تذکرہ کرتے ہوئے قابل مولف نے اس کے بڑھ کر فرمایا ہے کہ۔  
”اگر کسی ڈراما نگار کو اپنا نام اس کتاب میں نظر نہ آئے  
تو وہ مایوس نہ ہوں۔ کیونکہ اگر ہنر افروزی طور پر ان  
کا ذکر نہیں کیا۔ تو عجوبی حیثیت سے انکی طرز کا تذکرہ ضرور  
کیا ہے۔ کیونکہ انکی طرز متذکرہ بالاتین طرزوں میں سے  
کوئی نہ کوئی ہوگی۔ جن کا ہم نے تفصیلی ذکر کیا ہے۔“

ہر چند کہ اس دلچسپ عبارت سے ایک طرف تو قابل مولف  
کی غلطیوں اور ذمہ داریوں پر ایک مسہین اور زنگار پروردہ پڑ جاتا ہے  
تو دوسری جانب ان لوگوں کی واقعی انک شہرت بھی ہو جاتی ہے۔  
جن کے ڈراموں کا اس کتاب میں ذکر موجود نہیں۔ مگر اس کا کیا جواب  
کہ بعض مشہور اور اچھے خاصے ڈراموں کے تذکرہ کی غیر موجودگی سے کتاب  
کی تکلیف ہی میں فرق آگیا۔ یا نقص پیدا ہو گیا ہے؟

خوشخبردی بالی والا کے ڈراموں و کرم دلاس، دلیر دل شیر،  
نگاہ غفلت، آثار زن۔ گوئی چند اور ہر تہی چند، اور حسن نظامی کا  
ڈراما چراغ راہ و فہرہ ڈرامے ایسے ہیں جن کا ذکر نانک ساگر میں  
موجود ہے۔ مگر فاضل مولف نے نانک ساگر سے غیر معمولی طور پر استغناء  
کرنے کے باوجود اپنی تالیف میں ان ڈراموں کا ذکر نہیں فرمایا۔ نیز  
شوق لکھنوی کا ڈراما رشید و جید، مولوی الہی بخش کا ڈراما تہمت عالی،  
خشی غلام قادر فصیح کا ڈراما، شہر مسود مولوی انیس احمد کا ڈراما، جیل  
مرکب، محمد حبیب صاحب کا ڈراما انتخاب، منشی جلال پر شاد برقی کے  
ڈرامے مرزا علی، مارا ستین، ٹنگالی دہن، پرتاب اور بروج، اور  
منشی ظہور احمد وحشی کے ڈرامے محبوبہ کر بلا، حجاب حق و سعت، عروس  
مصر، عبدالرحمن نامہ وغیرہ ایسے ڈرامے ہیں جن کا ذکر نہ کرنے سے  
معتضف یا انکی روح کو گزند پہنچے یا نہ پہنچے لیکن کتاب کی قدردانیت میں  
کسی قدر ضرور آگئی ہے۔

نیز ان کے متعلق صرف یہ کہ دنیا کافی نہیں ہو سکا مگر

اس دورے کا تذکرہ کیا ہے۔ جو شاہ فرخ سیر کے عہد میں تیار ہوا تھا اس کے متعلق فرماتے ہیں:-

دو رفتہ رفتہ فارسی کے زیر اثر چند ترانے مخلوط فارسی اور ہر اکرت میں تیار ہوئے۔ جو خاص مخلوط اور دریاؤں میں دھکائے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی قسم کا ایک تماشاخاؤ ازانامی ایک شخص نے فرخ سیر کے حکم سے تیار کیا تھا۔ اس کا سلیس اردو میں ترجمہ سنہ ۱۱۷۳ھ میں مرزا کاظم علی جوان نے کیا۔ جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مشہور مدرس تھے۔

ہر چند کہ یہاں اسکی ضرورت نہ تھی۔ کہ اس کتاب کے دو ترجمے ادب کا تذکرہ کیا جائے۔ لیکن چند مصطلحات میں جن کی وجہ سے اس کتاب کے نویں عنوان: دوسرے قدیم ترجمے کا ایک اقتباس شکنتلا کے ترجموں کے ذکر سے پیش کیا جاتا ہے۔ صفحہ ۷۷ میں فرماتے ہیں:-

”و سب سے پہلا ترجمہ اگر اس کو ترجمہ کہا جائے۔ تو فارسی سے فرخ سیر سنہ ۱۱۷۳ھ سے سنہ ۱۱۷۴ھ کے زمانے میں اس نے شکنتلا سے ترجمہ کیا اس سے اخذ کر کے ڈراما ترتیب کیا کہا جاتا ہے کہ فرخ سیر کے ایک فوجی سردار مولیٰ خاں ولد لدائی خاں کے حکم سے یہ ترجمہ ہوا تھا۔ اور مولیٰ خاں نے جس کو جنگی کارگزاری اور ایک لڑائی جیتنے کے صلے میں عظیم خاں کا خطاب دیا تھا۔ اپنے خطاب پانے کی یادگار میں یہ ترجمہ کرایا۔“

فرانز نے شکنتلا کو سنسکرت سے ہندی میں منتقل کیا اور سنہ ۱۱۷۳ھ میں مرزا کاظم علی جوان اور فورٹ ولیم کالج کے مشہور مترجم اے لے نواز کے ہندی ایڈیشن کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا

غالباً یہ حوالے رسالہ اردو کے جنوری نمبر ۱۹۳۷ء کے بابا تنہید سے لئے گئے ہیں۔ لیکن ماخذ میں اردو کے اس نمبر کا ذکر موجود نہیں بلکہ یہ کہیں سے بھی لیا گیا ہو۔ لیکن درست ہے۔ البتہ یہ سمجھ میں نہ آیا کہ جب فاضل مولف کو اس کتاب کا قرارداد فی علم تھا تو پہلے اقتباس میں اسے بظاہر تصنیف کیوں پیش کیا گیا۔ اور پھر دوسرے اقتباس میں اس کا بسیل ترجمہ کیوں ذکر فرمایا گیا۔ جب کہ حقیقتاً وہ ترجمہ ہے۔ شکنتلا کا

کتاب کا پانچواں عنوان اہم سمجھا ہے۔ جس میں اہم سبب

اس کتاب کا مقصد مجموعی طور پر اردو میں ڈراما نگاری کی حالت کو پیش کرنا ہے۔ نہ کہ انفرادی حیثیت سے ایک ایک ڈراما کو روشناس کرانا

بہر حقیقت دیباچہ کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ جس کا پہلا عنوان ہے ”ڈراما کی ابتدا“ اس میں بھی ڈراما کی ابتدا یونان سے دہرائی گئی ہے۔ اور یہاں بھی ڈراما کا سوجدا سس کا ئی لس۔ . . . .  
۱۹۳۷ء میں کنگز اور دیگر ڈراما کو یونانی تراویک پر کس گیا ہے۔ چونکہ اس تالیف کا بہت بڑا حصہ نالک ساگر اور مولف کی تمام تر تحقیق مغربی محققین کے انکار سے ماخوذ ہے لہذا ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔ بہر کیف چونکہ نالک ساگر کے سلسلے میں اس عنوان پر میں بسک کہ کچھ چکا ہوں۔ لہذا اسکی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ کہ ان کا یہاں بھی اعادہ کیا جائے۔

دوسرا عنوان ڈراما کی نسیم ہے۔ جس میں ڈراموں کے اقسام گنائے گئے ہیں۔ اور انکی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے۔ ہر چند کہ اس جگہ ہندی یا قدیم ہند کے ڈرامائی اقسام کا ذرا بھی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ پھر بھی کتاب کا یہ حصہ قابل قدر ہے۔ اور نالک ساگر کی اس بڑی کمی کو جس کو فاضل مولف نے دیباچہ میں کسی حد تک پورا کیا تھا۔ جناب بادشاہ حسین صاحب نے بہت بڑی حد تک پورا کیا ہے جس وجہ سے وہ قابل مبارکباد ہیں۔ اس حصہ کا اردو دہاں اصحاب کو ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

تیسرے عنوان ”ڈراما اور تعمیر کے تحت بھی جو کچھ لکھا گیا ہے ہر چند کہ اس میں صرف مغربی مصنفین اور انگریزی تصنیفات سے ہی کام لیا گیا ہے۔ مگر وہ بات درست ہے۔ اور یہ حصہ فن ڈراما اور اسٹیج کے محاسن و معائب کو ظاہر کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔

چوتھا عنوان ”اردو ڈراما کی پیدائش“ ہے۔ جس میں مولف نے ہندی راگ چھڑا ہے۔ یہ کسی مہمل بات ہے۔ کہ ہمارے علمائے ادب جب کہ کہتے ہیں تو دوسرے دن کا سہارا لیکر اور جب کسی منزل کی طرف چلتے ہیں تو ایک راہ سے نہیں بادشاہ صاحب نے بھی ڈراموں کی تخلیق کے سلسلے میں تو ہندوستان اور ہندی قدیم ڈراما نگاروں کو قطعی نظر انداز کر دیا۔ دراصل اس وقت اس کی سخت ضرورت تھی لیکن جب اردو ڈراموں کا سوال آیا تو اس کی تاریخی حیثیت کو ظاہر کرنے کے لئے

قدیم ہندی ڈراموں سے مراد لکھنے لکے۔ دراصل یہاں اسکی کوئی ضرورت نہ تھی۔ بہر حال آگے چل کر فاضل مولف نے تاریخی حیرت

کچھ لکھے۔ مجھے اس میں کلام ہے۔ حشر کے ادبی ڈراموں (دو نہیں جنہیں کمپنوں نے فزوبوکر کے ایسی شکل ہی مجاڑ دی تھی۔ بلکہ وہ جو ہنوز اسلی حالت میں بصورت سوسہ موجود ہیں، میں وہ کلمات پائے جاتے ہیں۔ جو ٹیکسیر کے ڈراموں کا طرہ امتیاز ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ عوام نے انہیں بلکہ خاص نے انہیں ٹیکسیر سید کہا شہر رخ کر: یا تھا۔

آٹھواں عنوان ہے: ٹیکسیر کے ترجمے: جس میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ ٹیکسیر کے ترجموں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ لاریب اس کے قابل موصوف نے بڑی ہی تلاش و جستجو سے کام لیا ہے۔ اور تمام تراجم کی تفصیل ہر سرف پیش کرنے کی کوشش فرمائی ہے، جو مشکوہ ہے، لیکن فکر بے موقع نہ ہو تو میں عرض کروں کہ دو ایک ترجمے ایسے ہیں، جن کی عدم موجودگی شکستہ ہے۔ مثلاً میکنت (Mikent) کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے مترجم سہاب جی پستنی کی لکھا، مطبوعہ انوار الاسلام پریس حیدر آباد کابینہ ذکر موجود نہیں۔ اسی طرح دی و نٹرشل لٹریچر سوسائٹی (The International Literature Society) کے ترجموں کا جہاں ذکر فرمایا گیا ہے، وہاں اس کے ترجمہ دوم و گمان مترجمہ مرزا تقی حسین نقی مطبوعہ آفترو کی پریس حیدر آباد کا ذکر موجود نہیں۔ دو میو جلیٹ (Romeo) کے ترجموں کے ذکر میں بھی مٹی جوا پر شاد برقی سے ترجمہ مشہور فرنگ لکھنؤ ذکر موجود نہیں بلکہ محترمہ کیتی دہلوی نے ہانگ ساگر کے مقدمہ میں اس کا خاص طور سے ذکر فرمایا ہے۔

ذراں عنوان دوسرے قدیم ترجمے ہے، جس میں مذہب ہندی ڈراموں کے ترجموں کا ذکر ہے۔ یہ جتنے ہی بہت محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ برصغیر کے کالیڈاس کے شہرہ آفاق ڈراما شکنتلا کے ترجموں کا ذکر ہے۔ اور اس کے بعد کالیڈاس کے دوسرے ڈراموں، نیز دیگر تراجم کا۔ بظاہر اس میں کوئی ٹیک نہیں معلوم ہوتی، اس حصہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کس طرح اردو میں دیگر زبانوں کے سمنہ لکھائے گئے ہیں۔

دسواں عنوان قدیم ہانگ کپیان ہے جس میں انگریز محققین و ہانگ لڑکی کے دو سے تمام پرانی اور کسی قدر اپنی تحقیق سے چند نئی کمپنوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ خاص چیز خاص طور سے مطالعہ کے لائق ہے۔

حاضرہ حصہ کے پیش رو: اس کتاب کا کیا دراصل عنوان ہے جس میں گیارہ ڈراما نگاروں کا ذکر ہے۔ یہ سب وہی ڈراما نگار ہیں جو کا ذکر ہانگ ساگر میں موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کتاب میں ہانگ ساگر کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا تھا۔ اور اس کتاب میں ہندو ڈراما نگاروں

سے متعلق تمام تراجم کا ذکر کیا گیا ہے۔ دلیل اور مزید ثبوت کا ذکر کئے ہوئے، عطر کھینچ کر رکھ دیا گیا ہے۔ نیز پروفیسر مسعود حسن رضوی کے مضمون کو سبباً شرح اندر سمجھا۔ مطبوعہ اردو کے اس خیال کو کہ کہ میر حسن کے اشعار نقل کرنے سے گمان ہوتا ہے کہ انہیں نے اندر سمجھا کا پلاٹ، یا کم سے کم اس کا کچھ حصہ میر حسن کی مشہور زمانہ شہرہ سحر البیان سے لیا ہو۔

کسی قدر پسند لگلا رہا تھا کہ پیش کیا گیا ہے۔ مگر چونکہ فاضل موصوف نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ قطعی درست ہے۔ لہذا گنجائش اعتراض یا اس سے جہل انکار نہیں البتہ اس کا ذکر نہ فرمایا گیا۔ کہ امانت کی اندر سمجھا کی اشاعت کے بعد، اور بھی اندر سمجھا نہیں لکھی تھی۔ جن میں سے یہ چار س دلت موجود ہیں۔ اندر سمجھا امانت۔ اندر سمجھا ادبی لالہ بزم سلیمان اور جیش پرستان۔

چہار عنوان قدیم اردو ڈراموں کی بعض اہم خصوصیات ہے اور جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے۔ یہ حصہ کتاب اچھا خاصہ ہے۔ جسے موصوف نے دانسی بڑی محنت و جانفشانی سے مرتب کیا ہے۔

ساتواں عنوان طرز قدیم کے مطبوعات ہے۔ جس میں دوق، نظریات عالمہ عبداللہ، مرزا قلی بیگ، لکھنؤ، طابک، احسن، بے تاب، دو تار، شہر، شہر، صحت، تیر، نازاں، عباسی، قاتل، افق، آغا کشا، حواشی، شاد، اسٹیل، شہر، حواشی، آرزو، رات سے شام، و لاد، رشتہ، انہوں، نعل، انظم، عباس علی اور ریاض، یعنی تیس ڈراما نگاروں کے ڈراموں سے بحث یا اس کا سرسری ذکر کیا گیا ہے۔

ان میں سے گیارہ ڈراما نگار ایسے ہیں جو کہ ہانگ ساگر میں جو ہے۔ اور افسوس ہے کہ ان لوگوں کے متعلق جو کچھ اور جتنا کچھ ہانگ ساگر میں بتایا گیا ہے، وہی اس میں بھی ہے۔ حد یہ ہے، کہ حشر کے اردو ہندی ڈراموں کا جہاں پر ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں بھی صرف دو ڈراموں کا اضافہ کر کے وہی سب ڈرامے اسی ترتیب پیش کئے اور بتائے گئے ہیں۔ جو جس طرح ہانگ ساگر میں موجود ہیں۔ اور حشر کے مشہور و معروف

ڈراموں مثلاً مادہ آستین، جرم و قاتل، نیک پروین، یہودی کی بڑی، شیر کی گرج، ہندوستان اور رستم و سہراب دارو میں، اور بلو، مصلح، مہم، بھگت گنگا، بھارتی، ہانگ، دھرمی، ہانگ، پہلا پیار اور دل کی سیاست، ہندی میں، کانوٹی، تذکرہ فرمایا گیا۔ نیز فاضل موصوف نے آغا حشر کو ٹیکسیر سید کہے جانے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ انہوں نے ٹیکسیر کے متعدد ترجمے کئے تھے۔ لہذا انہیں ٹیکسیر سید

چودھوان عنوان اردو ڈراما کا مستحق ہے۔ اور یہ بحث بھی جو کچھ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اور جسے کچھ مشورے دیئے گئے وہ درست ہیں۔ کاش ان پر عمل ہو۔

سب سے آخری یعنی پندرھواں عنوان مافذ ہے۔ جس سے متعلق ویساچ میں فرمایا گیا تھا کہ اس کا تفصیلی ذکر مافذ میں کیا جائے مگر حقیقت اس میں کوئی تفصیلی ذکر موجود نہیں۔ بلکہ صرف کتب درسی کے نام اور پتے درج کئے گئے ہیں۔ جن میں ڈرامائی ادب سے متعلق کم و بیش سو اوستے اور سو سو ہیں۔ ہر کیفیت جہاں تک فاضل معرفت کی مکتوبات کا سوال ہے۔ کتاب قابل قدر ہے۔ اب اگر اس میں چند فروگزاشتیں ہیں تو اس سے کون کتاب منتر اور تبرا ہے؟ یہ جب اس چیز پر نظر ڈالی جائے کہ میں نے دس کر ہی دو کتابیں ہیں جو نئی ڈراما پر یا فن ڈراما سے متعلق ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں تصانیف مدد دہ قابل فکاہ لائق تھام ہیں

کے تحت پیش کئے گئے ہیں۔ بظاہر ان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ورنہ یوں تو ہر ڈراما نگار ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہے۔ لہذا جسے ان کو دو جگہ تقسیم کر دینے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

طرز جدید کے پردے میں جو اس کتاب کا بارہواں عنوان ہے کس ڈراما نگاروں کا ذکر ہے۔ جن میں سے آخر معرفت مترجم کی مشیت رکھتے ہیں۔ اور اگر وہ ہیں، جبکہ ذکر نامک ساگر میں چھپے جناب تاج کے ڈراما انارکلی پر جو کچھ اظہار خیال فرمایا گیا ہے۔ وہ جو صد اوزا نہیں۔ شاید اس کی وجہ ان کے تصانیف کا علم ہو۔ جو ساقی کے ذریعے کسی زمانہ میں کس قدر سختی کے ساتھ ظاہر کئے گئے تھے۔ مگر جیسے میرٹ ایجنڈا ہے کہ چنگیز کے بارہواں اس ڈراما نے وہ مرتبہ حاصل کر لیا ہے جو اردو زبان کے کسی ڈراما نگار کو بھی حاصل نہیں۔ اور جس کے معرفت خود فاضل معرفت یہ ہواں عنوان فلم اور اردو ڈراما ہے۔ اس کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے ان میں زیادہ تر حقیقت ہے۔ کاش اس پر دھیان دیا جائے۔

## سرسر و حیں

ملک شام کے مشہور عالم مصنف جبران خلیل جبران کے شاہکار "الاوراح الممتروہ" کا اردو ترجمہ ہندوستان میں پہلی دفعہ شائع کیا گیا ہے۔ جبران خلیل آئندہ کی تصانیف دنیا بھر میں مقبول ہیں اور انگریزی کے علاوہ اور یورپی زبانوں میں بھی ان کے تراجم شائع ہو رہے ہیں۔

الاوراح الممتروہ غالباً مصنف موصوف کی تمام تصانیف سے ممتاز ہے اور اسے ہمارے ملک کے مشہور ادیب ابو العلاء حشری نے عربی سے تفسیر کر کے، سال تک عربی لک میں چکے ہیں اصل عربی کتاب سے ترجمہ کیا ہے۔

## حاجی لقی لقی پڑھو

روئے کیوں ہو، کیا مشکل ہی ایسی ہو  
پر دہ نہیں۔ ہمارے پاس اس کا  
بھی علاج موجود ہے۔ آج ہی

## حاجی لقی لقی کے افسانے

خریدیں۔ اور دن میں بین و نغمہ ٹھنڈے پانی کے  
ساتھ پڑھیں  
انشاء اللہ آپ کا چہرہ ہر وقت تبسم نظر آنے لگے گا۔  
قیمت - بارہ آنے

مکتبہ اردو لاہور



امین حزیں  
ریاضی

## تجلیات

یتاب نگاہوں کا مقصود ہے پردے میں الجھن سی یہ الجھن ہے مشہوت ہے پردے میں  
آنکھوں کے پس پردہ ہے عکس نگہ لیکن ظاہر کی یہ صورت ہے موجود ہے پردے میں

(۲)

ایمان کی دنیا ہے۔ ایقان کی دنیا ہے۔ قہجور کی دنیا بھی کس شان کی دنیا ہے  
معمول ہیں کاہے بے تابی و بے خوابی یہ جان کی دنیا ہے پہچان کی دنیا ہے

(۳)

بے شوق جنوں سماں رفتار نہیں مکن بے جوہر بے تابی کردار نہیں مکن  
تغییل کی خود سوزی کیا کہتی ہے سنتھڑ دل خود نہ جلے جب تک دیدار نہیں مکن

(۴)

ہے باعث یتابی پردے کا نہ ہٹنا ہی! بجلی کی تڑپ کیا ہے! بادل کا نہ پھٹنا ہی  
سچ کہتی ہے مغل سے مغل سر مغل اس سوزِ رگ جاں کا بہتر ہے نہ گھٹنا ہی

# سوکھی ہوئی ندی

اور آج — ؟

وہ آج میں پھر پہلا سا افسردہ روح، اور پڑوہ دل انسان جز  
 "حم بسلیوں میں باقی کر رہے ہو سلطان؟"  
 "مگر تم مصری ہو تو میں سب کچھ بتائے دیتا ہوں بیکہ بی بیہوش  
 دل و دماغ پر غلطیت چھائی ہوئی تھی، اور میں زندگی کے اس قدس  
 دور میں بھی افسردہ رہتا تھا۔ گناہوں کے علاوہ مجھے کسی چیز سے  
 دلچسپی نہیں تھی۔ دن کے وقت..... مگر کے آخری کہتے ہیں  
 کھڑکی کے پاس بیٹھ کر کتابیں پڑھتا رہتا۔ اور رات کو اپنی یادیں اس  
 سے بادشاہوں اور راجاؤں کے قصے سننا سننا سو جاتا۔ ٹریجڈی بھی  
 بے حد پسند تھی۔ اور جب کسی میں کسی کتاب میں کوئی حسرت، کج  
 قسم، بڑھستا، تو میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتیں۔ اور میں  
 بعض اوقات اتنا دوتا کہ کتاب کے ورق گھلے ہو جاتے۔ اپنی اشیاء  
 کی وجہ سے مجھے کئی بار شرمندگی اٹھانا پڑی۔ لیکن جب سب اشیاء  
 آنکھوں میں اندھا آتا تھا تو سوائے رونے کے اور کچھ بھی نہ سوچتا تھا  
 میری حالت نشینی محلہ بھر میں مشہور تھی۔ اور جب میں گھر سے باہر نکلتا  
 تو لوگ مجھے اس طرح دیکھتے، گویا کوئی عجیب چیز دیکھ رہے ہیں۔  
 لوگوں کے طنز و نفیر سے سننا، اور خاموش رہنا۔ اس کے سوا  
 اور میں کر بھی کیا کرتا تھا۔

میرے والد صاحب بڑی غضبناک طبیعت کے مالک تھے  
 آخر عمر میں وہ نور بعادت سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ اور اس چیز سے  
 انکی فطری زبردستی میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ میری والدہ بڑی سکیر  
 طبیعت کی عورت تھیں۔ اور کسی سے بولنا چاہتا پسند نہیں کرتے  
 تھیں۔ بھائی بھی عموماً خاموش طبع تھے۔ اسی ماحول میں میری اندھا  
 زندگی گزر رہی تھی۔

اس وقت میری عمر شاید اکیس سال کی تھی۔ جب ہم نے مکان  
 تبدیل کیا۔ جہاں مکان کے سامنے ایک شکیں دار صاحب رہتے تھے  
 جو بہت سے تیکل انسان تھے چنانچہ طبعی انکے ساتھ ہمارے تعلق  
 استقامت ہو گئے۔ ایک دن میں اپنے گھر میں کھڑکی کے پاس بیٹھا

آندھی تھم چکی تھی، مگر ابھی کہیں کہیں گرد و غبار کے بادل سورج  
 کی الوداعی زبرد زبرد روشنی میں سدھار رہے تھے۔ طوفان خاموشی  
 چھائی ہوئی تھی، اور وہ دونوں سوکھی ہوئی ندی کے کنارے ایک دوسرے  
 کے بالکل قریب چپ چپ بجے۔ گویا کسی گہری ٹکڑی میں  
 ہیں۔ اچانک ان کے سروں کے اوپر ایک چیل کی دردناک آواز گونجی،  
 اس پر ایک سہرا اٹھا یا، اور تاریکی میں غائب ہوتے ہوئے پروں کو  
 دیکھنے لگا۔ دو تین لمحوں کے بعد چیل آفت کی تاریکی میں غائب ہوئی اس  
 پر اس نے اپنی سیاہ فونی زانو سے اٹھا کر چڑی کے قریب رکھ دی اور  
 اپنے سامنے سے کہنے لگا: "پارسل یہ نہر پانی سے لبالب بھری ہوئی تھی  
 مگر اب تو کہیں ایک قطر آب بھی نظر نہیں آتا۔"

دوسرے نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی نگاہیں ایک بڑے  
 درخت کے نیچے چند خانہ بدوشوں کے درمیان آگ کے دھمکے شعلوں  
 پر جمی تھیں۔ پہلا چند لمحوں کے بعد اس کی ساکھ کا جائزہ لیتے۔ باہر پھربلا۔ تم کئی بار  
 میرے ساتھ یہاں آئے تھے سلطان؟

سلطان نے سر آہ بھر کر کہا: "پارسل بہت بارش ہوئی اور اس میں  
 اتنا پانی جمع ہو گیا، کہ لوگ نہایا کرتے تھے، لیکن آج یہاں خاک اڑتی ہوئی  
 نظر آتی ہے! معلوم ہوتا ہے۔ میان کسی پانی تھا ہی نہیں۔ زندگی  
 میں بھی۔ سلطان کہتے کہتے رک گیا۔

"زندگی میں بھی کیا؟"

"کچھ نہیں ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔"

"کوئی نا خیال — بتاتے کیوں نہیں؟"

"کوئی خاص خیال نہیں۔ بلکہ سلطان اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی چمکا

پر پھر نے لگا۔

"یہ اگر کوئی خاص خیال نہیں۔ تو پھر بتانے میں کیا ہرج ہے؟"

"اس سوکھی ہوئی ندی کو دیکھ کر مجھے اپنی زندگی کا ایک واقعہ یاد آ گیا

ایک ایسا واقعہ جس نے میری رگ رگ میں طوفان کیفیت و نشاط برپا

کر دیا تھا۔ ایک ایسا واقعہ جس نے مجھے زندگی کی حقیقی مسرت سے

روشناس کر دیا تھا۔"

اختر انصاری

# قطعات

## گریز شب

اب نہ اگلی سی وہ طبعیت ہے نہ وہ دل میں کسی کی حسرت ہے  
شب کو روتا ہوں کیوں بتاؤں کیا یوں سمجھ لو کہ ایک عادت ہے

## محبت

آس کو یاس نے کیا مغلوب لی جگہ آرزو کی حسرت نے  
لت گئی سب مستابع دل لیکن ساتھ چھوڑا نہیں محبت نے

## احساسِ غم

The

تیرے قربان! اے نشاطِ شباب اے سرورِ حیات صدقے جاؤں  
کیا کروں اپنے دل کی ٹیوں کو غم کے احساس کو کہاں لے جاؤں

## آواز

اب نہیں آرزوئے بزمِ طرب اب نہیں جستجوئے نغمہ و ساز  
ہو گیا ختم ذوقِ موسیقی جب سے میں نے سُنی تیری آواز

## مظلوم کی تھلوی

# بھکارن

پھر اپنے کپڑوں پر نگاہ ڈالی، اور اس کے بعد اپنی آنکھیں دھجک کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ گویا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دے رہی تھی۔ مگر میری اور آپ کی ہستی میں زمین و آسمان کا فرق ہے، جہاں کے ایک تیز چھوٹے کی آمد پر بھکارن پھل سے لہی ہوا نازک لہنی کی طرح کانٹا اٹھی۔

دیکھانے اس کا ہاتھ پھڑک رہا تھا۔ میرے ساتھ چلو، نہیں کپڑے جی دول گی۔ اور ان کیلئے کپڑوں میں تم کا نپ رہی ہو؟ بھکارن نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی، کیونکہ وہ دیکھانے کے ساتھ جانا نہ چاہتی تھی، مگر دیکھانے نے نرم ہناؤنگ ہاتھ اس کے لئے تھکڑیاں بن گئے تھے۔

نزدیک ہی سڑک کے کنارے دیکھانے کی کار کھڑی تھی، اس نے کار کا دروازہ کھولی کر بھکارن کو اندر دھکیل دیا، اور خود کار چلانے لگی، بھکارن بھی چوٹی حالت میں کار کے گدیے پر بیٹھ گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا دھنسن گئی ہو۔

تمام راستہ بھکارن جن کے ساتھ سیٹ پر نہ بیٹھ سکی، کار ایک شاندار ٹیکو کے سامنے جا کر ٹھہری ہو گئی۔ دیکھانے بھکارن کو اتار کر امد لے گئی۔

بگلا میں جا کر دیکھانے پہلی کی انجینی سے پانی گرم کروایا، اور بھکارن کو تیل صابن سے خوب تھلویا، اس کے بعد اسے پیچھے کے لئے سفید کپڑے دیئے۔

اب بھکارن غسل کے پھول کی طرح دکھش، اور اس گلاب کی طرح شگفتہ ہو گئی تھی۔ جس کا نہ نیم چھوٹے شہنشاہ سے دھواؤں اور بال درست کر کے بھکارن کو طعام میں گئی، اور اس چائے کے چم پیائے اپنے حلق میں اتار لے گئے۔

دیکھانے اب محسوس کر رہی تھی کہ بھکارن کا طبع لمحہ بہ لمحہ بڑا جاہل تھا۔

بھکارن کے لئے یہ بیگموجہ سے کم نہ تھا، چائے پینے کے بعد

دورانی پر پہلی کسی تاریک قسمت میں شارع امید کی طرح جھک رہی تھی، اور بارش کی ہلکی ہلکی دھجڑ دھجڑ کی ٹپکی میں ہنسا دگر رہی تھی۔

دیکھانے پیالہ میں سے چائے کا آخری گھونٹ اپنے حلق میں ڈال دیا اور کمرے کے ریشمان سے باہر نکل آئی۔ اس وقت رات کے نو بج چکے تھے۔

دیکھانے اپنی ساری درست کرتے ہوئے چوٹی دیکھانے کی آخری سیرمی سے پیچھے قدم رکھا اس کے کانوں میں ایک خفیت آواز آئی، بی بی لالہ جی!۔

دیکھانے پہلی کی روشنی میں دیکھا، کہ سولہ ستر سالہ بھکارن اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کی طرف لٹھی تھا، ہوں سے دیکھ رہی تھی، بھکارن کے تمام کپڑے کیلئے ہو چکے تھے۔ اور نوہر کی گلابی سردی نے اسے کانپنے پر مجبور کر دیا تھا، دیکھانے کو وہ بھکارن بہت خوبصورت معلوم ہوئی، اور سٹا اسے اپنی چوٹی پہن سٹور کا خیال آ گیا۔ سٹور ما، جس کی وفات کو ایک سال کا گزر چکا تھا۔ اس نے اپنا منی بیگ کھوتے ہوئے پوچھا: یہ دیکھ کر کیا کہو گی؟

”چائے پوچھی؟“ بھکارن نے کافی پوٹی آدھ میں جواب دیا۔ دیکھانے نے سن کر اپنا منی بیگ بند کر لیا اور بولی: کیا تم میرے ساتھ چلو گی؟

”کہاں؟“ ”میرے بیگ پر۔“ وہاں تھیں گرم گرم چائے کے علاوہ کھانا بھی کھلاؤں گی؟

بھکارن نے بھی ہنسی آنکھوں سے دیکھانے کی طرف دیکھا، گویا اپنا نواب بھلا نا چاہتی تھی، ایک لمحہ کے بعد اس نے جواب دیا: ”نہیں بی بی جی“

”کیون؟“ دیکھانے حیرت ہو کر پوچھا۔ بھکارن نے یہ سکر ایک مرتبہ دیکھا، گویا سر سے پاؤں تک دیکھا

”یہ لکے ساتھ تمام کمروں میں گھومتی اور ہر چیز کو غور سے دیکھ رہی تھی۔“

دن بھر کے تھکے ماندے آدمی کو اگر کچھ سکون دیتا ہو جائے تو اس پر نیند غالب آ جاتی ہے، بیکاروں کی بھی یہی حالت ہوتی دیکھا نے اپنے خاص کمرے میں ٹٹاویا، اور نرم و گرم بستر پر لیٹے ہی است لیتا آئی۔

.....

رات کو گیارہ بجے کے قریب پر مودہ باؤکلب سے واپس آئے، کھانا کھائے، ٹیبلیر سیدھے دیکھا کے خاص کمرے میں چلے گئے آہستہ سے دروازہ کھول کر دیکھا کے بستر پر ایک ٹائٹلڈ نام حبیبہ خواب راحت کے مڑے لے رہی تھی، سوختے میں اس کا خن اور بھی نکھر گیا تھا، اور دل کھائے ہوئے گیسو اس کی چھاتی پر اس طرح لہرا رہے تھے، جس طرح سانپ بن کی آواز پر لہرا تا ہے پر مودہ باؤ نے ایک لمحہ تک اسے دیکھا اور پھر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں دیکھا ایک انگریزی ناول پڑھ رہی تھی۔ پر مودہ نے ہنس کر پوچھا: ”آج تمہارے کمرے میں کون سو رہی ہے دیکھا؟“ دیکھا نے ناول میز پر رکھ کر ایک آنکڑائی لی۔ اور جوابی لیتے ہوئے بولی: ”میری ایک قہسلی ہے!“

”کہاں سے آئی ہیں؟“

”یہیں سے!“

”اوہ آ میں نے تو آج انہیں پہلی بار دیکھا ہے، پر مودہ نے یہ سمجھتے ہوئے اپنا بیٹھ دوڑ کر سی پڑھینک دیا، اور خود آرام کر سی میں گہرا نیند“

دیکھا نے گنگنہوں سے پر مودہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا: ”لیکن اب آپ اسے ہر روز دیکھ سکیں گے!“

”یعنی؟“

”یہ میرے ساتھ رہیں گی۔ دیکھا نے جواب دیا۔“

”اوہ بہت خوب!“ پر مودہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور اس کے بعد کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ چند لمحے بعد دیکھا نے شرارت پر چہارہ

”کیا آپ کو میری پہلی پسند ہے؟“

”ہاں! پر مودہ نے خشک ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا۔“

”مجھ سے بھی زیادہ؟“

”تم سے؟“ پر مودہ نے یہ کہتے ہوئے دیکھا کو خوب غور سے دیکھا۔ اور پھر مسکرا کر بولا: ”شاید“

دیکھا بے شکریہ سے باؤں تک جل اٹھی۔ مگر اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہوئے بولی: ”میں تو کہہ کر دیکھی رہی ہوں آپ چائے وغیرہ تیار کر لیتے۔“

”تو کہہ کر مودہ کے کمرے میں چلا گیا۔ اور دیکھا اپنے کمرے میں، بیکاروں، سوخت خواب میں پڑیوں کا تاق دیکھ رہی تھی دیکھا نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔ بیکاروں، مگر بہت کی حالت میں آنکھیں کھول کر بولی: ”کیا بات ہے بن؟“

”کچھ نہیں دیکھا نے جواب دیا: ”اب تم کافی سوچیں ہو، مگر“

بیکاروں اٹھ بیٹھی، مگر وہ جانتی تھی، کہ پھر لیٹ جائے۔

دیکھا اس کا بازو پکڑ کر غصے سے بے گئی، اور اس کے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی: ”انہیں اٹھاؤ!“

بیکاروں نے بھی بولی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہلے اٹھا لے، اس کے بعد دیکھا اسے گلے کے دروازہ پر لے آئی اور ایک دھپہ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولی: ”دیکھو! یہ سانس والی شربت سیدھی دیشا ران کو جاتی ہے“

بیکاروں نے دلی آواز میں کہا: ”لیکن اس وقت سردی ہے بن؟“ مگر دیکھا نے جواب دیا: ”

”پھر نا کہو!“ اور ان الفاظ کے ساتھ ہی ہاتھ کے کندھوں پر سے اونی ٹائل اٹھ کر بیکاروں کے کندھوں پر ڈالتے ہوئے بنگلہ کا دروازہ بند کر لیا۔“

اور

کچھ دیر بعد جب شہر کے گرجا گھر میں بارہ بجے۔ اس وقت بیکاروں اسی دیشا ران کی سیڑھیوں پر تھی، جہاں کھسٹری ہو کر وہ کئی سال سے تھیک ٹانگ ٹانگ کر اپنا پیٹ پال رہی تھی۔

صحرا اور کے خطوط کی مانگ کا یہ حال ہے کہ کتاب ستمبر تک ختم ہو جائیگی، جلد طلب کیجئے۔

سراج الدین ظفر

# میری خودداری

نہ مسکامری حالت پہلے اسیر ہوس  
 کبھی نہ خاک نشینوں کی گرد کو پہنچی  
 مجھے دیا ہے زمانے نے ذوقِ بت شکنی  
 تری نظر ہے اسیر فریبِ سلطوت و جاہ  
 تری ہوس کو ہے دور و زہ زندگی کا خیال  
 مرے خیال سے جلتا ہے لامکاں کا چراغ  
 مرے لبوں میں شراب ہے ہیں برقِ امین کے  
 مری جبین ہے منہ نیم شب کا آئینہ  
 تری آوازوں سے آتی ہے بو غلامی کی  
 مری جوانی سے قائم بنائے کون و مکان  
 مرے غلوں کی وسعت ازل سے تابہ ابد  
 مرا وقار مرے بعد زندہ جاوید  
 تر وجودِ نسب و رُتب ہے رسوائی  
 مری نظریں ہے جو چیزِ بچ اندر بیچ  
 نہیں ہے مجھ کو ویسا نہ زندگی منظور  
 مرے لئے ہے وہ اسرارِ بدتر از دُشنام

بجا نہیں مرے آگے غمِ سرور نام و نمود  
 نہ پادشاہتِ فرعون نہ سلطنتِ نمرود  
 یہ کائنات ہے بت خانہ اور میں محمود  
 مری نظر کا ہے آگے مددِ زحل سے دُود  
 مری خودی کو ہے ذوقِ زمانِ لا محدود  
 ترا خیالِ خود اپنے لئے ہے ناسود  
 ترے لبوں میں غلامانہ زندگی کا جمود  
 تری جبین ہے سجودِ ریاسے گرد آلود  
 مری نواؤں سے ہے خود سری کا ورسدود  
 ترے بزرگاپے سے قائم گداگری کا وجود  
 ترے غرور کا حلقہ بُنانِ چشمِ حسود  
 ترا وقار ترے بعد نیست اند نابود  
 مرا وجودِ نسب و رُتب سخاوت و جود  
 بنایا تو نے اسی بیچ و زشت کو مسجود  
 لے جو غوئے خوشامد سے گوہرِ مقصود  
 کہ جس کی تہ میں فرنگی کا پاتہ ہو موجود

جھکا جو دولت و ثروت کے آستانِ پیر  
 مری نظریں ہے وہ شخصِ اندل و موز

مسعود جاوید

## ”نگہت کے خطوط“

رات کہیں دور کوئی گارہا تھا۔  
کون سے گاس کا دروشہ کشاں کشاں  
تم نے جسے ملا دیا پردہ الفت میں

میں سنتی رہی چپ چاپ — اور متعدد بار دل نے کہا تو بھی  
اے وہ بڑی گاتی ہوئی رات کی خاموش فضاؤں میں اپنی آواز کے ساتھ  
خواب ہو جا۔ مگر میں سنتی رہی خاموش، جیسے کوئی اپنی روت کی کڑا  
کوسن رہا ہو۔ مگر میں کشتے سے چبہ رہے تھے۔ لب تھر تھرائے میں نے  
محسوس کیا انا کا خاموشی بن کر تنگ رہے ہیں۔

— ”دور“ — ”شورش کائنات“ — ”پردہ الفت“ —

اجانگ بچے احساس ہوا کہ ایک سچ اپنے ساتھ میری ساری زندگی  
لے ہوئے مجھے کی گہرائیوں سے اندھی کی طرح انہی ضبط کی مضمون کشیوں  
آنسو بن کر آنکھوں میں آگئیں۔ جسم کے سارے اعصاب نوازی ہو گئی  
کے ساتھ شل سے ہونے لگے۔ میں نے چاہا سچ چوں مگر ایک  
جائستار کپڑی کے ساتھ معاً یہ معلوم ہوا، جسے کسی آہنی بازو نے پوری  
میدادی سے میرا گلا دبا دیا ہے۔ میرا سانس ٹھٹھنے لگا۔ ایک لمحہ  
کے واسطے اس لمحے ہونے سانس نے نگاہ بن کر آنکھوں سے نکلنے  
کی کوشش کی، مگر دوسرے لمحے ہی میں میرے ہوش و حواس  
سلب ہو چکے تھے۔

آخر شب کے ستارے ڈوبنے لگے تھے کہ مجھے ہوش آیا جسم کی  
رنگ رنگ زخم کی طرح دکھ رہی تھی۔ ضعف و تباہی کی شدت میں  
ہر احساس ہوتا تھا کہ سکرات کے عالم میں زندگی کا وحند لاسا خواب  
دیج رہی ہوں۔ مجھے میرے بچے سے پھسل کر زمین پر آ رہا تھا۔ اور چوڑیوں  
کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے دونوں کلائیوں کو مجروح کر بیٹھے تھے۔  
مگر — قریب ہی اپنی مہری پر تو اسی طرح درجوش سو رہے تھے!!  
یہ تو مٹے جن کو مذہب کے پس پردہ سماج نے میرا خدا لئے  
مجازی بنایا تھا۔ اور جن کی ہر ایک جنبش نظر پر مجھے صرف سجدے ہی ثابت  
کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ یہ وہی نافرمانے تنگ و ناموس تھا جس کے  
بغیر عورت صرف قمر تار رہتی ہے۔ — عقاوت نہیں: — یہ

ہی آقا تھا۔ جو اپنی ہر ایک کینز کو قبر میں سلا کر تہذیب و سماج کے تاجروں  
سے ایک اور کینز خرید لینے کا لی اختیار رکھتا ہے۔ مگر  
نہیں۔ وہ تو ایک لاش تھی جس کے تن میں مجھے اس لئے ساتھ  
... لغوت کر دیا گیا تھا کہ اس کے توسل سے میں بھی کسی طرح  
فردوس میں پہنچ سکوں۔ ورنہ بخت عورت تو مرد کو ترو و دہشت  
کراہی چکی ہے۔ اور اس کے لئے وہاں تک پہنچنے کا بذات خود کوئی  
استحقاق نہیں رہا! — میں نے ایک نظر ادھر دلی پوری مالاوچی  
لے اختیار کر لی چاہا کہ اٹھ کر اپنے ناقول پاٹھوں کی ساری کوتاہی  
کی موٹی گردن پر صدمہ کر دوں خواہ اس کے بدلے مجھے اب تک جہنم  
کے مٹھلوں میں ہی کیوں نہ بھٹک دیا جائے!

تم شاید متعجب ہو گی کہ ایک عورت ہوتے ہوئے بھی کیج کر  
ایسا لکھنے کی جرات کرے۔ جی ہوں۔ لیکن برا نہ مانو، تو کون۔ کہ تمہارا  
یہ استغراب غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ تم اس غلامی کا احساس  
اس لئے نہیں کر سکتیں، کہ تمہیں اس کا سواغہ ہی نہیں ملا، نہ باری اندوہ  
زندگی ان تمام مسرتوں کی حامل ہے جن کی تمہیں یا کسی اور عورت  
کو توقع ہو سکتی ہے۔ اور اس طرح اس حسین و جمیل تہذیب میں آزادی  
کا تصور بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ مگر مجھے دیکھو کہ ولہن لے کے بعد  
آہوں اور آنسوؤں کے درمیان ہی زندگی گزری ہے۔ اور سماج  
کی حرم پسند مصلحتوں نے مجھے ان مسرتوں سے فریب کھانے کا بھی  
موقع نہیں دیا۔ جو مجھے اپنی منفی غلامی کے شعور سے دور رکھ سکتی تھیں  
اگر ایسا نہ ہوتا، تو بہت ممکن تھا کہ کسی اور عورت کی زبان سے یہی الفاظ  
سنگریں خود بھی تمہاری طرح تھیر ہوتی۔

اس غلامی و آزادی سے میرا معلوم کیا ہے۔ یہ شاید تم پوری  
طرح نہ سمجھ سکو۔ تہذیب و سماج نے عورت کو کچھ ایسے خوبصورت انداز  
میں دھوکے دیئے ہیں۔ کہ ایک بہیم سے احساس کے علاوہ کوئی تجزیہ  
و تحلیل ممکن معلوم نہیں ہوئی عورت کے ارتقاء کے حیات کی داستان  
کا اولین باب وہ ہے۔ جب وہ شادی کے بعد بھی اپنے خاندان دیا  
قبیلہ کے برابر غاروں یا میوں میں زندگی گزار رہی تھی۔ دنیا کے اس

قدیم دور میں شادی کا مفہوم یقیناً موجود مفہوم سے کہیں زیادہ مختلف تھا۔ ایسی ہندسب و ذریعہ کی پیدائش نہ ہوتی تھی۔ اور اگر ان کا کوئی وجود تھا، تو وہ بھی یقیناً آجکل سے بالکل جدا گانہ نوعیت رکھتا تھا۔ اس لئے موجودہ صدی کا جذبات انسان اس قدیم دور کو وحشت و برہنیت کا زمانہ سمجھتا ہے۔ مگر حیرت ہے کہ اس قدیم وحشی زمانے میں عورت کو جو مرتبہ بنے اقتدار و اہمیت کے لحاظ سے حاصل تھا، وہ آج — یو یو سب کا ایک حسین خواب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں پہلی قابل غور چیز یہ ہے کہ عورت کو اپنے خاندان کا شہ و اذنیسم کیا جاتا تھا۔ وہ شادی کے بعد بھی اپنے اعزاء کے درمیان زندگی بسر کرتی تھی۔ اس کا شوہر بھی اسکی طرح اپنے قبیلے میں ہی رہتا تھا۔ اگر کبھی کسی وہ اپنی شریک حیات سے ملنا چاہتا تھا، تو اسکی حیثیت شوہر کے خاندان میں ایک معزز مہمان کی ہوتی تھی۔ ایک طویل مدت تک یہی قانون جاری و ساری رہا، اور شادی کے مفہوم کے زبردست تغیرات کے بعد بھی عورت کی حیثیت اپنے خاندان کی منطری ملک کی سی رہی۔ اس عہد میں عورت کی اہمیت و وقعت کی شاہد ایک مری تاریخی حقیقت یہ ہے کہ حسب و نسب کا سلسلہ ان کی طرف سے شمار ہوتا تھا، اور تمام رشتے ماوری شجرے کی بنا پر متعین ہوتے تھے، ان، خانگی املاک کی مالک تھی، اگر عورت کسی سبب سے اپنے شوہر سے جدا ہو جاتی تھی، تو اس کو اپنے گھر سے نکال دیتی تھی، اور مرد اپنے قبیلے میں چلے جانے پر مجبور ہوتا تھا۔ اس قسم کی مفارقت و علیحدگی کجالت میں بچے اپنی ماں کے پاس ہی رہتے تھے، اور اسی کے خاندان کے ارکان بن جاتے ہوئے تھے۔ سماجی ارتقا کے اس دور کے متعلق کارپٹر بیان کرتا ہے کہ وہ ان قدیم سماجی حالات میں عورت بہ نسبت موجودہ زمانے کے کہیں زیادہ آزاد و خوش حال تھی۔ وہ اپنے ہی فرقے یا قبیلے اور اپنے اعزاء و اقارب کے ساتھ زندگی تھی، اور اس کا شوہر ایک خارجی مہمان کی حیثیت رکھتا تھا، ان امور کے مد نظر عورت کسی صورت میں بھی شوہر کی محکوم نہ تھی، اور اگر شوہر اس تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا، تو اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ صرف عورت ہی کے لئے سندیہ رو بہ اختیار نہ کرے۔ بلکہ عورت کے خاندان کے لئے بھی خوشگوار عادت ہو۔ وہ اپنے بچوں کی طور پر مالک تھی، اور اس کو یہ حق حاصل تھا کہ اپنی ملکیت اپنے بچوں کے واسطے ورثہ میں چھوڑ جائے، مختصراً یہ کہ خاندان اور نسب کا اور اعزاز اس کو حاصل تھا، اس کے برعکس اگر شوہر کو یہ بھی معلوم ہو جاتا تھا، کہ اس کے بچے کون سے ہیں، تو اس صورت

میں بھی وہ اپنی کچھ دیکھ بھال نہ کر سکتا تھا، اور نہ اپنے قبیلے کی اعزاز کے بغیر اپنی ملکیت بچوں کو دے دینے کا حق رکھتا تھا، اس طرح ہندو زندگی میں مرد و عورت ایک ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ داستان ہے اس زمانے کی جسے آج ہم وحشت و برہنیت کی یادگار سمجھ کر حقارت سے دیکھنے کے شوگر ہو چکے ہیں، مگر تاریخ شاہد کہ جیسے جیسے مرد و زنہ مخلوق کی دنیا میں اقتدار حاصل کرتا گیا، اور جنس جانوروں پر اپنے آلات حرب کی ایجاد کے ذریعہ تسلط و قدرت پانے لگا، اس کے ذہن میں ذاتی تعریف کا شعور بڑھتا چلا گیا، اور کچھ مدت کے بعد وہ اپنی از و دوا ہی زندگی کی پائندگی کو بر و غضب کی نگاہوں سے دیکھنے لگا، یہ وہ زمانہ تھا جب مرد میں اپنی طاقت کا احساس پیدا ہوا، اس نے یہ سنے کر لیا، کہ جس طرح وہ اپنی قوت کے ذریعے جنگ کے فائدہ کو ہلاک کر سکتا ہے، اسی طرح وہ اپنی از و دوا ہی زندگی کے قدیم قوت، جن کو درہم برہم کر کے عورت کو اپنا محکوم بنا کر چھوڑے گا۔ یہ اس کا بعد اتمام تھا، موجودہ تمدن کی طرف! — چنانچہ اس نے اپنے اسلحہ کی تمام روایتوں سے بغاوت کی، اور عورت کو ایک جاوڑ کی طرح بڑی کر کے اس کے اپنے قبیلے کے چیموں میں لے آیا، عورت نے اس تباہ کن تبدیلی کو کس طرح قبول کیا، یہ پسند و نوقت کے ساتھ نہیں بتائی جاسکتی، اگرچہ یہ امر انسانی لطافت سے منافی ہے، مگر ممکن ہے کہ عورت محض معدودی و مجبوری کے تحت ظاموش ہو کر رہ گئی ہو۔ کچھ محققین کا خیال ہے کہ عورت نے جدید طرز زندگی کے نقصانات کو اس لئے برداشت کر لیا، کہ اس صورت میں مرد پر اس کا تعریف زیادہ ممکن اور براہ راست ہونے کا امکان رکھتا تھا، بہر حال خواہ عورت نے اس تفسیر کو پسند کیا ہو یا نہ کیا ہو، مگر یہ حقیقت ہے کہ مرد نے ہی پر زور دیا، اور کامیابی کے واسطے اکثر قوت و تشدد کا استعمال کیا، اس وجہ سے کائنات پر ہوا، کہ اس قسم کی جبری یا گرفتاری کی شاد باقی ہو گئیں، جس مرد میں جتنی زیادہ قریب زمانہ ہوئی وہ اتنی ہی عورتیں دیگر قبائل سے بکڑ لیا، قبیلوں کے طاقتور سردار اور وحشی جنگجو اپنے بچوں کی تعداد میں اضافہ کرتے چلے گئے، اور قبائل کے درمیان ایک مستقل خصوصیت و جنگ کا عنوان قائم ہو گیا، اس حالت میں مرد نے عورت کی اقتصادی قیمت کو سمجھا اور اسے مختلف کام سپرد کئے گئے، اس کے بچے مرد کی ملکیت ہو گئے، اولاد مزید کی وقعت بڑھ گئی، کیونکہ لڑکے مرد بن جانے کے بعد قبیلہ کی باہمی لڑائیوں میں مدد کرنا ہو چکے تھے، لڑکیوں کے فرائض یہ رہے کہ زراعت کریں، سنانج مسیکر تیار کریں،



کے چڑے بنائیں، اور بچے پیدا کریں۔ کچھ عرصہ کے بعد ہی مرد کے اس خلسے نے کہ عورت اس کی ذاتی ملکیت ہے، ایک قدم اور بڑھا دیا، یعنی دوسری ملکیت کی طرح عورت کی بھی خرید و فروخت جاوی ہو گئی۔ اولاد کی متعلق اس کے تمام حقوق سلب کر لئے گئے۔ حسب و نسب کا سلسلہ مرد کی ذات سے شمار ہونے لگا، اور خاندان کی تمام ملکیت جو زیادہ عورت کی نعمت و مشقت کا نتیجہ ہوتی تھی، جو کے تصرف میں دیدی گئی۔ سی دھ عورت بہت عرصہ کے ساتھ ایک سرور و اور لذت کی حیثیت سے گزر کر صرف ایک غلام یا پالتو جانور بن کر رہ گئی، مادری اعزاز فنا ہو گیا۔ پوری امت دار کا عروج و ناکامی اس کے ساتھ ایک آفتاب نے مطلقاً عورت کی کسی چیز سے ۱۱

عورت کے سماجی مرتبہ کے اس انقلاب پر غور و فکر کرتے ہوئے بہت کم لوگ ایسے ہونگے، جو عورت کی اقتصادی اہمیت کو نظر انداز کر سکیں۔ نہ وہ اپنے شوہر کی نفسی ایک جسمی شریکیت یا اس کے اولاد کی خواہش بن نہ تھی، بلکہ وہ خاندان کی نعمت و مشقت کا زیادہ حصہ برداشت کر رہی تھی، اور مرد کا کام صرف شکار کرنا یا دشمنوں سے جگہ کی کرنا تھا۔ شکار کے جانوروں کی کھالیں بنانا، اناج پینا کوٹنا، کھیتوں میں بل جانا، حسب اور عورت ہی کی ذمہ داری پر تھے، اور اس لئے مرد، عورت کو اپنی ملکیت میں سب سے زیادہ قیمتی چیز سمجھنے لگا، اور اس کی قیمت بھرنا بکریوں کی صورت میں متعین ہونے لگی۔ اگر عورت ایک کار آمد مزدور نہ ہوتی، اگر وہ صرف ایک پیش و عشرت اور مصارف کی چیز ہوتی — تو یقیناً نسل انسانی کے اس نفس اور مشقت انجیز دور میں اس کی قیمت اتنا زیادہ بھی تصور نہ کی جاسکتی، اس طرح رسمی شادی کے اس دور نے جیلا عورت کو ایک جدید تہذیب اور اخلاقیات کا دیدار دیا، وہاں ساتھ ہی ساتھ عورت کی مساوات اور آزادی کو بھی لوٹ لیا، اور اسے ایک کثیر میں تبدیل کر دیا، لیکن رقم جانتی ہو، کہ جب کوئی انسان دوسروں کو غلام بنا رہا ہے، تو وہ اپنی گردن کو بھی ان زنجیروں سے محفوظ نہیں رکھ سکتا، چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد دنیا نے دیکھا، کہ مرد عورت کو مجبور کر کے خود بھی آزاد کر رہا، اس نے خود کو چند جدید اور اہم ذمہ داریوں میں گرفتار کر لیا، اس کو مجبوراً چند حقوق اور فرائض کی تکمیل اپنے سر پہنی پڑی، علاوہ ان ذمہ داریوں نے اوصاف طاقت سے حکومت کی، اور اس کی اولاد پرینہ نظری انتخاب کے قوانین کے تحت اسی ذہنیت کو لیکر پیدا ہوئی عورت گزرتی تھی، اس نے مجبوراً اسے چالاک بنانا پڑا، اور اس نے اپنی حرکیوں کی غلطی میں تعلیم و عمل سے یہ چیز پیدا کر دی، پھر گزرتا ہوا دھلیانہ

طاقت کے مقابلے میں بغیر طاقت ہمیشہ کامیاب رہی ہے۔ اس لئے عورت نے رفتہ رفتہ خود کو حقوق و ادایات و رسوم میں محصور کر لیا، جن کی پابندی اگر مذاہب نے بھی مرد کے واسطے لازمی قرار دیدی، نسل انسانی کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہم رسم و قاعدہ جو عورت نے اپنی آزادی کے واسطے قائم کیا، یہ تھا، کہ شوہر اپنی بیوی اور بچوں کی ملکیت و پرورش کا ذمہ دہ ہے، اس رسم نے رفتہ رفتہ عورت کو متعین کر کے مذہب کی پشت پناہی بھی حاصل کر لی، اور ایک قانون کی صورت میں تبدیل ہو گئی، اس طرح بہت سے محققین کا قیصلہ ہے، کہ قدیم انسان اور عورت مذہب اقوام کے بشری طریق و رسوم عورت کے اثرات کا نتیجہ ہیں، بہت دور تھن کے عروج کے ساتھ ساتھ یہ طریق اصول میں تبدیل ہو گئے اور مذہب و حکومت کی حمایت نے انکو قوانین کی صورت دیدی جو کسی حد تک عورت کی آزادی کے ضامن ہو گئے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور اہم چیز بھی قابل غور ہے، انسان کے جسمانی ارتقاء کی تاریخ بتاتی ہے، کہ اس کے بعض کارآمد اعضاء ایسے بھی تھے، جنکا استعمال کسی وجہ سے ترک کر دیا گیا، اور اس لئے وہ معدوم ہو گئے، مگر ان متروک اعضاء کے باقیات —

(Vegetical Remnants) نظام جسمانی میں اب بھی موجود ہیں، جو بعض اوقات عمل میں آکر غیر متوقع پریشانی کا سبب ہو جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح قدیم زمانے کے نفسیاتی اور سماجی باقیات اب بھی مرد کی فطرت میں خوابیدہ رہ گئے ہیں، جو اگر متحرک ہو کر اسے مجبور کر دیتے ہیں، کہ اپنی تہذیب کے تمام لواظوں کو ناکارہ کر دیتی وحشی آقا بن جائے، جو عورت کو ایک پالتو جانور سمجھ کر اپنی اعلیٰ قوت سے انہمت تھا، عورت نے چند بلند فطرت اور ذہنی فطرت مشابہت کی امداد سے صدیوں کی جدوجہد کے بعد رفتہ رفتہ اپنی کھوئی ہوئی آزادی کو واپس لیتے ہیں، ایک نمایاں کامیابی حاصل کی ہے، مگر جب مرد کی ہیمنانہ خواہش فطرت جاگ پڑتی ہے، تو مذہب تہذیب اور قانون کوئی بھی عورت کی سپر نہیں بن سکتا، بلکہ یہی چیزیں مرد کی چہرہ و دستوں کے خوبصورت مجاہدات ثابت ہوتی ہیں، کارہنر ثابت ہے کہ ۱۱

۱۱ ایک نیم ارتقاء یافتہ مرد یقیناً ایک خردمند اور جانور ہے، اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں مرد کی حکومت کا مفہوم صدیوں تک عورت کی غلامی رہا ہے ۱۱ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ تہذیب و اخلاق کے جوہر و حاکم انسان

بس چلتا تو کسی کی مرضی ہوتی۔ زندگی کے ساتھ ساتھ موت بھی تسمو  
دی ہے۔ خدا جلے کب تک یونہی نزع کی اذیت سے کھینچا رہا؟  
تہااری تجھت۔

### میری سگی؟

آؤ آج تمہیں ایک دلچسپ کہانی سناؤں۔ مجھے معلوم نہیں  
دوسروں کی زندگی میں بھی ایسا ہوتا ہے یا نہیں۔ کم از کم میری حیات  
میں تو یہ چیز آپ جی ہے۔

کالج کا انیسوا پروردہ زمانہ تو نہیں بھی یاد ہوگا۔ مجھے تو بھلانے نہیں  
بھولتا۔ تعلیمی مشاغل میں مستقل اہٹاک اور اس کی مصمم لہ تھی۔  
بس یہ محسوس ہوتا تھا کہ زندگی اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہمارے میں  
میں مستقل کے متعلق کیسے کیسے سہانے خواب محفوظ تھے۔ — ہوگا۔  
وہ ہوگا۔ دن اس طرح بسر ہوئے۔ راتیں یوں گزریں گی۔  
مگر میرے تو وہ سارے خواب تقدیر کی جہانوں ہو کر جو جو رہ گئے۔  
کبھی کبھی ان کے ٹکڑے بچنے کر کے ایک ٹکڑے سا خاکہ بنائی کیوشل  
کرتی ہوں اور پھر وہی منتشر کر دیتی ہوں۔ کتنا لا حاصل ہے۔  
کھیل۔ مگر کس قدر دلچسپ!!

آہ انسانی فطرت! — زندگی بھر ہم سب یونہی خوابوں سے  
کھیلتے رہتے ہیں۔ — کچھ خواب زندگی ہی کو ایک ہنگامی غریب سے  
جاتے ہیں۔ اور کچھ اشکوں۔ گمراہیوں اور سکھوں میں تبدیل ہو کر اب  
بھی حقیقت بن جاتے ہیں۔ مگر ان کی یاد؟ — آہ وہ تو پار ہا مال  
ہے۔ — آئی ہے۔ خاموش رات میں سوئے سے کچھ پہلے۔

سنان دور پر کی تہائی میں — سو گوار شام میں — آئی ہے اور  
دلے پاؤں چلی جاتی ہے۔ — جیسے زندگی — آہ افانی انسان  
اپنی تحقیر ہے تیری ہستی۔ مگر کس قدر لاف تھا ہی میں تیرے خواب پہ۔  
پھر اب اس کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے کہ تو اپنی محرومیوں سے کھینچا  
رہا کہ اس میں کامرانی نہیں تو تیرے کامرانی تو ضرور موجود ہے۔

ہاں تو یہ اسی عہد باری کا واقعہ ہے۔ کالج کا حکیم احسان علی  
اندھی دوائی ہونے کو تھا۔ جب مجھے مشیل کے مرکزی کردار ڈیول  
کا پلاٹ دیا گیا۔ تو میں نے سوچا تو خوب۔ — ایک ہی رہی —  
قرنِ حال بنام سن دیونہ زود بخدا بھلائے کیسے ممکن تھا۔ کچھ جیسی میں  
لو کی سیکڑوں حاضرین کے سامنے ایک پامل عورت بن کر ساری  
رات بجا اس کرتی۔ ہے ۹ میں نے اپنا پلاٹ ڈیول یا دکر لیا۔

انقلاب و عروج کے زمانے میں بھی اس قسم کے نیم ارتقا یافتہ مردوں  
کی کمی نہیں۔ ہمارا موجودہ سماج اسی نوعیت کے خونخوار انسانوں کا  
ایک غول ہے۔ ذرا خود سوچو۔ کہ جب والدین اپنی بے زبان لڑکی کو  
ایک "غریب" کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اس دلخیزہ کی زندگی کو اپنے غلام  
و بے درجہ بگڑاؤں میں سسل کر چیک دیتا ہے۔ تو کیا یہ سطر باطل وہی  
نہیں ہوتا۔ جب مرد ایک میا و بھا قبربان — اور عورت ایک حید  
ملتی مجبور و کمزورہ۔ — مذہب و تہذیب کے وہی علمدار جو عورت  
کو اطاعت و محبہ بیعت کا درس دینے میں تقریر کی ساری قوتیں صرف  
کر دیتے ہیں۔ اس وقت کیوں زبان نہیں بلا سکتے۔ جب عورت کو اس  
اطاعت و محکومیت کے بدلے صرف ٹھوکریں عطا کی جاتی ہیں؟ —  
تم نہیں جانتیں؟ — سو سو۔ — یہ ساری تہذیب کم از کم عورت کے  
دائے ایک "مناقت" کے علاوہ کچھ نہیں۔ مردان قوانین و اصول سے  
تو بھار دین کر سکتا۔ جو غلام عورت نے جہد جہد کر کے اپنی نجات کیوں  
پیدا کئے۔ کیونکہ اس طرح خود تہذیب کے دعوے باطل ہوتے ہیں۔ اب  
صرف یہی صورت عمل باقی رہ جاتی ہے کہ مرد کے کچھ اور کرے کچھ۔  
عورت کی مساوات و آزادی کے ترانے بھی گائے۔ اور مگر کی قید میں  
اسے آئندہ بھانے پہ بھی مجبور کرے۔ اس کی بیوہ کی خاطر اپنی  
ذمہ داریوں کا احساس بھی ظاہر کرے۔ اور اسکی بربادیوں پر فوراً  
توجہ بھی گوارا نہ کرے۔ — آہ! تو میں اسی طرح تباہ ہوتی ہیں!

خط بہت طویل ہو گیا۔ تم میری بجواس سے یقیناً اکتانگی ہو گی۔  
مگر میں کیا کروں۔ پردہیں دکھا ہوا ہوں۔ اور تم جیسی بے لوث پرسش  
کرنے والی ہستی۔ — اکتانہ ہستی ہوں۔ تو جی چاہتا ہے کہ بدلتی جی  
کبھی چلی جاؤں۔ تم چاہے سنو یا نہ سنو۔ — میرے ذہانات سے یقیناً  
تم متحیر و متوحش ہوتی ہو گی۔ مگر پردہیں مجھے اپنی نامرادیوں کی قسم بہت  
حقائق ہیں۔ شاید میری زندگی میں وہ دن نہ آئے۔ مگر جیسے ازل سے  
کہ ایک روز یہ حقائق پرستاری کی نگاہوں سے دیکھے جائیں گے۔ اور  
میری مدوح بند دستاویز حروف کے خواب میں آکر انہیں سبار کب  
دے گی! —

میری صحت کو کیا پوچھتی ہو! راکھ کے ڈھیر میں دی ہوئی ایک  
چٹکاری ہے۔ کچھ راکھ بن چکی ہے اور کچھ ختی جا رہی ہے۔ غشی اور شنج  
کے درمے پڑے ہی تھے۔ اب کبھی کبھی دیوانگی کا سا جوش بھی طلوی  
ہو جاتا ہے۔ تنہا مکان ہوتا ہے۔ اور میں اسی حالت میں دیوانہ سے  
سر نہکواتی میری ہوں۔ کیا کہوں میں سمجھتا ہے کہ آسمان وہ —

خارج تحسین وصول کیا تھا۔ آج وہی جذبات میری دم دھکے بھرنے لگے ہیں۔ مگر زندگی کے سیج کے تماشائی کس قدر بے حس ہیں، کہ چپ چاپ بیٹھے دیکھ رہے ہیں۔ کاش یہ ڈراما بھی جلد ختم ہو جائے اور سوت کا آخری پردہ مجھے ان سنگدل تماشاہنوں کی نظر سے مخفی کر دے!!

ہاں تم تعجب نہ کرو۔۔۔ میں واقعی روز بروز پاگل ہوتی جا رہی ہوں۔ دیوانگی کے دورے میں کیا کیا بچ بچتی ہوں۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن یہ جانتی ہوں کہ اس حالت میں اپنے لاڈلے بچے کو کسی بار زور کو بکری ہوں۔ وہ کیا جائے کہ ماں اسوقت دیوانی ہے۔ سمجھتا ہوگا کسی ظالم عدوت ہے۔ مجھ سے دہشت محسوس کرنے لگے تو کھینچا ہے۔ جوش آتا ہے۔ تو اسے کیلے سے لگاتی ہوں۔ پیار کرتی ہوں روتی ہوں۔ ہنستی ہوں۔ وہ مجھے متیر نظروں سے گھورتا ہے۔ کبھی کبھی روٹھ جاتا ہے۔ اتنی ہم نہیں بولتے تھے۔ آہ میرا نظم بچہ!! اسکی پیاری پیاری آنکھوں میں کیسے نئے نئے آئینے چمکاتے ہیں! وہ کیسی لرزہ خیز سبکیاں لیکر خاموش رہنے کی کوشش کرتا ہے!!۔۔۔ میرا ننھا سا چاند!! شاید وہ اس عقوبت میں صرف اس واسطے جتا چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ ایک عدوت کی لڑکھاتی ہوئی زندگی کا واحد سہارا ہے؟۔۔۔ خیر!!

خوگر جو رہے تھوڑی سی جلا اور بھی  
اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور بھی  
تھماری بھگت دیوانہ

کرشن چندر تارو مانی واقع ہوئے ہیں۔ انکا طرز انشا اگر کمال العباد  
لیکن انہوں نے واقعیت سے گریز نہیں کیا۔ حیات انسانی کا اگر مطالعہ  
موجودہ معاشرت پر ظلم کے تیر فشرستین ہے ساختہ اور بے تکلف ظرافت بھی جو  
انکی اور دبا کسبہ ترکیبوں میں جمدت ہے۔

ان کے افسانے  
ہماری زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں

ظلم خیال

کرشن چندر کے افسانوں کا مجموعہ ہے

بارہ افسانے۔ ادھالی مدھالی۔ بھین برونی کا خنجر برائی کتابت میں قلمبند  
مکتبہ اردو لاہور

آخری ریسٹ ڈیرسل کا وقت آیا۔ کالی کا تمام حملہ موجود تھا۔  
دیوانی بن کر بال بکھلے دریدہ و کپے بنے  
انکے بڑھی۔ کس قدر تھک چکی تھی۔ اور کالی میں جذب تھی کہ ناگیا  
میری نظریں شریں ہستی محنت پر پڑی۔ میری اداکاری نے اس کے  
چہرے پر حیرت و خوف کے کچے ایسے مضحکہ خیز اثرات پیدا کر دیے تھے  
اور میں دیکھ نہ سکی۔ اور بے اختیار قہقہہ لگاتی ہوئی سیج سے بھاگ  
گئی ایک لمحہ میں سارا کھیل ختم۔۔۔ پھر کیا بچ رہی وغینہ۔۔۔  
کاہن بچے بنایا گیا۔ کتنی کچھ ہدایات کی گئیں۔ مگر سچ مانو مجھے پھر  
یہ خوف رہا کہ ڈراما کے دوران میں کہیں پھر ایسا ہی نہ ہو جائے  
میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اگلے روز پونے دو گھنٹے  
میں مجھے ایک سامعہ کے لئے بھی ہنسی نہ آئی۔ حاضرین نے میرے  
ان کی تعریف میں نہ من و آسمان کے تلابے ملا دیے۔ اور اختتام  
میں بہت سے تحفے مل گئے تھے۔ لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ میں کھیل گیا  
تھے مکمل طور پر دیوانہ بن جانے میں کیسے کامیاب ہو گئی تھی۔ میری  
تاریک بہت سادہ تھی۔ مگر قد بے و شمار تھی۔ یعنی صرف یہ  
تشریف کو حقیقت سمجھ لوں۔ میں نے معتزلی دیر کے لئے یہ تصور کر لیا  
تھا۔ کہ میں واقعی اندرونی زندگی میں غل ہو گئی ہوں اور میرے شوہر  
میں بے ہمتائیوں نے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔

لیکن پڑوس مجھے اسوقت کیا فرق تھی کہ یہ ڈراما نہیں بلکہ تمثیل  
کے پردوں میں اپنی حقیقی زندگی کا کھیل کھیل رہی ہوں۔ اسوقت میں  
میں جذبات کو زبردستی اپنے ادھر طاری کر کے حاضرین سے

حوالہ کے خطوط کی ساخت کا مجموعہ ایک پوسٹ  
ادھر اسرار غنیمت و صحت ہے۔ انکی نکاری ہر دم

ماہیوں کی نکاری کی سی ہے۔ انکی اثرات حوالہ کی طرح بسیط ہیں۔  
ان میں داستانیں ہیں ان ہستیوں کی جنہوں نے اپنا سب کچھ کھوکھلت کی بھرپور  
جست و خیز کر دی فرض پر۔ جنہوں نے غریب محبت کھایا اور پھر اپنی محبوبین  
کے لئے غریب حیات پر کھلی بن کر گئے۔

میں جنہوں نے اپنی محبت اپنی دنیا اور اپنی زندگی آداوی دین کی وہ تھیں کئی  
کتابت و طباعت نہایت دلآویز ٹائٹل پیج و رنگین  
قیمت دھماکی ہوئے۔ ادب لطیف کے خریداروں کیلئے  
ایک روپیہ تیار کے بصورت منی آڈر

مکے کے کا پتہ۔۔۔

جمیل احمد  
(کنہ صاحبوری)

# ناول نویسی

کہ پہلے اس مہو کا ذکر کر دیا جائے جس سے بلاٹ کی تعمیر و تکمیل ہوتی  
اگر آپ مثال کے لئے اردو کے تین شہرہ آفاق ناول نویس یعنی سق  
پریم چند اور راشد الغزیری کے کارناموں پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں  
تو یہ حقیقت آپ پر اجماعی طرح آشکار ہو جائے گی کہ ان تینوں نے مختلف  
طبقہ انسانی سے اپنے ناولوں کے لئے مواد فراہم کئے ہیں۔ مگر یہ کہ  
عوامل طبقہ اعلیٰ سے متعلق ہوتے ہیں۔ پریم چند نے سماج کی بیرونی  
سے تنگ آکر اس پر زہر میں بجھے ہوئے تیر چلائے ہیں۔ اور اس کے کما  
بھارے جیسے محمور اور بلاچار انسان ہیں۔ راشد الغزیری نے اپنے ناولوں  
میں متوسط طبقہ... کے حالات زندگی پیش کئے ہیں۔ اسی طرح اگر  
انیسویں صدی کے چار مشہور ترین انگریزی ناول نویس مثلاً ڈکنس، ٹیگرے  
چارلس ایلیٹ اور ہٹورن کے ناولوں کو مد نظر رکھیں۔ تو آپ کو معلوم  
جائے گا کہ جو چیز ڈکنس کے ڈیوڈ کاپر فیلفیلڈ (David Copperfield)  
(Vanily Fair) میں نہیں اور جو ٹیگرے ایلیٹ کے آدم بنڈن  
(Adam Bede) میں کارفرما ہے۔ وہ ہٹورن کے سکا رتھ  
(The Scarlet Letter) میں دولوش ہے۔  
ان چاروں کی دنیا ہی بالکل جدا نظر آتی ہے۔ مگر اس تغدد کے  
باوجود بھی انہوں نے نظرت انسانی کی نقاب کشائی کی ہے۔ یہ ادبات  
ہے۔ کہ ڈکنس نے جس طبقہ کے انسانوں کے واقعات اپنے مختلف ناولوں  
میں ظلم بند کئے ہیں۔ وہ اوسط ادنیٰ درجے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ٹیگرے  
کے بیشتر کردار طبقہ اعلیٰ سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت اب واضح ہو گئی  
کہ بلاٹ میں حیات انسانی کے کسی کسی پہلو کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ خود  
وہ طبقہ اعلیٰ سے متعلق ہو یا طبقہ ادنیٰ سے؛ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس  
قسم کا بلاٹ فنی اعتبار سے بلند اند کا سیاب کلائے جائے گا۔  
ہے۔ بلاٹ خواہ کسی شے سے بھی متعلق ہو۔ مگر اس کو فنی بلندی دینے  
کے لئے یہ امر لازمی ہے۔ کہ وہ سب کے لئے یکساں طور پر دلچسپ بن جائے  
کا باعث بن سکے۔ بعض حضرات اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہی بلاٹ  
درحقیقت قابل ستائش ہے، جو ہر اور اور دو تین لوگوں کی زندگی

اکٹھا دیکھنے میں کہ وہ بالکلنا مستعد و شوار ہے۔ ناول نظم بند کرنا  
استیوار آسان ہے۔ کیونکہ اگر ایک ڈراما نگار کو کچھ لکھنے سے پہلے سیکھنی کی بنیادی  
ضروریات اور ڈراما کے فنی اصول و ضوابط سے اجماعی طرح واقفیت حاصل  
کر لی جاتی ہے۔ مگر ایک ناول نویس کے لئے نہ کوئی ایسی پابندی ہے  
اور نہ کوئی ایسی دشوار مشہد۔ بروہ شخص ناول لکھ سکتا ہے۔ جس کے پاس  
فرصت کے ساتھ ساتھ نظم، سیاق و کلام، لفظوں... کا بھرپور علم ہے۔  
نفاذ کی نظر میں ناول نویسی کمیت فن استعد آسان ہے۔ تو اس کے  
ادبی معیار کو جاننے کے لئے اگر اس کے فنی اصول قائم کئے جائیں۔ تو یہ  
کوئی سہل کام نہ ہوگا۔  
بہر حال ناول نویسی کے اصول و ضوابط پر کچھ لکھنے سے پیشتر ہم اس کے  
خاص اجزائے ترکیبی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لینا ضروری سمجھتے ہیں۔  
۱) بلاٹ: بلاٹ کردار (۱) مکالمہ (۲) منظر (۳) طرز تحریر (۴) اور  
نظریہ حیات: یہ وہ مجموعہ ضروری عناصر ترکیبی ہیں۔ جن کے بغیر کوئی ناول خوا  
وہ اچھا ہو یا بُرا، حزنہ ہو یا طرب، طویل ہو یا مختصر، عالم وجود میں نہیں سکتا۔  
ناول واقعات اور حرکات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اور ان ہی دونوں  
کے مترسار کو لوگ عام طور پر بلاٹ سے تعبیر کرتے ہیں۔ جو خاص طور  
میں حصیتے ہیں۔ انہیں کردار کا لقب دیا جاتا ہے۔ اور ان کرداروں  
کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے، اس کو مکالمہ کہتے ہیں۔ جس کا کردار نگاری  
ست چولی و اس کا ساتھ ہے۔ حرکت جس جگہ عمل میں آتی ہے اور کردار  
جہاں تیسرے بلاٹ میں حصہ لیتے ہیں۔ اسے منظر کہا جاتا ہے۔ طرز تحریر کے  
متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ کیونکہ یہ وہ چیز ہے جو ہر ناول نویس کا  
خاص طرز اختیار ہوتا ہے۔ اب صرف ایک مختصر بات یہ کہنا ہے کہ یہ عیناً  
جس کے معنی ہیں کہ ہر ناول نویس زندگی کے اہم مسائل پر اس  
زادہ نظر بیان کرتا ہے۔ یہ ایک کامیاب ناول کی سب سے لازمی شرط ہے  
مگر اس کے لئے ایک کامل فن ناول نویس کو چاہئے کہ وہ واقعات اور  
کردار کی ترتیب کچھ اس طرح کرے۔ اور حرکات کو کچھ ایسے پرانے  
میں بیان کرے۔ کہ اس کا نظریہ حیات خود بخود قارئین پر واضح ہو جائے  
بلاٹ کے متعلق کچھ عرض کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے

مستحق ہو۔ مگر یہ خیال صرف سطح میں ناواہوں کا ہے۔ درحقیقت وہ ہے کہ مرگ پر چڑھے ہوئے بغیر یہ گداگر کی زندگی کو بھی اگر پلاٹ کا مرکز بنایا جائے، تو کوئی معافیہ نہیں۔ اور اب تو آئے دن ایسے ترقی پسند ناول لکھے جاتے ہیں جن میں نچلے طبقے کے لوگوں کی غمناک زندگی سے پلاٹ کا راز افراہم کیا جاتا ہے۔ ہاں، اسی طرح اس نوع خیال کو بھی حرف ظلم کی طرح دل سے نکال دینا چاہیے۔ کہ وہی ناول درحقیقت بلند پایہ اور کامیاب کہلاتے جاتے کا مستحق ہے جس کا انجام خیر ہو۔ طریقہ انجام بھی ہماری دلچسپی کا اسی طرح موجب بن سکتا ہے جس طرح یہ انجام اصل چیز یہ ہے کہ پلاٹ کے اندر دلچسپی ہوتی جائے یعنی یہ کہ وہ ہر قسم کے قاری کے لئے ذہنی انبساط کا سامان بنایا کر سکے۔

ناول جس قدر دلچسپ ہوگا۔ اسی قدر اسے کامیاب تصور کیا جائے گا۔ مگر وہ اس قابل ہوا کہ قاری اپنے اوقات فرصت میں اس کے مطالعے سے تھوڑی دیر کے لئے اپنے تمام تفکرات و غرو و احوال سے بے نیاز ہو گیا۔ تو بلاشبہ وہ ناول قابل تعریف ہے۔ اور اسکی مصنف ناول نگار اگر دلچسپی کے علاوہ فنی پابندیوں کا بھی اس کے اندر ہر لمحہ خیال کیا جائے۔ یا اس کے اندر کردار نگاری کا جوہر نہایت خونی کے ساتھ نمایاں ہو۔ یا اس میں ڈرامائی قوت بھی کافی طور پر پیدا کرنا۔ تو پھر میں ضرور اس ناول کا پایہ بہت بلند ہوگا۔

ناول کو کامل طور پر نئی بلند ہیئت کے لئے صرف دلچسپی خیال رکھنا کافی نہیں۔ سب بڑی چیز یہ ہے کہ اس کے اندر فنی پابندیوں کا کوئی خیال کیا جائے اور ان بات کو نہایت خوبصورتی سے ترتیب دیا جائے۔

### صداقت کی اہمیت اور ایک کامیاب ناول کیلئے

یہ ازہیں ضروری ہے کہ اس کے اندر صداقت کا عنصر خونی کا روبرو ناول نویس صرف ان ہی باتوں کو اپنے ناول میں بیان کرے۔ جس کا اسے تجربہ ہو۔ . . . . یا جس سے وہ اچھی طرح باخبر ہو۔ حدت صرف ہوائی باتوں کو الٹ پلٹ کر رکھ دینے سے ناول کی لطافت اور بہتر ہو کر رہ جائے گا۔ یہ خیال کرنا غلط اہمیل ہے۔ کہ ناول کو بھی ہو۔ آخر ناول ہی تو ہے۔ حقیقت سے اس کو کیا واسطہ!

اس قسم کے خیالات و افکار کے نکال کر یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ کوئی ناول خواہ وہ دیگر حیثیتوں سے کتنا ہی بلند پایہ کیوں نہ ہو۔ اس وقت تک فنی لحاظ سے قابل قدر نہیں سمجھا جاسکتا جب تک کہ اس کے اندر صداقت غالب نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایک کامیاب

ناول کی بنیادی شرط اس کے صداقت ہے۔ ناول نویس پر لازم ہے کہ اسے زندگی کے جس پہلو کی تصویر آئاری ہو۔ اسے اس صحت منظر کو دے۔ جیسے وہ ان تمام باتوں سے بخوبی واقف ہے۔ اس چیز کو اسے ہاتھ پرگز نہیں لگنا چاہیے جس کا اسے تجربہ نہ ہو۔ یا جس سے وہ کامل طور پر واقف اور متعارف نہ ہو!

ہر ناول نویس کی ایک محدود دنیا ہوتی ہے۔ جس کے ہر پر زب سے وہ واقف ہوتا ہے۔ اب اس کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ اپنے ناولوں کے لئے ہر قسم کا مواد اپنی اسی محدود دنیا سے فراہم کرے مگر اس نے اس کے باہر پاؤں پھیلانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اگر کر جائے گا۔ جارحانہ لٹ نے ہم سے ناول نویس خواتین کے خلاف ایجنڈے پر شکایت کی تھی۔ کہ ان کا نقطہ نظر مردوں جیسا ہوتا ہے۔ حالانکہ انہی ہی صنعت کا خیال کرتے ہوئے زندگی کی تصویر اپنے ناولوں میں ہی طرح آئاری چاہئے، جس طرح کہ خواتین آئاری ہیں اور آئانے کی عادی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جارحانہ لٹ کی شکایت بجا تھی، کیونکہ مرد صرف مرد ہی کے جذبات اور احساسات سے اچھی طرح واقف ہو سکتا ہے۔ اور خاتون صرف خاتون کے جذبات ہی سے! اگر کوئی مرد کسی خاتون کی دلی کیفیات کا حال سمجھ کرے گا۔ تو ظاہر ہے۔ اس میں وہ صداقت نہیں آسکتی جو ایک خاتون اور صرف ایک خاتون کے قلم ہی سے ممکن ہے۔ ناول نویس خواتین میں جن آئینہ نگاروں نے (مردوں کی)

صداقت کو بہت زیادہ مد نظر رکھا کرتی تھی۔ اس سے اپنے مفکر ناولوں میں صرف ان ہی مقامات کا ذکر کیا ہے۔ جن کا اسے ذاتی تجربہ تھا۔ . . . اس نے زندگی کے صرف ان ہی پہلوؤں کے جلوے دکھائے ہیں۔ جن سے وہ اچھی طرح متعارف تھی۔ جس سے اس کی دسترس میں باہر تھی اور جس پر اسے جوہر تھا۔ اس نے کسی بات نہ لگایا۔ اس کے ناولوں میں خواتین نہ صرف خواتین ہی سے مصروف نظر آتی ہیں بلکہ مردوں سے بھی! مگر ایک مرد کو مرد کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اس نے اپنے ناول میں ایک جگہ بھی پیش نہیں کیا کیونکہ وہ مردوں کے جذبات اور احساسات سے بیگانہ تھی۔ اور اسے اس کا علم نہ تھا کیونکہ آپس میں کس قسم کی گفتگو کیا کرتے ہیں۔

لیکن یہ امر قابل التماس ہے کہ نئے اور جدید ناول نویس اس اہم پہلو کو بالکل نظر انداز کر ڈالتے ہیں۔ اور وہ بے سرو پا باہر نکلتے ہیں۔ جن کا نام و نشان تک بھی وہ نہیں جانتے۔ اپنے پلاٹ کے لئے مواد وہ ان چیزوں سے فراہم کرتے ہیں۔ جن سے وہ کبھی وہ جا نہیں

نہیں کہ ہم براہ راست ہر چیز کا ذاتی تجربہ کریں۔ یہ کسی قسم کے شکل اور ہے۔ کتابوں سے بھی ہم بہت کچھ استفادہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً ان اشخاص سے گفتگو کرنا جنہیں کچھ کم منفعہ بخش نہیں۔ جو ہر دور متعارف ہو چکے ہیں۔ جن کی کسی ہم سے آج تک شکل بھی نہیں دیکھی۔ انگریزی ادبیات میں ڈیوڈ رے (David Ray) کا راجن کرود سوانیکا کا حامل ہے۔ اس کے اندر جو مناظر بیان کئے گئے ہیں۔ وہ استفادہ جاتے معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے غلام ہونے کا شائبہ بھی ہمارے ذہن میں نہیں گزرتا۔ مگر کیا آپ کو یہ سیکھنا چاہیے کہ اس کا مصنف نے تو کبھی کسی جزیرے میں رہا۔ اور نہ اپنی تمام زندگی میں اس نے کبھی سمندر کی شکل بھی دیکھی۔ اور حالانکہ اس قسم کے مناظر سے یہ تصنیف بڑی بڑی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ڈیوڈ رے دوسرے ذرائع سے مواد فراہم کرنا کی کامیاب کوشش کی۔ اور اپنے ذہن و تخیل کی مدد سے ایسی دھمپیل دلیپز پر لکھائی بلندی کی۔ جسے اب تک بچے اور بوڑھے مرد اور عورت سب یکساں طور پر ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔

تاریخی ناول نویسوں کو بھی موخر الذکر قسم کے تجارب حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً اگر انہیں تین صدی پیش کی حالت تصور کرنی پڑے۔ تو وہ اس عہد کے صحیح حالات کتابوں کی مدد سے معلوم کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ فانی تجارب کا اس سہ کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہوئے۔ وہ تخیل کی زندگی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ مگر یہ خود نہیں جانتے کہ سٹیج کے اندر کسے کیسے ہوتے ہیں۔ وہ سمندر میں ڈوکر کرتے ہیں۔ مگر انہیں اسکا ذاتی تجربہ نہیں ہوتا۔ کہ سمندر کا پانی تلخ ہوتا ہے یا شیریں، سرسبز و لالہ نہ ذہنیت کے غلات آواز لالہ اور مرد و رانیہ کا کو دنیا کے سائے میں گزرا و اتنی بہت بڑا کام ہے۔ مگر اب ہر شخص میں نے غریب کی معمول سی مصیبت بھی نہیں اٹھائی۔ محض مقبولیت کیلئے بار بار جہانے ہوئے ناسے چپا ناسٹروں کو تیار ہے ظاہر ہے کہ جہاں یہ کیفیت ہوگی۔ وہاں کوئی ناول مٹی بلند کی کیونکہ حاصل کر سکتا ہے؟ اکثر نقادوں کا خیال ہے کہ ہر شخص اپنی زندگی میں کم سے کم ایک کامیاب اور دلچسپ ناول ضرور لکھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے ذاتی تجارب و خیالات، احساسات و جذبات کی تصویر صداقت کے ساتھ پیش کرے۔ مگر افسوس کہ ہمارے بیشتر ناول نویس اسکی مطلق بڑا نہیں کرتے۔ اور بے جا مقبولیت کا دھڑا رہنے کے لئے وہ دوسروں کی نقل آوارہ کی سنی نامشکور میں بہک جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بوجہ ذہنی نقل کی کام کی بھی نہیں ہوتی۔

کاش۔ ہندو دقت وہ اس قسم کی ناکام کوششوں میں مرمت کرتے ہیں۔ اگر اس کا نفع بھی ذاتی تجارب کی بنا پر کم لکھے ہیں صرف کریں تو وہ ذہنی کاوش کہیں زیادہ تھیں سمجھی جائے۔

انڈی کے مختلف شعبوں کی واقفیت حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری

## ادبی جواہر پارے رعایتی قیمت پر

| سالنامہ | تعمیم | ۲۵۰ صفحات | تعداد پر ایک درجن | قیمت |
|---------|-------|-----------|-------------------|------|
| ۱۹۳۶ء   | ۲۰۰   | "         | "                 | "    |
| ۱۹۳۷ء   | ۲۵۰   | "         | "                 | "    |
| ۱۹۳۸ء   | ۲۵۰   | "         | "                 | "    |
| ۱۹۳۹ء   | ۲۲۵   | "         | "                 | "    |
| ۱۹۴۰ء   | ۲۲۵   | "         | "                 | "    |

نوٹ۔ ہر سال ایک آنے کی قیمت کے علاوہ ہوگا۔ ہمدردی رعایت سے فائدہ اٹھانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ قارئین طلبہ و محرموں کے لئے قیمت ہمدردی مئی آرڈر یا صورت نکٹ بھیجیں۔

یہ نچر رسالہ ادب لطیف لاہور

## محرمہ حجاب اقیاز علی

## ایکات

جب دنی چمن سے بوڑھے ڈاکٹر کا لوگواری گارن کئے کی عادی ہے  
ڈاکٹر کا رتے تھوڑی دیر کے غور کے بعد اپنی عادت کے مطابق اڑا  
بدن والا۔ بولا: تم لوگوں کی فرمائش ملتے ہوئے بھی طبیعت آزرده ہوتی  
ہے۔ تو بھر جیوتی! میرے سوٹ کیس تم کو بھرنے ہونگے، اور میری سواد  
کی پڑیوں کی دیکھ جال روحی تم کو رو۔

بوڑھے ڈاکٹر کی اسی ایک گندی عادت سے مجھے نفرت ہے۔  
مجھے سواد کو چھونے سے بھی کھن آتی ہے۔ مگر کیا کرتی! اس وقت اپنا مطلب  
تھا۔ ناچار وہ دھ کر لیا۔ کہ سوار کی پڑیوں کا اہتمام میں کروں گی  
ڈاکٹر کا رتے اسی وقت دادم عمر کو خط لکھ دیا کہ ہفتہ عشرہ میں  
ہم لوگوں سمیت وہاں پہنچ رہے ہیں۔

لیکن ڈاکٹر کے پاس بعض کیس ایسے اہم آتے رہے۔ کہ خط لکھنے  
کے پندرہ دن بعد ہم اپنا سفر شروع کر سکے۔ اس روز میں، میری محبوب  
اکلوتی سہیلی جیوتی اور ڈاکٹر کا دم تینوں ڈاکٹر کی جیوتی سی سفری کار میں  
چل پڑے۔ دن کی گرمی سے بچنے کے لئے رات کا کھانا کھا کر سفر شروع  
کیا۔ پھر گرام پہنچا۔ کہ سوار کے رستے میں رات دادم عمر کے ہاں بسر کر  
کے انچی خواہش پوری کریں۔ اور دوسری صبح سوار کے کھڑے دروں میں پہنچ  
جائیں۔ یہ خبر نہ ملتی کہ یہ رات زندگی کی بنیاد خوفناک واقعات میں سے  
ایک ہوئی۔ — مالک کی پناہ!

مٹی کی تہی ہوئی چاندنی رات تھی۔ ہماری نفسی سی بیٹنے دیران  
مترک پر کسی تیز رفتار کیڑے کی طرح چل جا رہی تھی۔ نو بج چکے تھے۔  
خیال تھا کہ رہا ہوا سا ڈھ بانہ بجے تک ہم دادم عمر کے میاں پہنچ جائیں  
کے مترک پر کوئی راہ گیر نہ تھا۔ زود چاند موسم گرما کے شفات آسمان پر  
دم بخور تھا۔ تازہ کے فلک دوس چھتری نما درخت رات کی تسوولی کاری  
سے سہوت کھڑے تھے۔

جیوتی کا چارہ ہی تھی۔ میں اس کے پہلو میں بیٹھی مانی کھا رہی تھی  
بوڑھا ڈاکٹر بچا ہوا سکار نہ میں دبائے غنودگی کے عالم میں کھل سہیل  
پڑاغت غنودگی سے چو نکتا۔ تو مرے میں آکر عمر خاتم کی کوئی شروع باہی

مجھے ایک مدت سے سوار کے کھنڈر دیکھنے کا اشتیاق تھا۔  
اتفاق سے ایک دن باتوں باتوں میں نے اپنے شوق کا ذکر کر دیا  
ڈاکٹر کا رتے کیا۔ وہ سنتے ہی بولے: اتنا اشتیاق ہے تو میں وہاں کی  
سیر کو جانی کیوں نہیں بہتہار سے قیام کا انتظام میں کئے دیتا ہوں۔ دادم  
عمر وہ لی خوشی سے نہیں اپنا ہمان بنائیں گی۔ کہہ تو آج ہی انہیں لکھ دیا  
میں نے سوال کیا دادم عمر کو کون ہیں؟

بوڑھے ڈاکٹر کا رتے سوار کی ڈوبہ جیب سے نکالی اور اسی بجلی  
مارنے ہوئے بولا: تم دادم عمر کو نہیں جانتیں۔ وہی! دو سال ہوئے  
یہ حادثہ سرد سے کوئی چالیس میل کے فاصلے پر کار کے حادثہ میں بری  
طرح زخمی ہو گئی تھیں۔ اتفاق کی بات۔ ہی زمانے میں ہماری پارٹی شمار  
کی غرض سے نکلی ہوئی تھی مجھے قریب ہی لگے تھے۔ رات کا وقت تھا۔  
شہر دور تھا۔ ایک میں ہی وہاں ڈاکٹر تھا۔ اللہ نے وقت پر مجھے توفیق  
دی۔ اور میں اس بے چاری خاتون کو اپنے پیچھے میں لے آیا۔ چوتیس سنت  
تھیں۔ مگر چاروں کی تیمارداری اور علاج نے خطرہ سے باہر کر دیا۔ اور میں  
نے انہیں اپنی کار میں بٹھا کر ان کے گھر پہنچا دیا۔ وہ دن اور آج کا دن —  
ہیشہ ان کا اصرار ہاں کہ میں چند دن کے لئے انکے ہاں جاؤں اور ان کا  
ہمان رہوں۔ مگر اس بے چاری کے اس شدید اصرار کے باوجود میں  
اب تک نہ جا سکا۔ نہ کھنڈروں کی میر کے لئے وقت نکال سکا۔ میاروں  
کی خدمت سے جو وقت بچتا ہے۔ وہ مطالعہ کی خدمت ہو جاتا ہے۔ اب یہ  
موقع اچھا پیدا ہو گیا۔ اپنی بچانے میں تہیں سہیلوں کا۔ انہیں خوشی ہوگی  
تہا دی خواہش پوری ہو جائے گی:

یسنگر میں ہوئی۔ واقعی موقع تو اچھا ہے۔ مگر ڈاکٹر میں اکیلی نہیں  
جاتی۔ مجھ لے لطف نہ آئے گا۔ تم بھی ساتھ ملو؟

ڈاکٹر نے اپنے قیام انداز میں صاف اٹھا کر دیا: بیٹی! میرا جی نہیں  
چاہتا۔ کون سوٹ کیس لہرے، اور سفر کی زحمت اٹھائے؟

جیوتی برآمدے کے سرے پر بھی بیٹھ کر دیکھ رہی تھی۔ یسنگر وہیں سے  
آئی: سوٹ کیس میں بھر دو جی۔ پیار سے گاری آپ ضرور چلیں؟

گاڑی بان نے ہماری طرف دیکھے بغیر دسیا توں کسے اکو  
لبے میں جواب دیا اور

• نہیں بارہ بج گئے ہیں۔ دیر ہو گئی ہے •

یہ غیر مہذب اور کاسا جواب سن کر بہت ہی غصہ آیا مضحکہ  
کے میں اور جھوٹی اس کے پاس گئیں۔ وہ ہمارے پیش قیامت نہیں باہر  
اور باوقار چہرے دیکھ کر گاڑی سے نیچے اتر آیا۔

• یہ تو • میں نے جانتے ہی چاندی کا ایک چمکدار سکہ اس کے ہاتھ  
میں دیکھ دیا۔ اور بولی • اب ہمیں جلدی سے عشرت خانے  
تک پہنچا دو •

وہ مرحوب ہو گیا اور سودب لبے میں بولا • سوار ہو جائیے غصہ  
دو گھنٹوں میں پہنچا دوں گا •

گاڑی کے پائیدان پر قدم رکھا، تو ایسا معلوم ہوا، کہ گاڑی سر  
آ رہی تھی۔ اس لئے فوراً میں نے اس کی حرکت تمام کی، جسوقت میں اس  
کے نیچے کو مضبوطی سے پکڑ کر گاڑی پر قدم رکھا۔ طرعی ہم تینوں چڑھ کر  
بیٹھ گئے۔

اب گاڑی چلی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ جیسے کسی جاں بلب بغیر  
کا سانس مل رہا ہو۔ چاند زور دہڑ گیا تھا۔ جواؤں میں خونگ سرسراہٹ  
پیدا ہو گئی تھی۔

بوڑھا ڈاکٹر کار گاڑی کے چمکوں سے ناخوش اور پڑھا ہوا معلوم  
ہوتا تھا۔ ہم دونوں گرمی سے نڈھال ہاتھوں میں غس کی زبردست لمبیاں  
لے، جن کی ڈنڈیاں خوشبو دار صندل کی بکڑی کی تھیں۔ بار بار بے کلی سے  
پیلو بدل رہی تھیں۔ آہ! اللہ وہ گرم اور ہیران چاندی کی رات۔ سانس  
آگ کے شعلوں کی طرح ناک سے نکلتا تھا۔ زبان سوکے پتے کی طرح  
خشک تھی۔ جسوقت وہ دہ کر اپنی پری کی وضع کی جھوٹی سی نفرتی صراحی  
سے پانی اندر لے کر پی رہی تھی۔ مشرقی ممالک کی یہ وہی گرم رات  
تھی۔ جس کے متعلق ہمارے ان ایشیائی ممالک میں مشہور ہے کہ ہر  
چشم پریاں بھی انہی آبی دنیا سے باہر نکل آتی ہیں۔

دوسرے ایک سفید شاندار عمارت نظر آنے لگی۔ پھر یک لخت  
بوڑھا ڈاکٹر کار گاڑی بان پر وہ میں جسوقت پر جا پڑی۔ اور اسی طرح ہمارے  
منہ کا انگریز گاڑی ایک جھلکے کے ساتھ عشرت خانے کے شاندار بھاگ  
میں گر گئی۔

میں نے کسبانے انداز میں کہا: ایسی بھڑی گاڑی میں پہنچنے  
کے سامنے جاتے ہوئے میں تو زمین میں گڑھاؤں میں گئی •

انہی سو فی غیر شاعرانہ آواز میں گادیتا۔ یہ اس کی مخصوص عادتوں میں سے  
ایک عادت تھی۔

• دلفریب چاندی تھی۔ اور خوابناک سماں۔ دفعتاً جسوقت میں کار  
کھڑی کر دی۔

میں نے چاکرلیٹ کا ایک ٹکڑا نکلتے ہوئے پوچھا: بھائیوں کیا ہوا  
وہ بولی تو کئی خرابی مدعی • اور پھر سیٹ سے اتر کر انجن کھول کر  
دیکھنے لگی۔

میں نے کہا: نامکس! اچھا بخیر، میں دیکھتی ہوں •  
یہ ٹکڑے میں نے اپنا دوستی بنواؤں گا۔ اگر گاڑی کو وہیں بیٹھک دیا اور  
خوابناک کو دیکھنے لگی۔ آدھے گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد ہم نے  
بایوس ہو کر ایک دوسرے کو بلکا۔

جسوقت میں کسبانے لبے میں پوچھا: اب کیا ہو گا مدعی •  
اسی وقت تازہ کے دیو قدر رخت پر تندیب و تمدن سے نا آشنا  
معمرائی اونسے ایک وحشانہ پیر ماری۔ بھلا جسوقت کے کان جو ستار  
کی موسیقی اور محبت کی سرگوشیوں کے عادی تھے، ان کی اس زیادتی کی  
تاب کب لاسکتے تھے۔ وہ بارے خوف کے بھتہ چٹ گئی لیکن میں  
ترغیر آباد زمینوں اور ہما زری جیسے دشوار گزار پہاڑوں کی سیاحت کی  
عادی ہوں۔ اسکی بزدلی پر اسکو محبت دلائی۔

اتنے میں بوڑھا ڈاکٹر کار کا ایک مشتہر چٹا ہوا اٹھ  
بیٹھا۔ اور پوچھنے لگا: کیا ہم پہنچ گئے •  
کچھ دیر بعد پریشانی کے عالم میں ہم تینوں کا رستے نیچے اتھوے۔ اور  
سراسیمگی سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

رات زیادہ گہری ہوتی چلی جاتی تھی۔ چاند کی زور روشنی میں تا  
کا کوئی پرند اپنے بڑے بڑے بازو پھیلائے کسی سمت اڑتا، تو ہم کسی  
راہ گیر یا گاڑی بان کے دھوکے میں اسی سمت دیکھنے لگتے۔

تھوڑی دیر بعد دوسرے بغیر چمکت کے دیہاتی وضع کی ایک  
منہ کا انگریز گاڑی آتی ہوئی نظر آئی۔

جسوقت میں اسے دیکھ کر ٹمکین لبے میں کہا: اگر ہم دیر میں پہنچے تو  
وہ سوچی ہوئی۔ اس لئے اسی گاڑی میں چلے چلو •

گاڑی منہ کے کنارے بے فکری سے جیسے چل رہی تھی کہ قریب  
چل جا رہی تھی۔

بوڑھا ڈاکٹر کار نے دوسرے آواز دی: بڑے میاں! ایوب محلہ میں  
عشرت خانہ نامی کوٹھی تک ہمیں پہنچا دو گے •



موجود کوئی نہ تھا:

ڈاکٹر گارجر این دیریشان جو کر بولا: یہ درد اذہ کو لاکس نے؟  
اندک دیر ان تاہی میں داخل ہونے کی جہت نہ ہوتی تھی ڈاکٹر  
نے ایک قدم اندر دیکھا تھا کہ جسوتی نے اسے روک دیا۔

بیزادہ ہو کر ہم نے چرباغ کی طوط جانے کا ارادہ کیا۔ ایک لحاف  
پھر اندک کسی درد اذہ کے پٹ سے کھٹنے کی آواز آئی۔ اور ساتھ ہی مڑ  
اندک بڑا کا جسوتی کا ایک بار سر ہم تک پہنچا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تاریکی میں  
ایک ہلکی سی روشنی نظر آنے لگی۔ اور بتدریج صوم جی میں تبدیلی ہو گئی،  
ہم نے نگاہ صوم جی سے ڈرا اور اٹھائی تو اٹھائیں اٹھیں سال کی ایک  
حسین و دلربا خاتون نظر آئی جس نے نہایت سادہ اور سفید لباس پہنے  
لہریں وامنوں کا لباس پہن رکھا تھا صوم جی اس کے ہاتھ میں تھی۔  
ڈاکٹر گارکر دیکھ کر ہنس کر آئی۔ اور سر جھکایا۔

”مزاج شریف مدام عمرو۔۔۔ یہ دونوں لڑکیاں میری بیٹی  
ہیں۔ انہیں کا ذکر میں نے خط میں کیا تھا۔“

عمرو نے نہایت دلکش انداز میں ہماری طوط دیکھ کر خیر مقدم  
کے طور پر سر جھکادیا۔

پھر ایک لمحہ بعد کوئی بات کہے بغیر انہوں نے اشارہ سے ہمیں  
اپنے پیچھے بلایا۔ اور روشنی دکھاتے ہوئے خود سامنے چلے گئیں۔ ایک بل  
کھاتے ہوئے ناک کے پھن پر صوم جی جل رہی تھی، ہوا سے ان کے سفید  
لبے لہجہ وامن ان کے پیچھے درد درد تک لہرا رہے تھے۔ چال ایسی تھی۔  
جیسے کوئی پری ہوا میں تیر رہی ہو۔ سیاہ بال سفید ریشمی چادر کے نیچے ہوا  
کی شرخیوں سے لہرا رہے تھے۔ چہرے پر عروہ کی مسکراہٹ تھی۔

اسی وقت جسوتی نے سرگوشی کی: مدھی یہاں کیسی خشک ہوا  
چل رہی ہے۔ باہر تو سڑکوں پر لو کی تکلیف وہ لپٹوں سے ہلکے چکر  
گرم ہو رہے تھے!

جسوتی کا نفرو ختم ہی ہوا تھا کہ ہم ایک عالیشان ہال میں پہنچے  
جہاں بالمش کی ہوتی چمکدار سیاہ لمبی میز پر افادہ و اقسام کے محصل  
برگ نڈل فرنی ٹشٹوں میں بچے ہوئے تھے۔ دل کی شکل کی تسی نئی کٹریوں  
میں مشرب رکھا ہوا تھا۔ میر کے اوپر چھت میں کنول کے پھولوں کی وضع  
کے فانوس آویزاں تھے۔ درد اذہں پر اڑھائی رنگ کے زرد سر پر  
لگے ہوئے تھے۔ دیو ادوں پر چین کی کسی قدیم جنگ کے مناظر دکھائے ہوئے تھے۔  
مادام عمرو نے سانپ کی شکل کا شمع دن میں برہ رکھ دیا۔ اور خود  
سرے والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

سارے بوڑھے ڈاکٹر گارڈ نے کہا: مگر مدھی! اس میں شرم کی کیا بات؟ وہ  
کیا کج نہ جانتی گی۔ کہ مجبوری کو اس گاڑی پر سوار ہونا پڑا ہوگا؟  
جسوتی نے کہا: نہ نہ جتنی جلدی ہو سکے۔ اس کو داکس کر دو۔  
چامنی کی سفید دھاریاں خوش طبع اور تنگ دوشوں پر پڑ چکی تھیں۔  
ہماری گاڑی صدمہ درد اذہ سے پر جا کر لگ گئی۔ ہم نے فوراً اسے داکس  
کر دیا۔

جسوتی نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا: یہاں کی دنیا تو خواب میں معلوف  
نظر آتی ہے۔ چرکسار کا بھی پتہ نہیں؟

جسوتی نے کہا: کون جانے مادام عمرو یہاں ہیں بھی یا نہیں؟  
ڈاکٹر گارڈ نے کہا: ہو سکتی کیوں نہیں؟ انہوں نے میرے خط کا جواب دیا  
تھا۔ اور تمکا تھا کہ میں دلی اشتیاق سے آپ سب کی آمد کی منتظر ہو رہی تھی۔  
ہم نے درد اذہ کھٹکھٹایا۔ پہلے استیاضے آہستہ آہستہ پھر کچھ دیر  
بعد درد اذہ سے۔ مکان کا طراوت کیا۔ لوگوں کو کھانا، چکی دار کو آوازیں  
دی۔ عرض جتنی کوششیں ہو سکتی تھیں۔ کر لیں۔ مگر درد اذہ کی میں سفید  
میں عروہوں والا عالی شان محل ساکت کھڑا رہا۔ وسیع برآمدوں میں  
لبے ستونوں کا عکس چاندنی میں ترچھا پڑ رہا تھا۔ چنبیلی کی بیل میں جھینگہ  
اپنا فقرہ تنہائی الپ رہا تھا۔

جب مایوس ہو کر ہم زینے سے اترنے لگے۔ تو اچانک اندک سی کرک  
سے ایک ایسی آواز آئی، جیسے کسی نے دیا سلائی جلائی ہو۔

ڈاکٹر گارڈ نے چونک کر کہا: تجھ میرا خیال ہے کہ کوئی جاگٹا تھا؟  
ہم تھوڑے پھر زینے سے اتر کر کے درد اذہ کے پاس اس امید میں جا کر  
ہوئے کہ اب کھٹکھٹا ہے۔ اور اب کھٹکھٹا ہے۔ اندر سے کسی کسی کوئی حنف  
سی آواز آجاتی تھی، پانچ منٹ اسی حالت میں گزر گئے۔ ہم بند درد اذہ  
پر نظر پڑ گئے کھلے رہے۔

آخر ڈاکٹر نے جہان ہو کر کہا: یہ کیا بات ہے؟

میں نے شیشوں میں سے اندھ جائے کی کوشش کی۔ وہاں دیکھ  
کے سوا کچھ نہ تھا۔

فائر بیزادہ ہو کر چلا آیا: اوسے یعنی یہاں کوئی ہے یا نہیں؟

اس کے چلانے کا اثر یہ ہوا کہ اندھ پھر کچھ گڑبڑ ہونے لگی۔ دو لمے  
جدید ایک درد اذہ اس درد سے کھلا۔ کہ ہماری آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس کا  
کھٹکھٹا کر تیز ہوا کا ایک سرو جھونکا چانگ ہمارے گرم چہروں سے یوں  
ہلکا ہوا۔ جیسے کسی نے قہر ماما ہو۔ میری تو آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور ساتھ  
یہ ہم تینوں کھڑے کھڑے کانپ سے کھٹے۔ لیکن درد اذہ کے سامنے

آجائے تو انہوں۔ ذری وہ سنواری کی ڈوبہ بچا دینا۔ فکر یہ؟  
 تو کچھ گئے۔ اور کسی نے خستہ بنی۔ تو میں نے کہا: یہ چلے ڈاکٹر  
 ذرا باہر نکل کر دیکھیں۔ چائے یا کافی خادموں کیوں نہیں آتی؟  
 ڈاکٹر گارنہ جلدی جلدی کپڑے پہن لئے۔ ہم تینوں وسیع  
 برآمدے سے گزر کر بڑے ہال میں آئے۔ تمام دروازے بند تھے۔ ہر  
 حلقہ سناٹا اور ویرانی تھی۔ بیش قیمت فرنیچر پر گرد جمی تھی۔ ایسا محسوس  
 ہوتا تھا۔ کوئی کئی روز سے بند پڑی ہے۔ ہم نے ڈسٹے ڈسٹے  
 کھنکھار کر آہٹ کر کے ایک ایک کمرے کو کھولا۔ لیکن ہر کمرہ خالی تھا  
 ہر کمرے کی یہ حالت تھی۔ جیسے برتا ہی نہیں جاتا۔

ساری کوئی دیکھ ڈالی۔ اس میں کہیں کوئی تنفس نہ تھا  
 ہمارے دلوں پر ہشت ایک بوجھ کی طرح بیٹھنے لگی۔ پریشان ہو کر  
 باغ میں نکل آئے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ یہ ما تو رات کیا ہو گیا؟  
 تو کہہ کر ہمیں؟ دادام خستہ کہاں غائب ہو گئیں۔

دس بج گئے۔ ہم پریشانی کے عالم میں اس ویران گھر کے نیچے  
 پر کمرے سوچ رہے تھے۔ گو کیا کریں؟ اسٹے میں دیکھا۔ کمرہ صاف  
 طازم باغ سے ہو کر اندر آیا۔ اور چپ چاپ ایک کمرے میں داخل ہو گیا  
 پھر اس نے فرنیچر نکال نکال کر باہر رکھنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ  
 زور زور سے روتا بھی جا رہا تھا۔

ہم ڈگ تیزی سے اسکی طرف گئے۔ وہاں ہمیں دیکھ کر ٹھٹھک سا گیا۔  
 پھر حیران ہو کر ہمارا منہ تھکنے لگا۔

ڈاکٹر نے پوچھا: "دادام عمرہ کہاں ہیں؟"  
 بوڑھا متعجب ہو کر دیوانوں کی طرح ڈاکٹر کا منہ تھکنے لگا۔  
 ڈاکٹر گارنہ بھر کہا: "ممن کے بہان ہیں۔ دادام جھوٹیاں گئیں؟"  
 بوڑھے نے حیران ہو کر کہا: "دادام عمرہ؟"  
 "آہ حضور! بگم صاحب کو تو ساہنے نے دس لیا تھا۔ آج  
 انتقال کو آج دوڑے دس دن ہو گئے۔ آج گھر کا سامان نیلام  
 ہونے والا ہے۔"

یہ سنتے ہی میں نے جسم میں ایک پھر بری سی محسوس  
 کی۔ رات کا وہ پُر اسرار سرد ہوا کا جھوٹا پھر ایک دفعہ  
 مجھے اپنے قریب محسوس ہونے لگا۔ اور میں بید مجنون کی طرح  
 کانپنے لگی۔

اس کے بعد مجھے مطلق یاد نہیں کہ کیا ہوا تھا۔

بغیر حجب و حیا

ڈاکٹر گارنہ نے کہا۔ لیکن میری بیاری دادام۔ رات  
 کے دو بجے ایسے لذت کھاؤں سے کوئی کس طرح لطف اندوز ہو سکتا  
 ہے؟ اسوقت تو ایک نرم اور آرام دہ بستر عنایت ہو جائے۔ تو بڑی  
 بہر بانی ہو۔

یہ سنتے ہی دادام تڑکے کی قسم کا کوئی نغمہ منہ سے نکلے بغیر اٹھ  
 کھڑی ہوئیں۔ کھانے کے لئے مطلق اصرار نہ کیا۔ اپنا وہی ناگ کی وضع  
 کا شمعہ ان اٹھالیا۔ اور مسکرا کر گردن کے اشارے سے ہمیں اپنے پیچھے  
 پیچھے آئے کو کہا۔

ایک پرمکھت خواب گاہ میں لے گئیں۔ جہاں دھندلے دشنیوں  
 کے نیچے نفیس اور رنگین ڈشمنی بستر کچے ہوئے تھے۔ جہاں پتھر سر کے  
 اشارے سے مشاب بچہ کیا۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اس  
 طرح چپ چاپ باہر چلی گئیں۔

میں ایک کمرہ در دل کی دبی عورت ہوں۔ اپنی مہربان کی ان  
 حرکات نے میرا خون خشک کر دیا تھا۔ چنانچہ ان کے کمرے سے  
 باہر جاتے ہی میں نے ڈاکٹر گارنہ کا ہاتھ تھام لیا۔ اور بولی۔

"یہ بات کیوں نہیں کرتیں؟"  
 گارنہ بولا: "میں خود دسمہران ہوں۔ نہ جانے کیا معاملہ ہے؟"  
 میں نے پیرا بچے میں کہا: "یہاں سے بھاگ چلو ڈاکٹر۔"  
 جسوتی بولی: "انہی شکل کسی میں ہے۔ پر کہیں گونگی تو نہیں؟"  
 ڈاکٹر گارنہ نے کہا: "نہیں جی! نہیں: وہ بے حد باقوتی ہیں۔"  
 میں سوچتے ہوئے بولی: "اس من کے باوجود انہیں دیکھ کر مجھے  
 دہشت سی محسوس ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر گارنہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جسوتی اور میں اس راڈ کو کھیلانے  
 کی کوشش کرتی ہوئی تین بجے کے قریب اپنی اپنی چار پائوں پر پٹ پٹ  
 صبح کی نماز کے وقت عادتاً میری آنکھ کھل گئی۔ پروگرام طبیعت  
 آٹے بجے میں سرد کے کھنڈروں کی طرف روانہ ہو جانا تھا۔ اس لئے میں  
 نے جبروتی کو بھی جگا دیا۔ ہم دوہوں نے نماز پڑھی۔ صبح گرم اور خوشگوار  
 تھی۔ نماز کے بعد سامنے چنبیلی کی بیلوں میں میٹھے کر بہت دیر چائے کا  
 انتظار کیا۔

مگر جب یاد سی ہوتی تو میں ڈاکٹر گارنہ کے کمرے میں  
 گئی۔ اور بولی:

"ڈاکٹر ابھی تک سو رہے ہو؟"  
 وہ بولے: "چائے کے انتظار میں پڑا ہوں۔ دوسری چائے"

لنگا و حزناتھ فرحت  
(کاپوری)

## تیسرے بغیر!

خوابِ رستی ہے بہارِ بوستانِ تیسرے بغیر  
بے مزہ ہے محفلِ کون و مکانِ تیسرے بغیر  
مضطرب ہے مضطرب عمرِ رواں تیسرے بغیر  
چینِ دل میں نیند آنکھوں میں کہانِ تیسرے بغیر  
پھر سسک کر رہ گئی عمرِ رواں تیسرے بغیر  
ہر نفس کی آمد و شد، کندہ و کاوش کی دلیل  
تو نہیں تو دل کی بستی میں اجالا ہی نہیں  
ہجر کا بن میں تری صحرا بھی ہے اک گل کرہ  
چاندنی راتوں کی یہ سرستیاں بلکیں ہیں  
آتشِ سیالِ رقصاں ہنرے دلیں کد آج  
ماہِ داغِ بسمِ دہپے ترکیبِ آہ و گریہ ہیں  
سیکڑوں سجدے تڑپتے ہیں جبینِ شوق میں  
نغمہ ہستی، فردِ بخِ زندگی، بزمِ حیات  
خود فراموشی گئی، زندگی و بدستی گئی،  
ظلمتیں بڑھنے لگیں، گھٹنے لگا نورِ حیات

آ کہ باغِ زندگی میں ہے خزاں تیسرے بغیر  
سونی سونی ہے فضا، دہسناں تیسرے بغیر  
غیر ممکن ہے سکونِ جاوداں تیسرے بغیر  
خوابِ شیریں بھی ہٹا خوابِ گمراہ تیسرے بغیر  
پھر تڑپاٹھی حیاتِ جاوداں تیسرے بغیر  
موجِ بونے گل ہے زنجیرِ گمراہ تیسرے بغیر  
تیرہ و تار یک ہے کون و مکانِ تیسرے بغیر  
کاٹنے کو دوڑتا ہے بوستانِ تیسرے بغیر  
بے مزہ ہے مہتابِ فوٹوشاں تیسرے بغیر  
ہر رنگ و پے میں ہے اک برقِ تپانِ تیسرے بغیر  
سلبِ رشک یا سیں ہے کہکشاں تیسرے بغیر  
ننگِ سجدہ ہے زمین و آسمان تیسرے بغیر  
بے حقیقت سی ہے ساری داستانِ تیسرے بغیر  
بڑھ گیا اندیشہٴ سود و زیاں تیسرے بغیر  
ہو چلا بُت پر خدائی کا گماں تیسرے بغیر

فرحتِ مہجور اپنے کلبہِ احزاں میں ہے  
کس کو ہے توفیقِ سیرِ بوستانِ تیسرے بغیر

نوشتہ: ہیرلز برگ ہاؤس

مترجمہ: سید فیضی جالندھر

# سوگوار محبت

## ایک ایکٹ کا ڈراما

### آفراتیشیل

لوسندہ ہینرز: ایک پچاس سالہ کنوادی بڑھیا  
 ہیلین ہاسٹرز: لوسندہ کی شاگردہ  
 سوکسن کرائٹر: لوسندہ کی جوان خادمہ  
 کرنل روفرن: لوسندہ ہینرز کا دیرینہ محب

زمانہ: ۱۸۸۹ء

### منظر اول

کرنل روفرن میں سے لوسندہ ہینرز کا ڈرائنگ روم جس کا سادہ ساٹان، کرسیاں، پردے، صحنے اور دیواروں پر لگی ہوئی تصاویر، اپنی مالک کی کہن سالی کی طرہ پر رایم کی تباہی کا آئینہ دار ہے۔ موسم گرما کی ایک سہانی اور چمکیلی صبح درود وجود پر رنگت لوز برسا رہی ہے۔ کرنل کے باگ سرسبز بھارتیوں اور جوڑہ ہینرز کی کیف آگین سے دل و دماغ پر ایک کیفیت سی طاری ہوئی جاتی ہے۔ طاقات پروردہ سیم کے جکے جکے تجلیں اتر رہی ہیں۔ ایک ناول کو تھپک رہے ہیں۔ لوسندہ گاہ کا دروازہ کھلتا ہے۔ اندر کی جانب کھلتا ہے۔ سوکسن کرائٹر ایک بائیس سالہ شوخ و بھیل دیہاتی لڑکی اپنی ایک ہم عمر خاتون ہیلین ہاسٹرز کو جو موسم کے مطابق کیز دل میں لبوس ہے۔ کمرے میں داخل ہونے کا اشارہ کرتی ہے۔

سوکسن: ہر مس ہاسٹرز! بی صاحبہ لوسندہ ہینرز، فرمائی ہیں کہ آپ شریعت لکھنے میں ابھی حاضر ہوئی۔

ہیلین: ۱۔ دیکھتے کھڑے، سوکسن ہائیری جانب سے انہیں کہہ کر اگر میری وجہ سے انہیں طاقانی ٹوپی پہننے کی زحمت ہوتی ہے تو مجھے سخت رنج ہے۔

سوکسن: ۲۔ دھندہ بورتے ہوئے، نہیں لہانی: حقائق ٹوپی پہنکر ہر جہان سے لٹا اچکا سمول ہے۔ اس میں انہیں ذرہ بھر زحمت نہیں لگتی بلکہ خوشی ہوتی ہے۔

ہیلین: ۳۔ مگر میں تو جہان نہیں ہوں۔ اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو اس

صبح سویرے خلافت تو قلع طاقات کا کچھ خیال کیا جوتا اہ۔

سوکسن: ۴۔ دلچسپ کلامی کرتے ہوئے، وہ اپنی ٹوپی بدل رہی ہیں۔ اور

اب تک تو تبدیلی میں کر چکی ہونگی بس آیا ہی چاہتی ہیں

ہیلین: ۵۔ دوزخا محجب ہو کر، انوس کر شرف زیارت کا یہی موقع

میرا آیا کیونکہ آج ہی لندن کو واپس لوٹ رہی ہوں۔

سوکسن: ۶۔ اس: تو کیا ریل گاڑی سے جانے کا خیال ہے؟

ہیلین: ۷۔ دسکراتے ہوئے، ہاں: ارادہ تو یہی ہے۔

سوکسن: ۸۔ آپ کی ہمت قابل رشک ہے۔

ہیلین: ۹۔ دگنگو کا رخ بدلتے ہوئے، سوکسن: بی صاحبہ ابھی تو یہی!

سوسن :- اہل بختیت ہیں، لیکن نامراد سوسن نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔

سوسن :- دو چنگ کر، سوسن کون سوسن؟  
سوسن :- درجی بی !! بچے تو اس کیفیت نے دیئے ہیں، مگر مصیبت جاری بی صاحبہ پر ٹوٹ پڑی ہے

سوسن :- بیست خوب !!  
سوسن :- ہم ابھی تک اسے سوسن ہی سمجھتے ہیں، یہی اس ناچنار کا نام ہے۔ سچ ہے زمانہ کہیں ایک حال پر نہیں رہتا۔ اس بیکار کا قیل ہے۔ سوسن نے اٹکا ساتھ نہیں دیا۔

سوسن :- دشواری ہے، اور تم نے سوسن؟  
سوسن :- بی بی سیرا کیا ہے، میں شہری ابھی خادہ دلجات ہوئے اور فرما تو تفت کے بعد اس ماسٹر !!  
سوسن :- راستہ کے انداز میں، کیا ہے سوسن، تبار سے کالوں پر کیا کی زدی کیوں چلائی۔

سوسن :- کہ نہیں، ذرا سوچو، اس ماسٹر کا تباری تو بی صاحبہ سے بڑی بے تکلفی ہے نا۔ اکی ایک بات میری آنکھوں میں بہت کھٹکتی ہے، اگر میری خاطر اس کا تدارک فرماؤ تو مجھے یقین ہے کہ۔

سوسن :- ہاں ہاں !! کہو رک یہوں نہیں؟  
سوسن :- بات یہ ہے کہ دس سال قبل میں قلم خاد سے یہاں آئی، تو اس صاحبہ نے مجھے اپنی خدمت میں لیتے ہوئے کہا تھا۔ اب عشق و محبت کی داستان کو ہمیشہ کے لئے فراموش کر دو، میں سب جواب میں کہا تھا آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن یہ سن شور سے بچنے کا واقعہ ہے۔ جب میں محبت کی لہریں سے باطل ہوا، آنا شامتی، اب جبکہ میں سرحدِ شباب میں قدم رکھ چکی ہوں، مجھے خوف ہے کہ اپنے جہد پر قائم نہ رہ سکوں گی تاہم۔

سوسن :- تو کیا یہ نیاز مندوں کی خدمت سوسن کرتی ہو؟  
سوسن :- نہیں بی بی، ایک وقت میں ایک ہی نیاز مند سے بھجوانے زنجیر ہے۔

سوسن :- کیا کسی کی غلطی سوسن کو گدہ ہی ہے؟  
سوسن :- میں براؤن سیرا منظر پر نظر ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ وہ کچھ کے کچھ منظر پر ہے

سوسن :- یہ بات ہے؟

سوسن :- میں اس سے وعدہ بھی کر چکی ہوں، میرے اقرار پر وہ کچھ مسرور ہوا تھا، کہ نہ پوچھئے، اب غوری انکار سے اسکی۔ مانی بھلیکٹ کا خیال کرتے ہوئے کاتب اشقی ہوں، مجھے اس کا اداس چہرہ نہ دیکھا جائے گا۔ حیران ہوں کہ کروں تو کیا کروں، مجھ سے غریب میں گرفتار ہوں بی بی سے اس کے متعلق استفسار کرتی ہوں، تو وہ کہے ناخوش ہو جانے کا خطرہ ہے، ایلین کی پوجہ تو بی بی بھی اپنے دل پر ہی چوٹ کھائے ہوئے ہیں، یہ ممکن ہے کہ ان معاملات میں قنوت یکم کا ثبوت دیں۔

سوسن :- رشتے جوئے، سوسن !!  
سوسن :- زنا خاندانہ از سے، کراؤ تو کا بچہ بچہ جانا ہے، کسی نیاؤ؟  
سوسن :- دوخل اندازی کرتے ہوئے، خبردار سوسن !!  
سوسن :- بی بی اس میں جھوٹ ہی کیا ہے، مزید برآں وہ ہندوستان سے واپس بھی آچکے ہیں، اور اپنی آنکھوں سے میں نے انہیں دیکھا ہے۔

سوسن :- مسٹر ڈفرن واپس آئے ہیں؟  
سوسن :- دیکھئے آپ نے ہی انکا نام لیا ہے۔ مجھے سب سے پہلے کہاں واپس آچکے ہیں

سوسن :- کب؟  
سوسن :- میں تو اتنا جانتی ہوں، بی بی کے ہمراہ کل ترکاڑیاں خریدنے جا رہی تھی، کچھ شیشے کے برتن بھی لانے گئے تھے، کہ مسٹر ولسن کی دکان میں ہم نے ایک شخص کو دیکھا، جو سگرٹ سٹالٹ کے لئے وہ اسٹالٹ کی دیر خرید رہا تھا۔

سوسن :- کیا کہا، کراؤ تو میں اور سگرٹ نوشی !!

سوسن :- جی ہاں، اور اس نے بی بی کو سلام کرتے کیلئے ٹوپی سر سے اتاری، اس صاحبہ تمہیر رہ گئیں، جھٹ سیرا بازو و تمام کر کچھ سہارا لیا، حیرت کے عالم میں بولیں: اٹھا... مسٹر...  
... تو فری !! اور وہ انداز سے جزیں خریدنے میں بھی ہنسک رہی، جیسے کہ ہوا ہی نہیں میں کچی گولیاں نہیں کھیل ہوں، غلطی پہنچاتی ہوں، ناؤ لگتی کہ وال میں کچھ لاکا لاکا ہے تاہم بی بی کی بہت پر آفری ہے، جب وہ اس خاد زانہ سے دامن نہ بچا سکیں، تو کچھ بچے، جس براؤن کے قہر محبت کے وہ داندے کیوں بند ہوں۔



پاکوڑیٹ لٹ گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ نہیں سے میرا نشان اقلی، بکار نہ تھا۔ بلکہ میرا عارضی انکار و اقرار کا پہلوئے ہونے تھا۔ میں آج تک اپنی اس غلطی پر متاسف ہوں۔ خدا معلوم اس وقت میرے ہونٹوں سے نہیں کا لفظ کیوں نکل گیا۔ حالانکہ میرے جسم کی رگ رگ سے ”ہاں“ کی صدا پیدا ہوتی تھی۔ میں اس کی نسبت کا دم بھرتی تھی۔ لیکن اس نے میری نہیں پر اہمیت بنا کر لیا۔ اور مجھے تمام عمر آلام و مصیبت کے طوفان میں غوطے لگانے کیلئے تہا چھوڑ گیا۔ بیلین! تم کس قدر خوش نصیب ہو جاؤ بیلین! خدا کا شکر بجاؤ کہ تمہاری غلط نصیبیاں تمہاری کئی سوام جانگزاں سے محفوظ و مصون ہیں۔ بیلین!۔۔۔ میں تمہاری طرح شرمیلی تو نہیں ہوں۔ میرے منہ سے بھی دو بار نہیں نکل گیا تھا۔ لیکن تفسیری دفعہ جب میری نے سوال کیا، تو مجھ سے انکار نہ ہو سکا۔ اور مجھے اپنی شکست تسلیم کرنی پڑی۔

بوسندہ! مسٹر ڈفرن نے مجھ سے ایک ہی دفعہ استفسار کیا مگر حسب خاطر جواب نہ پا کر مجھ سے منہ موڑ لیا۔

بیلین!۔۔۔ سنہ ۱۹۲۸ء

بوسندہ!۔۔۔ ہاں یہی ان کا نام تھا۔ میں اس تذکرہ کا اعادہ نہیں چاہتی۔ بیلین! لاہور کے لئے میری اس دیرینہ غلطی کو قبول جاؤ وہ جو ان کی ذمہ داری تھی۔ اس منزل میں بہت سے ہر شکستہ پانی سے عاجز آ جانے ہیں اس لئے گزشتہ واقعات کو مجھ سے دبا جا ہی قرین مصلحت ہے۔

بیلین!۔۔۔ مسٹر ڈفرن . . . لیکن میں بیتر— مستقبل تو امید افزا ہو سکتا ہے۔

بوسندہ! نہیں! آیام رفتہ کی بادی قدم قدم پر کیا کچھ کم جان بیوٹا ہو رہی ہے، جو میں اپنے مستقبل کو کبھی تاریک کر لوں۔ میرے لئے تو جو کچھ بھی ہے یہی ہے۔ اپنی حسین سیالوں تلے زندگی بسر ہو رہی ہے۔ اور نامعلوم کب تک . . .

بیلین!۔۔۔ حسین ساٹھے

بوسندہ!۔۔۔ ہاں نہیں کیا خدا، تم رخصت ہو چکے ہو، وہ دیکھو تمہارا خاوند اور تمہارے ننھے ننھے بچے، انتظار کر رہے ہیں اور تمہیں معلوم اخلاصوں سے اپنے پاس بلا رہے ہیں۔

بیلین!۔۔۔ ان باتوں سے آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔

بوسندہ!۔۔۔ شرمندہ کی کیسی اور کس لئے؟ تمہیں تو زندگی اور اس کی صواب

پر ناز کرنا چاہئے

بیلین!۔۔۔ واقعی مجھے ناز ہے اور ہو گا اتنی شادمانی کے باوجود میری حرص روز افزوں ہوتی رہے۔ لیکن تمہیں دیکھتی ہوں کہ قبیل سرایہ رکھتے ہوئے بھی فطرت پسند ہو۔

بوسندہ!۔۔۔ درست ہے زندہ گی جواؤں کا حصہ ہے مسرتوں و خوشیوں سے جذبات کے متلاطم ہونے کا نام ہی زندہ گی ہے اور میرے لئے تو اس عمر میں جو تھوڑا بہت سرایہ عیش و نشاط باقی رہ گیا ہے۔ وہ ان واقعات ماضی کے حسین سیالوں کی بہترین یادگار ہے۔ مجھے بھی تمہاری کبھی یادگراں معلوم ہوتی تھی۔ میں نے بھی راتوں کو آنسوؤں سے تکیے بھگوئے ہیں تاروں سے ہزارانی کی ہے اور فراق کے دنوں کی شام اور انتظار کی رات کی حسرت نہیں دیکھی۔

بیلین!۔۔۔ غراب

بوسندہ!۔۔۔ اب عالم تخیل ہی میرے لئے سرایہ حیات ہے۔ یہی میری معنوی اولاد ہے۔ دوسرے لوگوں کے بچوں کی طرح میرے یہ بچے بیلین! پرہیزگاری نہیں چڑھتے۔ جسے ہو کر بے ڈون اور جھوٹا نہیں ہوتے بلکہ جھپٹ پھین کی شراب کیفیت اور سے سرشار ہوتے ہیں۔ اور خوبصورتی و خوش اخلاقی کے زیوروں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ میری تمہاری جی انکی معصوم اواں کیوجہ سے جوت ہوتی ہے۔ لہذا تم جان سکتی ہو کہ میں ایک لمحہ کے لئے جی تمہا نہیں رہتی۔ وہ میرے نزدیک آگ کے پاس آکر بیٹھتا ہے۔ تاکہ اس سے نکلے ہوئے شراروں کو دیکھ سکیں۔ وہ دیکھو میری اور جن آئیں میں کھیل رہے ہیں۔ کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں بچوں کی سی خند ہے اور نہ ہی گھبریں طوفان بے تیزی برپا کرتے ہیں۔ رات کو یہ میرے ننھے ننھے سے لپٹ کر ہوتے ہیں۔ اسی طرح مبطلر حقیقی بچے اپنی ماؤں سے اظہار محبت کرتے ہیں۔

بیلین!۔۔۔ بہت خوب اس سہ اچھی بات اور ہو بھی کیا سکتی ہے۔

بوسندہ!۔۔۔ خیر بیلین! ان باتوں کو چھوڑ دو، پرانی کہانیوں کی یاد ہیست تلخ ہوا کرتی ہے۔ میں نے خود فراموشی کے عالم میں تم سے وہ باتیں کہی ہیں، جنکا افتخار میں مصلحت نہ تھا کیونکہ رازداری محبت کا جزو ضروری ہے۔ اپنی تلخی کا ذکر چھوڑ دو، ہر اہم عوسی کب تک عمل میں آئیں گی؟ تو زمین سن کی خاطر تاکت تاک

پھولوں کی ٹیکڑیاں اور ہوش کن خوشبوئیں تھیں میرے  
باغ سے میرا سکتی ہیں کیوں ٹیکہ ہے نا؟  
(سوسن آتی ہے)

سوسن :- ردم توجہ کے اعزاز میں، بی صاحبہ!  
لوسندہ :- کیا ہے سوسن؟ تمہاری سانس کیوں پھول رہی ہے؟  
سوسن :- باہر وہ دازے پر کوئی صاحب جن کے بشرے سے شعلیں  
ٹیک رہا ہے۔ کھڑے ہوئے آپ کا پتہ پوچھ رہے ہیں۔  
لوسندہ :- کون ہیں؟

سوسن :- ریا کرتے ہوئے، بی صاحبہ اگر معاف فرمائیں تو کہوں۔  
میں نے انہیں سوسن کی دکان میں دیکھا تھا۔ اقتدار لباس  
کل سے زیادہ نکلتا ہے۔ میں نے تو ان سے کہہ دیا تھا کہ بی  
صاحبہ شہول ہیں۔ لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ اور ملاقات  
پر صبر ہے

لوسندہ :- کچھ عجوب سی ہو جاتی ہے اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش  
کرتی ہے۔ اچھا سوسن!! انہیں اندر بلاؤ۔

سوسن :- استغجاب امیر بھروسہ کیا ہیں؟  
لوسندہ :- اچھے پرواؤں سے! اہ!

سوسن :- میرے خدا عجیب معاملہ ہے۔ سوسن جی جاتی ہے،  
لوسندہ :- ہیلن!! میرے پاس کھڑی ہو جاؤ۔ آزمائش کا وقت ہے  
میری بھی جیسے تنہا نہ بیٹھ دینا۔

ہیلن :- ایسا کہیں نہ ہوگا میں سایہ کی طرح ساتھ رہونگی  
لوسندہ :- میری بہت ہواب دے رہی ہے۔ میری خدا کا لکھ لکھ کر  
ہے۔ ہیلن کہ تم میں جو اتفاق کی بات ہے کہ میں نے تمہاری  
فاطمہ قاتی ڈپٹی سیکرٹری بنی تھی

ہیلن :- آپ تو جاذب نظر معلوم ہو رہی ہیں۔ ماشاء اللہ چہرے کا  
رنگ میں نکرا ہوا ہے۔ جبران سنٹ کر سرخ ہو گئی ہیں۔

لوسندہ :- عجیب مصیبت کا سامنا ہے۔ دیکھ میری ڈپٹی تو ٹھیک تھا نا؟  
ہیلن :- اہ! ہاں بالکل درست ہے۔

لوسندہ :- ہیلن!! اچھی تو وضع کیونکر کھانے و صبح کے وقت مرد جا  
پتے ہیں یا شراب؟ واللہ بچے تو کچھ علم نہیں میں تو اس معاملہ  
میں بالکل کوری ہوں۔

ہیلن :- انہیں تو آپ کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہ ہوگی۔ البتہ  
شراب نظر ضرور نہیں گئے۔

د سوسن اہ چارلس روڈ فرم آتے ہیں۔ سوسن بیکر  
کے واپس چلی جاتی ہے۔ روڈ فرم وہ دکان کے لاندے  
سارے سال بڑھا سہا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جسے لباس پہن  
رکھا ہے۔ اندازے شرم نمایاں ہے۔ گنگو سے سہا ہاندا  
ترشح ہے۔ لیکن جلد ہی اپنی غلطی کو محسوس کرتا ہے۔ کہ  
نوجو دتے کو حکم دینے کی بجائے ایک محبت سے مخاطب

لوسندہ :- سلام کو جھٹکتے ہوئے، آٹھ مشر روڈ فرم ہیں!!  
روڈ فرم :- مشر نہیں مادم! کرنل ایسٹ انڈیا کمپنی کا ریٹائرڈ کرنل  
لوسندہ :- اقتدار کرانے ہوئے، آپ کرنل روڈ فرم ہیں۔ اور یہ کیا  
عزیز شاگرد مس ماسٹرڈ!

روڈ فرم :- آپ کی خادمہ کہاں ہیں مادم؟  
لوسندہ :- تشریف رکھتے۔ روڈ فرم مشکوک نظروں سے دیکھا ہی  
وہ کرسی اپنی جسارت کے لحاظ سے منہ بڑا دکھائی پڑتی ہے  
اا! اا! اا! بے خطر بن جائے۔

روڈ فرم :- دیکھتے ہوئے، شکریہ!  
دکری کی نشست بہت نیچی ہے۔ لیکن اونچے اونچے پاؤں

نشست کو سنبھالنے سے قضا ہوئے ہیں!  
لوسندہ :- کچھ چہنے کے لئے حاضر کرنل کرنل!! تھوڑی سی خوش ذہن  
شراب یا...

روڈ فرم :- نہیں بس شکریہ۔ شراب کا تو میں خوگر نہیں ہوں۔  
دیکھتے کتے رک جاتا ہے وہ ہیلن کی طرف چھٹی ہوئی نظریں  
سے دیکھتا ہے۔ گویا اسکی ماضی بے شکلی ہے ایک خدا ہے  
لوسندہ :- محبوب ہو کر کرنل! نوجو زندگی کے بعد گرو انفرڈ تو ہیں  
ایک دیر انداز نظر آتا ہوگا۔

روڈ فرم :- میں تو انچی واپسی پر بہت خوش ہوں۔  
لوسندہ :- یقیناً۔ کیا ایسا ہی لوگ بہت تندہ ہوتے ہیں؟

روڈ فرم :- ہیلن کی طوٹ دیکھتے ہوئے، مس صاحبہ میں یہاں کوئی  
افسانہ کہنے نہیں آیا۔

لوسندہ :- مگر آپ کی زندگی تو مصوحتوں اور خطروں سے بھرپور رہی تھی  
یقین ہے۔

روڈ فرم :- پیگم صاحبہ صاف کہیے گا۔ بچی کھانا اے عموؤں کے کاؤن  
پر ذرا گراں گزرتی ہیں۔ میری زندگی تھکے اٹھا اے مختلرب  
پنجر نہیں ہیں۔ جتنی آپ کی رہی داستان حیات میرے لئے



### دب پچھ ہوگی۔

لو سنڈہ: آہ سرد پھر کر میری داستان حیات! لیکن میں —  
 روڈ فرن: دانتے ہوئے، ہاں اسی خاطر تو میں یہاں آیا ہوں۔ میں اسٹریڈ  
 تو آپ کی شاگردی میں رہ کر کس افسانے سے باخبر ہو گئی ہو گی  
 شاید یہ اعادہ انہیں اچھا معلوم ہو۔  
 لو سنڈہ: مجھے یقین ہے کہ ہیلن اسکا خیال نہ کریگی اور مجھے کہنا ہی چاہیے  
 ہیلن: دانتے ہوئے، اگر لی روڈ فرن تم ایسے دو پرستہ دوستوں کو  
 اپنے خلوت زیادہ مناسب ہے۔

لو سنڈہ: دانتے ہوئے اور خوفزدہ ہو کر، مگر ہیلن: ... کرنل تم  
 خواہ مخواہ دخل اندازی کر رہے ہو۔ بے چاری ہیلن مجھے اپنی  
 مٹی کے متعلق گھٹکا کر رہی تھی۔

روڈ فرن: دجھکے ہوئے، میں اسٹریڈ: مبارک ہو۔

ہیلن: شکر یہ کرنل صاحب:

لو سنڈہ: ہاں تو پھر کیا ہوا ہیلن؟

ہیلن: عرض تو کر چکی میں صاحبہ تہا دی قسم اب کوئی بات نہیں  
 روڈ فرن: چلو ہائی۔

ہیلن: جانے سے قبل سوچیں سے ایک بات کروں۔ اجازت ہے؟

لو سنڈہ: اتنی جلدی کیا ہے چلی جانا۔

ہیلن: نہیں اب اجازت ہی دیجیے۔

لو سنڈہ: لیکن ...

ہیلن: میں الوداع کہنے کیلئے پھر کسی وقت حاضر ہ جاؤں گی۔ اچھا  
 کرنل روڈ فرن آداب!

روڈ فرن: وہ دروازہ کھول کر بجھتے ہوئے، آداب میں اسٹریڈ:

دب وہ اس کے پاس سے گزرتی ہے، خدا کرے تو نیک کی  
 ثابت ہو۔

ہیلن چلی جاتی ہے وہ دروازہ بند کر کے مڑتا ہے،

اچھا لوسی!

لو سنڈہ: خوفزدہ ہو کر، کیے کرنل روڈ فرن:

روڈ فرن: لوسی تمہیں یاد ہوگا، کہ میرا اصلی نام چارلس ہے۔

لو سنڈہ: ہاں اچھی طرح یاد ہے۔

روڈ فرن: اور وہ آخری وقت بھی جب تم نے مجھے اس نام سے مخاطب

کیا تھا۔ جب میرے دل میں سرت کی ایک لہر نے چلی لی

تھی۔ اسی کسے میں۔ کیوں نہیں کہتا ہے نا؟ میں اپنی تمدنی کے

وہ غم انگیز واقعات کیونکر بھول سکتا ہوں اسی بارگاہ میں جب  
 سر بر سجدہ حاضر ہوا تھا۔ جب اپنے استغناء پر نہیں کا زہر آلود  
 نقطہ سنکر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ کچھ نہ پوچھے، کہ  
 اس وقت مجھ پر کیا کیفیت طاری تھی۔ میں تو سمجھا تھا کہ  
 تمہارا جواب غمزدہ سوال نہ ہوگا اپنی زندگی میں میں نے  
 بہت سی صعوبتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ لیکن اسدن کی جوت کا  
 اثر آج تک میرے دل پر ماتی ہی نہیں، بلکہ ترقی پذیر ہے گستا  
 خر صہ ہوا ۱۹۵۱ سال ...

لو سنڈہ: ۱-۲۵ سال تین مہینے اور دس دن شاید ماہ مارچ ۱۹۳۹ء  
 کا دن تھا۔

روڈ فرن: اچھا تو تمہیں تاریخ بھی یاد ہے۔ یہ بھی یاد ہوگا کہ میں کس  
 طرح ایک ٹوٹا ہوا دل لیکر گیا تھا۔ میں نے جانے ہی سبب  
 پہلے جہاز سے ہندوستان کی راہ لی۔ لوسی شاید تمہیں مسلم  
 نہیں کہ ہندوستان پہنچتے ہی میری ہی کوشش رہی مگر کسی  
 طرح پھر تمہارے گدیوں میں آ جاؤں۔ پورے کس مسان  
 ملک میں اسی کوشش میں مصروف رہا۔ اسی لئے تمہیں خط  
 بھی نہ لکھ سکا۔ کیونکہ میرا ارادہ تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو خط سے  
 پیشتر ہی میں خود پہنچ جاؤں۔ اول بول تو مجھے رخصت نہ دل سکی  
 آخر کار جب رخصت ملی تو صاحب زارش ہو گیا اور جب مجھے سنا  
 ہوا، تو جنگ سر پڑ پڑی۔ میری ناکام رانی نے میرا ساتھ نہ چھوڑا  
 خدا خدا کر کے جنگ کے زخم سے رہائی ملی تو ...

لو سنڈہ: کیا زخمی ہو گئے تھے؟

روڈ فرن: ہاں یہ سنو لی سازم جکی وجہ سے کافی عرصہ تک کے علاج  
 رہا۔ چنانچہ اسی اثنا میں غدر ہو گیا۔ اس سے بھی بال بال بچا  
 ہذا مو قعد کو غنیمت جانا۔ کہ گھر کی راہ لوں یہ میری رام کہانی ہے  
 اب اپنی کہو لوسی تم کیسی رہیں؟

لو سنڈہ: یہ میں اس گھر میں اور کہاں؟

روڈ فرن: جانتی ہو سیکر نزدیک گھر کا مفہم کیا ہے؟ میں جب

دوسرے لوگوں سے گھر کی بابت سنا، تو میرے سینے پر سانپ

لوٹ جاتا۔ ہر شخص کو اپنے اپنے گھر کی داستان ہی تھی۔ لیکن

میری دنیا معنی کرا خرونگ محمد دہلی۔

لو سنڈہ: گرا خرونگ تمہارا وطن تو نہیں ہے؟

روڈ فرن: کیا ہوا تمہارا تو رہے نا۔ گرا خرونگ سے میرا مطلب تمہاری ذات

زیادہ حسین نظر آ رہی ہو۔ ذرا میرے دیکھے آئینہ میں ہے  
تصویر تو دیکھو، وہی کنوڑی کی طرح دکھلا رہا چہرہ، وہی سب ز  
پیاری سیلوفری آنکھیں۔ دل میں محبت کی غلبہاں خود بہ  
ہیں۔ نرم زبانوں پر وہی احمدی قسم جلوہ افروز نہ  
مجھے سبتر خلافت پر دم سچا کا کام نہ رہا ٹکب، خدا کی قسم  
آج بھی تمہارا کاہیدہ سا سپر مرکز بندہ الہا رہے، ہندوستان  
میں تمہاری ہی یاد تو میرے لئے قریب سکون اور وفد اضطراب  
کا باعث تھی۔

لو سنڈہ :- کرنل !! ذرا اپنی آنکھیں تو مل کر دیکھو۔

روڈ فرن :- وہ کیوں؟

لو سنڈہ :- تاکہ تمہیں اصلیت نظر آئے۔

روڈ فرن :- لاجل ولاقوۃ !! مذاق نہیں کر رہا ہوں۔

لو سنڈہ :- خیر ایسا ہی سہی، مگر بہتر یہ ہوگا کہ آپ اپنی زماہرے  
لئے کوئی اور ہی معنون شعر تلاش کریں۔ ایک عمر رسیدہ بزرگ  
سے کیا حاصل ہوگا؟

روڈ فرن :- ہوسی !! تمہارے پاس آئینہ بھی ہے؟

لو سنڈہ :- میں ہر روز اس میں اپنی جھڑپوں کو خود سے دیکھتی ہوں۔

روڈ فرن :- وہ آئینہ دھندلا ہوگا، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔

لو سنڈہ :- خیر ان محکفات کو دہشے دیجئے، اور شریف آدمی کا  
مقصد جان ڈرائے۔

روڈ فرن :- مقصد؟ کیوں بھولی بنتی ہو؟ واللہ اس کے معنی یہ ہو۔  
کہ جو کچھ میں اب تک کہہ چکا ہوں، وہ محض بکواس تھی۔

لو سنڈہ :- یہ بات نہیں بلکہ آپ کی گفتگو بھل سی ہے۔

روڈ فرن :- اچھا تو بامنی لیجئے، محکفات برطرف، میری انتہائے آہ  
یہی ہے کہ آپ میری ہو جائیں، یہ دوسری دفعہ استفسار  
کر رہا ہوں۔ اور ایک مدت کے بعد، لوسی عورت کے مزاج  
میں تلون ہوتا ہے۔ مناسب تو یہی ہے کہ کچھ خور کیا جائے۔

لو سنڈہ :- میں بہت غور کر چکی

روڈ فرن :- خوشی ہے اس کے قریب جا کر، لوسی !!!

لو سنڈہ :- شاید آپ میرا مطلب نہیں سمجھتے۔

روڈ فرن :- میں سمجھ چکا ہوں، کہ تمہارا ارادہ بدل چکا ہے

لو سنڈہ :- چارلس جب میں نے پہلی مرتبہ نہیں کہا تھا، تو میرے  
بوں کی مدد سے آواز نہ تھی۔ حالانکہ میرا دل وہاں ہی اس کے

بچے جلدی کیا نہیں معلوم نہیں، کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں  
لو سنڈہ :- کیا دیکھا کرڈ ہونے کے لگ لگاتے نہیں ہو گئے؟

روڈ فرن :- دیکھا نہ ہونے کے؟ میں تو آج تک اپنے آپ کو جوان خیال  
کہتا ہوں، اور محض اس سبب نہیں کہ وہاں میں تبدیل کرنے کے  
لئے آیا ہوں۔ یہ وہی مسئلہ ہے جس نے مجھے کشمیک ارباب  
کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان  
پہنچے ہی سب سے زبردست جذبہ جو مجھے داسی پر اکس رہا تھا  
میں تھا۔ فرض کر دیں نے تم سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اور جب  
کہ پراکندہ چہرہ رہا ہوں تو کیا تمہارا جواب وہی نہیں دینگا۔

لو سنڈہ :- جو کچھ میں زبان سے کہہ چکی ہوں اس پر سختی سے کاربند ہوں  
شفرن :- پھر زور سے لوسی ان باتوں کو۔ دیکھو کتنا نوسر گز رہا ہے۔

لو سنڈہ :- اب کا کافی مدت گزر چکی ہے۔

روڈ فرن :- اس کا مطلب یہ ہوا، کہ گزشتہ راصوات پر عامل ہوں۔

لو سنڈہ :- اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے

روڈ فرن :- نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، اچھا تمہارے کہنے سے گزشتہ  
صلوات بھی سنی تاہم آئندہ راحتیاں تو ضروری ہے۔

لو سنڈہ :- کیا مستقبل میں میں رہائش کوئے کا ارادہ ہے؟

روڈ فرن :- خیال تو ایسا ہی ہے۔ لی افوائے جاری ہوئے میں قیام کرنا  
اس کے بعد حسب پسند کوئی خطہ زمین سیکر ہیں رہائش اختیار  
کر لیں گا۔

لو سنڈہ :- اور پھر کوئی ہرج نہیں، دوسرے لوگوں کے گھر میں محرم  
آزادی سے ایک دوسرے سے مل سکیں گے۔

روڈ فرن :- دوسرے کے مکانوں میں، کسی باتیں کر رہی ہو لوسی؟

لو سنڈہ :- کرنل !! تمہیں یاد ہوگا، جب تم آخری مرتبہ مجھ سے ملنے کیلئے  
آئے تھے، اس وقت میرے والدین دنیا میں نہ تھے، لیکن تمہارے  
چلے جانے کے بعد آج تک کوئی آدمی میرے مکان میں داخل  
ہونے کی حرمت نہیں کر سکا، تم پہلے شخص ہو جس نے میرے  
اصول کو شکست دی ہے۔

روڈ فرن :- یوں کہو کہ آج تمہیں کسی مرد کی محبت نصیب ہو گئی

لو سنڈہ :- افسوس کہ یہ ایک بوزی اور بے جس عورت کا گھر ہے جیسا  
مردوں کو بادر نہیں۔

روڈ فرن :- ہر سی عورت جانے جنم میں سعادت کرنا لوسی۔۔۔۔۔  
ایک سپا سیدنا بھول تھی ہوئی، سچے تو آج بھی تم پہلے سے

جو خزاں نے سلی ہے۔ اب دل سترت کے جذبہ سے ستاؤ  
نہیں ہوتا۔ میں کو قحطِ سبک آندہ مند ہوں۔

روڈ فرن :- لیکن میں؟

لوسنڈہ :- تم زندہ ہو، زندگی کا لطف صرف تمہارے لئے ہے...  
چارلس نکل زندگی کے آثارِ تباہی گود میں ہیں۔

روڈ فرن :- میں نے امیدوں کے سبز محلوں میں زندگی بسر کی ہے۔  
اب کیونچھاپنے آتوں سے صدمت و یاس کا تیشہ سیکر ان کی  
بنیادوں کو منہدم کر دوں۔

لوسنڈہ :- ان تشنہ تحلیل امیدوں کو یادگار میں تبدیل کر دو!

روڈ فرن :- کیسی یادگار؟

لوسنڈہ :- کیسی یادگار؟ جس نے تمہارے لئے باغِ عزت و زندگی کے  
دروازے کھول دیئے۔ اب مجھ جیسے جی طوفانِ خیرِ سواج کے  
سپردہ کر دو۔

روڈ فرن :- ترکیب میں بالکل ناامید ہو جاؤں دوسری؟

لوسنڈہ :- اہں بالکل ناامید!

روڈ فرن :- وہ دانے کی طرف جاتے ہوئے، ہندوستان میں چھڈ  
کبھی شکستہ کی صورت نہیں دیکھی تھی۔

لوسنڈہ :- اب تم انگلستان میں جو۔ یہ انگلستان ہے کرنل!!

روڈ فرن :- وہ عمارت سے اکرل!!

لوسنڈہ :- ادا تہ بڑھاتے ہوئے، اوداع چارلس!!

روڈ فرن :- دشمنی دلی سے ادا لاتے ہوئے، دوسری!! دوسری اپنے

کو جنبشِ دیتی ہے، اوداع!!

روڈ فرن چلا جاتا ہے۔ دوسری بیٹھی ہوئی اپنے گھر کے ادا کا

کھر جی ہے، ادا سے بار بار چوسنی ہے، بیلین دے پالنے

داخل ہوتی ہے!

بیلین :- کیا میں ادا آسکتی ہوں؟

لوسنڈہ :- واکٹ کو بند کرنے ہوئے، بیلین!! کیا تم واقعی دل برداشتہ

ہو گئی تھیں۔ جب میں نے کہا تھا کہ تمہارا میری ادا نہیں آسکتا!

بیلین :- میرا خیال تو یہی تھا۔

لوسنڈہ :- لیکن اب بیلین اے میری طرف سے کہتا۔ وہ ایک دل برداشتہ

انہی جوتیوں کو گود سے صاف کر کے ادا کر کے میں کسی قسم کا غصہ

داخل نہ کرے۔ ادا آسکتا ہے

بیلین :- میں جیتنے والا ہوں، اب سب سے شکستہ کاری، خود کار کا۔

خلاف تھا۔ اس واقعہ کو ۷ سال گزر چکے ہیں۔ جوتی کی رخنہ

مغفود ہو چکی ہیں۔ اب جبکہ میں نہیں کہہ رہی ہوں تو اس کا مطلب

یہ ہے کہ میرے دل و دماغ میری گواہی دے رہے ہیں۔

روڈ فرن :- سنو!! آج میں اس نہیں کو قبول نہیں کروں گا یہاں  
تک کہ تمہیں مجھ پر نا۔۔۔۔۔

لوسنڈہ :- تاہم؟ یہاں تک کہ مجھ پر دو شینہ جاؤں دیا دے کہ  
تمہاری بار بار کی فرمائشیں میری گزشتہ جوتی کو واپس لانے  
میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

روڈ فرن :- مضائقہ نہیں محبت کا ثبات دل کی جوتی سے جاری ہے۔

لوسنڈہ :- تمہارا دل جان ہے؟

روڈ فرن :- بالکل جان یہ دل جذبات کا سنڈ اور قنارہ کا مزن  
ہے۔ آج سے ۲۵ سال قبل بھی تلو و اب بھی ہے۔ اس شخص

آنکھ میں آج بھی کوئی ٹیکہ نہیں۔ اسی طرح روشنی اور چمک

لوسنڈہ :- ٹھیک ہے وہ اس لئے کہ ہندوستان کی صفت پروردہ

میں وہ آئے ہو۔ اور جگہ نے نہیں اتنی فرصت ہی نہ دی

کہ تمہارا خیال کسی اور طرف متوجہ ہوتا۔

روڈ فرن :- بالکل غلط، سفید جھوٹ، ایسا بھی نہیں ہوا۔

لوسنڈہ :- باہر تم۔۔۔ نے میرے خیال کو اپنے گوشہ ذہن میں محفوظ

کر لیا ہوگا۔ جس طرح میں اپنے بھولوں کو خزاں کے طبع سے بھر

کے کہ حفاظت سے رکھ چھوڑتی ہوں۔ تم گاہے گاہے میری

یاد کو رنگ کاری کی فرض سے داغ سے باہر نکالتے ہو گے۔ ادا

کہہ دیتے تھے اس پر یاد آدھی کا عطر برسا کر دوبارہ ذہن میں قفل

کر دیتے ہو گے۔ یہاں تک کہ مرانی جھگڑوں کے بعد آپس میں

نیاز و ناز کی محافل آراستہ ہوتی ہوں گی۔ بااں ہم میری قسمت

میں ایسی رعایتیں کہاں تھیں۔ ادا نہ ہی ہے ایسا کوئی گویا تھا

میں سے نکل محبت کو سرسبز و شاداب رکھ سکتی۔ وہ روکی زیادتی

سے زخم گہرا ہو چکا تھا۔ آخر کار وہ امتداد زمانہ سے وہ خود بخود

معدی ہو گیا۔ ہر جذبہ دفع نے محبت کی خاموش چمک دلی سے

تمہارے سینہ کو گرم رکھا۔ لیکن میری آنکھیں شوق نے بزرگ

کو محبت کو ہمیشہ کے لئے خاکستر کر دیا۔

روڈ فرن :- دوسری!! اب بھی کہ نہیں مجھ کو محبت سوجاتی ہے لیکن فنا

نہیں ہوتی۔ اب تم کا شرط ہے۔

لوسنڈہ :- بہت دیر ہو گئی چارلس!! وقت گزر چکا ہے۔ بہار کی

لوسنڈہ :- سوسن نہیں یاد ہے کہ میں نے ایک دن کہا تھا، اب عشق و  
محبت کی داستان کو بالکل فراموش کر دو۔  
سوسن :- بی صاحب مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اور ہمیشہ... یاد رہے گا۔  
لوسنڈہ :- سوسن!! اشارہ فتم بھی نوجوان ہو۔  
سوسن :- ابھی کہاں اس زور کو ۳۰ سال کی ہو جاؤ گی۔  
لوسنڈہ :- اسی لئے تو کہہ رہی ہوں کہ جوان ہو گئی ہو۔  
سوسن :- رخصت ہے میں، جوان ہو گئی ہوں مگر کسی کی ذیبت باغوش  
ہونے کے لئے نہیں۔  
لوسنڈہ :- نہیں سوسن!! میں نے تم سے یہ ڈنڈہ کہا تھا، کہ عشق و محبت  
کو خیر باد کہو۔ لیکن اگر تمہاری نظر انتخاب کسی نوجوان پر پڑ گئی ہے  
اور وہ تمہیں پسند آ گیا ہے تو مجھے مزور خبر کرنا۔ تاکہ میں اس کے  
حالات سے واقفیت کے بعد ایک ہفتہ میں ایک بار اسے اپنے محلے  
کی اجازت دیدوں۔ بشرطیکہ اس کی ذات سے کسی قسم کی جھگڑائی  
یا شور و غل نہ پیدا ہو۔  
سوسن :- دوستہ کے پاؤں پر جھکتے ہوئے، بی صاحب خوشحال و آباد  
ہو۔  
لوسنڈہ :- خدا نکرے میں آئندہ جوان دونوں کیلئے سوائے زحمت نبوں!!

آپ تصور نہ کر سکی گی۔  
دہلیں چلی جاتی ہے۔ جس میں صوفیوں کے غلات درست کرتی  
ہے۔ اسی دوران میں سوسن دروازہ کھٹکتی ہے  
سوسن داخل ہوتی ہے،

لوسنڈہ :- ہاں اندر آؤ

سوسن :- دیکھی ہوئی، بی صاحب!!

لوسنڈہ :- کیا بات ہے سوسن؟

سوسن :- اسی صاحب نے

لوسنڈہ :- آخر کچھ کہو گی بی!

سوسن :- انہوں نے مجھے یہ دیا ہے، سورن دکھا کر، بیگم صاحبہ کیا  
میں اسے رکھ لوں؟

لوسنڈہ :- ضرور سوسن ضرور

سوسن :- انہوں نے کہا تھا، کہ اسکی نئی گون خرید لوں، یا اپنے محبوب  
کے لئے کوئی تحفہ لے لوں۔ میں صاحبہ کون کی تو مجھے چنداں  
فردت نہیں۔ البتہ ایک ہم نفس کی مستی ہوں۔ چاہے اس  
معاہدے میں "بے شرم و بے حیا" ہی کیوں نہ کہلوں۔ کیا کروں کہ  
مجبور بخش ہوں۔

## فلسفہ محبت

مترجمہ رضیہ بیگم

کہا جاتا ہے، محبت جوانی کا ایک خواب ہے؛  
جوانی کے بٹنے ہی محبت غائب ہو جاتی ہے؛  
مگر اس قول کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں؛  
پہلی محبت، ایک بار پیدا ہو کر کسی بھی مرث نہیں سکتی؛  
اگرچہ اس مقدس جذبے کی شدت میں کمی ضرور واقع ہو جاتی ہے۔  
سورج تمام دن چمکتا رہتا ہے اور شام کو غروب ہو جاتا ہے۔  
بگردات کو سورج کی روشنی چاند کی روشنی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔  
: کا بٹل کس وقت بھی روشنی سے محروم نہیں ہوتی؛  
اس طرح انسانی زندگی محبت کے نور سے فیضیاب ہوتی رہتی ہے۔

(توسیعاً)

احمد ندیم قاسمی

## نوائے ندیم

تیسرے قدموں میں غورِ شش جہتا      بس یہی ہے میرے دل کی کائنات  
 حسن اور آئے جنوں کو پوچھنے!      لایقِ سجدہ ہے تیسرا التفات  
 موت کی امید بھی مٹنے لگی!      مردہ و افسردہ ہے میری حیات  
 دل کی دھڑکن کی وہی رفتار ہے      کیا ستم سے کم ہے تیرا التفات  
 فرش و کرسی و جد میں آجائیں گے      سن سکے کوئی تو کہہ دوں ایک بات  
 تیسرے دامن کا اشارہ چاہیے      ٹمسناتی ہے مری شمعِ حیات  
 اشکِ اندے اور پلکیں جھک گئیں      تیری آنکھوں نے سنا دی تیری بات  
 چاند تاروں میں تو تیسرا نور ہے      کون بیٹھا ہے ورے کائنات  
 زخم ہوتے ہیں دنوں میں مندمل      اور صدیوں تک چلی جاتی ہے بات  
 سر پہ زانو پر تو آنکھیں بند ہیں      ایک ہیں میرے لئے دن اور رات  
 قوتِ تمسیر ہے تحریکِ سیر میں      زلزلے آئیں تو سنوئے کائنات  
 نور و ظلمت کی حقیقت ایک ہے      روز و شب تیری خرد کے حادثات  
 مدتوں کے بچے بچہ چل جائیں گے      موت ہے دراصل روحِ نکلی برات

پیروی کا فن مجھے آتا نہیں  
 میں کہو گا اپنے دل کی داریات

## نوشتہ جان کیش

مترجمہ سید احسان بیگ

## جامِ ریحان

شاداد کال مرجا گئے۔ اور اس دست کی ماری ہاں کے گاہوں کیسے سوکھ گئے۔ جو منی لوریوں میں اپنے بچے کے درد و کرب کا علاج و معائنہ کرتے تھے۔ ازبلا کتنی خرم و معلوم ہوتی ہے، لورینزو، بستا، مجھے کچھ کتنا تو نہ چاہی لیکن میں سب کچھ کہوں گا۔ اور صاف مشکوں میں اپنے دل کی رام کہیں کہوں گا میں محبت کی ان غماز آنکھوں سے جھپکتے ہوئے آنسوؤں کی ایک ایک قطرہ پی لوں گا۔ کم از کم اس سے اس کے دل کی الجھنیں دور ہو جائیں گی۔ ایک حسین صبح کو یہ خیال لورینزو کے ذہن میں آیا۔ اور تمام دن اس کا دل بے پناہ شدت سے دھڑکتا رہا۔ وہ دل ہی دل میں دعا فرماتا رہا کہ اسے بات کرنے کی قوت مل جائے۔ لیکن اس کے باوجود سرنی کی لہر اس کا گلا دبا دیتی۔ اور اس کی نبضیں جھوٹ جاتی تھیں۔ ازبلا کو بھی بنانے کا بے باک تصور اسے بچے سے بھی زیادہ شرمیلا بنا دیتا تھا۔ آفت محبت کی طوفان اچھڑیاں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔

ایک اور کرب اچھڑا رات کو نہیں سنے کر گزر گئی۔ اللہ صبح کو وقت ازبلا کی معافی نہ کیا ہوں نے اس کی وسیع پیشانی کی گہری سلولوں میں رنج و غم کے ایک ایک نشان کو دیکھ لیا۔ پچھلے وہ مردہ انسان کی طرح زندہ معلوم ہوتا تھا۔ پھر ایک دم اس کا چہرہ شرم و حیا کی سرنی سے مل گیا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر ازبلا نے نہایت شیریں لہجے میں کہا: لورینزو، اور پھر طوفانی جذبہ بحکم نہایتی جواب میں چھپ گیا۔ لیکن اس کا طرز تکلم اللہ کی نگاہ میں وہ سب کچھ کہہ گئیں۔ جو کچھ اس کے دل میں تھا۔

ازبلا میں محسوس کرنے لگے کہ وہ بکری دیکھ کر بھی کہانی تیار کرے گا وہ ایک سچے سچے قابل ہو گئی ہے۔ اگر تم نے کسی دنیا کی کسی چیز پر اعتماد کیا ہے تو تمہیں اسی کا واسطہ عقین جاؤ کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ میری روح آخری فیصلہ سننے کے لئے بیقرار ہے۔ میں تمہارے نازک ہاتھوں کو دبا کر تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا۔ اور نہ ہی ان غمور آنکھوں میں آنسوؤں کی کہ ان سحرانہ نظروں کو کو زندہ بنانا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک اور بات کہنا میرے لئے ناممکن ہے۔ میرا جوش جوں کسی طرح بھی کم نہیں ہو سکتا۔ میری روح: تم بچے میری تکلیف سے دوسرے چارہ ہی ہو مجھ سے

حسین اور سادہ دل ازبلا اور عشق کے بیت المقدس کا ایک جہاں راجہ لورینزو ایک ہی عربی میں رہ کر اپنے نازک دلوں کی پرکٹ کرکٹ سے محفوظ نہ رہ سکے۔ وہ جب تک ایک دوسرے کے قریب بیٹھ کر کھانا نہ کھا لیتے ان کے لئے میز پر مینا ناممکن تھا۔ وہ ایک چھت تلے رہتے ہوئے اس وقت تک نیند سے بہکنا نہیں ہو سکتے تھے۔ جب تک ایک دوسرے کی یاد میں آنسو نہ بہائیں۔

ہر صبح طہ ہو گیا آفتاب انہی محبت کو پہلے سے بڑھا ہوا پاتا اور شام کا پہلا ستارہ اس محبت کو اور بھی بڑا اور پُر غلوص دیکھتا۔ لورینزو خواہ مخواہ ہوا خواہ کھینچوں میں ازبلا کا پیارا سراپا بروقت اس کی آنکھوں تلے چھپتا رہتا۔ اور لورینزو کی پرکٹ تانیں ازبلا کے لئے درختوں کی ترنم آواز تھیں اور پُر اسرار بانسری کی سین آوازیوں سے کہیں زیادہ دلچسپ اور دلکش بارشیں۔

اس سے پہلے کہ دروازہ کھول کر اس صبح محبت کو اپنی پیاری نگاہوں کی آغوش میں سے لورینزو دھج جاتا تھا۔ کہ گسکا نرم و نازک ہاتھ دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ وہ عقاب جیسی تیز نظروں سے اس کے چہرے کو کھڑکی میں دیکھ لیتا اور جب وہ حسین چہرہ آسمان کی طرف اٹھتا تو وہ بھی آسمان کی طرف دیکھنے لگتا۔ صبح کے وقت اس کے قدموں کی محترم چاپ کو شیر حیدر پر پہننے کی بے قراوی میں وہ تمام رات بنگاؤں پر بٹھاتا رہتا۔

مئی کا طویل مہینہ اسی ذہنی انتشار میں گزر گیا۔ اور آغاز جون نے اچھے حسین چہروں پر خرمی و دیکھی۔ لورینزو تکیے سے مخاطب ہو کر کہتا: "میں اپنی سترت کے سامنے سجدہ کروں گا۔" کل میں اپنے دل کی راکھ سے بجلیک مائل ہو گیا۔ اور ازبلا عالم خواب میں کہتی: لورینزو! اگر تمہارے جوش محبت کا رگ نہ لاپس تو مجھے دوسری شام دیکھنی نصیب نہ ہو؟

لیکن صدیق کہ ان کے تلخ دل اسی طرح گزرتے گئے۔  
میل تک کہ گلاب کے سایے میں رہنے کے باوجود ازبلا کے

تھیں۔ جاگواڑ کو نوں سے خون بن کر بہ جاتیں۔۔۔ ان کے لئے ایک نیم مراد اسٹیل چیمبر ہوئے دریا میں صبح سے تمام ہنگاموں سے رہتے اور زہر جو اس پر پھری جوئی کشتیاں کنارے لگاتے رہتے۔

انہیں کے لئے سینے تلے ملاج نے اپنا سانس روک لیا۔ اور  
عربانِ جسم کے ساتھ ہموکِ شارب کے منہ میں کود پڑا۔ انہیں کے لئے گمزد  
انسانی تو جس موت کے حبیبِ جبریل میں سرس کرنا ہو گئیں۔ محض انہیں  
کے لئے اقتصادِ انسان اقتصادِ مصائب کی وادیوں میں پیسے مارے  
پھرتے رہے اور یہ — بے اعتنائی سے تقدیر کا بیہ بھر دیتے۔  
جس سے عزود کے خون کا ایک ایک قطرہ بخورنا جاتا۔

وہ کیوں مفروضہ تھے؟ کیا اس لئے کہ ان کے مر مر میں تو ایسے ایک غم نصیب کی آنکھوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ قطرے ٹپکتے تھے؟ وہ کیوں مفروضہ تھے؟ کیا اس لئے کہ نارنگی کی پیاز میں پرچڑھتا ایک کوزہ می کے سبز حبوں پر چڑھنے سے زیادہ آسان تھا؟ وہ کیوں مفروضہ تھے؟ کیا اس لئے کہ سرخ ٹھیکروں والے ہی کھاتے رو مان کے سنہری زمانے کی شاعری سے زیادہ وہ جدید انگیز ادب کیست باہتے؟ وہ کیوں مفروضہ تھے؟ امارت کی شوکت و سطوت کا عمدہ نمونہ تھا کہ وہ کیوں مفروضہ؟ لادائش کے یہ دونوں فرزند ان ڈاکٹر سپردیوں کی طرح مضمر اور خود پسند ہو گئے تھے جو اس سرزمین شہر و دیار میں رہنے کے باوجود چاندی سونے میں گھرا ہئے کیوجہ سے زور و ہونگئے تھے اور نقصان کو جاسوس سمجھ کر ان سے ڈرنا کرتے تھے۔

یہی کہانے کے خشک اوراق میں ڈوبے ہوئے ایسے فریضہ شاعر  
لوگوں نے کس طرح حسین اذہب کو شفق کی رنگین دنیا میں دیکھ لیا کیونکہ  
وہ اذہب کی تحروں میں کام سے جی چرائے کا جذبہ بجاغائب گئے۔ کس طرح  
مصر کا یہ گرم مزاج فرزندِ کامل اور سست نظر آنے لگا۔ تاہم یہ  
سب کچھ سمجھ گئے۔ تجارتی بھی کہیں کہیں شکار شدہ ہرن کی طرح پیچھے  
مرکروں کے ہستیا ہے۔

جب مزاحوں طریقوں سے ان لوگوں کو اور نیزہ کی محبت کا تین  
 ہو گیا اور انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انکی بہن اسکی محبت میں اسیر تھیں  
 دونوں نے ایک دوسرے سے اپنے خوفناک خیالات کا اظہار شروع  
 کر دیا تو کوئینز یون کا غلام کس طرح انکی مشیر سے محبت کی نہنگ بولا  
 میں مشغول رہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ از بدیا کسی نواب کی جوی  
 ہے۔ اور اسکی وساطت سے اس نواب کے زیتوں کے درختوں پر چھ فٹ  
 اٹھانے کی سہولت ہو جائے۔

خاقان: تمہاری موجودگی میرے ذہن میں احساسِ مبارک و نہ کر دیتی ہے  
میں اس پھول کو سونگ کر ہوں گا جس کی پتھر میں کیت بادِ صبح کے آغوش  
میں کھتی ہیں! اس کے ہونٹ جو آج تک خاموش رہے تھے۔ بے باک  
ہو گئے۔ اور اس کے یا قوتی ہونٹوں سے ہم آہنگ ہو کر شہریت کی لطیف شہنم  
بر مانے لگے۔ روحانی مسرت ان دوزخ کی... ہموکابِ حق اور انبلا  
چون کے گرم جوش آغوش میں کھلنے والے پھول کی طرح بڑھ رہا تھا۔  
جب وہ جہا ہونے کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو قوم پھول چند  
محوں کے لئے جمنا ہونے ہیں تاکہ پھل کو ایک دوسرے کی روحانی  
لطفاتوں میں کھ جاویں۔ انبلا جو یہ حسن کی طرح باوقار اور حسین معلوم  
ہوئی تھی، دلکش محبتِ اللہ اندھے دیوتا کے نئے الٰہی اپنے کمرے میں چلی  
گئی۔ اللہ اور نیزہ خوشی سے ناچتا اور اچھلتا ہوا غروبِ آفتاب کی آخری  
کمرلوں کو پہاڑیوں کے ارد گرد طوائفِ ہار کی طرح لپٹا ہوا دیکھنے کے  
لئے چلا گیا۔

[illegible]

کاغذ سے لکھے ہیں۔ انہی موت کے بعد ان پر نوحہ خوانی کیا جا چکی ہے۔ اور ہزاروں حسرت انجام کھانیاں کئی کئی دفعہ دہرائی جا چکی ہیں۔

انہیلا کی زندگی شدید مصائب سے لبریز تھی۔ اور نورینہ کی حنوط شدہ لاش و رختوں کے حرارت بزرجمہنڈ میں پڑی رہتی تھی۔ پھر یہ حقیقت جستہ قائم ہے کہ کجھت کی سلطنت میں وقتِ مسرت کا تعداد مصائب پر ہی حاوی آجاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ شہد کی مکیاں، فدائے ہمارے کے دھماکے کی بجائیں، خوب سمجھتی ہیں کہ کہ نہ زہریلے پھول میں سب سے زیادہ زہر ہوتا ہے۔

جیسی دھنیزہ اپنے بھائیوں کے پاس رہتی تھی۔ جواب دہا  
 ک بے شمار درخت کے انک تلے بھی دھیت میں اضافہ کرنے کے لئے  
 عجز نہیں پڑے۔ آخر چرخوں کی روشنی سے منور کاوش اور کارخانوں میں  
 اُلپڑھیں ہو جاتے تھے۔ اور وہ راتیں جو کھٹ کیوجہ سے تھک رہی تھی

از بیلائے کہا یہ خدا کا نکتہ : ادب اور عزت جمانے کے لئے  
تو از بیلا کے ہونٹوں پر ایک وجد آو نہ خیر ملک رہا تھا۔

اس طرح دونوں بھائی اور بھیب محب خدا ہنس  
حسین دادیوں میں سے چھوٹے اسطوت چل دیئے۔ جہاں  
انہی انگلیوں سے ترنم کے دریا بھائی بھوں کی مٹرائے  
کو کاشی سید سے کنا روں میں سے ہوتی ہوئی گزرتی ہے۔ اور  
بھائیوں کے گھبرائے ہوئے چہرے مسر زور ہو گئے تھے۔ اور  
لوزیر کے چہرے ہر باک محبت کا لافانی نور کھل رہا تھا۔ اور  
ندی پر سے گزرتے کہ ایک بھیا تک جھل میں پہنچ گئے۔ جس کی ماء  
خاموشی خوفناک کا دورہ انہوں کے لئے توڑوں ترین محسوس

اسی جگہ لوزیر کو قتل کر کے دہن کر دیا گیا۔ آگہ اس جگہ  
تاریک وسعتوں میں محبت کے ایک عظیم الشان شعلے کو بجھا  
انہوں نے جب نوح اس طریقے سے عناصر کی قید سے آزاد کر  
جائے، تو وہ گستاہ سے نکال کر کتوں کی طرح بھرا ہوا جاتی ہے  
ان قاتلوں نے اپنی تلو اعلیٰ کو ندی کے پانی سے دھو لیا۔ اور  
کے پہلوؤں کو اپنی گھرائی ہوئی پاؤں سے زخمی کرتے ہوئے  
طرف چل دیئے۔ دونوں قتل کے نشے میں سرشار تھے۔

گھر پہنچ کر انہوں نے اپنی ہن کو بتایا کہ لوزیر کو کسی  
کلام کو جو سے کیا ایک جہاز پر سوار ہو کر خیر ممالک میں جانا پڑا۔  
بھیب لڑکی ہوئی کا لباس میں لے۔ اور خدا سے امید کے بے  
نہجوں سے دور بھاگ جا۔ آج تو اسے نہ دیکھ سکے گی، اور نہ کسی  
قیری طرف دیکھ کر مسکرائے گا۔ اور پرسوں کا دن تیرے لئے آئے  
اللہ سسکیوں کا دن ہو گا۔

وہ اس خوشی کے لئے آنسو بہا رہی ہے۔ جو اسے کبھی  
حاصل نہ ہو گی۔ وہ روٹی رہی۔ یہاں تک کہ شام کے وحشت لگے  
کو اپنے سائے میں لے لیا۔ اور جسے آہ وہ محبت کے لمحہ  
پر سونے کی بجائے فراوانی و دولت کے طلائ کاٹوں پر تڑپتی رہی۔  
اسکی نگاہیں شام کی برستی ہوئی تاریکیوں میں اپنے  
سرا پا دیکھتی رہیں۔۔۔ بار بار ایک جگہ آہ اس کے ہونٹوں تک  
دم توڑ دیتی۔ وہ اپنے حسین اور مستاسب باندہ چہرے میں بھیب  
اپنے بستر پر لیٹ کر زیر لب کہتی رہیں۔ جو آہ کہاں ہو  
جس طرح خزاں کے وسطی زمانے میں وہ رستے  
خونک ٹھکانوں سے ملتی دینے لگتی ہیں اور گھر مشرق منہ رہا

جب وہ اکٹھے بیٹھے تو ہر حد کی جھگڑیاں بھڑک اٹھیں۔ جب  
وہ تنہا ہوتے تو ہونٹ چباتے رہتے۔ آخر کچھ دنوں کے غور کے بعد انہوں  
نے ایک تجویز سوچ لی جس سے اس بے وقوف زوجہ کو اسکی غلطی کی  
میزا دیئے کا راستہ پیدا ہو گیا۔ مٹی کے کن سفاک پتوں نے دم و دم  
کے جگڑ میں آتش بھڑکایا دینے۔ یعنی انہوں نے لوزیر کو قتل کر کے  
کسی گھنے اور تاریک جگہ کی ناقابل عبور گہرائیوں میں دفن کر دیئے کا  
مہم ادا کر لیا۔

ایک خوشگوار صبح کو جب لوزیر دوبارہ کے بل پر چکا ہوا۔۔۔  
آفتاب کی اچھوتی کرنوں میں ہزار ہا تھا۔ یہ لوگ شبنم کو اپنے سفاک  
پاؤں تلے روندنے ہوئے اسکی طرف بڑھے اور بولے کہ ہم انوس  
ہے کہ ہم تمہارے اس سکون میں نخل ہوتے ہیں۔ لیکن مقلدی اسی  
میں ہے کہ اپنے خندے وقت میں گھوڑے پر زن کس لیجائے۔  
— آج — نہیں — اسی وقت ہم اینٹیاں کی طرف جانچے  
اس لئے اس سے پہلے کہ شبنم کے یہ بھرے ہوئے موتی آفتاب کے  
طلائی دامن میں مٹ جائیں انچے اتر آؤ۔

لوزیر نے حسب عادت بڑی خندہ پیشانی سے ناگن کے کن  
زہریے بچوں کا استقبال کیا۔ اور جلدی جلدی مٹی نیزہ اور ٹسکا کے دیگر  
سامان سے مسلح ہونے کیلئے اندھ چلا لیا۔

صحن میں سے گزرتے وقت وہ ہر قدم پر ٹھہرتا تھا کہ اگر اس کے  
والی ملکہ مصروف خدمت طرازی ہو تو مترق آواز اس کی سماعت میں ملے  
ہو جائے۔ یا کم از کم ان جگہ قدموں کی چاپ سنائی دے وے  
وہ اسی طہرچ اپنے جذبات کی فضاؤں میں اڑتا ہوا جہاز تھا  
کہ اوپر کی منزل میں ایک نفرتی قبچہ کو خبا — ایک ترنم ریز  
و موسیقی نا قبچہ! اس نے اوپر دیکھا، از بیلا کا دمکت ہوا چہرہ لینے  
حضرت آب دامن میں مسکراہٹوں کی جھٹکیں... بیٹھے دریچے کے  
رہنے میں سے جھانک رہا تھا۔

دھیاری از بیلا؟ اس نے کہا یہ مجھے خوف تھا کہ کہیں تمہیں  
صبح خیر کہنے کی سعادت سے بھی محروم نہ کر دیا جاؤں۔ آہ اگر تین  
گھنٹوں کے قلیل وقفے کی جدائی قلب و جگر کو غم و اضطراب کی لگی میں  
پس سکتی ہے، تو تم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانا کس قدر عاشورہ کا  
لیجن جو مست کردہ ہم بھی روز روشن کی طہرچ جدائی کی بھیا تک  
تاریکیوں میں بنا کر آہ زیادہ فراوانی ہو جائیں گے۔ خدا حافظ پاری



ایک مسلسل کھیل میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اور محاذوں میں تو  
ساتھ آجھ پھولی کھیلے لگتا ہے۔ تاکہ اچھے مشرقی غارتے ملنے سے پہلے  
وہاں ہو جائے۔ اس طرح مبین ازبک آہستہ آہستہ مشرق کی  
لہروں سے گرتی گئی۔

اسکی آنکھیں اگرچہ دہشت انگ تھیں۔ تاہم بن میں محبت کی چمک  
ابھی تک مستند تھی۔ اسی عوازیں چمک نے اس ننھی بے نصیب لڑکی کو  
خون دہرا س کے چوں سے بچا لیا۔ اور نوز کی مدح تا یک باضی رہے  
خوناک پر دے اٹھائی رہی۔ غور و غور سے کھانا غلام جمل کی ایک  
محبت — اہل شہ کی سرد خاں — جہاں اسے ایک ملازم بھیس رہے  
آپ کو خونی برجھوں کے حوالے کر دہشت۔

تقرآتی تھی۔ وہ چند لمحوں کیلئے کھڑی رہی پھر دفعتاً جھکی اسی جہ پناہ میں  
سے زمین کھودنے لگی۔

جلد ہی اس مٹی میں سے ایک دھبہ وار ستانہ برآمد ہوا جس پر  
ازہلا کے لئے ہاتھوں سے سرخ ڈودے سے متعلقہ نقوش کڑے ہوئے  
تھے۔ ازہلا شنگ مرمر سے زیادہ سرد ہونٹوں کے ساتھ اسے جوم کر اپنے  
بچنے کے پاس رکھ لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ بچے کو بیٹانے کا یہ معمولی کھنڈ  
اب سرد ہو کر بڈیوں میں جم گیا ہے۔ لیکن پھر بھی ازہلا اپنے کام میں مشغول  
رہی۔ اور بکجری ہوئی لٹھوں کو ماتھے پر سے پٹانے کے سوا وہ ایک لمے  
کے لئے بھی نہ دیکھی۔

بڑھئی آیا دیر تک قریب کھڑی دیکھتی رہی آخر اس کا دل اس  
روح خراشیں شکر کو دیکھ دیکھ کر پانی پانی ہو گیا۔ اور اس نے بھی اپنے  
ہوت جیسے سفید بالوں کے ساتھ جھک کر اس دھبہ ز کام میں ہاتھ  
بٹانا شروع کر دیا۔ آخر جن گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد بڑھئی کا پلا صفت  
برآمد ہوا۔ کتھہ خرفناک منتظر تھا، لیکن ازہلا کی آنکھوں میں اب بھی کوئی  
آنسو نہیں تھا۔

سرسین کی توار سے بھی زیادہ گند آٹے کے ساتھ ان لوگوں نے کسی  
غیر انسانی مخلوق کا سر نہیں کاٹا تھا۔ بلکہ یہ سر تھا۔ ایک ایسے شخص کا جو  
موت کے بعد بھی اسی طرح عظیم العین معلوم ہوا ہوا تھا۔ جس طرح وہ زندگی  
میں تھا۔ پرانے زمانے کے شعراء کا قول ہے کہ محبت کسی نہیں مرنی۔ بلکہ  
یہ لافانی شہزادی ابد آباد تک زندہ رہتی ہے۔ لیکن اگر محبت کا جسہ موت  
کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہو بھی سکتا ہے تو ازہلا انہیں ٹکڑوں پر پودوں  
کی بارش کرتی رہی۔ لہہ ہونے ہوئے آپس بھرتی رہی۔ یہ محبت کا دوا تھا  
— سرد مرده۔ لیکن اب بھی اسکی حکومت دل پر تھی۔

وہ اسے پوشیدہ طور پر لے گئی۔ اور یہ پیش بیاغرا ازہلا کے  
لئے وقف ہو گیا۔ اس نے غلائی ٹنگھی سے اس کے ایسا وہ بالوں کو سنہارا  
آنکھوں کے سیاہ حلقوں کے ارد گرد نوکلی ہنسیوں تیروں کی طرح جن کر  
کھڑی ہو گئیں۔ بیٹے ہوئے دھار سے کی طرح ٹھنڈے آنسوؤں سے اس  
نے کٹی ہوئی گردن پر چھٹے ہوئے گوشہ کے بد نما لٹھوں کو صاف کیا  
وہ ہر لمحہ ان بالوں میں لٹکی کرتی۔ اور آپس بھرتی — وہ ہر لمحہ اس پر پلو  
کی بارش کرتی اور آنسو بیاتی۔

پھر اس نے اس سر کو ایک ریشمی دھالی میں لپیٹ دیا۔ جو اہل  
کے خوشبو دار پھولوں سے مطام زراہ طربیں بسایا گیا تھا۔ ازہلا نے  
اس صخرے کو ایک پیالے میں رکھ دیا۔ اور اسے باغ کے ایک گوشے

”اے اس نے کہا۔ میں زندگی کے ان شدید سے نا آشنا تھی میرا  
خیال تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا آدمی ہی خوش سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا  
میں بہت ہی تھی کہ قسام ازل نے کسی خوش کے وقت یا اپنی مخالفت تو نہیں سے  
لائے وقت جو ش میں اگر ہم دونوں کی ستر کا بہترین حصہ بخش دے لیکن  
مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ اس دنیا میں جرائم بھی ہیں۔ ایک جانی کا خونچکن  
خبر بھی ہے۔ اے زہرا دج! تم بخیر ہی معصومت کو چاؤکی میں بدل دیا ہے۔ میں  
آؤں گی تہذیبی آنکھوں پر بہ شمار برسوں کی بارش کر دوں گی۔ اور صبح شام  
آسمان کی بلندیوں پر تیرا استقبال کیا کروں گی“

پوچھنے سے پہلے اس نے پوشیدہ طور پر اسی جھل میں جانے کا طریقہ  
سوچ لیا۔ اس نے یہ بھی سوچ لیا۔ کہ کس طرح وہ عزیز ترین مٹی دھوؤں  
لے گی۔ ان ذروں کو کس طرح میں لوریاں سنائے گی۔ اور پھر جب اس خواہ  
کی تعبیر اسکی آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔ تو کیونکر۔ اسکی یہ خبر غیر جانبدار  
معاف کر دی جائے گی۔ یہ سوچ کر اس نے ایک بڑھئی آیا کو ساتھ لیا۔ اور  
اس گھنے تاریک جھل کی طرف چلی۔

دیکھتے وہ ندی کے کنارے لٹا سنے چلتے ہوئے کس طرح بڑھیا  
کے کانوں میں ہولے ہولے باتیں کرتی ہے۔ اور پھر کس طرح کسی ہونی آنکھوں  
کے ساتھ چاروں طرف دیکھ کر اسے ایک خبر دکھاتی ہے: بیٹا یہ کیسا کاؤزہ  
شعلہ تیرے سینے میں بدگاہ ہے — یہ تمہارا بار بار مسکوانا، کیسی  
خوش کا آئینہ دار ہے؟ شام تک انہوں نے لوزیزو کی خاکی آد اٹکا کر  
دھوؤں کاٹا۔ پتھر کے ٹکڑے بھی وہیں تھے۔ اور سرخ جھل پر بھی:

کون ایسا تنفس ہے جو سر نہر قبرستان میں نہیں گیا۔ اور جس کا  
تصور ایک عظیم القبحہ چھوڑنے کی طرح مٹی کے ڈھیروں اور سنگین پردوں میں  
سے گزند تاجرا۔ لٹھو بری کی سوزنہ استخوان اور کھن میں پٹی ہوئی ٹی شری بدگاہ  
کو دیکھنے کے لئے قہر کے اندر نہیں پہچا۔ اور پھر موت کے مخوس سایے تلے اگر  
جگڑی ہوئی صورتوں کو ترحم خیر قطروں سے دیکھ کر انہیں دوبارہ زندگی و  
روح سے آشنا کرنے کے لئے بے چین نہیں ہو گیا۔ لیکن یہ سب بے چینی  
اور حسرت اس جذبہ کرب کے سامنے بچھ ہو جاتی ہے۔ جو ازہلا نے لوزیزو  
کے قریب دو مانا ہوتے وقت محسوس کیا۔

اس نے تازہ کھدی ہوئی مٹی کی طرف دیکھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا  
تھا کہ ایک ہی نظریں سامنے راز طشت ازہام جو گئے ہیں۔ جس طرح  
ٹکاؤں کنویں کے شفاات لاکڑی کی تہ میں سب کچھ سمات دیکھ لیتی ہیں۔ اسی  
طرح ازہلا نے بھی قبر کی گہرائیوں میں وہ جو سنے زرد اعضاء کو صاف  
دیکھ لیا۔ وہ اس خونی مقام پر کھڑی ہوئی کسی خشک جھل کا سر جھایا ہو کر

جادو کے پھروں کا گمان ہونے لگا ہے۔ عجیب و غریب باتیں اللہ کی سجدے کو سوں دور تھیں۔ انہیں کسی طرح بھی یہ یقین نہیں آ سکتا تھا۔ دیکھان کا چہرہ علم از بجا کو اپنی حسین جوانی اور سر سے بھٹکتی ہوئی عمر بھر گزشتہ محبت تک کو بھلا دینے کی قوت رکھتا ہے۔

اس لئے وہ اس راز کو پشت از باہم کرنے پر تل گئے۔ وہ دیکھ تک کسی مردوں موقع کی بے شکوہ جو کرتے رہے لیکن از بجا ہر وقت ہونے کے قریب نہیں رہتی تھی۔ ذہنی وہ گرے میں جاتی، اندھی محروک دیاس کی پھینکا اسے اس جام سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو تیں، اگر وہ کہیں جاتی تو اس پرند کی طرح، جو اپنے اڈوں پر داپس آنے کیلئے بجا رہا ہے، نوئل اس چلی آتی۔ وہ مرغی کے صبر و صبر کے ساتھ دیکھوں کے پھروں کے قریب نہیں جاتی انکسوں سے آسودوں کی برکھا برساتی رہتی۔

لیکن اس حفاظت کے باوجود ان غلاموں نے جام ریحان ہر اکر اسے کسی خیرہ مقام پر لے جانے کا انتظام کر لیا۔ پیاسے کے اندر رکھی ہوئی چیز کو کافی کی سبزی اور نند و صیوں سے ناقابل شافہ ہو چکی تھی۔ تاہم ان کی نظروں ناؤ گئیں۔ کہ یہ نوئل کا سر ہے۔ انہیں قتل کا معاوضہ مل گیا۔ اس لئے وہ اسے ساتھ لیکر فلائس سے ہمیشہ ہمیشہ چلے گئے۔ وہ ایک بیگناہ کے قتل کا وجہ نہ ہوں پر اسے غریب الاطی کی شکر گری کھانے کیلئے فلائس سے نکل گئے۔

اسے حزن کے دو تانا آئیں پھر اسے اس طرف سے موسیقی، موسیقی الیہ اللہ اب، افسردگی کے شیطاں اور داغ نہ کوڑ کیوں از بجا حسین از بجا ایک بڑی ہی غیر مکمل موت سے ملے گی۔ یہ ظالم اس سے جام ریحان کی چھین کرتے گئے ہیں۔

وہ مردہ اپنے روح جیوں کی طرف ترحم خیر قتل سے دلچسپی ہوا اپنے گمشدہ جام ریحان کا پتہ چھتی۔ وہ اپنی آواز کے اہم ایجنز تادوں پر گاتی، اور آواز داپس سے چھتی کہ اسکا جام ریحان کہاں ہے۔ وہ وہ کیوں اسکی تلاش سے چھپا دیا گیا ہے؟ یہ کشتہ ظلم ہے۔ وہ کہتی۔ میرا جام ریحان ہی مجھ سے چھین لیا گیا۔

وہ آخری دم تک جام ریحان باغی، تپ تپ کر رہی تھی۔ غلاموں میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس نے اس کی محبت کی پائمانی پر اسے بھانے ہوں۔ بس کی کافی کن افسردہ ہری لوگوں کی زبانوں سے یہ کہتا تھا کہ شہر چھپ گئی۔ اب تک گاؤں میں یہ گیت سنا جاتا ہے کہ وہ یہ کہتا تھا کہ علم ہے، میرا جام دیکھیں مجھ سے چھین لیا گیا۔

میں دفن کر دیا۔ اس میں اس نے دیکھان کے نہر بہت بیز پھول لگائے جو اس کے آسودوں سے ہمیشہ تر رہتے تھے۔

چاند سورج بتادوں کا عکس بھی اس کے ذہن سے مٹ گیا۔ بہتہ درختوں کی جھوٹی ہوائی ٹہنیوں پر بھکا ہوا نیلگوں آسمان اس کے دماغ سے محو کیا۔ وہ پانی سے پھری ہوئی شفاف جھیلوں کو بھول گئی اور سرخزائی کی تہہ دیز تھامیں اس کے لئے بے معنی ہو گئیں لیکن دیکھان کے خوشبودار پھول ہر وقت اسکی آنکھوں کے لئے رہتے۔ وہ انہیں اپنے آسودوں سے سیراب کرتی رہتی۔

کئی دن گزر گئے۔ اور وہ ہر اس نازک پروسے کو اپنے نازک آسودوں سے پہنچ رہی یہیل تک یہ پودا خوب پھول کر تر و تازہ ہو گیا یہ پھول اتنے خوبصورت اور خوشبودار تھے کہ فلائس پھر میں ان کا شل ملنا ناممکن تھا کہ یہ کہ پھول خوراک حاصل کرتے تھے، انسانی خون سے اور ایک انسان کا فنا ہوتا ہوا سر کھا دی طرح استعمال ہو رہا تھا الغرض یہ قریب ہر اجزا ہر ہستوں کی صورت میں پھوٹ پڑا۔

اسے حزن کے دو تانا چند لمحوں کے لئے بھڑ جا۔ موسیقی، موسیقی مال کی آہیں بھرا ہے آہ کی دیوی، اسے حزن و ملال کے شیطاںوں کیلئے سراٹھا کر آواز سکراؤ سا اپنے افسردہ سراٹھاؤ، اندا اپنے خزانہ صندلوں میں زرد و مدشنی کے دھبے بکھیر دو۔ تاکہ تھامے افسردہ مراد نقسری روٹنی کے دہشت افزا وجہوں کے سیاہوں میں آجائیں۔

اسے افسردگی کی تانوں افسردہ سیلان کی گھلے کی آہیں بکھر چکی، برہنہ برہنہ الیہ تادوں پر تھرتھراتا اور اس کی موسیقی میں اسراہ کی شلاب جرد۔ کیونکہ سادہ دل از بجا جلد سے جلد موت کے گریب جڑوں میں جالے والی ہے۔ وہ ایک ایسے مجبور کی طرح مر جا رہی ہے۔ جس کو کسی قلم نے اس کے خوشبودار شہد کے لئے کاٹ دیا ہو۔

آہ! جھوٹ دیکھئے۔ اس کجگو کو مر جھا کر سرکھ جانے کیلئے اور موت کے دیکھا سانسوں میں سردی کی منہ کر دینے والی تندی کو اس کے قریب ڈالنے دیکھئے! اس کے بھائیوں! دولت کے کنوئوں نے اسکی مراد آنکھوں پر سے بٹھے ہوئے آسودوں کے مسلسل تار کو دیکھ لیا۔ اس کے دشتہ اندر میں سے چند شخص طریت حیرت میں تھے کہ حسن و جوانی کا ایسا مرکز ایک ذراپ کی ہونے والی یوسی کے ہاتھوں یوں مٹی میں مل رہا ہے۔

اسکے بھائیوں کو بھڑک گئی کہ وہ کیوں دیکھان کے پروسے کے قریب گھر رہی ہے۔ انکسوں نے پھول اس سرحت سے بڑھ رہے ہیں کہ انکی

اگرچہ کمالی

# دعوتِ رنگیں

آءِ داد و حسن و عشق دیں تاروں کی چھاؤں میں

رُسوائی کے خیال کو دل سے نکال کر  
مجبوریوں کو کیف کے سانچے میں ڈھال کر  
رسم و رواجیات کو ٹھکرا کے بیدریغ  
مستی میں مجھوم مجھوم کے لہرا کے بسیلینغ  
چہروں پہ لے کے تازہ انگنوں کا نور سا  
دل میں بسا کے اک جہاں کیف و سرور کا  
الفت کی آگ سے غم ہستی کو پھونک کر  
مقل و شعور و ہوش کی بستی کو پھونک کر  
میٹھے سروں میں گاکا کے مجنبت کی راگنی  
دوڑا کے ہر نفس میں جوانی کی ہمدی  
آنکھوں میں لے کے ایک صنم خانہ نشاط  
بے احتیاطیوں میں بہا کر ہر احتیاط  
کیفیت جنوں کی شرابوں سے مجھوم کر  
اک دوسرے کو فرط مجنبت سے چوم کر

آءِ داد و حسن و عشق دیں تاروں کی چھاؤں میں

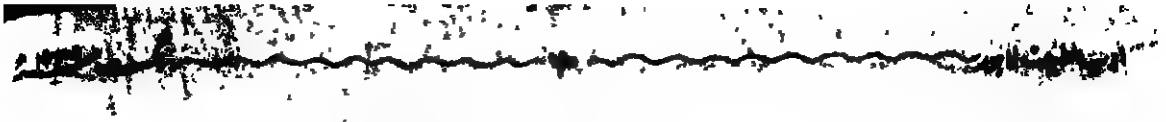
# ایک شام

”کریم؟“  
 فیض صاحب کی گھر جی ہوئی مضمناک آواز خفا میں گونجی۔ بڑھئی پوچھنے لگا کہ اتنے بڑے بھائی کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اور وہ کہنے میں جب کہ یہی سب باتوں سے اسے مضمناک ہی کو دیکھنے لگی۔  
 ”اب تمہارا کیا کام یہاں؟“ فیض صاحب اپنی چھتری گھماتے چڑھے  
 ”میرزا جی، بڑھائی نے محبت و نواز آواز میں کہا  
 ”ہمارے ہر روز یہی بہانے شرم کہیں کی؟“  
 ”بیاد تھی فیض جی — کچھ کہتی ہوں؟“

”اب چار روپے سے آئے ہیں“ منیہ نے کہا۔  
 اس کے جواب میں بڑھائی نے سکون کو ایک سیلے کیلے رد مال میں بانٹ کر جیب میں ڈال لیا۔  
 ”ڈالنے انہوں نے کاٹ لے ہیں؟“ منیہ نے سرگوشی کے لیے میں کہنا شروع کیا: ”کہتے ہیں تم نے ایک پلیٹ اور سے بڑھائی نے آہ بھری، ایک تھوڑا شکر اسکی آنکھوں سے نکل کر اس کے رخسار کی جھریوں میں ڈوب گیا۔“  
 ”اب تم علی جاؤ گی ماں؟“  
 ”اں بیٹا: مجھے جانا ہی پڑ گیا، انہوں نے مجھے نکال دیا ہے۔ اپنے گھر سے نکال دیا ہے؟“ یہ کہہ کر بڑھائی علی اور دو دانے کی طرف چلتی گئی میٹر وہیں کھڑا رہا۔ یکایک اوپر سے فیض صاحب کی آواز آئی: ”اوپر کو منیہ منیہ جلد جلد قدم اٹھانا ہوا سیز جیوں کی طرف جانے لگا۔ بڑھائی نے دو دانے کے پاس ہنجر دیا اور اس پر کھڑکیوں پر اور فرش پر اور دایمی حسرت انگیز نظر ڈالی اور دو دانے سے بچنے لگی۔ اوپر کھڑکیوں کو جنبش دے رہی تھی مگر صاحبہ اور دوسرے گھر کے آدمی دوسرے بڑھائی کو رخصت ہونے دیکھ رہے تھے مگر فیض صاحب کے ڈور سے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکال سکتے تھے۔“

”ایک دن بیاد۔ دو دن بیاد۔ مگر تم تو پتی بے شرم ہو چکی ہو جو صرف لوگ کام کر کے گھروں کو جاتے ہیں۔ اس وقت آپ شکر شکر کام کرنے کے لئے تشریف لاتی ہیں۔ ہر بات کر کے جس اب معاف کیجئے بڑھائی نے بولنا چاہا، غصہ پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی آواز رک گئی۔ اس نے سر اٹھ بھری اور اس کے تمام جذبات آشوب میں تبدیل ہو کر اسکی جگہوں پر اس طرح لرزنے لگے، جی طرح چاند کے تریب گزرتے ہوئے گیس جیاد بادل کا کوئی گوشہ روشن ہو جائے۔“  
 دو چار اور باتیں کر کے فیض صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اب دکان میں سوائے کریم کے اور کوئی بھی نہ تھا۔ دو تین منٹ وہ گم سم پتھر کی مورتی بنی بیٹھی رہی۔ اسکی نگاہوں کے سامنے خفا میں تاریکی کے بادل نڈھالتے پہنچے۔ نہ معلوم وہ کب تک اس طرح بیٹھی رہتی کہ منیہ نے اس کے ہاتھ میں چھو کر اس کے ہاتھ کے منہ دیکھنے۔ یہ بڑھائی کی کئی ماںوں کی کئی دنوں کی باتیں تھیں۔

آج سے دو سال قبل بڑھائی نے آرام اور چین کے ساتھ زندگی بسر کر رہی تھی۔ یکایک اس کا وفادار رفیق حیات جس نے بیس سال تک اس کی زندگی کا ساتھ دیا تھا، چند ہفتے گزار کر علی بسا کریم کی دنیا اندھیرے میں ڈھب گئی۔ مگر اس اندھیرے میں بھی روشنی کی ایک لہر نمودار تھی، اور یہ روشنی کی لہر اس کا چہرہ سالہا سالہا۔ ماں کی تمام دنیا سمٹ مٹا کر بیٹے کے رعبہ میں سما گئی تھی۔ بیٹا بھی، شوہر کی وفات کے بعد اسکی تمام امیدیں کا مرکز، اسکی تمام سرگرمیوں کا سرچشمہ تھا۔ ریاض میں اسکی تاریک دنیا کو روشن کر دیا تھا۔ ریاض ہی کے دم سے وہ زندہ تھی — زندہ رہنے کی آرزو مند تھی۔ مگر قسمت نے دوبارہ حملہ کیا۔ اور یہ حملہ پہلے حملے سے زیادہ شدید پایا۔ بے رحمانہ اور زیادہ تباہ کن تھا۔ اسکا نوچ ان بیٹا — سلسل زبلا ہمار وہ کر دیا سے رخصت ہو گیا۔ گھر میں جو کچھ تھا تھا، وہ بیٹا کی بیاہی ہو چکا تھا۔ اور جب بیٹے نے دنیا سے منہ موڑا تو گھر میں لوگ پیہ پیہ بھی نہ بچا۔



کریست پیچھے چھوڑ چکی تھی۔ تاحدی دورانہ سے کسپا میں لگا جھانک دم  
 لگ گئی۔ اب اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے گھر سے بیٹھ جائے گا تو اسے  
 وہ دورانہ کی وجہ سے پشت لگا کر کھڑی ہوگئی۔ اس سے چند فٹوں کے  
 فاصلے پر کھڑی شخص اپنے لڑکے کی انگلی پکڑنے لگے۔ اس کے سامنے ہوا تھا  
 پتھر دیکھتے ہی اسکی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ حالانکہ وہ کبھی نہیں  
 ایک سایہ سار کے سامنے پھر تار رہا۔ پھر جانوں طرف توجہ کی تار کی  
 .... اب اس کے دل میں سوائے ایک کچھ کے اور کئی نہیں رہتا۔ یہ  
 دیکھتا تھا کہ زمین پر دم پیر کر چھ رہا تھا۔ ایک اور  
 بد نصیب روح۔

بد نصیب پرہ کا دل ہے اختیار چاہتا تھا کہ زخمی کئے گئے کو اپنے  
 پیچھے سے لگائے۔ اپنے پیچھے سے لگا کر خوب دھمکے۔ بے قرار کھنڈ  
 بارش میں بیگناہ ہو اگلیں چلا گیا، اس کے جانے کے بعد جیسے کہ سر پر پڑ گیا  
 کی سی آواز ہونے لگی۔ اس نے اوپر دیکھا۔ ایک نسا ستر پر پڑ گیا  
 تھا۔ بارش اور تار کی نے اسے گھونٹے اندر کھینچ لیا تھا۔ ایک  
 اور بد نصیب روح۔  
 چند منٹ تک بڑھیا سر جھکا کر کھڑی رہی۔ پھر اس کے قریب  
 ہی سے آواز آئی۔

”کوئی ہے خدا کا بندہ؟“  
 بڑھیا نے اپنی داہنی جانب دیکھا۔ پانی میں غرق ایک فقیر  
 آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔  
 ”ہاں بابا؟“ بڑھیا نے اسکی لائیں پر ہاتھ رکھتے جھستے کہا۔  
 ”یکو سنا دورانہ ہے بھائی؟“  
 ”قادری دورانہ؟“  
 ”قادری — دور — رازہ؟“ فقیر نے حیرت و حیرت کے  
 لے چلے بے میں کہا۔

”تم کہاں جاؤ گے بابا؟“  
 ”جو کہ ریم بخش میں ملتی ہیں اس کے خور کے پاس سو رہا ہوں۔“  
 ”میں نے جانوں گی جہیں بابا؟“  
 ”آپ — مانی؟“ بڑھیا نے حیرت ہو کر کہا۔ پھر کچھ بے نیکی  
 لوگ دنیا میں موجود نہ ہوں تو ہم مر جائیں۔ اتنی سرودی خد پھر بارش  
 تو ہے! آج صبح بھی کوئی نہیں ملے۔ قاصد مات قاصد ہی گئے گی  
 اچھا رب الگ ہے۔ اسی نے یہ ایک چھوٹا سا دیکھا۔ وہی مانی کے  
 سار بڑھیا کی بھی تھیں۔ پشانی کے لیے دیکھنے لگا۔

ساری تک تو زخم نصیب پرہ گھر کے برتن و خیمہ پر پڑ کر گناہ کر گئی تھی  
 اور پھر بالکل محتاج ہو کر شیخ صاحب کے بیان فارم ہو گئی۔ اسی طرح  
 بیوہ کے مانی دن گزرتے گئے۔ کریں نے انتہائی کوشش کی کہ اس کے  
 فرائض میں اذیت نہ کرنا ہی نہ ہو۔ مگر بوڑھے بازو دشمن نہیں بن سکتے تھے  
 شیخ صاحب کبھی کسی اسے جھڑکنے لگے۔ اور یکا یک ایک دن یہ حال  
 جھڑک سے آگے نکل کر گالی گورے لگ جائیگا۔ بات یہ ہوئی کہ لکھنا ہنس  
 اپنا مکان پر کچھ کھیل چلے گئے۔ اور جاتی وہ اپنی نوکرانی کو جواب دے دیا  
 ان کی نوکرانی ناگوار اپنے غم میں جانے سے پہلے دو ایک دن کے لئے  
 شیخ صاحب کے ہاں کام کرنے غمگین تھی۔ شیخ صاحب کو قند کا کام بہت  
 پسند تھا۔ کیونکہ وہ زجران تھی۔ بات کرنے کا طریقہ جانتی تھی، اور کام بھی  
 نہایت احتیاط سے کرتی تھی۔ اور یہ بیوہ بھی کر دہوڑھی اور ہار  
 مینے کریں سے تنہائی میں کہہ دیا تھا۔ ”شیخ صاحب ناگوار کو اپنے لپکا  
 رکھنا چاہتے ہیں۔ — سمجھ لیا نا۔ — بات ہے؟“

کریں نے سب کچھ سنا سب کچھ سمجھا۔ پھر بھی وہ کام کرتی رہی۔  
 آخر کام نہ کرتی تو بیٹ کہاں سے ہوتی۔ مگر دو تین دن سے وہ صحت جیا  
 یعنی اس لئے وقت کی پابندی نہیں کر سکتی تھی اور اس کا نتیجہ —  
 آج وہ گھٹ کھال دی گئی۔

آج اس کی زندگی کا آخری سہارا بھی اس سے چھین چکا تھا۔  
 زندگی کی آخری امید بھی ٹوٹ چکی تھی۔ وہ سرخے چوتھے پر اپنا پاؤں  
 رکھے چند منٹ کھڑی رہی۔ پھر آگے چلے گئی۔ اس کا دل بے اختیار  
 چاہتا تھا کہ تنہائی میں جا کر اتنا روئے — اتنا روئے کہ اس کی  
 زندگی آنسوؤں میں بہ جائے۔ وہ نے کا خیال آتے ہی اس کی ٹہرودہ  
 آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔ اس نے بھی پرانی قمیص کے دامن سے  
 آنسو پونچھ بے کسی کے عالم میں آسمان کی طرف دیکھا۔ اڑا آگے بڑھنے  
 لگی۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ اور فضا میں بادل ساپنوں کی طرح ہل  
 رہے تھے۔ سردی اور تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ تمام کائنات کسی تاریک  
 غار میں جا رہی تھی۔ بیوہ کو پہلے بھی اپنی قبر میں کاشد یہ احساس تھا مگر  
 اب تو وہ خود کو دنیا کے بد نصیب ترین بستی سمجھ رہی تھی۔ بارش جو نہنگی  
 قیاسی کپڑوں میں بیویوں لوگ گھبرا گھبرا کر تانے والوں کو آؤں دینے لگے  
 کریں چلی جا رہی تھی۔ بارش اور سردی کی شدت سے بے نیاز چلی جا رہی  
 تھی۔ یہ خود ہی کے عالم میں اسے یہ بھی احساس نہ ہوا کہ وہ کہاں جا رہی ہو  
 اور کہاں پہنچے گی ہے۔ اس کی کہہ رہی جو کہ ریم بخش میں تھی مگر کچھ



# نقد و نظر

بہت حد تک کامیاب ہیں۔  
 ضیاء صاحب جو کہہ رہے ہیں وہ دلی غلوں کے ساتھ محسوس ہو کر کہتے ہیں۔  
 اسی لئے ان کا کلام تاریکی پر ہیٹ اثر ڈالتا ہے۔ بعض شخص ارٹا  
 فرماتے رہے۔

محل میں اور کوئی نہیں اپنا بازو  
 بسوز آگ دیا ہے سو وہ بھی بجھا چکا

اب جن میں بہار کیوں آئے  
 اب نہ بجلی ہے اللہ نہ ہے شیلہ

مکن نہیں کہ حسن نے عشق سے  
 وہ سامنے تو آئیں ذرا گفتگو کریں

ان کو بھی روزِ ندی ہوئی دنیا پل گئی  
 کلیاں سے کہ کھلی تھیں شہت تابیں

(۱۲)

حکومت نسواں :- حضرت جان سٹوٹ لی، شاعر  
 محمد الدین صاحب انصاری صفحات ۲۴ کتابت و طباعت جاذب  
 قیمت ایک روپیہ لے گا تہ جامعہ فید دہلی

حکومت نسواں :- انگلستان کے مشہور شاعر جان سٹوٹ لی

وہ مشہور آفاق کتاب ہے جس نے شائع ہوتے ہی لوگوں کے دہن پر

ایک انقلاب پیدا کیا تھا۔ لی اس امر کا قائل ہے کہ موشی سلاخ

بھی صورت پر قیمت نہیں دیکھتا اگر موشی چند ایسی..... خصوصیت

موجود ہیں، یہی کی جاوے صورت سے لائق ہے کہ اس میں بھی شے

ایسی خوبیاں ہیں جو اسے محض کے مقابل میں تو ایک نئی چیز ہے کتاب

چار اہمیت پر مشتمل ہے۔ اور اس میں بھی وہی وہی ہے عشق و

دیگر صورت کی نوعیت کو اس کے مقابل میں تو ایک نئی چیز ہے کتاب

اسلام میں غلامی کی حقیقت اور نئے مسیحیہ انداز ایم اے  
 کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ صفحات ۲۶۲۔ سائز کاغذ قیمت نمونہ  
 دو روپے آٹھ آنے قیمت نمونہ شہری میں روپے۔ لے گا تہ۔

ندوۃ المصنفین دہلی

یہ جاری ہیست بڑی خوش قسمتی ہے کہ اب ہمارے علماء و دانشور  
 و کتب کے مطابق مغربی علوم کی طرف بھی توجہ دے رہے ہیں۔ اور اس سے  
 پیشتر تو علوم مذہبیہ کی تحصیل ہی میں تمام مہموت کردی جاتی تھی۔ اور ہمارے  
 علماء کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ موجودہ دور میں دنیا کس منزل پر جا رہی  
 ہے۔ اور سیاسی معاملات کا کیا رنگ ہے۔ ہر ان کے محترم اثر و رسوخ کا  
 کہ فاضل موعظ جہاں فاضل دیوبند میں دہاں مغربی علوم کے بھی بھر عالم  
 چنانچہ ان کی یہ تالیفات نہایت کامیاب اور جامع ہے: فاضل موعظ  
 نے سب سے پہلے غلامی کی حقیقت، اسکے نفسیاتی، اخلاقی اور اقتصادی پہلوؤں  
 پر مدلل و اسے چوستے یہ بتایا ہے کہ دنیا میں غلامی کا آغاز کب ہوا؟ ملک  
 اقوام کا اس میں کس حد تک کیا گیا رنگ اختیار کیا۔ اس کے بعد اس نے  
 کو لیا ہے۔ میں اسلام میں غلامی کی حقیقت، اس کے پس میں قرآن مجید کی  
 روشنی میں غلامی پر بحث کی ہے۔ کتاب کا ادھر حصہ بہت اہم ہے جہاں اسلام  
 اور مسیحیت کا فرق بتاتے ہوئے بعض اعتراضات کا رد میں مکن جواب دیا ہے  
 ان میں کتاب نہایت مفید اور جامع ہے۔ جتنا موضوع اہم ہے اتنی ہی  
 کتاب کامیاب ہے۔ (۱۱م)

ضیاء کے سر مشعر :- حضرت ضیاء فتح آبادی ایم اے۔ صفحات ۳۳  
 کتابت و طباعت خوشگوار۔ لے گا تہ۔ گنبد لعل سونی، موبن بلا رنگ نزد  
 لاہور رنگ دہلی۔

اردو میں متعدد شعرا کے منتخب اشعار کے چھپنے چھوٹے مجرے  
 شائع ہو چکے ہیں۔ چنانچہ یہ مجرہ اردو کے خوشگوار شاعر ضیاء فتح آبادی  
 کے سب سے بڑے اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر شخص کی زبان  
 جانے بولتا ہے مگر بعض اشعار ایسے بھی ہوتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ  
 لکھ کر خالق کہتے ہیں۔ اس مجرے کے فاضل موعظ بھی اس میں





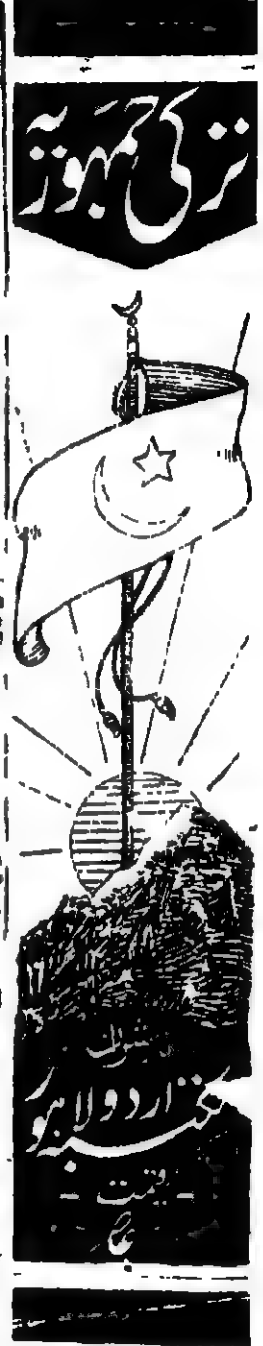


# حاجی قلیق کے افسانے



پاکستان اردو و سہ لاہور

حاجی قلیق ملک کے مشہور مزاح نگار حاجی قلیق کے بہترین مزاحیہ مضامین کا مجموعہ  
 کے افسانے جس کے پڑھنے سے آپ کا دل کشت زعفران بن جائیگا +  
 A9 12 حاجی قلیق



ترکی جمہوریہ میں ترکی کی مختلف ترقیات کا حال نہایت پذیرہ دہی میں بیان کیا گیا ہے ترکی غدا  
 سے پہلے کی خفا کے بعد کون کون سے میں یہ انقلاب پیدا ہوا ترکی کے تعلق متعلقہ نو، باورین  
 معداں میں رہنے کیلئے یہ کتاب ضروری ہے۔ یہ ضمیمہ: دانشی ملاحظہ دو و س

۱۹۳۷

Regd. L. No. 3521

پیشانی طاعت و تقویٰ و انوار حق

۱۳۹۷

۱۳۹۷

# ادب و طریقت

ایزید

برکت علی

۳/۸- مالہ چندہ

۱/۴- فی ۱۴ چہ

دارالاشاعہ

مکتبہ اردو ۱۵ سرکار روڈ لاہور

1

1

1

1

1

1

1

1

1

1



# ادب لطیف کا عظیم انظر سالنامہ

دسمبر کے پہلے ہفتے میں شائع ہو رہا ہے  
ذیل کے مایہ ناز ادباء و شعرا سالنامہ کی تعمیر میں حصہ لے رہے ہیں

مقالہ نویس :-

عبد الرحیم شبلی بی کام، مولانا انہار اترتہری، سید بادشاہ حسین، ماہر القادری، خلیق ابراہیم، سید راحت مولائی، پروفیسر اختر، ارباب

جمیل احمد کبند، پٹواری، عطا اللہ پالوی، عبد الرشید

افسانہ نویس :- ڈاکٹر امان گنگا

حکیم احمد شجاع، پروفیسر علی عباس حسینی، کرشن چندر، اجندر سنگھ بیدی، پروفیسر فیاض محمود، اوپندر ناتھ اشک، مسٹر عبد اللہ  
مسٹر حجاب الدین، علی، اختر انصاری، شاکر علی، صادق انجری، ناکارہ جیدر آبادی، فیضی جالندھری، شفیق الرحمن، سعادت حسن  
مسعود جوادید، احمد ندیم قاسمی، انجیلو، احسان بی اے، انور کمال، علی احمد، عزیز احمد، عطا چشتی، حاجی قیصر، شمس مظفر، پوری، رانا  
محمہ نجمہ، افسر راہ پوری، سراج الدین احمد نظامی،

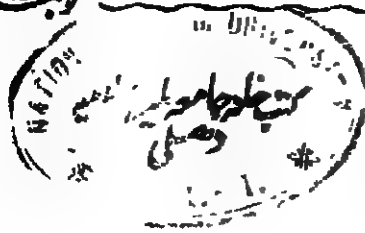
شعراء :-

ابن حزیں (سیالکوٹی)، اثر صہبائی، احسان دانش، حافظ جلیل، روش صدیقی، سیاب اکبر آبادی، اعجاز صدیقی، مقبول حسین،  
سراج الدین ظفر، احمد ندیم قاسمی، انجیلو، خندان (مرحوم)، حکیم آزاد انصاری، ضیاء فتح آبادی، بہزاد کھنوی، پروفیسر فراق گورگیر،  
رازی تروانی، حفیظ ہوشیار پوری، ان کے علاوہ امید ہے، مندرجہ ذیل حضرات بھی سالنامے میں شریک ہونگے :-

سید امتیاز علی تاج، سید انصاری، محترمہ عصمت چغتائی، فضل حق قریشی، پروفیسر نصیلا لال۔

میلنجر





# شذرات

لیڈیف کا سالنامہ۔

وہ چہ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، نومبر کی طرح ہے، اس کے بعد  
چلے جھٹے ہیں جو چہ شائع ہو گا وہ آپ لطیف کا عدم منتظر سال کا ہو گا۔  
وہ انہی مقالوں بنائیت، لاؤنر نظموں اور کامیاب ترین افسانوں میں سے ہو گا۔  
ہم سالنامے کے متعلق ابھی کچھ کتنا نہیں چاہتے مگر اس بات کا  
میں ضرور دلاتے ہیں کہ آپ اس خاص نمبر کو پہلے نظر انداز کر چوسے بہترین دیکھیں گے  
اس دفعہ ہم خاص طور پر کوشش کر رہے ہیں کہ سالنامے میں ایسا  
کچھ ہو جسے صحیح معنوں میں ترقی پسندانہ رجحانات کا سال کہا جاسکے۔  
بہندوں میں اس وقت بھوک اور سیاسی غلامی نے زندگی کو ایک رستا  
نہ بنادیا ہے۔ اس لئے اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ مروجہ دور میں ایسا  
کچھ نہ لیا جائے جس میں اس رستے چھوٹے رقم کی تمام کرب آفرینیاں نمایاں  
ہوں۔ ہندی پنکاس کو ملک کی بد نصیبی، مذلت کا پھل پودا احساس ہو جائے۔  
عسکریات ہندوستانیوں کے دل میں سیاسی غلامی کی معنوں کا آتشیں احساس پیدا  
نہیں ہوتا۔ اور جب تک لوگوں کے سینے میں انقلابی روح شرب بار نہیں ہوتی اس  
وقت تک یہ رقم کی پنکاسہ آرائی، جہد جہد، تنگ و دوپٹوں کے کھیل سے زیادہ وقت  
انہیں نہیں لے سکتا۔ ایک آتشیں شعلہ ہار اور۔ دل و دماغ پر چھا جائے والا احساس۔  
ایک ہی کی ہمارے کچھ کھلے سینوں، اندر وہ دلوں اور ہوش کی طرح ٹھنڈی  
نہ ہوں وہ ضرورت ہے یہ احساس اگر آج پیدا ہو جائے تو آج ہی غلامی کی خبریں  
انہیں نہیں۔

ادوارہ جنگ کا اثر کا غلبہ۔

آج کل بہترین ہیت کی خود غرضی و مطلب برآی اور نازیہیت و فاشیت کی  
تہ اور اس طرح ہیت کے باعث جس نوعیت جنگ کا آغاز ہو رہا ہے، اسے جہاں  
دیکھنا، یا بت زندگی پر اثر ڈالے گا وہاں کا فذ کے بساؤ کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں چھوڑ  
نہیگا۔ زندگی کا تاریکی کی وجہ سے انہماکات و مسائل جو پہلے ہی لوگوں کی سرچر میں  
تھے، ان میں مشکل اپنی زندگی قائم کئے ہوئے تھے ایک نئی مصیبت کا سالنا کر رہے ہیں  
انہیں تہ تم دیکھ رہے ہیں کہ انہماکات و مسائل کی دنیا میں قطع و برید کا عمل جاری  
ہے۔ اس لئے موجودہ حالات میں ہر ملک کا فرض ہے کہ وہ ملٹی اور اولیادہ رسائی  
وہیاد کی ہر ایک ہو سکے۔ بہت افزائی کریں تاکہ ہر ایک ادب و محافت تمام گراں  
دروال کا تحلیہ کر کے اپنے صفوں میں فراغت ادا کرتا رہے۔

ادب ہماری زندگی کا آئینہ ہے۔ اور صحافت سیاسی حالات کا نقہ امیز  
اگر ادب مجروح ہو جائے تو قوم، ملک کی دواہیات خطرے میں پڑ جائیں گی۔ اور اگر  
صحافت کے رستے میں دو کوئی پیدا ہو جائیں۔ تو سیاست پر چہرے کیسے لگیں گے  
بہیں اس سے قارئین اس امر کی طرف بہت جلد توجہ کریں گے۔  
ایک سالانہ نمبر اپنے قارئین سے۔

ہر وہ جب ہم ڈاک، بیٹے ہیں تو کم از کم ایسے تین چار خطوط ضرور مل  
تے ہیں جن میں یہ شکایت ہوتی ہے ابھی تک تازہ نمبر تو کجا گزشتہ دو ماہ کے کچھ  
بھی نہیں پہنچے۔

اول تو یہ بات، لیجئے کہ جب ان خطرات کی خدمت میں گزشتہ دو ماہ کے  
پرچے نہیں پہنچے تھے تو انہوں نے اس وقت اطلاع کیوں نہ دی تھی۔ دوسری بات  
یہ ہے کہ ان کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ منیجر صاحب نے ان کی خدمت میں پرچے  
باقاعدگی کے ساتھ نہیں بھیجے، اس قسم کی شکایتوں کا ازالہ کرنے کے لئے ڈاک میں ہم  
آجائے۔ ہر وہ متعدد پرچے صحت اس شکایت کو رفع کرنے کے لئے بھیجے جائے  
ہیں۔ پھر یہی دیکھتے ہیں کہ شکایت ابھی حل نہیں ہو رہی ہے۔

ہم ان حضرات کی خدمت میں عرض کر چکے کہ جب ان کی خدمت میں  
کسی ماہ کا پرچہ نہ پہنچے تو کارڈ لکھا کہ منیجر صاحب کو اس امر سے مطلع کریں، وہ تین  
ماہ گزرنے کے بعد ان کی شکایت بے جا شکایت ہے اور دفتر ان کے ارشاد

کی تعمیل سے قاضی ہو گیا۔

مکتبہ رڈ کی علی سرگرمیاں۔  
پروفیسر علی عباس حسینی کی کتاب باسی بھول کی جلد بندی ہو رہی ہے  
چند روز میں کتاب تکمیل ہو کر مارکیٹ میں آجائے گی۔ باری طبع کی کتاب۔۔۔  
کیونٹ مٹی فیلو کی طباعت ہو رہی ہے جو اس وقت تک مکمل ہو جائے گی۔

گوہال مش کے افانوں کا مجموعہ فیصلہ شدہ کتنے بھی طباعت کی منزل پر  
پہنچ چکا ہے۔ وہ اسی ہفتہ میں مکمل ہو جائے گا۔

خیل جبریل خلیل کے احسانوں کا مجموعہ سرکش رو میں (سرپرست خطبہ شتی)  
کتابت کی منزل پر گور رہا ہے۔

حکیم احمد شجاع کی دو کتابوں احسن کی قیمت اور دیگر افسانے ان باب کا  
گناہ کی بھی کتابت ہو رہی ہے۔ ان کے علاوہ مسٹر عبد اللہ ملک کی کتاب۔۔۔





# ہماری زبان

دنیائیں وہ مہابی حاصل کرنے کے لئے عمل کی ضرورت سمجھ کر صرف باتوں سے کام نہیں لیتا۔ ہمارے وہ روزانہ حضرات کو یا تو اس نظریے کی صداقت میں شک ہے یا پھر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو کی جڑیں اس قدر مضبوط ہو چکی ہیں کہ اب اس کی ترقی و اشاعت کے لئے کسی عمل کے مرتبہ میں ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں رہی باقی وہ اپنی تفریح کا سامان ہیں۔ اور ہندی تو از حد امت کو دیکھئے۔ وہ باقی تو کم کرتے ہیں بلکہ کرتے ہی نہیں مگر چپ چاپ کام کرتے رہتے ہیں۔ ہندی اسی چپ چاپ کام کرنے کا نتیجہ ہے کہ ملک کے ہر گوشے میں ہندی کی نشر و اشاعت نہایت منظم طور پر ہو رہی ہے۔ بالکل جیسی متحدہ قومیت کی صلہ و ارجاعت جس کا لفظ اب اعلیٰ میں یہ ہے کہ ملک میں انکلو پیڈیا کے آواز ہی کی جگہ لڑنے اردو ہندی قلمی کے سلسلے میں خاموشی کے ساتھ ایسے کام کر رہی ہے کہ معمولی سمجھ کا انسان بھی ان پر اظہارِ حیرت کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کانگریسیوں اور قوں میں ذمہ وار سبکیاں اردو کو نسبت و ثابوت و کثرت کے لئے جو سبب ذرائع کام میں لا رہا ہے اس کا اثر اس کے اقتدار اعلیٰ کا یہ حال ہے۔ کہ ملک ملک و دم نہ کشیدم۔ ذیل میں ڈاکٹر کے ایک نہایت نور و ارکان کی ذہنیت آشکار کی جاتی ہے۔

”مشرعہ و نائند وزیر تعلیم نوپنی، کا نام ہندی، ہندوئی اور دیگر کے سلسلہ میں اتنا مشہور ہو چکا ہے کہ اب جہاں کہیں بھی زبان سے متعلق وزیر صاحب صوف کے ارشاد است گما کی خبر آتی ہے تو لوگ بہت تن گوش ہو جاتے ہیں۔ چند وہی میں ہندی لٹریچر کی انفرس کا اقتراح کرتے ہوئے وزیر صاحب تعلیمات صوبہ متحدہ نے تولی زبان کے متعلق فرمایا کہ ہندوستان کی قومی زبان ہونے کا شرف اسی قدر قومی زبان ہے۔

”مشرعہ و نائند وزیر تعلیم نوپنی، کا نام ہندی، ہندوئی اور دیگر کے سلسلہ میں اتنا مشہور ہو چکا ہے کہ اب جہاں کہیں بھی زبان سے متعلق وزیر صاحب صوف کے ارشاد است گما کی خبر آتی ہے تو لوگ بہت تن گوش ہو جاتے ہیں۔ چند وہی میں ہندی لٹریچر کی انفرس کا اقتراح کرتے ہوئے وزیر صاحب تعلیمات صوبہ متحدہ نے تولی زبان کے متعلق فرمایا کہ ہندوستان کی قومی زبان ہونے کا شرف اسی قدر قومی زبان ہے۔

ہندوستانی قوم کی اصطلاحیں درج ذیل شکل میں ہیں۔

ہمیں بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ ہندی تو اسی اعلیٰ صوبہ میں جو رہی ہے جہاں کی زبان کو ہندوئی کی تعریف مرتب کرتے معیار قرار دیا ہے۔

مختار اور اس کے وہم و آواز کا اثر کی حکومت کے ارکان میں۔ جس کے نمائندہ۔ نے تعریف مرتب کر کے خوشی خوشی اس پر رات بھر گئے تھے۔

جیسا کہ تاریخین کو معلوم ہے۔ دسمبر کا چھ سالہ نامہ ہے۔ خاص ایزر ہمیشہ ڈاک میں گم ہو جاتے ہیں۔ اسلئے اطلاع لکھا جاتا ہے۔ حضرات اپنا سالانہ بحفاظت وصول کرنا چاہتے ہیں۔ وہ موزی سونے کے تحت جبری کے لئے بھیج دیں۔ اس صورت میں رسالہ کے گم ہونے کا ہر احتمال نہیں۔

جو خیردار سالانہ ۱۲۰۰ کے بجائے سالانہ ۱۳۰۰ کے بھیجے ہیں انہیں مطلع کیا جاتا ہے۔ سالانہ سنگمہ بر دسمبر ۱۳۰۰ کے پہلے ہفتے میں شائع ہو رہا ہے انہیں قیٹا ہے لگا سٹے انہیں دفتر کو جلد از جلد مطلع کر دینا چاہیے۔ کہ سالانہ سنگمہ انہیں دی۔ پی کے ذریعے بھیجا جائے یا وہ خود ایک دسمبر بند ہی آؤ بھیج دیں تاکہ پرچہ شائع ہونے ہی انہیں ارسال کر دیا جائے۔

## ضمیمہ

جیسا کہ تاریخین کو معلوم ہے۔ دسمبر کا چھ سالہ نامہ ہے۔ خاص ایزر ہمیشہ ڈاک میں گم ہو جاتے ہیں۔ اسلئے اطلاع لکھا جاتا ہے۔ حضرات اپنا سالانہ بحفاظت وصول کرنا چاہتے ہیں۔ وہ موزی سونے کے تحت جبری کے لئے بھیج دیں۔ اس صورت میں رسالہ کے گم ہونے کا ہر احتمال نہیں۔

جو خیردار سالانہ ۱۲۰۰ کے بجائے سالانہ ۱۳۰۰ کے بھیجے ہیں انہیں مطلع کیا جاتا ہے۔ سالانہ سنگمہ بر دسمبر ۱۳۰۰ کے پہلے ہفتے میں شائع ہو رہا ہے انہیں قیٹا ہے لگا سٹے انہیں دفتر کو جلد از جلد مطلع کر دینا چاہیے۔ کہ سالانہ سنگمہ انہیں دی۔ پی کے ذریعے بھیجا جائے یا وہ خود ایک دسمبر بند ہی آؤ بھیج دیں تاکہ پرچہ شائع ہونے ہی انہیں ارسال کر دیا جائے۔

# سرگذشت

(”ذکر و فکر“ کا ایک ورق)

ہم نے کتنی ہی ٹھوکیں کھائیں جب کہیں راہِ راست پر آئے  
تھا نہ اک بھی نشان منزل کا گو ہزاروں نشان نظر آئے  
میکدے میں کبھی رہے بدست کبھی کعبے میں سجدہ کر آئے  
کوچہ عقل میں پھر برسوں بے خبرواں سے بھی مگر آئے  
بارہا نفتِ دین و ایماں کو مہجبینوں کی نذر کر آئے  
تاگہاں پڑ گئی نظر دل پر دل میں وہ جلوہ گر نظر آئے

رات دن ان کی دید رہتی ہے

اب تو ہر روز عید رہتی ہے

---

احمد یحیٰ قاسمی

## اخستلافات

شفیق کے پردوں سے تھر تھرتے ہوئے ستارے ابھر رہے ہیں  
 اُجڑے بستر کوں سے ہوئے ہوئے تھکے مسافر گزور رہے ہیں  
 ادھر وہ پورے بکے پرتوں سے دھوئیں کا بادل اُبل پڑا ہے  
 ادھر یہ سویا ہوا مہیا نڈی کنارے محپل پڑا ہے  
 ادھر وہ بیمار چاند نے اپنے سینے کی کھڑا تار ڈالے  
 ادھر یہ قزاق جنگلوں میں نکل گئے لالچسبیل سنبھالے  
 بدل گئے زندگی کے نقشے، کوئی مٹا، کوئی بن رہا ہے  
 کوئی لحد میں پڑا ہے خاموش، کوئی محلوں میں تن رہا ہے  
 کوئی کہ اپنا خالی کسکول دیکھ کر دم بہ خود کھٹڑا ہے  
 کسی کے قدموں میں سونے چاندی کا ایک انبار سا پڑا ہے  
 کسی کے بچے ہلکے رہے ہیں کہ رہ گیا ان کا پیٹ خالی  
 کسی کے ننھوں کے ہونٹ تر ہیں، تو جھملائی ہے منہ پہ لالی  
 کہیں نکلتی ہیں دل سے بیوہ کے بچکیوں کی دبی صدائیں  
 کہیں رنگا میں یہ کہہ رہی ہیں کہ آؤ بل جھل کے مسکرائیں  
 ادھر وہ دیوار کے سہارے سے سو گئے پہرہ دینے والے  
 ادھر یہ چوروں نے چپکے چپکے گھر میں ہیں راستے نکالے  
 میں اپنی حسرت کا خون کر کے بھگتا چھبڑا ہوں جنگلوں میں  
 وہ میرے سخاوتنا چہرے پھر رہے ہیں سرسبز وادیوں میں  
 خدا کی یہ کائنات قائم ہے اخستلافات سے صبر و جوی  
 کبھی تو پھوٹے گا چشمہ نور، دکھ بھری رات سے صبر و جوی

(قسط دوم)

# صحرا اور دے خطوط پر ایک نظر

ہو ہے

اویس کی زمیں ڈالی سینے۔

”اس کے بعد میں خود کو نئی دنیا میں محسوس کرنے لگا، میرے اندر وہ  
اثر صحت و بہت کے حسین اور شہتوں میں لپٹے ہوئے تصور انگ انگین و  
مسطر ہو گئے، اور میری یاس و محسوسات میں طبعی کی ساوہ جمیل کے یا ہمیں دلوں  
سے پر نور و شندوں۔ میری تمام کائنات بہت ہلکا کر کے چل  
دلوں میں محدود ہو گئی، اور میرے خیالات ہر چیز سے ہٹ کر صرف اپنے  
کے گرد گھومنے لگے۔ راتوں کو میں سرسوں میں ڈوبا رہتا، اور دن کو ان  
سرسوں کے خیال میں غرق، آہ! یہ زندگی کی یہی عجیب و غریب غریبوں  
کی زمینوں میں تیرتی ہوئی، ٹھنڈی گہوارے میں جھوکتی ہوئی، اور  
مسرتوں کی لہروں میں چلتی ہوئی، خوش نصیب زندگی!“

شہاب الدین کے اشعار میں روحانیت کے ساتھ ساتھ ایک اور ایک  
غش، ایک بے تابی کی بھی ہمیشہ ہے جس کے ہونے یا نہ ہونے پر بہت کچھ  
کما جا سکتا ہے۔ مگر اذیت کے عشق و محبت میں وہی چیز ہے جو ہمارے تجربہ  
اور مشاہدے میں آئے دن آتی رہتی ہے۔ اور جس سے ہم کسی طرح ناناوس نہیں  
اویس یاس پرست فطرت کا قابل نہیں، وہ اپنی قورین انسان ہیں۔ ان کی  
دن نگاریوں میں غم و الم کا پہلو اتنا نمایاں نہیں، جتنا مسرت و بہت کا۔  
و مسرت و بہت حیثیت سے جہاں مسرت و بہت اساطیر کی جگہ لیتی ہے۔  
و اس سے نہیں کما جا سکتا، کہ غم و الم کی دل گذاریاں نظر انداز کر بیٹے ہیں۔  
ان کے انسانوں میں انسانی جذبات کی ایک ناقابل بیان مصدقہ پھاؤں  
ہوتی ہے۔ وہ کسی دوسری پیاپی بن جاتے ہیں، کبھی جزیرے ہوئے ہمارے سلسلے  
آتے ہیں کبھی بہت میں تن امن، امن سب کچھ تجھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کبھی  
محبوب کی مصروف اور کبھی کبھار خوشبوؤں سے لہریزا خوشی میں ہمیشہ کے لہاسو  
جانا چاہتے ہیں، اور کبھی اس کے گرم شیریں شمس کے گلے لگے ہوئے دل میں شمس  
کی نیند کے مڑے۔ یہ لہتے ہیں، ہر جگہ رحمان پرست، رومان فیروز، رومان  
نور اور صبح معنوں میں رومان نگار ہیں۔ ان کے جذبات حوصلہ مندوں ہیں  
ان کی محبت نڈر اور دلیر ہوتی ہے۔ وہ محبت کے لئے حسن اور کثرت ضروری  
نہتے ہیں، وہ فیروز شمس کے محبت نہیں کر سکتے، ایک بد شکل و بد مزہ کی چیز

اویس ہمدردی اس وقت ہوتی ہے جب کسی زمین خیال کو کسی زمین  
طرز سے اور کیا جانے محسوس زمین خیال، محسوس زمین ریان کل روحانیت کی کمی  
بہی تحقیق نہیں کر سکتے۔

انسانی فطرت کچھ اس طرح واقع ہوتی ہے کہ جذبہ بلذت کی حقیقت کو بار  
بار محسوس کرنے پر بھی ہمدردی و دماغ کوئی نکان محسوس نہیں کرتا احساس جس  
تہہ تعلیم زمانہ اور جتنی مختلف نسلوں سے گزرتا ہوا ہم کبھی ناچھلنا ہی نہیں سکتی  
ہے۔ مثلاً اگر کہہ سکتے ہیں۔ تازہ اور جدید تحقیق ہمارے لئے مکمل کی بات ہوتی ہے  
روحانی و علم و مختلف بلا سبب ہیں۔ علمی حقیقت صرف ایک دماغ  
ہماری جاتی ہے، اور دماغی خیال ہر مرتبہ نیا معلوم ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جو مصنف  
اپنی کسی چیز کو ہمیشہ کے لئے انسانوں کے دلوں میں روشن اور زندہ جاوید کر کے  
رکھنا چاہتا ہے۔ تو اسے جذبات ہی کا ہمارا ایلمنٹ ہوتا ہے۔ اس لئے ادبیات کا  
خاص انحصار جذبہ پر ہے۔ علمی باتیں کو ثابت کرنا ہوتا ہے اور جذباتی کیفیتیں  
کو تحریک کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جذبات و حقائق تمام انسانوں میں یکساں ہوتے  
ہیں۔ لیکن تصنیف مصنف کی بالکل اپنی ہوتی ہے۔ جذبہ کو اپنا بنا کر سب کا  
خاندانی ہی ہو سکتا ہے۔ یہ چیز فیروز میں اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ ہم  
نورانی، جیسے پلٹ ٹپک کو عقین کر لینے میں ذرا پس و پیش نہیں کرتے۔

فیروز اس کے خطوط میں عشق و جمال کا وہ شدید جذبہ لہریں لیتا نظر آتا ہے۔  
جس کی ادنیٰ سی زد کا شائبہ عالم کے تمام شمس و خاشاک کو چشم زدن میں ملانے  
کر دے۔ ان کے اس مقدس جذبہ کو دو طرح دیکھا جا سکتا ہے۔۔۔ وہ  
”قد بلند، اتنا فرخ ہے، جہاں عشق جتنی کی روحانی یاس تک کی شکلیں  
ہو جاتی ہے۔ ستر کی شاوہ شہاب الدین کہتا ہے۔“

برہمست ایک بندہ جس ایدک انصافی

دو دم ایدر تو تم ایلم تصدیق انگلہ

آملی طویا و شیشی تحسرتا ملی!

برہمست ایک ایک بندہ قافلہ عطر باوگد

میرے وہ دیر و دروہل کا طوطا ہے، میں اپنی روح میں اس کے  
میں کو چھپانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میری صحت کی سانسیں عرفان  
نہتوں کو سونگھتی ہیں، جو اس عطر رخصت سے نکلتی ہے۔ جو دماغ میں لگا





کی دنیا میں جس نے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ نہ سمجھو سمجھا ایک طویل کتاب ہے جس کے صفحے پر بے شمار دریاں کھڑے ہوئے ہیں۔ میری نفس پر بھی نہ سہی کی جائے، جو چتی پتی کا رس چوستا ہے اور اس پر بھی طبیعت یہ نہیں ہوتی، نئے نئے رواں کو چھ رہی ہیں۔ چند دن سے میں انوار کے صحران پر تیار ہوں ہیں اپنے رفیق سفر غاہر ام کے ساتھ، قدرت کی دل آویز پرتوں کو کش فطرت میں گھرا ہوا ہوں۔ اور یہاں اتنی کچھ پی محسوس کر رہا ہوں۔ کہ اس کے عوض شہر کی زندگی جاوہر بھی نہ ہوں۔

کچھ دیر کے بعد ہم قیل کے کنارے پہنچ رہے تھے۔ بلور نیل کی رنگین سدرہ ہاں تھیں، بار بار اٹھ کر ہلکا سا ترنم پیدا کر کے، ساحل پر کھجورے ہوئے گہرا اور وحش میں غور کیا کرتا تھا۔ کے شک نہ کر رہی، چھوٹی چھوٹی ٹہناؤں، ریت اور ٹیٹے کے دووں سے گرا کر اڑا کر واپس جا رہی تھیں۔ ہانکے سینے پر چھوٹی چھوٹی کشتیاں بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھیں۔ ملاحوں کے ترنم رینگتے تو اس سے لفظ انور تھی۔ ایک طرف معبد مسیح کی بلند عمارت، دوسری طرف اس منظر کو دیکھ رہی تھی آسمان کی مشرقی دستوں میں خدائے رحمت کی عظمت و جبروت کہ ساتھ نمودار ہو رہا تھا۔ ہر چیز وہند سکھ، ہروں میں پلٹی ہوئی تھی۔

”ہر طرف انور دور دور پچھلے ہوئے تھی وقتی صحران میں چلتا، شہر میں ٹھہرتے کے کنارے غمزدہ رہتا، کبھی کبھی قافلوں کو سمجھتا، لہو کی کرتے ہوئے دیکھتا، ان کے اونٹوں کی گھنٹوں کی خوش آئند آواز کو سننا، ظہور آفتاب کے وقت ریت کے خلیج البیت خدائے ناک تو وہوں کے غضب میں اسٹیجی آسمان کی نیلیوں ستروں کو سیاہاب لہو میں نہاتے ہوئے دیکھنا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی اداؤں کی کڑواہٹوں کی پیشانی پر محسوس خیر رنگ میں ڈالتے ہوئے محسوس کرنا، عجیب عجیب خوشہ صحران کی داستانوں کو سننا۔۔۔۔۔ آہ۔۔۔ واقعات کچھ مسرت بخش ہیں؟

— کس درجہ دلآویز؟ —

”ایک دن شام کے وقت میں ساحل دریا پر ایک چٹان سے سہارا لگا کر، دریا کی آغوش میں آہستہ آہستہ بہتی ہوئی ایک کشتی کو دیکھ رہا تھا، سیاہی بہت تیز پھیل رہی تھی، آسمان کے گوشہ مغرب میں شفق کی سرخیوں کے

کی تصویر اٹارنا، خاص کر اس وجہ سے آفریادہ قابل توجہ ہے۔ کہ وہ شہری زندگی اس کے شہر و شہب احساس کی دلچسپی کے بھی بہت شوقین ہیں۔ اس خصوصیت میں ان کا یہ مقابلہ ترکی اور یب عبدالحق حاتم ہے جس نے ترکی زبان کو ادبی خیالات کے اظہار کا ایک اعلیٰ وسیلہ بنا دیا ہے۔ عبدالحق حاتم کے یہاں وہ مافوق الفطری جذبہ بھی باقراط ہے جس کا اور تذکرہ کر آیا ہوں۔

ادیب کی حسین منظر نگاری کی تصویریں دیکھئے۔

”میں نے کبھی کبھار دیکھا ہے کیا کچھ محسوس کیا؟ بس یہ سمجھ لو کہ وہ سب کچھ دیکھ کر جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اور وہ سب کچھ محسوس کیا۔ جسے محسوس کرنے کی آواز تھی۔ جہاں پہلے دنگ تھا۔ منظر خوبصورت و مسرت بخش شگفتہ تھے۔ اگرچہ ان کے ساتھ ہی کچھ حوصلہ کش مصائب بھی برپا تھے۔ کڑا پڑے۔ صبح سے شام تک، شام سے صبح تک ہیبت ناک صحران، مگر وہ دل پہاڑوں کو سینہ پر اٹھائے اور یہیت نیو، ریالہا کو پہونے لے جیسی انگلیوں سے سامنے ہے، ہیبت ناک صحران ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کی عظمت و ہیبت نے جسم اختیار کر لیا ہے۔ ہر لمحہ ہر گھڑی، وہ وہ مجھ الحقول اور پیتر آفری واقعات نگاہوں کے سامنے گذرتے ہیں۔ جہاں کبھی الف لیلہ کے ہوش زبا انسانوں میں پڑھنا تھا۔

”ہو اسکے تیز و تند جھوٹے شور مچاتی ہوئی خوفناک آواز کی صورت اختیار کر کے بے بسے و ریتوں سے دیواروں کی طرح کھڑا ہے۔ غصے زندہ رہا، جہاں ایک سفید پارے کے شے کھن میں پلٹی ہوئی ایک لاش کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

”میر جی نکا ہوں نے، ہیبت، غریب صحران، ہولناک پہاڑوں کی آواز ریت کے عظیم البیت آواز، گنجان اور بلند آواز کے علاوہ شادنا دہری کوئی چیز نہیں ہے۔ اب مجھے قدرت کے ان عجیب مناظر سے محبت ہو گئی ہے۔ اور جیسے جیسے میرے قدم آگے بڑھتے جلتے ہیں۔ نئے سے نئے تجربوں سے تھرکن واقعات سامنے آتے جلتے ہیں۔ دوست! میں ایک ایسی دلآویز، رومانیت انگیز دنیا میں سانس رہا ہوں، جس کو کچھ سپاں ہمارے تصورات سے بھی بالاتر ہیں صبح جب میری آنکھ کھلتی ہے، آفتاب کی شعاعیں اوٹیں میرے لیے ایک راز کا تازہ اپنے آغوشِ نور میں سے نکالتی ہے۔

آدھ ہر شام رات کی تاریکی عجیب غریب پراسرار واقعات

دنیا کے ایک گوشے میں، کھنڈر وں کی صورت میں، غفلت و بیخوشی کے ماتم کرتا ہوا، بد نصیب بابل !!! — آہ ! میرے دوست ! اس وقت میرے دل کی عجیب کیفیت ہے۔

میرے ذرا افسانہ و رست ! تمہیں کیونکر بتاؤں کہ میں کیا محسوس کرتا ہوں، میرے احساسات میرے احساسات جس بہتار و ذہن ان کا احاطہ کرنے سے عاجز ہے۔ آہ کہیں نہ قائم ہو، میرے احساسات کے درمیان ایک دنیا حاصل ہے، تم کا شکار کے ایسے خطے میں ہو جو شہر ہے، جہاں زندگی کی بجائے زنجین قلعوں کی آبادی کے غنیمت و شگفتوں، اور تہذیب تمدن کی گونا گوں برکتوں میں جیتے بگیتے لگا دیے گئے ہیں، اور جس کے ایسے گوشے میں ہوں، جہاں زندگی سورج، چاند اور ستاروں سے چمکتی ہوئی فضا میں ایک روئی خواب بنی ہوئی ہے۔ ... میں صحرائی لاش و لاشوں میں دوں کہیں نگاہیں نہ کر، خود کو ایک ایسی کیفیت کے حوالے کر دیتا ہوں جس کا تجربہ میری قوت تحریر و دست زبان سے باہر ہے، مغرب کی جانب جب تاریکی شب اپنے پسے ہوئے غولنگ نامزدوں سے آفتاب کے سینہ کو چھو رہی ہے اور پھر اس آفتاب سے بخون نش کو اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے۔ تو میں حیران ہو جوں کہ یہ صحرائی دنیا کیسی دنیا ہے۔ میلان، بلوچی نہیں، پچھل دور و رست نہیں شہر کے ہنگامے نہیں، ... گھر اس کے باوجود اس میں اتنی جاذبیت کیوں ہے، یہ دنیا، یہ ہر طرف پھیلے ہوئے، چمکتے ہوئے ذرات، کیسی دنیا، یہ بڑے بڑے و رشتہ انگیز و اشتقاق و دوں کی دنیا، یہ سوکھے سوکھے پسے ہوئے بد نصیب و رشتہ کی دنیا کیوں اتنی دلکش و گیرا، کیوں اس قدر مددگار و مدد کیوں اس درجہ حیران و نیل ہے۔ میری زندگی دنیا سے روٹی کا ایک سحر کو وہ خواب بن جاتی ہے۔ دل سے پہچتا ہوں، ہاں ذروں کے سینہ پر کیا کچھ ہوا ہوگا، رشتہ کی نسبت کے کیسے کچھ خونخوار کھیل کھیلے گئے ہونگے، جہاں سپاری کے کون کون سے مفارے کئے گئے ہوں گے اور چہر موت کے پہنچے ہیں کس کس اذیت سے انسانوں نے جان دی ہوگی، ہر ایک میرے سامنے عالم تصور میں عجیب عجیب مناظر و مناظر ہوتے ہیں، اند میں گھنٹوں غلوں، چرخ و حرکت، بیچارہ رہتا ہوں۔

درمیان ڈوبتا ہوا سورج ایک زخمی خون میں شراب و سپاہی کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ جو میدان جنگ میں تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہا ہو۔ ایک دو سو گنا کناٹے پر دیوی سائنو کے منہ کے عقب میں، بلند، سوکھے سوکھے و رخت غلٹیلوش فضا کی لاشتنازیوں میں غائب ہوئے جلیے جلیے تھے۔ خور و خور و خور و خور کے بعد ایک آواز کشتی ہلکا سا شور پیدا کر کے، وہ آواز بوجاتی اور بہتنگ وہ دوسرے کدے پہنچتے، رات کے ٹیٹ سے فضا میں مترنم ارتعاش پھیلاتا تھا، ملاحوں کے گیتوں سے مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اور میں ان کو بے شوق سے سنتا رہا ہوں۔ اس وقت بھی ملاحوں کی معصومانہ آواز میرے شوق کے لئے سامان خشیں پیدا کر رہی تھی۔

”بائے، دھان، منظر اور بیان کی ہمدردی جوتنگی ملاحظہ ہو۔“

بابل نے تعلق تم سے قائم کیا۔ ت کچھ بڑھا ہوگا۔ اور شاہ میری طرح یہ پراسرار نام پختے ہوئے تم بھی اپنے دل میں ایک عجیب کیفیت محسوس کرتے ہو گے۔ میں جب اس کا خیال کرتا ہوں۔ تو میرے تصور کی نگاہوں کے سامنے، ماضی کے بکھرے پاپان کی سطح پر ایک ایسا شہر نمودار ہوتا ہے جس کے اوپے اوپے ہیبریت ناک سینڈ، پڑا اسرار بلخ، شاندار مسجد، ہزاروں سلی پیشتر کی انسانی زندگی کے حالات سناتے ہیں۔ بابل — انسانیت کا اولین گوارہ جہاں دنیائے قدیم کا قابر غلم سکندر سوربا ہے، جہاں دریائے فرات کے کنارے ہرودی ولی غدار ہے، ابدی خواب میں گھومے۔ جہاں لافروئے خدائی کا دعوے کیا اور پھر انتہائی ذلت کے عالم میں موت کے ٹھکانے آ کر گیا۔ جہاں لڑی مجبور اشارت کے لئے ایک قاہر بادشاہ — جو کھنڈر غلم سے ملحق باغات لگوائے۔ بابل — جہاں عیاش بادشاہ بلیشتر کے شاندار عروج نے شاندار مگر آخری بزم عشرت میں متہمس پایوں کی توہین کی بابل — جہاں عیش پرست بادشاہ وینر وٹ نے اپنی موتی بیٹی سوتلی کے صحرانوحش پر عاشق ہو کر فطرت کے استقام کو چھینٹا۔ بابل — صحر و جلو کی سرزمین، حسن و جل کی عورت، عشق و محبت کا شہر۔ — بابل —

اس عالم کینٹ میں میرے دل میں آرزو پیدا ہوتی جسے کاش  
اس صحرایہ وحشت و وحشت کو اپنے والی اس مہیب دنیا میں  
حسن و عشق کا ایک ایسا کیمیل بھی مکیلا جائے جس میں بیڑ  
کے فرائض میں لگا کر وہ اس وقت جبکہ سن کی نگاہیں  
بہرے عشق بنو سہرور پر مہربن ہو جائیں گی۔ میل نئی زندگی  
و حقیقی معنوں میں زندگی بھوں گا۔ ان ہی خیالات کے ظہور  
میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا سر ایک نازنین آغوش میں ہے  
یہی خواب تمام رات میرے دل و داغ پر بھایا رہتا ہے۔  
یہاں تک کہ میری آنکھ کھل جاتی ہے میں دیکھتا ہوں کہ  
رات کی مکہ چاند کی بھٹی ہوئی شکل اندھ میں سے عدم کے  
خدا میں داخل ہو رہی ہے۔

دنیائے کمال ان تھیں خیالات کو چرچا کر کے انگریزی زبان اور زندگی  
بہار میں اہم مشہور جالباتی شاعر سکونسن یاد آئے تھے ہیں۔ ان کے  
میرے قیامی ذوق، بیٹھ کا مشاہدہ زندگی اور سکونسن کی تعمیل پروری کا حد  
و جہ قابل ہوں۔ مگر ادیب کی خوبصورتیوں پر غور کرتا ہوں۔ تو خود ہی یہ اعتراف  
میں لیتا ہوں کہ ہمارا ایک مصنف ہر مسئلہ کے مقابلے میں کھڑا کیا جا  
سکتا ہے۔ وہ اپنے پہلاں اور موضوع کے انتخاب میں۔ وراثت اور ان کے  
بہت کرتے ہیں حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔ ان کے موضوعات بالعموم عمد  
قدیم کان وراثت غیر داستانوں سے ماخوذ ہیں۔ جن کی لچکی اور محبت کا  
برخا ہے کہ کہہ سکتے ہیں تمام تمام باتیں ان ہی کے سینے میں گزر جاتی ہیں اور  
بانی اندہ سینے کے لئے ہر مسئلہ والی رات کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔  
خطوط بھلے خود ایک حدت ہیں۔ اپنے اندہ ایک مخصوص رنگ تھے  
ہیں ان کی نگاہیں اسی صحن و کمال کے ساتھ کی گئی ہے جس کو وہ متقاضی  
میں مناظر کی تصویریں، مافوق الفطری مس، صحرائی زندگی پر کلاں عبور اور  
ان کی ہر شے و واقعیت کو سمجھنے کی و جدائی قوت و وضاحت اور تفصیل پھر  
زبان کی شستگی اور شیرینی و روانی، ہمارے سامنے ایسی جتنی جالباتی تصویریں  
پیش کرتی ہیں کہ حقیقت اور امتداد کا فرق بالکل مٹ جاتا ہے۔ مشہور  
وادی ادیب گوگوں کو اپنے تخیل کے ذمہ اور بیان کی تفصیل میں میرا سے  
بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر موضوعات کے تنوع اور مضامین کی اختراع میں  
ان کی گرو کو بھی نہیں پہنچتا۔ بقول کسی کے وہ ایک آنکھ سے دہتے ہیں  
اور ایک آنکھ سے ہنستے ہیں۔ اور پھر روئے والی آنکھ ہنستی اور ہنسنے والی  
آنکھ روئی ہوئی نظر آتی ہے۔

خطوط کی تیسری خصوصیت ان کے نفسیاتی رنگات ہیں۔ یہ موضوعات

اس قدر دلچسپ و ممتاز طویل ہے کہ میں پرہیز نہیں کر سکتا کہ لکھنا موجودہ محدود  
جگہ میں سرسری طور پر معلوم ہوتا ہے۔ انگریزی ادب میں ہنری جیمس، ٹالس ہارڈی  
جیمز آسٹن، کانسوڈی اور برنارڈ شاواس موضوع کے نمایاں نمونہ ہیں۔  
کانسوڈی بہت اجتماعی خیالوں اور کرداروں کو بری بے رحمی سے بے نقاب  
کرتا ہے۔ میرے خیال میں اس سے بہتر کسی نے آج تک کردار و اخلاق کا اس  
طرح تجزیہ نہیں کیا۔ اس کے یہاں طنز و کھینچنے کے وہ سم و نو فشر نہیں ہیں جن  
سے نشان مستور پر مستور ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی شہرت دنیا بھر میں  
تاری کی گول پر زیادہ اثر کرتا ہے۔ شاید وہ ناک سے درد ناک باتوں کو مضحکہ بنا  
دیتا ہے جو بعض اوقات ناک و ظلم ہوتا ہے۔ جیمز آسٹن نطرتا اور عمد و دونوں  
طرح خوبصورتی و نفرت انسانی کا کوئی تاریک اوق اور اچھا ہوا نمونہ لکیرا جاتی  
سے اور بڑے سن اور بڑی آسانی کے ساتھ اس کو بھجا دیتی ہے۔ اس کا نظم کہیں  
نہیں لگتا۔ وہ قاری پر یہ اثر نہیں سڑکتی کہ وہ کسی جگہ غور کر کے لکھ رہی  
ہے۔ میرا ادیب ہیں نہ کانسوڈی اور شاواس طنز و کھینچنے سے اور نہ جیمز آسٹن  
کا قبل از وقت فکر و تامل۔ وہ جیمز آسٹن اور ہارڈی کی طرح ان نفسیاتی پہلو کو زیادہ  
جاگ کرنا چاہتے ہیں اس کو اچھا دیتے ہیں وہ نہ تپکیاں لپکتے ہیں۔ اور نہ  
پہلے سے کوئی شکل سوچتے ہیں۔ وہ ہارڈی سے بھی بالکل متفق نہیں۔ ہارڈی  
کے یہاں صرف قنوطیت ہے اور ان کے پاس ایک مخصوص رجائیت ہے۔ یہ چیز  
جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ بھی گروں رو نگار سے تمامی طور پر واقف ہونے  
کی کمی کی بنا پر ہے۔ انہیں بھی دنیا کی ان سیلہ کار فطرتوں سے اتنا واسطہ  
نہیں پڑتا جتنا عام انسانوں سے۔ ابھی وہ اس چیز سے کامل طور پر واقف  
نہیں ہوئے ہیں۔ جس کی ان کے اندر کہیں کہیں جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ وہ نہایت  
کے حامی مزدور معلوم ہوتے ہیں۔ مگر دنیا کی اہل فوہیوں اور انسان کی قسم رازوں  
سے غبر ابھی اٹھتے ہیں۔ ہارڈی کا مشاہدہ ان کے مشاہدہ سے بہت زیادہ فضا  
ادیب ابھی جوان کیا جبکہ فوجیان ہیں۔ شاید منازلی حیات کی مسافت ان کو  
وہاں تک پہنچا دے جہاں ہارڈی نے کھڑے ہو کر کسی چیز کی خوبی ظاہر کر کے  
کے لئے۔ اس کی رانی اور تاریک پہلو کو خوب روشن کیا ہے۔ اور جہاں لگتا ہے  
اندھیروں اور حسرت و یاس کی تاریکیوں میں وہ ایک خاص لطف محسوس کرتا  
معلوم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی میں اس نتیجہ پر بھی پہنچا ہوں کہ میرا کی قنوطیت  
بکند رجائیت ان کے امتداد میں ایک خاص حُسن کے اضافہ کا باعث ہے  
اگر وہ اپنے اس مخصوص رنگ سے نہ ہٹے اور اسی طرح اس پر قائم رہے۔ تو  
شاید یہ چیز ان کی اپنی چیز ہوگی اور اس خصوصیت میں ان کا کوئی بے مقابل  
نہ ہو سکے گا۔ نہ کہ یہ معلوم میں ان کی تعلیم و تائیدوں اور مدد ان نگاروں کے  
نہ پش کے لئے گئے ہیں۔ اب اس مخفی سیات پر ان کا گرجنا بھی سیکھئے۔

ادب صورت مرد بوٹھے، بچوں کی نظروں کا جس گہری نظر سے نہ ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کے افسانوں کو بہت بلند و مرتفع رکھ دیا ہے۔  
"سبیلِ عادت میں شیریں کی طغیانہ اداؤں اور اس کی بچہ کی پوری عسوری کی ہے۔ نفسیاتی نکات کا اندازہ کرنا ہی فی نفسہ جو نہیں ہے۔ بلکہ اس نواس کی صحیح جگہ پر بیان کرنا بھی خود کو فی نفسہ ادیبانے موصوفہ محل کی نزاکت کے تقاضے کے مطابق ان پر دوں کرنا جو نفسیاتِ انسانی کو عام نظروں سے چھپائے رہتے ہیں۔

میرزا کے خطوط میں بعض جگہ نفسیات کے ایک مخصوص پہلو کیا گیا ہے اور وہ انہماکِ نفس ہے۔ ان کا کردار کسی جگہ جذباتی نشیب و اوج کی شدت یا وار واتی اخذ ہے اس قدر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کے افق پر پورے والے واقعات نظر آتے لگتے ہیں اور اس طرح اس کے اسی کے احساسات و شاعر ہیں یا ان کا کوئی جزو۔

"ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی روح فرسا اور مشکافت ہوئے  
وہ ہے، کوئی خوف ناک مجید ظہور میں آیا ہوا ہے۔"  
"ایک مجسم خوف میرے دل پر چھا چکا تھا۔ اوپر محسوس  
کردہ تھا کہ کوئی بہت بڑی عیبیت ہم پر ٹوٹنے  
والی ہے۔"

"ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ بہت ناکل لٹن جیت  
دنیا سا حرکتی ہے، میرے دل کی دھڑکن کو سن رہا ہے  
اور اب اس کے خوشحالانے میرے سینہ کی طرف مڑ چکے۔"

میرزا کی یہ نوعیتِ مؤثر فی بین زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔  
کافلانیکہ عجیب المیزانیت اس کا حاصل ہے جو اردو ادب میں  
چیز ہے۔ "پیمانہ" مرحوم ڈاکٹر ہیں ایک مرتبہ روح کا کٹ کاٹی شہ  
تھا جو فی تمام انسانی خصوصیات کے باوجود اس لئے عجیبی اند  
ہیں کہا جاسکتا کہ اس کا پلاٹ مخصوص طور پر اسی خیال پر تعمیر کیا گیا ہے  
اس قسم کے خیال کو پلاٹ میں اس قدر نمایاں کر کے نہیں لانا چاہیے  
اس کو اس طرح رہنا چاہیے۔ جیسے دریا کی تہ میں بہتی ہوئی کوئی مہ  
ادیب اس نکتہ کو سمجھتا ہے۔

ادیب کی نظر انتخابِ عیدِ عقیق کی داستانوں پر ٹوٹی اور انہوں  
ان میں روح بچو تک کو ان کو اپنا لیا۔ مگر اس کے باوجود ہم کسی نہ  
محسوس نہیں کرتے کہ وہ واقعات ہماری زندگی کے علاوہ کچھ اڑ بھی  
ان کے کردار تک ہم ہی میں سے چند نفوسِ معلوم ہوتے ہیں نہ وہ  
پھرتے محسوس ہوتے ہیں اور ان کے وار وابتِ زندگی سے جو جذبات

"انہماک سے پوچھا جائے کہ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن کون  
ہے تو میں وہ بھرتا مل گئے لیکن کہہ دوں گا کہ انسان۔  
کون شخص اس سے انکار کر سکتا ہے کہ انسانیت کی چھاتی  
پر انسانوں ہی کے چہرے لگائے ہیں غلطی کی تباکاریاں  
انسانوں کے خون کی ندی بہہ سہری ہی انتفا کرتی ہیں مگر  
جب انسان کی فطرتی قدر بریت انسان کا خون بہانے پر  
تلی جاتی ہے تو وہاں کے ہر گوشے میں خون کے دودیاں نہٹنے  
لگتے ہیں۔" ایسے کے اوراقِ پٹو ہمیں معلوم ہو جائے گا  
کہ طاقت و انسان اور کمزور انسانوں میں کیا کچھ ہوتا  
رہا ہے۔ سنگدل فتح یا بوں اور بد نصیب مظلوموں کے کون  
سا نظارہ پیش کیا ہے۔ اور پھر بہادر افواج سے متمدن  
ممالک کے ساتھ کیا کچھ کیا ہے؟ کیا تم اس حقیقت کو  
چھٹا سکتے ہو کہ فتح کی بیخ اس وقت نمودر ہوتی ہے جب  
کرداروں انسانوں کی قیمتی زندگیاں موت کی تار کی پٹیاں  
نہیں کر رہ کر توڑ دیتی ہیں۔ یا تم اس امر سے انکار کر سکتے ہو  
کہ صرف ایک انسان کی عظمت کے چراغ کو روشن کرنے  
کیلئے بے شمار انسانوں کے خون کو تیل بنا دیا جاتا ہے۔

ابتداءً آفیش سے انسان انسانوں کے خون سے جولی  
کھینٹے چلے آ رہے ہیں۔ تکوین کا نکتہ ہے کہ اب تک  
انسانوں ہی کے ظلم کا سبیل ہے یا ہاں انسانیت کے زخمی  
سینے سے نکلا رہا ہے۔ زرمیشہ سے بریت کے ظہور  
انسان بے گناہ انسانوں کی خونچکاں اشوں کو روندتے  
ہوئے فتح کے دروازے تک پہنچے ہیں۔ چنانچہ ہلاکتوں کے  
ہلکار، ہٹی پال، نجات نصیر، طبلتس، سیر و قیود، اور  
ناور موت کی آگ کے آتشیں تھلے تباہی کے سمندر کے  
نغمہ نگین طوفان اور بر باد کی آندھی کے ہلاکت یا غرض  
خون کے بن کر آباد و شاداب کرہ ارض پر آئے اور شہروں  
کو خاک کرتے تو سبے آبادیوں کو قتل و قحط مھرا۔ اور  
بارہ فی ملکوں کو ہونک چڑستان بنا کر عدم آباد کو چلے  
گئے۔۔۔۔۔"

میرزا نے انسانی نفسیات کا تجزیہ جس ہوشیاری اور ہنرمندی سے  
کیا ہے۔ وہ بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوتی ہے۔ انسانی نفسیات کا بڑا اہم  
جزو ہے اور اس قدر اوجی کہ اس کا خوبصورتی سے نبھانا بڑا مشکل کام ہے۔

کو اصول منظر۔ اخلاق کو اصول انصاف اور جمالی کو اصول حسن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جب تک کہ مصنف کا منظر تحقیق منہج و حکم نہیں اور اس میں یہ قابیلیت نہیں کہ وہ حقائق و حقیقت، مقام و تعلقات کا جو وہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، خوبصورت طور پر نمودار کر سکے، اسکی کوشش میں نہ کوئی حسیب ضرر پڑ جائیگا۔ اگر وہ ہم کو کوئی چیز دکھانا چاہتا ہے۔ تو پہلے اس کو خود وہ چیز صاف طور سے دیکھ لینی چاہیئے۔ جب تک کہ کسی مصنف میں خلوص نہیں وہ کامیاب مصنف نہیں ہو سکتا۔ وہ کہتا ہے اس میں ایکسٹینشن، ایک خلوص، ایک صداقت ہونی چاہیئے۔ دہ دہ قاری کا یقین بھروسہ و ہرچیز خلوص چاہیئے غلام ہو نہیں اور اس میں ایک سچی اخلاقی کام کا باعث ہوتا ہے۔ اخلاقی تحقیق کا لازمی جز ہے۔ دوسروں کے جذبات و عزم کا اندازہ ہم صرف اپنے نفس کے وسیع سے کر سکتے ہیں۔ بیرونی نتائج ہم میں صداقت، بیانی اور حقیقت نگاری پیدا نہیں کر سکتے۔ آخر میں جب تک کہ مصنف میں اپنے خیالات کی ادائیگی اپنے طرز اور اپنی خبروں کا ایک خاص خوبی ایک خاص حسن و بیان نہیں آجیلا اسکی تمام قوتیں راہیں گلیں جائیں گی اور وہ اپنی تصنیف کو مقبول کرانے میں ناکام رہے گا۔ تصنیف میں صداقت، ہندی، بیان، خلوص اور حسن ہی وہ چیزیں ہیں جو ان کو حیات دوام بخشی دیں۔ صداقت ادب کا اصل مقصد ہے۔ خلوص اخلاقی صداقت کا دوسرا نام ہے۔ اور حسن جمالی صداقت کو کہتے ہیں۔

**بیان** انسانے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ نیز اس کے افسانوں کی زبان میں صداقت، الفاظ میں مددیت، ترکیبوں میں دل کشی و ندرت، فکر و جستجو میں اہمیت و اختراع، بیان میں خوش و سستی کوٹ کوٹ کر بھری ہونی چوتی۔ وہ اپنے بیان اور اپنی زبان کے دیار و تالی علوم جوتے ہیں۔ لیکن بلو جو اس کے ان نسا اور وہ اور صنعت کا کہیں نام نہیں ان کے حسین اور خوبصورت الفاظ میں خیالات کی سی روانی پائی جاتی ہے۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ بعض زبان کھینے کے شوق میں لفظ کھینے لگے ہوں۔ انہوں نے افسانوں میں بیان کی تمام ضروریات و خصوصیات کی پابندی کی ہے۔ ناوردیہات، خوبصورت استعارات، الفاظ کی حسین نگار، پرمعنی تراکیب، نئی نئی اضافیتیں، بیان کا انداز سب چیزیں ملتی ہیں۔ بیان کی خوبیاں ملاحظہ ہوں۔ سچ و سرت کو کس طرح اصل کر دیا ہے۔

”جس طرح شفاقت ہانی سے بھرے ہوئے چشمہ کی ت میں کہیں

کہیں گدلاہن ہوتا ہے، اسی طرح حیرتی خوشبو کو عقب

میں اضطراب کی لہریں بھی دوڑ رہی تھیں۔“

بیان میں زہد اور قوت سہرناہ ہے۔

برونٹن، خذ کئے جاتے ہیں۔ وہ بھی ہماری ہی زندگیوں پر منطقیں دیتے ہیں کہ انسانوں کو تیرزا اپنی اس خصوصیت کہ اپنے اس قریض سے جہدہ ہر نے ہیں نہایت کامیاب ہیں۔ میں ان کے اس درسیاتی پہلو کو کہیں ہر سے متا لیں دے کر زیادہ واضح کر سکوں گا۔ ملاحظہ فرمائیے۔

”یہ وہ عورت کی جد و عاشقت خوفناک ہوتی ہے۔

”زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے۔ جس

میں دواسی غلطی کرنے سے انسان اپنی تمام زندگی تباہ

کر لیتا ہے۔“

”اس طرح بھیجنا ہوتی ہوئی نکھیاں زخم پر پیٹنے کے لئے بیٹھا

ہوتی ہیں۔ اسی طرح وقاصہ بھی صرف دولت کے لئے

یہ قرار ہے۔“

وہ کہتے ہیں جان جو سے دینگے۔ مگر اصول کو نہیں چھوٹے۔

وہ حکومت کے دل میں رحم پیدا کرنے کے لئے قربانیاں

نہیں کر رہے۔“

”تو پھر آؤ کس لئے؟“

”اصول کے لئے۔“

”انسا اصول؟“

”وطن پرستی؟“

”ہم میں سے ایک شخص اٹھا اور اس نے اہل بلخ“

”یہ سلیوں میں سوئے ہوئے جذبہ وطن پرستی کو بھنبھو“

”کو بیدار کرنا چاہا۔ اور اسی قابل و مہم فرائض کی ادائیگی

میں پہلے اپنی آنکھیں اور پھر اپنی جان دیدی۔“

”اگر اہل وطن کے دل سے وطن پرستی کا جذبہ مٹو دوجا۔“

”تو پھر ظالم حکومت کے ظلم و ستم کا شکوہ کیا معنی رکھتا ہے؟“

”وطن کے لئے میرے باپ نے جان دی اور اسی فرائض کے

لئے میں بھی اپنی جان دوں گی۔“

”مجھے سخت کی ضرورت نہیں۔ میں اپنا فرض ادا کر

دی ہوں۔۔۔ اپنے محترم باپ کے نقش قدم پر چل

دی ہوں۔“

”..... فرائض جان کی قیمت پر ادا کئے جاتے ہیں۔“

اس میں خط و طوطا کو ادنیٰ و فنی فکری سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ادب

بن اصول راہی ہیں۔ دماغی، اخلاقی اور جمالی۔ اور ان تینوں کی

لیا ناکامی دور اصل انسانی فطرت کی ساخت پر مبنی ہے۔ دماغی شکل



# انوکھی شادی

بدادوب الحیف ہوں  
نوشتہ  
ایون سنڈٹ

اس کی آواز میں پھر ایسی تاثیر تھی کہ ہم لوگ خاموش ہو گئے۔

”سچے قہریم! کیریاں تو یہ تھی۔ کہ جب ہم نے روزی کو سہا کاد پیش کی تو وہ کچھ۔۔۔ سن اسے شرفائی اور اس کے دھندلے پر کچھ ایسی بارونی مسکراہٹ۔ جیسی، جس سے یہ شرع تھا کہ وہ خود جاننے کی محبت میں گزرا رہے۔۔۔ صرف یہی بلکہ۔۔۔ عرصہ سے اس کی پرسش کرتی رہی ہے۔۔۔ اور ہم کمال سب بڑی حد تک صبر بھی تھا۔۔۔ عورتیں نظر نہ اٹھاتیں نہ اسرار ہوا کرتی ہیں۔“

ہم لوگ شادی میں نہ تھے۔ ان دنوں گاؤں کے ہر گھر میں ہر وقت اسی شادی کا نیکر رہتا اور ہر شخص ایک دوسرے سے یہی استفسار کیا کرتا کہ کیا واقعی روزی جانتی کی محبت کا دم بھرتی ہے؟  
پہلے بیٹا بھی کبھی کسی اپنے دل سے اسی قسم کے سوالات کرنے کا حامی تھا۔ مگر آگست کی ایک ناقابل فراموش شام کے بعد مجھے پھر اس قسم کے شکوک پیدا کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

میں ایک دن گرجا کے قبرستان کی طرف سے ہونا ہوا گھر واپس جا رہا تھا۔ ہمد اگر جا ایک بلند مقام پر واقع تھا اور اس کے ارد گرد جو گھاس جی ہوئی تھی، اس قدر نرم اور ملائم تھی کہ کسی مسافر کے قدموں کی آواز نہ ملتی سنائی نہ دیتی تھی۔ چھلانگ لگا کر میں گرجا کی دیوار کے پاس پار گیا۔ اور قریب درمیان سے ہونا ہوا، آگے بڑھنے لگا وہی وقت میرے کلاں میں جانتی کی آواز آئی کہ جب میں نے چونک کر گردن اوپر اٹھائی تو دفعتاً میری نظر روزی پر پڑی ایک چوڑی سی کشادہ قبر کے نیچے وہ بیٹھی تھی، اُٹھ اُٹھتے ہوئے آنتہب کی کرتی اس کے چہرے پر وقص کر رہی تھی جلتی جلتی۔۔۔ فتر پر لیٹا ہوا تھا اُٹھ یہ اُٹھ کی اکاؤنٹی جو اس وقت ماہ آگست کی اس دلکش شام کے سکوت کو وہ ہم پر ہم کر رہی تھی۔

”میری بیوی! میری جان! مجھے یقین ہے کہ میری موت کے بعد بھی اگر کسی وقت تیریں میری عزت بہتیں آجائے، تو میں قبر سے نکل کر، تیری خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا؟“

”یہی مرچو کی ظاہر کرنے کیلئے میں ایک بار کھانا۔ اور پھر وہ جنوں کے سلاخوں میں سے گزرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔“

کسی کو کبھی یہ ایب نہ تھی۔ کہ عمارت کبھی روزی سے شادی کرنے پر تیار نہ تھے۔۔۔ مگر مدت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اور جس چیز کی اسے دل جان نہ تھا وہی اسی تھی وہ کچھ ایسے عجیب و غریب طریقہ پر پیش آئی۔ کہ اس کی تفصیل اس کرینیا آپ کو کتب سہا ہوگا۔ آگسٹ وہ جاتے سے قبل اس نے اپنی بچہ ساہوی کی درخواست کی۔ کہ اس جفا شعار نے ہنسکر ٹال دیا۔  
گھر واپس آئے پر اس نے پھر دست سوال دراز کیا۔ مگر اس شعر نے پہلے ہی طرح ایک پھر خندہ زبیر کے ساتھ انکار دیا۔ تیسری مرتبہ پھر اس نے اپنی شکل بھوب سے شادی کی استدعا کی اور اس مرتبہ پھر وہ اپنے عاجز شوق کی نافرمانی پر دل کھول کر ہنسی۔

گاؤں میں صرف عمارت ہی ایک ایسا شخص نہ تھا کہ روزی سے شادی کرنے کا آرزو نہ کرتا۔ وہ تو تمام گاؤں والوں کی انقباض نظر تھی۔ اور سب سہاوی نہ کسی حد تک اس کی محبت میں گرفتار تھے۔ اور جب عمارت نے کلب میں ہمیں اپنی شادی کی خبر سنائی تو ہم سب رنگ اس منہ کھنے لگے۔

”بتائی شادی؟“

”شاید تم مذاق تو نہیں کر رہے؟“

”اور وہ خوش نصیب اولین آخر ہے کون؟“

کچھ جواب دینے سے پہلے عمارت نے اپنے پائپ میں تباکو بھرا، اور اسے روشن کر کے بستم انداز میں یوں گویا ہوا۔۔۔

”اے! میری ہی شادی! ہمیں روزی کے ساتھ؟“

”شاید یہ مذاق کر رہا ہے؟“

”روزی کے عشق نے اس کو داغ خواب کروایا ہے؟“

”نہیں؟ میں اُٹھ کر کہنے لگا۔ مجھے اس کی باتوں سے صداقت کی بو آتی ہے۔ مگر تاہم ضرور ہے کہ میرے دوست نے جادو اور سحر کے اندر سے کامیابی حاصل کی ہے۔ اور نہ کہیں ممکن تھا کہ ہمارے گاؤں کی سب سے حسین عیسیٰ لڑکی اس سے صاحبہ نہ ہو جائے پر رضامند ہو جاتی۔۔۔ پھر گلو فلاحی کے بعد جس سے یوں مخاطب ہوا۔ دوست! خدا یہ تو کتنا، آخر وہ کون سا جادو تھا جس سے تم نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی؟“

”جادو! عمارت ہنس کر کہنے لگا۔ جلدو میرا استقلال تھا اور خوش نصیبی میرا سحر؟“





میں نے اپنی بہن سے چہیں بچیں ہو کر کہا کہ شادی کل ہوئی اور غور ہو کر  
راہیسی کو کم تمام عمر یاد رکھو گی۔ یہ میری ایک ایسی پیش گوئی تھی۔ جو  
حرف صریح ثابت ہوئی۔

بچتے کو تو میں نے اپنی بہن سے یہ باتیں کہہ ڈالیں۔ مگر جب رات  
'یہ وہ ہو گئی اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ جارج اب تک گھر واپس نہیں آیا تو میری  
عزت اور تشویش کی کوئی انتہاء نہ رہی۔ دوسرے دن صبح سویرے مجھے جارج  
کا ایک خط ملا جس کو پڑھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور اسی قدر روزی  
مے ملنے چلا گیا۔

وہ بارغی میں بدلتی پوسٹ گزریب تن کئے ہٹل رہی تھی۔

"تو گویا جارج نے ابھی بھی اطلاع بھیجی ہے؟" روزی نے مجھ

سے پوچھا۔

"ہاں! مجھے اس نے شام کے تین بجے شیڈیل بھجوا دیا ہے وہاں سے  
ہم سیدھے گھر چلے آئیں گے۔"

روزی کے چہرے پر زندگی کھنڈی ہوئی تھی۔ مگر انکسوں میں کچھ ایسی  
درخشانی چل رہی تھی۔ جس سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ جارج کی آمد کی خبر سے  
خوش و صبر ہو رہے۔

"میسٹر براؤن کے لئے اس سے کچھ اس طرح ایک سات اور خیر جاننے کی  
دعوت کی کہ وہ انکار نہ کر سکا۔" روزی نے اپنے محبوب کی طرف صفا  
پیش کرتے ہوئے کہا۔ "جارج فطرتاً نہایت رحمدل ہے۔ مگر میری تو یہی پیش  
گئی کہ وہ اس جگہ اب اُردہ بھڑتا۔"

میں ڈھائی بجے انیشن پر پہنچ گیا۔ جارج سے مجھے اس وقت کوفت  
سی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ خیال مجھ بے حد اُردہ بنارہا تھا۔ کہ وہ اس  
قدر تاخیر ہے کہ خوار خواہ اپنی محبوب کی دل آزاری کا باعث بن رہا ہے۔  
"میں بچے والی گاڑی انیشن پہنچی۔ مگر جارج کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ۳۵  
نٹ سے پیشتر کوئی دوسری گاڑی نہیں آتی تھی۔

نہ اُردہ آئندہ گاڑی سے آگیا تو چہرہ بھی ہر وقت مقررہ تک  
گرا ہوا نہ ہو سکتے ہیں۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ آخر وہ کس قدر  
جتن ہے کہ پہلی گاڑی سے نہ آیا کوئی غفلت ایسی حرکت نہ کرتا۔

وہ پینتیس منٹ میرے لئے گویا ایک طویل سال تھا میں انیشن  
پر اُدھر اُدھر اشتہادات اُردہ نام ٹیبل پر ہتھ مارا۔ .... کسی چیز کے  
انتظار سے مجھے سخت نفرت ہے۔ . . یوں تو کسی شخص کو بھی انتظار  
کی غریب پسند نہیں مگر مجھے دوسروں کی پرستش کچھ زیادہ تکلیف دہتی  
ہے۔ تین بجے کہ پینتیس منٹ پر آنے والی گاڑی لیٹ تھی۔

پارٹیپ کو دانتوں کے درمیان زبرد سے دبائے ہوئے میں گنجل کو لہجہ  
بیکھڑا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بیکارک شپے کی جانب جھک گیا۔ پانچ منٹ  
کے بعد میں اس گاڑی میں سو رہا ہوا گیا۔ جو جارج کو رجا تکٹ جانے کیلئے  
میں گاڑی سے مانتہ لے کر آیا تھا۔

"چلو! جلدی سے گر جا چلو" میں نے کہا تو جارج اس گاڑی سے بھی  
نہیں ہٹتا تھا۔

عشقت اب اختلا اور فکر کی صورت اختیار کر لی! آخر وہ

کدھر گیا؟ . . . کیا ایک اس کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی؟ . . .  
مرا ایسا ہوتا تو وہ ٹیلیگرام سے اس کی اطلاع ضرور بھیجتا۔ ضرور کوئی نہ کوئی  
خوفناک حادثہ اسے پیش آگیا ہے! یہ خیال تو مجھے میرے دل میں پیدا ہی  
نہ ہوتا تھا۔ کہ اس نے قصداً اپنی روزی کو دھوکا دیا ہو گا۔ بھٹک کوئی  
نہ کوئی خوفناک حادثہ اسے پیش آگیا ہے۔ اور روزی کو اس واقعہ کی اطلاع  
دینے کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہو گئی ہے۔ --- اس وقت میرے دل  
میں ہی خواہش تھی کہ "کدھڑی لڑکھا جائے اور میرا سراپا شہاں  
ہو جائے۔ تاکہ اس حسینہ کو یہ وحشت انگیز خبر میری بجائے کوئی اور سنا سکے۔

جب میں گرجل کے پاس پہنچا تو پارٹینے میں پانچ منٹ باقی  
تھے۔ تماشا بینوں کی دورہ یہ قطار یہاں سے دہاں تک بھی ہوئی تھی گاڑی  
سے اتر کر میں گرجا کے اصرار میں داخل ہوئے لگا دو روزہ کے پاس ہی ایک  
دوبان کھڑا تھا میں نے اس سے کہا کہ گاڑی اب تاک جارج کے منتظر  
ہیں؟

"منتظر! انہیں جناب! تباہی تو اب تک ختم بھی ہو چکی ہوگی!"  
"تو کیا جارج سگنالی سے واپس آچکا؟"

"ہی! ہاں! شاید آپ انیشن پر انہیں نظر انداز کر گئے۔" وہ کہنے لگا  
"جناب! میسٹر جارج کو ایسی وحشت انگیز اور سرسبز حالت میں میں نے  
پیشتر بھی نہ دیکھا تھا۔ ان کے تمام کپڑے نود آلود ہیں اور چہرے سے سرسبلی  
مترشح ہے۔ سچ پوچھیے تو مجھے ان کے یہ انداز مطلق پسند نہ آئے۔ . . .

اندھی لوگ ہر قسم کی چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔ . . . معلوم ہوتا ہے  
میں نے کبھی کسی پریشان کن شخص میں نہیں دیا انہوں نے کافی مقدار میں  
شراب پی لی ہے۔ . . وہ قہقارہ بھڑکتے جیسے نظر آتے ہیں اور  
جس وقت وہ اندر داخل ہوتے تو ان کی آنکھیں آگے کی جانب گڑی ہوئی  
تھیں۔ . . نہ اُدھر اُدھر کسی کو دیکھا اور نہ کسی سے مخاطب ہی ہوئے۔  
..... ان کی اس تہذیبی سے ہر شخص کو موجود جرت بنا رکھا ہے۔ . . وہ  
تو ہمیشہ شرفیاء بنا کر کرنے کے عادی تھے۔"



## نکات

زلیست بے لذتِ ادراکِ فضول      چشمِ دل بے نگہِ پاکِ فضول  
جس کی ملکوتِ نہیں خونِ جگر      ہے وہی دیدہِ نناکِ فضول

(۲)

من بے ذوقِ طلبِ گارِ فضول      جنسِ بے چشمِ خیرِ دارِ فضول  
ہے ترے ہاتھ میں فطرتِ کئی نوشت      دستِ بے لذتِ کردارِ فضول

(۳)

حُسنِ بے عیشوہ و اندازِ فضول      عشقِ بے جزبہِ جانِ بازِ فضول  
تینغِ بے بازوئے بیباکِ فضول      بازِ بے جوہرِ پروازِ فضول

(۴)

مردِ بے ہیبتِ مردانہِ فضول      بدلتے جراثیمِ زندانِ فضول  
راکھ ہو کر جو نہ اڑنے پایا      اے امیں ہے وہی پروانہِ فضول

سعادت حسن منٹو

# اُنسکارامو

( میکسم گورکی کا ایک افسانہ ڈرامے کے رنگ میں )

ہندو۔ لکھئے.....!

گوپال۔ ارے بابا! ہندو تو کچھ بولو۔ یا جڑوں میں آئے گھیسٹوں  
ہندو۔ لکھئے..... (زیر طوفان خاص شہر دہلی) ... محلہ بلی ماہاں  
چودہ گھر کا گھر... اس کے آگے میرا نام لکھ دیجئے:

گوپال۔ کیا نام لکھوں؟

ہندو۔ ہندو!

گوپال۔ لکھ دیا..... آگے کہو!

ہندو۔ لکھئے..... میرے پیارے۔ میرے دل سے پیارے راتو  
گوپال۔ (لکھتے ہوئے) میرے پیارے، میرے دل سے پیارے راتو،  
... لکھ دیا... آگے پڑھو!

ہندو۔ تو نے اتنے وقتوں سے اپنی ہندو کی سند کیوں نہیں لی ہو،  
کی ماری تار سے گن کر راتیں کاٹی ہے۔ ہر سے اس کا تیرہ  
ہی طرف دھیان ہے۔ وہ سوئی جاگتی، اٹھتی بیٹھتی، تیرے ہی  
کی مالا جیتی ہے، اس کا تن من، تیری یاد میں ڈوبا رہتا ہے۔ آ  
کب آئے گا راتو؟ تو میرے بچتے ہوئے ہر سے کوئی  
اپنے پریم سے ٹھنڈک پہنچائے گا۔ تو آئے، راتو آئے، ہر  
تیری ہندو، سند تیری ہندو ہے گی، وہ تیری ہے ساری کی  
ساری تیری!

گوپال۔ بیرو تو!

ہندو۔ میں ابھی بس کر رہی ہوں، نیچے یہ بول لکھ دیجئے:

سے آؤ شیانم پیار سے گھر:

وہ پہلے سے کھڑکی پر

میں اسندن میں آس لئے

من میں سو سو اس لئے

تم پھرتے پھرتے گاؤں ٹر

... یہاں راہ دکھاؤ گے کوننگ

... بس... پر آپ سے تو کچھ بھی نہیں لکھا..... یہ بول بڑے

گھمبیل کا گھر۔

(دور دراز سے پردہ تنگ ہوتی ہے، دستک کے بعد کتب بند

کرنے کی آواز سنائی دیتی ہے)

گوپال۔ کون ہے؟

چلے آؤ، دور درازہ کھلا ہے!

(دور درازہ کھلتا ہے)

ہندو۔ (پچھل کر کہتی ہے) میں اندر آ جاؤں؟

گوپال۔ اندر آؤ گئی ہو، اب کیا پوچھتی ہو۔۔۔ مگر تم ہو کون؟

ہندو۔ میں... ہندو ہوں... ریوڑائی کے بڑے صاحب

کے جہاں آبا کا کام کرتی ہوں... اندر ہیں آپ کے پڑوس پر

رہتی ہوں... کیسی میرا کوئی بھی نہیں... میں...

گوپال۔ (رات کا ٹکڑا) میں تمہارا حدود وار لہجہ بوجھنا نہیں چاہتا...

بتاؤ کیا یا جتی ہو... اگر کچھ مانگئے آئی ہو تو مجھے انوس نہ کہ

میں تمہیں کچھ نہ دے سکوں گا۔ اسنے کہ ابھی تک میرے گھر سے صحیح

نہیں آیا۔ کالی کی فیس بھی ابھی تک نہیں دی۔

ہندو۔ بابو جی! میں بھیک مانگنے نہیں آئی... کیا میں بھکارن دکھائی

دیتی ہوں؟... میں تو آپ سے ایک پتر لکھوانے آئی تھی۔

گوپال۔ لکھ دوں گا... لکھ دوں گا... لکھنے پڑھنے کے سوا اور

کچھ کام ہی کیا ہے۔

ہندو۔ آپ بہت اچھے ہیں بابو جی... بہت اچھے ہیں، آپ پتر لکھ

دیں، جس میں نے لکھی۔

گوپال۔ ہاں ہاں! سن رہیں لینا ہی پڑے گا۔ میں نے یہ بول ڈال دیا

تو نہیں کھول لکھا۔ چلو بیٹو اور لکھاؤ۔

(پتہ لکھنے کی آواز، ایک کاغذ پھاڑا جاتا ہے)

گوپال۔ ہوں... تو کیا لکھوں،

ہندو۔ (خٹک جھٹکتے ہوئے) لکھئے...

گوپال۔ ہوں... چلو...!

ہوں تو آپ کوئی بچے سے بلکہ دیکھئے ... میں نے کل چھوٹی میم صاحب سے منے تھے۔

گوپال۔ (سندھ دئی سے) یہ رات کوئی ہے؟

مردو۔ راتو ... (جیا آؤ ہنسی) ... راتو ... آپ سے نہیں ہو چکے ہیں ... (بچا کر) میں نے ابھی ابھی کسی کچھ تو کہہ دیا ہے۔

گوپال۔ تو یہ راتو تیرا وہ ہے ... ہوں۔ تجھ سے مریم ویم کوڑتا ہوگا۔

مردو۔ (جیا آؤ ہنسی) ... آپ کیا کہہ رہے ہیں بابو جی؟

گوپال۔ پریم کرنا پاپ نہیں، جرم نہیں، پھر یہ شرم گئی ہے ... اس راتو سے تمہارا پریم کب ہوگا؟

مردو۔ (پچھلے ساد میں) ... جب بڑی میم صاحب کا بیاہ ہوگا ... لائے میرا پتر ... میں نے آپ کو بہت تنگ کیا ... اگر آپ کہیں، تو میں ہر روز اس کمرے میں بھاڑو سے دیا کروں؟ گوپال۔ نہیں نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں ... یہ کوئی تکلیف نہیں ... یہ لاپتا خد ...

(کاغذ کی کھر کھر ہٹ)

مردو۔ ہر رات ... آپ کی بڑی ہر رات ہے ...

(دروازہ بند کرنے کی آواز)

دوسرے دن :-

گوپال۔ ساری بات میں نہیں سنا چکا ہوں کہ وہ کیسے آئی اور کیسے اپنے عاشق کے نام خط لکھو اسکے لئے گئی۔ اب تم اس سے کیا نتیجہ نکالتے ہو؟

مردو۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ جو دماغ پر زور دیا جائے۔ بیدار سادی بات ہے کہ دو انسان ایک دوسرے سے پریم کرتے ہیں اور ہیں۔

گوپال۔ حلد! میں پوچھتا ہوں کہ پریم کیسے پیدا ہو جاتا ہے؟ حلد۔ عجیب اوٹ پٹانگ سوال پوچھ رہے ہو، اسے بھی پچھ پر پچھل میٹھا کیوں ہو جاتا ہے؟ آگ پر وہ کیوں اُٹنے لگتا ہے۔ بلخ کے بچے پیدا ہوتے ہی تیرے کیوں لگ جاتے ہیں؟ تہذیبی بندو آؤ اس کے راتو میں پریم پیدا ہونے کی صورت ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے۔ کہ دونوں کے پہلو میں دل دھڑکتا ہے ... اور پھر حوالی سب کچھ سکھا دیتی ہے۔

گوپال۔ ٹھیک ہے جونی، یہ سب کچھ سمجھاتی ہے۔ اور کوئی چیز ایسا سبق نہیں دے سکتی۔ حلد۔ وہ بالکل خوبصورت نہیں، تہذیبی شکل ہے، کالا رنگ، میٹھے دانت، گہرے کبیل جیسے بال ... مٹے مٹے ہونٹ، شگفتہ سی ... پر وہ جوان ضرور ہے ... اور معلوم ہوتا ہے یہ جوانی اس پر ابھی تازہ تازہ آئی ہے۔

مردو۔ خدا کیسے کہ تہذیبی بندو کا راتو اچھا آدمی جو اس کچھ پریم بچا ہو تجھے تو اپنے بھائیوں پر ایسے معاملوں میں کوئی اہل نہیں ہوگا۔ سافروں کی طرح اس درخت کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ جس کی بھانوں میں انہوں نے ایک دفعہ آرام کیا ہوگا۔

\*\*\*\*\*

(اُس ٹھکانے پر کہ وہاں بندو آیا کا کام کرتی ہے)

مردو۔ چھوٹی میم صاحب! بڑے صاحب کہاں ہیں؟ سو شیلہ۔ اپنے کمرے میں کسی دوست سے باتیں کر رہے ہیں۔ تو ابھی اس طرف نہیں جاسکتی۔

مردو۔ میں ادھر نہیں جانا چاہتی ... مجھے آپ سے ایک کام تھا۔ سو شیلہ۔ کیا کام؟

مردو۔ آپ ہندی ٹیڈ لیتی ہیں نا؟ سو شیلہ۔ تو کیا اسکول میں اتنے برس گھاس چھیتی رہی ہوں ... تو کہنا کیا چاہتی ہے؟

مردو۔ میں ہونے ہونے سب کچھ کیتی ہوں، چھوٹی میم صاحب۔ یہ پتر پڑھ کر سننا دیکھئے ... میٹر پنے میں کھول دوں؟ (کاغذ کی کھر کھر ہٹ)

سو شیلہ۔ کیا پڑھوانا چاہتی ہے تو ... کاغذ کا یہ ٹکڑا تو کہاں سے اٹھا کر لے آئی ہے؟

مردو۔ پڑھیے تو میم صاحب! ... کیا لکھا ہے؟ سو شیلہ۔ از طرف خاص شہر دیتی۔ علی بی ماراں، چوہہ نمبر کا کرو ... یہ کیا ہو اس سے؟

مردو۔ آپ اس کے بچے پڑھیے ... سو شیلہ۔ میرے پیارے، میرے دل سے پیارے راتو! تو نے اتنے دنوں سے اپنی بندو کی سُدھ کیوں نہیں لی ... (زکڑاتی ہے) ... کون ہے یہ راتو؟

مردو۔ آپ سارا پتر پڑھ کر سنائیے ... اپنی بندو کی سُدھ کیوں نہیں لی ... آگے ...

بتایا تھا تم نے؟ ... ہاں ... راتو!  
بندو۔ جی نہیں۔ ... میں اس کی طرف سے جواب لکھنا چاہتی تھی۔  
گوپال۔ (حیرت میں) کیا کہا؟  
بندو۔ (گھبراہٹ میں) کچھ نہیں، بالو جی، کچھ نہیں۔ ... میں بھول گئی تھی۔  
میں یہ کہنا چاہتی تھی (شوک جھٹکتے ہوئے) میں یہ کہنا چاہتی تھی۔  
میں۔ اب، اب میں بھول ہی گئی ہوں کہ میں کیا کیا۔  
چاہتی تھی۔

گوپال۔ حد ہو گئی ہے۔ ... اسے بھی کچھ تو کہو۔  
بندو۔ (جلدی سے) ہاں ہاں! مجھے یاد آ گیا، میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ مجھے ایک ایسا پتہ لکھ دیں، ایک ایسا پتہ لکھ دیں۔  
راتو کو نہیں، کسی کو بھی۔ میرے ہی نام۔ ... جو پریم سے بھرا ہوا ہو۔ جس کو پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آجائیں۔  
پریم آپ کو اچھی طرح نہیں بتا سکی، میرے من کی بات من ہی میں رہ گئی ہے۔ ... میں بھولی ہوں۔ ... اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں!  
گوپال۔ (سختی سے) تم بھولی نہیں ہو۔ بلکہ دوسروں کو ہانگی بنا رہی ہو۔  
بندو۔ میں مر جاؤں۔ جو آپ سے جھوٹ کہوں۔ ... بات یہ ہے، ہاں یہ ہے۔ اب میں کیا بتاؤں کہ کیا بات ہے، میری زبان تالا سے چمٹ گئی ہے۔

گوپال۔ سنو بندو! یہ جال بازیوں میرے ساتھ نہ چلیں گی، ہاں ...  
میں شریف آدمی ہوں جو کچھ تم نے اپنے ادا اپنے داتو کے بلے میں کہا ہے، سب جھوٹ ہے۔ اس کا دل جھوٹ، آخر جھوٹ۔ ... یہ سب من گھڑت مساند ہے۔ ... یہاں آگے کے لئے خط لکھوانے کا تم نے رکھ بھانہ بنایا ہے۔ ... مجھے تمہاری حالت پر ترس آتا ہے، اپنی جوانی یوں روناؤ نہ کرو۔ ... جاؤ یہاں سے چلی جاؤ۔  
اور خیال رہے کہ پھر کسی اس کمرے میں داخل ہونے کی جرأت نہ کرنا ...

بندو۔ بالو جی! بالو جی! ... دیکھا ہی ہوا نا۔ جس کا مجھے کھٹکا تھا۔  
... میں آپ سے کہہ نہ رہی تھی کہ مجھے کوئی بات کرنی نہیں آتی۔ ... (رونی آواز میں) آپ نے مجھ کو بتا دیا تھا۔  
(زیادہ رونی آواز میں) آپ کو کیا معلوم کہ میرے من میں کیا ہے؟  
... چاہیے میں کچھ نہیں بتاؤں گی (رونی ہے)  
(جلنے کی آواز)۔ سسکیاں۔ ... پھر روانہ ہندو کی گئی تھی

سوسٹیللا۔ وہ میری ماری تارے گن گن کر ایتیں کاٹتی ہے (طنز پر اندھ)  
حفاظت بھرے لہجے میں) ہر سے اس کا تیری ہی طرف دھیان ہے۔ وہ سوئی جاگنی، شقی بیٹتی، تیرے ہی نام کی ملا جلتی ہے۔  
اس کا تن من تیری ہی یاد میں ڈوب رہا ہے۔ ... تو کب آئے گا راتو!۔ ... تو میرے پتے ہوئے ہر دے کو کب اپنے پریم سے ٹھنڈک پہنچائے گا۔ ... تو آئے یا نہ آئے، پر تیری بندو سدا تیری بندو رہے گی۔ ... وہ تیری ہے، سدا کی سدا تیری۔ ...

بندو۔ (آہوں میں) سدا کی سدا کی تیری! ... بالو نے ایک ایک بول ٹھیک لکھ ہے۔ میں نے ہی لکھ لیا تھا۔  
سوسٹیللا۔ بندو! یہ تو نے عشق بازی کب سے شروع کی ہے۔ ... صاحب کو پتہ چل گیا۔ تو چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دیں گے۔  
بندو۔ (بھونکنے میں) یکم صاحب! میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟  
سوسٹیللا۔ تجھے یہ باتیں کرتے اور دوسروں سے اپنے خط لکھواتے لاج نہیں آتی۔ ... پھر تو یہی میں ابھی صاحب سے ساری بات کہتی ہوں۔

بندو۔ آپ بے ناطق! بگڑ ہی میں میم صاحب، میں آپ کے کئی پتر اس ہیٹ والے بالو کے پاس لے جاتی رہی ہوں جو سائیکل پر آیا کرتا تھا۔ پر میں نے کبھی سے بھی اس کی بابت بات نہیں کی!  
سوسٹیللا۔ چپ رہو۔ جا اپنا کام کر۔ ... نالائق کہیں کی!

\* \* \* \* \*  
دوسرے روز گوپال کے کمرے میں  
(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

گوپال۔ کون ہے؟ ... اسے بھی دروازہ کھٹو ہے، چلے آؤ۔ ...  
(ڈرڈراتا ہے) نہ چلے یہ لوگ جان بوجھ کر کہ میرا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ کیوں بے کار دستک دینا شروع کر دیتے ہیں۔ ... (حیرت میں) ... اسے۔ ... یہ تو بندو ہے ...  
... آؤ آؤ بندو۔ ... چلی آؤ۔ ...

بندو۔ (شرمیلی ہنسی) جی ہاں، میں ہوں۔ ... بندو!  
گوپال۔ اپنے آپ کے نام خط لکھو، نا ہوگا۔ ... ہے نا؟  
بندو۔ (شرمیلی ہنسی) جی ہاں۔ ... نہیں۔ ... جی ہاں! ...  
جی ہاں۔ ... لکھو نا تو ایک پتر ہی ہے پر۔ ...  
گوپال۔ ہاں ہاں کہہ ڈالو۔ ... اسی کے نام لکھو نا ہوگا۔ ... کیا نام

گوپال۔ اوسے ..... (اپنے آپ سے) حد ہو گئی ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ بات کیا ہے..... عجیب سمجھا ہے..... میں نے اس کے دل کو بہت دکھ پہنچایا ہے۔ کہا بہت کہ وہ بالکل بے گندہ ہو (زور سے) بندو..... بندو..... اوھر آؤ میں تجھے خط لکھ دیتا ہوں (اڑبٹنگ سے) چلی گئی.....

(چند سیکنڈ خاموشی طاری رہتی ہے)

گوپال۔ میں اس کے ساتھ بہت غصے سے پیش آیا ہوں..... میں سنہہ ہینک نہیں کیا، مجھے اس سے معافی مانگنا چاہیے۔ (قدحوں کی چاب، ہینک پھر دروازہ کھولنے) آؤ بند کرنے کی آؤ!

گوپال۔ بندو..... بندو.....

بندو۔ (دو فی آواز میں) جی!

گوپال۔ اوسے تم نوک کاغذ دو رہی ہو؟

بندو۔ (زور زور سے رونا شروع کر دیتی ہے) نہیں تو، نہیں تو!

گوپال۔ بندو، تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

بندو۔ رونا بند کر دیتی ہے (اندھنگیاں لیتی ہے) مجھے کچھ بھی نہیں ہوا..... میں پاگل ہوں..... دیوانی..... اس میں آپ کا کیا کبھی کا بگڑتا ہی کیا ہے؟ آپ چند بول لکھ دیتے اور کسی کا کلچر ٹھنڈا ہو جاتا۔ اس میں آپ کا کیا جاتا؟..... سب پریم کہتے ہیں..... سب پریم کہتے ہیں..... کیا سب پریم نہیں کرتے؟

گوپال۔ کرتے ہیں.....

بندو۔ تو میں بھی کرتی ہوں..... اپنے راتوں سے پریم کرتی ہوں..... جو صرف میرے من ہی من میں ہے..... دوسرے ایسے لوگوں سے پریم کرتے ہیں جو گھر میں رہتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، بولتے ہیں..... پر میرا راتوں جیسے نہیں..... میں نے اس کو آپ بنا یا ہے..... نہ کوئی بندو ہے، نہ کوئی راتوں..... سب کچھ میں ہوں..... میں.....

گوپال۔ (حیرت میں) کیا کہا؟..... یعنی یہ راتوں راتوں کوئی بھی نہیں..... آؤ بندو.....

بندو۔ بندو میں ہوں.....

گوپال۔ بندو تم ہو۔ آؤ راتوں میرے ہی سے کوئی نہیں..... آخر تم کتنا چاہتی ہو؟

بندو۔ میں کچھ کتنا نہیں چاہتی (کاغذ کی کڑکھڑاہٹ) یہ لیجئے اپنا لکھا

ہوا پتر!..... آپ دوسرا پتر نہ لکھ کر دیں، میں کسی اور سے کھوا لوں گی!

گوپال۔ (کاغذ کھونٹنے کی آواز) اوسے..... یہ تو وہی خط ہے جو تم نے مجھ سے اپنے راتوں کے نام لیا، یا تھا..... آخر یہ قصہ کیا ہے میری سچ میں تو کچھ بھی نہیں آتا..... تم آؤ خط لکھو نا چاہتی ہو اور ابھی تک تم نے پیسے کو ڈاک میں ڈالا ہی نہیں۔

بندو۔ میں اسے کچھوں کہاں؟

گوپال۔ کیسے میجر..... راتوں کو آؤ اس کو؟

بندو۔ اب میں آپ سے کہنے بار کہوں کہ یہ راتوں کوئی بھی نہیں ہے..... میں جانتی ہوں کہ آپ بندیں گے، دُنیا بندے گی، پر اس میں کسی کا جگڑنا ہی کیا ہے کہ میں اس کو پتر لکھ دیتی ہوں۔

گوپال۔ کس کو؟

بندو۔ راتوں کو، اور کس کو؟

گوپال۔ پر تم بھی تو یہ کہہ رہی تھیں کہ راتوں کوئی ہو جو ہی نہیں ہے۔ بندو۔ اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں..... اگر کوئی راتوں نہیں بند۔ تو

میں کیا کروں۔ اس میں میرا کیا ہوش ہے۔ میں نے تو اپنے من میں اسے بنالیا ہے نا..... وہ ہو نا ہو، مجھے اس سے کیا.....

میں تو یہی سمجھتی ہوں۔ کہ وہ ہے، میری طرح جیتا جاگتا چلتا پھرتا جیسے میں اس سے پریم کرتی ہوں، ایسے ہی وہ مجھ سے پریم کرتا ہے۔ میں اس کے نام پتر لکھواتی ہوں، گو یا وہ کچ

ہے اور وہ جواب بھی دیتا ہے..... آپ نے پتر اس کے نام لکھا تھا۔ میں نے چھوٹی بیم صاحب سے پڑھا یا، سنا اور

بھمکا کہ وہ میرے سامنے کھڑا ہے۔ اور مجھ سے پریم بھری باتیں کر رہا ہے..... پھر میں نے راتوں کی طرف سے اس کی

بندو کے لئے جواب چاہا، آؤ آپ سے پتر لکھنے کو کہا.....

..... میں سادی بات یہی ہے، جو آپ کی سمجھ میں نہیں آتی..... اب اگر آپ بھگ گئے ہوں۔ تو بتائیے۔ کہ

اس میں کسی کا کیا بگڑتا ہے، جو میں اپنے راتوں سے پریم کرتی ہوں جو اس دنیا میں نہیں پر میرے ہر دے میں رہتا ہے.....

x x x x x x x

(یہ لکھ لاکھور سے دوسرے آؤ بیٹے سے ایک مرتبہ

براؤ کا سٹ ہو چکا ہے)

# تکمیلِ غم

آئے اور کچھ مسکرا کر کہہ گئے  
منزل مقصود کو سوں دور تھی  
راز دارانہ ادائیں حسن کی!  
زندگی کے چند لمحات جیسے  
سرخئیِ افسانہ تکمیلِ غم  
ہو چکی تقسیم جب کل کائنات  
اہل محفل دل بچر کر رہ گئے  
چلتے چلتے راستے میں رہ گئے!  
جو نہیں کہتا تھا وہ بھی کہہ گئے  
سیل اشکِ آرزو میں بہہ گئے  
چار قطرے خون دل کے رہ گئے  
غم اٹھانے کے لئے ہم رہ گئے

لاکھ ضبطِ غم کیا لیکن ضیاء  
خود بخود دو چار آنسو بہ گئے

## قطعات

محرم سے کہا ہے میں نے رازِ الفت ہمدم سے کہا ہے میں نے رازِ الفت  
الفت ہے مگر ایک محتاب تک عالم سے کہا ہے میں نے رازِ الفت  
افتاد پر اپنی کس قدر شاد ہیں ہم پستی کے اندھیروں ہی میں آباد ہیں ہم  
جنت سے نکالا تھا فرشتوں نے جے اُس آدم کم طرف کی اولاد ہیں ہم  
طوفان کی ٹھوکروں سے ڈرنا کیسا ڈرنا تھا تو دوریا میں اترنا کیسا  
پیلا جو ہوا ہے زندہ رہنے کیلئے جینا اُسے ہر حال ہے مرنا کیسا



# آزادی

مسترحم عزیز احمد

افنی دن ووزقی ہوئی کمر سے آئی اور بغیر کچھ کہے مسلسل قبضہ نکالنے لگی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکھنے لگے۔ گریزی چوکنی ناول پڑھنے میں شغول تھی۔ اُنی دن کی اچانک آمد پر اور مسلسل قبضوں سے چہرے پر خطرناک، پھر کتاب کا صفحہ پر لکھنے ہوئے اُنی دن کو تہم نذر لگنے لگے۔

”جیت آزاد ہو گئی میری پیاری، جیسا بالکل آزاد ہو گئی، اپنی دن یہ کہہ کر  
سہ خنہ لگی۔“

”میں تو اس سے نواز ہوا ہوں گی، کس بلا سے تجھے نجات ملی، گرینی نے  
 منہ نہ کھلا۔“

”ہم اپنے سوہرے آزاد ہو گئے۔“

”جیسے رہا ہوئی؟“

”طلاق دے کر۔“

”کیا تو نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی ہے؟“

”نہیں ابھی نہیں، ابھی بقی بھولی ہو، کیا تین گھنٹے کے فاصلے میں وہ غلطی کر سکتا ہے، لیکن میرے پاس اس کا کافی ثبوت ہے۔ کہ“

میں نے مجھے چھوڑ دیا۔ ... غور کرو کہ میں نے اسے ایک ایسے موقع پر  
بروز کیا، ... ایسے موقع پر۔۔۔“

”کیا مجھ سے پوری کیفیت بیان کر سکی۔۔۔ یہاں تھوڑے سے ٹپس کرنے  
مطلق ہو گئی؟“

ہاں لیکن نہیں . . . میں کچھ نہیں جانتی۔ یہ سہا سہا کہتی ہے اور میری جھلی چڑھتی ہے۔

”تم کو یہ ثبوت بلا کہاں سے؟“

”کہانی سے ملنا تم سنا چاہتی ہو..... ہمیں بھی یہی ہو شہاد اور  
جلاک کہوں..... گزشتہ تین ماہ سے وہ میرے ساتھ بہت قابلِ فخر ہیں

ملوک کرتارا، اور دیکھو کچھ اور مخرج بھی ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس عیال کو رہونا ناممکن ہے، بہتر ہے کہ میں اس سے علاقے والے لیکن سوال

یہ تھا کہ کون کون ملاقات کی جائے، کیونکہ یہ اتنی آسان بات نہیں ہے۔ وہ ہر وقت مجھے پریشان کیا کرتا، مجھے ایسے وقت باہر جانے کو کہتا جب میں اپنے

جاننا چاہتی اور ایسے وقت مجھے ٹھہریں خدے کو مجبور کرتا جب باہر سی

”میں کوئی خیال رانی نہیں کر سکتی تم کہے جاؤ؟“

”ہمارے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی۔ اس مقصد کے لئے  
میں نے اپنے بھائی کو بلایا۔ تاکہ وہ کسی طرح مجھے اس عورت کی ایک تصویر

فراہم کرے۔ فرما مجھے اس کا مقصورہ ملے گا۔ وہ نہایت حسین عورت ہے۔  
پھر میں نے اس سے عادات و اطوار کے متعلق چند مطووعات فراہم کیں۔ اس

کے بعد اس شہر کے سو پر فی فیہ کا یہی نام ہے! کاٹھوڈو دیتے ہوئے کہا۔۔۔

مجھے ایک خادمہ کی ضرورت ہے جو اس تصویر کی ہم شکل ہو۔ میں اس کے لئے تمہیں کافی معاوضہ دے گا اگر دس ہزار فرانسیس کی بھی ضرورت ہو، تو

بھی پُر و پیش نہ کروں گی۔ مجھے صرف تین مہینے اس کی خدمات کی ضرورت  
ہے۔ اس نے کھر رستیاں ہو کر کہا۔ کیا آپ کو ایک یا الٹو کہ کٹر خداوند کی ضرورت

ہے۔ میں نے تو کچھ محبوب جو کہ چوب دیا۔ بی بی ہاں ایسا غلام اور شہباز العین  
کی تسنی بہر ہوئی۔ یہ کچھ غلام اب بھی کچھ تہہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے دیکھتے

ہوے اس سے کہا موسیٰ میرے شوہر کے لئے .... وفا کہ میں اسے پہنچا دیاں  
کہ بکوں۔" وہ میرا مطلب سمجھ گیا اور ہنسنے لگا۔

مجھ سے رخصت ہوتے ہوئے اس نے کہا: ایک ہفتہ کے اندر  
خادمہ آجے پاس آ جائے گی۔ تین دن بعد ایک مصروف طبع لڑکی میرے پاس

آئی وہ بہت خوبصورت، خوش ادا، اور جاذبِ نظر تھی۔ اُس نے مجھ سے کہا: خالون! میرا بیٹا کب مرے گا؟ میں نے اس سے لڑکھا: کیا تمہیں

حکومت یہاں تم کس کام کے لئے آئی ہو؟ دیکھو! میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا..... تمہیں کوئی دشواری نہ ہوگی۔

کچھ توقف کے بعد اس نے بولا تھا۔ "آپ کے شوہر کا پسندیدہ ماحول کون سا ہے؟"

کون سا ہے



# پر دینی ادیب کا خط اپنی ماں کے نام

پیاری ماں :

میں جانتا ہوں کہ چار ماہ سے میرا خط موصول نہ ہونے کی وجہ سے آپ بہت فکر مند ہو گئی۔ آپ کی پہلی کہ پر سمجھنے کے باوجود میں نے اتنے دنوں تک آپ کو کوئی خط لکھ کر بھیج دیا۔ مگر یہ سب سب سے سبب تھا کہ میں نے اس کی وجہ سے اس قدر غصہ کیا کہ میں نے آپ کو خط لکھنے سے منع کیا۔ مگر یہ سب سبب تھا کہ میں نے اس کی وجہ سے اس قدر غصہ کیا کہ میں نے آپ کو خط لکھنے سے منع کیا۔

وہی پرانی بات

وہی پرانی بات، وہی افلاس، وہی نظرات میں گھلنا، وہی مستقبل کی جولناکیاں۔۔۔ اہ! میں کیسا بد نصیب اور ناکارہ ہوں، یا میں دنیا کے لئے نہیں یا دنیا میرے لئے نہیں، دونوں میں سے ایک بات ضرور ہوتی ہے، مگر بالکل منقطع ہو چکی ہے۔ آہ! مجھے آزادی تو کجا غلامی تک نصیب نہیں کی گئی تھی، نہ تھی اور نہ تھی اس کا احساس دل میں اتنی شدت سے پیدا ہوا تھا کہ میں نے خود کو کسی کونے کو بھی چاہتا تھا۔ مگر رونا تو اس کا ہے کہ میں یہ بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ والدین اپنی اولاد کی پرورش اس لئے نہیں کرتے، کہ وہ جوان ہو کر خود کوئی کرے، بلکہ مجھے بھی اس کا احساس ہے کہ والدین اپنے بچے کو گھر سے کو اپنے گرم گرم خون سے پیچھے بچھ کر اس لئے پروان چڑھاتے ہیں کہ آئندہ دنوں میں اس کو برسرِ بڑی و بیکھر مسرور ہوں۔ زندگی کے شاہراہ پر اس کو کھانا پھرے و بیکھر کھڑے اپنا سر بلند کر سکیں اور خوشی سے پھوٹے نہ سہائیں۔ مگر غریب والدین کے سہرے خواب، سہرا پر سنا اور شخصیت بلند آئندہ سنا میں اکثر مشر مند نصیب نہیں ہوتے۔ ان کی اولاد کی زندگی تباہ و برباد ہو جاتی ہے، اور ان کے تمام منصوبے خاک میں مل جاتے ہیں۔۔۔

ہر جگہ سوا بہ داری کا ہونا، دیو، غریبوں کو اپنے تیز تیز دانتوں تلے پھیل ڈالنے کے لئے لپٹا لپٹا تاک منہ پھاڑے کھڑا ہے۔ ہر طرف شخصیت پرستی کی ہلک اور خطرناک دیوالیہلی ہوئی ہے۔ جب صورت حال یہ ہے۔ تو پھر مجھ آئیے غریب و نادار کو کون پوچھتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میں بہت بد لکھی ہوں۔ اس کے علاوہ میں کئی ستر یا خان بہادری کا بیٹا تو ہوں نہیں کہ تو کوئی نہیں تو کم از کم کچھ اور پُر زور سفارش ہی مل سکے۔ میری خود ساختہ ہی پرست ہوئی کیجئے۔ اگر میں کہوں کہ آئیے آئیے میرا زادے ڈیڑھ سو دو سو

روپیہ ماہور نواری سے پیدا کر رہے ہیں۔ جو اہلیت و قابلیت کے لحاظ سے مجھے حشر خیر بھی نہیں کر یا تو ان کا کوئی قریبی رشتہ دار کسی شعبہ کا افسر علی ہے یا فیشن ڈاؤن۔ لیکن چونکہ میرے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں اس لئے میں بھیجیں میں روپے کی حقیر ترین ملازمت کو بھی ترست ہوں۔ اندر ہی اندر کڑھتا اور گھٹتا رہتا ہوں۔ دل پر حیرت کے رعب احساس کو بھیجیائے جی چاہے جس، با اگر امیروں کی خوشامدیں یا تاجوں کے سود۔ امیر لوگ اگر سب نہیں تو سناؤں فی صدی ضرور مشغل اور بے درد ہوتے ہیں غریبوں کی بے بسی اور بے چارگی پر ان کی کسی نرمی نہیں آتا۔ بلکہ انہیں اپنی امیری اور غریبوں کی مصیبت میں ایک اظہارِ مسوس ہوتا ہے۔ وہ امیروں کے لئے سب کچھ کہتے ہیں لیکن غریبوں کے لئے ان کے پاس حوصلہ نہیں اور صبر و بردباری کے سوا کچھ بھی نہیں اگر بڑی جہاد کی تو غایت جہاد اور مکاری سے ان کی ہوسری غلامی کرو۔ اہ! ظلم اپنے پناہ ظلم! آخر غریب لوگ امیروں کی خوشامدوں کو کس کی کیوں لیکن افسوس کہ غریب اس قدر بے حس اور ہر لوگ جو چاہے ہیں یا آمرانہ یا لیبیوں سے انہیں ایسا بھرتا دیتا ہے کہ ان کا دل بے حس ہو جاتا ہے جیسے کسی کی جرات نہیں کر سکتے۔ ان کا دل اس غلامی کے لئے کہیں حاف نہیں کر سکتا۔ کہ انہوں نے امیروں کی دیکھا، لیکن یہ سب سبب کے فربہ ہیں بدلتا ہو کر میری تقدیر پر ادنیٰ گارنٹی کئی کے بے حس صفا کرتے۔ اہ! ان کو کتنا حق پھر ہوا ہے۔ اب تو وہ شہر عقیق کو ترہانے بکھائے کا خیال بھی اپنے دل میں پیدا نہ کر سکتے یہ ہیں جس نے کہا کہ ناوار والدین کی اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت سے بوجھتی کا واحد مقصد ہی ہونا ہے کہ وہ جوان ہو کر ان کی پرورش کرے۔ اہ ایسی توقع کرنا بوجھتی ہی نہیں۔ کیونکہ ان کا سہرا بہ بھارت اولاد ہی ہے۔

بارہ خیال آیا کہ ایسی ذلیل اور بے تیز زندگی سے تو یہ نہیں بہتر ہوگا۔ کہ اپنے علوم و محارف سے بھرے ہوئے سر کو ریل کی کڑی پٹری پر ڈال دوں اور وہ ہونٹا ہوا خونخوار ریل کے کچھ کر پاش پاش کر دے، ایک ولد و زچہ بلند ہو۔ اور ساتھ ہی۔ مایہ داری کا دھندہ اپنی کامرانی پر ایک فاکس شگفت قہقہہ بلند کر دے۔ مگر اس خیال کے آتے ہی آپ کی اودا کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ اود میں زندہ رہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔۔۔ پیاری اماں! بہر حال میں جیسے جا رہا ہوں اور اس وقت تک جیتا رہوں گا۔ جب تک کہ

من بلائے نہ آجائے۔ کوئی ہر سانس حیات: موت کے بین بین ہوگی۔

سپیری شادی کی فکر میں نہ ہی مبتلا ہیں میں شادی کرنے کیلئے ہرگز تیار نہیں۔ کیونکہ میرے جذبات تو مردہ ہو چکے ہیں۔ میرے سینے ٹھوڑا سا سے ندی محفوظ ہو چکی ہے۔ وہ لوگ فریب نظریں مبتلا ہیں۔ جو میرے ہڈی اور گوشت کے عیجان و حیا کے ساتھ زندگی جیسی گرائنڈ چر کر دہا بہت سمجھتے ہیں۔ ایسی حالت میں میرے کمزور شانے شادی کی ذمہ داری اٹھا کر کھینچ سکتے ہیں۔ خود اپنا وجود میرے لئے ایک بارگراں ہے۔ جس کو بعض وقت میں اٹھائے پھر سنبھال چھوڑوں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میری تمام پریشانیوں کی ذمہ داری میری شاعرانہ طبیعت سے آتی ہے۔ یہ سچ نہیں ہے مجھے کاروباری ذہن کے ناقابل بنا رہا ہے۔ مگر ایں تنگ نظروں اور کم مغزوں کو کون جھٹکے نہ سناؤ؟

مزاج کے باوجود مجھ میں کام کرنے کی صلاحیت بددعہ اقم موجود ہے جس کی کمی  
استحسان نہ لیا گیا۔

ان دنوں میں ہسپتال میں دیباہ پڑا ہوں۔ آپ کو اپنی نیا ہی کھلا۔  
اب نکلس خیال سے نہیں کھٹکتا۔ میری مسلسل پیروکاری ہی کا صدر آپ  
کے لئے کیا کم ہے؟ اس میں اور بھی اضافہ کر دیں۔ ہر چند کہ مجھے یہاں کوئی نظریہ  
نہیں ہے۔ پھر بھی وہ آرام اور سکون کہاں جو آپ کے مقدس دھنوں سے ملتا تھا  
کے سہارے جانتے ملے تیرا نام ہے، میری نصیحت کیلئے آپ کے الفاظ بھی یہاں  
کی اودیات سے زیادہ مفید ہیں۔ ورحال اب میں اچھا بھولوں دو ایک شعر کہتے  
باکل تندرست ہو جاؤں گا۔ آپ نکلے نہ کریں۔ اب ان کی خدمت اقدس میں میرا  
سلام۔ اور حقیق اور عصمت کو میرا بہترین پیار۔  
سوا گوارہ حیات  
آپ کا غم فیضیہ

# نئی کتابیں

آتش خاموش  
۱- سالن دانش

جاوہ نق  
احسان نق

سرمايه دارى  
از عيب ملك

نوائے کارگر  
احسان دانش

ساز فطرت  
حسن عزیز چاہیے

سید اختر حسین - محمد عبدالغفور  
دیف حاکمیت جوڑ  
انٹرنیشنل ونگار

وہمہ اندیشین

باسق پھول - پیدل باس  
شب غم - ایام کا  
طسم خیل - کرشن چندر  
نور مشرق - فاطمہ

یہ ناول بہترین ٹیٹ اپ ہے  
یہ ناول بہترین ٹیٹ اپ ہے

نیپلو  
حسن بیجاو  
عم

پہلے۔ ترقی پسند۔

ن۔ مقررہ پیشہ منہ کی ہر  
ہر کے افسانوں کا مجموعہ ہے  
نہ اوس۔ مجاہد قمریت عبد

نصویر احساس - الطاف  
عمر حاضر کے بڑے بڑے  
ہندو تلوں، دھرم پیناں اور  
نیا غلط

چند روز بعد  
 کے لوگ۔ حصہ اول  
 برائے مرزا محمد دہلوی

مشاورہ عالم  
کے اے۔ حمید

ایک ایسا  
چاندیوں کا

ترکی جمہوریہ - ترک

بیت دل دوزخ کی جگہ  
خستہ راہ بنی ہوئی ایمان  
میں متعلق مستند کتاب

گنودان - انشی پریم چند مر  
لینن - روس کی رہا پانہ  
النسات - لایہ کا انشی رام

مکانیا ناول ..

کھیلے کا پھل  
شدیا و جہاری

اندرسی و نرس  
اخترت النفا  
عمر

اردو کے بہتر  
صحفانہ کے خطوط

میں نے دیکھی۔ جلد و مطلقاً۔  
میں نے دیکھی۔ جلد و مطلقاً۔  
میں نے دیکھی۔ جلد و مطلقاً۔

دیوان غالب علی -  
تتمت محمد انگریزی

قدسی بی، اسے ہر

معیار محبت  
سیاح منامی  
عمر

ادبستان  
خلیق دہلوی

ڈاچی  
ادپدرمانہ اشک  
عبر

مکمل  
ملنے کا پتہ :-

دَوْلَتِ

چاندان  
احسان دانی

کھڑکی آپ بیتی

# حاکم و محکوم

اس طرح اس دور نے بدلی ہے انسان کی شرت  
 اک طرف حاکم کی آنکھوں میں خوشامد کا خمار  
 اک طرف محکوم کی باتیں ریا کا اشتہار  
 اک طرف کچھ بد دماغوں کو حکومت کا دماغ  
 اک طرف اک یادہ گوجاہل کا انداز خطاب  
 اک طرف ابن شغال ابن شغال ابن شغال !  
 اک طرف روج ہوس کاری کا تزک و احتشام  
 اک طرف بیباکی و شہوانیات و حرص و شر  
 اک طرف شیخی و قار اپنا دکھانے کے لئے  
 روک ان بستی کے دلدادہوں کو اے دنیائے دوں  
 حاکم و محکوم دونوں کی ہے فطرت ہیچ و زشت  
 اک طرف محکوم کی باتیں ریا کا اشتہار  
 اک طرف کچھ بے حیا دامان خود داری پہ داغ  
 اک طرف سو سوتھیم یاودہ گوئی کا جواب  
 اک طرف پرہائے رسوائی نہ عزت کا خیال  
 اک طرف اہل وفا کا دونوں ہاتھوں سے سلام  
 اک طرف بیہوشی کی عزت بھی نثارِ سیم زور  
 اک طرف کچھ لوگ ہاں میں ہاں ملانے کیلئے  
 ہونہ جائے ان کی ذہنیت سے بشریت کا خون

عظمتِ اولادِ آدم کا انہیں عرفاں نہیں !

حاکم و محکوم دونوں میں کوئی انسان نہیں !

# دیوانی

(۱)

ایک تارککرات کو جبکہ فضا میں کیشف بادل چھا رہے تھے کلا منوہر کو فضا میں چپٹے پٹنگ پر دیوار سے سہارا لگائے بیٹھی تھی سامنے کرسی پر ریش بالو کوئی خط پڑھا تھا۔ اتنے میں ہاول زور سے گر جا۔ بچے نے ڈاکٹر نکھیں کھولیں۔ اور بچی بچی آواز میں رونے لگا۔ کلا نے بچے کو سینے سے چٹایا۔ پھر چپے کے ساتھ دوائی اس کے منہ میں ڈالنے لگی۔ بچہ برابر روتا جا رہا تھا۔ اور اس کا چروا بل پیلٹا گیا تھا، دوائی اس کے منہ سے نکل کر اس کی ٹھوڑی اور گردن پر نہنے لگی کلا گھبرا گئی اور مضطربانہ لہجہ میں بولی۔

”منوہر کے بتا! ڈاکٹر کو بلاؤ۔“

ریش نے خط کرسی پر رکھ دیا۔ اور پٹنگ کے قریب پہنچ کر بچے کو دیکھنے لگا۔

”ڈاکٹر کو بلاؤ۔ جلدی کرو۔ حالت بہت خراب ہے۔“

”باہر بادش ہو رہی ہے“ ریش بالو نے بھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو کیا ہوا۔ بچے کی حالت دیکھتے نہیں! دمگ بالکل زرد ہو گیا ہے“

”خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو۔ پتہ ٹھیک ہے۔ ادھر لاؤ۔“

”ہیں۔“

”نہیں اسے رہنے دو ہمیں تم ڈاکٹر کو بلاؤ۔“ کلا نے منوہر کو کر کہا۔

”صبح ہسی۔ اب تو رات کا وقت ہے اور پھر بادش۔ ایسے میں

ڈاکٹر کیوں آئے لگا۔ اسے کیا مصیبت پڑی ہے؟“

”تو میں جاتی ہوں نہیں تو اپنے بچے کی جان عزیز نہیں۔ مگر مجھے تو عزیز ہے۔“

یہ کہہ کر کلا بچے کو بستر پر لائے لگی۔ یہ دیکھ کر ریش بالو بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد کلا نے بچے کو پھر گود میں اٹھا لیا۔ اور ہولے ہولے اس کے ہنری بالوں میں انگلی کرتے لگی۔ اس کی نگاہیں دودانے پر جمی تھیں۔

بچے کی حالت متغیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقہ اور گہرے ہو گئے تھے۔ اور وہ زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ کلا نے مضطربانہ

نجد لا بجایا۔ منوہر اگر ریش بالو کی تمام تہاؤں کا مرکز تھا۔ مکمل لائے دیکھ کر کہتی تھی۔ اور اس کی وجہ تھی۔ کامل تیرہ سال تک رات دن مسلسل التجاس کے بعد انہیں پرنا ماکہ رہا ہے۔ بچے کی شکل بھی خراب ہوئی تھی۔ اس نے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ دونوں اپنے بچے کو زندگی کا حقیقی سرہانہ دیکھتے۔

وہ دونوں منوہر کے متعلق طرح کی سیکمیں بناتے رہتے۔ ریش بالو کہتا۔ جب منوہر پانچ سال کا ہو جائے گا تو ہمیں اسے سکول میں داخل کر دینگے وہیں پورڈنگ میں رہینگے۔ پورڈنگ میں رہنے سے بچے کے خلاق کی خاص نگہداشت کی جائے گی۔ گھر میں تربیت ناقص ہوتی ہے۔ اس پر منوہر کی مال کہتی۔ میں تو اپنے بچے کو پورڈنگ میں بھیجوں گی۔ آپ ماسٹر گھر پر آکر پڑھا جائے گا۔

”اب ہمیں یہ مکان بھی تبدیل کرنا ہوگا۔ دیکھتی ہو۔ ارد گرد لیتا غبار اڑتا رہتا ہے۔ بچے کی صحت پر اس کا بڑا اثر پڑے گا۔“

”میں تو چاہتی کہ بچہ کی کوشش کی کوکھی کے پاس ایک چھوٹی سی کوکھی خالی ہے۔ کرایہ بھی زیادہ نہیں صرف پچاس روپے ہے۔“

”پچاس؟ یہ تو بہت زیادہ ہیں؟“

”ہوں“ کلا بچے کی پیشانی کو چوم کر کہتی۔ میرے منوہر پر آنکھوں پڑے قربان! پچاس روپے کی کیا حقیقت ہے؟“

غرض وہ اس قسم کی خیال آرائیاں کرتے رہتے۔

جب منوہر پانچ سال کا ہو گیا۔ تو ریش بالو اس کی تعلیم کے متعلق انتظام کرنے لگے۔ لیکن اس سے پیشتر کہ کوئی بندوبست ہو، منوہر کو ہلکا سا بخار ہو گیا۔ خیال یہ تھا کہ دو تین دن کے بعد یہ معمولی سی حرارت دور ہو جائے گی۔ لیکن آنکھوں گرد گئے اور اس دوران میں بخار نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ والدین مضطرب ہو گئے اور بچے کے علاج سب لہجے میں انتہائی کوشش کرتے گئے۔ کلا بار بار ڈاکٹر کو بلائی اور جب وہ آتا تو اس سے بچے کی بیماری کے متعلق کئی سوال ایک ہی سانس میں پوچھ لیتی۔ ڈاکٹر تسلی دیتا۔ بیماری کو ایک معمولی سی حرارت بتاتا مگر بے قیامت دیکھ رہی تھی کہ اس کا لخت جگر رو برو زور زور دیکھتے ہوئے جا رہا ہے۔

مگر منور بھی وہیں ہے۔ ایچھے دوست جو اس کے، آئندہ اسے ساتھ لایا کرو۔  
ہی تو اپنے بھولیوں کا کام ہے؟

ریش بابو نے لاکھ کوشش کی کہ اس کی بیوی کا جھوٹا غم دور ہو  
سب، مگر بے سود: کلا کا وہم بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ ہانگل ہو گئی۔ یہ دیکھ کر  
ریش نے غصہ، ان بیوی کو اس کے بھائی کے ہاں بھجوا دیا۔

ریش نے دیکھا ہی ریش کو شادی پر مجبور کر رہے تھے۔ اور اب تو  
ان کا اصرار اور بڑھ گیا۔ آخر ریش نے شادی پر اپنی رضا مندی ظاہر کر دی۔  
ایک سو: گھر آنے میں باس چیت ہوئی اور دو تین ماہ کے بعد وسنتی بچہ شیت  
ہندی کے ریش کے گھر میں آگئی۔

دیوانی کلا اپنے بھائی کے گھر چند دن تو مجنونا نہ دکتیں کرتی رہی اور  
پھر اس کی حالت میں سکون پیدا ہو گیا۔ جب تک کہ عورتیں ریش بابو کی نئی  
بیوی کے متعلق گفتگو کرتیں تو وہ بڑے غور سے ان کی باتیں سنتی اور ایسا سلوم  
اتو۔ لیچھے وہ سب کچھ سمجھ رہی ہے۔ ہر ایک بات کا اندازہ لگا رہی ہے۔

ایک دن اُس نے سنا کہ ریش بابو کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے۔ یہ خبر  
سننے ہی اسکی آنکھیں پھٹ گئیں۔ آدھ جب شام کے وقت اس کا بھائی دکان بند  
کر کے گھر آیا تو وہ اس سے پچھے لگی۔

"ہیں ہاں جاؤں گی۔ ان کے گھر"

"ان کے گھر۔۔۔ لیکن لاہور جی تو شے میں ہے اور وہی تہا ری سہلی  
ہے؟ اس کے بھائی نے کہا۔

"نہیں وہاں نہیں۔۔۔ میں ان کے گھر جاؤں گی۔ جن کے  
ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ بہتیں علوم نہیں؟" کلا نے مسکرا کر کہا۔

ریش بابو کے گھر

دیوانی اثبات میں سر ہلانے لگی۔

"بھلی کہیں کی۔۔۔ وہاں بیٹھو۔ کھانا کھا لیا ہے کہا؟ یہ کہہ کر کلا کا

بھائی نہانے کے لئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

رات کو بھی دیوانی یہی الفاظ دہراتی رہی اور دوسرے دن تو وہ  
درو: نہ سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔

ریش بابو کو اس کی خبر مل گئی۔ وہ آیا اور کلا کے بھائی کو سہا بھسا  
کر کلا کو اپنے ساتھ لے گیا۔

کلا نے جب گھر سے ہٹ کر آتے ہوئے گول مول بچے کو دیکھا تو وہ  
اس طرح خوش ہوئی جس طرح ایک لڑکی نئی خوبصورت لڑکا کو لے کر خوش ہوتی  
ہے۔ اس کا دل ہل گیا۔ وہ ہر وقت بچے کو گود میں لئے پھرتی، اُسے کھلاتی  
اور طرح طرح کی آوازیں نکال کر ہنسائی۔ رزائن بھی کلا سے مانوس ہو گیا۔

مگر وہ بارہ بچے کے منہ میں دوڑائی ڈالی مگر پچھلے کی طرح یہ بھی خلق سے بچے  
نا انزی۔ کلا نے لوکر کو آواز دی۔

ریش بابو ڈوکر کو اند آیا۔ کلا نے اسے دیکھا ہی بلند آواز میں کیا  
'ڈاکٹر آگیا؟'

"ہیں کہیں کیا غصا؟" ریش نے کہا اور بچے کو پلٹنے کے لئے ہاتھ  
ڑھائے۔

ڈاکٹر نہیں آیا۔۔۔ تم ڈاکٹر نہیں لانے۔۔۔ میں ایچ؟

مگر وہ تو "ریش بابو نے کہا، اور بچے کا سوا کھا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ  
میں پکڑ لیا۔

"مشکو! ڈاکٹر کو لاؤ۔۔۔ جلد ہی نہ!"

مشکو اپنی مالکہ کا حکم سن کر کمرے سے نکل گیا۔

بچے نے ایک لمبا سانس لیا۔۔۔ اور اس کے بعد ماں کی آغوش  
میں منور کی نش پڑی تھی!

(۳)

منور کے فوت ہوتے ہی ریش بابو اور کلا کو ایسا محسوس ہوا۔  
جیسے ان کی زندگی کا تمام سرمایہ لٹ چکا ہے۔ ان کی دنیا بھییا کٹا کٹ کر  
ہیں ڈوب گئی ہے۔ اور ان کی ستریں ہیشہ کے لئے خاک نہاد ہیں۔ دن ہو چکی  
ہیں۔ کئی دن تک تو وہ دونوں بے حس و حرکت چپ چاپ، افسردہ و پشیمانی  
ہیں بیٹھے رہے۔ گو یاد نہ گئی اور کائنات سے بیزار ہو چکے ہیں۔

مرد کو عورت کے مقابلے میں دل بہلانے کیلئے زیادہ ذرائع حاصل ہیں  
وہ گھر سے باہر جا کر اپنے دوستوں کی محفل میں اپنا غم غلط کر سکتا ہے۔ مختلف تفریح  
میں حصہ لیکر اپنی توجہ زندگی کے غمگین واقعات سے ہٹا سکتا ہے۔ مگر عورت۔۔۔

آہ بالخصوص عورت ان تحریریں و سلاسل کے مجبور ہے۔ وہ گھر کی چار دیواری میں  
'جنت' غم و حسرت میں ڈوبی رہتی ہے۔ اس کی توجہ کسی اور طرف منحرف نہیں ہو  
سکتی۔ چنانچہ ریش بابو عزیزوں اور دوستوں کے بار بار کہنے سے بہت حد تک

سنبھل گیا اور آہستہ آہستہ اپنے منطقی فرائض انجام دینے لگا۔ مگر بد قسمت  
کلا کی متالم حالت میں ذرا بھر کی توقع نہ ہوئی، اس کے سینے کا زخم گہرا سے گہرا

ہوتا گیا۔ وہ ہر گھر میں، بچے کے خیالات میں ڈوبی رہتی تھی تو وہ اس کی کڑیوں  
کو پہننے سے لگا کر اس طرح چیمنے لگتی کہ ریش بابو اور گھر کے دوسرے لوگ گہرا

بلتے۔ کبھی وہ منور کی چھوٹی سی چارپائی پر ہاتھ پیر پیر کر مادرانہ شفقت سے  
منور دیکھنے میں لگتی۔ منور: دیکھو تو صبح ہو گئی اور تو ابھی سو رہا ہے۔ اٹھو مگر ان

کو یاد کو دہیر کر کے جاؤ۔ اٹھو بیٹا! صبح دیر تک سوئے رہنا ٹھیک نہیں۔ اور  
کبھی وہ لڑکی ہنسائی کے بیٹھے، اور نہ رونا کھونڈ کر کہتی: تو تو سکول سے آگیا

دی۔  
"بالوہی۔"  
ریش بابو جلدی سے اٹھ اس کے پاس نظر نہ کرکھڑا تھا۔  
"وہ۔۔۔ میرا بے لایا ہے۔۔۔ زخمی۔"  
"میرا لایا ہے کہے؟"  
"باہر آکر دیکھئے!"

ریش بابو سے جلدی سے پہلے پہنچنے اور وہ ان کے پاس آیا۔  
دروازے کے پاس ایک ٹانگر کھڑا تھا۔ ریش بابو نے اس کے پاس پہنچا کر مانگی۔  
کھلاڑھی پڑی تھی۔ اور ریش کے ہر سائے پر ہر لال نے اسے تمام دکھانے  
"کیا ہوا؟" ریش نے گھر آکر پوچھا۔  
"ہونا کیا تھا۔ آپ نے اس کا خیال نہیں کیا۔ آپ بخوبی جانتے تھے  
کہ یہ دیوانی ہے۔ پھر بھی گھر سے باہر نکلے دیا۔ اگر میں اتفاقاً وہاں سے نہ ہوتا  
تو اسے یہاں کون لانا؟" میرا لال نے کہا۔  
"بات کیا ہے بتاؤ تو؟"  
"کھلاڑی کو بال کے مکان کے پاس لائے کے نیچے آگئی۔"  
ریش نے جھٹ کر کھلا کے چہرے کو دیکھا۔ کھلا کے چہرے پر ایلیم  
سرخی سی آگئی اور وہ ریش بابو کو انہماک سے دیکھتے ہوئے  
بولی۔

نران۔۔۔ بچہ۔۔۔ ڈاکٹر۔"  
کھلاڑی نے یہ الفاظ وہ بار کہے اور چہرہ اس کا ہمیشہ کیلئے ہمیشہ کیلئے ہو گیا۔

اتنا اس پر گیا۔ کہ کھلا کے مقابلے میں اپنی کسی کم ہمارے لگے  
کئی سال گزر گئے۔ اچانک نرائی جیاد ہو گیا۔ معمولی سا جلد تھک گئی  
کو کوئی بچہ مضطرب نہیں ہوا تھی۔ جو بچہ کھاتے کے ذریعے نکال دیتا۔  
ایک رات دوستی جیاد ہو گئی کہ وہ اس کے قریب کھلا  
بیشی منتظرانہ لگا ہوں سے رات کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اور ان سے کہنے  
اور ریش بابو لیٹا تھا۔

دوستی نے بچے کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ہن سخت گرم ہے۔ جلتا  
منا کہ یہ معلوم ہوتا ہے صبح سر سے ڈاکٹر کے پاس سے جانا۔"  
"بہت گرم ہے ہن۔" ریش نے کہا۔ "رات میرے گز سے۔  
جس ڈاکٹر کو میں لے آؤں گا۔"  
کئی منٹ گزر گئے۔ ایک ایک دوستی نے سانس کی کرسی کو خالی دیکھ کر  
کہا۔ "کھلا کھلی گئی۔ ابھی یہاں بیٹھی تھی۔"  
"دوسرے کمرے میں ہو گئی۔" ترلا وہیں ہے۔ اور ہاں صبح جو وہاں  
ڈاکٹر سے لایا تھا۔ وہ بچے کو پلائی۔

"وہو! اس کا تو خیال ہی نہیں رہا۔ وہ المدی میں پڑی ہے۔" بیٹی  
بولی۔  
ریش نے اٹھ کر وہاں نکالی اور بچے کو پلا لے لگا کھ دیر کے بعد  
بچے نے آنکھیں بند کر لیں اور سو گیا۔  
ریش بھی الینان کے ساتھ لیٹ گیا۔ وہ بچے کو گھنٹوں کے بعد اکی  
آنکھ لگی۔ اور ابھی وہ بچہ ہی طرح سے یا بھی نہ تھا۔ کہ اسے ایک بندہ آواز سنائی

# کمپنی کی حکومت سوشلزم کامیابی بادی کی چادر کیا ہیں کیونسٹینٹینی فیسٹو

خیال کیا ہے۔ اس کے اصول کیا ہیں، مثلاً وہ لڑنے نظام جس  
سوشلزم کی تشکیل کرنا ہے۔ اس میں امیروں کیلئے سب کچھ  
ہے اور غریبوں کے لئے کچھ نہیں ہے۔ اس کے سوا قیاس کیا  
کھا نہیں ہیں اور کھلا جیاد ہے۔ کیا اشتراکیت ملے  
اور حکومت کی تشکیل کو ختم کر سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب  
کمال اس کاوست، دست فیکلے لنگرا اپنی کتاب میں بتا  
ہے۔ کتاب پر جو جیاد ہے اس کے لیے کہ کتابت طباعت اور  
کاغذ نایاب طائر ہے۔ قیمت صرف چھ آئے (۱۱)

رگین اکار لال اور بیگم کے طرز بیان  
پر ہندوؤں کے اس حوالہ دہرہ شوش کی مثال پر  
سوشلزم کے سببوں کے نتائج کے اقتصادی نظریوں  
کی تشریح طرز بیان ضعیفانہ اور نہ جوش۔ اس کا ہر وقت  
قادی کا خون گر بنے کے لئے کافی ہے۔ اس سے بہتر کتاب  
آج کے لائے نہیں۔ بیٹی۔ کتاب ایک خوفناک ڈراما ہے۔  
کرداروں کی سیرت انہی ہے ان کی حکومت عملی کا۔ کتابت  
اغلے۔ قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آئے۔ (۱۲)

استقامتی منشور۔۔۔ کارل مارکس اور فریڈرک انگریز کا  
وہ اشتراکیت نشور ہے جسے یونسٹون کی نزدیک بائبل کا دوم  
حاصل ہے اس کتاب کو نیا کی نام متعدد بالفردی ترجمہ  
ہر جگہ ہے۔ کامریڈ باؤ کی کہ فیڈرلے کتاب کی اصطلاح  
مشکلات کو بہت آسان کر دیا ہے کہ وہیں پہلی مرتبہ  
کمال اس کے۔ جسے بائیں صاف بنے نہایت  
کمال اس کے۔ محنت کے ساتھ اپنے مخصوص  
رنگ میں دکھایا ہے۔ زیر طبع۔ قیمت صرف چھ آئے

مکمل طور پر۔۔۔ وہ لائے



# نوائے راز

سرشکِ عنس کو مرے سوز نے عادی ہے      وفانے تشنگی جذبِ دل بجا دی ہے  
 بڑی نگاہ نے کیا شے مجھے پلا دی ہے      دل و جگر میں یہ اک آگ سی لگا دی ہے  
 سکون و امن کی دنیا ہے میرا گہوارہ      کو میرے پیش نظر رنگِ بوکِ وادی ہے  
 وہ راہ جس پہ جھلکتے ہیں تیرے نقشِ قدم      وہ راہ ذوقِ طلب نے مجھے سمجھا دی ہے  
 ترے تبسمِ رنگیں کے حسلِ زاروں پر      لطافتوں نے جوانی سی شے لٹا دی ہے  
 تمہارے ناز کا پرورن ہے نیاز مرا      تمہیں نے رسمِ ورہِ عاشقی سکھا دی ہے  
 ترے خیال نے نورِ حیات بجٹا ہے      ترے جمال نے تمغیل کو جلا دی ہے  
 تمہیں نے میری تمنا کو کر دیا گستاخ      تمہیں نے جبرأتِ اظہارِ مدعا دی ہے

مجید میری زباں پر لگی ہے مہرِ سحر  
 نظر نے دل کی حدیثِ الم سنا دی ہے

شیر محمد اختر

# برکھارت

"ماں توج پانی نہیں تھے کا پینکے نے روتے ہوئے ماں سے پوچھا۔

پینکے کبے ہوئے نیند کی وجہ سے بھاری ہو رہے تھے۔ بھوسونا چاہتا تھا مگر کمرے میں آتی جگہ روکتی کہ ماں اُسے انگ چار پانی ڈال دیتی۔ چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں چار پائیاں چھٹی تھیں۔ ایک پر گھر کے سارے برتن رکھے تھے۔ وہ سرگرمی سے بیستر وغیرہ اور ایک دو شکستہ ٹرنک اور تیسری پر بیماریاں بچان پڑا کر رہا تھا۔ اس کے پاس چھوٹی لڑکی سو رہی تھی۔ بڑا لڑکا چار پانچ برس کی عمر، ہانپنے پاؤں کی حرکت بیٹھا اور گھر رہا تھا۔ اور ماں کمرے سے بارش کا پانی نکال رہی تھی۔

متواتر کئی گھنٹوں سے بارش ہو رہی تھی۔ جس گلی میں بھان کا مکان تھا وہ ذرا نیچی تھی۔ اس پاس کے کوچوں اور مکانوں کا پانی اس طرف آجاتا۔ اور غریبوں کی چھوٹی چھوٹی کوشریں میں گھس کر ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیتا تھا۔ ایک دو تنگ کو گھر یا پھر بھان بھان جیسے اور بھی بہت سے مزدور کا پیشہ لوگ رہتے تھے۔ پہلے ہی بہت گندی تھیں۔ مگر جب کبھی بارش ہوتی اور پانی اندر گھس آتا۔ تو ان کے ہرن وغیرہ سب پانی میں تیرنے لگتے۔

ساون کا ہینہ تھا۔ اور موسلا وحار بارش ہو رہی تھی۔ باغوں میں جھولے پڑے تھے۔ نوجوان لڑکیاں اپنے نمروں سے لٹکا کو مگر رہی تھیں۔ ساون اپنے ساتھ نئی انگلیں نئے دلوے اور نیا جوش حیات لاتا ہے پہلی پانی کہاں کہہ کر دی ہوئی چنگا رہاں روشن کر دیتا ہے۔ پانی کی پھوٹا کر کسی کے آنسو بہن کو ہرے ہرے کھیتوں کو اور بھی پُر رونی بنا دیتی ہے۔ انہوں کے کچھ مرادوں کے دن۔۔۔ بارش سے جھینگے ہوئی لڑکیاں تھرتکتی، کانپتی اور بدن سے چپکے ہوئے کپڑوں کو بدن سے جدا کرنے کی ناکام کوشش کرتی ہوتی کہیں رہی تھیں۔ حسن، جوانی اور ساون کی برسات۔ اف۔۔۔ ایہ سماں !

بھان کی بیوی کمرے سے پانی نکال رہی تھی۔ اس کے لئے ساون کا ہینہ ایک قیامت تھا اس کا خاوند ایک معمولی مملکت تھا۔ اور بچاہ کئی دن سے بیمار پڑا تھا، اگر زہر دست ہوتا، تو بھی کیا کرتا؟ مکانوں کی تعمیر کا کام ساون کے سینے میں اکثر زہر دیتا ہے۔ اور وہ تھا بھی کونسا بڑا کلونیر۔ برکھارت۔ ان کے لئے ماؤ رمضان کے مترادف تھی۔ ایک وقت کا کھانا اگر میرا آ جاتا۔ تو بھی غنیمت تھا۔

بھان کی بیوی نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔ بچوں کے لئے وہ اپنے

بھائی کے ہاں سے چند روٹیاں اور مقدوڑا سا سالن مانگ لانی تھی۔ شہر پہ لہا جلا ہی نہ سکی۔۔۔ آدھ گک کہاں جلاتی؟ مگر میں سوچی جگہ ہی نہ تھی۔ پکاری ستام سے کوئی بل کرے سے پانی نکال چکی تھی۔ اور مگر کالنی محدود ہے۔ پانی سے بھر جانا

کمرہ ایک اچھا خاصا دل بنا ہوا تھا۔ نالی کا گندہ پانی وہ ہاں ہاں سے نکال کر باہر پھینک دیتی تھی۔ کمرے میں نا قابل برداشت قحط تھا۔۔۔ خاوند کی بیماری، بھوکے بچے اور ان کے سونے کے لئے جگہ نہ ارد۔ وہ کہاں اور کیا نہ کرے۔ رحمت اس کے لئے رحمت بن چکی تھی۔ وہ بھی تو باطنی ساری مگر بڑھیا معلوم ہوتی تھی۔ اس کا شباب عزیزت اور انفلاس کی نذر ہو چکا تھا غریبوں پر تو شباب آتا ہی نہیں۔

ساون کا ہینہ کبھی وہ بھی اس کا پتہ تالی سے انتظار کیا کرتی تھی۔ جھولے پڑے پھر کر چند دن وہ بھی کاٹی تھی۔ پانی کی باونے اسے بھی مسئلہ باغ آدموں کے کچھ میں دوسری لڑکیاں اسے چھیڑتی تھیں۔ کہ تیرانی تو شہر میں کل بنانا ہے۔ وہ تیرے لئے ہنگامہ بنایا گیا۔ جس کے گرد بلغ ہو گا۔ اور تو بہم صاحب بن کر اس میں ملا کر گی۔ پرسن کر وہ شرم کے مارے لال ہو جاتی۔ اس کا من ہی زہر ہوتا تھا اس کو پانی شہر میں لوگوں کے لئے مکان بنانا تھا وہ اس کے لئے بھی مل بنائے گا۔ اور وہ دور سے جھولا جھولا کر اکثر کا یا کرتی تھی۔

اُچھیاں تے کیاں ناہاں نی نے صبح ساڑی سے پینکے کا سا

گر آج۔۔۔ آج اسے سب کچھ بھول گیا تھا۔ اور وہ حسرت و امان کی ایک تصویر تھی

بھان کی بیوی کو خاوند کا شکوہ نہ تھا، وہ دیندار تھا اور ایک بھتی تھا، اور وفا شعار۔ اس کے باوجود وہ غریب تھا۔ اس میں اس کا کیا قصور۔ بارہ گھنٹے کا کام کرنے کے بعد بھی اسے بال بچوں کے پیٹ پالنے کے لئے بعد۔ شکل کچھ میرا آتا تھا۔ اس نے محنت کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ کبھی تھی۔ مگر بڑی بچوں کا پیٹ نہ بھرتا تھا۔

وہ دن میاں بیوی بچتے تھے۔ کہ اس میں زیادہ تر ان کی قسمت کا مل ہے۔ اس لئے دونوں اپنی قسمت پر شاکر تھے۔۔۔ غریب شکور کے ہوا اور کبھی کیا سکتے ہیں؟

اُن کے گھر کے سامنے مسجد تھی۔ اور مسجد سے ملتی مولوی صاحب کا مکان

مولوی صاحب کے برتن بھی دھوئے۔ کئی کئی راتیں اور دن ان دعوتوں کے کام کاج میں صرف کر دیئے۔ ان دعوتوں کا اہتمام دیکھ کر وہ سوچا کرتا تھا۔ کہ کاش ان میں سے ایک پلیٹ کی ڈاگت ہی مولوی صاحب اسے حق نسبت میں دے دیتے تو اس کے بال بچوں کے دو تین دن گزر جاتے۔

شام سے بھان کا بخار اور تیز ہو گیا تھا۔ اس کی بڑی شام سے ہی پانی نکالنے میں مصروف تھی اس لئے وہ اس کی طرف توجہ نہ کر سکی۔ اس نے لڑکی کو تو بھان کے چہرے ہونے دن سے ٹکا ٹکا دیا۔ مگر روکے کے لئے باجہ مٹی وہ بھان مٹی خود کی تھوڑی بھاری مغربہ اور بارش سے اس کو بے حال کر دیا۔ اس کے دل و داغ میں ایک بھات پیدا ہو رہی تھی۔ اسی ضمیر بکار بکار سے کہہ رہا تھا کہ اسے بد بخت لڑکی تو مزدور کی بیوی ہے۔ اس دن میں تیرے لئے چین نہیں مزدور کا ابو امیہ کی دلچسپی و شہرت میں غلبہ نہیں کرے گا۔ کچھ اس حالت میں رہنے کے لئے امیہ روئے دھونگ رچا رکھا ہے۔ اگر تو بھی آج بالدار ہو جائے۔ تو تمام محلے میں تیری بھی عزت ہو۔

باد و بارش کا خوف ان اور بھی تیز ہو گیا۔ ان کی کوٹھڑی کے دروازے پر پڑا ہوا مات زور سے آگور و اندسے لگا۔ اور اس کی آواز سے بچے سہم جاتے۔ بچوں کی حالت دیکھ کر بھان اپنی تکلیف بھول گیا۔ وہ بے بس تھا اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ وہ اس فکر میں گم ہو گیا۔ غریب دکھ میں بھی زبان نہیں کھولتا۔ اور خون جگر پی کر بھی شکر ہی کرتا ہے۔

سائے مولوی صاحب کا مکان کھلی کے منتوں سے روشن تھا۔ روشنی بکڑیوں کے ہر دوس سے چھن چھن کر پانی سے بھری ہوئی تھی۔ ایک بڑے لطف نظر آدمی نے گھر ہی تھی۔ رڈ پور کے گھنے کی آواز موش فضا میں اٹھنے لگا تھا۔ پید کر رہی تھی۔ گدی سے گانا بھان کی بیوی کی زبانی نکالیف میں اضافے کا موجب ہو رہا تھا۔ ضروری دیر کے بعد بھنوں کی آواز سنائی دی۔ یہ رڈ پور پر گائے والے کو خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔ مگر بھان کی بیوی کو یقین ہو گیا۔ کہ گونیا اس کی چالی پر سن رہی ہے۔ اس احساس نے اسے اند بھی بدیشان کر دیا۔ وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔

علیٰ ذکر سے میں مٹی کا چراغ ٹٹھا رہا تھا۔ ہول کے ایک تند جھونکے نے اسے بھی بچھا دیا۔ اور ذکر سے میں بالکل اندھیرا ہو گیا۔

اور رڈ پور پر کسی نے شاعر مشرق کا قلم چھوڑ رکھا تھا۔

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا وہ بھی !!

گھر پر کا بجلی کے چراغوں سے بے روشن

جہاں مسجد میں غلط کیا کرتے تھے۔ بھان کی بیوی نے بار بار غلط سنا تھا اور چہرہ پر غلط رویہ لگائی تا پائیداری پر مولوی صاحب اکثر کھڑک دیا کرتے تھے۔ وہ فرماتے "خدا کی بادشاہت ظالموں کے لئے ہے۔ اور دنیا کا نظام غلاموں کے سہارے قائم ہے۔"

مولوی صاحب نے کئی بار خدا کے نام پڑا۔ پلیس لیں۔ خدا کا دین خطا میں مبتلا۔ بھان اور اس کی بیوی نے بہت دفعہ اپنی کم آمدنی کے باوجود کچھ نہ کچھ زندگی کی خوشنودی کے لئے دیا۔ انہیں یقینی تھا۔ کہ ان کا چہرہ ان کی غربت کو بہت جلد دور کر دے گا۔ وہ اسی امید میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہر آٹے اور دن ان نے نئے نئے امیدیں لے کر آنا۔ وہ اپنی بختی پر بعض اوقات غور کرتے مگر دست خیز پراچیان لاسے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ وسنت غیب۔۔۔ ایک دن انہیں ایک بیک مالدار کو دے گا۔ یا کسی کا مکان بناتے ہوئے مکان کی دیواروں میں سے بھان کو کوئی وسیعہ مل جائے گا۔

اپنی بے حالی سے بعض اوقات وہ بچہ سہ بہت حیران ہوتے۔ مگر جب مولوی صاحب کا غلط آخرت کے انعامات اور جنت کی ابدی خوشی کا حال سننے تو ان کی ڈیڑس بندھ جاتی، دنیا و من کے لئے قید خانہ ہے۔ یہی وہ نظریہ تھا۔ جو انہیں اپنی تنگ و تنار بیک کو کھڑی میں بھی خوش رکھتا تھا۔ آنے والی فراخی اور خوشحالی کے تصور میں وہ اپنی ساری تکلیف بھولے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے مولوی صاحب رہتے تھے۔ وہ مولوی صاحب جہنم سے اپنے آپ کو نہ ہٹکے لئے وقف کر رکھا تھا۔ شاہد اسی لئے خدا نے انہیں بہت کچھ دے رکھا تھا۔ ایک فراخ مکان، سواری کے لئے موٹر، غلام خادماں اور خوبصورت اولاد۔ یہ سب انعامات دیکھ کر بھان اور اس کی بیوی بھی جھگڑتے۔ کہ یہ سب مذہب پر کاربند ہونے کا نتیجہ تھے۔ اور شاید بادے میں ان میں ایسی کچھ کمی ہے۔ جو وہ غریب ہیں۔

جب مولوی صاحب کے بچے شام کو سیر کرنے موٹیں جاتے۔ تو بعض اوقات بھان اور اس کی بیوی کو دکھ بھی ہوتا۔ ان کے بچے مولوی صاحب کے بچوں کی نسبت زیادہ صحت مند اور خوبصورت تھے۔ مگر ان کے سیر کرنے کے لئے زمین پر جگہ نہ تھی۔

بعض اوقات انھوں نے یہ دور رخ دیکھ کر انہیں سمجھ نہ آتی۔ کہ ایک ہی گلی میں ایک ہی مذہب کے پیرو۔ اور ایک ہی خدا کا نام لینے والے۔ دو خاندانوں میں بعد المشرقین کیوں ہے۔ حالانکہ دونوں ایک ہی طرح ایک ہی خدائی عبادت کرتے تھے۔ لیکن ایک کی زندگی امیرانہ تھا۔ دوسری سیر ہو رہی ہے۔ اور دوسرا فاقوں مر رہا ہے۔ بھان نے مولوی صاحب کے گھر کئی دعوتیں جو تی دیکھیں۔ دیکھی ہی نہیں۔ بلکہ اس نے حصول ثواب کے لئے

# میں خودکشی کر رہا ہوں

(پڑس ڈاٹری کے چند واقعات جس میں نے ندی کے کنارے پڑا پایا۔ کاتب بیچارہ بیرون نگاری سے تنگ۔ اگر ڈوب مرا تھا)

اب تو دو وقت ہیں ایک وقت کی روٹی شکل سے نصیب ہوتی ہے۔ وہ بھی پریٹ بھر کے نہیں۔ اب دنیا کے افکار کو بھولنے کے لئے سگریٹ مزدوری تھا میرے وہ وقت کھل۔ کسی زمانے میں والدین کے مجھے پیسے کی کمائی سے دیکھ کر اڑھائی کرتے تھے۔ مگر اب ایک بلینڈ سے دس جھانٹیں ہوتی ہیں۔ ہم دینک گیس ہائٹس رہے۔۔۔۔۔ خدا خدا کر کے ان سے بچنا کا حاصل ہوا۔۔۔۔۔ پھر اس آرزو کی تلاش شروع ہوئی۔ شام گہری ہوتی جانی تھی۔ لیلا شے شب نے اپنی سیاہ آؤروں پر ڈیفنس کاٹلٹ عالم پر بھیج دیں۔ غدا کا اندہ گھر پہنچا۔ ماں سوچتی تھی۔ ڈاٹری کبھی آؤر چپکے سے بستر میں گھس گیا۔

۱۔ ستمبر۔۔۔۔۔ خبر ملی کہ روٹی کے کارخانے میں چند مزدوروں کی ضرورت ہے۔ دفتر میں گیا۔ میجر نے پوچھا کیا کام ہے؟ میں نے کہا۔ نوکری چاہیے۔ پوچھا کہیں؟ میں نے کہا ہاں مجھے؛ وہ ہنسنا اور بولا۔ آپ کے لئے تو کوئی نوکری نہیں۔ ہمیں تو روٹی کے گٹھے اٹھانے کے لئے چند مزدور درکار ہیں۔ میں کچھ گیا۔ کو میری ٹیبلن اور بیٹ اسٹو حو کا وہ سب سے ہیں۔ لباس سے انسان کے مشق صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں ہوتی۔ میں نے کہا۔ میں مزدوری کروں گا۔ بولا آپ مزدوری نہیں کر سکتے۔ تشریف لے چاہیے۔ مزدوری کے لئے علم نہیں طاقت چاہیے۔ مجبوراً مجھے دفتر سے نکالنا پڑا۔ یہ تھا تعلیم کا پل۔ مستقبل کی امید کے لئے میں نے اپنی رگوں میں کھولتے ہوئے خون کا ایک ایک قطرہ تعلیم پر صرف کر دیا اور اب؟ سولہ داری کی گاڑی دھچکنے کے لئے میرے کروڑیم میں کافی خون نہ تھا۔ میں نوجوان تھا۔ لیکن بڑیوں کا ڈانچہ موجودہ سنسنیں اپنی کھمت اور تباہی سنی تعلیم کی قربانیاں دہر بھینٹ چڑھا رہی ہیں۔ کس امید پر؟۔۔۔۔۔ فرد جسم کا بچتے ہوئے ہاتھ نظر جھنک کی محتاج۔۔۔ اور دماغ سوچنے کی صلاحیت سے خالی۔۔۔ میں نے اس انسانیت کے اشتہار کو بدن سے اتار چھیننے کا ارادہ کر لیا ہے۔

۱۸۔ ستمبر۔۔۔۔۔ آج سڑک پر ایک مجبور اور بے غیرت کچھ ہاتھ پھیلا کر خیرات کا طلب گار تھا۔ ایک سو بیسہ بابا۔۔۔۔۔ چہرہ؛ کیا کر دے گا۔ اٹھتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ جاؤ بازوؤں کی محنت سے کماؤ۔ اس کی آنکھ

۱۱۔ اگست۔۔۔۔۔ من گھڑا۔ جادو بیٹا؛ پھر تمہارا وہ کھٹکناؤ۔ تنہاری بصیرت نے منظور نہیں نوشا۔ میری دعا میں اس کے پتھر دل کو موم کر دیتا۔

میں اٹھا آؤر چل دیا ایک نامعلوم منزل کی طرف۔ کہاں جا رہا ہوں مجھے معلوم نہ تھا۔ اب یہاں کرنا ہوگا؛ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا۔ پھر بھی جا رہا تھا۔ ناگہیں میرا ساتھ دے وہی تھیں۔ لیکن ہوش و خود ساتھ چھوڑ چکے تھے ہیں۔ ایک آؤر منزل۔ شہر کی بھری ہوئی سڑکوں پر۔ ایک نہ ختم ہونے والے راستے پر بھٹک رہا تھا۔ آخر وقت اپنے پروں پر تیزی سے اڑا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ ہر طرف شام کی تاریکی پھیلنے لگی۔۔۔۔۔ سامنے سڑک بفلک عمارتوں کے ٹکڑیوں پر دوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی مشاعیں سکر رہی تھیں۔ میری پہلے کسی پر۔۔۔۔۔ شاید اس روشنی میں۔ دولت کی بیج پھلنا کا ڈراما کھیلنا جا رہا تھا۔ قسمت اور قدرت کی بے بسی پر قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ اور ساتھ ہی ہوا کی لہروں پر تیرتے ہوئے تھے؛ اگت خدا یا! ایک ڈھ و ہاں جو زندگی کی رنگینیدوں میں گھوگر گرتے ہوئے وقت کا اندازہ بھی مشکل سے کر سکتے ہیں آؤر ایک ہم ہیں کہ وقت ہمارے لئے ایک ناقابل برداشت پوچھ ہے۔۔۔۔۔ وقت کے پہلے تلے ہادی زندگی بھر کی آؤروں کی پھل جا رہی ہیں۔ یہ۔۔۔۔۔ غریب؛ وکیل کے محلے کا طوق لعنت !!!

۱۲۔ اگست۔۔۔۔۔ آج صبح خیالات کی زہ میں رہتا جا رہا تھا۔ راستے میں مظہر آؤر زمر دل گئے۔ یہ میرے کلاس فیلو ہیں۔ ہم نے ایس سی سی ای۔ اے پاس کیا ہے۔ لیکن یہ دونوں صلاح آؤر دنیا کی نظروں میں انسان ہیں کمال انسان کالج کی چہار دیواری سے باہر قدم رکھتے ہی وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔۔۔۔۔ وہ مجھ سے دوہین نہ تھے۔ میری ہمائی صحت ان سے کئی دور چھٹی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے ماں باپ کا پیٹ پال رہے ہیں۔ رشوت خور حکام شرمست نیلام کرتے ہیں۔ سبک دوزوں کو دینے والا اس کا حق اور ہے خیران پاؤں سے فائدہ۔۔۔۔۔ جانتے دو۔ ہاں؛ تو تم تینوں ہوٹل میں جا بیٹھے۔ چائے کا ڈور آیا۔ سگریٹ کے کش لگے۔ چہلے ہی کش سے میرے بدن میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ کہیں کل کے ریم میں شوقیہ سگریٹ پھینے تھے۔ لیکن

۱۔ دسمبر۔ اب تک مزدوری ہاتھ نہیں آئی۔ مدھر جاؤ۔  
 نوکلینسی نوکلینسی۔ یہ فرعون دماغ، ہم جیسے بھگتے ہوئے بیروزگاروں کی  
 جاں طلب امیدوں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں آج تین دن سے فاقہ ہے۔  
 رہی ہوی امید بھی جاتی رہی۔ ماں میری جملہ اس آٹ اس گھاسوں  
 کا بدلہ دے رہی ہے۔ میرے پاس آؤ کیا ہو سکتا تھا؟

بھوک ہے اس کی غصہ کی کمر توڑ دی ہے۔ وہ شب و روز غم کھاتی  
 ہے۔ شاید غم اس کی مغرب غذا ہے۔ اس نے اپنی امیدوں اور نیشہ کی  
 جوانی کو برفان چرتے دیکھا۔ لیکن آہستہ آہستہ برس بھر تیری اس  
 کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ بھوک بھوک! چوری کروں گا کہ وہاں کسی فریج  
 دہشت حاصل کروں۔ نہ سہکتا ہے چوری گندہ ہے قابل گرفت کچھ سمجھتا ہے۔  
 فاکہ انسانیت کے فرائض پر واضح ہے انٹ۔ اور قانون کتا ہے۔ فوج بھرم  
 سے ناقابل معافی۔ لیکن مذہب ان سے کوئی باز پرس نہیں کرنا خود مردوں کی ہوا  
 بیچیل کے جرحمت کی چوری کرتے ہیں۔ سماج ان کو نہیں روکتا جو دسپا کے  
 امن و سکون پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ ہزاروں شریف بدعاش فریج کے حال  
 میں دنیا کو گزند کسے اپنا تو یہ ہا کر تے ہیں، اور فخر کی منگول پر تو دیتے  
 ہوئے قانون کی گرفت سے صاف بچ جاتے ہیں غریبوں کے خون سے اپنی زندگی  
 رنگین بنانے والوں کی قانون، مذہب اور سماج حمایت کو تا ہے۔ مذہب  
 دولت کا غلام۔ سماج، روپے کا شیا۔ قانون، سونے چاندی کے چند چمکتے ہوئے  
 ٹکڑوں کا بدلہ۔ جہاں دیکھو پیسے کے ٹھیل۔ ہسپتال کی چھاب دیواری، مغیرات خلع  
 عدالتیں جہاں دیکھو دولت کی حکومت۔ محنت کے مزدور کے مجاور، قانون کے محافظ  
 سب پیسے کو اپنا خدا مانتے ہیں۔ ڈاکٹر کی نظروں میں انسانی زندگی سے بڑھ کر  
 دولت کی قیمت ہے۔ جج قانون کو سستے ماموں پیچھے پھرتے ہیں۔

۲۔ دسمبر۔ آج درے اخبارات مجرم بھم اندیشہ۔ نادیک  
 شہادت اور دھیمہ ورجانی شہر کہ بغیر میرے خواروں بھاوی رہیں۔ اب تک تو  
 اس اپنے زور و جھنجھٹ سے کر میرا اور اپنا پلوں شہر پل رہی تھی۔ لیکن اب تو پھوٹی کوڑی  
 تک کسی پاس نہ تھی۔ میں نے سوچا آج نوکری کی تلاش میں جانا فضول ہے۔  
 دوپہر کو کتابوں کی المدی کھولی۔ سینکڑوں جلدوں والی کتابیں الماری میں چھسکراتی  
 ہوئی جھانک رہی تھیں میری پہلے کسی اور بے کسی پر۔ یہ ان مصنفوں کی شب رعد  
 کی عرق ریزی کا پھل ہے جن کا دماغ فخر کی گتیاں سجھانے کے لئے پیدا ہوا  
 ہے۔ کیا ظلم سبک بڑی دولت ہے؟ کوئی جواب نہیں! کیا بھوک کی گود میں  
 لگتے ہوئے بچوں کے آسنو بچہ سکتا ہے؟ نہیں۔ کیا موضوع کی عریاں  
 جسم کو سودا کی پیش اور ٹھکرتے ہوئے جھٹے سے بچا سکتا ہے؟ نہیں! تو  
 پھر دولت کیسی؟۔۔۔۔۔ بوجھ کے نیچے وہے ہوئے مزدور، فرعون مزاج

۳۔ رحم ادا میر کی جھلک تھی۔ یہ بچہ۔۔۔۔۔ ہماری موجودہ نہیں جیسے ہی کمزور  
 میڈیکل پیپڈا کر رہی ہیں۔ جو جان ہوئے تو ان کے لئے زندگی نام ہوگا ستر لاکھ  
 کے کنکڑے کھڑے ہو کر کانپتے ہوئے ہاتھ دوسروں کے سامنے پھیلائے گا۔  
 ان کے نجیب و نزار حرم مشقت کے تحمل نہیں ہو سکیں گے۔ قدمت انہیں جنم کی  
 بلنگے کے لئے زندہ رہیں گے دوسروں کی مدد پر، اور مہا میں گے بھوک کی  
 آہ سے، وہ اپنے بعد ایک ایسی تاریخ چھوڑ جائیں گے۔ جس کا ہر ورق ان کی  
 بڑی اور کالی کی داستانوں سے سہا ہوگا۔۔۔۔۔ لیکن بازوؤں کی محنت  
 سے وہ می پیدا کرنے والے کوئی سانسو دیکھتے تھے۔ بن بھر مزدور و مزدور  
 کی خدمت جس کا معاوضہ ناکافی اور رات کی ختم نہ ہونے والی تاریکی میں  
 تھے کارونا۔۔۔۔۔ قسمت! جاؤ جاؤ! خدا سے کو عزتوں کو کیوں  
 ختم دیا؟ دولت مندوں کو دولت کیوں دی؟ کیا یہی تیرا کارخانہ قدرت ہو  
 کہ وہ ہیں جو دولت سے کھیلتے ہیں، اور ایک یہ جو بھوک کی گود میں پر دیا  
 پاکر، تارکیک چھوڑ پڑوں میں قسمت کو اپنی پرودا ہوں میں ڈھونڈتے ہوئے  
 بیباں رگڑ رگڑ کر جان دے دیتے ہیں۔ قسمت! تقدیر! غربت! ۱۱

۱۱۔ اکتوبر۔ منہ ہے چین اور جاپان میں جنگ چھڑ گئی ہے  
 اس اور خود داری کی جنگ۔ جاپان کمزور چین کو ہرب کر جانا چاہتا ہے  
 آئی کی اخبار میں لکھا تھا کہ جاپانیوں نے وس ہزار چینوں کو فنا کی کھاٹ  
 اور با ہے۔ جنگ کا رونا پوتا کتنا بھیا تک ہے! صورت کتنی بے رحم و ہمدرد  
 نیچے تھیم ہو گئے ہونگے۔ سینکڑوں ولہنوں کا سماگ لٹ گیا ہوگا۔ ہوس  
 ملک تیری انسان کو وحشی درندہ بنا دیتی ہے۔ کیا ماٹیں اپنے بچوں کو اسی  
 دن کے لئے ختم کرتی ہیں؟ نیچے۔ سی نے جوان ہونے میں کہ وہ اپنی جانیں  
 ملک کے رونا پوتا چینٹ چڑھائیں۔۔۔۔۔ والدین کی ہزاروں آرزوئیں  
 ظلم و ستم کے پاؤں تلے پٹی جا رہی ہیں۔ لیکن قدرت خاموش ہے۔۔۔ وقت  
 اپنے سبک پر رول پر اٹا جا رہا ہے۔ دنیا کو اتنی فرصت نہیں کہ اپنے ان  
 ہول سے بچوں کی موت پر چار آنسو ہی بہاے۔

ظالم دلیری سے ظلم کر رہے ہیں اور مظلوم صبر سے برداشت  
 فاقہ زد کمزور کو جس جانا چاہتا ہے۔ ملک تباہ ہو چکا ہے۔ ہمسائے ہمدرد کی  
 کا پیغام بھیجتے ہیں۔ ہماری ہمدردی ہر وقت ہمارے ساتھ ہے۔ لیکن  
 رو مند کا درد کوئی نہیں بانٹتا۔ کافر میں ملین میں ہی پیدا ہوتا۔ تاکہ  
 اور وطن کی حفاظت کو تے ہوئے کسی بید و جا پا کی فی رحمل گولی کا نشانہ  
 بن کر زمانے کے کندھوں سے بوجھلہا کر دیتا۔ مجھے پیٹ پانے کے لئے  
 کوئی چیز میسر نہ تھی۔۔۔۔۔ تو میں کسی بھوکے درندہ جی کی  
 خوراک بن سکتا۔

ہوتا۔ آج ہوتے ہیں۔ اسی طرح سربلے داری کا یہ کیل بھیلا جاتا ہے ...  
 آنکھیں کھول کر زمانے کی رفتار کو دیکھو۔ اگر سرمایہ داری کی گاڑی دیکھتے کیلئے  
 اپنی طاقت صرف کرتے ہو۔ تو داغ انہی ہتھری کے لئے صرف کرو۔ ہتھاری مرقہ  
 حالت دیکھ کر میری ہمدردی خون کے آنسو روٹی ہے۔ ہتھارا ٹپنا میں ان کی گویا  
 سے نہیں دیکھ سکتا۔ میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا۔ ان کی پشت پر سرمایہ داری کا  
 ہاتھ ہے۔ لیکن ہم انہیں جلد ہی بتا دیں گے۔ کہ ہمارے ساتھ جی بھوک کی  
 گودیں دم توڑتے ہوئے غریب مزدوروں کی آغوش میں کاش سرمایہ  
 داروں کی آنکھیں ہتھری تالو کی غوہوں کے بے رونق چہروں کو دیکھتے۔ ان  
 کے کان پر تالو ہمارا دھمکی دہمکی آواز سننے انہیں ایک دھم بھرا دل ملے گا۔  
 وہ ہمارا موجودہ حالت کا اعلان کر سکتے ...

تقریر ختم ہو گئی۔ ہزاروں ہاتھ پھولوں کے ہار لٹے ہوئے آگے بڑھے۔  
 سینکڑوں دل اسے گلے سے لگا لینے کے لئے جناب تھے۔ اس کے الفاظ پہلی  
 کا پہلوئے ہوئے تھے۔ ظلم و ظلم کا یہ ڈرانا۔ دولت کی شمع پہری کیل جاتا ہے۔

۱۰۔ مٹی۔۔۔۔۔ آٹھ ایک سال پورا ہو گیا۔ یہی دن عقلمند جب میں  
 نے اپنی صحت، دولت، اور ملکی ترقی جیتی بہاریں علم کی دیوی پہنچا دی گئی  
 اسے پڑنا بنا تھا۔ کس لئے؟ مجھے مستقبل کے اتنی پرست و شادمانی کا سنا  
 چھٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔ تعلیم کی سرخس سے میں بام عروج پہنچنا چاہتا تھا۔ اس  
 وقت تک مجھے دنیا میں زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ جب تک کہ میں  
 زیر تعلیم تھا۔ راستہ نہ ہو جاؤں۔ ہمارے آس پاس کا اپنا بنا سکتا تھا جب  
 تک کہ میں اپنی عمر کی ترقی خیریاں سکول اور کالج کی چار دیواری میں نہ مل سکتا۔  
 لیکن یہ سب کچھ کہنے کے بعد بھی میں دوسروں کے ہمارے کا محتاج ہوں۔ پہلا  
 قصور میرا غریب تعلیم کا ہے جس نے مجھے ہاتھ پاؤں رکھتے ہوئے خیروں کا محتاج  
 بنا دیا۔ میں ابھی بڑا اور بیوس کی جائے وقوع دنیا کے نقشے پر تھا۔ کتا ہوں۔ چند  
 سیبوں کے متعلق جو کچھ تواریخ کے صفحات پر کھیرا پڑا ہے سب لوگ زبان سے ابھرا  
 آواز میری کس مشکل سے مشکل حالات حل کر سکتا ہوں لیکن میرے کس کام کے ہمارے  
 کچھ سکھا ہوا سکول نے ملکر دوسروں کا ہمارا نہ ہو نہ تا۔۔۔۔۔ اپنی زندگی

سے تنگ۔ گیا ہوں۔ دنیا میں مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ میں  
 خود کشی کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ مذہبی کی احمق ہوئی کہیں مجھے اپنی گود میں سکھ اور  
 آرام کی نیند سلائی گی، معاف کرنا ناں، اپنے اس بد قسمت اور بزدل بیٹے  
 کو ہتھاری یعنی میری موت کے غم کی قفل نہ ہو سکے گی، دنیا میں تھلا کوئی سدا  
 نہ ہوگا۔ لیکن میں، میں زندہ ہوتے ہوئے بھی تمہارے کس کام کا؟ .....  
 اوداع! ..... اے میرے بل کی دنیا میں بسنے والی رشتہ دار

آقاؤں کی خدمت میں خون پسینہ ایک کر کے دانے غلام کیا ان میں کوئی بھی علم  
 سے چرہ نہ آیا۔ میں تو چہر علم کی دولت ہوتے ہوئے بھی خون آبی رنگوں  
 میں گردش کرتا رہا۔ ہمدردی کی گاڑی کو حرکت میں لانے کے لئے وہ زندگی کا  
 سانس لیتے ہیں۔ ان کی اسدوں میں روح پھونکنے کے لئے ..... ان  
 موٹی موٹی کتابوں میں علم و ادب، سائنس، تاریخ سب کچھ ہے۔ لیکن پیٹ اور  
 روٹی کا نسخہ ان میں تلاش کرنا فضول۔ سب کتابیں باندھ کر کھاٹیئے کے پاس  
 لے گیا۔ اتنی قیمتی کتابوں کے عوض اس کھفت لئے صرف سوارو پیو دیا۔ اچھا  
 کتا ہیں اب ہمارے کس کام تھیں۔ ان پیسوں سے اپنا اور اپنی ضعیف ماں کا  
 پیٹ چالوں گا۔ لیکن کب تک؟ خیر وہ بچا روٹی ہی ہے۔

۲۲۔ دسمبر۔۔۔۔۔ پندرہ دن ہسپتال میں، بیمار پڑا۔ جی چاہتا  
 تھا کہ میرے پیس پڑا ہوں۔ کیوں نہ ہو! کتنا نامزدت تھا تھا۔ مگر ہسپتال  
 کی چار دیواری کے باہر بھوک، تنگی، بیمار پڑنا میرا انتظار کر رہی تھی۔  
 مجھے ہسپتال سے نکال دیا گیا۔

۹۔ جنوری۔۔۔۔۔ سڑک پر بار بار ہاتھ۔ ریڈیو کی آواز کان میں  
 آتی۔ گانے سنو! کی دنیا میں چل چاوی۔ سوئے ہوئے بدبخت پھر انڈیا  
 نے کہ بیدار ہو گئے۔۔۔۔۔ مجھے بہت ہے ایک کھنکھریے بول والی آہ  
 چشم کا فوہ سے، ہم دونوں ایک جان دو دو کام۔ میں جی چاہتا ہے۔ اپنی دن  
 بھر کی کٹھنوں کو اس کے آخری لمحوں میں گم کر دوں۔ لیکن یہی موجودہ حالت  
 اجازت نہیں دیتی۔ بیٹا۔۔۔۔۔ وہ ایک حسین و شہو ہے لیکن پوڈر، لپ سٹک  
 اور ساڑھی کی دلدلاہ نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ میری موجودہ مصیبتوں کی ساقی  
 بن کر میرے دل کے لئے سکون نازت ہو لیکن یہی زندگی تباہ ہے تو اس کی  
 دنیا کیوں برباد کروں۔۔۔۔۔ میں اپنی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ شور و  
 غل نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ریڈیو کی آواز جی گم ہو چکی تھی معلوم ہوا مزدور  
 کا جلسہ ہے۔ میں نے بھی وہاں جلسے کے متعلق سوچا۔ شاید وہاں ہی میرا درد  
 بھرا انسان سن کر کسی کا دل پیچھے کیونکہ ان میں بہت سے ایسے ہونگے۔  
 جو میری موجودہ حالت میں اپنے دن گزار چکے ہونگے۔

جیسے میں بچا۔ مزدوروں کا مجھو بیٹہ۔ اپنی گرجا دار آواز میں تقریر  
 کر رہا تھا۔ سرمایہ دار مزدوروں کا خون و جھٹک کی طرح پوس رہے ہیں  
 تھکے جسم کا خون ختم ہو چکا ہے۔ لیکن وہ بھی سیر نہیں ہونے، وہ چاہتے  
 ہیں کہ ہمارے گوشت پر دست سے بھی دو پیہ کھیں۔ جب تم شور کرتے ہو  
 تو وہ کام سے ملکہ کر دینے کی دھمکی دیتے ہیں۔ تم مستقبل کی باتوں بھری زندگی  
 کا خیال آتے ہی لڑا اٹھتے ہو۔ وہ کانپ رہا تھا۔ سرمایہ داری کی آواز پر  
 مڑیوں کے لاکھوں ہاتھ کہ جن پر گوشت پر دست کا نام و نشان تک نہیں

# اس کا لال

انور کمال

”تم ابھی تو رہیں اماں! شاہ گل نے آہستہ سے کہا۔  
”تم شاید شہزادے سے ملنے کیلئے جیاں آئے ہو؟ بڑھیا نے شاہ گل کے  
چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہیں اماں میں ذرا دوسرے گزر رہا تھا، سوچا، ذرا تم سے مل لوں۔“  
شاہ گل نے گھبرائے ہوئے ہنسے ہوئے کہا۔

”بیٹے! وہ، لویہ تھوہ کی چبلی پی لو، شہزاد ابھی سو رہا ہے۔“  
نہرو بات نہیں سویا، بس بے چینی سے دوسرا دھر مہلتا رہا ہے۔ جس نے بہت  
کہنا نہ کہ سوچا، لیکن نہ جانے کیا بات تھی، اب وہ سو رہا ہو گا۔ جس نے فائدہ  
سے کہہ دیا ہے کہ اسے بیاد نہ کرے، کل عید ہے نا، آج آرام کر کے کل صبح  
سیر سے جاگنا ہی چرے گا۔ لیکن شہزاد تم اس سے بنا ہی چاہتے ہو، تو میں  
آہستہ سے بیدار کرتی ہوں۔“

”نہیں نہیں آہستہ سے ہونے دو اماں! وہ بھی خنید سو رہا ہو گا۔ شاہ گل  
نے غم میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

بڑھیا چہرہ نہ جانے کیا سوچ کر شہزاد کے کمرے کی طرف چلی گئی، شاہ گل  
بے چینی سے ادھر ادھر چلنے لگا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو فٹری بے چینی سے مل رہا  
تھا۔ وہ حیران تھا کہ بڑھیا کو ایسی کوسس خبر کو کیوں سنائے۔ وہ سوچنے لگا کہ یہوں  
وہ صاف طرہ برتر جیسا تو یہ نہ کہہ سکتا، کہ اس کا بیٹا اپنے خاندان کی عزت کی  
خاطر حجاب ہے۔ لیکن اس کی زبان گنگ چو گئی۔ وہ کانپا ہوا تھا۔

”اب تم ہی بتاؤ نا، تم جہاں جو جیوں پر بھلا کے اعتبار آئے، زبیدہ  
نے شاہ گل کو کمرے سے باہر کرنا طلب کیا۔

”یہاں میں نے بہت کوشش کی کہ میاںیاں آپس میں نہ بچے پاش  
بچوں کو میں نے خاص احتیاط سے دیکھا، مگر پھر شاہ گل نے تھلا اور دست  
بچے تباہی سے بغیر کہیں چلا گیا ہے، لیکن تم ذرا بیٹھ جاؤ۔ تمہارا سستا، وہ بھی  
آتا ہی ہو گا۔“ زبیدہ ہلکا کر کہی۔

”مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی تھیں، شاہ گل تم بہت عرصے کو  
بہتے ہو، لیکن میں شہزادے سے تم سے ان باتوں کا ذکر دیا ہو گا۔ بڑھیا لالہ  
ناواں ہے۔ جب کل رات وہ نہیں سویا، تو میں سوچتی رہی کہ ایسی کسی  
کی بے قراری کی وجہ کیا ہے۔ یعنی دفعہ تو وہ بالکل نہیں سوتا۔“

”شہزادہ گل! میری توجہ پرانی آواز ہے کہ اس کی شادی زہرہ

جمع کے وقت ایکٹ ہو، فوجیوں، افغان سرحدی گاؤں کے ایک نیسٹ پر  
حکم خطوب میں کھڑا تھا، وہ شاید کسی کا منتظر تھا۔

دیس میں بد امن پر سفید ریت کی ایک سی جگہ تھی، یہاں ایک اس سخت  
چین پر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی، اور خرق کے افق سے کدے جوت  
افغان ٹھوسے پر آدھائی دیا فوجیوں کو نا دیکھ کر شہزاد کی آنکھوں میں خون تر  
آیا، اس نے پناہ پناہ پناہ لیا۔ دوسرے فوجیوں نے بھی فوجیوں کو شہزاد پر حملہ  
نا، شہزاد کا خوبصورت چہرہ قصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہوں افغان اپنی خاندانی  
حزت اور وقار کا فیصلہ کرنے کے لئے یہاں آئے تھے۔ پیرنگ کشن جادی رہی پیر  
نصایں ایک ہی کی آواز گونجی۔ شہزاد ایک بدتر پاد اور پھر زمین پر گر پڑا۔ پھر سے  
اسے گردن پر گاری زخم لگا تھا۔ اس کے خون سے ریت پر وہ دھرسرخی پھیل  
تھی۔

خاندانی عزت اور وقار کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ فاتح ہی کا بیابی پر مسرور  
ٹھونے پر سوار ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور مختلف زمین پر دم توڑ رہا تھا، تھوڑی  
بے کے بعد شہزاد نے دم توڑ دیا، اس کی وجہ کے ہر آدمی کو اس کی موت کی خبر بھی  
ہل گئی۔ صرف اس کی ماں تک یہ روح نہ سا خبر پہنچا باقی تھا۔ جو لو جہاں بھی گئی  
اپنی عزت کی خاطر دشمن کے ہاتھوں ہلاک ہو رہا تھا، اپنی بڑھی ماں کا، کلو تاجیسا تھا،  
نہیں کو دھم دگن بھی نہ تھا کہ شہزاد اپنے دشمن کے ہاتھوں ہلاک ہو جانے کا۔ وہ اپنے  
دشمن سے کہیں زیادہ قوی اور شجاع تھا۔ تمام سپاہیوں کو اس سے عزت تھی۔  
وہ اس کی بہادری کے نذر دیاں تھے، لیکن بس اس کی ماں کو یہ کوس خبر کو  
سنائے وہ یہ سبے مشکل کام تھا، کہی میں اتنی بہت نہ تھی کہ شہزاد کی بڑھی ماں  
تک یہ خبر پہنچ سکے۔ انوکھا شاہ گل کو اس کام کیلئے منور کیا گیا۔ وہ سخت دل  
تھا، اور لوگ بہا کرتے تھے کہ اس کے سینے میں دل کی بجائے پتھر کا ایک ٹکڑا  
ہے۔ شاہ گل یہ کوس خبر شہزاد کی ماں تک پہنچانے کے لئے شہزاد کے گاؤں  
اور نہ ہو گیا۔

زبیدہ کو بیدار ہوئے بھی زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا، وہ اپنے منہ دھو کر تھوہ  
جادی تھی کہ شاہ گل، اداس و غم اور افسردہ دیکھیں کہ اس میں داخل ہوا  
”خوش آید، بیٹھو، کہاں چلے تو ہو بیٹا! بڑھی زبیدہ نے شاہ گل کو  
بنا طلب کیا۔“

نکاح کر پڑھنے لگی۔

بیاری ماں!

وقت گب آیا، جب میں نہیں مسیح معنوں میں مان کر  
کر پکار سکوں گی۔ میں بڑی بے چینی سے اس وقت کا انتظار  
کر رہی ہوں، میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ وقت بہت جلد آجائے گا۔  
شاہ گل کو میرا سلام اور اس کے دوست کو ہزار سلام۔  
تمہاری بیٹی:-

”زہرا“

ربیدہ نے سر اٹھایا، اسکی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو تیز قطرے  
چمک رہے تھے۔

بڑھیا شاہ گل کو اپنی طوٹ متوڑ نہ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔  
”تم بہت خوش ہو گئے شاہ گل، تم اور شہزادہ ایک دوسرے کے بھائی  
ہوئے، یہ خدا کا عطا کردہ برکت ہے، تمہاری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، شاہ گل بہت  
پریشان تھا۔ جب اس نے سنا کہ بڑھیا اس کے تعلق ایسی اچھی ماں سے مل رہی ہے  
تو غم سے اس کو سر جھک گیا۔

دوست ہو کر وہ اپنے دوست کو دشمن کے پنجے سے نہ پھرناسکے؟  
شہزاد کی جگہ خزانے کے بجائے پار چاہتا، تو یقیناً اسے بہت سرت چوٹی پھر وہ  
سوچنے لگا کہ بڑھیا آدھ گھٹنے کے بعد اس کے تعلق کیا خیال کرے گی، اس سبب  
سے اس کی آنکھیں نیچے جھک گئیں وہ سوچنے لگا اور اس نے ارادہ کر لیا کہ  
بڑھیا کو اب وہ اس کے بیٹے کے تعلق سب کچھ بتا دیا، لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا  
وہ بڑھیا کی یہ عارضی خوشی بھی دھنچنا چاہتا تھا، اسے شجاعت سے نصرت کر گئی  
جنگ و جدل سے بیر ہو گیا۔ غرت سے اسے بے عزتی پیاری معلوم ہونے لگی  
”وہ یہ قبولی لو نا، اس رقت سے رکھا ہوا ہے۔ میں ذرا اندھ ہوں، دل  
بڑھیا یہ ہسکرا رہی گئی۔ اور شاہ گل چپکے سے باہر نکل گیا۔ اور گھر سے  
بھاگ کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔ بڑھیا جب باہر آئی، تو قہر سے کی زبان  
میز پر پڑی تھی، اور شاہ گل کا کوئی پتہ نہ تھا۔  
بڑھیا مستقبل کی رنجشوں میں کھو گئی۔

سے گردوں، اڑھاپے میں۔ خوشی تو دیکھ لوں، تم جتنے ہی بوجہ شہزاد کے  
والد ہیں جہاں سے مدد سے تو شہزاد صرف دو سال کا تھا، بس اس وقت  
سے جنگ میں اس کی پرستش کرنی رہی ہوئی۔ دیکھ دو، وہ ہسکرا سے  
جوان کیا ہے، اور اب میری آخری آرزو ہے، کہ اس کی شادی زہرہ سے  
ہو جائے، اس کی رشتہ فی کا باعث زہرہ کی جنت ہے، بڑھیا کی آنکھیں  
بہکتے ہوئے بھر گئی۔ اس کی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے آنسو دھک دھک کر  
اس کے گالوں پر رگڑکے گئے۔ بڑھیا نے سکرانے کی کوشش کی اور اپنی چٹا  
سے آنسو پونچھ کر بولی۔

”تھیں مسلم ہی ہے شاہ گل! مجھے شروع شروع میں کس قدر  
مصائب اور تکلیف کا سامن کرنا پڑا تھا، دپے کی قلت کی وجہ سے، تم لوہی  
سے مسروں کو بڑی سوں سے شادی کرنے کو مجھوتا ہے۔ اس نے مجھے  
سہرا دیا ہے، یہ میری سونے کی مہر ہے، میرا ارادہ ہے کہ میرے چند دن بعد پہلا  
کی شادی کر دوں۔ اب مجھ سے گھر کا بدبست نہیں ہوتا۔ بوڑھی ہوئی چلا  
جائے، اچھا دیکھ مجھے زہرہ نے کس پیار سے خود گھلے۔“

بڑھیا نے یہ کہہ کر اپنی حیب میں سے کاپٹے ہوئے ہاتھوں سے کچھ  
نکالا، اور شاہ گل کو دکھانے کے بعد چرائی حیب میں رکھ لیا۔

”وہ کتنی پیاری لڑکی ہے، بڑھیا نے اپنی نکلو باری کہتے ہوئے  
کہا۔ شاہ گل بڑی بے چینی سے بڑھیا کی باتیں سن رہا تھا۔ بڑھیا کی باتوں کے  
ساتھ ساتھ اس کی کیفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے یہ کس طرح  
کہے کہ زہرا، اس کی نیکیت ہی تیری زندگی کا پہلا اور آخری مقصد ہے، اب  
اس دنیا میں موجود نہیں۔ وہ سوچنے لگا کہ تھوڑی دیر کے بعد بڑھیا کی امیدوں  
کا تھوڑے کر گرجائے گا۔ جنت کا ہاتھ اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں پر سیاہی  
مل دیا، لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اور چپ چاپ بڑھیا کی باتیں سنتا رہا۔  
”لیکن مجھے تم اتنے ادا کیوں ہو؟“ بڑھیا نے شاہ گل کو متھڑکھڑکایا  
”میں ابیرہ آج خزانہ زدہ پنے کی طرح کیوں زد رہے شاہ گل۔  
بڑھیا نے دوبارہ دہرایا۔

شاہ گل چاہتا تھا کہ کہہ دے۔ بڑھیا میری کو کھ باندھ گئی۔ تقدیر  
تیری دشمن بن گئی۔ لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ بڑھیا پھر بولی۔  
”اور زہرہ سے نہیں بھی تو سلام لکھا ہے۔ یقین نہ آئے تو خود پڑھ لو  
تم کہنے ہو گے بڑھیا جوت کہتی ہے۔ زہرہ نے میری کوشش کی اور اپنی چٹا  
سے آنسو پونچھ کر بولی۔

سالانہ دیکھ لیتے ہو، اتنا دیکھ اپنی تمامت کو فروغ دیجئے، پرچہ دیکھ کر  
خروج میں ملے ہوئے ہے۔ (بہتر)

**ضروری:-** جن خدایان حضرت کا نام اکثر ہرگز میں چند خطوں کا  
عنوان سے ایک چٹھی شکل کی گئی تھی۔ غم بہت کم لوگوں نے  
اس طوٹ توجہ کی ہے، بن دلی سامنے کے لئے وہ مل کی ہرگز  
ہے۔ حضرات جلد توجہ فرمائیں۔ (بہتر)



# قید خانے کا عفریت

قاویہ قوت سے لرز رہا تھا۔ اس نے ہستے سے میرے کان میں کہا۔ "میرے نے چرکی کی خبر لی۔ ایک اور قتل....."

وہ سری سرج قید خانے میں سرگوشیاں مہرہا تھیں۔ کل رات مجھے نے پوچھا کہ یہاں کی کام تمام کرنا چاہا تھا۔ قید خانے کی مشرقی سمت میسرے کیلئے خاص طور پر تیسروں کا ایک بچہ سنا گیا تھا۔ آج اسے وہاں سے پناہ تھا۔ جہنوں سے یہ بچہ سنا جا رہا تھا۔ گو با کسی جنگی خونخوار دہندے کو اس میں بند کرنا تھا۔ یہ اتنا تنگ بنایا گیا تھا کہ مستقبل سے ہی میرے کچھ کا آدمی اس میں سما سکے۔

ہم دفتر میں کام کر رہے تھے۔ جیسے ہی سنا کہ ابرے کو کوٹھڑی سے باہر نکالا جا رہا ہے۔ میں دوڑا دوڑا کر اسے میں آیا۔ کال کوٹھڑی کے باہر میں کے سپاہیوں کی ایک جم غفیرہ کھڑی تھی۔ بسکی سپاہی ہے ہے ہے کوٹھڑی کے دروازے کو تنگ ہے تھے۔

دروازہ کھلا۔ ایک خوفناک منظر نظر آیا۔ میں نے قیدی نے کے حبیب کو کوٹھڑی سے باہر نکالا۔ وہ حقیقت میں دیوتا تھا۔ قوی، تیز، مضبوط، مہم، کشادہ سینہ، کندھے آگے کو جھکے ہوئے۔ تھنا ہندک ہندو میں اس کی پناہ تھی۔ سپرے سے وحشت ہی ہر ہر ہی تھی۔ سوائے تھوڑے سے حصے کے سب بال سلامت تھے۔ آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔

سپاہی ہاتھوں میں بی بی بی ہر چہاں لئے دو دو یہ کھڑے تھے۔ تھوڑا سا اور تھوڑا سا۔ اُسے پرچی کی آلی سے اسکا جادہ تھا۔ ہر چہاں کی آنکھیں اس کے گوشت پوست میں چھوٹی جادہ تھیں۔ اس کی ہڈیوں میں بھی مولیٰ پڑ چکے تھے۔

اس کے پاؤں میں ایک بوجھل ٹیری تھی۔ پاؤں سوسن کے بھدے تھے۔ لیکن وہ خود تھا کہ قدم اٹھائے۔ باوجود شدت کر کے وہ گردن جھکائے خاموشی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ آخر وہ سنا کہ سوسن پتھر کے قریب آیا۔ ایسے کو اندر بند کر دیا گیا۔ اور باہر ایک کئی شکا دی گئی۔ قید خانے کا عفریت۔

"قید خانے کے عفریت۔" کے ہر طرف پر پے تھے۔ دلدور سے لوگ آئے دیکھتے تھے۔ شہر تھا کہ میں ایک خونخوار دہندہ بند ہے۔ جس کی شکل انسان کی سی ہے۔ میرے ایسے کے دیکھنے کے لئے چار دن کا بگٹ مقروض کر دیا تھا۔ تماشائیوں کو پتھر سے لڑا اور کھڑا کیا جانا۔ اور پھر میں دیکھے

میرے قیدی دوست جاوید نے تھوڑا سا دھڑکے سے سرکراتے ہوئے کہا۔ "کچھ ہیں انسان کی تخلیق جن عناصر سے جوئی ان میں زیادہ حصہ بچہ کا تھا اور اس میں ذرا تنگ نہیں۔ انسان سے ایسے ایسے افعال سرزد ہوتے ہیں جن سے دہندے شرمناک ہوتے۔ قید خانے کے عفریت ابرے ہی کو کیجئے....."

وہ منبھلا میں سمجھا کہ میرے کا نام بے اختیار اس کی زبان بیٹھ گیا تھا۔ اس نے پھر بہت شروع کیا۔ "دوست انسان کی ذلت ہر اشد نہیں ہو سکتی۔ اشد انقدر ذلت اتنا ذلیل ہو کہ میرے کی طرح ایک دہندہ ہو کر رہ جائے۔ آہ۔ کل رات پھر اسے بری طرح پٹایا گیا۔ جس کال کوٹھڑی میں گیا اور اس کے زخموں کی مرچ مچی کی۔ وہ قوی ہو گیا۔ دیوانہ کئی محنتی ظلم و محنت میں صحت ہوئے۔"

اس حبیب دیوانہ کو ہر پتے دو چار بار غرور پٹایا جاتا۔ اور ہر بار زخموں کی مرچ مچی جاوید ہی کیا کرتا، لیکن آج پہلی بار اس کا ذکر ہے کیا۔ میرا قید خانے کا پھر غیر تھا۔ حبیب دہندہ۔ میسوں سپاہی اس کے ہاتھوں سے کھینچا دینا کو سودا حد تک تھے۔

چودہ سال سے وہ کال کوٹھڑی میں پڑا رہا تھا۔ زندہ درگور۔ اُسے بستر دیا گیا تھا۔ نہ کبیل نہ روشنی۔

جب کوئی سپاہی اس کی اندھیری کوٹھڑی کی صفائی کرنا چاہتا تو میرا پھرے شیر کی طرح چھٹتا۔ میسوں سپاہیوں میں کرنا سے داتے۔ نیم بیٹھی میں اُسے دوپہا لیتے۔ اس کے ہاتھوں کو بوجھل زنجیروں سے جکڑ کر اُسے پھٹ سے شکا دیتے۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس کا نام سننے ہی ہر ایک لرزے لگتا۔ کوئی بھی نہ جانتا تھا کہ اہندہ اس کا شکار کون ہو گا۔ وہ سست باطنی کی طرح کال کوٹھڑی میں زندہ جاتا پھرتا۔

میں نے اسے کبھی نہ دیکھا تھا۔ جاوید نے جب اس کا ذکر کیا۔ تو میرے دل میں اسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ دوسری سٹم میں جاوید کے پاس گیا۔ ایک میرے کے اور حالات معلوم کروں۔ ہم سنا کہ کوٹھڑی سے ذرا ہٹ کر کھڑے ہیں جس باتیں کر رہے تھے۔ اچانک ایک میسٹنک جیج ہم کو چیرتی ہوئی کانوں تک پہنچی۔ ایک خوفناک غرور ہٹ سائی دی چیخ چیخ بلند ہوئی۔ ایک گھونے کی آواز آئی۔ "میںیں بند ہو گئیں۔ سنا چا گیا۔"

ہوئے ذلیل و خوار کی طرف اشارہ کیا جاتا۔ جو کبھی انسان تھا۔

ایسے موقعوں پر امیر بڑا نہیں بھڑکتا۔ وہ دوماہیک کو گھونٹنے میں مرکب جاتا اور تماشائی آئے سانسے لاسے کا مطالعہ کرتے۔ ایک روز شہر کے ایک رئیس اُسے دیکھنے آئے۔ آدھ گھنٹہ تک کھلی محرابے پیرے کے دروازے کو دیکھتے رہے لیکن امیر اسانے نہ ہلکا سا سپاہیوں نے بڑے متین کئے۔ دھمکیاں دیں۔ پتھر مارے لیکن امیر کو نہ ہلکا ہوا۔ پتھر صاحب کو اطلاع دی گئی۔ اور ناپ اپنے چھٹے شریف سے کہئے۔

”دروازہ کھولو“ انھوں نے سپاہیوں کو گھنٹا کی گھنٹہ کی قیل کی گھنٹہ نہ ہئی میں کہنا ہوں دروازہ کھولو“ وہ چائے اور پائس کے سپاہی سے لاسٹی چھین لی۔ ایک سپاہی دروازہ کھول کر انگ کھڑا ہو گیا۔ ہتھم دونوں ہاتھوں میں لالھی تھامے پتھر سے داخل ہوا۔ امیر موقع کا مستعمل تھا۔ جھٹک چھٹا۔ لالھی چھین کر اس زور سے پتھر کے سر پر چھتی کہ سارا حاکم نہ نشہ ہرن ہو گیا۔ وہ سپاہی جھٹ کر ہتھم صاحب کو باہر کھینچ لائے۔ اور دروازہ بند کر دیا گیا۔ تماشائی کو اپنے چادر آنے وصول ہو گئے تھے۔

پتھر صاحب کا غصہ تھکے پتھر سے صبح سلامت پانچ گھنٹہ سحر سے کم نہ تھا۔ اب پتھر کے عقب کی دیوار میں ایک کھڑکی بنادی گئی۔ جب امیر تماشائیوں کے سامنے آئے تو اس کھڑکی کے سامنے سے طرح طرح کی تنگیوں دے کر دروازے پر آنے کو مجبور کیا جاتا۔ تین چار ہیسے ہی ہوتا رہا۔ جب ہتھم بدل گیا تو نئے ہتھم نے آئے ہی امیر کی کوٹھری کی تختی تارہ کر اس انانیت کو نظر اہرے کا لہر کر دیا۔

امیر کے درونک حالات زندگی کا علم بھروسہ وقت ہوا جب میں پرنسپل تعلیم یافتہ قیدی ہونے کے سبب نئے ہتھم میں کا سیکرٹری مقرر ہوا دنیا ہتھم ایک نیک شہرشت انسان تھا۔ اُسے سولی سے سولی قیدی سے مشورہ قبول کرنے میں عار نہ تھا۔ ایک واقعہ نے میرے کی ساری زندگی بدل دی۔

ایک شام میں ہتھم کے کھانے کے کوسے سے آ رہا تھا۔ جہاں سے میں نے ایک سیب اس غرض سے اٹھا لیا تھا کہ ایک بیمار قیدی کو دوں گا جس کی آنکھیں لوہار خانہ میں کام کرنے کرتے ضائع ہو گئی تھیں۔

امیر کی کوٹھری کے پاس سے گزرتا تو دیکھا کہ وہ شکستہ فہم اور حذر پھر رہا ہے۔ چہرہ مٹ گیا ہے۔ آنکھیں بند ہو چکی ہیں۔ توجہ اس کی شکل و صورت سے وحشت نہیں رہی تھی۔ میں معلوم ہوا تھا کہ کسی لے ہوئی آنا دس کو اس سے چھین رہا ہے۔ بے جے بال اس کے صیب چہرے کو ہٹ میں نے تھے۔ مجھ سے آنکھیں چاہو نہیں تو بے محسوس ہوا کہ اس کی لای مردہ ہو چکی ہے۔ اس کی دایوں نگاہ نے میرے قدم روک لئے۔ میں کوٹھری

کے قریب گیا۔ اور دروازے کی سلاخوں میں سے سیب اس کی طرف لاسکا دیا۔ وہ چلتے چلتے رک گیا۔ میں نے اہستہ سے کہا۔ ”امیر! یہ سیب لے و میں یہ تمہارے ہی لئے لایا ہوں۔“ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں بڑھ کر بیٹھ کے سایے میں ہو گیا۔ اور اس انتظار میں رہا کہ دیکھوں وہ کیا کرتا ہے۔ بہت عرصے بعد وہ قوی ہو گیا۔ پتھر صاحب نے انھوں کو میکا کسے لپکا۔ اور مضبوط پتھر سے سیب کو پکڑ دیا۔ پتھر دیوں اور بیرونی کی جھینکار تائی دی۔ پتھر دی اس کی کھانوں میں چکر لگائی تھی۔ وہ سیب کو خاکہ چاروں پنجوں کے کھنچوں لنگر اس واقعہ کے بعد ایک خاص شیش لے کر ہر روز قید خانے کے عفریت کے پاس سے جاتی۔ میرے لئے امیر اب عفریت سے نہ تھا۔ بلکہ ایسا انسان تھا جسے دوسروں نے ستا کر بری طرح جرد کر دیا ہو۔ میں اس کی کوٹھری کے دروازے سے لگ کر کھڑے جاتا رہا۔ ہتھم نے اُسے پکارا۔ وہ میری آواز پہچاننا اور ہاتھ پاؤں کے بل سرگے سرگے قریب آ جاتا۔ وہ ہمیشہ چاروں پنجوں کے بل چلتا۔ اس واقعہ کے دوسرے دن میں امیر کو دیکھے گیا۔

”امیر! تمھیں سیب پسند آیا؟“ اس نے مجھ سے پتھر سے دیکھا۔ امیر اس کے اندر دلی خیالات میں جگمگ ہو رہی ہے۔ مختصہ جواب نہ دیا۔ لیکن لہجہ جیسے جیسے لگے تکتا رہا۔ پتھر نے سر کو زبرد کا جھٹکا دیا۔ جیسے کوئی بوجھ سر کا ہوا۔ اور اسی طرح واپس کو دھکیں لٹ گیا۔

میں نے سوچا کہ اپنے قیدی دوست جاوید سے میرے کے احوالات معلوم کروں۔ جاوید ہسپتال میں کام کیا کرتا تھا۔ جب بھی امیر کے کوڑو کو بھ گیا جاتا اس کے زخموں کی مرہم تھی جاوید کے ہاتھوں ہوتی۔ جاوید کو اس کے زخموں سے خون برستا دیکھ کر روحانی صدمہ ہوتا۔ اور کئی کئی دن اس صدمے کی یاد تازہ رہتی۔

”دوست! یہ تذکرہ نہ پھرو۔ یہ جگہ دو دفع سے کم نہیں۔ میں رات کو اپنا روزنامہ لکھتا ہوں۔ جاوید ملک کا نوجوان اور ناسور سیب تھا۔ ایک بے نصیب انسان کی درد بھری چیخیں میرے کانوں میں بڑتی ہیں۔ سانس رک جاتا ہے۔ یہ چیخیں میرے الفاظ میں سما جاتی ہیں۔ پھر میں کہہ نہیں سکتا۔“ لیکن تم نے امیر کے کوڑا دیکھا ہے۔ کیا وہ دائمی عفریت ہے۔ ہم ”دوست! امیر کو باہل خانہ میں جونا چاہئے۔ قید خانہ میں نہیں۔“ اس کے سر پر ایک بوجھ سا معلوم ہوتا ہے۔ اُسے ذہنی ٹھیکہ جاتا۔ جاوید کی راسے سے میری تسلی ہو گئی۔ میں ہر رات امیر کے پاس جاتا۔ بسکٹ گوشت اور خوردنی اشیاء ساتھ لے جاتا۔ چند دنوں میں مجھے معلوم ہو گیا کہ میرا میری ملاقاتوں کی فکر کرتا ہے۔ میں ہر بار اسے سچے انتظار میں پاتا۔

لو کھا یا کرتا ہے۔

انہوں نے کہا: اگر یہ صحیح ہے تو میں اسے خبر سے باہر رکھوں گا۔  
دوسری بج بج کر عیسٰی کی طرف گئے۔ ہنرمند نے دروازہ کھولنے کا حکم  
دیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرا ایک کونے میں دبکا بچا تھا۔ سیاہی خونت سے  
لڑا ہوا تھا۔ ہنرمند نے اس کے ہاتھوں سے جالی لی۔ دروازہ کھول کر اندر داخل  
ہوئے۔ وہ خود اگر ملتی گاڑی کے سلسلے فرادہ تھیں تو موت نہ تھی یقیناً نہ ہوتی  
تھی اب بھی۔ میرے نے سر اٹھایا۔ جھجکا اور اچانک پیچھے گھٹن پر ہنرمند پڑا  
”ایسے“ میں چلایا۔ میری پیاد سے وہ یوں ٹھٹھکیا کہ باہر کی زو  
نے اس کے پاؤں جکڑ لئے ہیں۔ قید خانے کے حبیب دوڑنے کے اٹے ہوئے  
ہاتھ ہیں کے وہیں رہ گئے۔ وہ پیٹ کے بن گئیاں تھیں ہاتھوں تک آیا۔  
میں نے اس کے کان میں کہا: ”ایسے یہ کر نہیں اچھی نہیں۔“  
ہنرمند کو شک نہ ہو چکا تھا۔ وہ اب سنبھلا اور ہم تارک کو گھر  
کے کونے کی طرف لے گئے۔ سنت ہو اگر ہی تھی۔ ہنرمند صاحب شلفقت کے  
ہو جس میرے سے کہا: ”میرے باہر آؤ“ میں نے بھی اسے ایسا کرنے کا  
اشارہ دیا۔

”ایسے اگر میں نہیں کوئی اچھا کام کر سکتا ہوں تو تم میں سے کون سے  
چودہ سال کے عرصہ میں یہ پہلا موقع تھا کہ میرے نے میں کے کسی  
انصر سے ایسے نرم الفاظ سنے۔ اس نے میری طرف اس نظر سے دیکھا گویا  
آئے ہنرمند پر اعتبار نہیں۔ اور ہنرمند نے میں سے پرسے ہنرمند شرمند کو دیا  
”ایسے یہ غصہ تم سے بہت اچھا سلوک کریں گے۔“  
ایسا اگر چاہتا تو ایک چھلانگ میں بچے آ رہا تھا۔ لیکن خدا جانے  
کیا سوچ کر چپ ہو رہا۔ مجھے پھر دیکھا اور بڑھ کر میرے ساتھ دھوپیا۔ میں کے  
اچھا بچے میرے تک پہنچے۔

ہم لوگوں نے یہ سب سنا تھا کہ کاش کیا۔ جہاں ہنرمند کے حکم سے  
ایسے کیسے نہایت اچھا کیا کیا گیا۔ تین ہفتے گزرنے پر میں والوں سے  
دیکھا کہ ان سے وہ دیوہل چلے وہ میرا کہا کرتے تھے۔ نہایت نرمی اور  
خوش اخلاقی سے بہت صحبت کر رہا ہے۔ جتنی معائنہ پر معلوم ہوا کہ میرے  
کے داغ پر ایک ہڈی زور ڈالے تھی۔ جو بھی سر پر چوٹ آنے کی وجہ سے سر  
میں دھنسن گئی تھی۔ یہی اس کے جوتنا تھکا اور تھکاڑے محلوں کی وجہ سے  
پر عمل جاری کیا گیا۔ اس کا داغ اچھا ہو گیا۔ اس کو گزشتہ واقعات یاد آئے  
اور میرے نے اپنی ”دناک“ دستاں زندگی بیان کی۔

وہ لوہے کے ایک کارخانہ میں لدا چھلانے کا کام کرتا تھا۔ بڑا جان  
جو کھوں کا کام تھا۔ صرف اسی کے سے تن و نوش کا بنان ایسا کام کر کے

یہ وحشی انسان جس سے اور میں کو خوف آتا تھا۔ دروازے کی سلاخوں  
سے لگ کر ہر روز میری ماہ دیکھتا رہتا۔ وہ جھکٹ میرے ہاتھوں سے لیتا  
اور میرے سامنے بیٹھ کر کھا جاتا۔ چودہ سال تک اس گھرائی محضت کو کھاتے  
نہ دیکھا تھا۔ اس کا کھانا دروازے میں سے پھینک دیا جاتا تھا۔ وہ دن کو  
اسے ہاتھ نہ لگا۔ رات کو وہاں سے اٹھا کال کو گھر میں لیتا۔

ہماری آپس کی بات چیت جیل اور اس کے مصائب کے متعلق  
ہوتی۔ میں باتوں باتوں میں اس کی زندگی کے حالات معلوم کرتا۔ وہ تمہیں  
الفاظ کی پیشگی بول سکتا۔ اسے حالات یاد آتے۔ سر کو دونوں ہاتھوں  
سے تھام کر غافل پر زور دیتا لیکن بے فائدہ۔

میں نے معلوم کیا کہ وہ قتل کے جرم میں قید ہے۔ اس نے دن رات  
ایک آدمی کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ لیکن ان حالات کا علم نہ تھا۔ میں سے خبر۔  
پوچھ کر اس نے اس جرم کا انکباب کیا، اور کسی نے یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی  
نہ کی۔ میں نے سوچا کہ اس کے کسی دوست کو خد کھ کر حالت کی  
تبصیر معلوم کروں۔ شاید اس طرح اس کی مدد کی جاسکے۔

”میں کیا جانوں۔“ میرا سر دھڑکتا ہے۔ ”وہ کوخت آدمی اس  
جو اب دینا۔ ایک بار میرا سرکل ہی گیا تھا۔ کوئی کان میں۔۔۔۔۔  
لوگوں سے لدا چھوڑا میرے سر سے ٹکرائی تھا۔“

کئی کئی راتیں وہ داغ پر بڑا زور دے کر یہی تین چار فقرے بار بار  
دہراتا۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا۔ دل سے چاہتا کہ یاد آجائے۔ لیکن جب  
کچھ یاد آتا۔ تو اپنے دونوں مضبوط ہاتھوں سے سر کو تھام کر زور کا جھٹکا دیتا۔  
”معلوم نظروں سے میری طرف دیکھتا۔ ایک دفعہ بول معلوم ہو کر اس کے  
داغ میں واقعات کی یاد آ رہی ہے۔“

میں حقائق پر دو دو چار چار نصف تو جمع کرنا میرا مشغور ہو گیا ایک  
رات میں ان واقعات پر طور کر رہا تھا کہ ایک سپاہی مجھے چلائے چلائے  
میرے سر پر پہنچا۔ اور کہا کہ ہنرمند میں آپ کو جا رہے ہیں۔

ہنرمند صاحب مجھے دیکھنے کی چٹائے۔ یہ ہر شاہ تھی ویرم کہاں تھا  
بہتے ہوئے میں نے موقع غنیمت جانا۔ اور سیب اورا میرے کا ہاتھ ان کے  
گوشہ لگا کر دیا۔ ”میرا پیارہ مصیبت کا مارا ہے۔ اس کا داغ مازن  
ہے۔ ایک دن اس کے سر پر چوٹ کا ٹکڑی تھی۔“

”اگر اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ تو وہ نئے بچے کی طرح  
بے آزار بن سکتا ہے۔“

ہنرمند صاحب نے مجھے اس نظر سے دیکھا جو میرا داغ بھی مل چکا ہے  
میں نے کہا: یہ حقیقت ہے۔ وہ میرے ہاتھوں سے چیزیں لے



آج شہر ہی تھا۔ عجیب، اعمتات دو چار ہوا۔۔۔ میرے قم نے اپنی ٹاپ  
میں بالکل صبح مستانی :-

”جی ہاں جناب“ امیر نے مجھے بے جواب دیا۔ اس کا ایک نیک  
لفظ درست تھا۔ یقین رکھنے میں نے خواب نہیں دیکھا۔

لیکن در مسنونہ - تھماری بیوی تھی نا - ہاں - وہ مر گئی  
 اسی دن جس دن اُسے مکان سے نکالا گیا - بچی زندہ ہے - اب باقی

مرد ہے۔ میں اس دیکھ کے آکر اچھل۔ بڑی پیاری بچی ہے۔ اسے بس شہر کے ایک امیر گھرانے پر پالا ہے۔ وہ ہمارے جیل کے شہر قائد ٹرٹ کے دوست ہیں۔ میں نے ان سے تمہارے متعلق بات چیت کی۔ جس عورت نے تمہاری بچی کو پالا ہے۔ وہ تمہاری بیوی کی دشمن وار ہیں۔ وہ تمہیں ایک زندہ و شہیت کہاں کرنی ہیں میں نے ان سے سب واقعات کہہ دیے۔

یہ انھی سرسماں نرودی گئی ہے۔ جاؤ غیثی میں سے کپڑا دھا  
نیا بٹا۔ الہ۔ گل صبح تم ہا کر دیئے جاؤ گے۔

یہ بے حیرت، مستعجب اور سرسکے بچے جذبات کے تحت آئے  
 طرح ۱۱۔ ہتھکڑیاں اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ کیا بھی کو اس کا ظم ہے۔

نہیں۔ انھوں نے بھی کوئٹے میں تباہی مچا دی اور پھر واپس چلے گئے۔  
دوسری صبح امیرانہ کمرے سے باہر نکلے اور اس کے ہمراہ

یہ روح فی مسرت کے آثار چھائے تھے۔ اس نے مجھے قاضی ہو کر کہا: "دوست! سب پر تو تھے کیا۔ ذرا سوچو ایک سیٹ تم نے میری زندگی بدل دی؟ وہ

ایک ٹکٹ کے خاوشیں بولیں : ”وہ بچے چوہن نہیں نیکیں۔ اور میں بھی چاہتا ہوں کہ  
اُسے خبر نہ ہو کہ اس کا باپ فیضان کا مغرب ہے۔“

جب ہاتھ میں سمانی نامہ اور پانچ روپے کا نوٹ اس کے ہاتھوں میں دیا تو اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ ”جنت اب کچھ نہیں سکتا کن الفاظ میں

”آپ کا شکریہ ادا کروں۔“  
 ”ایک کوئی ضرورت نہیں۔ تمہارے باعث میری تنگی ہی ہوئی، اور کبھی

میرے نے چڑھ کر پتھر اٹھایا۔ میں نے یہ کہہ کر دوں گامیں اٹھے  
 دیکھنا چاہتا ہوں — دیکھ کر جو نکلا۔ اس نے ہنسنے اور مجھے اٹھ بولایا اور

نصحت ہو گیا۔  
ایک ہفتہ گزر گیا یہیں میرے کی کوئی خبر معلوم نہ ہوئی بہت کم پریشان

”نکل جاؤ یہاں سے۔ مجھے اس کے کیا غرض کہاں دفع ہوئی۔ تم اسے  
 مجھ کے کہاں چلے گئے تھے؟“

”اچھا تو اے تم ہی نے بھلا جو رنگی کہاں ہے؟“  
”جہنم میں کہاں ایسی عورتوں کو نہ پایا جائے۔۔۔ فاحشہ ہیں کی۔۔۔“

دیر کے کواکس سے زیادہ سُننے کی تہب : قحی۔ بھیرب جو تشری کی ملج  
 ہش۔ مکیا کاس۔ میری یوی فاحشہ۔ میری یوی۔ میری یوی

پرمائش ————— مینے ————— پرکبو ————— اب کبو  
ذیل کتے

اس کی گردن ابیرے کے آہنی پھوں میں تھی۔ ایک سٹھلے میں اس کا  
پہن تمام تھا۔ تین انصروں نے پیش کیا۔ یہ سہ کی گرفت کو ڈھینا کر کے  
مردہ لاش کو اس سے بچا رہا۔

ایہ سب کے سب سے گت چاری نکلنے سے تپا گیا کہ وہ بہوش ہو گیا  
وہ اُسے اسی حالت میں نکالے پہنچا گیا۔ اس کے حواس جانتے رہے۔ اُسے سحر

کی قید کا حکم سنایا گیا۔ اس کی طرح کوئی دیکس نہ تھا۔  
یہی وہ داستان، امیر نے ہتھکڑیوں کو جس جہاں کے بعد ہوش

ہیں آستہری سٹانی۔ اب رو بہ ساسا خوشوار زندہ نہ تھا۔ بلکہ صاف تھک رہا ہے۔  
معزز مسدود بزرگوں کی طرح وہ زندگی کی تاسیں سنایا کرتا تھا۔

مترجمیں نے چھائی کی کوٹھڑی کی صفائی اس کے سپرد کی۔ وہ بھاری پائوں کو کھانچا پکچا کرنا۔ وہ بد نصیب انسان جو زندگی کی ٹھریاں گھنا

کرتے۔۔۔۔۔ ایسے کی تسلی آمیز باتیں غور سنتے۔۔۔۔۔ اور کبھی کبھی  
روحان بن بھروسوں کی حالت پر آبیہ ہو جاتا۔ میں ایسا سے اکثر نہ پا جا کے جا کرتا

وہ خوش تھا اور زندگی سے بھین — کسی نے اُسے دو ٹوٹی تھیں چڑیاں پالے  
کو دیدی تھیں۔ ہر تہم نے اُسے ہن کہنے کی اجازت دیدی تھی پس کسی کی

لوٹھری میں ان نخی اڑیوں کا چمکنا غیب منظر پیدا کرتا تھا۔  
اس سفید ریش، تومی ہیکل انسان کا یہ منظر انھوں کو میت بعد معلوم

ہوتا تھا کہ غریبی کی دیوار سے ٹیک لٹا سب بچتے۔ شائے پر بچتے پروں کی چڑیا  
بھدک بھدک کر سر پہ سڑوں میں جھک رہی ہیں۔ اسی شنائوں پر تھیں۔ سب بانڈو

”ہاتھوں پر لگتی ہیں۔۔۔ کھڑکی میں سے سمجھ جاتے ہیں کہ شہر میں کچھ نہیں ہو رہا۔“

ایک دن سیم جیل قلعہ جلدی دفر میں آئے۔ ان کی آوازیں دوجا سہرت کی جھلک تھی۔ ہمیں نے ایک بات معلوم کی ہے۔ امیر کو بلا بھیجو

”جیو جاؤ ایسا۔۔۔ آرام سے منو“ انہیں خود پریشانہ تھا۔ ”میں۔۔۔ جلدی“

کے کپڑے بدش اور کپڑے تھپتھپ رہے تھے اور وہ دروازہ کھول کر دوسرے کمرے سے نکلتے ہوتے میں دوڑتا ہوا تھا۔

”دروازہ کھولے میرا اور کہیں ٹھکانا نہیں ہے“

”یہ نہیں ہو سکتا نہیں معافی میں ملے ہے۔ تم دوبارہ واپس نہیں آ سکتے۔ یہ قانون کے خلاف ہے۔“ جھانڈنے جواب دیا۔ ”تم کو اطلاع ملی۔ اس نے پوچھا کہ اس وقت آیا ہے؟“

”میرا“ جواب دیا

وہ بھاگتا تھا دروازہ پر پہنچا۔ دروازہ کھولا گیا۔ ”میرا موجود نہ تھا۔“ ہنر ہر ایک پر غصے ہو رہا تھا۔ ”گدھو! تمہیں اس کی خبر نہیں ہم ایک ہفتہ سے اس کی تلاش کر رہے ہیں۔ وہ شعل نے جیل کی چار دیواری کے باہر تلاش کرنے لگا۔ اور سڑک پر دیر لگا کر اس کو تلاش کر لیا۔ ”میرا سڑی سے تھل ہو چکا تھا۔ ہنر نے اسے نو دہ رات کے بجے دیا پناہ تھا۔ بدن کے کچھ حصہ کو ابھی رات و صبح نہ سہی تھی۔ اسے شدت کا بخار تھا۔ اور اس کے چہرے پر ابھی سے غرق چار دیواری تھی۔

ہنر نے میرے کی رڈ کی کو بلا لیا۔

”نیز کھوم رڈ کی آتے ہی باپ سے لپٹ گئی۔ ابا جان۔ ابا جان۔ اپنے بچے پہلے کیوں نہ بتایا۔“ اس نے آپ کی بیٹی ہوں۔ میری طرف دیکھنے سے آہ آپ کیا جانیں میں نے کتنی بار آپ کے لئے کی دعا میں مانگی ہیں۔ آپ نے مجھے تب کیوں نہ بتایا۔“ آہ

میرے نے شدت در دو کب سے دھندلی نگاہ اس کے موصوم چہرے پر ڈالی۔ رڈ کی کے نرم نازک ہاتھوں کو اپنے بھاری بھاری ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی میں نے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔ اچھا ہوا جو تم آگئیں۔ یہ میری آخری آرزو تھی۔“

تید خانے کے حضرت کا سر آپ کے آپ تلخ پر جا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر روحانی سکراہٹ کھیل رہی تھی۔ براہ بوڑھا اپنی آخری منزل پر پہنچ چکا تھا۔

ہنر کو اور زیادہ اس کی فکر ہوئی۔ رڈ کی کی پردوش کرنوائی کو پیغام بھیجا۔ ”میرے اور اس کی جڑوں کے متعلق جواب میں رڈ کی بغیر نہیں آتی تھی۔“ بوڑھا آدمی کیا کہا۔ وہ میرا باپ تھا۔ مجھے چاہیے اس کی خبر کیوں نہ دی گئی۔ انھوں نے مجھ سے کیوں چھپائے رکھا۔ وہ چلا گیا تب بھی نہ بتایا۔ اس نے مجھے بھی نہیں کہا کہ کیا رہا تھا۔ آہ۔ اب کیا کیا جائے؟ اس نے مجھ سے نفرتوں میں اس نے بوڑھے کی طاقت کا ذکر کیا۔ وہ گھر کے دروازے پر آیا تھا۔ چڑاں میں چمک رہی تھیں۔ شاید وہ پہنچا آیا تھا کہ جس اس کی بیٹی ہوں۔ وہ اس کی امارت اور موصوم سن کو دیکھ کر خوش ہو رہا۔ یہ معزز بوڑھا انسان اپنی بد مصیبت زندگی کے واقعات سے اپنی بچی کی مسرتوں کو براہ کار نہیں جانتا تھا۔ وہ بن کے رخصت ہو گیا۔

رڈ کی بڑے جھانڈ رہی تھی۔ جو تھکن کی آواز آئی۔ نوکر بوڑھے کو اندر لے دیتا تھا۔ اسے میں ابھی خود آپسی۔ اور بوڑھے کو اندر لیا کر بٹھا گیا۔ ”بیٹی میں جہاں رہا تھا رہا ہوں۔ یہ وہاں خرید لو۔ یہ بڑا بچا چمکتی ہیں جس بہت خوب لڑھا ہوں۔ میں نے خود انھیں دلا ہے۔“

رڈ کی نے صرف تم کھا کر بندوں کو بوڑھے سے خرید لیا۔ صرف کب دیر میں۔۔۔ وہ مجھ سے ملتی تھی کہ بوڑھا اسے کیوں دیکھے جا رہا ہو اور اس کی آنکھوں سے سیلاب اشک بہوں جاری ہے۔

”خدا حافظ بیٹی! تم باہل اپنی ماں کی شکل و صورت کی ہوتے پاتی رہو۔ اس نے کہا۔ جو کھٹ پر چمک رہا۔ جیسے کہ اور کہنا چاہتا تھا اس نے رڈ کی کو ختم نظروں سے دیکھا۔ اور چپ چاپ رخصت ہو گیا۔

رڈ کی بیدار تھیں۔ ہر تھی۔ ہم اسے کہاں ڈھونڈیں۔ کہاں تلاش کریں۔ پہلے ہی نے مجھ سے بڑھ گیا؟

باہر رات باری ہو رہی تھی۔ ایک ہفتہ سے طوفان بار بار اسے تھمتا تھا۔ ”میرے کی رڈ کی اور ہنر جیل نے شہر کی گلیوں اور گرد و نواح کا چرچہ چھ چھان ڈالا۔ مگر پتہ نہ چلا۔

ایک رات جیل کا بڑا دروازہ کھٹکٹا گیا۔ اسی آہستہ سے ہٹ گیا۔ دروازہ کھلے۔ بچے اندر آئے دیکھے یہ سنتری نے کھڑکی سے دیکھا۔ میرا

**ماناسری** قلوبطرس۔ میلین۔ اور تائیس۔ کے مقابلہ میں جلوہ گر ہونے والی عدوت! ایک ایسی زندہ بادیہ سارہ ہے جس نے اپنے سحر آمیز ارشادوں سے دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس میں ایک ایسی ہیئت دوسروں کی عقلوں سے دنیا کو رطل حیرت میں ڈال دیا۔ اور جن جاسوس کے گھیس میں ایک بہترین مہرمل کے دماغ کو بیکار کر دیا۔ مسٹر میلین نے اس فنکار حیدر کی رنگین دکانوں کو مختلف کتب اور جنگی دستاویزوں کے مطالعہ کے بعد اپنی بار بار دہن ابان کتابی صورت میں شکر کیا۔ کھائی، چھپائی، کاغذ اور تائیل نہایت اعلیٰ قیمت سے ایک روپیہ (۵۰) ملے کا پتہ۔

ابو دلاہ نور

حکیم آزاد انصاری

# آیاتِ دانش

|                                      |                                     |
|--------------------------------------|-------------------------------------|
| ہر حال میں ناشاد سے دلشاد و اچھا     | ہر طرح گرفتار سے آزاد اچھا          |
| جس دین میں افکار تک آزاد نہ ہوں      | اُس دین سے سومرتبہ الحاد اچھا       |
| اجسام کی عسوس فکس شکلیں ہیں          | ارواح کی عجیب و غریب شکلیں ہیں      |
| وہ مادے کے کثیف تر سپر ہیں           | اور یہ اُس کی لطیف تر شکلیں ہیں     |
| مقصود بقا کیا ہے یہ کس سے کہتے       | مفہوم فنا کیا ہے یہ کس سے کہتے      |
| ہم واقف اصل دوسرا تو ہیں مگر         | اصل دوسرا کیا ہے یہ کس سے کہتے      |
| راز تخلیق کیا ہے کس سے کہتے          | پہنی تحقیق کیا ہے کس سے کہتے        |
| ہم کو معلوم کیا ہے کس کو سمجھائیں    | ہم کو تصدیق کیا ہے کس سے کہتے       |
| ہم رازِ جہاں سے بیش و کم واقف ہیں    | واقف ہیں اور مستحکم واقف ہیں        |
| اس اہل وقوف سے تہی دنیا میں          | اتنا بھی بہت سے جتنے ہم واقف ہیں    |
| میں رازِ جہاں سے کچھ نہ کچھ واقف ہوں | پیدا و نہاں سے کچھ نہ کچھ واقف ہوں  |
| گو نا بلند زبان قدرت ہوں مگر         | اندازِ بیاں سے کچھ نہ کچھ واقف ہوں  |
| حسرت تھی کہ رازِ دہر کھل کر سمجھائیں | جس طرح سمجھ سکے ہیں یکسر سمجھائیں   |
| لیکن کوئی نہ سمجھنے والا ہی نہیں     | کس کو سمجھائیں اور کیوں نہ سمجھائیں |
| جو شے ہے وہ انتخاب ہے اپنی جگہ       | جو چیز ہے بلا جواب ہے اپنی جگہ      |
| ہر ذرۂ بے حقیقت اس عالم میں          | غیرت وہ آفتاب ہے اپنی جگہ           |
| ذہن اتنے رازِ فہم اتنی چالاک         | سمجھیں تو رموزِ دہر سمجھیں کیا خاک  |
| دانش بخشی گئی تو ناقص دانش           | اب تک عطا ہوا تو محدود و ادراک      |

## حیات ملک

## تعبیر

ایسا دھانپ کر رکھ دیا۔ آخر اٹھ اٹھالیا۔ پہلے ہی صفحہ پہلی حروف میں یہ سرخی دیکھی۔

”کوڑھ میں قیامت چیز زلزلہ۔“

لاکھوں جانوں اور کروڑوں کالمی نقصان، جتنے بھی ملک محسوس ہوئے ہیں میں دھمک سے رہ گیا۔ مفصل حال ایک ایک نظر کر کے پڑھنے لگا۔ ختم کرنے پر ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے میری زبان سے بے ساختہ نکلا: ”اُف! اس قدر تباہی دیر بادی!“

چوٹیوں کی جھنکڑ سے میں نے محسوس کیا۔ کہ وہ ٹہل ہٹا کر میرے ان کلمات تا سب کی وجہ معلوم کرنا چاہتی ہے۔ لیکن میں بغیر توجہ کئے سامنے دیوار پر نظر جمائے بیٹھا رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے مصیبت زدگان زلزلہ کی حالت زار کا نقشہ چھر گیا۔ میں پچھلے بھوکھال کے محضر پر بہار طبع کیسے ہیں ایک جہنم گزار آیا تھا۔ بہار کے زلزلہ کے ہولناک منظر دیکھ چکا تھا۔ ”تیم بچوں اور بوجھ خوروں کے درجہ سوزنا۔“ زمین کی پڑور و کراہٹ شہر میں بے گور و کن لاشوں کا فتنن اور باہر کھنٹوں میں پس ماندگان کی بے سرو سامانی، عالی شان اور مضبوط عمارتوں کا سپر و خاک ہونا اور پھر اہل زمین کی اسس مر بادی پر چاند سورج اور ستاروں کی حسب معمول پھر وائی سب منظر ایک ایک کر کے میری نظر سے گزرے گئے۔ دنیا کی اس بے تہائی اور قدرت کی اس بے پروائی پر میں ہی دل میں اس سو بہانے لگا۔ نا معلوم میں کب تک بڑھتی پڑا اور جتنا تھکا تھکا کیا کہ ایک لمحہ چپکے چپکے سہاٹا کسی دیوار کے دھڑام سے گرنے کی آواز سنائی دی۔ ”اے مر گیا! اٹھو! باہر نکلو!“ کی آواز یہاں آئے تھیں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکھڑایا۔ کہ لڑکھڑا کر رہے تھے۔ سامنے دروازے کے اور لگی ہوئی جھیل دل کے ایک منظر کی رنگین تصویر فرش پر گر گئی اور چٹکنا پڑی۔ مجھ کو چٹائی میں سے خوفزدہ ہو کر کہا۔ ”آسیب! آسیب! آسمان چلا ہوا اٹھو بھلا دی تپتے چلو۔ بھوکھال!“

میں نے اس کا اقدہ پڑا اور زمین کی طرف دوڑا۔ آگے آگے میں پیچھے پیچھے دوپھی چلی آتی تھی۔ نصف میری پٹائی ہی ملے کی ہو گئی۔ کہ زلزلہ کے ایک تارہ جھٹکے سے زمین کی دیوار پر سے دو اٹھیں میرے نکلے سر پر لگیں میرے سر سے ایک جھج جھج آواز گرائی چاہتا تھا۔ کہ نرم ہاتھوں نے سنبھال لیا۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے مطلق خبر نہیں۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ پھر جس

بزم مہتاب گویاں کے آج کے اجلاس کو مدگرم آپ سہیلیاں منانے کا تھا۔ اشد صاحبہ اپنی کالج لائف کا ایک واقعہ ختم کرتے ہوئے کہا: ”یہ میری پہلی آہ آخری شکست کی داستان جیسے میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔“

سب بے صدیقی صاحبہ ہمدردانہ لہجہ میں کہا: ”آپ کی سیکم تو ہر لحاظ سے مکمل معلوم ہوتی تھی۔ لیکن زندگی میں بعض واقعات ایسے بھی پیش آ جاتے ہیں کہ تقدیر کو ماننا ہی پڑتا ہے، اور بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بظاہر انسان بھوتا ہے کہ اسے شکست ہوتی۔ لیکن وہ حقیقت اسی شکست میں سکی کامیابی کا دامن نہیں ہوتا ہے۔“

”بی شک“ میری زبان سے کھڑا اس انداز سے نکلا۔ ”جیسے ایسی ہی کوئی واقعہ مجھے پیش آچکا ہو۔ اس نے سب وہ سب کی استفسار انگیز نظریں مجھ پر جم کر رہ گئیں۔“

”چند سال ہوئے۔“ میں نے کچھ دیر سوچ کر کہنا شروع کیا۔ ”خمس دن میری شادی ہوئی۔ اسی شام کو میں تمام دن کے تھکے ماندہ دوستوں اور خاں کو شب بھر کھراپنے کرہ کرچلا۔ اس وقت مختلف قسم کے امید افزا خیالات نہایت تیزی سے ایک ایک کر کے میرے دماغ میں آ رہے تھے۔ کون نہیں چاہتا کہ اپنی نئی رفیقہ حیات کو شرمع ہی میں اپنے مزاج و طبیعت کا بہتر سے بہتر نمونہ پیش کر کے متاثر کرے؟ غرض جب زمین طے کر کے میں نے دوپہر منزل پر قدم رکھا۔ تو خلاصہ معمول کی طرح زیادہ روشن پایا۔ کمرہ میں داخل ہوا تمام کمرہ ہلک سا تھا۔ نیز پرگلدتے تھے جوئے تھے۔ ایک طرف پینٹنگ دلیں کبیل پیچھے سامنے دیوار پر لگی ہوئی نقادیر کو دیکھ رہی تھی۔ مجھ دیکھ کر اس نے جھٹ کھل میں منہ چھپایا۔ میں اس کے نزدیک لگی ہوئی آرام کری پر بیٹھ گیا۔ اور کمرے کے سامان کا جائزہ لینے لگا۔ ہر ایک چیز نہایت صاف ستھری اور قرینہ سے رکھی تھی۔ کھونٹھلا پر دوں اور المادیوں پر زردہ بھر گروہی نظر نہیں آتی تھی۔ فرش پر مددی کا غدہوں کے ہنار پڑے رہتے تھے ٹھنڈے ناپید تھے۔ بیڑ پر ایک طرف تازہ آب۔ اور میری چند کتابیں اور وہ سری طرف کوئی بیڑ دھانپ کر رکھی تھی۔ میں نے کپڑا اٹھا کر دیکھا۔ تو عقاب انگیزی اور دلی مٹھائیوں سے لبریز تھا۔ دل ہی دل میں سکویا اور خیال کیا کہ یہ شدت سونے جہانی صلاوت کے اور کب کی نہیں ہو سکتی۔ میں نے پینٹنگ کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ ابھی ٹھنڈی گھٹری سی تھی منہ چھپائے پڑی تھی۔ عقاب میں نے ویسے کا



وقت میری آنکھ کھلی۔ میری دگ دگ میں سخت درد محسوس ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر میرے دل کا معائنہ کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کے علاوہ اور بھی لوگ کمرے میں موجود تھے۔

"ہائے۔۔۔۔۔ پانی! میرے منہ سے نکلا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ مجھے یاد نہیں۔۔۔۔۔ میں پھر بے ہوش ہو گیا۔۔۔۔۔ میں بتا سکتا کہ کتنا عرصہ اسی بے ہوشی کے عالم میں رہا۔۔۔۔۔ پھر مجھے ہوش آئی۔ صبح منورہ ہو چکی تھی۔ درد میں لگی۔۔۔۔۔ ہوا آ رہی تھی۔ والدہ مجھ سے میرے منہ میں دودھ ڈال رہی تھیں۔ انام میرے سر پرانے کھڑا تھا۔

"صبح کون سا دن ہے؟ میں نے والدہ سے پوچھا۔  
"مجموعات ہے بیٹا! طبیعت اب کیسی ہے؟"  
"اب تو آرام ہے۔"

والدہ باہر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد کسی کے کراہنے کی آواز میرے کان تک پہنچی۔ میں نے دائیں طرف دیکھا۔ تو تین قدم کے فاصلے پر ایک چار پائی پر سر پہنٹی باندھے کوئی بڑا گواہ رہا تھا۔

"یہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔  
"انام جھٹ بول اٹھا۔ چھوٹی بھابی جان دیں۔"  
"آسیجہ! میرے منہ سے نکلا اور ایک برقی زو میوے جسم میں دوڑ گئی۔ جھٹ اس کی چار پائی تک پہنچا۔ دونوں ہاتھ چار پائی کے بازوؤں پر ٹپک کر جھٹکتے ہوئے نرمی سے پکڑا۔

"آسیجہ!"  
"اس نے آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحہ گھورا۔ پھر دونوں ہاتھ میری طرف اٹھائے اور مسکرا کر بولی:-

"آپ ہیں۔ اب تو آرام ہے نا؟"  
"ہاں آرام ہے لیکن نہیں ہے چوتھ کو کچھ ہنسی؟"  
"اس ٹیلی فونی پر گر کر؟"  
"ٹیلی فونی پر گر کر۔ وہ کیونکر؟"

"جب ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ کا بچنا۔۔۔۔۔ محال ہے۔۔۔۔۔ تو پھر۔۔۔۔۔ میں نے جی کر۔ کیا کرنا۔۔۔۔۔

ابھی فیوض غم بھی نہیں ہوا تھا کہ کوئی مجھے بلا کر کہنے لگا۔ وہ ملا گیا! اٹھو ابھی تاک سوئے ہوئے ہو۔ دیکھو مورچ کتنا بڑھاتا ہے۔ رات ساری کر کے کہہ کر بول پڑے۔ رہے ہلنگ پر کیوں نہیں سوئے؟ میں نے آنکھیں کھولیں تو بھابی صلوہ شانہ ہلا کر مجھے جگایا تھی۔

مورچ کی کرنیں صلعائے اندازہ نہ تھیں۔ برقی قلعہ اسی طرح جل رہا تھا۔ اخبار پڑھ کر ڈاکٹر صاحب نے اسے بچھڑائی کے پیچھے کھڑی میری حالت پر مسکرا ہی تھی جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے منہ چھپا لیا۔

اب بھی جب کبھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو سوچتا ہوں کہ کس قدر مصیبت خوب تھا۔

اس پر راشد صاحب نے کہا: "اب خوب تو بے شک مصیبت تھا لیکن زندگی بدلت گئی کہ وہ دن کی ہمدردی اور اعتبار تو ضرور حاصل کر لیا ہوگا۔ وہ بھی کہتی تو ہوگی کہ مصیبت انسان سے پہلا ہے جسے کرسی کی بجائے ہلنگ پر سونے کی تربیت دینی چاہی۔"

آپ کو بھی حالات توقع اپنے لہرادوں میں خوب ہی شکست ہوئی تھی اور دوست بڑا:-

"انہیں بات تو ختم کر لینے دیں۔ صدیقی صاحب نے بات کٹاتے دئے

کہا:- "ہاں تو پھر بات کے واقعہ کا ذکر ہی صاحبہ سے کہی نہیں ہوا۔"

"یہی تو مجھے سنا تھا ہے۔ ایک صبح جب کہ میں غسل سے فارغ ہوا ہی

تھا کہ خلاف معمول بھانے خادمہ کے وہ نود چائے لے آئی۔ اس کی اچانک آمد

میں کچھ گھبرا گیا۔ بڑی شکل سے رٹ رٹ کر اس کے سلام کا جواب دیا مگر ان کا

کیا یہ وہی وہیں ہے۔ چ شادی کی رات شرم و حیا کی پتلی بنے سکڑی ہوئی اپنے

آپ کو کھیل سے چھپائے بیٹھی تھی۔ اور کچھ اتنی دیدہ دلیری کہ میں اس سے ایک

لفظ تک نہیں دلا۔ اور یہ چائے خود لے کر آئی اور پھر اس دھماکے کا اسلام علیکم۔

ہونا ہر ضرور اس سے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ خاوند تو بالکل شرمیلا بچہ

ہے اس سے کس بات کا ڈر۔

وہ خاموشی سے میز پر چائے رکھ کر پیالیوں میں ڈالنے لگی۔ جب نوں

پیالیاں تیار ہو گئیں۔ تو میں مقابل کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اپنی پیالی اٹھالی۔

چائے پینے کے دوران میں کال خاموشی طاری رہی۔ چائے ختم کر چکے پر اس

ہی مہر سکوت کو توڑا:-

"میں اپنی غلطی کی معافی چاہتی ہوں۔ اس بات شاید آپ بہت شکے ہو

تھے کہ اخبار پڑھتے پڑھتے کرکے یہی سوئے جی تو بہت چاہتا تھا۔ کہ آپ کو

جگھوڑوں۔ لیکن نہ جلتے آپ کو جگھٹنے کی کیوں جرأت نہ کر سکی۔ یہ میری کمزوری

تھی۔ میں اب اسے محسوس کرتی ہوں آپ شاید اس پر بھی خفا ہوں۔ کہ دوسری

صبح جب میں صلوہ سے آپ کو جگایا۔ تو میں کیوں نہ تھی۔ لیکن خدا شاہد ہے۔

اس سے آپ کی تعزیریک مرادہ تھی۔ میں خود نہیں سو سکی۔ کہ مجھے اس وقت کیوں

ہنسی آئی۔"

قصہ بگایا وہ مسرتانہ دیکھ کر میرے ہوش ٹھکائے ہوئے اور بالکل اس

"آپ نے اس رات بھر بچل کے متعلق خیال میں پھل اچھوڑ کر میں کہ میں آپ کے ساتھ گئے  
میں خواب میں بھی مجھے ساتھ اٹھا کر لیئے۔ یہاں تک تو مشاہدات کا تعلق ہے؟  
"بائل بلیک؟"

"آپ بھی ایک میری فطرت سے ناواقف تھے۔ اس لئے اس خواب میں  
جو میرے ایشور و محبت کا جذبہ آپ سے تو کھلے اس کا آپ نے ابھی ایک مشاہدہ  
نہیں کیا تھا۔ اس لئے آپ کا میرے متعلق تصور ہی ہو گا۔"

"بائل بلیک: میں نے تعبیر کی وہ دیتے ہوئے کہا  
پھر کچھ در خاموش رہ کر کہنے لگی۔"

"آپ انشا اللہ مجھے اپنے تصورات سے بہتر رہی پائیں گے ....  
... کی پوجہ تو بغیر آپ کے زندہ رہ کر کرنا بھی کیا ہے ...  
لیکن خدا رحیم بخیر عظیم عابد کے ناراض نہ ہو جائے اگر میری۔"

(تذکرہ)

شخص کی طرح اس نے لگا جو ایک رات ناگہانی طور پر اپنی زندگی کی ساری  
کمانی چوڑی کے حوالے کر بیٹھا ہے اور وہ ساری صبح ہر ایک چیز صبح و سہم پھر  
گھر میں موجود پاتا ہو۔ میں اب سمجھا کر جسے میں ذلیل شکست سمجھتا تھا۔ وہ  
وہ اصل ایک بنا نہ فرم سکتی۔ میں نے بھی لڑی چکچکھا ہٹ کو وہ کیا اور باقیں  
کرنی شروع کر دیں۔ آخر باتوں باتوں میں وہ خواب بھی کہہ سکیا۔ خواب سکر وہ  
کچھ در خاموش رہی اور پھر دلی۔

"خواب کے متعلق عمر آؤ کہ ہیں کا کیا نظریہ ہے؟ کیا یہی نہیں کہ دماغ  
میں جو مختلف اوقات پر مختلف حیات متاثر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ بعض شاہد  
کے ساتھ لی کر لیند کی حالت میں اندر دماغ کے کسی حصے میں جو ابھی جاگ  
رہا ہو تب ایک واقعہ کی صورت میں گشت لگاتے ہیں۔ جس کی یاد بیدار تھے  
پہلے ہی دماغ میں رہ جاتی ہے۔"

"اں کہتے تو ابھی نہیں۔ میں نے کسی قدر متاثر ہو کر کہا۔"

## سیاسی طبع

|    |                                                                |    |                                                                   |
|----|----------------------------------------------------------------|----|-------------------------------------------------------------------|
| ۱  | سوشلزم۔ از فینک اننگز۔ مہر جیسہ کا مرید بادی۔                  | ۱  | روسی افسانے آتش بارے علی ایک قدم آگے۔ سلطنت حسن منشور۔            |
| ۲  | سرمایہ داری۔ عبد اللہ ملک۔                                     | ۲  | مضامین محمد علی محمد مولانا کے حالات زندگی۔ پروفیسر سرد۔          |
| ۳  | قائد اعظم۔ مسٹر محمد علی جناح کی تحفہ سوانح حیات۔              | ۳  | اوراق پارینہ۔ مشہور شاہی قیدی کی کہانی و داستان جہم دردی شیر جنگ۔ |
| ۴  | لینن۔ از ڈاکٹر محمد علی۔                                       | ۴  | چنگیز خاں۔ پرنسپل جمیل داس کے چھوٹے چھوٹے انسانوں کا مجموعہ۔      |
| ۵  | انقلاب۔ انقلاب۔ از ڈاکٹر محمد علی۔                             | ۵  | سوشلزم کیوں؟ سوشلزم کے بنیادی اصول۔                               |
| ۶  | انقلاب فرائض۔ باری علی کے لکھے طرز بیان میں بہت قبول کتاب۔     | ۶  | پروبلیم یونان پارٹ۔ ناممکن کو ممکن بنانے کے سبق آموز کالمے۔       |
| ۷  | جمہوریت روس یعنی سویت روس کے نظام کاؤز۔ مترجم منظر علی انور۔   | ۷  | کولیس۔ کولیس کی دیسی کی کل داستان۔ پنڈت بیہارام دتتا۔             |
| ۸  | سوویت روس۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا سیاست نامہ روس۔              | ۸  | آہنگ زخم۔ شجاعت و حیرت سکھ نروالی انگلیں۔ دتار انبالوی جگلد۔      |
| ۹  | توانیہ کاٹرس۔ لکھے ہندوستان کی جنگ آزادی کی داستان۔            | ۹  | انقلابی شراکت۔ پرنسپل جمیل داس کی خیالات انقلاب کی صورت میں۔      |
| ۱۰ | آئینہ ہندوستان۔ باغی ہندوستان دینل انڈیا کا اردو ترجمہ۔        | ۱۰ | قوم کی آواز۔ جانا گاندھی کی زبان سے سوانح کی تشریح۔               |
| ۱۱ | میری جہد جہد۔ ہر شہر و کشمیر میں کی خود نوشت سوانح حیات۔       | ۱۱ | مسلمہ عمرانی۔ ارژن شاہک روسو۔ فلسفہ سیاست کی اہم کتب۔             |
| ۱۲ | مسلمین۔ سائنس میسرینی کی خود نوشت سوانح حیات کا اردو ترجمہ۔    | ۱۲ | میزوینی۔ انکی کے نجات دہندہ آزادی کے اصول کی تعلیم دینے والا۔     |
| ۱۳ | میری کہانی۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشت سوانح حیات دو حصے۔ | ۱۳ | ہم مورچ کیوں چاہتے ہیں؟ احمد داد و شمار کے ذریعہ دار و ملن کی     |
| ۱۴ | آزادی ہند۔ ہندوستان کی آزادی کا افسانہ۔ جہم دردی افضل حق۔      | ۱۴ | بے کسی کی پرہیز تقویٰ پرنسپل جمیل داس                             |
| ۱۵ | آزادی۔ حاکم سوشل کی کتاب لہری کا صبح اور باکلاہ اردو ترجمہ۔    | ۱۵ | سیلوچی۔ سیلوچی مرہٹے کے حالات زندگی۔ لالہ لاجپت رائے۔             |
| ۱۶ | آتش بارے آگ کی چنگاریاں۔ دیکھتے ہوئے انگارے۔                   | ۱۶ | پیکار۔ گانڈھی کے ڈراما کا بہترین ترجمہ۔                           |

افسانے کے نگار ہیں۔ از سلطنت حسن منشور۔

خوبصورتی

نوشتا  
دشمنی بر ناکشک

پہنٹ رہی پریشاں شکل بہت بڑے کوی ہیں۔ ان کی زمیندار کی وسیع  
 ہو کر پندرہ گاؤں ان کی ملکیت میں ہیں۔ شہر میں بھی بہت سی چٹھاوے۔  
 ان کا خاندان بھی بڑا ہے۔ خاندان میں مرد و عورتیں سب مل کر پندرہ افراد ہیں۔  
 بیٹے کو دوپٹے ہیں۔ ایک لڑکا جس کی عمر آٹھ جنگ دس سال ہے اور ایک لڑکی  
 جو قرعہ آچہ دو سال کی ہے۔ شہر جس کی والدہ بھی زندہ ہیں۔  
 سات کا وقت تھا۔ شکل جی اپنے کمرے میں بیٹھے ایک انگریزی اخبار پڑھ  
 رہے تھے۔ کہ ان کی والدہ کمرے میں آئیں اور بولیں۔

اسی نے تو لوگ پہلے پچیس میں - یاہ کو دیا کرتے تھے - کم عمر میں شادی کر کے یہ جھگڑا پیدا نہیں ہوتے۔ بھلی بڑی کسی طرح کی لڑکیاں کم پڑتی ہیں۔“

”ہاں، بات تو غور و تحقیق سے کی گئی کی شادیوں میں اور بہت سی خرابیاں  
ہیں۔ اسی وجہ سے لوگ آج کل کم عمری کی شادی کے خلاف ہیں۔“

”کابکس ہے نا۔ اس کابکس میں لکھی باتیں سب ختم ہوتی جا رہی ہیں اور  
بڑی باتیں پیدا ہو رہی ہیں۔“

’ہاں پھر کیا کیا جائے۔ دستارِ باندہ کے خلاف چٹنا بھی تو اچھا نہیں؟‘  
’تو بھئی لڑکے لئے کیا ہوگا؟ کیا یہ بیماری عمر بھر کنواری رہی، میٹھی؟‘

جنس کنواری گونا گویں سے کی کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ کوئی خاندانی اور عصب زدگال جائے تو اسے چہنہ میں ایک آدھ کاٹوں دے کر پیا کر دوں گا۔ لیکن بھی کوئی ایسا ملا ہی نہیں کوشش کر رہا ہوں۔ امید ہے لہ جائے گا میں نے آپ کے کہا نہیں، دو عجیب بات کہتے ہوئی تھی۔ مگر جب انہوں نے لڑکی کا فوٹو دیکھا تو مجھے مرث گئے :-

”نو تو نے لڑائی کی تصویر بھیجی تھی؟“  
 ”ہاں بھیجی تھی۔۔۔ انہوں نے انکی میں نے بھیج دی۔“  
 ”یہ تو غلطی کی تصویر نہیں بھیجا چاہیے تھی۔“

”تو پھر کرتا کیا۔ بغیر تصور دیکھے وہ شادی کرنے پر رضامند نہیں“  
تصور دیکھی اور پھر بھی راضی نہ ہوئے؟ مانا نے ایک سرواۓ بھر کر کہا۔  
”اے کیل پند نہیں! اس وجہ سے راضی نہ ہوئے۔“

”رام۔ رام۔ اتنا بڑا وقت آگیا ہے۔ میری چاہی بچھاری بائبل منہ نہ نہیں تھی۔ دنک سالو اتنا ناک نقشہ بھی اچھا نہ تھا۔ مگر یہاں بڑے اعلیٰ ناک ہو گیا۔ ابھی وقت نہ ہوئی میرے چاچا کو اسے جان سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے جملہ آدمیوں میں یہ باتیں نہ ہوتی تھیں۔ اس وقت تو یہ دیکھا جاتا تھا کہ گھر اچھا ہو۔ ڈرائی ٹھہر ہو۔ گھر کے کام کاج میں جو شجر ہو میں۔ صورت نکال کوئی

”بیٹا دوسری لڑائی کے میدان کی بھی کچھ نگر ہے۔ یہاں بوٹی ہے۔  
 پشیدت جی نے اُنہما ایک طرف دکھ کر جواب دیا۔ ”نگر کیوں نہیں دوسر  
 ہوا کر کے رکھی ہے؟“

”خالی کہنے سننے سے کام نہیں چلے گا کوشش بھی تو کرنا چاہیئے، اللہ نے ایک کرسمس بھیجتے ہوئے کہا۔“

”ہاں کو شیش بھی کر رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ آج کل کچھ ایسی ہوا چلی ہے کہ جسے دیکھ کر پتہ لگے کہ کافر کو طلب کرتا ہے۔“

‘فوتۇناتىس توۋۇلۇپ چىققان دەيدۇ؟’

”نوٹ کیجئے میں گزشتہ دو جاتے کا اندیشہ ہے؟“

”گزشتہ روز جو ہمارے کاؤنٹر کیوں ہے، ہماری لڑکی کا کافی، انگلیشی، ٹولی تو ہے انہیں۔ ہاں خوبصورت بھی نہیں ہے مگر یہ تو بھگوان کی مرضی۔“ — ہمارا بائس کا ہاں میں کہا انصوور، چھپچھپ کے داغ داغ ہوتے تو خوبصورت بھی تھی۔ اس کھنٹ چھپکے سے چہرہ اٹکا ڈھکیا۔“

یہی تو خرابی ہے!

”خوابی اس میں کیا ہے۔ مجھے گھروں کی جیسی لڑائیوں، ہوا کرتی ہیں ویسی ہی لڑائی ہے۔ پیٹنے پر رونے میں ہوشیار ہے۔ کھانا اچھا پکالیتی ہے، مٹی بھی بھی لگی ہے اور کیا جانے؟“

”یہ سب ٹھیک ہے مار لوگ تو پہلے شکل صحت دیکھتے ہیں۔“

کون دیکھتا ہے؟ ہم نے تو کہیں بھی نہیں سنا کہ کوئی اتنی دیکھ بھال کے بعد بیمار کرتا ہو۔

”پہلے تو نہیں کرتے تھے لیکن آج کل ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”پھر تو جو لڑکیاں خوبصورت نہیں، ان کی شادی جیسا کہ اسے کو ہوتی ہوگی؟“

ہیں دیکھتا تھا۔

" میں تو آج کل لڑکی کے پیار کی فکر میں ہوں۔ "

" فکر؟ اس کے لئے فکر کیوں؟ "

" شکل جی نے سب کچھ بتا کر کہا: بس یہی سبب ہے۔ بچپن سے لڑکی کے عجیب نکلی تھی۔ جس سے اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ اس وجہ سے کوئی شادی کرے کو تیار نہیں ہوتا۔ نہ ہی کوئی ایسا ملتا ہے جو بچہ لڑکی یا اس کا فوٹو دیکھ بیلا کرے۔ "

" تو اس کے لئے دوسری ترکیب ہے۔ "

" وہ کیا؟ "

" نقلی فوٹو بھجیو۔ "

" نقلی...؟ شکل جی نے نفرت انگیز لہجے میں کہا

" ہاں نقلی۔ آخر کو دے گیا، لڑکی کا پیار تو کرنا ہی پڑ گیا۔ "

" مگر کسی کو دھوکہ دینے کے لئے میرا ضمیر تیار نہیں ہوتا۔ "

" بے خوف ہو، دنیا میں ہمیشہ ایماندار آدمی کہا جاتے رہنے سے

کام نہیں چلتا۔ "

" لیکن نقلی فوٹو بھی بھیجا جائے تو کس کا؟ "

" کسی کا بھی ہو۔ ہاں ایک... ایک طریقہ آدھے اپنی لڑکی

ہی کا فوٹو کسی ایسے فوٹو گرافر سے لے کر دوں گی ( Retouch )

کر کے اسے خوبصورت بنا دے۔ "

" خوبصورت بنا دے؟ "

" میرا مطلب یہ ہے کہ ان کی عیوب کو دُور کر دے۔ جن کی وجہ سے وہ

بدصورت دکھائی دیتی ہے۔ "

" ہاں اگر ایسا فوٹو گرافر چلے تو بڑی بھی بات ہے۔ اتنا پاتوں

کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔ لیکن سولہ آٹے نقلی فوٹو کیوں؟ — یہ مجھ سے

نہ ہو گا۔ "

" خیر وہ نہ کرو یہ کرو۔ "

" تو ایسا فوٹو گرافر ہیں تو کوئی ہے نہیں؟ "

" فوٹو کھٹے یا مٹی بھجیو وہاں سے درست ہو جائے گا۔ "

" تم کسی ایسے فوٹو گرافر کو جانتے ہو؟ "

" ہاں دو تین پتے مجھے یاد ہیں۔ "

" اچھا تو پتے لکھا دو بھی کر دیکھیں۔ "

دوست نے تین پتے لکھا دیئے اور پھر لوٹے۔ ان کو صاف کہ

دینا کہ چہرے میں جو نقائص ہیں وہ دُور کر دیئے جائیں۔ "

" یاد ایسا ہو جائے تو پھر کہا ہے، پر ماتا جانے میں اتنا برکت

والدہ کی اس بات پہ شکل جی ہنس پڑے، والدہ بھی مسکرائیں۔ بھگوان جاتے میں جھوٹ تھا، ابھی کہتی ہوں میری خالہ بڑی خوبصورت تھی ایک بار میرے نانالے کسی سے کہہ دیا۔ میں نے سنا ہے، آپ کی لڑکی بڑی خوبصورت ہے۔ یہ سن کر میرے ناتا بہت ناراض ہوئے، بولے آج کہا تو کہا آئندہ ایسی بات نہ کرنا۔ ورنہ اچھا نہ ہو گا۔ ایک روز نہ تھا۔ آدھ ایک پونہ زمانہ ہے کہ لوگ لڑکیوں کی تصویریں بھیجتے ہیں۔ "

پہنٹ بددی پر شاؤ نے کہا۔ جس زمانے میں وہ بات سناچ ہوتی ہے وہی لہجہ ہوتی ہے، اس کے برعکاس کرنے میں غرائی ہے۔ "

" حیر ہو تو میں جانتی نہیں، میں تو یہ جانتی ہوں کہ لڑکی سیانی ہو گئی ہے اس کا پیار ہونا چاہئے، بس۔ "

" پیار تو خیر ہو گا ہی۔ "

" پہلے رکھا تو لے۔ "

" لڑکا بھی لے گا لیکن ذرا دُور ہو چکے۔ "

" تو دُور نہ ہو، کب کرو گے اس کے لئے کون سا وقت آئے گا؟ "

" وقت آپ آ لیا ہے اور میں کو شیش کر رہا ہوں۔ "

" ہاں بس میں یہی چاہتی ہوں۔ میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں تم سے کم لڑکی کا پیار تو اپنے لائق کر جاؤں۔ لڑکے کا پیار دیکھا جائے گا۔ بھگوان اس کی عمر دے کرے۔ "

" سب ہتھارے سامنے ہی ہو گا گھر اور نہیں، حوصلہ رکھو۔ "

( ۵۵ )

شکل جی نے بڑے جتن کئے کہ لڑکی کی نسبت کہیں قراہا جائے لیکن جہاں کہیں منگنی کی بات چیت ہوتی۔ پچھے لڑکی کا فوٹو طلب کیا جاتا، فوٹو بھیجنے سے انکار کر سکتے، ہر وہ بات چیت کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے منقطع کر دیتے اور فوٹو بھیجتے تو لڑکی پسند نہ آتی، شکل جی بچا دے بڑی کشمکش میں تھے ایک دن وہ اسی فکر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کے ایک پرانے دوست ان سے ملنے آئے۔ کئی برسوں کے بعد ملاقات ہونے کی وجہ سے بددی پر شاؤ بڑی خوشگوار ان کے ساتھ پیش آئے۔ خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد شکل جی نے پوچھا

" کہو آج کل کیا شغل ہے؟ "

" وہی پڑنا شغل ہے۔ "

" سب کام کھلی خوب ہو رہا ہے؟ "

" ہاں ایشور کھانے کو دینے جاتا ہے۔ یہی بہت ہے۔ آپ کچھ کل کیا

کیا کرتے ہیں؟ "

ہوں کہ کہہ نہیں سکتا۔

”خداوند خود پریشانی اٹھائی۔ یہ تو معمولی بات ہے۔ بہت لوگ ایسا

ہی کرتے ہیں۔“

”میری فطرت ہی ایسی نہیں۔ کہ کسی کے ساتھ دھوکہ کروں۔ اسی

بہب مجھے کہی اس بات کا خیال تک نہ آیا۔“

”ذہنی میں رہ کر سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔“

”اں جب لوگ ایمانداری کی قدر نہیں کرتے۔ تو یہ بھی کرنا ہی پڑتا

ہے۔“

”میں نہ اتنا ابھی تم اسی فکر میں جاؤں کہ اب تک غلطیاں رہتے۔“

”اں اس میں کیا شک ہے۔ مجھے یہ بات بھی نہ سمجھتی۔“

”غیر میرا آنا ادا کرتا نہیں گیا۔“

”اچھا بیک آنا ہمیشہ مبارک ہوتا ہے۔“

گھنٹہ بھر چپ کر دو دست صاحبِ شخصت ہو گئے۔ شکل جی نے اُسی

روز لڑکی کا فوٹو بھی بھیج دیا۔

پندرہ دن بعد فوٹو بن کر آگیا۔ شکل جی اسے دیکھ کر سنائے میں لگے  
ہاں نقشہ سب ویسی، لیکن ہرہ بالکل صاف، چمکاکا کہیں ایک نشان  
تک نہیں۔ آنکھیں بھی اصلی آنکھوں کی نسبت کہیں اچھی بنا دی گئی تھیں۔  
شکل جی نے والدہ اودا ابھیر کو فوٹو دکھایا۔ پہلے تو وہ پہچان ہی نہ سئیں  
لیکن جب شکل جی نے بتایا، تو ان کو بھی بڑی حیرت ہوئی۔

بہوی ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولی: ”یہ چمک نہ نکلتی۔ تو لڑکی

ایسی ہی ہوتی۔“

”بیشک! مگر بھگوان کی مرضی ہی ایسی تھی۔ کیا کہا جائے۔ اب جہاں

سے فوٹو کی مانگ آئے گی۔ یہی فوٹو بھیجوں گا۔“

”اب اسے دیکھ کر تو کوئی ناپسند نہ کرے گا؟“

”اب کیا ناپسند کرے گا۔ اس میں خوبصورت نہیں دکھائی دیتی تو

بدمصورت بھی معلوم نہیں ہوتی۔“

”لیکن میلہ کے بعد جب دیکھیں گے تب؟“

”تب دیکھا جائے گا، شادی ہو جائے۔ پر کیا ہو سکتا ہے؟“

”ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔ دوسرا۔ یا یہ بھی کر سکتے ہیں۔“

”تو کیا کریں جو لڑکی کی قسمت میں لکھا ہو گا وہی ہو گا۔ ہمارے کرتے

کا کچھ کام ہے وہ کم کر رہے ہیں۔“

دو تین مگر جہاں رشتے کی بات چیت ہو رہی تھی۔ شکل جی نے ویسی  
فوٹو بھیج دیئے۔ نتیجے کے طور پر ایک جگہ بات بخت ہوئی۔ جس دن رشتے کی

منگھڑی کا شکل جی کو ملا۔ اس دن وہ بے فکری کی نیند سوئے۔ شادی کی تاریخ  
بھی مقرر ہو گئی۔

(الطاف)

شکل جی کی لڑکی کا بیاہ ہو گیا۔ انہوں نے دل کھول کر چہرہ دیا۔ پورا  
گاہوں جس کی سلاخ آمدنی تقریباً چار ہزار روپیہ تھی، ایک سو تیرہ گار، اور لگ  
بھگ بارہ ہزار کا دوسرا سامان مثلاً برتن، دیوڑھی، کپڑا وغیرہ۔ اس طرح شکل جی  
نے اپنے اس گناہ کا کفارہ ادا کر دیا۔ جو انہوں نے لڑکی کا اصلی روپ بچا کر  
کیا تھا۔ پنڈت جی کے سمدھی پنڈت بالک رام ترپاشی بہت خوش ہوئے۔  
ترپاشی جی اوسے طبقہ کے آدمی تھے۔ ان کے یہاں والدہ کی آڑھت  
کا کام پڑتا تھا۔ اور اس طرح تین چار سو روپے ماہوار کی آمدنی ہو جاتی تھی۔  
شہر میں کچھ جگہ بھی تھی۔ اتنا زیادہ چہرہ نہ کر ترپاشی جی بے حد مسرور ہوئے  
انہوں نے شکل جی کی خوب تعریف کی۔

وداع کے وقت شکل جی ترپاشی جی سے ہاتھ جوڑ کر بولے: ”ترپاشی  
جی! بھول چوک سب ہوتی ہے۔ انسان اپنی مطلب براری کے لئے سب کچھ  
کر سکتا ہے۔ میری یہ التجا ہے کہ میرے کسی تصور کا بدلہ آپ میری لخت جگر سے  
نہ لیجئے۔ یہ میری لاکھوں لڑکی ہے۔ اگر اسے آپ کے ہاں تکلیف پہنچی۔ تو مجھے  
بڑا دکھ ہو گا۔“ اتنا کہتے کہتے شکل جی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

ترپاشی جی بڑی نرمی سے بولے: ”یہ آپ کیا کہتے ہیں شکل جی! آپ  
کی لڑکی اب میری لڑکی ہو گئی۔ اسے بھلا ہم دکھ دے سکتے ہیں۔ میری لڑکی کو تا  
رکا ہے۔ اس وجہ سے اوروں کو ہی ہو نہیں سکتا۔ آپ کی لڑکی کا راج رہے گا۔  
اس طرح ترپاشی جی بہت ہی خوش خوش واپس ہوئے۔ لیکن گھر  
پہنچنے پر جب وہن کا چہرہ دیکھا گیا۔ تو ان کی تمام خوشی پر اوس پڑ گئی۔ ان  
کی بیوی وہن کا منہ دیکھنے کے بعد ڈانٹتی ہوئی ان کے پاس پہنچی اود بولی۔

”سارک کے پتا لڑکی والوں نے تو بڑی دغا کی؟“

”ترپاشی جی نے گھبرا کر لاچھلہ کیسی دغا؟“

”لڑکی تو وہ نہیں ہے جس کا فوٹو آیا تھا۔“

”ترپاشی جی شپٹا کر بولے: ”یہ تم کہتی کیا ہو؟ وہ نہیں تو اور کون ہے

ان کی ایک بھی تو لڑکی ہے؟“

”ایک ہو چاہے دس۔ مجھے اس سے کیا مطلب۔ میں تو یہ کہتی ہوں

کہ یہ لڑکی وہ نہیں ہے۔ جس کی تصویر آئی تھی۔“

”یہ کیونکر جانتا؟“

”جب لڑکی بھی موجود ہے۔ بعد تصویر بھی۔ تو جاننے میں کتنی دیر لگتی؟“

”تو اس لڑکی میں کیا کوئی عیب ہے؟“

غیب! تو بڑی دیر صحت ہے، سچک کے دے پہرہ بطول کا چھتہ بن گیا ہے۔

”رنگ تو گونا گئے، میں نے اتھ پائل دیکھے تھے۔ اتھ پاؤں سے تو اچھی معلوم ہوتی تھی۔“

”رنگ گہرا ہونے سے کیا ہوتا ہے، تاک نقشے کی بات ہی آ رہی ہے۔ سائٹ دیکھ گا۔ تو کیا کہے گا؟“

”ترپاشی ہی مسئلے میں آگئے۔ مگر انہیں ترپاشی ہی کے دواغ کے وقت کہہ ہوئے، اظہار آگئے۔ انہیں اپنی مطلب، ردی کے سبب کہہ کرنا ہے۔۔۔ میرے کسی قصور کا، نہ آپ میری غفلت بھڑے نہ نیچے گا۔ اب ترپاشی جی کی کھٹ کرنا کہ ان فقروں کے کہنے سے شکل ہی کا کیا مقصد غفلت سرکار پر لے رہی تھی، شکل ہی اتنی عاجزی، خدا ہے تھے۔ میں اس پر کہا۔“

”ترپاشی ہی کی ایسی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی، سنٹر انٹیل سم لوچتے ہوئے لوہیں۔ میرا اٹلا تاہم، اور اس کی دہن ایسی دیر صحت: میں نے دیکھا کتنی دفعہ کہ لڑکی دیکھ آؤ، کسی سے دیکھا۔۔۔ تصویر کا کیا ہر دوسرا، لیکن تم سے میری ایک نہ ملے۔ اب بتاؤ۔ میں کیا کروں۔ میرے بچے کی زندگی مراد ہو گئی کہ نہیں؟“

”ترپاشی ہی بولے۔ تو میں کیا جانتا تھا کہ اتنے بڑے آدمی بھی غلابازی کریں گے جو بیڑ تو پھل سے ستر بہت دیا۔“

ایسا کہ یہ کس کام کا۔ ہم محتاج تھے زاری میں، بھگوان کا دیا سب کچھ ہے۔ ابھر نہیں تو ایسے غریب بھی نہیں ہیں۔ ہمیں تو لڑکی دیکھی جائے تھی، دھن دیتے چاہے نہ دیتے۔۔۔ سالک تو اس سے بات بھی نہ کرے گا۔

”غیر اب تو ہونا تھا، اگر سالک کی خواہش ہوئی تو وہ سارا بھلا کر دیتے۔“

”وہ تو گناہی بڑے گا۔ جو پہلے ہی میری بات مان کر لڑکی دیکھ لیتے۔ تو بے دن کا رہے کو دیکھنا نصیب ہوتا۔“

”اعتماد میں رہے گئے۔“

”اب کب کی پر اعتماد کرنا پڑا امتحان ہے؟“

”غیر اب تو حاکم ہوئی تھی، پتہ کے لئے محتاج ہو گئے۔ ان کی اس دغا بازی کا پچل اپنی کی لڑکی کو بھگتتا پڑے گا۔ میں کیا، ہم تو لڑکے کا دھڑا بھاد کریں گے۔ انہیں ایسا ہرگز نہ کرنا چاہیے تھا، تنے پڑے اُدھ بھگتتا ہو کر ایسا کھڑا کام کر بیٹھے رام۔ رام۔ خدا تو تو لاؤ۔ دیکھوں تو بھی کس کا تو بھید یا تھا۔“

”ترپاشی کی جی تو لے آئی۔ تو دیکھ کر بولے۔ غصہ تو کسی

اچھی لڑکی کی ہے۔

”میرے لئے جو بہ دیا۔ کسی رشتہ دار کی لڑکی ہو گی۔“

”اب یہ وہ جانیں ہیں کیا پتہ؟“

”انہیں بھگتتا، کہ یہ کیا دغا بازی کی؟“

”بھگتتا کتنا فضول ہے۔“

”کیوں فضول ہے، انہیں بھی تو معلوم ہو جائے۔“

”تو اس سے ہو گا کیا؟“

”تم کچھ تو نہ بتا۔ ہوتا تو ابس کہہ نہیں، لڑکے کا دوسرا بھاد کرنا پڑتا۔“

”کرنا پڑے گا۔ تو کرنا چاہئے گا۔ فضول خط و کتابت سے کوئی فائدہ نہیں۔“

(۴)

سہگ سات کو سالک رام ترپاشی نے جب دہن کا پھر دیکھا۔ تو اسے کچھ شہر سا ہوا۔ ایک تعلیم یافتہ لڑکوں تعلیمی۔ اسے پاس گرجا تھا، سالک حسین لڑکی کو اپنی شریک حیات بنانا چاہتا تھا، لیکن شکل ہی کا یہی بھاد فوٹو دیکھ کر اس نے ایک شریف و جوان کی طرح لڑکی پسند کرنے کی ضرورت داری، دہن کی کو سو نہ دی۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر لڑکی انصاف کے مطابق ہوتی تو وہ صفت نہیں تو بد صورت لگی نہ ہوگی۔ یہ سچ کہہ کر اس معاملے میں خاموش ہو رہا، لیکن اس وقت ہری کا سنہ دیکھ کر اسے پڑا چھٹا ہوا۔ اتنا فرق، کئی سہنٹ تک اسے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ آخر اپنے حواس و دست کو کھولا۔

”تہہ سے پتا ہے جو تو بھیا تھا۔ وہ تو تہہ انہیں تھا، کس کا تھا؟ سالک رام کی جی تو لے آئی، سچ کرانے سے سچ کرانے ہوئے جواب دیا۔ ”جین کا جہاز کس کا تھا؟“

”کیا جین ہی پتہ نہیں کہ تہہ سے پتا ہے تہہ تو تو بھیا تھا؟“

”لیا لے سر کے اشارے سے بتایا کہ اسے معلوم نہیں؟“

”سالک رام خاموش ہو گیا۔ اور کچھ سوچتا رہا۔ پھر کھٹک وہ اٹھا اُدھ کر کے کی ایک ملاری سے اس نے ایک فوٹو نکالا۔ تہہ کے قریب آیا اُدھ اسے دکھاتے ہوئے لولا۔ یہی تصویر بھی تھی۔ یہ تہہ ہی ہے؟“

”یہاں سخی نظروں سے فوٹو کا جائزے لے کر کہاں ہے تو میری ہی؟“

”تہہ تو ہے۔“ یہ کہہ کر سالک رام نے تہہ کی ٹھڈی پکڑ کر اس کا چہرہ اور کو اٹھا لیا۔ اور اس کے نقش و نگار کو فوٹو سے ملانے لگا۔ خوب دھیان سے دیکھ کر اس نے جی کی ٹھڈی چھوئی۔ ”... فوٹو تو بے شک تہہ ہی ہے۔ لیکن بڑی ہانک دیتی ہے، کی؟“ (طالعہ صاف ہے) ”کیا ہے؟“

”کیا کچھ گئی کہ شہر کو اس کا چہرہ دیکھ کر کڑی ہلائی ہوئی ہے۔ اپنے



” صورتِ شکلِ نبویؐ میں جو کچھ نہ دیکھی ہو، جس کے خلاف نہ ہو، نہ کہیں قصور نہ درپیش آیا جائے، جس پر کتا بول نہ کہہ سکے، اس کو کتا نہیں کیا جاتا۔ چاہے نہ نہ جھجھکتا ہو، نہ کہ چرگا۔“

” اچھا اچھا اب نہ ہوگا..... بس؟“

” بات کو تیرے باتِ حریت جو غریب سا لگتا ہے، اب میں نے سب کو ڈانٹ دیا ہے۔ اب تم سے کوئی بڑی طرح پیش نہ آئے گا۔“

” یوں تو شہر و نظر دلی اس کیٹ بگلی کی اتنی منوریت و حریت تھی، کہنے لگی۔“

” کیا تم بھی دوسرا بیاد نہ کر دے؟“

” کیوں کروں؟ سبب؟“

” میں بد صورت ہوں، لیتے شرم سے سر جھکا کر لیا۔“

” سنگِ رام پر ہم بھرے بھرے میں بولے: ”میرے لئے نہیں ہو۔ میں تہدی صورت نہیں دیکھتا، میں دیکھتا ہوں تہدلی، تہدلی میرے دل کی خوبصورتی کے سامنے ظاہری حسن کی کوئی اہمیت نہیں۔“

” یہاں تک کہ میں بائیں ٹال کر بولی۔ اگر یہ بات ہے تو اب مجھے چاہے ساری دنیا بد صورت کہہ کر مارے۔ مجھے کوئی دکھ نہ ہو گا۔ تم مجھے بد صورت نہیں سمجھتے۔ میرے لئے ہی سبب ہے۔“

” سنگِ رام بوی کو کھاتی سے لگا کر کہنے لگے۔“

” میں اتنی بد صورت نہ ہوں، میں بلکہ بد صورت سے بدتر ہوں، جسے بدتر میں دیکھنا چاہوں۔ تم پر بڑی سے بڑی خوبصورتی پھل کر سکتا ہوں، جسے بدتر میں دیکھنا چاہوں۔ تم کو میری آنکھوں سے دیکھ کر تم سے بدتر ہو جاؤ گا۔ تم کو کتنی حسین ہو۔“

” آج مجھ سے بدتر کس بھی دُنیا میں کوئی نہیں۔“ یہ کہہ کر یہاں سے شوہر کے گرجان میں اپنا منہ چھپا لیا۔“

” یہاں تو کئی ایسے نہیں پڑا رہتا۔“

” اتنا سب بد صورت اور بد بونڈی کہا کرتی ہیں؟“

” اول تو کوئی کتا نہیں اور اگر کہہ تو کیا جھٹکتا ہے۔ بد صورت تو دیکھو ہی۔“

” لیکن کچھ سے کیا فائدہ؟ غصہ دل کی کاہل دکھانے سے کچھ ملے؟ کیا؟ اور دوسری شادی کہنے کی بات کیوں کی جاتی ہے؟“

” دوسرا بیاد تو کرنا ہی پڑے گا۔ اس میں کچھ جھوٹ سمجھو، ای ہے۔“

” دوسرا بیاد میں کروں گا تب کروں گی یا زبردستی کروں گی؟“

” یہ غیر متوقع بات سن کر والدہ ہنسنے لگیں۔ اچھا تو کیا بات بھی ہے۔ تو دوسرا بیاد نہیں کرے گا؟“

” ہرگز نہیں کروں گا۔ کیوں کروں؟“

” بہو بد صورت جو ہے؟“

” کون کتنا ہے بد صورت ہے؟ وہ جتنی خوبصورت ہے۔ اتنا اس گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔“

” والدہ ہے، انتہا بھرت زدہ ہو کر بولیں: ”واہ بیٹی! یہ تو نئی بات سنی۔“

” غیر بات سنی ہو کر پرانی بات سے کہی ایسی بات نہ کہے۔ کہے گا تو میں اسے بد اشت ذکوروں کا خواہ مخواہ اس غریب کو پریشان کر دے گا۔“

” محض بد صورت دیکھ کر آؤد باتیں ہی تو دیکھی ہوتیں۔ اس کی خوش سلیکی آؤد شور بھی دیکھا ہے؟ اس معاملے میں تو یہیں کوئی اس کے پاس نہ گیا۔“

” والدہ منہ بنا کر بولیں: ”اوہو! کیا شک ہے۔ بد صورت شکل نہیں تو یہ حالت ہے مگر خوبصورت ہوتی تو نہ جانتے کیا ہوتا؟“

# بای بھول

عبدلہ بن عبدالمطلب نے اپنے بیٹے کو  
عبدلہ بن عبدالمطلب نے اپنے بیٹے کو  
عبدلہ بن عبدالمطلب نے اپنے بیٹے کو

” سہیلہ اری“  
” سہیلہ اری“  
” سہیلہ اری“

” سہیلہ اری“  
” سہیلہ اری“  
” سہیلہ اری“

” سہیلہ اری“  
” سہیلہ اری“  
” سہیلہ اری“

(پہلے کا پتہ:۔ مکتبہ اُردو لاہور)



# سرورِ درقہ

وہ اک سرور !  
کیا جس نے زندگی کو خراب .....  
کہاں سے ڈھونڈے لافں میں وہ سرور و شباب !  
چمن میں پھول میں گلچیں میں وحشت و صحرائیں  
صبا کی تیز خنک سحر کے طور دیکھے ہیں  
فلک پہ چاند ستاروں کو چھان مارا ہے  
کہاں کہاں اسے ڈھونڈا ہے میں نے دنیا میں  
شگفتہ صبح کے تیور بغور دیکھے ہیں  
سمن بدوش بہاروں کو چھان مارا ہے

گلہاں کے سایہ میں بلبل کی اشیاں بندی وہ پاس و بیم سے لبیریز آرزو بندی  
وہ نقشہ رازِ محبت وہ طور کی دہلی وہ ایک جنسیت رنگیں وہ لڑکی دہلی  
جہاں لبوں پہ گلچیں ہیں سینکڑوں نغمے !  
کہاں زخمہ دری اشتعال پرور ساز وہ مطربہ کی خوش الحانیوں کا دلکش راز  
بغور دیکھے ہیں میں نے یہ شب نشیب و طرازا  
کہیں بھی اس کا نشان بیش و کم نہیں ملتا وہ نغمہ مجھ کو خدا کی قسم نہیں ملتا  
تو کیا مرے خطِ قسمت میں صرف لکھا ہے .....

ایک اضطراب مسلسل اک آرزو ناکام !  
نہیں ! یہ روح پہ ہوتی ہے بارشِ اکہام کوئی یہ کہتا ہے اے زخم خوردہ اوہام  
ہے سعی لازمی تکمیل دعا کے لئے !  
پھر ایک بار ہوں سرگشتہِ دادی غم میں الجھ گیا ہوں تمناؤں کے نئے غم میں !

\*\*\*\*\*

یہ اضطراب !  
ایک سوال کرتا ہوں —  
تصورات کی رنگین حراج دنیا سے

ہے گلابِ غم تیز دستی مضرب !  
میں کیا سنوں گا پھر اک بار وہ سرور و شباب !

مُیِزِزِ اَدِیِب

افزار جنگ

میں۔ ہر سنگ میرے منور کی طبیعت قدمے ہمارا ہے۔ کل تین دنوں  
تھکی۔

جیسے کہ اس سب سے پہلے ہی کا تصور ہے اور اچانک کھلاؤ۔  
 راجہ۔ کیا کہیں غور ہائے جاگ چلا کر خرید لیتا ہے، وہی تو اسے اتنی چوری ہے  
 کہ کیا کہیں؟

حمیدہ - اہلی :- - - - خدا کا لئے اس ہے۔ پچھلے دن ایسے ہی  
اعمری کو الی کہنے کے لئے کہہ کر یہ تو خدا کا فضل ہے۔ اہلی کی  
طرف دیکھتی ہی نہیں۔

والجملہ۔ ہمارے لیڈر صاحب کا کیا عمل ہے؟  
 حمیدہ۔ (منشد کی جگہ پر) کیا کہوں اس کا عمل عجیب ہے۔  
 گوشت کی دکان سے لے کر لہنت بھیج رہا ہے۔

والجہ۔ پھر؟  
 سمجھو۔ پھر کیا ایک دوسری رقم میں کام کرتا ہے۔ کام بہت زیادہ مگر تنخواہ  
 کچھ ہی نہیں۔

راجہ سہجائی کیس نہیں اسے؟  
 عجیبہ میں آصف ہر وقت بھگتے رہتے ہیں کہ بیٹا! تو نے اتنا علم حاصل  
 کیا ہے گوشت کی ذری کر، یہی طرح ہے اس میں، پھر حقیقی خورد  
 میخورد، مگر سنسنا ہی نہیں، گوشت کو ملک کاٹوں بہرتا ہے۔

والجہ۔ چل، پاکی۔ بعد اس کے کوئی بوجھ اگر تو کو دینش کی کوکری  
 نہیں کرے گا۔ تو کو دینش کا نقصان کیا؟ خواہ وہ اپنی زندگی تباہ  
 کرنا ہے۔

نمیدہ۔ استقامت میں غرور ہوں، غرور کی کسے روزی کھاؤں گا۔ اور ملک کی خدمت کروں گا۔

والجہ ملک کی خدمت کریگا، بڑا آقا مذہبی حلالیج !  
 تمہید و خدای اسی کی کیا حیثیت ہے، اگر فتنہ کے خلاف، اہل وطن کے  
 خلاف ہو تو میں کے خلاف —

رابعہ۔ رات کاٹ کر کیا ہڈی اور کیا ہڈی کا شور بہ؛ اس کی مخالفت سے ہما  
کیا کوئی گل دکھائے دیتی ہیں۔

فیہد۔ الشہداء احمد بن حنبل و سہ (اصغری کے کرتے کا جائز لینے لگتی ہے)



والجہ۔ گھر میں بیٹے فوت ہو رہے ہیں:

اصف خالہ جان: میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بیٹے  
دیکھا ہے کہ غریب مزدوروں پر سیدہ ایک کوڑے کے بعد بھی روئی کے تنے  
ٹکڑے کو ترس رہے ہیں مگر یہ سولہ کوڑے بھی نہیں کرتے۔ پھر وہی  
عایشان بنکوں میں رہتے ہیں نو نیا کی تمام نعمتیں کھاتے ہیں بہترین  
کپڑے پہنتے ہیں۔ کیا یہ انصاف ہے؟

جمیدہ۔ خدایہ الزام لگا رہے ہو۔۔۔ خدایہ ہی طرح ہوا میرے بچے  
میں اس میں کسی کا کیا قصور؟

اصف۔ یہی دلیل نظر پہندہ تان کو تہا کر رہا ہے۔ خدائے انسان پیدا  
کئے ہیں۔ امیر اور غریب نہیں۔

والجہ۔ تو مجھے ایسی ہی آمد غریبی۔

اصف۔ امیری اور غریبی انسانوں نے خود پیدا کی ہے۔ چلاک انسانوں نے  
اپنی دوستی کا ذرا انکار متوج انسانوں کا سب کچھ روٹ لیا۔

والجہ۔ رخصت دو فلسفہ، تہا راوار غریب ہو گیا ہے:

اصف۔ اچھا خالہ جان! میرا خواب دلخ بچے مہلک گرہ وقت آ رہا ہے۔  
جب انہی کے ہر طفل کا دماغ ہی طرح خواب ہو جائے گا۔

جمیدہ۔ ماہین سے اچھوڑے یہ بیکشت، یہ کسی کی مانند ہے۔ (مضطرب ہو کر حسن  
کا کچھ نمکی سے کر آیا ہے یا نہیں:

اسلم۔ ابھی تک تو نہیں آیا۔۔۔ (خاموشی) اچھا خالہ جان! یہ تو بتائیے  
آپنے خالو کی بیماری کی وجہ سے تین ماہ کا گریہ ادا کیا۔ اس پر سیدہ

گھنٹام مالک مکان نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا:

اصف۔ مکان سے نکال دیا تھوٹ پٹ:

اسلم۔ حالانکہ اس کے پاس لاکھوں روپے موجود ہیں مگر نہادہ کا گریہ دیر سے  
لیتا۔ تو کیا ہو جانا۔۔۔؟

والجہ۔ (قدیمہ ضعیف ہو کر) ایسی باتوں سے کیا ہوتا ہے؟

(حسن آتا ہے)

جمیدہ۔ (حسن سے) اتنی دیر کہاں لگاؤ؟

حسن۔ بی بی جی! بلا دین لڑائی ہو گئی۔

جمیدہ۔ کیسی لڑائی؟

حسن۔ ایک مزدور بڑی سی گھڑی سر پر اٹھنے چلا آ رہا تھا۔ سامنے مور لڑی  
تھی۔ وہ بچہ ایک طرف ہٹتے ہوئے شیخ صاحب سے ٹکرا گیا۔

اس پر شیخ صاحب نے اسے گالیاں دینی شروع کر دیں۔۔۔ پائی  
گدھا، نامعقول، ایدھا، کمینہ، مرفود۔۔۔ اس بچہ نے

کہہ دیا: آپ فرعون ہیں، بس پھر کیا تھا۔ شیخ صاحب نے اس کی گھڑی  
زمین پر پھینک دی اور اب تو پیٹ رہے ہیں گے اے۔

اصف۔ پیٹ رہے ہیں گے۔۔۔ (تیزی کے ساتھ دو دروازے کی  
طرف جاتا ہے)

جمیدہ۔ اصف! کدھر چلا تو۔۔۔ بیٹا اصف! کہیں گستاخی نہ کرنا  
اصف:

(اصف چلا جاتا ہے۔ سب لوگ بکڑکی سے دیکھتے تھے ہیں)  
والجہ۔ خدایہ کرے۔ طبیعت میں تیزی ہے کچھ کر دیجئے۔ اس کے آباؤ اجداد  
جمیدہ۔ (حسن سے) حسن! کدھر کیو جلدی۔۔۔ میرے اللہ اس بڑے  
نے کتنا تباہ کیا ہے:

والجہ۔ حوصلہ کرو بہن! وہ اتنے بے وقوف نہیں کہ شیخ صاحب کی شان  
میں کوئی گستاخی کرے۔

جمیدہ۔ تم کیا جانتے۔۔۔ میرے اللہ! (ناست سے ہاتھ ملتی ہے) میرے  
بچے کو ہدایت دے:

اسلم۔ نہیں بھی جانوں اتنی:

والجہ۔ تو کیا کرے جائے گا، بیٹھو یہاں آکر:

اسلم۔ نہیں میں جانا ہوں!

جمیدہ۔ جلدی جا، بھائی جان کو بلانا۔ اس سے کہہ اتنی سخت ناراض ہوئی  
میں۔۔۔

(اسلم چلا جاتا ہے)

جمیدہ۔ دل دھڑک رہا ہے۔ خدایہ کرے:

والجہ۔ خدایہ ہی کرے گا بہن! اطمینان رکھو! ہانڈوں میں ہر مہل لوگ  
موجود ہوتے ہیں، کوئی ایسی بات نہیں ہوگی:

جمیدہ۔ شیخ صاحب بہت بڑے آدمی ہیں۔ ان کی شان میں کچھ گستاخی ہوئی  
تو پھر پہلی غیر نہیں۔ جانتی ہوں یہ سال انہوں نے وہی بات پھر فرم  
نائی کو ہتھکڑی لگا دی تھی!

زمیر سے سولہ پڑاؤں کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔۔۔ چند لمحوں

بعد جاوید آدھ حسن زخمی اصف کو پکڑے اور ہلاتے ہیں۔

دو دو لپٹیں جھگڑ کر سیٹھ بھائی کے پاس جاتی ہیں۔ انہیں بھائی

کو ختمی دیکھ کر وہ زور سے رونے لگتے ہیں۔ اسلم کا چہرہ سرخ ہو

اس نے بھائی کا ایک ہاتھ پکڑ رکھا ہے۔

جمیدہ۔ اے اللہ!۔۔۔ میرے بچے کو کیا ہوا۔ اصف میرے اہل

جاوید۔ پاگل ہے، پاگل ہے، پاگل ہے۔

اصحف۔ چھوڑ دیجئے۔۔۔ میں اس کو بے پروا کر کے رکھوں گا۔  
تو میرا نام اصف نہیں۔

حمیدہ۔ (جی! آئیں اس کلبہ کو گئی ہیں) میرے پیٹے آصف! میرے سائی!  
(جا رہی آہ من آصف کو پٹنگ پر لڑاوتے ہیں)

راجمیدہ۔ تو کتنا پہل ہو گیا ہے آصف، تیری عقل کد گئی؟  
جمیدہ۔ انا اس وقت گئے، کالی بانگن کاٹے۔ میرے لال کو کس بے رحمی

میں نے مارا ہے۔ خانی بہادر بنا چکا ہے۔  
جہاں میں۔ شہزادے لالہ سے بھی تو کھل کر دیکھو حضور کو یہ شہزادہ تھا۔ اور یہ  
ان دنوں کے درمیان کچھ اچھو گیا۔ باز نہیں آتا۔ تو کچھ موجود تھا۔  
کسی نے بھی شے کو کچھ نہ کہا۔ سب حضور کو جو بولنا کہتے تھے۔ مگر  
اس کے خلاف میں کیا آئی۔

**مصحف**۔ بیت اللہ کے ساتھ ہر سب پاؤں والے بڑھل ہیں، یہ بغیرت ہیں  
پتھر کے بت ہیں۔ ان کے سامنے ایک بے کس غزوہ کو اہول بان کر دیا  
گیا کہ وہ غزوہ سے کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ تصنیف ان  
کی انسانیت پر!

رجمیدہ۔ نہ بیٹا اسپہ سالام کرد۔ حسن جہان کو کپڑا لاؤ۔ کوٹھڑی میں آصف  
 کی دھجی ہے۔۔۔ جلدی لاؤ سب کچھ۔۔۔ (راجہ سے) ابہن  
 پانی گرو کرنا۔۔۔ جلدی کرہ صی۔۔۔ دودھ بھی پیتے آؤ۔۔۔ ہٹے  
 اس ظالم نے کس بچے روٹی سے میرے بچے کو پیٹا ہے۔۔۔ خدا کرے  
 اس کے ساتھ ٹوٹ جائیں:

جاوید۔ جنگ کرتا ہے، امیر مل سے

اصف۔ جنگ! (زیمجر) اباجین! اب مزدور پیدا ہو چکا ہے۔ اسے  
ظالم سرکاروں کاظمیہ داشت نہیں کر سکتا۔ اسے کب تک  
دندان مزدوروں کا خون چوسنے سے روکے اور موٹے ہوتے رہے، مگر اس  
زمانہ بدل گیا ہے۔ مزدور سرکاروں کا مقابلہ کر سکتا۔  
جنگ کا آغاز ہو گیا ہے۔ دنیا کے مزدور جنگ اٹھے ہیں، سواری  
وادی تہائی کے گھٹ اترنے والی ہے۔ مزدوروں کا سر بلند  
ہو لایا۔ (جاوید مجید) اصف کے کندھوں پر تھرپڑھتے ہیں  
اب جنگ لگ نہیں سکتی۔ فوج مزدور کی ہے۔ مزدور فوج ہو گا۔  
جنگ کا آغاز ہو گیا ہے۔ (اسے خوش ہو کر گرتا ہے)

ہندوستان کے گورنر نے اس شہزادے پہلے کا ایک ہذا سے بہترین ذریعہ  
 نیا ادب لطیف میں اس شہزادے کو بھیجا

خوشخبری      ترقی اور کمیٹی کی کارزار      خوشخبری

بتائے اسی سبب کہوں پڑے کی بلند پایہ کتابیں مفت حاصل کریں۔  
ہندوؤں کے طالب علموں کی ہر عمر میں سوائے ایک جواب تکمیل تیار کیا جس کی  
دوسرے نہایت پاکیزہ علمی ادبی اور اخلاقی کتابیں ادویہ کے ہلو اور مختلف مصنوعات کی پانچ سو  
تقدیر کے نتیجے کا میاں بفرنگ کے برائے آفرین کا نام ہے شاہ عالم کے حیات افروز مکتبہ  
نفاذی سبب آموزہ دہلی اور مصریہ دہلی کے مختلف لکچر کی صورت میں شائع ہو کر سوائے  
چند ہر سرتی کی مدت میں بطور تحفہ مفت ارسال ہونے پر ہندو کے طلباء و طالبات کے  
علاقہ داروں میں سے کسی نہ کسی نے دیگر حضرت بھی سوائے کے علاوہ معاونین میں شامل ہو کر  
سیکڑوں پہلے کی طباعت مفت طبع کی کہ جس کوئی ناہور یا مسلمان چندہ نہیں کیا  
جائے تفصیل کیلئے سوسائٹی کی نہایت دلچسپ کتاب شاہِ زندہ کی تین پہلی  
لاکھ روپے کے حصول و ایک سیکڑ مفت طلب فرمائیں۔

جلالیکریمی دی سٹوڈنٹس ایجوکیشنل سوسائٹی فیروزپور (پنجاب)

سب مجھے پاگل سمجھتے ہیں مگر دنیا کی ہر  
 نسل میں ایک اعلیٰ ترین انسان کو  
 کیا پتہ نہیں؟  
 (میں متعلق بعض لوگوں سے)  
 پاگل مریضوں کے لیے ایک کتاب لکھنا

ساکت بیڈیٹر انقلاب اور شباب پیدا ستیلا علی صاحب نقی، لکھنؤ، ۱۹۷۱ء کے دیباچہ  
بھی شریک ہیں۔ (م-۱)

### معروف جمیل

(مصنف صاحب کیم آزاد انصاری، کتابت و طباعت خوشگور، صفحات  
۲۵۹- قیمت جلد دوم روپے آٹھ آٹے، غیر جلد دوم روپے۔ چلنے کا پتہ: برکات شاہ  
بلند گھانسی، حیدرآباد دکن؛  
ساریف جمیل لکھنؤ کے نامور شاعر صاحب کیم آزاد انصاری کے دقاہ و زکام کا  
جمویری ہے کیم صاحب کہنے مشق شاعر میں آدھ اپکا کام اردو کے ہر ہر چھو  
زینت سے تارا ہے۔

سلامت و صفائی زبان کیم صاحب کی سب سے بڑی خوبی ہے اور اس شاعری  
نوجیل القدر شاعر نے ہر جگہ پیش کیا ہے۔  
ذیل میں چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں، جن کے مطالعہ سے قارئین کیم صاحب  
کی شاعرانہ خصوصیات کا کچھ نہ کچھ اندازہ لگا سکیں گے:-

امید مرانی مازنگان علوم ہوئی ہے۔ نگاہ ہریاں ناہر ہاں علوم ہوئی ہیں  
دل انگارہ کی جگہ چلانی علوم ہوئی، خوشی و دمنہ کی زبان علوم ہوئی،  
اک ترے شوق نے خود رفتہ بند کھا ہے۔ اک ترے یاد نے دنیا کو بھرا کھا ہے  
دل کو بے بانی، بیم تو زبان کو نالے :: اک مزاج کو قسمت نے کچا کھا ہے  
کس کی نگاہوں کیس کی لاک، بھاگ، ہلائے بستی سو کھا  
زلفوں والو! یہ اندھیر۔ دھیرے دھیرے کالے ناگ  
مہرا سر، اور پیرا در۔ دمنہ دمی مست دمنہ سر بھاگ  
ہم یوں کھانچے ہیں سر پہ سیکھ ہے۔ جیسے کوئی غریب سانس نہ ہوا  
لے کر کراہید خبر سے کہ مشورتی! دنا آس، زند کی کاہلدا کہیں چھ  
لے کاش کوئی لطف سے استا تو چھوٹے۔ جی ای میں کچھ نہیں، کچھ بھلی عزت نہیں  
کتاب کے غلام میں مصنف نے اپنی اس پانی شاعری کی سرگزشت اپنے  
قلم سے کھیں ہے جس میں خاندانی حالات کے علاوہ اپنی خصوصیات شاعری بھی  
بیان کی ہیں۔

کتاب میں غالب محمد زبانی اسلوب کے اشعار عینیت کے علاوہ صحت  
کی تصویر کے لیے کیم صاحب ایک شعر درج ہے، وہ غزل ہے جس نے تو جبر کا  
چیز قارئین پر ناخوشگوار لگتی ہیں:- (م-۱)

### کیلے کا جھلکا اور دیگر مضامین

از سند باد جہازی، کتابت و طباعت بہتر مطبعات، ۱۹۶۹ء، جلد تیس  
ایک درجہ اچھے کا پتہ :- اور ایک ڈی جی پنجاب، لکھنؤ، ۱۹۷۱ء  
دیکھنے تو ملک میں ہیں مزاج نگار موجود ہیں اور ہر ایک مزاج نگار کے  
مزاج کا ناموں کو ملک کے کسی نہ کسی طبقے میں بڑی قدر وقت کی نگاہوں سے  
دیکھا جاتا ہے مگر سند باد جہازی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر نکل کے ہر طبقے  
میں مقبول ہیں۔ آپ کا مزاج صبح معنوں میں مزاج ہے، یہاں نہ تو غریب شرمیں ہیں  
نہ اور کے ناخوشگوار غصہ نہ نیکم صاحب کی پختہ پختہ چھڑ۔ سند باد جہازی جو  
کچھ لکھتے ہیں نہایت بے تکلفی کے ساتھ لکھتے ہیں اور کسی جگہ بھی اور دکان میں  
ہر سکتہ سند باد جہازی کے مضامین پر صحرانہ اختیار نہیں آتی۔ (اور نہ یہ  
سینہ دہاؤ یعنی مزاج کا فرض ہے، مگر ان کلاموں کے ہمارے دل میں جگہ بیاں لیتا رہتا  
ہے۔۔۔ ایک دیکھ کر ملک چکیاں لیتا رہتا ہے۔ اور جب بھی ان کا کوئی اچھا فقر  
پڑتا ہے، ہم سکرانے پھر نہیں رہ سکتے۔

سند باد جہازی کی نگاہ بہت باریک ہے۔ ہر شے کی کئی باتوں میں ہیں  
ایسے ایسے حقائق سے آشنایا کرتے ہیں جن سے اکثر غیبیہ ہو سکتی ہو سکتی ہے۔  
پتہ:- (م-۱)

### چوہیل

(مصنف احمد ندیم قاسمی کی تلمے۔ کتابت و طباعت محفہ۔ صفحات ۳۰۴  
قیمت ٹھہرہ روپے (پتہ: چلنے کا پتہ:- دارالاشاعت پنجاب لاہور)  
حضرت احمد ندیم قاسمی اردو کے بہترین شاعروں اور نامور انساںوں  
شمار ہوتے ہیں۔ آپ کی ذہنی کاوشیں ملک میں نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھ جاتی ہیں  
ندیم صاحب کو دہائی معاشرت کے نگار میں بڑے طے حاصل ہے اور  
آپ کے مضامین میں دیہاتی زندگی کے ہر دم سے ہر پہلو، مولیٰ سے مولیٰ بڑا اور  
باریکت باریک لفظ کے کوئی نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ آپ کا انداز  
پڑھ کر انسان نے کی غصا کا کوئی حصہ بھاری تھا ہونے لگا۔ اچھا نہیں رہتا۔۔۔ ہم  
دیہاتیوں کے ساتھ کلاؤں کی تہ سب نا آشنا ہوں سے گزرتے ہیں۔ معصوم  
فضائیں لہراتے ہوئے دلاؤ نہ سننے والے اور بیک دیکھی ہوئی بستیوں کے  
دکھوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اس سے ہر سکر انسان کی اور کیا کامیابی ہو  
سکتی ہے۔

اس مجموعہ میں انشاء نے مثال میں کتاب کا آغاز میں ناخوشگوار

# دی فیدل بینک انڈیا پبلیٹڈ لاہور

## کی ترقی کا اندازہ

ذیل کے اعداد و شمار بتا رہے ہیں ۳۰ جون ۱۹۳۹ء سے لگائیے!

فروخت شدہ سرمایہ ۲۸۰۶۰۰ کاروباری سرمایہ ۱۰۳۵۰۰۴

اداشدہ سرمایہ ۶۸۸۹۴ ڈیپازٹ ۸۳۵۸۸۴

رینڈم بقایا سرمایہ ۲۱۱۸۰۶ ریزرو فنڈ ۱۵۰۰۰

ایسے ترقی پذیر اور قومی بینک کی سرپرستی کرنا ہر مندرستہ تانی کا فرض اولین ہے

شرح سود فیکسڈ ڈیپازٹ ۴ فیصد فی سالہ

شرح سود سیونگ بینک ۳ فیصد فی سالہ

چلت حساب ۴ فیصد فی سالہ

مزید تفصیلات بینک سے طلب فرمائیں!

میخنگ ڈائریکٹر۔

ایچ سی ماحتری بی ایف، آر لنڈن  
ای، ایس

رسالہ ادب لطیف لاہور

فیڈل بینک انڈیا پنجاب لمیٹڈ لاہور

جدید سیاسی کتابیں

کوئٹہ شیت مختلف ۳۰ جون ۱۹۷۹ء ہمارے قلم کے گورائے رہ رہ رہتے

[illegible]

آہنگ رزم اندیش جنگی ترانوں کا پہلا مجموعہ ہے جس کا سالانہ قیمت بمبک جذبات

اچانک اچانک وہاں بابا لیلے میٹروخان سے بہت جلد  
مقابل میں پیدا کتاب کتابت و باع، بیرون، دارالانشاء، قیمت عمل

مفتی کی حکومت تو شخص کا لقب ہے ایسے انڈیا میں ہندوستان کو معاشی و

تجربہ کاروں کی رہنمائی کے بغیر اس کے خلاف جو عمل صورت میں آئے

میں نے کہا کہ میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔

ہمسایہ جسے ایک ایسا نور نیکل ہے جس سے تمام اعلیٰ اور ظہم ہمیشہ جگمگاتی ہے۔

بت طباعت بہترین - سید اختر اندونی ایم اے۔ قیمت

پس میں فیصلہ (آسانی سے) کر لیں اور فریڈک ایگلنگ اور شٹر کوٹنگ

ہماریا کی تمام متون 'بائبل' میں موجود ہے۔ ہر ایک کے لئے یہ مفت کی خدمت کی اطلاع ہے۔

کتابت کتابت طباع و پیران اسلامیت

تھے تمام علما و فہمائیوں نے اس پر طعن و تہلیل کیا۔

[illegible]

مجلس علمیہ (درممن طلسا نین عثمانیہ)، اس غرض سے قائم کی گئی ہے

کہ عام طور پر تعلیم کا نفع ہمارے عزیزان اور بالخصوص طلبہ تعلیم کے علمی و دینی کارناموں کو منظر عام پر لائے اور اس طرح اردو زبان کی خدمت اور

اصطلاحی کتابوں کی شاعت کا کام انجام دے اس سلسلے میں محققانہ مقالے جو

جامعہ عثمانیہ کے پرمٹ لیر بھوت طلبہ سے لکھائے گئے ہیں یہیں سے حسب ذیل کو  
انجمن کے ترجمان بلاطیسا نین میں طبع کرنے کے علاوہ کتا بہت میں شامل کیا گیا ہے۔

۱۔ اردو ادیب سیوئس صدی میں - تالیف سید علی حسین صاحب باہم (عثمانیہ) موجود

۱۲۔ علامہ راجہ محمل شاہ ثانی کے متوالانہ راست تالیف سید محمد صاحب

یہ مسئلہ عثمانیہ ممالک شامی ریاست کے دور تولیت کی بسیط اور محفوظ تاریخ مگر

۳۔ سلطان محمد سادہ کی بیٹی خلیفہ طہیر الدین نے اسے (عثمانیہ) سلطان اور خلیفہ

و فراموشی علی بن ابی طالب را که در حضور امام علی (ع) فرموده است که هر کس مرا فراموش کند...

فرید اللہ صاحبی بزرگ فیلساٹین حیدر آباد کن کسانہ جہاں ہندوستان طر ہے۔ خاص

روایت محمد زبیدی۔



فیضوں اور سولوں کے خوبصورت معنے !!



THE BANGALORE WOOLLEN COTTON & SILK MILLS CO., LTD. BANGALORE

سول ڈسٹریبیوٹرز - میسرز برجمون کرشن پرشاد کٹھہر پلوایاں  
 دیگر فائر - لاہور - راولپنڈی - پشاور - کانپور - دہلی - بمبئی

پانچ ادویات کا مجموعہ

۱۵۔ ادویات کستورنی، جنہیں بہتر مشورہ میانی، نہ مخزن ایک اور دوائی کا مجموعہ طبی اصول کے مطابق ایسے وزن سے گریلوں تیار کی جیں کہ ۱۱۲ گرام سے ۲۵ پیارہ لوں کی پہنچ کنی کرے۔

[illegible]

ان گولیوں کا استعمال کنوارے کنواریاں نہیں کر سکتے ہیں۔ اور نئے نوجوان میں عارضہ خشک خشک کھانسی میں اور فون انامکی عضو سے  
 جن حالتوں میں بھی یہ گولیاں استعمال نہیں کر سکتے۔

پیشہ کا مکمل یونانی شفاخانہ۔ باغیچہ صدو اکبری دروازہ لاہور

آنزبل قدوسی، آچار یہ نرینہ دیو، سوامی سہانہ کامرینی کے مت

”خود کو سمجھنے کی چند دشنامی زبانیں پڑھنے کے لائق رسالے نہیں ہیں جن میں بعض رسالے کی ایک کاپی طرزدہ دیکھنی پڑے گی“  
(آئینہ میل و مرہول، ربع احمدی)

”وقتِ بے پناہ صید اور اچھا اجوارہ رہا ہے۔ اس کا کہیں لازم کا اس کی انتخاب کرنے کے لائق ہے۔“

آپ کا یہ فریاد سنیے

”جب دہلاؤ گا جاتا ہوں تو اسے خروار سے جھڑک کر پھینک دے گا۔ اس کے اپنے بڑی ریلوٹ خوب لڑوا دے گا۔“

سماهی سپیدی صید شد و آن را یکسایه

”جیتا ہمارے سیاسی اور اقتصادی انقلاب کا آئینہ ہے، وہ ہماری انقلابی تاریخ کو سرکاری کے ساتھ میل کر رہا ہے۔ ہر ایک انقلابی کے

اے بڑا ہوا ہے، قہقہے کے پھر کلب کی ہڈیٹ اور پائے کی چھکناں (دگر و بڑا دانے) پڑے کے فائن ہے اس سے جو کلام ہوا ہے۔

کامیابی کے رستے پر چلتے ہوئے

سلاطین

لوہہ کی کالی کی قیمت ہر کھٹ

قطرہ رباعی کا آغاز و خیر

وَلْيُؤْتُوا غَنًى، كَمَا

ساگرہ نبر انقلاب کی انا گلہ پیڑیا  
 ہو گی ہاں نبر کی جیت ۹۰ برسے محبت

دولت باغی کا خصوصی

افغانیوں کی سرگرفتگی۔ "لوگوں کو  
اس کے آگے کی جگہاں۔ جگر کھنڈ و غنہ

درآمد اوشتن ایالت با باره پند مسامحه و قضا  
ایا چاره سازد می شود و در این صورت  
از بکران و غیره نیز اجتناب نمودن

ولموا آفئس۔ لکھنؤ

# ایسی چھٹی صحت کس طرح ہے؟ مستوفی جواب



آگ آب اپنے گردوں کو دیکھ سکتے تو معلوم کرتے کہ گردہ، بگڑا ہوا، دھجھکا ہوا اور معدہ کی جملہ امراض۔ انفلوینزا، خفیدہ نزلہ، تیرہ کی درد، ضعف، ہسٹریا (اعتناق الرحم)، عرق النساء، ذیابیطس وغیرہ سب سب تیزاب اور خون کے فساد کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک مشہور ڈاکٹر کی رائے ہے کہ خون صاف کے بغیر امراض کا مطلق بعض تقصیر اوقات ہے یہ تسلیم شدہ ہے۔ اور اس کا ثبوت بھی باسانی فراہم کیا جاسکتا ہے کہ مختلف عضویاتی امراض اور تمام شکایات جسمانی پر اور بہت زہر آلود مادہ اور فساد خون کی وجہ سے رونما ہوتی ہیں۔ مثلاً یورک ایسڈ کے اثرات اسے گھٹایا اور اعصابی امراض اور معدہ کے تیزابوں کے اثر سے بد معنی وغیرہ پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دق (TUBERCLOSIS) اور معولی نکام کے درمیان تمام امراض فساد خون اور تیزاب کے اثر سے وجود میں آتے ہیں۔ اور جب یہ مملکت صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ تب طبیعوں کو یہ بھر ہوتی ہے کہ کسی طرح زہر کا دفع کیا جائے۔ لیکن احتیاط کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیے کہ قبل از وقت خون کی صفائی کا خیال رکھا جائے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ وقتاً فوقتاً جگر کو تقویت پہنچا کر معدہ اور گردوں کا متفقہ کہ خون صاف کرتا رہے تاکہ تولید جراثیم کا کوئی مرکز ہی نہ رہے۔ خون اور نظام قفیری کو جراثیم اور دیگر فساد دہی مادہ سے محفوظ رکھنے بغیر از آلہ مرض کی کوشش کرنا بالکل ایسا ہے جیسا کہ بغیر آگ بجھانے و اجوش کو دور کرنے کی کوشش کرنا۔ آپ اس کا ثبوت فراہم کر سکتے ہیں۔ مثلاً کہ قیمت دوائی جس کا نام مصطفیٰ ہے منکر اگر استعمال کریں۔ دو مہینہ یوم کما استعمال سے آپ کو معلوم ہو جائیگا۔ کہ آپ کی مرض رفتہ رفتہ رخصت ہو رہی ہے اور آپ کی صحت و قیمت میں اضافہ کے ساتھ آپ کی رنگت میں خوشامرخی اور سفیدی بڑھ رہی ہے۔ یقیناً آپ اپنے جسم و درگوں میں نئی قوت و توانائی محسوس کریں گے۔ قیمت فی شیشی ۲۵ غولاک پانچ روپے۔ محمولہ ڈاک ایک شیشی سے تین شیشی تک آٹھ آنے ہر۔

ہندوستان کے سول ایجنٹ:-

## میسرنبی ایم کے بخشی اینڈ کمپنی (وطن بلڈنگ) کلکتہ

مست قلندر لاہور کے مشہور  
اشہادِ معتمدات کی خدمت میں

# سینکڑوں پیچیدگی کے انعامات

مست قلندر لاہور کے مشہور  
اشہادِ معتمدات کی خدمت میں

جسمہ آدھائی کا کوئی سوال نہیں، غور و فکر سے کام لیجئے۔ آپ کی عقل آپ کی رہنمائی کرے گی اور کہیں دیر نہیں کہ آپ کا سیاحت نہ ہو، آپ کے کام کوئی رکاوٹ نہیں  
ہو گی اور آپ کے ساتھ ساتھ انعامات بھی حاصل کیجئے۔ چاہتے ہیں کہ کتنے ہی آپ کی تعلیمت پیدا ہو جائے گی کہ باتوں ہی باتوں میں سنانی زندگی کی عقلیں بھی بھانسنے لگیں۔  
اردو کے دلچسپ اور ادنیٰ نہیں، رسالہ مست قلندر لاہور میں آج کل دلچسپ جانتے سنا رہے ہیں۔ اس وقت آٹھ سو لاکھ کے انعامات مل سکتے ہیں۔  
پڑتے ہوئے ہیں۔ آپ کو دلچسپ اور شہرت فرما کر اپنی تعلیمت میں اضافہ کیجئے۔ دلچسپ و محبہ باطن آسان ہے۔ اور اس میں کوئی لفظ غیر زبان کا نہیں ہوتا۔ جس میں عقل  
مسمولی ہے۔ بلکہ بلا فیس بھی کر سکتے ہیں۔ اردو دان حضرات کی لئے دعا ہے کہ انعام حاصل کر لیں۔ بالکل نئی اور اچھی سیکنم ہے۔ چھ  
مست قلندر لاہور کی تعلیمت حاصل کرنی ہے۔ اور وہ ان حضرات کی لئے دعا ہے کہ انعام حاصل کر لیں۔ بالکل نئی اور اچھی سیکنم ہے۔ چھ  
مست قلندر لاہور کی تعلیمت حاصل کرنی ہے۔ اور وہ ان حضرات کی لئے دعا ہے کہ انعام حاصل کر لیں۔ بالکل نئی اور اچھی سیکنم ہے۔ چھ

سینکڑوں پیچیدگی کے انعامات

مست قلندر لاہور کے مشہور  
اشہادِ معتمدات کی خدمت میں

سینکڑوں پیچیدگی کے انعامات

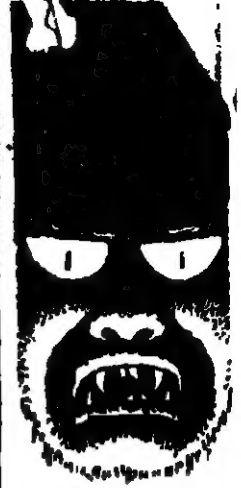
## ہر عمر کے بچوں کے لئے



پہلا نمبر

اس مرتبہ سال گرہ منبر عجیب و غریب چیز ہو گا۔ کاغذ بہت اچھا تصویریں دلچسپ غرض کا ہری صورت بہت مشائخ اور  
اور حضرات کا قلم بھی کیونکہ اگر فرمایا نہیں ہو تو تو فرمایا ہو جائے اور اس سے اس کی قیمت لگ نہیں لی جاتی۔ ویسے اس کی قیمت نہ چھوٹے ہو  
جیو یا تم تعلیم قرطی باغ عتی دہلی





# صحراورد کے مخطوط

مُصَنَّف

میرزا ادیب

قیت

ناشر

مکتبہ اردو لاہور

صحراورد کے مخطوط  
دعائے توفیق میں جو کہنے والے صحراورد کی کتابیں ہیں  
یہاں توفیق چاہیے کہ کتاب کو خوب سے کر سکا  
پر نہ پہنچا ہے  
280

